اپریل ۱۹۱۱ء

ماہوار

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ایم اے قادری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قادری

محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

تصویر: سروجنی نائیڈو

فہرست مضامین

پبلشر ریاض حسین قادری

نادرن انڈیا پرنٹنگ ورکس لکھنؤ میں چھپا

نواب محل

قیمت سالانہ ۳ روپیہ

نمونہ کے پرچہ کی قیمت ۵؍

مقام اشاعت نیا گاؤں لکھنؤ

(۱) تمدن ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے

(۲) ایسے مضامین جن سے اخلاق پر برا اثر پڑے یا ذاتیات سے بحث ہو یا سیاسی پہلو لئے ہوئے ہوں درج "تمدن" نہیں ہو سکتے۔

(۳) مضامین نظم و نثر ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ تک آجانے چاہئیں

(۴) جو مضامین کسی دوسرے رسالہ میں شائع ہو چکے ہوں انکو تمدن کیلئے ارسال نہ کرنا چاہئے۔

(۵) اگر کسی صاحب کے پاس ڈاکخانہ کی غفلت سے اتفاقاً کوئی نمبر نہ پہنچے۔ تو اسی ماہ کی ۱۰ تاریخ تک طلب کریں ورنہ پھر چار آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوگا۔

(۶) نا تمام مضامین "تمدن" کیلئے ارسال نہ کرنے چاہئیں ؛

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور

تمدن

لکھنؤ

تمدن

اگر تمدن کی یہ تعریف ہے کہ

وہ انسانی جماعتوں کی ایک ایسی حالت اور کیفیت کا نام ہے جس سے اُن کی ذہنی، اخلاقی
اور ارتقائی ترقیات کا پتہ چل سکتا ہے تو یہ صرف انسانی نسلوں یا انسانی موجودات ہی سے
مخصوص ہے کوئی دوسری مخلوق یہ خصوصیت نہیں رکھتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ یہ خاصہ
صرف اُسی مخلوق کا ہے جو مکلف ہے

اور اگر تمدن صرف تمدن یا مدنیت ہی کا نام ہے تو اس میں کوئی خصوصیت نہیں اپنے
اپنے رنگ میں یہ تو ہر ایک جاندار مخلوق کو حاصل ہے۔ اور اگر تمدن ایک روش اور ایک
ضابطہ زندگی سے مراد ہے تو پھر غیر جاندار زندگیاں بھی اس سے بہرہ ور ہیں۔ وہ غیر
جاندار زندگیاں جنہیں ہم غیر جاندار کہتے ہیں ورنہ اپنے رنگ میں انہیں بھی ایک جاندار
زندگی حاصل ہے۔ انسانوں کی طرح دوسری جاندار مخلوق بھی ایسا تمدن رکھتی ہے وہ بھی
اپنے رنگ میں مدنی ہے اگرچہ ہماری طرح اُن کے گھر اماکن اور رہائشی جگہیں نہیں ہیں

اور انہیں ہماری طرح مختلف اشیا اور مختلف سامانوں کی ضرورت ہے مگر جتنی ان کی حیثیت اور جتنی ان کی ضروریات ہیں اس کے موافق انہیں بھی ایسا سامان حاصل ہے۔ ایک بیے کا گھونسلہ اگرچہ ہمارے ایک کمرہ کی حیثیت تو نہیں رکھتا مگر بہ نقطہ خیال بیا ہمارے کمرہ سے اس کی ساخت کچھ کم نہیں ہوتی اگرچہ ہم اسمیں آرام نہیں کر سکتے مگر خود اس کے واسطے وہی ایک بڑی آرام دہ منزل ہے

اگرچہ دوسری مخلوق ہماری طرح ایجادات میں ید طولے نہیں رکھتی مگر جن ایجادات کی انہیں اپنی ضروریات کے مطابق ضرورت ہے وہ انہیں قدرتاً یا فطرتاً حاصل ہیں اگرچہ ہماری طرح ان کا خلا ملا نہیں مگر جسقدر ضرورت ہے ان میں بھی خلا ملا پایا جاتا ہے۔

اگرچہ ان کی قوتیں اور ان کے جذبات انسانی قوتوں اور انسانی جذبات کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ وہ ہماری طرح مکلف ہیں مگر انہیں بھی ان کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق قوتیں اور جذبات دیئے گئے ہیں اور ان کی بعض قوتیں اور جذبات ایسے منضبط اور تیز ہیں کہ ہم بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

میری رائے میں ان معنوں میں صرف انسان ہی متمدن نہیں ہے دوسری جاندار مخلوق بھی متمدن ہے ان کا تمدن جدا ہے اور ہمارا جدا ہے

ہاں ان کا تمدن ساکن ہے اور ہمارا متحرک ہے یا وہ غیر مکلف ہیں۔ اور ہم مکلف

ان کا تمدن وہی ہے جو قدرت نے انہیں ان کی حیثیت اور ضروریات کے مناسب بخش رکھا ہے خلاف اس کے ہمارا تمدن اگرچہ ہماری اندرونی قوتوں اور جذبات کے ماتحت یا ان کا اثر ہے مگر پھر بھی ہمیں قوتوں اور جذبات کے اضافی یا اجتہادی زور سے اپنی رفتار تمدن کو ارتقای پہلو سے بہت کچھ آگے لے جانے کا موقعہ ملتا ہے

تمدن انسانی کیا ہے۔

(الف) دماغی قوتوں کا صحیح استعمال

(ب) جذبات کا صحیح استعمال

(ج) دماغی قوتوں اور جذبات سے وقت پر کام لینا۔

(د) اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے ان امور اور ان نسبتوں کا ایک دوسرے نتیجہ کی خاطر انکشاف اور ترتیب جو انسانی آسائش کا سرچشمہ ہیں۔

(ہ) اُن مخفی اسباب اور مخفی رموز کا عملی رنگ میں اظہار جو انسانی آسائش۔ تہذیب کے لیے ایک انتہائی اور امتیازی درجہ رکھتی ہوں

یہی پانچ باتیں ہمارے تمدن کا خمسہ ضروریہ ہیں اور ان ہی پر تمدن انسانی کا بہت کچھ مدار ہے۔ یہ خمسہ ضروریہ دوسری زندہ مخلوق میں ہماری طرح نہیں پایا جاتا اور نہ اس کی انہیں ایسی ضرورت ہے جیسے انسان کو ہے

انسانی تمدن کا پہلا زینہ

معاشرت ہے

دوسرے الفاظ میں طرز معاشرت یا ضروریات معاشرت

دوسری جاندار مخلوق کی معاشرت کی کفیل یا ذمہ دار خود اور قدرت ہے۔ انسان ہی ایک ایسا بچہ ہے جسے مادر قدرت نے مختلف قوتیں اور مختلف جذبات دے کر اپنی گود سے جدا کر دیا ہے انسان پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان ضروریات معاش کا محتاج ہو جاتا ہے قدرت جن کے انتظام سے خود کو ایک بڑی حد تک الگ رکھتی ہے بیشک اسے بہت سی اشیا یہ مفت بھی دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی اس کا مذاق کچھ ایسا نکہ دیا گیا ہے کہ وہ باوجود اس لطف و آرام کے بھی رہ معاشرت میں بہت کچھ تکلیف اٹھاتا ہے بنی اسرائیل نے آسمانی غذا یا من وسلویٰ کے ملنے پر بھی قناعت نہ کی اور یہی رہا سکن

قدرت نے حیوانات پرند چرند کی جو غذائیں مقرر کر رکھی ہیں وہ آج تک خوشی سے ان ہی پر قانع اور شاکر ہیں۔ سہ

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ایک جانور کا بچہ پیدا ہونے کے بعد جس قدر تکلیف معاشرت اٹھاتا ہے اس سے انسان کا بچہ صدہا درجہ بڑھ کر اٹھاتا ہے

عیاں را چہ بیاں

انسان کو پیدا ہوتے ہی معاشرتی پہلو سے کن امور اور کن اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے

(۱) وسائل معاش کی

(۲) حسن معاش کی

(۳) ترقی معاش کی

(۴) آسائش کی

(۵) ضمیری یا وجدانی ترقیات کی

دوسری جاندار مخلوق ان میں سے ایک ضرورت بھی نہیں رکھتی اور اگر کسی حد تک رکھتی بھی ہے تو خود قدرت ان کی کفیل ہو چکی ہے جو اوپر کی پانچ باتیں انسانی زندگی کا لازمہ ہیں۔ ان کے واسطے اور چار باتوں کی بھی بالخصوص ضرورت ہے

(الف) علم کی

(ب) عمل کی

(ج) مشاہدہ کی

(د) تجربہ کی

کیا ان میں سے بھی دوسری زندہ مخلوق کو کسی بات کی ضرورت ہے اگر ہے بھی تو

انسان کے مقابلہ میں بہت ہی کم۔

ان سب باتوں یا ان سب ضروریات کے ساتھ حضرت انسان کو جو عقل و فراست اور اس پر اختیارات دیے گئے ہیں وہ اس کی معاشرتی رفتار میں اور بھی حارج اور مزاحم ہیں اگر انسان کو یہ اختیارات اور اس کے ساتھ ایسی عقل و فراست اور مادہ تمیز حاصل نہ ہوتا تو وہ دوسری زندہ مخلوق کی طرح ایک مخصوص یا محدود مرکز پر رہ کر اپنی زندگی کے دن پورے کرتا اور ان مشکلات اور تکلیفات میں نہ پڑتا جو اس وقت اس کی گلو گیر ہیں۔

اگرچہ اس گلوگیری اور اس سر دردی میں لسے چند فتوحات بھی حاصل ہیں مگر مشکلات بھی کم نہیں ہیں۔ انسان کے سوائے جسے اپنی عقل و دانش پر اس قدر ناز ہے۔ اور جو اشرف المخلوق کا ڈبلوما رکھتا ہے دوسری مخلوق میں سے شاید ہی مشکلات سے تنگ آکر کوئی فرد خلقت خودکشی کرتی ہو یہ انسان ہی کی شان ہے۔ کہ مشکلات سے تنگ آکر خودکشی کر بیٹھتا ہے ایک حکیم کا قول ہے۔

جب کوئی قوم تہذیب کے مدارج طے کرتی ہے تو اس کی مشکلات میں تین باتوں کا اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

بے چینی۔ اضطرار۔ کثرت ضروریات

صرف یہی نہیں بلکہ ایک قسم کی شرمناک دست برد تصرف اور لالچ و خودغرضی بھی۔

ان کے ساتھ ہی محنت۔ تردد۔ مشقت بھی بڑھ جاتی ہے۔ جہالت اور وحشت اگرچہ ایک بری حالت ہے مگر اس میں یہ باتیں ہوتی ہی نہیں ہیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو بہت ہی کم اور ایک استغنا اور لاپروائی کے ساتھ جہالت اور وحشت میں عموماً وہ تنگ دلی نہیں ہوتی جو تہذیب میں ہوتی ہے۔

جہالت اور وحشت میں ایک قسم کی درندگی کے ساتھ قناعت بھی پائی جاتی ہے اور ایک خالص صداقت بھی۔ وہ قناعت اور وہ صداقت جو تہذیبی یا تمدنی فلسفہ تو

نہیں البتہ مذہبی فلسفہ اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے ۔

تمدن جس طرح تصرف کا حامی نہیں اسی طرح وہ اس خیال کا بھی حامی نہیں کہ اس کی ضروریات کا دامن اس دنیا میں رہ کر اس قدر تنگ ہو جائے کہ وہ خود کو بالکل اوس زندہ مخلوق کے قریب تر لے جائے جو غیر مکلف ہونے کی صورت میں قدرتی حدود میں رہ کر زندگی کے دن پورے کرتی ہے ۔ تمدن کی یہ خواہش ٹھیک اسکی فطرت کے مطابق ہے ۔ اگر یہ خواہش درست نہ تسلیم کی جائے تو پھر ان مختلف قوتوں اور جذبات کا اسکی طبیعت اور فطرت میں ودیعت کیا جانا درست اور موزوں ثابت نہ ہو گا ۔

آنکھ کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے ارد گرد جائز حدود میں رہ کر مشاہدہ کرے کان کی یہ فطرت ہے کہ سنے ۔ زبان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ان دونوں سے الگ رہ کر اپنے کام میں لگی رہے حافظہ کی یہ فطرت ہے کہ حفظ کرے ۔

جس قدر قوتیں انسان کو قدرت نے دے رکھی ہیں یہی سب کا سب تمدن انسانی کی بنیاد ہیں ان ہی سے تمدن انسانی شروع ہوتا ہے اور ان ہی پر ختم بھی ہو جاتا ہے ۔ جب یہ قوتیں صحیح رنگ میں کام کرتی ہیں یا کام دیتی ہیں تو انسانی تمدن ترقی کرتا جاتا ہے اور جب ان کی صحیح چال میں فرق آجاتا ہے تو تمدن انسانی کی رفتار میں بھی فرق آجاتا ہے ۔

مختلف اقوام کے حالات اور کیفیات سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ قوموں کے تمدن میں کس کس طرح اور کس کس وقت ترقی ہوتی ہے اور کس کس طرح اور کس کس وقت وہ تنزل پذیر ہوتا ہے

اگر قوموں کا تمدن یا حسن تمدن ہماری دماغی یا ضمیری قوتوں اور جذبات سے وابستہ ہے تو دوسری طرف اس کے ڈانڈے دنیا و مافیہا سے بھی ملے ہوئے ہیں ۔ جو قوم اپنی ضروریات فارغ البالی سے نہیں رکھتی یا جس کا سامان ضروریات کتنی

اور مکمل نہیں ہے اُس کا تمدن اور حسن تمدن بھی کتنی اور مکمل نہ ہوگا دونوں صورتوں میں تمدن اور حسن تمدن ضابطہ وسیلہ کا خواہاں ہے مثلاً وہ قوم جو اپنی زندگی کی ضروریات سے ناچار ہے اور جسے ضروریات کے متعلق مناسب پیمانہ پر سامان نہیں ملتا اور نہ وہ سامان ضبطہ رکھتی ہے اس کا تمدن اور حسن تمدن کیا کچھ خوبی اور عمدگی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کا تمدن اور حسن تمدن قابل تعریف ہے اگرچہ یہ بات بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ قلت سامان تمدن کی صورت میں ہی ضبط و ربط سے تمدن کی ہستی قایم اور باقی رہ سکتی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وقت معمولی یا چھوٹی ہستیاں بھی باوجود کم مقدرت کے تمدن سے اصل میں ایک اچھے پایہ کا ضبط و ربط رکھتی ہیں اور ان میں بھی ایک حسن موجود ہوتا ہے۔ گر پھر بھی یہ کہا جائیگا کہ تمدن اسی صورت میں فارغ البال اور قیمتی ہوتا ہے جب اس کا اثاثہ کافی ہو۔

اس موقعہ پر یہ سوال ہو سکتا ہے۔

(الف) کیا حسن تمدن سے اثاثہ بڑھتا ہے۔

(ب) یا اثاثہ سے تمدن اور حسن تمدن مترقی ہوتا ہے۔

اگر ہم حسن تمدن کی جگہ شروع شروع میں حسن تدبیر رکھدیں تو شاید زیادہ موزوں ہوگا جب تک کسی قوم میں حسن تدبیر نہ ہو تب تک نہ تو تمدن میں حسن آتا ہے اور نہ اثاثہ تمدن میں اضافہ ہوتا ہے حسن تدبیر تمدن اور حسن تمدن کی کلید ہے اور یہ کلید اس وقت تک ہاتھ نہیں آتی اور نہ اس سے قفل تمدن کھلتا ہے جب تک کہ کوئی قوم سیرت اور کیرکٹر کی مالک نہ ہو + (باقیدارد)

سلطان احمد

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے - منیجر

غذا اور درازیٔ حیات

جسم کی پرداخت اور پرورش میں غذا کس حد تک مددگار ہے؟ ایک زمانہ تھا جب انسان کا پختہ عقیدہ تھا کہ جسم کی پرورش کا دارومدار بالکل غذا پر ہے۔ مگر ان چند سالوں میں عجیب و غریب تحقیقاتیں کی گئیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علاوہ غذا کے اور بھی کئی باتیں ہیں جو جسم کی پرداخت میں معاون ہوتی ہیں

یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ اکثر غذا کے نہ ملنے سے انسان تین یا چار دن کے اندر ہلاک ہو گیا۔ مگر جس وقت کوئی شخص عمداً اور اراداتاً فاقہ کشی کرنے لگتا ہے اور کھانے پینے کی طرف سے بے پروا بنجاتا ہے تو وہ نہ صرف زیادہ عرصہ تک جیتا رہتا ہے بلکہ اس کی تندرستی اچھی رہتی ہے اور فاقہ کشی کرنے سے اس کو نقصان کے عیوض فائدہ پہنچتا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کہ جب انسان فاقہ کشی کے لئے مجبور کیا جائے تو وہ بہت جلد مر جائے اور وہی شخص اگر اراداتاً فاقہ کشی کرتا رہے تو چالیس پچاس روز تک زندہ رہے اور اس تجربہ سے بہت بڑا فائدہ حاصل کرے۔

بعض آدمیوں کا خیال ہے کہ ہم پانی پر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مگر بالجبر فاقہ کشی کرنے والے پانی پی کر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ درانحالیکہ جو اراداتاً فاقہ کشی کرتے ہیں وہ پانی بھی نہیں پیتے اور پھر بھی زندہ رہتے ہیں۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہوا زندگی کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہ امر اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ہم ان بالجبر فاقہ کشوں کو جن کو غذا نہیں دی جاتی یا نہیں ملتی ہوا یا پانی دیکر زندہ نہیں رکھ سکتے۔ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ زندگی کے قائم رکھنے میں انسان کے دل کو بہت بڑی طاقت حاصل ہے۔ جب دل کہتا ہے کہ میں چالیس دن

مگر بغیر غذا کے زندہ رہونگا اور اس سے فائدہ اٹھاؤں گا تو جسم کو واقعی اس سے نفع پہنچتا ہے لیکن جب دل کہتا ہے کہ جسم کا سلسلہ دار و مدار غذا پر ہے اور غذا کے بغیر تو تین چار دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تو اس حالت میں جسم کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر دو دن تک پانی نہ ملے تو ایک شخص بیقرار و مضطرب ہو جاتا ہے۔ دوسرا آدمی اپنی تندرستی کے خیال سے بالکل پانی نہیں پیتا اور اس کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ اگر دوا نہ ملے تو ایک مریض مر جائیگا۔ مگر دوسرا اپنی خوشی سے دوا نہیں پیتا بلکہ کہتا ہے میں آپ ہی اچھا ہو جاؤنگا۔ دوا کی ضرورت نہیں۔ اور وہ جلد تندرست ہو جاتا ہے۔

پس اگر انسان کا دل ہی جسم کی پرداخت کرتا ہے اور اس کو مضبوط اور طاقتور رکھ سکتا ہے تو کیا ہم اگر بہت مدت تک غذا کا استعمال موقوف رکھیں تو زندہ نہ رہیں گے؟ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بہت عرصہ تک جسم خود اپنے ہی اوپر بسر کر سکتا ہے۔ اور جب تک اس کی ہڈی کے ڈھانچہ کو صدمہ نہ پہنچے اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک بات غور کرنیکے قابل ہے۔ پہلے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ فاقہ کر کے جسم صرف تین دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔ تجربہ نے تین دن سے بیس دن میعاد مقرر کرا دی۔ اس کے بعد ایک شخص نے کہا میں ۴۰ دن تک فاقہ کرونگا۔ لوگ اس کو جنونی سمجھنے لگے کیونکہ ان کی دانست میں چالیس دن تک بغیر غذا کے زندہ رہنا غیر ممکن تھا۔ مگر اس نے ایک بھی نہیں سنی۔ چالیس دن تک متواتر بھوکا رہا اور زندہ رہا۔ اس کے بعد بعض آدمیوں نے اس کی تقلید کی اور بعض اس سے بھی بڑھ گئے۔

اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی شخص قطعی طور پر نہیں بتا سکتا کہ وہ مادی غذا کے بغیر کس میعاد تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ظاہرا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا دل جس مدت تک یقین دلائے اس عرصہ تک وہ زندہ رہ سکیگا لیکن اس دل کی غذا کی کوئی حد بھی مقرر کی جا سکتی ہے یا نہیں ابھی تک یہ بحث طلب امر ہے جس مدت تک بغیر غذا کے رہنے کا انسان نے ارادہ و یقین کیا تھا اس میں کامیاب ہوا تھا۔ اور اب ہر ایک شخص اس پر یقین کرتا ہے۔ اور دل اگر یقین ہی سے جسم کو اس عرصہ تک زندہ رکھ سکتا ہے جب تک جسم اپنے

سو برس تک اگر کوئی شخص قلبی طور پر یقین کر سکیگا کہ کس مدت تک وہ زندہ رہیگا اور ان کا احساس بات کا پکا ہو جائے کہ دل جسم کے اندرونی سامان سے بالکل بے پرواہ ہو کر اس کو زندہ رکھ سکنے پر قادر ہے تو کسی کو موت مقرر کرنے کی جرأت تک نہ ہو سکے گی۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو جب تک دل زندہ رکھنے کا یقین کریگا اس عرصہ تک جسم زندہ رہیگا۔

یہی حالت عمر کی نسبت بھی تھی۔ ایک وقت تھا جب انسان ضعیف اور کمزور ہو کر بمشکل ستر برس تک زندہ رہ سکتا تھا۔ اگر کسی کی عمر اسی برس کی ہوگئی تو وہ عجیب و غریب انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ سو برس کی عمر تک زندہ رہنا معمولی بات ہوگئی۔ کسی زمانہ میں زیادہ عمر تک جیتے رہنے سے انسان کی بابت کمزور ہو جانیکا خیال ہوتا تھا۔ حافظہ تو بالکل ہی برباد ہو جاتا تھا۔ اب آجکل بھی اسی برس کی عمر کے مرد و عورت بکثرت موجود ہیں۔ جو ساٹھ برس کی عمر والوں سے بھی زیادہ تندرست نظر آتے ہیں اور سو برس کی عمر والے ستر برس والوں سے زیادہ پھرتیلے اور چست و چالاک ہیں۔

یہ تبدیلی کیوں ہوئی ہے؟ اس کا اکیلا سبب صرف یہ ہے کہ اب انسان کو یقین ہو چلا ہے کہ وہ سو برس یا زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اس کے قویٰ درست رہ سکتے ہیں۔ اب روز بروز یہ یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ "وقت" یا "عمر" کی حد کا یقین نہیں کر سکتا بلکہ یہ انسان کا اپنا دل ہے جو اس کو نوجوان، خواہ بوڑھا کر دیتا ہے۔ جہاں کسی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب اس عمر سے زیادہ زندہ رہنا غیر ممکن ہے۔ اسی وقت سے وہ ضعیف ہونے لگتا ہے۔ اور مر جاتا ہے۔ کاش وہ دائمی جوانی کی ہوس کرے اور ساتھ ہی پورا پورا یقین رکھے تو وہ دنیا میں بہت دنوں تک نہ صرف جیتا جاگتا رہیگا۔ بلکہ جوانوں کی طرح چوکس و چالاک نظر آئے گا۔

پس اگر یہ دل ہی ہے جو جسم کو کھلاتا پلاتا اور اس کی پرداخت کرتا ہے۔ اور یہی عمر کی میعاد تجویز کر دیتا ہے تو پھر مادی غذا کے استعمال کی نسبت کیا کہا جائیگا؟

بعض صوفیوں اور محققین نے یہ خیال دلایا ہے کہ جس طرح پانی غذا کو جسم تک پہنچاتا ہے اسی طرح غذا خود تو جسم کی پرورش نہیں کرتی بلکہ اپنے ساتھ غذائی مادہ داخل کرتی رہتی ہے اصل سے جسم کی پرورش و برداخت ہوتی ہے۔ غذا کے مہیا کئے جانے سے دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ جسم کھلایا پلایا جا رہا ہے اور وہ سب کو جسم کے رگ و ریشہ میں پہنچاتا ہے اور اس سے اس کی پرداخت ہوتی ہے۔ تصورات یا خیال ہی یہ طاقت ہے کہ چاہے وہ زندگی کے دروازہ کو بند کر دے خواہ کھول دے۔ بعض قسم کے خیالات اچھے ہوتے ہیں اور وہ زندگی کو متحرک رکھتے رہتے ہیں بعض مضر ہوتے ہیں اور وہ اس کے راستہ کے سامنے رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ جس وقت دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم بغیر غذا کے زندہ رہ سکتے ہیں تو فاقہ کشی سے نفع حاصل کرتے ہیں اور ویسی نوجوانی سے بہرہ ور رہتے ہیں۔ اس وقت دراصل ہماری زندگی میں یہی نتیجے ظاہر ہوتے ہیں اور جب ہم خیال کر لیتے ہیں کہ غذا کے بغیر نہیں جی سکتے۔ ہاتھ پاؤں کمزور ہو جاتے ہیں۔ جوانی جاتی رہتی ہے۔ بڑھاپا اور موت آجاتی ہے۔ اس وقت ان سب حالتوں کا پیدا ہونا ازبس ضروری ہے۔

اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غذا سے صرف ہم کو جسم کے پرداخت کے متعلق علم ہو جاتا ہے اور مادی سامان ملتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مادی سامان صرف پانی اور ہوا سے جسم کی پرداخت کے لئے کافی مقدار میں مل سکے؟ کیا ممکن ہے کہ دل ہوا اور پانی کے کافی ذرات کو اپنی یکسوئی سے جسم کی طرف کھینچ سکے۔ اور غذا کی ارزانی ان سے ہو جائے؟ ہاں یہ ممکن ہے۔ جہاں دل کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اس قسم کا کام کر سکتا ہے۔ اس وقت محض قوت ارادی سے اس کا انتظام خود بخود ہونے لگیگا۔

اس وقت پھر غذا کی کیا ضرورت ہوگی؟ جو ضروری سامان ہے وہ براہ راست ہوا اور پانی کے ذریعہ ہم کو ملتے رہینگے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی کارروائی اب بھی برابر ہو رہی ہے۔ ہر چیز اپنا اپنا حصہ جسم کو دے رہی ہے۔ پانی سے اسکا نشوونما

سمجھتا ہے لیکن جب سارا دار و مدار ان ہی پر رہے گا اس وقت وہ زیادہ احتیاط ہوشیاری اور مستعدی سے کام کرینگے۔ دل کی یکسوئی میں مقناطیسی طاقت ہوتی ہے دل کو یکسو کرکے خیال اور تصور کی مدد سے انسان بہت کچھ اپنی طرف کھینچ سکتا ہے اور حاصل کرسکتا ہے۔ دل روح کی فیکٹری ہے۔ اور اس موٹر (یعنی دل) کی مدد سے خداوند کریم کی ساری نعمتیں روح کو ملتی ہیں اور وہ منتخب کرکے ہر چیز لے سکتا ہے۔ اور اسکی مدد سے ہر قسم کی تکمیل و نشو و نمائی کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے جسم کی ابتدائی حالت میں غذا ضروری چیز ہے۔ اور اس کی ضرورت اسوقت تک ہے جب تک کہ ہم کو ذہن نشین نہ ہو جائے کہ یہ غیر ضروری ہے۔ درازئی حیات کی دولت ہم کو اس وقت نصیب ہوگی جب ہم سمجھ جائیں گے کہ غذا ہماری پرداخت کیلئے بالکل ضروری نہیں ہے۔ یہ سمجھ آہستہ آہستہ پیدا ہوگی۔ ہم کثیف سے لطیف طرف مائل ہوتے ہیں۔ پہلے کثیف غذا کھاتے ہیں پھر لطیف غذا کا خیال آتا ہے۔ غذا کو اسی طرح برابر لطیف بناتے چلے جاؤ۔ ایک وقت آجائیگا جب ہم سمجھ سکیں گے۔ کہ ہم صرف روح پر رہ سکتے ہیں اور کسی طرح کی مادی غذا کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ مقصد بالجبر فاقہ کشی کرنے سے حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ بتدریج اس کی سمجھ آتی جائیگی اور جتنی سمجھ آئیگی اتنا ہی ہم کو کثیف غذا کی محتاجی کم ہوتی جائے گی۔ اور ہماری قابلیتیں بڑھتی چلی جائینگی۔

اس کا ہمارے جسم پر کیا اثر پڑیگا؟ یہ ہم خود سوچ اور سمجھ سکتے ہیں جتنی غذا لطیف ہوگی اتنا ہی جسم بھی لطیف ہوتا جائیگا۔ اس کی طاقت اور خوبصورتی میں بھی لطافت آتی جائے گی۔ اور ہم کو ایسی زندگی نصیب ہوگی۔ زندگی ہر شے میں ہے لیکن ہماری بالیدگی اسی طریقہ پر ہوتی ہے جس طریقہ کو ہم منتخب و پسند کر لیتے ہیں جس قدر لطافت کا خیال رکھا جائے گا اسقدر زندگی اچھی اور شاندار ہوگی جسم کی بنا کثیف ہوتی ہے۔ تدریجی لطافت کے زینہ پر بڑھتے ہوئے زندگی اور ترقی کا ورثہ حاصل ہوتا ہے۔

مادی غذا صرف اس وقت تک کے لئے مددگار ہے جب تک کہ ہم اس کے بغیر زندگی بسر کرنے کی سمجھ نہ پا جائے۔ یہ خیالات خوشگوار راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ جس کی منزل مقصود اطمینان ہے۔ اور اسی اطمینان میں ایسے سامان ہیں جو روحانیت بخشنے والے ہیں۔ جہاں آکر جسم ہمارا ہوتا ہے۔ اور ہم جسم کے جسم ہمارا فرمانبردار اور غلام ہوتا ہے۔ اور پھر ہم کو اس کے اطاعت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ◆

مترجمہ فریلا پرشاد ورما عاصی گیاوی

ساقی نامہ

از جناب سید محمد صاحب (پرتاب گڑھ)

فصل گل آئی ہے بدلا ہے ارادہ میرا — اس مہینہ میں ہے کچھ شوق زیادہ میرا

سادہ دل میں بھی ہوں ساقی بھی ہے سادہ میرا — چودہویں رات کا ہے چاند کہ بادہ میرا

حق چمکنے لگا باطل کا جو تھا میل گیا

نکلی مے شیشہ سے اور نور خدا پھیل گیا

ساقیا کون مسلماں نہیں تیرا غلام — سنی و شیعہ ہیں دونوں کو تیری ذات سے کام

دونوں عاشق ہیں ترے پیتے ہیں خوشتر مدام — دونوں لئے چلتے ہوئے الفت کے جام

ہر دو بخشش کے سزاوار ہیں دونوں ساقی

تیرے میخانہ کے مے خوار ہیں دونوں ساقی

رات دن [illegible] — سب سمجھتے ہیں یہ نکتہ نہیں کچھ ایسا دق

یہ بلا کہتا ہے تاریخ کا ایک ایک ورق — پہلے تو نے ہی پڑھایا ہے حقیقت کا سبق

شک نہیں شاہ ملایک تجھے سب جانتے ہیں
پینے والے تیرے ساقی تجھے پہچانتے ہیں

صاف کیونکر نہ کہے جب ہے کوئی نمک کے　　بیخطر کیوں نہ کہے حق بھی تو ہو کوئی شے
ہے دونوں کے نزاع کی نہ کیوں ایک ہی نے　　ایک ہی شیشہ و پیمانہ ہے اور ایک ہی مے

نہیں پہچانتے اپنوں کو جہالت دیکھو
پیکے آپس ہی میں لڑتے ہیں حماقت دیکھو

ایک کو نشہ جو چڑھتا ہے تو بکتا ہے فضول　　توڑ دیتا ہے تنزل سے شریعت کے اصول
بڑ میں کہتا ہے سب طاعت ہماری ہے فضول　　جانتا ہے کہ خدا ہو گیا اوس میں حلول

اپنی بدمستی کو مستانہ ادا جانتا ہے
دشمن ہے خود پرستی سے کہ ہر اک کو خدا جانتا ہے

دوسرا نشہ میں ہو جاتا ہے ایسا بے حال　　سر جھکاتا ہی نہیں پیش خدا سالہا سال
یا وہ گوئی میں بڑھاتا ہے کچھ اس درجہ کمال　　کہ نہیں رکھتا ہے ساقی کے مراتب کا خیال

جلد کم ظرفوں کے پیمانے چھلک جاتے ہیں
سیدھے رستے سے غرض دونو بہک جاتے ہیں

کیسی مستانہ ادا ہے نیمے میں بادل اوٹھے　　جھومتے آتے ہیں اس طرح کہ بس اب برسے
یہ عمل دیدہ و دانستہ ہے یا ہیں بہکے　　سر جھکے جاتے ہیں مغرب کی طرف رندوں کے

وجد ہے دل کو تیرے عز و شرف سے ساقی
بوئے مے آتی ہے مانہ کی طرف سے ساقی

شکر صد شکر کہ اب رندوں کی قسمت جاگی　　حوصلہ چاہیے پینے کو نہیں مے کی کمی
بھر گئے ساغر صہبائے ولائے دینی　　کھل گیا ہے در بیت خانہ ابراہیمی

کیسا رازق ہے میرا دینے دلانے والا

مل گیا آج محتسب سا پلانے والا

ہوا اک سماں بزم میں بنتا ساقی　　شوقِ دیدار میں پھر ڈھونڈ رہا تھا ساقی

لب پینے کا ہر اک کو ہے سکھاتا ساقی　　چودہ سو برس سے تو چھپ کر نہیں پیتا ساقی

پیتے ہی پیتے مجھے ہیں سحر و شام گئے

کم ہوں اس سے تو رندوں نے مرا نام کئے

یہ وہ مے ہے کہ جسے سب علما پیتے ہیں　　یہ وہ مے ہے کہ جسے سب فضلا پیتے ہیں

یہ وہ مے ہے کہ جسے سب کملا پیتے ہیں　　یہ وہ مے ہے جسے ہم سے جہلا پیتے ہیں

خس و خاشاک ضلالت ہو تو بہہ جاتا ہے

آدمی پیتے اسے آدمی بن جاتا ہے

بخدا تو نے دیا بادۂ وحدت ساقی　　ہے یہ عرفان کی جھلک تیرے بدولت ساقی

دل میں میخواروں کے ہے تیری محبت ساقی　　تیرے ہی ہاتھ پہ ہے دونوں کی بیعت ساقی

بغض آپس کا یہ کب شیوۂ اسلامی ہے

انہیں جھگڑوں سے تو میخانہ کی بدنامی ہے

مرے ساقی تجھے اللہ نے شہرت دی ہے　　تیری دوکان پہ نظر سارے زمانہ کی ہے

مسجدیں بھی تیرے میخواروں کی بستی ہے　　مدرسہ والوں میں پینے کی ٹھنی رہتی ہے

یہی پی جاتی ہے ہر اہل خرد کے گھر میں

کارخانہ تیرا مشہور ہے دنیا بھر میں

تجھ سے رندوں کے ہر سال پڑے رہتے ہیں　　در میخانہ پہ پینے کو اڑے رہتے ہیں

مسجدوں میں کبھی پی پی کے کھڑے رہتے ہیں　　خانقاہوں میں کبھی مست پڑے رہتے ہیں

مے سے لبریز سبو شیشہ و پیمانہ ہے

تیرہ سو سال سے جاری تیرا میخانہ ہے

رند سرشار ہر اک شاہ و وزیر اسکا ہے — دل سے پروانہ ہر اک مست و فقیر اسکا ہے
کیا بتائیں کہیں دنیا میں نظیر اسکا ہے — نور عرفان الٰہی سے خمیر اس کا ہے

مجھکو اللہ نے یہ عرش سے بھجوائی ہے
مصطفیٰ نے خم تطہیر میں کھچوائی ہے

میرے ساقی تیرے میکش تجھے کیا کہتے ہیں — وہی کہتے ہیں جو ارباب صفا کہتے ہیں
قبلہ کعبہ کو تجھے قبلہ نما کہتے ہیں — ہم نصیری تو نہیں ہیں کہ خدا کہتے ہیں

پیکے بیہودہ کبھی ہم نہیں بکنے والے
اور ہوتے ہیں وہ کم ظرف بہکنے والے

پینا اس بادۂ خالص کا ذرا مشکل ہے — یہ نہ سمجھو کہ چڑھا جانے میں کیا مشکل ہے
یعنی آسان نہیں عشق خدا مشکل ہے — جنکے رہتے ہیں سدا انکو سوا مشکل ہے

حق اگر پوچھو تو لذت میں ذرا تلخی ہے
جب پینے والے بتاتے ہیں یہی چوکھی ہے

یوں تو بیچو ہر اک کا دنیا میں بڑا چرچا ہے — جستجوئے مے خالص میں ہر اک پھرتا ہے
سودا ہر ملت و مذہب کا بڑا بکتا ہے — اور یہ ہر ایک کا دعویٰ میرا مال اچھا ہے

کہیں ہر ایک کو پہچان تیری ملتی ہے
بڑی تحقیق سے دوکان تیری ملتی ہے

میل کا میل تو اس مے میں نکلتا ہی نہیں — ایک میں تین کا فقرہ کبھی چلتا ہی نہیں
پینے والا تیرے صہبا سے ٹلتا ہی نہیں — اسکے نشہ کا کبھی رنگ بدلتا ہی نہیں

شرک سے بہر خمے میخوار کا دل خالی ہے
تیری دوکان میں بھی ایک خدا والی ہے

عمر گذری کہ سبھا اپنی اسی ساغر پہ گذر — شغل پینے ہی پلانے کا رہا ہے اکثر

دیکھتے ہیں جو زمانہ کے پھرے ہم تیور　　زاہد خشک سے بھی ملتے ہیں کیسا جھک کر

شرم ان کو مگر نہیں شرع کا ادراک نہیں
چھپ کے پینے میں بھی اسکے ہمیں کچھ باک نہیں

رند مخفی نہیں رکھتے ہیں کبھی راز دلی　　منہ پہ کہدیتے ہیں جو بات بھلی یا کہ بری
ناصحا انکو بھی اس بات کی تم نے کبھی کی　　توبہ ترک مے تجھ سے کہوں تو پی بھی

کہیں ابتک یہ چھڑائے سے چھٹی ہے زاہد
ایسے یہ منہ سے نہیں دل سے لگی ہے زاہد

اس زمانہ میں مگر شانے نہیں رندوں کے ہوش　　پھنس گئے حلقۂ عصیاں میں ترے حلقہ بگوش
اب نہ وہ بادہ پرستی ہے نہ وہ نوشا نوش　　اور نہ میخانہ میں اگلا سا رہا جوش خروش

نام ساغر پہ فقط جھومتے ہیں گرتے ہیں
اب تو سب بے پئے متوالے بنے پھرتے ہیں

اب کے رندوں میں نہیں ہے وہ شعار اسلام　　بس زبانوں ہی پہ رہتا ہے فقط نام امام
کیا چڑھاتے ہیں کہ کھانے کیلئے جام پہ جام　　اب تو بوئے مے خالص ہی ہے بیگانہ مشام

مے پرستی کا وہ چرچا سحر و شام نہیں
منہ سے بو آتی ہے نشہ کا کہیں نام نہیں

رسم جو جو ترے میخانہ کے تھے بھول گئے　　ادب آداب جو پیمانہ کے تھے بھول گئے
وقت جو جو ترے یاد آنیکے تھے بھول گئے　　سُر ترے راگ کے جو گانے کے تھے بھول گئے

مجلسوں میں یہ ترے ذکر کی پامالی ہے
سوز خانی ہے کہیں اور کہیں قوالی ہے

اک زمانہ تھا کہ میخوار تھے اور تیری دکان　　نشہ کی دھن میں ثنا کرتے تھے تیرا فرمان
جان اور مال سے ہر وقت تھے تجھ پر قربان　　اب وہ مستانہ ادائیں ترے رندوں میں کہاں

اب فقط زینت محفل مے و پیمانہ ہے
طرح مجلس کی فقط رسم قدیمانہ ہے۔

ساقیا کچھ تجھے رندوں کی بھی ہے اپنے خبر
قوم کی قوم کا اب حال ہوا ہے بد سے بدتر

مرض جہل و تعصب کا ہوا ہے یہ اثر
شدت ضعف سے بیکار ہوئے قلب و جگر

گرم مےخواری کی اب بزم کہیں ہوتی ہے
کسی مقدار میں ہو ہضم نہیں ہوتی ہے

ماں کی یاد

سرائے طفولیت میں قمر کا قیام تھا۔ جہاں بےفکری کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اطمینان اور فارغ البالی کی حکومت تھی، سامیری کارخانہ تھا۔ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ یہ سرائے وہ مبارک زمین تھی جہاں رنج و غم پاس آکر بھی نہیں پھٹکتا لیکن قدرت نے قمر کیلئے اس سرائے کو مصیبت کا گھر بنا دیا۔ محبت اور پیار کے ہار جو اس کے گلے میں پڑے تھے وہ مرجھا گئے۔ اسکی فراغت اور اطمینان کا باغبان جو خوشی اور خرمی کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ اس سے ہمیشہ کیلئے منہ موڑ گیا لیکن ہاں ایک آخری نشانی قمر کے لئے چھوڑ گیا۔ اور وہ ستم کش قمر کے بچھڑے ہوئے باغبان یعنی ماں کی تصویر تھی۔

قمر اب سن رشد کو پہنچگیا ہے۔ ماں کی تصویر کو ہاتھوں میں لئے اس پر نظریں دوڑا رہا ہے۔ طائر خیال اس کا پروانہ کر رہا ہے مختلف خیالات اس کے دل میں تصویر بنکے آتے ہیں اور تمنا بنکے جاتے ہیں۔ آخرکار وہ اپنے خیالات میں ایسا مستغرق ہوتا ہے کہ تصویر کی طرف دیکھتا جاتا ہے اور یوں کہتا جاتا ہے:۔

کاش ان ہونٹوں میں طاقت گویائی بھی ہوتی۔ پیاری اماں تمہارے آخری دیدار کے بعد سے زندگی مجھ پر کٹھن گذر رہی ہے۔ اماں جان یہ ہونٹ تمہارے ہیں۔ ہا! یہ تو تمہاری اُس مسکراہٹ کا اظہار کر رہے ہیں جو اکثر عالم طفولیت میں میری تسلی اور خوشی کا باعث ہوتی تھی۔ صرف آواز کی کمی ہے ورنہ زبان حال سے وہ کہہ رہے ہیں کہ "اے میرے پیارے بچے غم نہ کر۔ اپنے افکار و انتشار کو دور کر" (خدا اس فن میں برکت دے جس نے کہ زمانہ کے برباد کرنے والے دعوے کو ہیچ ثابت کر دکھایا۔ جو اسے برباد کرنے کے درپے تھا) دیکھو تو ان پیاری آنکھوں کی پتلیاں ابتک اسی چمک کے ساتھ مجھسے محبت کا اظہار کر رہی ہیں +

اے میری پیاری ماں کی سچی یادگار! تو مجھے اشارہ کر رہی ہے کہ ایک سچی اور خلوص سے بھری نظم سے اپنی اچھی ماں کی عزت افزائی کروں میں اس حکم کی تعمیل کیلئے صرف راضی ہی نہیں ہوں بلکہ میں اسے نہایت خوشی کے ساتھ انجام دونگا اور یہ سمجھونگا کہ یہ حکم خاص میری اماں جان کا ہے۔ اور جب اس رُخ زیبا کی یاد مجھے ستاتی ہے۔ تو طائر خیال میری تسکین کے واسطے مجھے تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسے بحر تخیل میں غوطہ کھلاتا ہے کہ اے تصویر میں یہ سمجھنے لگتا ہوں کہ تو ہی پیاری ماں ہے +

میری اچھی اماں جب کہ میں نے سنا کہ تم مر گئیں میں نے آنسوؤں کا دریا بہا دیا تھا۔ کیا تمہیں اس کی خبر تھی؟ پیاری ماں تمہاری روح اس وقت تمہارے اس بدنصیب بیٹے پر منڈلا رہی تھی جس کے حصہ میں ابتدائے سفر زندگی سے ہی غم و رنج پڑا۔ شاید تم نے میرا ایک غیر محسوس پیار لیا ہوگا۔ اور اگر بہشت سدا سکھ میں رہنے والی روحیں روتی بھی ہیں تو تم نے شاید کشتی چشم سے آنسوؤں کے موتی بھی مجھ پر نثار کئے ہونگے۔ افسوس وہ ماں تا کی مسکراہٹ خواب و خیال ہو گئی +

امی جان تمہارے لاشہ کے اٹھنے پر جو صدائیں بلند ہوئیں وہ میں نے سنیں۔ اہل عزا کو ماتمی لباس پہنے تمہارے جنازے کے پیچھے پیچھے جاتے دیکھا۔ افسوس میرا ننھا سا دل یہ

باتیں دیکھ کر کڑہنے لگا۔ بیٹھ گیا۔ اور میں نے اپنے دل سے بے اختیار ہوکر کھڑکی سے گردن باہر نکال دی اور ایک آہ سرد بھر کر اپنی پیاری ماں پر چشم پرنم سے ایک الوداعی نظر ڈالی اور کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ لیکن کیا سچ مچ یہ الوداعی نظر تھی ؟ تھی اور ضرور تھی۔ کیونکہ اے پیاری ماں اب جہاں تم چلی گئی ہو وہاں الوداع جیسی چیزیں نہیں ہیں +

امی جان! کاش میں بھی تم سے اس سدا سکھ کنارے پر آ ملتا۔ اور تب میرے منہ سے فراق کے الفاظ نہ نکلتے۔ تمہاری لونڈیاں میری بے چینیوں پر بیچین ہو جاتی تھیں اور جب قلب نازک کو بہت پریشان ہوتا دیکھتیں تو یہ دلاسا دیتیں کہ "میرے پیارے بچے نہ رو، میرے لاڈلے بیچین نہ ہو۔ تیری امی تیرے نئے اللہ میاں کے یہاں سے مٹھائی لینے گئی ہیں اور تیرے پاس بہت جلد واپس آ ملینگی" میری امی! چونکہ میں ان ہی باتوں کا متمنی تھا۔ ان باتوں کو فوراً قبول کر لیتا۔ اور جس قدر بیدل ہوتا اسی قدر مجھے دلاسے دیئے جاتے۔ کبھی جو تو بہت پریشان ہو جاتا تو مجھے لیکر دروازے پر جاتیں کہ چلو چلو! دیکھیں تو تمہاری اماں آتی ہیں۔ اس طرح سے روز مجھے امیدیں دلائی جاتیں اور آج سے کل، کل سے پرسوں، پر میری امی کے آنے کا وعدہ ٹلتا رہتا۔ اور بیچین بچے سے مجھے آج اور کل کے پھندے بتائے گئے۔ اور اس طرح بہتیرے آج اور کل آئے اور چلے گئے۔ یہاں تک کہ مجھ پر یہ رباعی صادق آگئی ؎

بہے کب تلک چشم تر جائیگی ۔۔۔ یہ ندی چڑھی ہے اتر جائیگی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز ۔۔۔ ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائیگی

لیکن اے امی جان! اگرچہ قلق روز بروز گھٹتا گیا مگر تمہاری محبت کا نشان ہمیشہ کے لئے کبھی بھی میرے دل سے محو نہیں ہوا۔ سپہر کج نہاد کی گردش سے، زمانہ کے انقلابات سے ہزاروں باتیں ظہور میں آئیں اور میرے گوشۂ دل میں کچھ دنوں تک بس بسا کر معدوم ہو گئیں لیکن تمہاری مامتا کا اثر اور تمہاری مہربانیوں کا نشان باوجود انقلابات و گردشات کے ابتک خانۂ دل میں چراغ کی طرح روشن ہے۔ رات کو اٹھ اٹھ کر میرے کمرے میں اسلئے

آتا کہ دیکھیں بچہ کی کیا حالت ہے۔ کس حالت میں سو رہا ہے۔ آرام میں کسی قسم کا خلل تو نہیں
تھا۔ مدرسہ جانے کے پہلے مجھے صبح کو مٹھائیوں کا دینا اور خود اپنے دست شفقت سے تازہ
اور صاف شفاف پانی لیکر میرا منہ ہاتھ دھلوانا۔ یہ سب کچھ یاد ہے۔ اب جب میں بے پروا ہوں
یہ سب باتیں مجھے یاد آ آ کر ستاتی ہیں :؎

کوئی بھی اب کھانے پینے کے لئے ‏‏ منتیں کرتا نہیں دو دو پہر
اب منانے والا ہی بیٹھا ہے کون ‏‏ میری اماں کس پہ بیٹھوں روٹھ کر
بال الجھے ہیں تو اب الجھے ہی سہی ‏‏ گرد رخ پہ ہے تو ہووے جس قدر

یہ سب باتیں تو ہیں ہی لیکن سب سے بڑھ چڑھی یاد اس حالت کی ہے جس حالت میں تمہاری
محبتوں کا اظہار مجھ پر ہوا کرتا تھا۔ تم مجھ پر غصہ ہوتیں۔ ہزار خفگیاں سناتیں لیکن جب بھی نگاہوں
سے آنکھیں چار کرتا مسکرا دیتیں اور یہ کہکر کہ دیکھو خبردار ایسا پھر نہ کرنا کلیجے سے لگا لیتیں۔ امی
جان! کتب خانہ دماغ کے ہر ورق میں یہ باتیں جلی قلم سے رقم ہیں اور دم واپسیں تک ان ورقوں
تک کیڑوں کی رسائی نہیں ہونے کی ؀

کاش زمانہ اپنی رفتار بدل دیتا اور مجھے وہ گھڑی پھر دیکھنی نصیب ہوتی جبکہ میں تمہارا
دامن پکڑ پکڑ کر کھیلا کرتا تھا۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر جہاں تہاں کیا کرتا تھا۔ پیاری
اماں سچ بتاؤ اس وقت مجھے ہنستا کھیلتا دیکھکر تم کس قدر خوش ہوتی تھیں۔ پیار سے بولتی تھیں
میرے سر پر دست شفقت پھیرتی تھیں اور جب منہ تکنے لگتا تو مسکرا پڑتی تھیں۔ آہ! کاش!
میری ایک آہ اس خوش گھڑی کو لا سکتی! لیکن کیا اگر میری خواہش کے مطابق اسوقت
کا واپس ملنا ممکن بھی نظر آئے تو کیا مجھے اس کی طلب میں کوشاں ہونا چاہئے؟ نہیں! نہیں!
میں ایسی خواہش کے پوری ہونے کا متمنی نہ ہوں گا نہیں بلکہ اس قسم کی خواہش ہی نہ کرونگا
کیونکہ پیاری اماں اگر وہ وقت واپس آگیا اور تم بھی یہاں آگئیں تو گویا تمہاری آسمانی آزادی
دنیاوی قید سے بدل جائیگی اور میں اس حالت میں تمہارے لئے خوشی کا نہیں بلکہ آفت

کا باعث ہونگا +

اے اماں تم نے تو اس تیز رفتار کشتی کو بھی ماند کر دیا جو لاکھوں موجوں کو زیر کرتی ہزاروں طوفان کا سامنا کرتی اور ساتوں سمندر پار ہو کر ایک ایسے بندرگاہ میں جا پہنچی ہو جہاں کہ ہر طرح کی چہل پہل ہو۔ جہاں سدا بہار ہو۔ تمہاری کشتی سفر کا! وہاں کچھ ایسا با اثر نکلا کہ تمہیں دم کی دم میں ساحل فانی سے اس ساحل جاودانی کو اڑا لیگیا جہاں نہ مصیبت کی موجیں تھپیڑے مارتی ہیں۔ نہ آفات و بلیات کے جھونکے بہتے ہیں۔ یہیں تک نہیں بلکہ تم نے تو چلتے چلتے آبا جان کے کان میں بھی نہ معلوم کیا پھونک دیا' یا شاید انہیں بھی چل چلاؤ کے وقت اس ساحل کی جھلک دکھائی دی کہ وہ بھی ساتھ ہی سدھار گئے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بحر انکار کے پار ہو گئے +

لیکن آہ! جب میں اس کنارۂ امن کی طرف کا رخ کرتا ہوں اور کشتی حیات پر دنیائے دوں کو دکھانے کے لئے الوداعی جھنڈا لٹکانا چاہتا ہوں تو موجیں تھپیڑے مار مار کر اس کے کنارے لگا دیتی ہیں۔ اور جب کبھی میں بحر زندگی کو پیر کر کے اس چین و آرام کے گھاٹ پر پہونچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہوں تو مصیبتوں اور آفتوں کے گھڑیال اپنی بھیانک صورتیں دکھا دکھا کر مجھے مبہوت کر دیتے ہیں۔ آہ! میرے لئے وہ چین کا گھاٹ نہیں۔ خیر نہیں ہے تو نہیں سہی۔ لیکن جب مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ میری پیاری اماں اور اچھے ابا دار القرار میں آرام سے بسر کر رہے ہیں۔ تو میری تسلی ہو جاتی ہے اور پھر ہر مصیبت و آفت کیلئے سینہ سپر ہو جاتا ہوں +

خیر پیاری اماں! خدا حافظ! زمانہ نے اپنی چال چلی تو ضرور۔ لیکن میری خواہشیں بغیر تمہارے آرام میں کسی قسم کی مداخلت کئے پوری ہو گئیں۔ قوت متخیلہ سے میں نے وہ پا لیا جو میرے دل میں بسی تھی۔ اس استغراق سے تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں پھر سراسر طفولیت میں کھیل رہا تھا۔ اور بچپن کی خوشیوں کا بادشاہ تھا۔ اور جب تک میرے طائر خیال میں پرواز کی طاقت رہے گی اور یہ تصویر میرے ہاتھوں میں۔ مجھے ان

خوشیوں کے حاصل کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوگی۔ زمانہ نے تمہاری چوری کی تو ضرور۔ لیکن وہ اپنی چوری میں پورے طور سے کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ تمہیں لیجانے کو تو لے جا سکا لیکن تمہاری سکون بخش قوت اور تسلی وہ طاقت اب تک میرے دل و دماغ میں موجود ہے۔ حامد

مدینہ کا سفر

(از جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی)

اللہ اللہ مری قسمت کہاں لائی دیکھو
بعد مدت میری امید بر آئی دیکھو

ناخن بخت نے کی عقدہ کشائی دیکھو
در جاناں پہ ہوئی آج رسائی دیکھو

سامنے گلشن طیبہ جو نظر آتا ہے
غنچۂ خاطر پژمردہ کھلا جاتا ہے

آج ہے سامنے آنکھوں کے وہ دلکش منظر
فرط شادی سے مرے بس میں نہ دل ہے نہ جگر

للہ الحمد مٹے دل سے سب آلام سفر
بن گئے خلد خس راہ گل تازہ و تر

روح تو چاہتی سینے سے نکلنے کے لئے
شوق کہتا ہے مجھے دوڑ کے چلنے کے لئے

پیشوائی کو مری آئے ہوائے جنت
تاکہ آغوش محبت میں سلائے جنت

اب نہیں جچتی نگاہوں میں فضائے جنت
گرچہ رضوان مجھے سو بار دکھائے جنت

کھب گئی ہے مری آنکھوں میں بہار طیبہ
باغ فردوس سے بڑھکر ہے دیار طیبہ

اپنی امت کیلئے رنج اٹھانے والے　اور گنہگاروں کو دوزخ سے بچانے والے

رخ انور سے نقاب آج اٹھادو آقا

اپنا جلوہ مجھے للہ دکھادو آقا

ہوں مصیبت میں مدد کو مری آؤ شاہا　درد کی تم ہو دوا اگر ہی بنا ؤ شاہا

تشنہ ہوں حسرت دیدار پلاؤ شاہا　راہ بھولا ہوں مجھے راہ بتاؤ شاہا

چھوڑ کر آپ کی چوکھٹ کو تنا جائے کہاں

در اقدس کے سوا سر کو یہ ٹکرائے کہاں

یا نبی آپ پہ قربان ہوں سودا ہے یہی　دشت طیبہ میں ہو مسکن مرا سودا ہے یہی

در پہ حاضر رہوں تا زیست ارادہ ہے یہی　ہو مرا خاتمہ بالخیر تمنا ہے یہی

چشم رحمت سے تمہارا جو اشارا ہو جائے

بحر عصیاں سے مرا پار سفینا ہو جائے

غزل

دل مرا بندۂ تسلیم و رضا ہو جائے　یا الٰہی مری مقبول دعا ہو جائے

یہی خواہش یہی ارماں یہی حسرت ہے　مری ہستی تری الفت میں فنا ہو جائے

قیس کی طرح بھٹکتا نہ پھروں جنگل میں　یاد منزل کی مری راہ نما ہو جائے

لطف اس راہ کا ناصح کوئی ہم سے پوچھے　شاہ بھی ہو تو محبت میں گدا ہو جائے

مجھکو ساقی ترے مینا و سبو کا صدقہ　مجھ پہ بھی ایک نظر ہوش ربا ہو جائے

اے فلک کیا ترے نزدیک یہی ہے انصاف　ہم ترستے ہیں غیر دل کا بھلا ہو جائے

پھر تو جینے کا مزا ہی نہ رہے دنیا میں

آپ کی یاد جو ہاتف سے جدا ہو جائے

(ہاتف)

حُسن کے فریادی

اے فراق کے بھڑکتے ہوئے شعلو۔ اے کسی کے حسن عالم سوز کی کوندتی ہوئی بجلیو۔ میں تم کو بجھاؤنگا اور خونابہ دل کے ابلتے ہوئے سمندروں میں بہا دونگا۔ اے عشق کے زہریلے مادے۔ اے آتش سیال۔ اے شہنشاہ حسن کے کمانڈران چیف ہر چند کہ میری سلطنت جسمانی پر تیرا پورا پورا اقتدار ہو چکا ہے منشا روحانیات یعنی میرے نازوں کا پالا دل تیرے سلطان کا دارالسلطنت بن چکا۔ وہ مضبوط اور گرانقدر بلکہ پراسرار دماغ وجگر کے قلعے جن کو معمار قدرت نے غیر معمولی استحکامات سے تیار کیا تھا صرف تیری ایک نظر غلط انداز بلکہ محض جنبش ابرو سے پاش پاش ہو چکے سلطنت کا شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا۔ ارکین سلطنت حافظہ حس مشترک واہمہ متخیلہ سب کے سب ویران وبرباد ہو چکے۔ وزیر اعظم عقل کے ہاتھوں سے زمام سلطنت چھوٹ چکی لیکن کچھ پروا نہیں مطلق خوف اور اندیشہ نہیں۔ کیا معزول ہونے کے بعد میرا اتنا بھی اقتدار باقی نہیں رہا نہیں نہیں ہے اور ضرور ہے۔ میں اس دارالسلطنت دل کو کیوں نہ نیست ونابود کردوں۔ ابھی میرے پاس زمین وآسمان کے قلابے ملا دینے والی۔ عرش کے کنگرے ہلانے والی ایک طاقت موجود ہے۔ اور ضرور موجود ہے۔ اگر دنیا کی تمام قوتیں ایک طرف ہو جائیں جب بھی کچھ خوف نہیں۔

ڈر ڈر اے کافر خود پرست قدرت نما حسن ڈر میری اس بیکسی کی آتش فشاں آہوں سے جن سے کسی دن دامن ہستی میں آگ لگجائیگی حذر کر ان دکھ بھری فریادوں سے جن سے خون کی چھینٹیں اڑ اڑ کر تیرے دامن ستم کو محضر شہادت بنا دینگی۔ کیا تجھکو یہ خیال ہے کہ میری حسرت آمیز مظلومی اور عبرت آگیں بیگناہی کی بازپرس تجھ سے نہیں کی جائیگی نہیں نہیں کی جائیگی اور ضرور کی جائیگی۔ ایک روز وہ بھی؟ [illegible] الست کہ تمام ظلم اور جور کی مضبو

دنیا میں بالکل نیست ونابود ہوگی۔ یہی فراق کی کالی کالی بھیانک رات۔ یہی ہو کا عالم۔ یہی
قیامت خیز اداسیاں۔ یہی عالم یاس۔ یہی عالم تنہائی۔ یہی عالم دم واپسیں۔ یہی جھلملاتی
ہوئی شمع۔ اے جان قیامت۔ اے ظلم وستم کی جیتی جاگتی تصویر یاد رکھ یہ سب کے سب
عرصہ محشر میں مجھ بیکس کے گواہ ہونگے۔ دست بیکسی میں دفتر ہائے فراق ہوگا۔ خون
ناحق میں ڈوبی ہوئی حسرتیں تری منہ جور وستم کی مظہر ہونگی۔ یہ رنگ مظلومی میں ڈوبے ہوئے
نالے فریادیوں کے وردی لباس میں جن کو آغوش فنا نے امانت رکھ چھوڑا ہے ظاہر
ہونگے۔ اور عرش کے کنگوروں میں لپٹ لپٹ کر داد خواہ ہونگے۔ کیا ظالم اس دن بھی یہ
تری زہر آلود کلیجہ برمانے والی نگاہیں شرم سے نیچی نہ ہونگی۔ کیا یہ دست ستم جس نے ہزاروں
منتوں سے پلی ہوئی حسرتوں کا کمال بیدردیوں سے گلا گھونٹ ڈالا ہے تیغ جفا
سے خالی نہ ہوگا۔ کیا یہ کافر بنا دینے والی ادائیں اپنی کرشمہ سازیوں کے قدیمی چلن پر قائم
رہ سکیں گی۔ کیا کسی حرماں نصیب کے بستر مرگ پر عالم بیکسی میں تڑپ تڑپ کے دم توڑنے
کا موقعہ چشم فلک سے محو ہو جائیگا۔ کیا ظالم مظلوم کے تعلقات میں قدرت کا انصاف کچھ
محاکمہ نہیں کریگا۔ کیا وہاں بھی دنیا والے وہی کہیں گے۔ جو تری جنبش ابرو کا
اشارہ ہوگا۔

مگر نہیں نہیں۔ اے بیدرد خود پرست ظالم حسن تجھکو تو خود دعوئے خدائی
ہے۔ تری تو ہر ہر ادا پر ہزاروں قیامت کے لیے فتنے نچھاور ہوتے ہیں۔ تری
تو ہر نظر غلط انداز میں ہزاروں محشرستان مضمر ہیں۔ تجھکو تو آزاد مادہ پرستوں نے یہ
یقین دلا رکھا ہے کہ خدا درحقیقت ایک واہمہ ہے ایک تخیل فاسد ہے ایک معنی خیز
مغالطہ ہے ایک جہل مرکب ہے۔

یہ جو کچھ ہے سب تیرا ہی فیضان ہے۔ یہ دنیا دنیائے مادیات ہے سب فیضان
مادہ ہے اسی کی ہنگامہ آرائی ہے نہ قیامت کوئی چیز ہے نہ روز حساب۔ فنا ہونے

کے بعد نہ کوئی ظالم ہے نہ مظلوم نہ ضرورت تلافی مافات نہ خوف بازپرس اس عالم کی
خدائی تیرے ہی لئے زیبا ہے۔ وہی عین انصاف ہے جو تری نگاہ فیصلہ کن طے کردے
وہی فلسفۂ اخلاق ہے جو تیری خودداریاں تعلیم دیں۔ وہی قانون عمل جو تیرے تازہ کرشمے
مقرر کردیں۔ واقعی خوف ہو۔ کیا جب اس عالم کا خالق مادہ ہے اور وہ بے شعور وارادہ
ہے۔ پھر جفاؤں کا نگران کون ستموں کی بازپرس کس سے۔ وعدے خون دل کس کی
عدالت میں۔ اُف اُف رحم اے الحاد کی بنیاد ڈالنے والو رحم صرف اسیران محبت کے
حال پر نہیں بلکہ تمام دنیا پر ترس کھاؤ۔ اس چلتے ہوئے جادو (حسن) کی آتش مزاجی
میں یہ غیر معمولی اضافہ نہ کرو۔ للہ نکرو۔ مادہ جیسی بے شعور وارادہ شے کو تم کائنات
کا خالق سمجھتے ہو یہ غلطی ایک غیر معمولی غلطی ہے۔ ہر چند کہ اب فیضان حسن اور عنایت عشق
سے میرے تمام قوائے دماغی معطل ہیں حواس معطل اور ادراکات کمزور حافظہ ضعیف
خیالات پریشان ایک بھرے پورے گھر (دل) کی ویرانی پیش نظر ہے۔ لیکن پھر بھی اس
خیال کی رکاکت میرے منہ سے مہر سکوت زبردستی توڑتی ہے اور میں مجبور ہوتا ہوں
کہ مادہ پرستوں سے یہ دریافت کروں کہ جبکہ ایک غیر محسوس اور غیر مدرک شے پر صرف
اس وجہ کو ملحوظ رکھکر کہ اس کے متعلق تمہارے احساسات اور ادراکات کمزور ہیں۔
یقین کیا بلکہ قیاسی اور امکانی طریقہ سے بھی کوئی حکم کرنا مسلک شریعت عقل کے خلاف
سمجھتے ہو تو پھر اس بے شعور و ارادہ غیر محسوس اور غیر مدرک (مادہ) کو کیونکر خالق
کائنات اور موجد عالم مانتے ہو۔ کیا صرف اس لئے کہ دنیا ظلم و ستم کی بنیادیں مضبوطی اور
غیر معمولی استحکام حاصل کرلیں یا اس لئے کہ خالق حقیقی کا دستور العمل منشار ستم کے خلاف
تعلیم دیتا ہے۔ یا اس لئے کہ مزاج حسن کا پارہ اپنی موجودہ شخصیت سے بھی متجاوز ہو جائے
اور اس غیر معمولی طریقہ سے بھی گذر کر عاشقوں کے شیرازۂ ہستی کو خاک کرے اور خاک بھی
برباد کردے تاکہ مر مٹوں کی یادگار قایم ہونے کی کوئی صورت بھی باقی نہ رہے۔ اے کفرکہ

طوفان اٹھانے والو واقعی اگر مادہ موثر بخالق ہوتا تو آج عالم میں یہ ہیچ درہیچ یہ پاکیزہ انتظام اس نفاست کا پیارا تناسب جو درحقیقت فلسفہ حسن ہے کیونکر پایا جاتا - اور آج تمہاری شعلہ آمیز تحریکوں سے حسن معنی خدا کیونکر ہو سکتا سلسلہ علل و معلول میں یہ غیر معمولی انتظام و ترتیب یہ ادراکات انسانی سے بالاتر تناسب تمہارے مادہ کے ایسے بیکار محض بے شعور غیر مختار خدا کا کام نہیں ہے - یہ دراصل حکیم علی الاطلاق کی طاقت الہی ہے - یہ خالق کائنات مدبر عالم وحدہ لاشریک کا فیضان ہے اگر غلط ہے تو بولو بولو - جواب دو انصاف کا خون نکرو جسطرح سلسلہ علل و معلول سے تم انکار نہیں کر سکتے اسی طرح مادہ کے بے شعور اور بے ارادہ ہونے کا تم کو اقرار ہے پھر بتاؤ کہ یہ ترتیب اور تناسب کیونکر پیدا ہوا - اگر تم بھولتے ہو تو میں تمہارے مسلمات تم کو یاد دلاتا ہوں - کیا تم اس ترتیب کے قائل نہیں ہو کیا تم اپنے ان مسلمات سے اس وقت انکار کرنے کی جرات کر سکتے ہو - تم اس کی توضیح کر چکے ہو تم یہ تحقیق کر چکے ہو تم اس پر کافی طور سے روشنی ڈال چکے ہو - کہ تمام روح سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کا وجود پانی کے وجود پر موقوف ہے اور پانی کا وجود اس کے دونوں جزوں ہیڈروجن اور آکسیجن پر موقوف ہے اور ان دونوں جزوں کا وجود (اجزا) مادہ کے موجود ہونے پر موقوف ہے - سچ بتاؤ تمہیں ایسے وجود معطل کی قسم اس ترتیب اور ان تعلقات کا پیدا کرنا ایک حکیم مطلق اور مدبر عالم کا کام ہے یا اس جاہل بحت مادہ کا فعل ہو سکتا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار

اے ظالم حسن والے بیدرد حسن لے ہوا سے کبر و نخوت میں بھرے ہوئے حسن - ذرا دور آنے والی ساعتوں سے ڈر - اس وقت کا یقین جان جب خالق کائنات عالم الغیب مدبر حقیقی تجھ سے اپنی عدالت انصاف میں ان بدنصیب عاشقوں کی بیدردیوں کے ساتھ خاک میں ملا دینے والی ہستیوں سے سوال کریگا - ان کے خون کی ہر بوند سمندروں کی طرح جوش کھاتی ہوئی ابلے گی - یہ سب کشتہ حسرتیں مجسم ہو کر فریاد کی زبانیں کھولیں گی - ارمانوں کا جمہرمٹ فریادیوں کے لباس میں ستون بارگاہ انصاف کو ہلا دیگا -

دل ناسور زدہ اپنا زبردست محضر شہادت پیش کریگا۔ مایوسیاں اپنی عبرت ناک نامیوں کے مرقعے پیش کرینگی۔ اُداسیاں اہل محشر کی نگاہوں کو ہمدردیوں کے سمندر میں غوطہ دیکر اپنا طرفدار بنالیں گی۔ ارے ارے نبض نبض بند رکنے والی زبان پھر کلیجہ میں ہوک اُٹھی زبان لڑکھڑا تو نہیں سلب ہو چلیں۔ اچھا اچھا اے دنیا اور دنیا والو اب اُسی عدالت انصاف میں ہمارا تمہارا فیصلہ ہوگا +

آشفتہ لکھنوی

سائنس کے کرشمے

پروفیسر گھوشال ایم۔ اے۔ ایم۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایف۔ ایس۔ اے۔ لندن ناظم کتب خانجات ریاست بھوپال کے مضمون کو درج کرنے کا آج تمدن کو فخر حاصل ہے۔ آپ بنگال کے ایک ممتاز خاندان کے رکن ہیں۔ ڈاکٹر کرنل کے۔ پی گپتا۔ آئی۔ ایم۔ ایس آنجہانی سنٹری کمشنر گورنمنٹ بنگال کے داماد ہیں اور سر ایس۔ پی سنہا کے قریبی عزیز۔ آپکی علمی قابلیت کی نسبت کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کئی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور کئی کالجوں کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ آپ کو بنگالی ہونیکے بھی اردو زبان سے جو کچھ شغف ہے وہ آپ کو ملک سے کافی روشناس کرا چکا ہے چنانچہ گذشتہ اجلاس اردو کانفرنس میں آپ کے ایک مضمون نے لوگوں کی حیرت کو اس وجہ سے اور بھی زیادہ کر دیا تھا کہ آپ ایک بنگالی نژاد ہیں۔ پروفیسر صاحب کے علمی اور سائنٹفک مضامین ملک میں مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور اب امید ہے کہ آپ "تمدن" کو بھی اپنے "جواہر افکار" سے مستفید فرماتے رہیں گے۔ اس مضمون کو شائع کرتے وقت ہم "تمدن" کے خاص کرمفرما جناب ابوالمظفر صنور نعیمی صاحب دہلوی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری خیال کرتے

ہیں جن کے توسل و کوشش سے ہمیں یہ مضمون حاصل ہوا ہے۔ ایڈیٹر

آج کل یورپ نے ایک زمانہ کو اپنے "اعجاز سائنس" سے دنگ کر رکھا ہے ستاروں
کو اپنی عقل کی ترازو میں تول لیا ہے۔
مادہ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے جواہر فردہ کو بھی دریافت کر لیا ہے۔
اور ایتھر کو تو اپنا تختہ مشق بنا لیا ہے
خط و کتابت کیسی بے تار کی پیغام رسانی کر لیتا ہے
فاصلۂ بعید سے نہ صرف آواز سنتا ہے بلکہ تصویر بھی اتار لیتا ہے
اور تصویر بھی کیسی کہ گوشت پوست کے اندر کی ہڈی گودے کا فوٹو کھینچ لیتا ہے
اور رنگین عکسی تصویر بنانا تو اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے
زمین کے نیچے بھی وہ اسی آسانی سے ریل چلاتا ہے جیسے پہاڑوں کے
اندر چلائی ہے۔
دو لائن پر ایک سو بیس میل فی گھنٹہ ریل چلانا اُس کے لئے ایسا ہی آسان ہے
جس طرح ایک لائن پر
ہوائی جہاز جو کبھی ہم قصہ کہانیوں میں سنا کرتے تھے آج ان کو اڑا کر دکھانا
کیا معنی، بلکہ ان کے ذریعہ سے بم اور گولے برسا رہا ہے۔
اور بری لڑائیوں میں نہ صرف پچاس میل کے فاصلے سے گولہ باری
کرتا ہے۔
بلکہ لوگوں کو شعلوں اور زہریلی ہوا سے بھی ہلاک کرتا ہے
سطح آب پر جہاز رانی کیسی بلکہ آب دوز جہاز چلا کر بحر بحار تجارتی جہازوں کو آن واحد
میں غرق آب کر دیتا ہے۔ اور برقی قوت کو تو اوس نے اپنی ایک خانہ زاد کنیز
بنا لیا ہے۔ زمانہ حال میں ایک ایسی چیز بھی معلوم کر لی ہے جس کا ہر فردہ سالہا سال

تک بغیر گھٹے بڑھے گرمی اور روشنی خارج کرتا رہتا ہے۔ اور سنئیے! اب دعوے یہ ہے کہ سورج کی گرمی سے ریل چلائے گا۔ مگر برسات میں شاید بند رہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ایک دن اس چیز کو بھی پیدا کریگا جس کا نام حیاۃ ہے۔ اس پر بھی کہا جاتا ہے کہ سائنس کی چڑیا نے اسرار قدرت کے سمندر سے ابھی صرف چونچ بھر پانی پیا ہے۔ خدا جانے جس دن یہ چڑیا گھونٹ بھر پانی پی ے گی تو کیا قیامت ہوگی! گھبرائی! ہم تو ایشیائی ہیں ذرا ہم کو اوربھی دھیان کرنا چاہئیے کہ سائنس نے اپنی اس حیرت انگیز ترقی کے ساتھ کسی رازدہر کا پتہ بھی چلایا یا نہیں" اور آخر

گزشتہ صدی میں یوروپ نے دینیات کے متعلق کیا کیا؟

اس باب میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ خود اہل یوروپ کے خیالات کا آئینہ آپ کو دکھاتے ہیں۔

سائنس اور رازدہر

مسئلہ انتباہ | زمانۂ حال کے مشہور ہیئت داں پراکٹر کا قول ہے کہ بڑے بڑے عقلائے دہر اب تک حیران ہیں اور کچھ فیصلہ نہ کرسکے کہ ستاروں کا باقاعدہ نظام اور اس کا باہمی فرق مراتب کیونکر عمل میں آیا۔

ماہیت اشیاء | خود ڈاروِن کا قول ہے کہ اشیاء کی ماہیت کا مسئلہ حل کرنے سے ہم عاجز ہیں۔

اسرار حیات | ہکسلے کا قول ہے کہ مجھے آغاز حیات کا پتہ نہیں چلتا اور ڈرمنڈ کلارک کہتا ہے کہ ہم جس قدر علمی ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر اسرار کائنات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ ؎

بڑھتا جاتا ہے جس قدر علم بشر کرتے جاتے ہیں شک خیالات میں گھر

ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی فضا جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر

ماشاء اللہ کیا سمجھایا ہے۔ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"!

یوروپ اور دینیات

اب رہی دینیات سو گذشتہ صدی میں یوروپ نے دینیات کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس پر ایک مختصر تبصرہ کے بعد ہم خود مشاہیر یوروپ کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ یوروپ کی علمی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کا خاص علمی اثر انگلستان پر ۱۸۵۱ء سے لیکر ۱۸۷۵ء تک بہت زبردست پڑا۔ اس وقت جرمنی کا مشہور دہریہ پروفیسر ہیکل تھا جو آج بھی زندہ ہے۔ انگلستان میں پروفیسر ہکسلے اور ہربرٹ اسپنسر موجود تھے۔ سوسائٹی کے نوجوان انہیں سائنس دانوں کے خیالات سے متاثر ہو رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں یہ نئی روشنی چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ ان کے دل نئی تحقیقات اور پرانی معلومات کی کشمکش سے بے قرار تھے۔ سچ تو یوں ہے کہ انگلستان میں ۱۸۵۰ء میں یہ خیال کر لیا گیا تھا۔ کہ اب علم و فلسفہ کے باریک سے باریک مسائل اور حفظان صحت کے معمولی سے معمولی مسائل پر سائنس نے اپنی بحث و تحقیق ختم کر دی۔ اسی دوران میں ڈارون کی معرکۃ الآرا کتاب ارتقاء انسانی کے مسئلہ پر شائع ہوئی۔ اصل الانواع (نام کتاب) کے شائع ہوتے ہی سوسائٹی میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ اور ہزارہا روحیں یک بیک خدا سے جدا ہوگئیں +

ان جدید معلومات کی روشنی کی بھڑک سے بہتوں کے دلوں پر ایسی تاریکی چھا گئی کہ وہ سب کے سب ضلالت و گمراہی کے تاریک گڑھے میں گر پڑے +

اور ان کے نزدیک خدا پر یقین کرنا مجذوبانہ الحواس تخیلات کے سڑیل خیالات سے تعبیر کیا گیا۔ آسمان کا خدا اور کسی قدرت علت العلل کو خدا ماننے کا وجود معطل کر دیا گیا۔

اور یہ سمجھ لیا گیا کہ علم کی روشنی نے ان بیہودہ توہمات سے دنیا کو پاک کردیا۔ جب خود خدا کا وجود ہی معطل کردیا گیا تو "الوہیت" ایک بیہودہ خیال مانی گئی۔ اور دعا و عبادت جاہلوں کے خوف اور ڈر کا نتیجہ سمجھا گیا۔ ایسی حالت میں "نبوت" دھوکے کی ٹٹی ہوگئی۔ پھر تو وحی کا افسانہ بن جانا تعجب خیز بات نہ تھی۔ اور الہام تو گویا خواب و خیال ہوگیا۔ روح فانی سمجھی گئی۔ اور قیامت ایک خیالی ڈھکوسلا۔ ایسی اندھیر نگری میں نیکی۔ بدی۔ عذاب۔ ثواب انسانی اوہام قرار پائے۔ لہٰذا جنت دوزخ بھی مذہب کے لغت سے خارج کئے گئے ابعد موت نہ جزا۔ نہ سزا۔ غرض کہ دہریت کے سمندر کی یہ موجیں سوسائٹی کے کنارے تک آ آکر اس زور سے ٹکرانے لگیں کہ قریب تھا کہ مذہب کی دیوار ٹوٹ کر بہہ جاتی۔

چنانچہ اس زمانہ کے شعرائے انگلستان سوئین برن اور مارس کے شاعرانہ خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس کا کتنا خطرناک اثر سوسائٹی پر پڑا۔ یہ حالت تو صرف ایک ملک کی بطور نمونہ مشتے از خروارے آپ صاحبوں کو دکھائی گئی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت یوروپ میں عام طور پر یہی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ اور آج بھی یہ مرض یوروپین سوسائٹی کو لاحق ہے اور اس کا اثر بہت کم زائل ہوا ہے۔

چنانچہ گذشتہ صدی میں یوروپ نے جو کچھ دینیات کے متعلق کیا ہے اس کا تذکرہ خود ہیکل کی زبان سے سن لیجئے۔ یہ مشہور سائنس دان کہتا ہے کہ

"اخلاق اور معاشرتی زندگی کے لحاظ سے ہم نے گذشتہ صدیوں کے مقابلہ میں بہت کم یا معنی کچھ بھی ترقی نہیں کی بلکہ بعض اوقات ہم نے خطرناک رجعت قہقری کی ہے"۔ (سائنس دانوں کا خیال)

اسی ضمن میں انگلستان کا بہت بڑا ماہر سائنس ڈاکٹر ویلیس کہتا ہے۔ "ہم اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے نااہل ثابت ہوئے جس تہذیب پر ہم کو ناز تھا وہ دھوکے کی ٹٹی نکلی۔ ہمارا نظام حکومت نہ دین مسیح کے مطابق ہے

نہ تمدن و تہذیب کے موافق۔ ہم اپنے قول کی تائید میں اس صدی کی یورپین جنگوں کو پیش کرتے ہیں۔ جو صرف قومی درازدستی کے سبب ظہور میں آئیں۔ ”کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مقابل کے آداو کرنے یا مظلوں کے داو دینے میں اپنا مطلب پیش نظر نہ رکھا گیا ہو“۔

فلاسفروں کی رائے | پروفیسر یوکن اسی موضوع پر اپنی کتاب ”مجموعہ مضامین“ میں لکھتے ہیں کہ ”موجودہ معاشرت کی انسانی زندگی کا ہر شعبہ ترقی پذیر حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس ترقی کی تہ میں باطنی سکون اور اندرونی اطمینان بالکل مفقود ہے۔ نظام حیات کے سلسلے کی ہر کڑی آپس میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور یہی تضاد و تخالف آجکل ہماری باہمی کشمکش زندگی کا باعث ہے۔

موجودہ حالت کے لحاظ سے ہمارے اخلاقی جذبات کی کیفیت ایسی نازک ہو گئی ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے سچے اخلاق کے نہ ہونے سے ایک ہستی دوسری ہستی کے مٹانے پر آمادہ ہے تمدنی اور تجارتی سطح پر بھی باہمی کشمکش کا یہ حال ہے کہ انسانوں کو اگر ایک جانب حیات اجتماعی کھینچتی ہے تو دوسری جانب حیات انفرادی اپنی کشمکش دکھاتی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ان متضاد قوتوں کے علاوہ ایک تیسری طاقت اور بھی ہے جو موجودہ تجارتی دنیا اور اس کی خاص حالت کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے یعنی انسانی زندگی کو ایک ”آلہ“ یا ”مشین“ بنا رکھا ہے۔ ہماری روحانی زندگی اور باطنی جذبات کی بنیاد جن اصول و عقائد پر رکھی گئی تھی آج ہماری نظر سے وہ بنیاد ایسی چھپی ہوئی ہے کہ اگر ہم اس کا سراغ لگانا چاہیں تو از سر نو ہمیں تمام روحانی مسائل کی تلاش و جستجو کرنی پڑیگی۔ آج کل دنیا نے یہ جو کچھ مادی ترقی کی ہے اس کی قیمت یہ دی گئی کہ انسان اپنی روحانیت کھو کر افسردہ بن گیا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے۔ کہ روحانیت کے گلے پر مادیت کی کند چھری چل گئی مگر اب لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انسان کی انتہائی مادی کوششوں

اور ترقیوں نے اس کی روحانی و باطنی زندگی میں ذرہ بھر اضافہ نہیں کیا یہی باعث ہے جو یوروپ کی متمدنہ اقوام موجودہ طرز تمدن کو منافرت کی نظر سے دیکھنے لگی ہیں۔ نئی تہذیب نے آدمی کو محنت و مشقت کا ایک آلہ بنا رکھا ہے اور اس خیال نے یہانتک ترقی کی ہے کہ انسان کیلئے کوئی وقت۔ کوئی لمحہ۔ کوئی [illegible] ایسی نہیں جس میں وہ مطمئن ہو کر کچھ غور و فکر کچھ دہیان یا مراقبہ کر سکے ہم لوگوں [illegible] ترقی کی خاطر اپنی تمام روحانی ترقی کو پس پشت ڈال [illegible] یہی وجہ ہے کہ متمدن اقوام میں مایوسانہ خیالات زور پکڑتے جاتے ہیں۔

علم ادب والوں کی رائے

مشہور و معروف مصنف رسکن کہتا ہے

سب سے بڑا کھیل آجکل روپیہ پیدا کرنے کا ہے اور متمول بننے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ ہمارے ہمسایوں کے پاس ہم سے کم روپیہ رہے۔

سود لینے کے بارہ میں ایک جگہ اس نامور مصنف نے کہا ہے کہ سود خوری چوری سے زیادہ برا فعل ہے کیونکہ سود کا بنیادی اصول یہ ہے کہ خود بڑھتیں اور دوسرے گھٹیں۔ مگر یاد رکھیئے وہ دن بہت جلد آنے والا ہے [illegible] اور غریب لوگ اپنے نقصان کا حساب اس شد و مد کے ساتھ کرینگے [illegible] پولیٹیکل نتیجہ [illegible] عالم میں اس کی مثال نہ ملیگی۔ تجارتی یورپ کی تمام [illegible] ہوئی تکالیف کو ممکن نہیں کہ کچھ کا کچھ کر دکھائیں۔ [illegible] اصل حقیقت کو چھپا دیں۔ نہ ان میں [illegible] چھپا ہوا ہے ان کی تردید سے [illegible] کی غربت کا اصل راز کیا ہے تو ایسا انقلاب [illegible]

ہے۔ اور یہ خطرناک وغیر محفوظ حالت نہ صرف عیسائی مذہب کی جڑ تک پہنچی ہے بلکہ اس سے بھی گذر گئی ہے۔ کیونکہ نہ اب انسان پر اعتبار رہا۔ نہ خدا پر ایمان! اور اب یہ عقلی بنا صرف خود اسی تمدن پر لوٹ پڑی ہے جس نے مذہب کی ایسی ظاہری صورت بنا رکھی ہے جو تجارتی خیالات میں انسان کو خدا سے جدا کرے اور اس سے وہ کام لے جو اخلاقی حیثیت سے نہ لیا جائے۔
یہی وجہ ہے جو ہم ٹھوکر کھا کر گر پڑے ہیں۔ ہماری اس موجودہ حالت کی تمثیل یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح چند آدمی ایک ایسے کمرے میں بیٹھے ہوں جس میں ہر لحظہ گرمی بڑھتی جائے اور ان آدمیوں کا یہ خیال ہو کہ شاید کسی وقت وہ بھی کپڑے اتار کر کچھ آرام لینگے۔

مگر اس آرام کے ساتھ اپنی تہذیب کا بھی کچھ کھاؤ ضرور کرینگے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنکی اولاد اب اس نقطہ خیال سے بھی گذر گئی ہے۔ بعض تو برہنگی کی حد پہ پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اکثر اس حد سے بھی بڑھ کر اپنے جسم کی کھال اتار کر پھینکنا چاہتے ہیں اور کچھ تو ایسے ہیں جو بالکل ہی اس کمرے سے باہر نکل پڑے ہیں۔

افسوس! کیا اسی کا نام ترقی ہے؟ ترقی تو ضرور ہے مگر کس جانب؟ آسمان کی طرف یا تحت الثریٰ کو؟

مغربی اور مشرقی تمدن علمی کی تفریق

کیا آپ نے یہ کبھی نہیں سنا کہ قریب قریب کل قدیم متمدن اقوام کی تاریخ سے ثابت ہے کہ جب فلسفہ اور سائنس کے خزانوں پر ان کی دسترس ہوئی تو انسان کی انتہائی سرحد یہ قرار دی کہ وہ صفات ملکوتی حاصل کرے۔

برخلاف اس کے تین صدیوں کی کوشش سے یورپ کے تمدن کی بنیاد تجارت کی زمین پر رکھی گئی۔ اور اس کی غایت صرف یہ رہ گئی کہ اس عالم اجسام میں انسان اس قدر ترقی کرے کہ عالم اور ما فی العالم اس کا مسخر ہو جائے جس کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان آجکل ایک زندہ مشین بن رہا ہے اور بجائے اخلاقی ترقی کے صرف علمی ترقی کا ہر طرف چرچا ہو رہا ہے۔
اگلے زمانے میں تحصیل علم کا مقصد صرف تکمیل نفس تھا۔ اور آج کل سب سے مقدم مادی منفعت کا خیال ہے بقول چکبست لکھنوی

کہتے تھے بُرا زر کو نحن سنج پُرانے — اُن لوگوں کے ہمراہ گئے اُنکے زمانے

وہ فلسفہ و علم و ادب اب ہیں فسانے — بدلا ہے نیا رنگ زمانہ کی ہوا نے

ذرا یوروپ والوں کے دل سے پوچھو کہ باوجود اس آزادی اور دولت مندی کے ان کو اندرونی اطمینان اور قرار و سکون میسر ہے یا نہیں۔ جدہر نگاہ دوڑائیے ایک عالمگیر بے چینی نظر آتی ہے ہر شخص یہی کہیگا کہ وہ پریشان ہے آشفتہ خاطر ہے۔ پھر اس نمائشی راحت سے کیا فائدہ؟

ان مادہ پرستوں سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ کسی اسرار غیبی کا پتہ دینگے جب خود ان کے گھر کی یہ حالت ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں ؎

"او خویشتن گم است کرا رہبری کند"

یہ حصہ ان لوگوں کا ہے جن کی ارواح کو خدائے ذوالجلال نے اپنے علوم مخفیہ کی بصیرت عنایت فرمائی ہے۔

اور جن کے آگے مادی سائنس۔ اور فلسفہ کے منکشفات کسالیہ ہیچ ہیں۔

(پروفیسر) گھوشال (ایم۔ اے + ایم۔ اے۔ آر۔ ایس ایل۔ ایس۔ اے لندن ناظم تعلیمات ریاست بھوپال)

سر رابندرو ناتھ ٹگور

ہمارے کرم دوست جناب حامد اللہ صاحب افسر نے سر رابندرا ناتھ ٹگور پر ایک سلسلہ مضامین "تمدن" کے لئے لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک مضمون ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو بقول جناب افسر صاحب بہت عجلت میں لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ مضامین میں جناب افسر سر رابندرا ناتھ ٹگور کی ذاتی زندگی اور ان کی شاعری کے پہلو پر کافی روشنی ڈالیں گے۔ سر رابندرا ناتھ ٹگور وہ شخص ہے جس نے تمام دنیا کے دل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ اور ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ جو ایک باشندہ سویڈن نے مقرر کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ پرائز کسی ہندوستانی کو نہیں ملا تھا۔ نوبل پرائز دیگر علوم و فنون کے لئے بھی دیئے جاتے ہیں مگر سر رابندرا ناتھ ٹگور کو جو انعام ملا ہے وہ دنیا بھر میں بہترین ادبی قابلیت رکھنے والے کے لئے مخصوص ہے۔ سر رابندرا ناتھ ٹگور نے ثابت کر دیا کہ ۱۹۱۳ء میں وہ دنیا بھر میں بہترین ادبی قابلیت رکھتے تھے۔ ادبی قابلیت کے علاوہ آپ کا حب وطن بھی قابل ستائش ہے۔ آپ نے اپنی حال کی سیاحت میں امریکہ کے ان علاقوں میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ جہاں ان کے بھائی ہندوستانیوں کی توہین کی جاتی ہے۔ آپ اپنا دورہ جاپان و امریکہ ختم کر کے ابھی حال ہی میں ہندوستان واپس تشریف لائے ہیں۔ — ایڈیٹر

ہندوستان کی لٹریری زندگی میں ۱۸۶۱ء کیسا مبارک سال تھا کہ اسے سر رابندرا ناتھ ٹگور کے پیدائشی سال ہونے کا فخر حاصل ہے یہی وہ سنہ تھا جس میں ایک غیر مزروعہ زمین سے خوشنما پودا نکلا، وہ بڑھا اور قدرت کی نگہداشت میں بڑھا۔ پھر اس میں پھول کھلے اور ایسے پھول کھلے جن سے تمام عالم کا دماغ معطر ہو گیا۔

ابھی اچھی طرح ہوش سنبھالنے کے دن بھی نہ آئے تھے کہ ماں اپنے پیارے بچے کو قدرت کی بے نیاز گود میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔

ٹیگور اپنی جیون سمرتی میں لکھتے ہیں

"میں بہت ہی خوبصورت تھا، یہی میرے بچپن کی ایک خصوصیت تھی۔ میں کچھ بہت ہی پیارا اور دلفریب تھا۔ میں بابا کے پاس بہت کم جاتا تھا۔ ان کا رعب تمام گھر پر طاری تھا۔ میں نوکروں کی حفاظت میں تمام دن قیدیوں کی طرح رکھا جاتا تھا اور ہر روز باہر کی طرف والی کھڑکی میں بیٹھکر اپنے دماغ میں بیرونی دنیا کا نقشہ کھینچا کرتا تھا۔ جہانتک مجھے یاد ہے میں ابتدا ہی سے فطرت کا چاہنے والا تھا۔ آہ! جب بادل ایک ایک کر کے آسمان پر جمع ہوتے تھے تو میں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ میں اس بچپن کے زمانہ ہی میں محسوس کرتا تھا کہ میرا ایک عزیز دوست ہے، ایک پیارا ساتھی ہے، اس سے مجھے بڑی محبت ہے، بڑا انس ہے، اگرچہ میں یہ نہ جانتا تھا کہ اس دوست کو کس نام سے یاد کروں مجھے فطرت کے ساتھ اس درجہ گہری محبت تھی کہ الفاظ میں اسکا اظہار مشکل ہے"

ٹیگور کے مقدس باپ مہرشی دویندرو ناتھ ٹیگور بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے، تمام بنگال کے دل پر آپ کے زہد تقا کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔

۱۹۱۳ء میں مسٹر سی۔ ایف۔ انڈریوز نے والس اینگل لاج شملہ میں ٹیگور پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"ٹیگور نے مجھ سے اپنے بزرگ باپ کی بابت کہا ہے کہ بچپن میں ان سے میری روح کانپتی تھی، ان کے رعب و جلال کی یہ کیفیت تھی کہ جب وہ گھر میں موجود ہوتے تھے تو تمام گھر ساکت و صامت رہتا تھا کہ ان کے ذکر و شغل میں خلل نہ پڑے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ جب میری ماں کا انتقال ہوا ہے تو میں بہت ہی چھوٹا سا تھا جس وقت میں نے اسے موت کی گہری نیند میں سوتے ہوئے دیکھا تو ہمیں صرف سے

ہوئے دیکھا' نہ میں ڈرا اور نہ میں رویا' سچ یہ ہے کہ میں ایک مدت کے بعد موت کا مفہوم سمجھ سکا ہوں۔"

ٹیگور کی خود نوشت سوانح عمری "جیون سمرتی" اور مجموعہ خطوط "چھنا پتر" میں اس غیر فانی شاعر کی زندگی کے مفصل حالات مندرج ہیں'

جیون سمرتی میں ٹیگور نے کچھ اپنے مخصوص طریقہ سے اپنے حالات بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والے پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہ ٹیگور خود سامنے بیٹھے ہوئے اپنی کہانی سنا رہے ہیں' چنانچہ ایک جگہ اپنے مخصوص طرز بیان میں شاعرانہ انداز سے فرماتے ہیں۔

"موسم بہار کی صبح ہوتی تھی اور میں بستر سے اٹھتے ہی باغ میں دوڑا ہوا جاتا تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شبنم میں نہائی ہوئی سرسبز دوب اور چھوٹے چھوٹے خوشنما پودے مجھ سے بغلگیر ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اور فرحت بخش صبح آفتاب کی سنہری کرنوں سے منہ نکالکر جو ابھی بیدار ہوئی ہے سکراتی ہوئی میرے خیر مقدم کیلئے آگے بڑھ رہی ہیں۔"

سر ابندرا ناتھ ٹیگور کے بڑے بھائی دوجیندرو ناتھ ٹیگور ایک مشہور فلاسفر ہیں' آپ کا حلم و بردباری خلق و محبت بنگال میں ضرب المثل ہے' محویت و استغراق کی یہ کیفیت ہے کہ گلہریاں درختوں کی شاخوں سے اتر کر آپ کے زانو پر چڑھ جاتی ہیں اور چڑیاں بے تکلف آپ کے ہاتھوں پر آبیٹھتی ہیں۔"

دوجیندرو بابو سے چھوٹے اور رابندرو بابو سے بڑے بھائی پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا۔

آپ کے دو چچا زاد بھائی گاگندرو ناتھ ٹیگور اور آبندرو ناتھ ٹیگور ہندوستان کے مشہور ترین مصوروں میں سے ہیں ٹیگور کی ایک بہن بنگالی زبان کے مشہور ماہوار رسالہ "بھارتی" کی اڈیٹر ہیں۔

جب رابندرا ناتھ ٹیگور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کیلئے اسکول میں داخل کئے گئے تو یہ ایک بڑے بدشوق طالب علم ثابت ہوئے۔ اسکی خاص وجہ مدرسوں کی بیجا سختی اور بدسلوکی بیان کی جاتی ہے۔

وہ خود اسکول کے ایک ماسٹر کی بابت کہا کرتے ہیں کہ "وہ میرے ساتھ بری طرح پیش آتا تھا اور اکثر مجھے گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رکھتا تھا"۔

ٹیگور اسکول جانے سے بہت گھبراتے تھے اور وہاں کی خشک روکھی اور بیمزہ زندگی سے بچنے کیلئے اپنے جوتے میں پانی بھر لیا کرتے تھے کہ بیمار پڑ جائیں اور اسکول جانے سے پیچھا چھوٹے۔ جب ان کے باپ نے یہ سب حال سنا تو انہیں اسکول سے اٹھا لیا اور ان کی تعلیم کے لئے گھر ہی پر دو تین معلم مقرر کردیئے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں ان میں غیر معمولی ترقی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔

ٹیگور کا رجحان طبع قدرتاً شاعری اور موسیقی کی طرف تھا چنانچہ انکے متعلق جو تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی وہ کامل غور و توجہ کے ساتھ حاصل کیا کئے۔ یہی سبب ہے یہ حال تھا کہ جب کوئی نظم پڑھتا یا عمدہ گانا گاتا تھا تو ٹیگور کے شاعرانہ جذبات مشتعل ہو جاتے تھے۔ اور اس درجہ بیہوش ہو جاتے تھے کہ تڑپ تڑپ جاتے تھے۔

"ڈیلی نیوز" لکھتا ہے کہ "رابندرو ناتھ ٹیگور کو "نوبل پرائز" ملا ہے اس میں ایک خاص نکتہ قابل غور ہے ٹیگور نے کسی یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی اور وہ لارڈ ہارلے اور سلطنت برطانیہ کی تعلیمی جدوجہد سے مطلقاً مستفید نہیں ہوئے۔ لیکن اگر اتفاق سے وہ کسی یونیورسٹی میں جا پہنچتے تو زیادہ سے زیادہ ایک مدرس ہو سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوتا ہے۔ بنانے سے نہیں بن سکتا۔ اور میرے خیال میں تو مشکل سے چند کامیاب شاعر ایسے مل سکیں گے جنہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم تکمیل کو پہنچائی ہو۔

سترہ برس کی عمر میں ٹیگور تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھیجے گئے۔ یہاں وہ یونیورسٹی

کالج میں داخل ہوئے اور مسٹر مارلے کے زیر نگرانی انگریزی علم ادب کی تحصیل کی ایک سال کے بعد ہندوستان واپس آئے، لیکن فوراً ہی پھر انگلستان کو روانہ ہوگئے۔

"ڈیلی کرانیکل" لکھتا ہے کہ ٹگور عنفوان شباب میں قانونی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان آئے لیکن اسے اپنی [illegible] کے [illegible] نہ سمجھکر پھر ہندوستان واپس چلے گئے اور وہ نظمیں لکھیں جنہوں نے [illegible] نام کو تمام عالم میں مشہور کردیا"۔

ٹگور نہایت حسین اور خوبصورت آدمی ہیں، امریکہ کا ایک مشہور اخبار نویس لکھتا ہے کہ "ٹگور صورت ہی سے شاعر معلوم ہوتے ہیں، میں جس وقت چاہتا ہوں اپنے ذہن میں اس فرشتہ صورت شاعر کی تصویر کھینچ لیتا ہوں، سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی مخمور آنکھیں، اور پھر گھونگریالے بال، یہ سب ملکر دیکھنے والے کے دل پر ایک عجیب پر لطف کیفیت طاری کردیتے ہیں

ٹگور کو بیرلے اور شعر کہنے کا بڑا شوق ہے اور خصوصاً موسیقی کے تو عاشق ہیں، کہتے ہیں کہ ٹگور کچھ اس انداز سے گاتے ہیں کہ اچھے اچھے گانے والے ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں، اکثر ایسا ہوا ہے کہ وہ صبح کو گانے بیٹھے ہیں۔ اور رات کے گیارہ بارہ بجے تک متواتر گاتے رہے ہیں۔

آپ ایک فصیح البیان خطیب ہیں، جب ٹگور خود اپنی نظمیں سناتے ہیں۔ تو سامعین پر بے خودی طاری ہوجاتی ہے۔

ٹگور بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، آپ برہمو سماجی ہیں، ہر روز صبح کے تین بجے سے ذکر و شغل میں مصروف ہوجاتے ہیں، ٹگور نے بنگالی زبان کو تصوف اور معرفت سے مالا مال کردیا ہے، سچ یہ ہے جو فارسی کے لئے حافظ، سعدی اور جامی ہیں جو ہندی بھاشا کیلئے کبیر اور نانک ہیں وہی بنگالی کے لئے ٹگور ہے،

ٹگور کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ "بہنو سمبھ" کے نام سے شایع ہوا ہے اسمیں وہ تمام نظمیں ہیں۔ جو آپ نے ۱۶ برس کی عمر تک لکھی ہیں، اس کے بعد "سندھیا سنگت"

(شام کے گیت) اور "پروت سنگت" (صبح کے گیت) دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن کے حرف حرف سے ٹیگور کی قادر الکلامی اور جدت طرازی ٹپکتی ہے

سندھیا سنگت میں "ایک تارے کی خودکشی"۔ "غم سے التجا"۔ "بیوفا عورت اور دل کا مرقعہ" الشیائی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ "ابدی زندگی" "چشمہ کا خواب اور فطرت کی گود" پروت سنگت میں ایسی نظمیں ہیں جنمیں کوٹ کوٹ کر معرفت بھری ہوئی ہے ان نظموں نے بنگالی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

یہ ٹیگور کی شاعری کا دور اول تھا، دور ثانی کی ابتدا ۲۳ سال کی عمر میں ہوئی اسی عمر میں آپ کی شادی ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ کے والد بزرگوار مہرشی دیوندرناتھ ٹیگور نے آپ کو اپنے گاؤں "شالاڈا" کا انتظام درست کرنے کے لئے بھیجا۔ ٹیگور اگرچہ وہاں جانے سے خوش نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی زمانہ ٹیگور کی شاعری کا بہترین حصہ تھا، ۲۵۔۲۶ سال کی عمر سے غالباً ۴۵ سال کی عمر تک ٹیگور کی شاعری عشق و محبت کے پاکیزہ جذبات سے پر رہی لیکن اس کے بعد مذہب اور فلسفہ کا رنگ غالب آگیا۔

اسی عرصہ میں آپ کی زوجہ کا انتقال ہو گیا اور چند مہینہ بعد ایک لڑکی اور پھر سب سے چھوٹا لڑکا بھی آپ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

ٹیگور نے ان غم انگیز سانحوں کی اہمیت مسٹر اینڈریوز سے کہا ہے "تمہیں معلوم نہیں یہ موت میرے لئے بڑی برکت ثابت ہوئی، مجھے کچھ ایسی سیری اور فراغت حاصل تھی گویا کچھ بھی ضائع نہیں ہوا ہے۔ اس واقعہ نے مجھے صرف صبر و توکل کی ہی تعلیم نہیں دی بلکہ ایک خاص قسم کی آسودگی میری طبیعت کو حاصل ہوئی۔ غرض اب میں یہ جان گیا تھا کہ موت کیا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب گیتانجلی، سونر تاری، سنیاسی اور چترا جیسی کتابیں عالم وجود میں آئیں جنہوں نے ٹیگور کو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بہترین شعرا کی صف اولین میں جگہ دی۔

رابندرناتھ ٹیگور نے کم و بیش سو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ میں انشاء اللہ آئندہ بشرط فرصت آپ کی شاعری اور مختلف تصانیف پر ایک مضمون لکھونگا۔

ٹیگور کی چند نظموں کے بعض حصوں کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جن سے اس شہباز تخیل کی بلند پروازی کا اندازہ ہو سکے گا:-

"وہ دیکھو صبح اپنے داہنے ہاتھ میں حسن کے خوشنما پھولوں سے بھری ہوئی ایک سنہری ٹوکری خاموش زمین پر بکھیرنے کیلئے لا رہی ہے اور پھر شام سنسان چراگاہوں میں بہتی ہوئی اپنی طلائی گگری میں عیش و آرام کے مغربی سمندر سے امن و امان کی ٹھنڈی اور مست کر دینے والی شراب لا رہی ہے، مگر ان آسمانوں کی وسیع تہہ پر گہرائیوں میں جہاں روح آزادی کے ساتھ مصروف پرواز ہو سکتی ہے، ہر طرف صاف و شفاف نور پھیلا ہوا ہے، یہاں نہ دن ہے اور نہ رات، نہ وضع ہے اور نہ رنگ" (گیتانجلی)

تیرے نور کی شعاعیں میری ہستی کی دنیا میں ہاتھ پھیلائے ہوئے آتی ہیں، اور تیرے مبارک قدموں تک میرے آنسوؤں، آہوں اور گیتوں سے بنے ہوئے بادل لیجانے کے لئے میرے دروازہ پر تمام دن کھڑی رہتی ہیں۔ اور پھر تو بادلوں کی اس میلی چادر کو اپنے تاروں بھرے سینے پر لپیٹ لیتا ہے۔ (گیتانجلی)

ملکہ۔ پھر تم کیا معاوضہ چاہتے ہو؟

خادم۔ بس یہ کہ تمہارے کنول کے پھول کی مانند نازک کلائیوں میں پھولوں کے گجرے پہنانے کی اجازت ملجائے۔ تمہارے پیر کے تلوؤں پر اشوک کے پتوں کے سرخ عرق سے ہلکی ہلکی لکیریں کھینچا کروں"۔ (باغبان)

مجھے اپنے گلزار کا باغبان بنا دو، میں اپنے تمام کام چھوڑ دونگا۔ میں اپنی شمشیر اور نیزے کو خاک پر پھینکدونگا۔ مجھے دور دراز ممالک میں نہ بھیجو، غنیم کے مقابلے میں فتح حاصل کرنیکی ترغیب نہ دو، بس مجھے تو اپنے ہرے بھرے گلزار کا مالی بنا لو۔ (باغبان)

ایک روز صبح کے وقت ایک نابینا بھولی لڑکی مجھے کنول کے پتوں سے ڈھکا ہوا پھولوں کا
ہار دینے کے لئے آئی، میں نے اسے اپنے گلے میں پہن لیا، اور میری آنکھوں میں آنسو بھر
آئے میں نے اس لڑکی کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا کہ تو بھی ان پھولوں کی طرح کچھ نہیں دیکھ
سکتی، تجھے خود معلوم نہیں ہے کہ تیرا تحفہ کیسا پیارا تحفہ ہے، (باغبان)

اے دنیا میں نے تیرا پھول توڑ لیا،
اور اسے اپنے سینے سے لگایا، میرے دل میں اس کا کانٹا چبھا،
جب دن ڈھلا اور اندھیرا ہو گیا، میں نے دیکھا کہ پھول مرجھا گیا تھا، اور کانٹے کی
تکلیف باقی تھی، (باغبان)

سنسان اور خاموش رات تیرے راستے میں ہے، اور صبح سایہ دار پہاڑیوں
کے پیچھے سو رہی ہے۔ تارے سانس روکے ہوئے گھڑیاں گن رہے ہیں ضعیف چاند
کانپتے ہوئے رات کی گہرائیوں میں تیر رہا ہے، . . . .
نہ گھر ہے اور نہ عیش و آرام کا سامان،
بس تیرے دو بازو ہیں اور آسمان کی غیر محدود وسعت،
پرندا اور میرے پیارے پرندے دیکھ کہیں اپنے بازو بند نہ کر لینا، (باغبان)

بچے نے اپنی ماں سے پوچھا میں کہاں سے آیا ہوں، تم نے مجھے کس جگہ پایا تھا؟
ماں نے اپنے بچے کو سینے سے لگا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا،
"پیارے بچے تو میرے دل میں میری امید بنکر چھپا ہوا تھا۔"
تو میرے بچپن کے زمانہ میں گڑیوں کے کھیل کے اندر موجود تھا، اور جب میں ہر روز صبح
کے وقت مٹی سے دیوتا کی مورتی بنایا کرتی تھی، تب میں تجھی کو بناتی تھی اور تجھی کو بگاڑتی تھی۔ . .
. . جب کنوار پن میں میرے شگوفہ دل کی پتیاں کھلا کرتی تھیں، تو تو خوشبو بنکر ان کے
ارد گرد موجود رہتا تھا،

تیری لطیف نزاکت بھرے شباب کے اعضا میں اس طرح شگفتہ تھی جیسے شفق طلوعِ مہر سے پہلے آسمان کے مشرقی پردوں پر"

فطرت کے شاہدِ اولین! نورِ سحر کے ہمزاد! تو بحرِ حیات کی لہروں پر تیرتا رہا ہے اور آخر تم میرے دل کے کنارے پر اتر آیا" (ماہِ نو)

ماہتاب تمام عالم کو روشنی بخشتا ہے۔ لیکن سیاہ داغ اپنی ہی ہستی تک محدود رکھتا ہے۔ (نظم مطبوعہ بھارتی)

جنوبی دروازے کھلے ہوئے ہیں، آ میری پیاری بہار آ،
میں تجھے اپنے دل کے جھولے میں جھلاؤں گا،
پتوں کی سنسناہٹ میں سے ہنستی ہوئی آ، کلیوں کے دلوں کو گدگداتی ہوئی آ،
بانسری کے سروں میں سے ہو کر، جنگل کی آہوں میں سے گذرتی ہوئی آ، اور مستانہ ہوا کو اپنے دامنوں سے کھیلنے دے، آ میری پیاری بہار آ، (تاریک خلوت گاہ کا بادشاہ)

آفتاب غروب ہوتے ہوئے کہتا ہے "میرا کام اب کون انجام دیگا"؟
کوئی جواب نہیں ملا۔ کہ تمام عالم خاموش اور ساکت رہ گیا،
آخر مٹی کا چراغ ایک گوشے سے اپنی دھیمی آواز میں بولا!
"اے آفتابِ عالمتاب جس قدر میرے امکان میں ہے میں اس خدمت کیلئے حاضر ہوں،" (نظم مطبوعہ بھارتی)

حامد اللہ افسر

حسن ادا

(از جناب سید صدر الاسلام صاحب [illegible] لکھنوی)

جب دلبری کا نقش خدا نے بنا دیا — اور زینت جمال کو حسن ادا دیا

پھر کیا تھا جلوۂ متنوع نیرنگ حسن سے — بجلی سے کوندنے لگی خرمن میں عشق کے

نیرنگیان جمال کی سودائے سے پوچھیے — یوسف کا سوز حسن زلیخا سے پوچھیے

لیلیٰ کے واقعات کا افسانہ ہو گیا — قیس اپنے جذب عشق میں دیوانہ ہو گیا

ہر دل پہ سحر حسن اثر اپنا کر گیا — فرہاد تیشہ مار کے بے موت مر گیا

یوسف کو ملک مصر کا فرمانروا کیا — اسلام کے نبی کو حبیب خدا کیا

شاہ و گدا ہیں ایک یہ وہ بارگاہ ہے — نیرنگیوں سے اس کی خدا کی پناہ ہے

جذبات بے پنہ سے اثر جا بجا کیا — شہزادۂ سلیم سے سلطے تو کیا کیا

بازار حسن گرم تھا اک روز شام کو — آنے کا حکم خاص کو تھا اور نہ عام کو

ہر سمت وہ بہار کا منظر نظر فریب — مست شباب پھرتے تھے دلبر نظر فریب

شانوں پہ زلفیں کھولے ہوئے نازنیں کوئی — سایہ کو غیر جان کے تماشہ بیں کوئی

کچھ شوخ دل دبا کہیں محو خرام ناز — کچھ پھر رہے تھے جھومتے سرشار جام ناز

کچھ ایک سمت کرتے تھے آپس میں شوخیاں — بڑھتے ہوئے شباب کا وہ جوش الاماں

تھا جلوہ زار حسن کہ قدرت خدا کی تھی — دیکھی نہ ہو جو شان وہ ناز و ادا کی تھی

دلچسپیاں تھیں باغ تھا باد صبا بھی تھی — موجود اتفاق سے مہر النساء بھی تھی

آیا وہاں پہ شاہ جہانگیر ناگہاں — بکنے کے واسطے تھے کبوتر رکھے جہاں

شہ ان کبوتروں کا خریدار بن گیا — بازار حسن مصر کا بازار بن گیا

جوڑا کبوتروں کا پسند آگیا اُسے ۔۔۔ رنگ سفید ان کا بہت بھا گیا اُسے
شاہانہ قدر دانیوں سے مول لے لیا ۔۔۔ پھر بہر سیر دوسری جانب چلا گیا
بڑھ کر نظر پڑے اسے آگے حسین کئی ۔۔۔ محوِ خرام نور جہاں جس جگہ پہ تھی
دل میں خیال آیا کہ بس ان کو چھیڑیئے ۔۔۔ مہر النسا کو دونوں کبوتر وہ دیدیئے
سودائے عشق شاہ سمجھکر لئے رہی ۔۔۔ مثل دل و جگر وہ کبوتر لئے رہی
مستِ شباب نازشِ حسن ادا تھی وہ ۔۔۔ بے مثل دلربائی میں نام خدا تھی وہ
حسن نظارہ سوز میں کچھ سادگی بھی تھی ۔۔۔ بیشک دلوں کے لینے کی آمادگی بھی تھی
وہ نازنیں کہ جس پہ نزاکت نثار ہو ۔۔۔ رفتارِ حسن ایسی قیامت نثار ہو
وہ حسن وہ شباب وہ دلکش ادا کی شان ۔۔۔ مہر النسا میں صاف تھی ظاہر خدا کی شان
بھولی نازنینوں میں یا اٹھلا رہی تھی وہ ۔۔۔ دل اپنی ہی اداؤں میں بہلا رہی تھی وہ
خود محو اپنے حسن میں وہ ہو کے رہ گئی ۔۔۔ نقد دل سلیم کو یوں کھو کے رہ گئی
مانند مرغ روح کبوتر اک اڑگیا ۔۔۔ گھبرا کے بول اُٹھی کہ ہے ہے یہ کیا ہوا
چھٹکر اسیرِ ناز چلا سوئے آسمان ۔۔۔ پر ہیبت پٹائے راز رہائی ہوا عیان
پوچھا سلیم نے کہ کبوتر وہ کیا ہوا ۔۔۔ بولی کہ رنگ رخ کی طرح سے اُڑا ہوا
انداز نے سوال کے تازہ ستم کیا ۔۔۔ جذباتِ حسن و عشق کو لا کر بہم کیا
معشوقوں کی ادا کا مرقعہ دکھا دیا ۔۔۔ "یوں" کہہ کے دوسرا بھی کبوتر اڑا دیا
اک آہ کر کے شاہ جہانگیر رہ گیا ۔۔۔ اپنی جگہ پہ صورت تصویر رہ گیا
حسن نظارہ سوز کی دلکش ادا تھی یہ ۔۔۔ گویا دل سلیم کو برق بلا تھی یہ
چھوٹے کبوتر اور یہ گرفتار ہو گیا ۔۔۔ مہر النسا کے عشق کا آزار ہو گیا

محفوظ رکھے حسن کے جذبات سے خدا

اے صدر وہ نہ چھوٹا ہوا جو کہ مبتلا

نشاط

(بسلسلۂ اشاعت گذشتہ)

ہاں نشاط موجودہ کی تخلیق قبل از وقت ضرور تھی۔ دور بہار ہی میں ہنگام وَیدہ کے آثار نمایاں تھے نبض جوانی اور اشتہا رِ شباب اس میں موجود تھے لیکن وہ خود بین و خود آرا ہو رہا تھا۔ اس کے نقل و حرکات کا مشاہدہ کتنا مسرت خیز تھا۔ نشاط مع اپنے چہرہ سیمیں اور طبیعت رنگیں کے اک چیز تھا قابل حیرت و استعجاب آفرین' کیا مضائقہ کہ اس کا انجام کیونکر ہوا اور کیا ہونیوالا ہے۔ وہ تماشہ یا سینیمٹوگراف کی ان خوبصورت تصویروں میں سے ایک تصویر تھا جس کی خوشیاں دیکھنے والے کو اپنے سے علیحدہ اور بعید نظر آتی ہیں۔ لیکن جس کی تکالیف اس کے حسِ حُسن کی محرک اور جس کے زخم اس کو گلہائے احمر معلوم ہوتے ہیں۔

روح اور جسم جسم اور روح۔ یہ کتنی پر اسرار چیزیں تھیں کبھی روح میں شائبہ بہیمیت اور کبھی جسم میں روحانیت کی جھلک نظر آتی تھی۔ حواس مادی میں لطافت و رفعت کی صلاحیت تھی اور حواس ذہنی میں تذلیل و پستی کی گنجائش۔ کون کہہ سکتا ہے کس نقطہ پر خواہش بہیمی ختم اور کس نقطہ سے خواہش ذہنی شروع ہوئی۔ معمولی علمائے نفسیات کی خودساختہ تعریفیں کسقدر سطحی ہیں۔ اور پھر بھی مختلف گروہ علماء کے دعاوی میں باہم فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہے۔ آیا روح محض ایک پرتو ہے جسکا شانہ رمعیت میں متمکن ہے۔ یا حقیقۃً وہ صاحب جسم ہو جیسا کہ Giardano Bruno کا خیال ہے۔ روح کی مادہ سے علیحدگی ایک معمہ ہے اور روح کا مادہ سے اتصال بھی ایک معمہ ہے۔

ابھی یہ غور کرنا تھا کہ آیا نفسیات کو ہم کبھی اتنا جامع علم بنا سکتے ہیں۔ جس سے کے

مطالعہ سے ہر شعبۂ حیات ہم پر منکشف ہو جائے۔ بحالت موجودہ ہم ہمیشہ اپنے نفس کی
طرف سے غلط فہمی میں رہتے تھے۔ اور دوسروں کو شاذ و نادر سمجھتے تھے تجربہ میں کوئی
اخلاقی وقعت نہ تھی وہ محض ایک نام ہے جو لوگوں نے اپنی حماقتوں کو دے رکھا ہے۔
علماء اخلاقیات اس کو عموماً ایک قسم کا طریقۂ تنبیہ سمجھتے تھے۔ کیرکٹر کی ساخت میں
اس کے لئے ایک خاص تاثیر اخلاقی کے مدعی تھے اس کے علاوہ بھی معترف تھے۔ کہ وہ ہم کو یہ
سکھاتا ہے کہ ہم کس بات پر عمل پیرا اور کس بات سے محترز ہوں لیکن تجربہ میں کوئی قوت
محرکہ نہیں ہے۔ اس کی ترکیب میں علت فاعلی کے عنصر کی آمیزش اس قدر کم ہے جتنی کہ
ضمیر میں۔ اس سے حقیقۃً جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا مستقبل ویسا ہی ہوگا
جیسا کہ ہمارا ماضی تھا اور یہ کہ وہ گناہ جس کے ہم ایک بار مرتکب ہوئے تھے اور بکراہ۔
اس کے ہم کئی بار مرتکب ہونگے اور بہ طیب خاطر

تاہم یہ امر اس پر پورے طور سے روشن تھا کہ صرف استقرائی طریقہ ایک ایسا طریقہ
ہے جس سے اشتہاآت و جذبات انسانی کی تحلیل علمیہ ممکن ہے۔ اور فی الحقیقت نشاط ایک
ایسا معمول تھا جس سے مکمل اور کامیاب نتائج حاصل ہونے کی امید ہو سکتی تھی سلمیٰ سے
اس کی اضطراری اور جنون آمیز محبت کوئی معمولی مظہر نفسی نہ تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ
عجائب پسندی کو اسمیں بہت کچھ دخل تھا عجائب پسندی اور تجربات نو کے حصول کی تمنا۔
تاہم یہ کوئی منفرد جذبہ نہ تھا۔ یہ ایک امنگ تھی مرکب و مختلف النوعیت جس کی سوج نور خود
دیدۂ معمول سے نامحرم

عمل تخیل نے عالم طفلی کی خالص مادی حس نظری کو ایک ایسی شئے سے بدل دیا تھا۔
جس کی مسرت معنوی سے لذت گیر ہونے کی صلاحیت اس کے حواس ظاہری میں نہ تھی
اس کا تعلق نفس و وجدان سے تھا۔ اور وہ اسی وجہ سے اور زیادہ خطرناک تھی۔
جن کے مبدا اصلی کے متعلق ہم دھوکہ میں رہتے ہیں وہی ہم پر سب سے زیادہ ظلم

کرتے ہیں۔ ہماری کمزور ترین حرکات وہ ہیں جن کی اہمیت سے ہم واقف ہوتے نہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ جب ہم اس خیال میں تھے کہ ہم دوسرے پر تجربہ کر رہے ہیں تب ہم حقیقۃً اپنے ہی نفس پر تجربہ کر رہے تھے۔

ادہم ان باتوں پر بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ پر کھٹ کھٹ کی آواز معلوم ہوئی اور ایک خدمتگار داخل ہوا جس نے اطلاع کی کہ کھانے کا وقت آگیا ہے ادہم کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ نشاط نے اس مضمون کا ٹیلیفون بھیجا کہ سلمیٰ میرے ساتھ منسوب ہو گئی۔

فرخ منزل میں ادہم اور ہارون ڈنر ٹیبل پر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

ادہم۔ ہارون تم نے یہ خبر سنی۔

۔نہیں۔ خبر ہے۔ کونسی خبر۔ سیاسیات کے متعلق تو کچھ نہیں ہے۔ مجھ کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔

۔نشاط کی شادی ہونیوالی ہے۔

بآواز بلند۔ اور متحیر ہو کر "نشاط اور شادی" یہ غیر ممکن ہے۔

۔یہ واقعہ ہے۔

۔اور کس کے ساتھ۔

۔ایک ایکٹرس کے

۔مجھ کو یقین نہیں پڑتا۔ نشاط ایسا بیوقوف نہیں ہے۔

۔نشاط نہایت عقلمند ہے۔ وہ ایسا بےوقوف نہیں ہے کہ ان حماقت آمیز حرکات سے وقتاً فوقتاً متلذذ نہ ہو۔

۔شادی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے انسان وقتاً فوقتاً محظوظ ہو سکے۔

لیکن میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کی شادی ہو گئی۔ میں نے صرف یہ کہا کہ اسکی شادی ہونیوالی ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مجھ کو اپنی شادی خوب یاد ہے لیکن مجھ کو اپنی نسبت بالکل نہیں یاد ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ میں کبھی منسوب ہوا ہی نہیں۔ دہم نشاط کے نسب۔ پوزیشن اور رسوخ کا خیال کرو۔ اس کے لئے اس قدر گر کے شادی کرنا نہ محض معیوب بلکہ مہمل ہے۔

اگر تم چاہتے ہو کہ نشاط اس لڑکی سے شادی کرلے۔ تب تو اس سے یہ کہو پھر تو وہ ضرور شادی کریگا۔ انسان جب کبھی کوئی انتہائی حماقت کی حرکت کرتا ہے تو ہمیشہ نہایت شریف نیت سے۔ (باقی آئندہ)

آرٹسٹ

شام زندگی

شام زندگی نامی کتاب مکرمی محمد المصری صاحب نے ہم کو ریویو کے لئے عنایت کی ہے۔ یہ کتاب جناب مولانا عبدالراشد طلب الخیری سابق ایڈیٹر "تمدن" حال ایڈیٹر عصمت کے پر تاثیر قلم سے نکلی ہے مولانا عبدالراشد صاحب کی طرز تحریر سے جو لوگ واقف ہیں وہ اس بات کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ آپ کی تحریر کو دیکھکر کوئی سنگدل سے سنگدل شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ اردو زبان میں ٹریجڈی کے بادشاہ ہیں رنج و الم کے مناظر دکھانے میں آپکو جو ید طولیٰ حاصل ہے اس کو دیکھتے ہوئے آپ کو اس رنگ کا واحد نثار لکھنا قطعی مبالغہ نہیں ہے شام زندگی کا بڑا حصہ اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے اسی سلسلہ کی ایک کتاب صبح زندگی مخزن پریس نے شایع کی تھی اب جناب احمد نے "شام زندگی" شایع کرکے ادبی دنیا پر احسان کیا ہے "شام زندگی" ادبی حیثیت سے ایک اچھی کتاب ہونے کے علاوہ لڑکیوں اور عورتوں کے لئے دلچسپ معلومات اور نصائح کا مجموعہ ہے کتاب کی زیادہ تعریف کرنے کے بجائے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اسکا

لکھ "صفۂ تمدن" میں نقل کر دیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے کتاب ۲۲×۱۶ کے ۱۲۹
صفحات پر مشتمل ہے اور ایک روپیہ قیمت پر صدیقیہ پریس دہلی سے مل سکتی ہے۔ ایڈیٹر

نسیم کی جٹھانی کلیم کی ماں تھی تو نسیم کی خالہ زاد بہن مگر عورت کیا آفت کا پرکالہ تھی جس نے ساس کو ناک چنے چبوا دیئے تھے۔ گھر میں کی بنا ہی چار بچوں کی ماں کچھ ایسی کچھ بھی نہ تھی مگر منتفر نماز سے بیزار علم سے بے بہرہ جاہلوں کی سردار گلے میں زور پلے پر ساس سسر کا مال گھر بھر کو زیر کر رکھا تھا ساس پاؤں کی جوتی شوہر بے دام کا غلام گھر بھر پر حکومت کا ڈنکا بجاتی تھی نسیم کے دوسرے بھائی کا لڑکا فہیم جس کے ماں باپ سات مہینہ کا چھوڑ مرے تھے۔ اور اب پانچ سال کا گھر بھر کی جان تھا۔ اس کی بھی اتنی مجال نہ تھی کہ جی کی طرف رخ کر لیتا۔ دادی اس کو بے پروا نہ تھی۔ مگر بچلی ہو جب آڑے ہاتھوں لیتی تو چپکی منہ تکتیں خدا کی قدرت ایک روز علی الصباح کلیم اور فہیم دونوں بچے اٹھ باہر کھیلنے چلے گئے ریٹھے کی ایک گولی پر لڑائی ہوئی۔ تھی تو فہیم ہی کی مگر کلیم جس نے بے ایمانی اور دغا کے دودھ سے پرورش پائی۔ گولی جیب میں ڈال لگا رونے اور چلانے۔ کر گھٹی میں پڑا تھا جھوٹ کی گود میں پروان چڑھا۔ حمایت کو باپ شہ دینے کو ماں۔ ڈرتی اس کی جوتی اور سچ بولتا اس کا صدقہ بیٹے کی آواز سن کر ماں دوڑی ہوئی دیوانہ وار آئی۔ بچے نے رو رو غل مچایا کہ بیل کا بیل بنا دیا کمبخت بلکتا رہا۔ اور کہتا رہا میرے پیٹ میں فہیم نے لات ماری کہاں کا رحم کدھر کا ڈر اور کیسا انصاف سنگدل عورت یتیم فہیم کو گھسیٹتی ہوئی لائی اور دروازہ ہی میں ایک ایسا دوہتڑ دیا کہ بلبلا اٹھا پانچ برس کی جان اس قصائی کے آگے سہما کھڑا تھا اور یہ کہہ رہا تھا

"چچی جان میں نے تو نہیں مارا!"

کٹھور چچی کیا رحم کرنے والی تھی دروازے ہی میں مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا۔ لہر چکی تو دیوار میں ایسا دھکا دیا کہ بچہ لہو لہان ہو گیا خون کی تُلّی ہونٹ سے بہ رہی تھی خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ مگر آواز مطلق نہ نکلتی تھی بن باپ کا بچہ جس کو اس وقت ظالم سے

بہلانے والا کوئی نہ تھا حسرت سے ممی کا منہ دیکھ رہا تھا معصوم نگاہوں بیکسی کا ثبت تھیں۔ اور خون کا ہر قطرہ بیگناہی کا دعوے کر رہا تھا۔ اسی حالت میں ایک ہاتھ سے کپڑے اٹھا لائی اور ساس کے آگے یہ کہہ کر پٹخ دیا۔ ذرا اس فتنے کی کارستانی تو دیکھو ہاں بیٹھا ادہر دھما چوکڑ رہا ہے۔ کہ کوئی کچھ کہے نہیں۔

پھول سا بچہ جس پر یہ چار چوٹ کی مار پڑی۔ اتنی دہکے کے پھینکنے سے بالکل بیہوش ہو گیا دادی نے جلدی سے اٹھا گود میں لٹایا نسیمہ پانی گرم کر کے منہ پونچھنے آئی۔ بچہ ہوشیار ہوا تو ساس نے کہا منجھلی بہو ہن! ماں باپ کے بچوں پر ایسا ظلم نہیں کرتے۔

منجھلی بہو۔ ذرا عقل کے ناخن لو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اتنا بڑا الزام لگانا اچھا نہیں۔ وہ ڈبہا نہ بازی ہے تم اس کے دھوکے میں آ کر مجھ کو اتنی بڑی بات کہتی ہو۔ خیر میرا تمہارا انصاف خدا کے ہاں ہے۔

وہ ساس جو نسیمہ کی ایک رضائی پر اس قدر بپھری تھیں ناہنجار بہو کے سامنے بالکل خاموش ہو گئیں۔ جانتی تھیں کہ زبان ہلانی بے سود ہے اپنا وقر اپنے ہاتھ نہ ایک کہونگی نہ چار سنونگی۔ اگر آدھی بات کہتی ہوں تو سات پشتیں پن کر رکھدیگی ساس بہو کے تعلقات پر کوئی خاص رائے قایم کرنی اتنی ہی مشکل ہے جتنی میاں بیوی کے خیالات پر ہر جگہ کے علاوہ جداگانہ ہیں وہاں نسیم کی ماں ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ تھی نسیمہ نے زندگی بھر ساس کو کبھی جواب تک نہ دیا لیکن جسقدر وہ منجھلی سے محبت کرتی تھیں مگر اس سے چوتھائی بھی نسیمہ سے کرتیں تو وہ اس شان کی لڑکی اور اس قدر [illegible] کی ہو تھی کہ مرتے دم تک ساس کے پاؤں دھو دھو کر پیتی اور منجھلی بہو سے ہی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ساس نے مرتے دم تک اس کو کبھی تکلیف نہ پہنچائی لیکن وہ اگر نسیمہ سے آٹھواں حصہ بھی ساس کی خدمت کرتی تو ساس اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتی۔

جس طرح بیٹی کی ورائے پر ماں باپ یہ سمجھ لیتے ہیں اور صرف سمجھ ہی نہیں لیتے بلکہ متوقع

ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میاں بیوی ایک جان و دو قالب ہوں اور ہم سے کچھ زیادہ واسطہ نہ رہے۔ اسی طرح لڑکوں کی شادی کے وقت ماؤں کو یہ سمجھ لینا چاہئے اور سمجھ لینا نہیں یقین کر لینا چاہئے کہ جو لڑکی اپنے تمام عزیزو اقارب اور گھر بار کو چھوڑ چھاڑ ہمارے ہاں آ رہی ہے وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کی اس قربانی کا عین مقصد کیا ہے۔ یہی نہ کہ دو نو ایک ہو جائیں پھر اس مقصد کی ابتدا ہماری ناخوشی کا باعث کیوں ہو ہم کو اس کی تکمیل میں مدد دینی چاہئے۔ تاکہ دونوں دولہا دولہن کی زندگی کا جو مقصود ہے وہ حاصل ہو۔

اسی طرح بہوؤں کو اچھی طرح یہ مان لینا ہے کہ آج ہماری زندگی بہو کی حیثیت سے ہے لیکن آ رہا ہے وہ وقت جب ہم کو ساس بننا ہے اور آج ہمکو اپنی ساسوں سے وہی سلوک کرنا چاہئے جو کل ہم اپنی بہوؤں سے توقع رکھتے ہیں

فہیم ہشیار ہوا تھا تو بخار میں ہل ہلا رہا تھا۔ چوٹ دماغ پر کاری لگی۔ ہر چند نسیمہ اس کو بہلا رہی تھی مگر چچی کا خوف اس قدر طاری تھا کہ وہ چاروں طرف گھبرا کر دیکھتا اور پھر ڈر کے مارے منہ چھپا لیتا۔ اسی حالت میں نسیمہ اس کو ساتھ لے اپنی پرانی سہیلی مس میری بی کے پاس لائی جو مشہور ڈاکٹر تھی۔ میری بی نے نہایت غور سے دیکھا بخار شدت کا تھا مگر ڈر بچہ کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ اس کو ہر طرف وہی ظالم نظر آتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے صاف کہدیا کہ دماغ پر چوٹ آئی ہے نسخہ رکھو اور دوا پلاؤ امید ہے کہ اچھا ہو جائیگا۔ ڈولی میں بیٹھی تو نسیمہ نے فہیم کو کلیجہ سے چمٹا لیا اور خیال کیا کہ آہ اے کمبخت دنیا تیرے جلوے کیسے سیپائی ہیں یتیم معصوم جس کے سر سے دو نو شفیق ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا ہرگز ایسی سزا کا مستحق تھا کہ صاحب اولاد دشمن کے ہاتھوں اس مصیبت میں گرفتار ہوتا۔ آج اس بدنصیب پردادی کے سوا کوئی دو آنسو گرانیوالا بھی نہیں ہے۔

انہی خیالات میں غلطاں پیچاں گھر پہنچی دوائی پلائی اور بچہ کو رضائی اوڑھا گود میں لیکر بیٹھ گئی۔ دادی کی بھی پانچ برس کی محنت تھی سر بہلے کا سرا اور مرے ہوئے بیٹے کی

دانت تھی تائیں اس کا منہ کھولتیں پیار کرتیں اور روتیں مگر بڑیا پا تھا اور ان بوڑھتیں خدمت کے لایق نہ تیمارداری کے قابل۔

دفعتہ بچہ نے آنکھ کھولی اس کے آنکھ کھولتے ہی دونوں کے جان میں جان آگئی۔ برابر میں انگیٹھی پر دودھ رکھا تھا۔ چار چمچے دودھ کے نسیمہ نے پلائے ملتھے پر پیار کیا اور کہا نسیم میاں کیسا جی ہے۔

آدھی رات کا سنسان وقت تھا اور تمام گھر بے خبر پڑا سوتا تھا صرف نسیمہ بچہ کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور دادی جانماز پر بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھی۔

سنگدل چچی کی تصویر معصوم آنکھیں بھولی نہ تھیں۔ سہم گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا "چچی جان میں نے نہیں مارا"

ایک تیر تھا جو نسیمہ کے کلیجہ میں گھسا یتیم کی بے گناہی پر تڑپ اٹھی۔ منہ پر منہ رکھا اور کلیجہ سے لگا کر کہا۔

"نہیں نہ سہی تو آنکھیں کھولو دودھ اور پیو"

منہ پر منہ رکھے روتی رہی تو بچہ چونک پڑا۔ پھر آنکھیں کھولیں نسیمہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے پھر تتلاتی ہوئی زبان میں رک رک کر سہمے ہوئے کہا۔

"نہیں چچی جان میں نے نہیں مارا"

ساس بہو ئیں ایک ایسی عورت کے لال پر رو رہی تھیں جس کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہوگئیں۔ کہ بچہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا چاروں طرف دیکھا اور پھر تیسری دفعہ اپنی بے گناہی کا اظہار کیا کہ

"چچی جان میں نے نہیں مارا"

اس فقرہ کے ساتھ ہی معصوم کو ایک ہچکی آئی اور رخصت ہوا۔

غزلیات

حضرت محشر لکھنوی

کیوں کہا تم نے کوئی تجھ سے تری فریاد نہیں　　اور بھی کہنے میں اب تو دل ناشاد نہیں

ہوں وہ محو دست شب وصل بھی دل شاد نہیں　　لطف محبوب مجھے مانع فریاد نہیں

ابتدا قصۂ فرقت کی ہے پیغام اجل　　اسقدر یاد رہا اور آگے مجھے یاد نہیں

عشق میں اس کی نگاہوں کے تحمل پہ نثار　　جو یہ کہتا ہو ادا میں ستم ایجاد نہیں

سننے والو تمہیں اللہ سلامت رکھے　　مختصر شرح غم ہجر ہے فریاد نہیں

ظلم پر ان کو یہ کہہ کہہ کے ابھارا ہم نے　　میری جان تم میں ادائے ستم ایجاد نہیں

جسکی محفل میں گئے ہم یہی کہہ کر اٹھے　　کہیں دنیا میں علاج دل ناشاد نہیں

شکر کرتا ہوں مرا خاتمہ بالخیر رہا　　کہ انہیں حد مرے حسرت بیداد نہیں

چھوٹنا فصل خزاں میں ہے اجل سے بدتر　　وہ گلستاں نہیں گلچیں نہیں صیاد نہیں

لذت درد محبت نے کیا یوں بے خود　　نزع میں جسقدر ایذائیں ہوئیں یاد نہیں

اہل باطن کو فنا بھی ہے حیات ابدی　　ہستی عشق وہ ہستی ہے جو برباد نہیں

ہر نفس میں نگرانی قفس کی فکریں　　میں اگر قید ہوں صیاد بھی آزاد نہیں

حشر میں دیکھے کوئی شکل شہیدان وفا　　میل تیوری پہ نہیں شکوۂ جلاد نہیں

امتیاز نگہ دوست پہ صدقے محشر
مر گیا میں تو کوئی قابل بیداد نہیں

حضرت حسرت موہانی

اب دیکھئے کیا حال ہمارا ہو سحر تک　　بھڑکی ہوئی اک آگ سی ہے دل سے جگر تک

مانا کہ یقینی ہے اثر جذبۂ دل کا
کیا ہوگا اگر ہجر میں تا آئید اثر تک

میں بے خبر غم تھا مگر وہ دم رخصت
دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حد نظر تک

اب تک نہ منے ہم سے وہ حالانکہ ایسے ہیں
لیلائے شب وصل کی زلف آئی کمر تک

کچھ محو تصور تھا میں اس درجہ کا حسرتؔ
مجھ کو نہ ہوئی یار کے آنے کی خبر تک

حضرت مبارک شاہ جہانپوری

ہر دم شراب حسن سے سرشار چاہئے
ایسا متاع دل کا خریدار چاہئے

ہر ہر قدم پہ حشر کے آثار چاہئے
اتنا تو آپ کو دم رفتار چاہئے

ہر دم ظہور جلوۂ دلدار چاہئے
عاشق کا دل تو مطلع انوار چاہئے

کس طرح بزم غیر میں وہ بے حجاب ہو
دیدار یار کو نگہ یار چاہئے

ہاں اک ادائے ناز تغافل بھی ہے مگر
معشوق حال دل سے خبردار چاہئے

بدنام کیا نہ ہوگے جو دیوانہ ہو گیا
جلوے میں ہر گھڑی تمہیں تکرار چاہئے

بے پردہ کون دیکھ سکے گا تمہیں مگر
کچھ تو لحاظ وعدۂ دیدار چاہئے

ممکن ہے کوئی شخص اگر سخت جاں ہوا
خنجر بھی ہاتھ میں دم انکار چاہئے

بے نالہ خاک عرض تمنا اثر کرے
حسن ادا کو شوخیٔ گفتار چاہئے

سچا تمہارا وعدۂ فردا سہی مگر
عاشق تو ہر گھڑی پس دیوار چاہئے

کیوں مجھ کو چھوڑ کر وہ عدو پر جفا کریں
رحمت کا مستحق تو گنہگار چاہئے

چھپتا ہی مدعا ہے اگر چشم شوق سے
زلف سیاہ پردۂ رخسار چاہئے

ٹکڑے تو ہو گئے دل مشتاق کے مگر
اب تم سے دلربا مجھے دو چار چاہئے

صحت ضرور شافیٔ مطلق کے ہاتھ ہے
تم کو تو پرسش دل بیمار چاہئے

عشق و جنوں میں کچھ تو رہے امتیاز [illegible]
[illegible]

کچھ دیر اور تیغ ادا میان میں نہ ہو — ہر آرزو کو ایک اب اظہار چاہیے

بیباک کچھ عجیب بکھیڑا ہے عشق کا
اب مر گئے تو کوئی عزادار چاہیے

ابو المظفر حضور نعیمی صاحب (بھوپال)

سر سے خمار جوشش جوانی اتر گیا — وہ دور مٹ گیا وہ زمانہ گذر گیا

مجھ کو بھی کوئی عشق میں برباد کر گیا — مجھ پر بھی ایک حشر کا عالم گذر گیا

بیمار غم کی یوں کوئی تسکین کر گیا — اک آس بندھ گئی دل مضطر ٹھہر گیا

دیکھا کئے اسیر ابڑتا رہا چمن — آنکھوں کے آگے حشر نہ کیا کیا گذر گیا

پہلو میں ایک دل تھا غم یار کا رفیق — حسرت سے وہ بھی آج گلے مل کے مر گیا

یوں مٹ گیا ہے دل سے مرے نقش آرزو — یہ بھی نہیں خیال وہ عالم کدھر گیا

وہ کہہ رہے ہیں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — یہ عہد ہے اگر تو میں بے موت مر گیا

ہلتے تھے ہونٹ آنکھ کو جنبش تھی نزع میں — اس کشمکش میں آپ کا بیمار مر گیا

اک حرف آرزو بھی نہ ہم اُن سے کہہ سکے — منہ سل گیا لبوں پہ کوئی مہر کر گیا

چلئے کہ نزع میں ہے مریض غم فراق — اُٹھیئے کہ وقت نازش بے جا گذر گیا

سونے کی کوئی حد ہے بہت سو چکے حضور
اُٹھیئے کہ آفتاب بھی سر سے گذر گیا

مولوی عبد القیوم صاحب شفق اندہری

تن مجروح کو جنبش نہیں بیتابی دل سے — یہ بسمل وجد میں ہے لذت دیدار قاتل سے

مزہ قتل پوچھو سر فروش ناز کے دل سے — رگ گردن پھڑک اٹھتی ہے نوک تیغ قاتل سے

[illegible] بسمل کے لہو میں ہو نہیں سکتی — الٰہی کیا حنا چھوٹی ہے دست ناز قاتل سے

[illegible] کی ہم شوق شہادتمیں — خدا رکھے ہمارے دلکو یہ کچھ کم ہی قاتل سے

یہ جس کو تاک لیتی ہے وہ زندہ رہ نہیں سکتا — قضا نے بھی ادا سیکھی ہے شاید میر قاتل سے
تمنائے شہادت میں کچھ ایسی اضطرابی ہے — کبھی قاتل سے ملتا ہوں کبھی شمشیر قاتل سے
اگر مجھ سخت جان کی جان لینے کا ارادہ ہے — ادائیں مانگ لے میری قضا دم بھر کو قاتل سے
نیاز و ناز عشق و حسن کا افسانہ سنتا ہوں — وہاں زخم بسمل سے زبان تیغ قاتل سے
چمن کا رنگ پیدا کر دیا ہے خون بسمل نے — شہادت گاہ گلشن ہو گیا ہے خون بسمل سے
الٰہی شرم تیرے ہاتھ ہے شوق شہادت کی — سر تسلیم کٹوانے چلا ہوں تیغ قاتل سے
دل مقتول کا افسانہ بھی کیا شان رکھتا ہے — الف سے تا بہ یا لکھا ہے آب تیغ قاتل سے
شہید عشق کو مژدہ حیات جاودانی کا — قضا بچتی ہوئی چلتی ہے تیغ ناز قاتل سے
مری مشکل کشائی ہو مری حاجت روائی ہو — نہ یہ امید خنجر سے نہ یہ امید قاتل سے
مرے قاتل نے وقت ذبح اپنا منہ جو پھیرا ہے — مرا زخم گلو ملنے لگا ہے تیغ قاتل سے
رگ گردن ہماری کٹ گئی غرلمے مقتل میں — خجل ایسی ہوئی عریانی شمشیر قاتل سے
خدا جانے نگاہ ناز کو مد نظر کیا ہے — چھری کھینچے ہوئے نکلی ہے ظالم چشم قاتل سے
جسے مرنا ہو تیغ ناز کے نیچے گلا رکھدے — قضا لپٹی ہوئی ہے دامن شمشیر قاتل سے
مجھے دامان مقتل پر نماز شکر پڑھنا ہے — وضو اسواسطے کرتا ہوں آب تیغ قاتل سے
دل بسمل سے اب اسکا نکلنا غیر ممکن ہے — ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی ہیں تیر قاتل سے
ہر اک مضمون میں نیرنگی خون شہیداں ہے — زمین شعر مقتل ہے تمنائے تیغ قاتل سے

شہید ناز۔ مقتول تمنا کشتہ حسرت
شفق ہم کو خطاب اچھے ملے سرکار قاتل سے

حکیم خواجہ محمد اسمعیل صاحب ذبیح

لذت شناس درد مرا دل نہیں رہا — بار گران عشق کا حامل نہیں رہا
جور و ستم کا میں متحمل نہیں رہا — جسمیں تھی تاب ضبط وہی دل نہیں رہا

اب تک ازل سے کشتِ وفا کا یہی ہے رنگ — اس کا بجز فنا کوئی حاصل نہیں رہا
اس بحرِ عشق میں مجھے جس کی تلاش تھی — اتنا تو دور مجھ سے وہ ساحل نہیں رہا
مضمر ہر ایک ذرہ میں وحدت کا راز ہے — دل آشنائے صورت باطل نہیں رہا
ہر ذرہ جلوہ گاہ ہے قدرت نمائی کا — اے جذبِ عشق تھم کہ میرا دل نہیں رہا
مجھ کو ازل سے کرلیا قدرت نے انتخاب — جب کوئی بارِ عشق کا حامل نہیں رہا
میں دیکھتا ہوں روز زمانہ کا انقلاب — اب اس فریبِ حسن کا قائل نہیں رہا
جو دل سرورِ عیش سے معمور تھا کبھی — حسرت کدہ ہے اب وہ میرا دل نہیں رہا
اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو رہا — جب اپنے اختیار میں یہ دل نہیں رہا
وہ کشتۂ وفا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی — قدموں سے ترے دور میں قاتل نہیں رہا
ناکام آرزو کی ہے اک آرزو فنا — لطفِ حیات کیا رہا جب دل نہیں رہا

دل کو میرے ستائے نہ کوئی کہہ لے ذبیح
اب ضبطِ گریہ کرنے کے قابل نہیں رہا

نعت رسول اکرم صلعم

از جناب منشی محمد ذکریا صاحب بن محمد نیاز ذاکر

بڑی سرکار ہے سرکار احمدؐ — بڑا دربار ہے دربار احمدؐ
کہوں کیا خوبیٔ رخسار احمدؐ — خدا ہے طالب دیدار احمدؐ
یہ رتبہ ہے کہ جبریل امین بھی — ہوا ہے غاشیہ بردار احمدؐ
معطر دونوں عالم ہو رہے ہیں — زہے بوئے گل رخسار احمدؐ
زلیخا حسن یوسف بھول جائے — جو دیکھے رونق بازار احمدؐ
ہما کے سایہ سے نزدیک میرے — فزوں ہے سایۂ دیوار احمدؐ

وہ کافر ہے۔ وہ کافر ہے وہ کافر کیا جس شخص نے انکار احمدؐ
الٰہی بخش دے امت کو میری یہ تھی معراج میں گفتار احمدؐ
وہی ہے خوش نصیب و خوش مقدر جو پائے دولت دیدار احمدؐ
ابوبکر و عمر عثمان و حیدر ہوئے تبلیغ دین میں یار احمدؐ
نہیں ممکن مسیحا سے بھی ہرگز کہ اچھا ہو سکے بیمار احمدؐ

ہمارا نام اے ذاکر ہے ذاکر
نہ کیوں کرتے رہیں اذکار احمدؐ

ایک نظر

موت کا مذاق ۔ گذشتہ پرچہ میں ہم نے جناب عارفؔ صاحب ہسوی کی ایک غزل درج کی تھی اور اس کے ساتھ "مرحوم" لکھا گیا تھا۔ عارف صاحب کو ہم سے شکایت ہے کہ ہم نے انہیں قبل از وقت مار ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب ظفر احسن صاحب علوی نے ہمیں یہ غزل بھیجی اور غزل کے ساتھ جو خط ہمیں لکھا تھا اس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ "عارفؔ مرحوم کی غزل ارسال ہے" اس غلط واقعہ کو شہرت دینے کا الزام ہم پر عاید ہو سکتا ہے مگر ہم یہ نہیں خیال کر سکتے تھے کہ جناب عارفؔ کے خاص دوست جناب علوی صاحب اس قسم کی غلط اطلاع ہم کو دینگے ۔ جناب علوی کو اگر اپنے متعلق "مرحوم" ہونے کی غلط فہمی ہوتی تو اس میں زیادہ ادبیت کا پہلو نکل سکتا تھا۔

تعزیت نامہ ۔ عصر جدید پریس میرٹھ نے اس نام کی ایک کتاب جو آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے متعلق تعزیتی خطوط اور مضامین پر مشتمل ہے شائع کی ہے کتاب کے ابتدائی حصہ میں چند قابل قدر مضامین ہیں جن میں خواجہ صاحب مرحوم کی زندگی کے اکثر پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضامین ایک حیثیت سے اس درد مند قوم کی ایک مختصر سوانحعمری کہے جا سکتے ہیں افسوس ہے کہ خواجہ صاحب مرحوم کی کوئی مفصل سوانحعمری اسوقت تک شائع نہیں ہوئی جو آپکے متعلق کسی دوسری کتاب کی نسبت قوم کیلئے یقیناً زیادہ بہتر ثابت ہو سکتی تھی اور قوم کے نوجوانوں کیلئے ایک حد تک شمع ہدایت کا کام انجام دیکتی تھی تعزیت نامہ کی لکھائی چھپائی اچھی ہے قسم اول ۱۲؍ قسم دوم ۸؍ یہ کتاب عصر جدید پریس میرٹھ سے طلب کرنے سے مل سکتی ہے

قابل دید کتب

کتب ذیل کی قیمت میں انتہائی تخفیف کر دی گئی ہے اور ان میں سے بیشتر کسی دوسری جگہ سے اس قیمت پر دستیاب نہیں ہو سکتیں

ناول

ناول اہل نگاری قاری محمد سرفراز حسین صاحب حمی دہلوی کا ایک ہے کے اخلاقی ناول سعید- سعادت شاہد رعنا جو دو بار چھپکر قدر دانوں کے ہاتھ میں پہنچ چکے ہیں۔ اب ایک مجموعے کی صورت میں چھپوا گئے ہیں۔ ۳۰۰ صفحہ کی مجلد کتاب جو نہایت عمدہ ولایتی کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور جس میں مصنف کی ایک تصویر بھی ہے۔ قیمت ؏

تالث بالخیر ایک ترکی ناول کا ترجمہ مترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے - ۴ر

نیرنگی دہر حمیدہ بیگم کے مصائب اور وفاداری کی داستان شریف النسا کی کج ادائیوں کا انجام مصنفہ منشی عبد الغفور صاحب صفحات ۲۳۲ - ۴ر

گودڑ کا لال ایک نہایت دلچسپ اخلاقی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا طبعزاد فسانہ کہ جس میں ایک ہندوستانی خاندان کی حسن معاشرت کو نہایت خوبی سے قلمبند کیا گیا ہے مصنفہ محترمہ والدہ صاحبہ سید محمد افضل صاحب بی۔ اے حصہ اول و دوئم صفحات ۶۴۶ - ۹ لعہ

روح لیلےٰ۔ اس میں عجیب روحانی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک شخص ایک مرد لطلی کی روح کو اس کی وفات کے وقت ایسا محبوس کرتا ہے کہ وہ جسم کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اس کو زندہ کر کے اس کے ذریعہ سے بہت سے روحانی مسائل کے حل کرنے کا کام نکالتا ہے۔ صفحات ۲۰۷ - للعہ

تمناے دید۔ مصنفہ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی قابل دید کتاب ۱۰ ر

رومۃ الکبریٰ کی آتشزدگی۔ یعنی نیرو قیصر روم کے زمانہ کا ایک دلچسپ تاریخی قصہ قابل ملاحظہ۔ مجلد ۱۰ ر

حکایات دلچسپ۔ یہ ان حکایات کا اردو ترجمہ ہے جن کو ساتویں ملک کے مشہور اور عظیم ڈراما کے استاد بے نظیر شکسپیئر کے منظوم کھیل سے زبان انگریزی کے مشہور و معروف ادیب چارلس لیمب نے اختصار و لطافت بار کے ساتھ نثر میں تحریر کیا ہے اور اب یہ حکایات شائقین کی ضیافت طبع کے لئے اردو میں نہایت قابلیت کے ساتھ ترجمہ کی گئی ہیں۔ ۸ر

حاجی بغلول مصنفہ جناب منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ ۴ر

احمق الذین ایضاً ۳ر

ملنے کا پتہ - دفتر ستون نیا گاؤں - لکھنؤ

الوپیا - اس ناول میں سر ٹامس مور نے ایک خیالی ملک و قوم کے نظم و نسق کا بیان کر کے اہل انگلستان کو بیدار کرنا چاہا ہے ۱۲؍

آولیس - روبنہ الکبیر کا ایک خاص واقعہ ناول کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے - نہایت دردناک و پر تاثیر قصہ ہے - ۸؍

وکرم اروسی یعنی مہاکوی کالیداس کے ایک مشہور ناٹک کا ترجمہ معہ ایک بسیط مقدمہ کے جس میں ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مترجمہ جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی اے - قابل دید کتاب ہے عہ؍

قاسم و زہرہ - منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی اس منظوم ڈرامے کے مصنف ہیں شروع سے ختم تک زبان شستہ خیالات پاکیزہ طرز ادا انتہا کا دلآویز شوخی اور بانکپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے نیچرل کیفیات و جذبات میں از سرتا پا ڈوبا ہوا ہے منظر دلفریب ہیں ۸؍

انتخاب زریں - ملک کی ایک مشہور انشا پرداز خاتون کے زور قلم کا یہ تازہ کارنامہ ہے اس میں قابل مصنفہ نے اپنے صنف کی جانب سے جنس ذکور کی خدمت میں اپیل کیا ہے کہ شوہر کے انتخاب میں اس غریب کی رائے کو بھی قابل وقعت سمجھ کر حاصل کر لیا جایا کرے - ۳؍

وصال - منشی درگا سہائے صاحب مرحوم کی دلکش تصنیف - ۸؍

اتالیق بی بی - جس میں شوہر طلبہ

کی بے معنی نکتہ چینی اور اہل خدا کا بیوں کا ابہت خاک دکھایا گیا ہے عہ؍

جذبات بھاشا - بھاشا کے شاعر کا قدرتی مناظر کی تصویر کھینچنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے خودداری - حیا - غرور حسن - محبت یہ وہ جذبات ہیں جن پر بھاشا کی شاعری کا ستون کھڑا ہے - سیدھی سادی آسان تشبیہات دلوں میں چٹکیاں لے لیتی ہیں - جذبات بھاشا میں ملک کے قابل انشا پرداز حضرت نیاز فتحپوری نے ان دوہوں کے معنی بیان کئے ہیں - قیمت مجلد ۱۲؍

کتب تاریخ

تاریخ اودھ - نواب برہان الملک سعادت خان کے عہد سے واجد علی شاہ کی معزولی تک کے مفصل حالات درج ہیں - یہ مستند و نایاب کتب تواریخ سے مرتب کی گئی ہے - اس کے مؤلف جناب نجم الغنی صاحب رامپوری نے تحقیقات اور تاریخ اخذ کرنے میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی ہے جس پر زبان اردو کو بجا ناز ہے - اور دلچسپی فرضی افسانوں سے کہیں بڑھی ہوئی ہے - تاریخ فرمانروایان اودھ کے دربار کی پوری تصویریں دکھاتی ہے - مکمل چار جلدوں کی قیمت سللہ؍

یادگار دربار اسلام جلد اول یعنی حضرت محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلعم کے سوانحات عمری صفحات ۲۶۰

جلد دوم جس میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہم خلفا کے

ملنے کا پتہ دفتر تمدن نیا گاؤں لکھنؤ

نپولین کے مفصل سوانح عمری فتوحات انتظامات خانگی حالات وغیرہ کی پوری تحقیق کے ساتھ قلمبند ہوئے ہیں۔ قابل دید کتاب ہے صفحات ۵۷۶ قیمت ہر دو جلد ۳ روپے۔

تاریخ اندلس مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت یورپ میں لاجواب کتاب ہے۔ ۲ روپے

علمائے سلف مولانا محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈہ کی مشہور تصنیف جس میں علمائے اسلام کے حالات درج ہیں۔ ۸ آنہ

شباب لکھنؤ۔ اگر آپ گذشتہ لکھنؤ کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ ایک انگریز سیاح نے سلطنت اودھ کے عروج کے زمانہ کے چشم دید حالات نہایت دلکش پیرایہ میں قلمبند کئے ہیں۔ مترجمہ منشی احمد علی صاحب بی۔ اے ۲ روپے

قدیم ہندوستان کی تہذیب مشہور ناول مسٹر آر سی۔ دت کی بے مثل تاریخ سویلزیشن آف انشنٹ انڈیا کا ترجمہ ۲ روپے

مکمل محاربات روس و جاپان حصہ اول و دوم۔ قیمت فی حصہ ۱۲ آنہ

تاریخ مذہب۔ اس میں مذہب کی ابتدا اور ترقی کا حال اور نیز بڑے مذاہب مثلاً بابل اور اسیریہ مصر اور چین اور دیگر ممالک و اقوام کے مذاہب کی مختصر تاریخ درج ہے۔ ۸ آنہ مجلد ۱۰ آنہ

صحیح حالات جاپان جس میں ملک جاپان کی ہر قسم کی حالات مادی۔ مذہبی۔ تعلیمی وغیرہ مع جاپان کی ترقی کی تاریخ اور جاپان کے شہنشاہ نامور مدبرین سپہ سالاران و امیر البحران وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ مجلد ۸ آنہ

علوم طبیعہ کی تاریخ۔ علوم طبیعہ کی ان تمام دریافتوں اور ایجادوں کی تشریح جو ساتویں صدی قبل مسیح سے لیکر انیسویں صدی تک وقتاً فوقتاً عمل میں آتی رہی ہیں۔ مسائل کی تحقیقات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم و جدید حکما نے ان علمی دریافتوں اور ایجادوں میں کیا کیا حصہ لیا۔ نہایت مفید کتاب ہے۔ مضامین کی وضاحت کے لئے صدہا تصویریں دی گئی ہیں۔ قیمت ہر دو جلد مجلد ۲ روپے

تاریخ یونان۔ سلطنت یونان کے عروج و زوال کے اسباب۔ نظام سلطنت معرکہ آرائیاں اور فتوحات وغیرہ کے مفصل حالات۔ ۸ آنہ

تاریخ مصر جس میں قدیم زمانہ کے مصریوں کی رسم و رواج۔ طرز معاشرت۔ عادات و خصائل۔ تمدن۔ معبودوں۔ نظم الاصنام۔ نظام سلطنت معرکہ آرائیاں اور فتوحات۔ عروج و زوال کے اسباب علم و فنون وغیرہ کے مفصل حالات درج ہیں۔ بالتصویر ۸ آنہ

تاریخ روم اس کتاب میں معتبر مصنف نے سلطنت روما کی ابتدا سے شروع کر کے روم کی تاریخ جلیل القدر قیاصرہ کے عہد انتظام و بہت التزام کے اختتام تک بڑی دلچسپ صورت میں قلمبند کیا ہے۔ ۸ آنہ

تاریخ تمدن یعنی سر ہنری طامس بکل کی مشہور تصنیف "ہسٹری آف سویلزیشن" کا ترجمہ شروع

ملنے کا پتہ:- دفتر تمدن نیا گاؤں لکھنؤ

مرحوم مغفور منشی احمد علی صاحب بی۔ اے۔ ایل
ایل۔ بی وکیل۔ قیمت ۴
تذکرہ بہادران اسلام یہ ایک لاجواب
اور قابل دید کتاب ہے۔ ہر ایک مسلمان کے مطالعہ
میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے اسلاف کے
کارناموں سے واقف رہ سکے صفحات ۲۵۴
رعایتی قیمت ۱۲
گنج شایگان قدیم شاہان ایران سے لیکر
اس وقت تک کی دنیا بھر کی سلطنتوں ریاستوں
وغیرہ کے سونے چاندی کے سکوں کی دونوں
رخ کی اصلی تصویریں معہ حالات و وزن وغیرہ
قیمت ۸

سوانحات عمری

الہارون سوانحعمری خلیفہ ہارون رشید اعظم
معہ نقشہ سلطنت عباسیہ و منظر دار الخلافہ بغداد ۱۲
حیات نور الدین محمود یعنی ملک العادل
سلطان نور الدین زنگی نور اللہ تربتہ فاتح شام
و جزیرہ مصر کی مفصل سوانحعمری۔ ۱۰
یادگار سعدی یعنی سعدی شیرازی علیہ
الرحمۃ کی سوانحعمری اور ان کی جملہ اخلاقی تصانیف
نظم کا اردو خلاصہ اور ناصحانہ اشعار و حکایات
کا انتخاب قیمت ۸
حیات حافظ جس میں لسان الغیب خواجہ حافظ
شیرازی کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں اور
انکی شاعری پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے ۱۲

بنت الرسول صلعم سیدۃ النساء حضرت فاطمہ رضی
کی مکمل واقف اس کتاب کو حضرت سیماب اکبر آبادی
نے مکمل اور مستورات کے لئے لکھا ہے۔ حجم ۹۴
صفحات قیمت رعایتی ۵
جہاں آرا شاہجہان بادشاہ کی فاضل بیٹی جہاں آرا
بیگم کی سوانحعمری۔ اس کے اعلیٰ سوشل اور پولیٹیکل
کارنامے۔ مورخین یورپ کی نکتہ چینیوں پر محققانہ
نظر۔ کاغذ وغیرہ عمدہ قیمت رعایتی ۸
مشاہیر بنی نوع انسان آدم یعنی ان ہمدردان
بنی نوع انسان کی سوانحعمریوں کا مجموعہ جس کے مطالعہ
سے ہر شخص حب انسانی سے بھر جاتا ہے۔ ۲
مشاہیر عالم اس مختصر رسالہ میں ان مشاہیر عالم کے
اسمائے گرامی منسلک ہیں جن کی اولوالعزمیاں طرح طرح
کے کارہائے نمایاں کے متعلق آسمان شہرت پر چمک
رہی ہیں قیمت ۸

کتب متعلق اسلام

ادلۃ الکرم فی اثبات عقاید الاسلام جس
میں ہر ایک عقیدہ اسلام کا ثبوت علوم جدیدہ
و سائنس کی رو سے دیا گیا ہے۔ قابل دید کتاب
ہے قیمت ۸
چمنستان عرب غنچہ حج اس کتاب میں
قرآن شریف۔ احادیث مبارک۔ سیر و تواریخ
سے حج مکہ معظمہ۔ کعبہ مقدسہ۔ مدینہ منورہ اور عرب
کے تاریخی حالات بہت تحقیق و تفصیل سے بیان
کئے گئے ہیں۔ ۱۰ المشتہر منیجر تمدن

جنوری ۱۹۱۸ء

جلد ۵ — نمبر ۱

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ایم۔ اے قاری (علیگ) خلف اکبر جناب قاری

محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

پبلشر محمد عباس حسین قاری — نارورن انڈیا پرنٹنگ پریس لکھنؤ میں چھپا — پرنٹر نواب علی

قیمت سالانہ ۳ر — مقام اشاعت نیا گاؤں۔ لکھنؤ — نمونہ کے پرچہ کی قیمت ۵ر

ناول اور افسانے

طلسم: والٹر اسکاٹ کے ناول طلسمات کا ترجمہ صفحہ ۱۷۰ قیمت ۱۲ر

مونگے کا جزیرہ: - انگریزی جہازرانوں کے عجیب وغریب سفر و مہم کے صفحہ ۲۹۶ قیمت - ۸ر

دہن شیر: - رومی بادشاہوں کا جور و ظلم کا ناول صفحہ ۲۳۲ قیمت ۸ر

دور دراز ملک کے عجائبات: - چند نوجوانوں کے انگلستان سے جنوبی امریکہ تک سفرناموں کے پیرایہ مین قیمت ۸ر

روم الکبریٰ کی آتشزدگی: - قیصر روم کے عہد کا تاریخی ناول مجلد ۱۰ر

جان ہیلفکس جنٹلمین: - ایک نوجوان لڑکے کے حالات - کسطرح ادنی حالت سے اپنی جوانمردی سے ترقی کرکے دولتمند ہوگیا صفحہ ۶۴۰ قیمت ... ۱۲ر

سرگذشت رابنس کروسو: - (صفحہ ۲۹۲) انگلستان کے ایک مشہور جہازراں اور سیاح کے زندگانی کے حالات بہت دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۲ر

افسون: - بالکل سچی سرگذشت اور تاریخی فسانہ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی دردناک تصویر قیمت ... عہ

ہاجرہ: - ایک دلچسپ اور اعلےٰ درجہ کے ترکی ناول کا ترجمہ قیمت ۸ر

اوٹوپیا: - ایک خیالی قوم کی طرز معاشرت وغیرہ کے پیرایہ مین ایک فلاسفر نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہین مع تصویر ۹۶ - قیمت ۴ر

بزم اکبری: - اسمیں شہنشاہ اکبر اور اسکے جلیل القدر پنجہزاری منصب دار جیب خاں کے دلچسپ حالات حاکم مالوہ باز بہادر کی شاہزادی روپمتی کے حسن و عشق کی پُردرد داستان خاقان اکبر کی لشکر کشی سلطان احمدنگر کی تباہی اور دیگر تاریخی واقعات نرالے ڈھنگ سے قلمبند کیے گئے ہیں صفحات ۴۴۴ قیمت ۱ر

علمی ادبی اور اخلاقی کتابین

چمنستان عرب عرف حج: - قرآن شریف احادیث اور تواریخ سے حج مکہ معظمہ کعبہ مقدسہ مدینہ منورہ اور عرب کے تاریخی جغرافیائی حالات اس کتاب میں نہایت تفصیل سے درج کیے گئے ہیں ادعیہ حج بھی کتاب میں مندرج ہیں قیمت .... عہ

اتالیق بی بی: - جسمیں عورتوں شوہروں کی باہمی نکتہ چینی اور بیجا شکایت کا بہت سچا خاکہ دکھایا گیا ہے قیمت ۸ر

رموز فطرت: - علم طبیعات علم طبقات الارض جغرافیہ طبیعی اور ثوابت و سیارہ کے ابتدائی اور بنیادی اصول کی تشریح ۱۲ر

سیر یورپ: - ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم ریاست بھوپال کے سفر یورپ کا روزنامچہ جسمیں تمام واقعات خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں عکسی تصاویر شامل ہیں کاغذ و چھپائی نہایت اعلےٰ صفحات ۶۰۳ قسم اول ۱۲ر قسم دوم ۱۲ر

انقلاب ٹرکی: - سلطنت عثمانیہ کے گذشتہ انقلاب اور پارلیمنٹری دور کے آغاز کی ایک مفصل اور جامع تاریخ مؤلفہ منشی عبد الرؤف خاں صاحب آلفت ... ۸ر

نیشنل ڈراما: ہندو مسلمانوں کی موجودہ حالت انکو شرم دلانے کا نیا طریقہ اور تعلیم کی ضرورت کے اظہار کا جدید طرز قیمت ۸ر

السنہ مشرقیہ: - عربی سنسکرت اور فارسی زبان کی دلچسپ تاریخ ہر زبان کی ترقی و تغیر اور زبانوں کے نمونے نہایت عمدہ تحقیق سے لکھے گئے ہین قیمت .. ۶ر

خیابان عجم: - شعرائے عجم کی سوانحعمریاں اور انکے کلام کا انتخاب مع ترجمہ انگریزی قیمت ... ۱۰ر

زندگانی بےنظیر: - جسمیں نظیر اکبرآبادی کے حالات و خیالات سے انگریزی اصول تذکرہ نویسی پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے مؤلفہ سید عبد الغفور صاحب شہباز قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ: - دفتر رسالہ "تمدن" نیا گاؤں - لکھنؤ

علمی ادبی اور اخلاقی کتب کا ذخیرہ

اخلاق محمدی:- اس کتاب میں طرز معاشرت ادب مجالس اخلاق کسب معاش ہمت و استقلال ہمدردی حقوق الٰہی وغیرہ تمام صفات حسنہ کے متعلق آیات و احادیث جمع کر کے مع اصل و ترجمہ کے طبع کی گئی ہیں علم اخلاق میں اس طرز کی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی مسلمانوں کے لیے اسکا مطالعہ مفید ہے قیمت ہر دو حصہ عہ

المدنیۃ الاسلام:- یہ کتاب ایک زبردست عالم حضرت مولانا ظفر مہدی کی تصنیف ہے۔ مغربی تعلیم اور مغربی علوم و فنون کی بدولت جو شکوک اور شبہات مذہب کیطرف سے پیدا ہو رہے ہیں اور الحاد و دہریت کا جو سیلاب مغرب کیطرف سے چلا آ رہا ہے۔ اسکے استیصال کے لیے یہ کتاب آب حیات سے کم نہیں ہے قیمت ۸ر

حکمت عملی:- فلسفۂ عملی پر مبسوط اور جامع کتاب ہے اسمیں افراد انسانی کی روحانی ارتقا کی تدابیر کے ساتھ قومی ترقی اور عزت حاصل کرنے کے اصول بھی بیان کیے ہیں عورتوں کی تعلیم اور حقوق کی نگہداشت کا ذکر بھی موقع بموقع کیا ہے عبارت نہایت دلچسپ ہے لکھائی چھپائی اعلےٰ درجہ کی قیمت ۱۲ر

جذبات بھاشا:- بھاشا کے کلام قدرتی مناظر کی تصویر کھینچنا اسکے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے خودداری حیا غرور حسن محبت و جذبات میں بھاشا کی شاعری کا ستون کھڑا ہے سارے زمان تشبیہات دلنشین چٹکیاں لیتی ہے جذبات بھاشا میں ملک کے قابل انشاپرداز حضرت نیاز فتحپوری نے ان دوہوں کے معنے بیان کیے ہیں ۱۲ر

حیات النذیر:- شمس العلما حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم ایل ایل ڈی دہلوی کی زندگی کے مفصل حالات قیمت ۱۲ر مجلد ..... ؎

حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتاب

میلاد نامہ

اگر آپ نے اسے اب تک نہ دیکھا ہو تو جلد طلب فرمائیے۔ حقیقت میں اسکے مطالعہ کا یہ سب سے بہتر زمانہ ہے۔ رسول اللہ کا ذکر میلاد نامے میں جس شان سے لکھا گیا ہے دنیا اور کہیں نہ ملے گا۔ آنحضرت کے بزرگوں کے حالات سے شروع کیا ہے اور ولادت کا بیان نظم و نثر کی زیبائش سے قلم بند کر کے بچپن جوانی کے کل واقعات قلمبند کیے ہیں پھر تتمہ میں رسالت سے لیکر وفات تک کی کیفیت ہے آخر میں حضور کے اخلاق۔ عادات لباس و طعام کا حال ہے حجم دس جزو قیمت عہ، علاوہ محصول۔

انسان:- انسان کی تشریح علمی رنگ میں ۸ر

آثار خیر:- اسلامی عہد حکومت کے محکمہ پبلک ورک مدرسوں سڑکوں نہروں وغیرہ کے حالات ... عہ

خیالات ممتاز:- جسمیں اہل ہنود کا مذہب اور اسکی حقیقت بودھ مذہب کے بانی کا حال مسیحی اور یہودیوں اور آتش پرستوں کے اصول اور انکی اشاعت تثلیث کا ذکر دہریوں کے خیالات توحید اور رسالت و فطرت کے مقابلہ کا بیان اور پاک اسلام اور اسکے بانی کا تذکرہ اور دنیا میں کس قدر مذاہب شائع ہیں اسلام کس مذہب کے موافق اور کس کا مخالف ہے مذہب کیا چیز ہے اور دنیا کو اس سے کیا فائدہ ہے قابل دید کتاب ہے قیمت ۸ر

تواریخ مذہب:- اس کتاب میں مذہب کی ابتدا اور ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذہب مثلاً بابل و اسوریہ مصر و چین اور دیگر اقوام و ممالک کے مذہب کی تاریخ درج ہے قیمت ۸ر مجلد ۱۰ر

ملنے کا پتہ:- منیجر تمدن بک ایجنسی نیا گاؤں لکھنؤ

ڈاک

چناں میان من و یار راہ مسدود است
کہ رسم نامہ و پیغام بر طرف شد و رفت

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا میں کتنی مدت سے تحریر و ترقیم کی بنیاد پڑی اور پہلے پہل کیونکر اس کی تحریک ہوئی اگرچہ شروع میں غالباً اشارات اور کنایوں پر ہی کاربراری ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ بجائے اُن اشاروں کے یہ ابجدی یا حروفی اور نفراتی اعلامت رکھ لیے گئے۔

شروع شروع ان ابجدی اشاروں کی اشاعت اور عمل سے اکثر انسان تعجب کرتے ہوں گے کیونکہ انسان کی یہ عادت میں داخل ہے کہ وہ شروع شروع میں ہر ایک نئی شے کے دیکھنے سے تعجب کرنے لگتا ہے اگرچہ وہ خود اُس کی خود ساختہ ہی ہوتی ہے۔ تحریر اور ترسیم کی بدولت انسانی کاروبار میں اگر ایک طرف سہولتیں پیدا ہوگئیں

تو دوسری طرف کچھ دقتیں بھی پیدا ہوئیں۔ دنیا کی ہر چیز دونوں پہلو رکھتی ہے کبھی فطرتاً کوئی شے مفید ہوتی ہے اور استعمالاً مضر اور کبھی استعمالاً مفید اور طبعاً مضر دنیا کی رونق کا یہی ذریعہ ہے اور اسی پر یہ سلسلہ چل رہا ہے تحریر دیکھو کیسی مفید ہے مگر اس کی بدولت بھی دنیا بھر میں جو جو جھگڑے اور تنازعات اس وقت برپا ہیں اُن کا کون شمار کر سکتا ہے اگر تحریر نہ ہوتی تو دنیا کے بہت سے تنازعات ہی نہ ہوتے جب تک اشارات اور زبان پر کاروبار چلتے تھے تب تک تو سہولت اور امن رہا اور جب نوبت بہ تحریر آئی تو وہ بات باقی نہ رہی۔

دلے در سینۂ من بود لیکن ہا
نہ دانم چہ شد خوں گشت سر یافت

لوگ تہذیب تہذیب کی دُہائی دیتے ہیں جب سلسلۂ تحریر نکلا ہوگا تو اُس وقت بھی چاروں طرف اسی کا شور و غلغلہ ہوگا کون جانتا تھا کہ اس کی بدولت فائدہ کے علاوہ خرابی ہوگی اور حروف و نقاط کے گیروں میں بھی اس قدر پیچیدگیاں ہوں گی زبان بے اعتبار ہو جاوے گی قول صداقت سے دور جا پڑیں گے قلم اور کاغذ یا چند حروف و الفاظ یا فقرات پر اعتبار کیا جائے گا۔ زبانی باتیں آئی گئی ہوا کی ہستی رکھیں گی۔

دوسری طرف

تحریر کی بدولت بیسیوں علوم و فنون کی بنیاد بھی رکھی گئی اگر تحریر نہ ہوتی تو حافظہ کس قدر کام دے سکتا یہ تحریر ہی کا صدقہ ہے کہ آج صدیوں کی باتیں جوں کی توں ثابت اور زندہ ہیں تاریخ تحریر ہی کی بدولت رونق بازار واقعات ہے اور تذکرات ترقیم ہی کی وجہ سے موجب ثبات عالم و عالمیاں ہیں مذاہب باوجود تحریر میں آنے کے بھی اسقدر اختلاف رکھتے ہیں فلسفۂ ترقیمی کا پہلو بھی کسی کل نہیں بیٹھتا

اگر یہ سب سلسلہ زبانی ہی ہوتا تو کچھ اور ہی سماں ہوتا لیکن ذرا دوسرا رخ بھی دیکھو اگر تحریر کا ایک رخ اس قدر مفید ہے تو دوسری طرف مضر بھی ثابت ہو رہا ہے یہ تاریخ ہی ہے جس کی بدولت اس تہذیب کے زمانہ میں بھی قومیں چھری کٹاری ہو رہی ہیں یاد زمکاں کے جوش اور ولولے میں دل بدنامی وی ہو رہی ہے اگر آج یہ تاریخی فسانے مٹ جائیں تو دنیا کا رنگ ہی کچھ اور ہو جائے یہ تاریخ اور تحریر ہی کا صدقہ یا اثر ہے کہ آج لوگ آپس میں باوجود زندہ انسان ہونے کے مردوں پر لڑ رہے ہیں ذرا وحشی لوگوں میں جا کر دیکھو جہاں زبان ہی زبان ہے تحریر کا نام نہیں حروف و الفاظ کا نشان نہیں جو بات منھ اور زبان سے کی وہی پتھر کی لکیر ہو گئی نہ سیاہی نہ دوات نہ کاغذ وہی الفاظ اور وہی فقرات جو منھ اور زبان سے نکل کر ہوا میں اڑ گئے اخیر تک ثابت اور قائم رہتے ہیں نہ کہ تحریر کی طرح کہ باوجود ایک قسم کی پابندی کے بھی موجب کلفت ثابت ہوتے ہیں، سو سو تاویلیں کی جاتی ہیں الفاظ اول تو لکھتے ہی سوچ سمجھ کر ہیں بعد میں مفہوم قرار دیتے ہیں سو سو تاویلیں اور تعبیریں ہوتی ہیں ابتدائی عدالتوں میں بحث ہو کر ان کا کوئی نہ کوئی مفہوم قرار دیا جاتا ہے اور عدالتہائے اپیل میں وہی لفظ کچھ اور معانی پیدا کر لیتے ہیں قطع نظر ان کہانیوں کے دیکھنا چاہیے کہ تحریر کیا ہے۔

ایک یادداشت غم و غصہ خوشی و فرحت کی۔

ایک پیشین گوئی مختلف حالات کی۔

ایک خوش خبری یا ایک بد خبری۔

ایک تفریح یا ایک تنغص

ایک کامرانی یا ایک ناکامی۔

آؤ ہم ذرا ڈاکیہ کے تھیلے کا تماشا دکھائیں صبح ہی صبح ہر ڈاکیہ گلی بہ گلی

کوچہ بہ کوچہ منزل بہ منزل کوٹھی بہ کوٹھی کمرہ بہ کمرہ اور بازار بہ بازار بیگ میں لوگوں کی قسمتیں بند کرکے لیے پھرتا ہے گو خود اُسے اُن قسمتوں کی کیفیت کا علم نہیں ہوتا مگر ہزاروں کی قسمتیں اُس کی بغل میں ہوتی ہیں ہزاروں خوش خبریاں دیتا ہے اور ہزاروں ہی غم واندوہ بھی روز تقسیم کرتا ہے ایک چھوٹے سے بیگ میں اسقدر درد مختلف قسمتوں کا بند ہوتا ہے کہ سوچنے والوں کے واسطے ایک عجب قسم کا تماشا رکھتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ ڈاکیہ کس کس کی قسمتیں اُٹھائے پھرتا ہے اور بیگ میں کس کس کا نصیبہ بند ہے اور اُس کے نکلنے سے گلی کوچوں میں کیا کچھ ہجوم مسرت اور ہجوم غموم ہوگا۔

آں شوخ زدلہا چہ خبر داشتہ باشد
طفل است ز دنیا چہ خبر داشتہ باشد

اے بیگ یہ تیرا ہی حوصلہ اور تیرا ہی ہاضمہ ہے کہ اسقدر لوگوں کی قسمتیں اور فرحت وغم اُٹھائے پھرتا ہے۔ ڈاکیہ کی بغل پھٹ کیوں نہیں جاتی ڈاکیہ کے دل پر کیوں کوئی اثر نہیں ہوتا ڈاکیہ کس حوصلہ سے یہ بارِ اعنیار اُٹھائے پھرتا ہے۔ وہ دیکھو ڈاکیہ بیگ کھول کر ایک گھر والے کو خط دے رہا ہے ابھی وہ چند قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ گھر میں ایک کہرام مچ گیا لوگ رفتہ رفتہ جمع ہوتے جاتے ہیں کوٹھوں پر عورتیں آرہی ہیں۔ کوئی ڈاکیہ سے پوچھے جاتے جاتے یہ کیا آگ لگا چلے ہو پُرزہ کاغذ کیا دیا ایک آفت برپا کردی۔ ڈاکیہ چونکہ روزانہ ایسے ہی تماشے دیکھتا ہے اس واسطے مڑکر دیکھتا بھی نہیں پوچھنا تو جدا رہا کہ خط میں کیا بارود بھری تھی جو یہ کہرام مچ گیا پڑھتے یا پڑھاتے ہی بارود ے اڑی۔

چار قدم پرے ہی جاکر کسی دوسرے کو ایک اور خط نکال کر تھیلے سے دیتا ہے پڑھنے والے کی پڑھتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں چہرہ لال ہو جاتا ہے اور آنکھیں روشن

زور سے آواز دیتا ہے لو خدا کے فضل سے لڑکا با تعریف پاس ہوگیا مراد بر آئی یہ سُن کر ڈاکیہ بھی انعام کی خاطر لوٹ آتا ہے اور مبارکباد دیتا ہے اور بھر لے کر چلتا ہوتا ہے۔ ڈاکیہ بھی خوشی کا سماں دیکھ کر مڑ آیا سچ ہے غم کا کوئی شریک نہیں۔

نالہ ام آں سنگ دل ہرگز نخواہد کرد گوش
درد اگر صدرہ می دہد تغییر آوازہ مرا

سامنے ایک بڑے پیٹ یا بڑی توند والا کوئی مارواڑی دوکاندار کھڑا ہے چہرہ کہہ رہا ہے کہ کسی تار یا کسی خط کے انتظار میں ہے ڈاکیہ دیکھتے ہی لالہ جی کو خط نکال کر دیتا ہے لالہ جی شوق سے خط (مہاجنی) پڑھتے ہیں۔ ہاتھ سے خط گر پڑتا ہے اور لالہ جی کی توند نرم پڑ جاتی ہے شاگرد پوچھتا ہے کیوں خیر تو ہے۔ ایک آہ بھر کر لالہ جی فرماتے ہیں ہینگ کا نرخ ارزاں ہوگیا ہزاروں پر پانی پڑ گیا سال بھر کی کمائی تباہ ہوگئی ڈاکیہ یہ الفاظ سُنتے ہی رفو چکر ہوتا ہے وہ روزانہ ایسے تماشے اور سانحات دیکھتا ہے کس کس کے دروازے پر آوے اور کس کس سے ہمدردی کرے ایک ہو تو کچھ کرے بھی یہاں تو تھیلا ہی ایسی خبروں سے بھرا ہے

ہر سو کہ رو نہادیم در محنت اوفتادیم
دنیا برائے ماشد دار المحن سراپا

سامنے ایک اور کوٹھی دار کھڑے ہیں ڈاکیہ کارڈ پکڑا کر آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے کوٹھی دار بلا کر کارڈ پڑھوا تا ہے ڈاکیہ سُناتا ہے مہاراج چیف کورٹ سے مقدمہ جیتا گیا پوری ڈگری ہوگئی کوٹھی دار خوشی سے ایک اٹھنی ڈاکیہ کے ہاتھ پر رکھ کر خود اُچھلتا کودتا دکان کے اندر جا کر تھوڑے پیسے نکال کر نوکر دں چاکروں کی مٹھی گرماتا ہے۔

اگلی گلی میں ایک بڑھیا کھڑی ہے پیارے بچے کے خط کا انتظار دیکھ رہی ہے ڈاکیہ غور سے تھیلہ دیکھ کر کہتا ہے آج کوئی تمہارا خط نہیں آیا ہے غریب بڑھیا اپنا سا مُنہ لے کر واپس جاتی ہے۔

اب حلقہ نمبر (۲) آجاتا ہے یہاں صاحب لوگوں کی کوٹھیاں ہیں ولایتی ڈاک کا انتظار ہو رہا ہے ڈاکیہ ایک خط ایڈنبرا سے چلا ہوا میم صاحبہ کو دیتا ہے ولایت کا خط دیکھکر میم صاحبہ مارے خوشی کے پھولی نہیں سماتیں وطن مالوفہ کی خوشی بشرہ سے ٹپک رہی ہے دوڑ کر اندر کمرہ کے چلی جاتی ہیں اور غور سے پڑھنے لگتی ہیں وطن کی لگن بھی عجب شے ہے۔

دوسری کوٹھی میں ایک صاحب بہادر کو جو خوشی خوشی اپنے پائیں باغ میں مع اپنی میم صاحبہ کے سیر گشت لگا رہے ہیں ایک سرکاری لفافہ دیدیتا ہے صاحب بہادر غور سے پڑھتے ہیں کھولتے ہی بشرہ ذرا بدلا اور رنگ میں کچھ تبدیلی سی ہوئی میم صاحبہ نے پوچھا کیا بات ہے مُنہ سے بولے ہمارا بدلی ہوگیا نہ باغ یاد رہا اور نہ سینری۔

پیٹھ پرائی نوکری جی پرائے دس ۔ (پنجابی)

(پرائی نوکری پر افسوس دل دوسرے کے ہاتھ ہی میں رہتا ہے) صاحب بہادر ڈاکیہ کو ذرا گھور کر دیکھتے ہیں بھلا اس میں غریب ڈاکیہ کا کیا قصور اُسے کیا خبر کہ اس لفافہ میں کیا بند ہے اور کیا مضمون لکھتا ہے۔ راستہ میں ایک غریب پھٹے پرانے کپڑے پہنے دم یاس کا پرستار آہستہ آہستہ آرہا ہے ڈاکیہ کو دیکھکر بلند آواز سے میرا بھی کوئی خط ہے کہتا ہے۔ اُسکے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی بول اُٹھا اگر میرا ہو تو مجھے بھی دے دو۔

ڈاکیہ آہستگی سے ایک کا خط نکال کر دیتا ہے اور دوسرے کو جواب دیتا ہے

دوسرا آدمی خط کھول کر پڑھتا ہے اُس میں لکھا ہے کہ
نمبر دس ہزار دو سو چودہ میں تمھارے نام پر ایک لاکھ روپے ہزار کی لاٹری نکلی ہے۔
مکتوب الیہ شادی مرگ ہو جاتا ہے دوسرا آدمی بھی لاٹری ڈال چکا تھا اپنے نام پر کوئی اطلاع نہ پا کر یہ کہتے ہوئے جلدی جلدی سینۂ بریاں پر ٹھنڈا ہاتھ رکھ کر رخصت ہوتا ہے قسمت کے کھیل ہیں آخر جُوا جُوا ہے۔ اچھے بچے گناہ تو نہ ہوا۔ مال حرام کبھی رہ نہیں سکتا
دیکھو ایک ہی وقت ایک ہی تھیلے میں سے دو قسمتیں کس رنگ اور روپ کی نکلی ہیں اور دونوں کا حشر کیسا مختلف ہوا ہے۔ کامیاب یہ گاتا ہوا رخصت ہوتا ہے

ترا کہ گفت کہ اے سبزہ بستاں باش
بنوش یک دو سہ جامے و خود گلستاں باش

اور دوسرا بہ لبِ سوزاں یہ کہتا ہوا سر پہ کپڑا رکھ گزر جاتا ہے۔

منزل بہ کوے سوختہ جاناں خریدہ ام
مارا بجاے مُہر بود بر قبالہ داغ

عالم و عالمیان کی دو رنگی کا یہ حال ہے اور یہ ہے کیفیت طالع روشن اور طالع واژگوں کی۔
آگے کی دُکان پہ ڈاکیہ ایک نیلا لفافہ دیتا ہے جو کسی قدر وزنی ہے مکتوب الیہ لپک کر لے لیتا ہے کسی مطلوب کی چٹھی ہے پڑھتا ہے اور ہنستا ہے اور ساتھ ہی ٹہلتا بھی جاتا ہے غریب کا سارا دن اُسی میں گزر گیا۔

چرا باید تغافل کرد خوش چشماں بہ مشتاقے
کہ با صد آرزو چشم نگاہے از شما دارد

تھوڑی دیر کے بعد ایک گھبرایا ہوا شخص آتا اور پوچھتا ہے کیوں جی کوئی میرا خط اور تار بھی ہے ڈاکیہ ایک تار نکال کر دیتا ہے مکتوب الیہ پڑھتے ہی خوش خوش دوڑ جاتا ہے کیونکہ اس میں یہ خبر تھی کہ اس کا بھائی جو ولایت کے سفر میں تھا پرسوں بمبئی بندر پر اُترے گا۔

ڈاکیہ مٹھائی مانگتا ہے وہ حضرت ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے ہاتھ سے کچھ اشارہ کرتے جاتے ہیں شاید جس کا مطلب یہ ہے کہ پھر سہی۔

ہست نا صاف مشام طلب ما ورنہ

بوے یار از در و دیوار شنیدن دارد

اب بیگ خالی ہوتا جاتا ہے چٹھیاں جتنی تھیں سب بٹ چکیں دو تین ایسی چٹھیاں بھی نکلیں جن کا کوئی مکتوب الیہ نہیں ملتا ڈاکیہ پوچھ گچھ کے بعد نشان کرکے تھیلے میں رکھ لیتا ہے اور کچھ سبزی خرید کر فراغت پاکر گھر کی راہ لیتا ہے اسقدر تماشے خوشی و غم کے دیکھ کر اپنے گھر میں دم بھر آرام لیتا ہے۔ جتنے غم اور مسترتیں تھیں سب کو اپنے گھر کے دروازہ کے باہر چھوڑ آیا گھر میں داخل ہو کر سب قضیے تقسیم کے پاک تھے تھیلہ بھی خالی پڑا تھا۔ اور اپنا حافظہ بھی کوئی کیفیت یاد نہ رکھ سکا تھیلہ بزبان حال کہہ رہا تھا ایک باری تو پوری کر آیا ہوں اب دوسرے وقت کی ڈاک خدا جانے مجھ میں کیا کچھ بھر جاوے اور خدا جانے وہ کس قماش کی ہو اور اس میں کیا کچھ بھرا ہو۔

رحم بر حالم نداری گریہ مے آید مرا

یک دل و صد زخم کاری گریہ می آید مرا

ڈاکیہ دن بھر کا تھکا ماندہ تھوڑی دیر کے واسطے سو جاتا ہے خراٹے مارنے لگتا ہے خود بدولت سوتے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ دم کے دم میں کتنے گھروں میں

آگ لگا آئے ہیں اور کتنے گھروں کی آگ بجھا بھی آئے ہیں۔

گاہے بہ فرق گہہ بہ قدم کردہ ایم سعی

راہ بہر طریق بہ بیہودہ ایم ما

ڈاکیہ غریب کا کیا گناہ وہ جانتا ہی نہیں کہ خطوں کیا کچھ نہ ہوکر آیا ہے اور اُن کی کیا کچھ کیفیت ہے وہ عالم الغیب تو نہیں کہ لفافوں کے اندر کی تحریر بھی سمجھ لے اور اگر لفافہ کھولتا ہے تو جرم میں پھنستا ہے پیغام کی خوبی اور مضرت پیغام رساں کے ذمہ نہیں رہتی ہے پیغام رساں کا کیا ذمہ اور کیا کفالت ہے اگر ڈاکیہ کا کوئی ذمہ ہے تو یہ کہ وقت پر چٹھی پہنچا دیوے یہ تو لوگوں کا اپنا کام ہے کہ اچھی چٹھیاں لے لیا کریں اور بری نہ لیں مگر اُن سے بھی یہ کیونکر ہو سکتا ہے لفافہ کیا ہے ایک قسمت سربستہ۔

اسی طرح قدرتی ڈاک رساں بھی لوگوں کی قسمتیں تقسیم کرتے رہتے ہیں اُن کے لفافوں میں بھی بری بھلی قسمتیں بند ہوتی ہیں وہ بھی بعض گھروں میں آگ لگاتے ہیں اور بعض میں پانی چھڑکتے ہیں لوگ تقدیر و قسمت سے انکار کرتے ہیں پر ڈاکخانہ کا ڈاکیہ راز قسمت ہی کا تو سودا کرتا پھرتا ہے یہ بھی تو ایک تقدیر ہی ہے اور ایک نصیب و قسمت اور کیا ہوتی ہے اس کا رنگ و روپ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

جب ہم یہاں کی چٹھیوں کے اثرات کو روک نہیں سکتے تو کس طرح قدرتی چٹھیوں کے تاثرات سے بچ سکتے ہیں جس طرح ڈاکیہ ایک بری بھلی چٹھی ہاتھ میں دے کر رخصت ہو جاتا ہے اسی طرح قدرت کے ڈاکیے بھی تقسیم کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اُن کا بھی قدر کام ہے فرق صرف اسقدر ہے کہ یہ ڈاکیے نظر آ جاتے ہیں اور اُن کی تشخیص نہیں کی جا سکتی اگرچہ وہ بھی ایک طرح سے نظر آ جاتے ہیں مگر اُن کا نام ذرا مشکل سے لیا جاتا ہے۔

ایک ڈاک خانہ خود انسان کی طبیعت میں ہی کھلا ہوا ہے ہر روز کیا ہر لمحہ اس میں ڈاک آتی اور جاتی ہے خیالات کا تموج اور تصورات کا سلسلہ ایک ڈاک رسانی ہے ہم ہر گھڑی چٹھیاں بھیجتے بھی ہیں اور چٹھیاں اس ڈاک خانہ میں ڈالتے بھی ہیں نری چٹھیاں ہی نہیں آتی جاتیں سلسلۂ تار بھی کھلا ہے ہزاروں کوس تک ایک ہی سکنڈ میں خبر رسانی ہوتی رہتی ہے اور بیچ میں کوئی روک نہیں نہ کسی مصالحہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی سامان وغیرہ کی اس میں وائرلیس سے بھی زیادہ تیزی سے آمد و رفت رہتی ہے خوشی کی خبریں بھی آتی ہیں اور غم کی بھی مسرت افزا بھی اور مسرت کش بھی ان میں سے بعض خبریں یقینی ہوتی ہیں اور بعض غلط سلط بھی اس ڈاک خانہ کی خبریں دل و دماغ پر ایک خصوصیت سے اثر کرتی ہیں اور ان کی فرداً فرداً تقسیم بھی ہوتی ہے ڈاکیہ خیال ایسا تیز رفتار ہوتا ہے کہ بغیر کسی تردد اور تامل کے صبح سے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک کام میں مصروف رہتا ہے۔ ڈاکیہ ڈاک تو آرام بھی کر لیتا ہے لیکن ڈاکیہ خیال بیداری اور خواب دونوں میں تقسیم میں لگا رہتا ہے۔

تعجب ہے کہ لوگ معمولی ڈاکیہ کے تو انتظار میں رہتے ہیں اور اس کی تقسیم کی ہوئی چٹھیاں تو تامل اور غور سے پڑھتے ہیں اور خیال کا ڈاکیہ جو کچھ منٹ بہ منٹ شب و روز تقسیم کر رہا ہے بعض دفعہ اس طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے حالانکہ یہ ڈاک بھی ایک لازمی ڈاک ہے اور اسی ڈاک پر زندگی کا دار و مدار اور یہی ڈاک دوسری ڈاک کی موجد اور مفسر ہے۔

جو لوگ اس ڈاک کی چٹھیاں پڑھتے ہیں وہ ان ممالک کی رفتہ رفتہ خبریں پانے لگتے ہیں جو ممالک اس دنیا کے ممالک سے نرالے اور دوسرے رنگ کے ہیں یہاں کی ڈاک یہیں ختم ہو جاتی ہے اور وجدانی ڈاک وجدانی رنگ میں دوسری زندگی میں بھی برابر جاری رہے گی اس کا سلسلہ یہاں سے شروع ہو کر دور تک جاتا ہے۔

ہر منظر قدرت بجائے خود ایک ڈاکیہ ہے ہر منظر ہر گھڑی ایک ایک چٹھی دیتا ہے جس کا مضمون بہت ہی پُر لطف اور جدید ہوتا ہے۔ ان چٹھیوں کو پڑھنا خود کو ان مناظر قدرت سے آشنا بنا تا ہے اور اُن سے آشنا ہونا خود کو رموز قدرت سے واقف کرتا ہے اور رموز قدرت سے واقفیت پیدا کرنا علوم وفنون کی بنیاد رکھنا ہے اور علوم وفنون کاروباری زندگی اور نیز معادی زندگی کا سہارا اور جزو اعظم ہیں۔

اگرچہ اس مادی ڈاک میں بھی مختلف قسم کی چٹھیاں آتی ہیں اور اُس کا سلسلہ بھی ایک حیرت افزا وسعت رکھتا ہے مگر قدرتی ڈاک کا سلسلہ جو وسعت اور جو تحیر رکھتا ہے وہ کچھ اور ہی سماں ہے اور وہی سماں دراصل ایک سماں ہے۔

ما طول وعرض قصۂ خود را نہ دادہ ایم
ایں یک دو سطر خدمت جاناں کنیم عرض

سلطان احمد

غزل

مائل جور اگر وہ بت بے پیر نہیں — میں یہ سمجھوں گا مرے عشق میں تاثیر نہیں
شیوۂ صبح نہیں نالۂ شبگیر نہیں — کیا [illegible] گلو گیر نہیں
بن گیا شہر خموشاں ہے یہ زندان جنون — [illegible] کی [illegible] نہیں
سر وہ کیا سر ہے کہ جس میں نہیں تیرا سودا — دل وہ کیا دل ہے جو ترے عشق کا نخچیر نہیں
چھیڑ لی ہے مری وحشت نے یہ کہہ کہہ کر — خانۂ عشق ہے یہ [illegible] نہیں
دعوت درد تمہیں دیتی ہے اے اہل جنوں — نہ کھل تو یہ صدائے لب زنجیر نہیں
کہتے ہیں شامل تقدیر ہے تدبیر مگر — اپنی تقدیر تو شرمندۂ تدبیر نہیں
کیسے سلجھائے مرے عقدۂ تقدیر کو وہ — آپ کا عقدہ مرا ناخن تدبیر نہیں

خاموشی ہوتی ہے [illegible] جو میں [illegible]
میں سراپا ہوں زباں بلبل تصویر نہیں

حکیم مظفر حسین آہ دہلوی

علّت و معلول

یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ موجوداتِ عالم کی کسی شے پرہستی کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں کیونکہ ہر مادی شے کے اجزا ایک دوسرے میں منتقل ہوکر قائم رہتے ہیں۔

مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر ایک ہستی ایک وقت معینہ تک اپنی اصلی ہیئت میں برقرار رہتی ہے اور بعد ازاں زمانہ اسکو فنا کر دیتا ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے اور اس کی ہر شے قانون فطرت کے تابع ہے کوئی تبدیل یا تغیر بلا سبب وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ یا بالفاظ دیگر اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔ موجودات عالم کی طرح افعال انسانی پر بھی یہی قانون حاوی ہے۔ اگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو علت و معلول کا مسئلہ ہی فلسفۂ اخلاق کی بنا ہے۔ انسان کی ادنیٰ لغزشیں اسکو قعر مذلت میں گرا دیتی ہیں اور بعض اوقات اُسکی ہلاکت کا موجب بن جاتی ہیں۔ علت و معلول کی زنجیر کی کڑیاں کچھ ایسی بے ربط و غیر مسلسل ہوتی ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہو جاتی ہے۔ نہ آغاز سے انجام کا پتہ چلتا ہے نہ انجام آغاز کا سُراغ لگا سکتا ہے یہ عجز ادراک انسانی کی کمزوری کی دلیل ہے۔

علم التواریخ اور اس قسم کے دوسرے علوم صرف اسی لیے وضع کیے گئے ہیں کہ عقل انسانی کو علت و معلول کی محیر العقول داستانیں از بر ہو جائیں اور وہ ان سے سبق حاصل کرکے اس اہم مسئلہ کا کلیہ قائم کر سکے۔ تاریخی واقعات اعادہ کرتے رہتے ہیں یعنی جن اسباب نے مل کر کبھی کوئی خاص نتیجہ مرتب کیا ہے اگر وہی اسباب پھر پیدا ہو جائیں تو یقینی وہی نتیجہ پیدا کریں گے۔ غرضیکہ علت و معلول کی زلف برہم سلجھانے کے لیے انسان کو مختلف علوم کے شانے استعمال کرنے پڑے مگر نہ اس کی گرہ کھل سکی اور نہ اس کی

طولانی پر عبور ہوسکا۔

(۱) ہوا کا جھونکا چلتا ہے۔ بخارات کے منتشر اجزا مخلوط ہو ہو کر ابر کی صورت میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ آتشگیر مادے برق تاباں بن کر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ بخارات کے اجزا کا اتصال ابر کی سفیدی کو سیاہی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جب ان کی جسامت ہوا کے اجزا کی قد و قامت اور قوت تحمل سے بڑھ جاتی ہے تو یہ طفل شیر خوار کی طرح گہوارۂ سماوی سے نکل کر مادر گیتی کے آغوش میں پناہ گزین ہونے لگتے ہیں زمین انکے استقبال کے لیے فرش راہ ہو جاتی ہے۔ شاخیں ان کے خیر مقدم میں آغوش کشا نظر آتی ہیں۔ آب باراں نازنینان چمن کو جامۂ عروسی پہناتا ہے اور عالم نباتات کی روح رواں بن کر ذی روح ہستیوں کا کفیل ہوتا ہے۔ صدف تشنہ لب کی سیری بحر ذخار سے نہیں ہوتی مگر اس پانی کی ایک بوند سے ہو جاتی ہے جو اس کے دہن میں جا کر ایک ناچیز قطرے سے دُر نایاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر پانی کی بوند صدف کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ صدف کا سینہ چاک ہو جاتا ہے اور خود غرض غواص کے ہاتھ گوہر مقصود آتا ہے۔ یہ گوہر رفتہ رفتہ جوہریوں کے ہاتھ فروخت ہو کر ایوان شاہی تک باریاب ہوتا ہے۔ اور تاج خسروی میں آویزاں ہو کر اس کی زینت اور منزلت کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ان تمام معلولوں کی علت صرف ایک ہوا کا جھونکا ہے۔

(۲) تخم کو لیجیے۔ باغبان اس کو قطعۂ زمین میں بوتا ہے۔ آفتاب کی حدت زمین کی تری اور باغبان کے تحفظ و آبیاری سے اس میں نشو و نما شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ پودا اور پھر پودے سے درخت بن جاتا ہے موسم بہار میں کلیاں آتی ہیں پھول کھلتے ہیں جن کی نکہت جانفزائے نفس کا دماغ معطر ہو جاتا ہے وہ اس پھول کی جستجو میں دور دراز کی مسافت طے کرتی ہے۔ اپنے لبوں سے اسکے بوسے

لیتی ہے اور اس کی شیرینی کو بحفاظت اپنے خزانے میں جمع کرتی جاتی ہے۔ خود غرض انسان آتا ہے اور مگس کو فنا کرکے اُسکے خزانے پر قابض ہو جاتا ہے۔ شیرینی گل یعنی شہد کو عطاروں کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے جس کے استعمال سے ہزار ہا مریض شفا پاتے ہیں۔ پھر مگس کے خزانے کے در و دیوار کو منہدم کرکے موم کی صورت میں بیچ کر ڈالتا ہے۔ یہ موم شمع بن کر رونق محفل کا باعث اور ہلاکت پروانہ کا سبب بن جاتا ہے ان سب معلولوں کی علت صرف تخم ہی کو قرار دے سکتے ہیں۔

(۳) دُخانی کلوں کی ایجاد کا موجب دیگچی کے سرپوش کی جنبش تھی جو اُبلتے ہوئے پانی کے بخارات سے پیدا ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ انسان نے اس شعبہ میں بقدر ترقی کی کہ طیارے تک ایجاد کرنے لگا پس اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دیگچی کے سرپوش کی حرکت نے انسان کو بام فلک تک پہنچا دیا۔

(۴) دہقان ہل چلا رہا تھا کہ ایک بیل کی ٹھوکر لگی۔ غور سے دیکھا تو مٹی کا ایک تودۂ درخشاں دکھائی دیا اس نااہل نے اس کی قدر نہ کی مگر اہل نظر کے ہاتھوں میں پہنچکر وہ کوہ نور کے نام سے موسوم ہوا۔ اس پتھر کے ٹکڑے نے سلطنتوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ اس کی وجہ سے بیشمار خونریزیاں عمل میں آئیں۔ اسکی طلب نادرشاہ کو فارس سے کھینچ کر ہندوستان میں لائی۔ یہ کوہ نور سلطنت فارس کے خزانے کی رونق رہا۔ اور آج برطانیہ عظمیٰ کے بیش بہا تاج کی زینت بنا ہوا ہے۔ ان معلولوں کی علت صرف بیل کی ٹھوکر ہی ہو سکتی ہے۔

(۵) حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آتش کی جستجو کوہ سینا تک کشاں کشاں لے گئی تھی مگر وہ وہاں سے پیغمبر خدا ہو کر لوٹے۔

یہ اور اس قسم کے واقعات روزانہ ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ علت کی نوعیت اگرچہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتی ہے

مگر اس کا معلول عبرت و بصیرت کی ایک بولتی تصویر بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قتل و خودکشی کی علتیں ایسی معمولی نظر آتی ہیں کہ ایک خالی الذہن شخص یکبارگی ان کو باور نہیں کر سکتا۔ موجودہ جنگ یورپ پر نظر ڈالیے اسکی علت محض ایک انسان کا قتل ہے۔ اور یہ ایک ایسا معمولی واقعہ ہے کہ تقریباً ہر گوشۂ عالم میں اسکی مثالیں ملتی رہی ہیں۔ اگرچہ معلول کی زنجیر ہنوز ناتمام ہے تاہم اب تک جس قدر اس کی کڑیاں فراہم ہوئی ہیں ان کی بنا پر بوثوق کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک متعدد سلطنتیں نیست ہو چکی ہیں۔ اور اس جنگ عالمگیر کی وجہ سے اب تک جو کچھ دنیا کو جانی اور مالی نقصان پہنچا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

دنیا کی ہر سلطنت کے خزانے کا بیشتر حصہ علت و معلول کے مسائل کے طے کرنے میں خرچ ہوتا ہے کسی محکمہ پر غور کیجیے بالآخر اس کی بنیاد اسی مسئلہ پر ہوگی۔ چوکیدار سے دارالامراء کے [illegible] تک رات دن اسی سلسلہ کی جستجو میں غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں۔

محمود اسرائیلی

غزل

زخمِ حسرت پہ تبسم نمک افشاں ہو جائے
دلِ افسردہ مرا رشکِ گلستاں ہو جائے

میری جمعیتِ خاطر کا تو ساماں ہو جائے
زلف گر آپ کی ہوتی ہے پریشاں ہو جائے

شرطِ یاری ہے مداحتِ جاں غیروں کو
ہائے وہ میرے جگر کے لیے پیکاں ہو جائے!

یاد میں تیری ہوا آغوش کشا دستِ طلب
اور مری چشم تصور سے وہ پنہاں ہو جائے!

شکوۂ جور بھی کرتے ہوئے ڈرتا ہوں میں
کہیں ایسا نہ ہو وہ سن کے پشیماں ہو جائے

خانۂ دل سے نکل کر کبھی اس کی تصویر
دیدۂ شوق میں بھی آ کے نمایاں ہو جائے

مقتل میں نظر آ جائے گلستاں کی بہار
خونِ عشاق سے رنگیں گر داماں ہو جائے

گر یہی مشقِ سخن ہے تو کسی دن محمود
کیا عجب ہے کہ تو صاحب دیواں ہو جائے

محمود اسرائیلی

لکھنے کی ابتدا

لکھنا اظہار مافی الضمیر کا ایک ایسا زبردست وسیلہ ہے جس کے واسطے سے انسان نے جہالت کی نیند سے رہائی پاکر تمدن کے وسیع اور پرتکلف میدان میں قدم رکھا ہے اور علم و عمل کے خوشنما، دلفریب اور ہرے بھرے باغوں کی سیر کرنا نصیب ہوئی ہے۔ ہزاروں برس پہلے کی قوموں کے حالات اُن کے وجود کے متعلق معلومات اُن کی تعجب خیز طرز معاشرت و معیشت، اُن کے ایجادات و اختراعات کی کیفیات، جو صفحۂ دنیا پر آباد رہ کر بے نام و نشان اور معدوم ہو چکی ہیں ہمیں لکھنے کی بدولت حاصل ہوئی ہیں۔

لکھنا نہ ہوتا تو انسان کا علم بہت کم، بالکل ہی ناکافی، اور محدود ہوتا۔ اور تہذیب و شائستگی اخلاق و عادات میں ذرا سی بھی خوبی اور ترقی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ پتا بھی خبر نہ ہوتی کہ موجودہ وقت سے پیشتر کے واقعات اور حالات کیا ہیں، اور کیا کیا سانحات اور حادثات گزر چکے ہیں نہ وہ اُن خوبیوں، نیکیوں اور اوصاف کا مالک ہو سکتا تھا، جو اسکے جد و آبا میں موجود تھیں، اور نہ وہ اُن افعال، اعمال، حرکات سکنات سے محترز رہ سکتا تھا جن کو اُس کے بزرگوں نے بُرا سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔

لکھنا نہ ہوتا تو ایک شخص کی تجربہ کی ہوئی بات سے معدودے چند لوگوں کے سوا اُسکے زمانہ کے آدمی، اور آنے والی نسلیں مستفید نہیں ہو سکتی تھیں ... اور مختصر یہ کہ دنیا میں روحانی اور مادی پہلو سے جو دلچسپ سماں آج ہمیں نظر آرہا ہے وہ کبھی نہ دکھائی دیتا۔ ایک یورپی مصنف کتابوں کی تعریف و توصیف میں اس طرح رطب اللسان ہے۔ میرے مکان کے ایک کونے میں کتابیں رکھی ہیں، جو بہت نادر و نایاب، اور

عجیب و غریب ہیں۔ اور جو سب کی سب میری ہی ملکیت ہیں۔ ان کی غرابت اُس
شہور پیالے سے زیادہ ہے جس کا ذکر کتاب الف لیلہ میں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ کتابیں
نہ صرف مجھے سارے جہان کی سیر کرا دیتی ہیں، بلکہ گذشتہ زمانوں اور قرنہائے قدیم کے
مناظر حکایات اور واقعات کا لطف بھی بہم پہنچاتی ہیں۔ میں کتابوں کے ذریعہ قدیم زمانہ
کے بزرگوں جواں مردوں کو اپنی نظر سے بچشم دیکھ سکتا ہوں گویا اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی
وہ زندہ ہیں اور میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میں کتابوں کو اپنے حظ نفس اور تفریح طبع کے
لیے کھول سکتا ہوں اور اس لیے بھی کہ انسان کے بہت زیادہ مشہور و معروف بہتر و برتر
زبردست نیک اور عمدہ کاموں اور کارناموں کے کرنے، اور اُن کا اعادہ کرنے کی کوشش
کروں کبھی شعرا میرے سامنے دیوانوں کو پڑھتے نظر آتے ہیں کبھی فصیح و بلیغ اصحاب اپنے
خطابوں کی تجدید میں مصروف دکھلائی دیتے ہیں۔ نکتہ سنج اپنی سخن سنجی اور بذلہ گوئی
سے روحانی فرحت بخشتے ہیں۔ فلسفی اور حکماء علماء اپنے مفہومات کی توضیح و تشریح میں
مجھے مصروف کرتے ہیں۔ عابد زاہد واعظ و ناصح ہدایت و نصیحت کے لیے موجود ہوتے
ہیں۔ اور مختصر یہ کہ میں اپنی کتابوں کی مدد سے خط استوا سے قطب تک اور دنیا پیدا
ہونے سے اس وقت تک جس جگہ اور جس زمانہ میں جانا چاہتا ہوں بآسانی جا سکتا
ہوں" کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

بیٹھ کر سیر ملک کی کرنا   یہ تماشا کتاب میں دیکھا

اس خیال کا صحیح ہونا بہت ممکن ہے کہ پہلا قدم جو لکھنے کی طرف بڑھا گیا وہی
نقوش اور لکیریں تھیں جو غاروں میں رہنے والے کھینچتے تھے اور اپنے مفہوم و مطالب
کو اشاروں کے ذریعہ ادا کرتے تھے۔

امریکا کے ہندیوں نے اس سلسلہ میں ایک حد تک ترقی کی تھی۔ وہ لوگ اُن
عظیم الشان واقعات کو جو ... آتے تھے ... یادگار ... تصویر ...

ذریعہ لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔

وہ کتابت جسے "خط میخی" کہتے ہیں اور جو اسیریا (شام) اور بابل کے لوگوں میں رائج تھی اسکی اصل ان ہی تصویروں اور شکلوں سے ماخوذ ہے۔ سورج کی تصویر کو اس طرح لکھتے تھے کہ چار لکیروں کو باطراف یکدیگر قائم کر کے اک شکل بنا لیتے تھے پھر اس شکل کو قائم و مستحکم رکھنے کے لیے اُن مینوں سے جو نرم مٹی کی بنائی جاتی تھیں اور جنھیں آوے میں پکایا جاتا تھا منقوش کرتے تھے اسی وجہ سے اس خط کو خط میخی کہتے ہیں۔

اینٹوں کے ٹکڑوں اور ٹھیکریوں کے ٹکڑوں کو بھی لکھنے کے واسطے استعمال کرتے تھے ہزاروں خشتی کتابیں جو قدیم زمانہ میں لکھی گئی تھیں اب دستیاب ہوئی ہیں تحریر و کتابت کے اس رواج کا ۳۰۰۰ قبل مسیح سے پہلے تک کا پتہ لگتا ہے۔ اور ولادت مسیح کے بعد بھی بہت دن تک اس کا رواج بدستور رہا ہے۔

بابل میں کیلستھینز[1] کو ۱۹۰۳ کلدانی سال کے مشاہدات اجسام فلکی ہاتھ لگے تھے جو پختہ اینٹوں پر ثبت تھے۔ اسی طرح بطلیموس[2] مصری ہیئت دان کو بھی بابلی جدول خشتی ہاتھ لگی تھی جس میں ۷۴۷ء قبل سے لے کر اس کے زمانہ تک کے واقعات کسوف خسوف کے نتائج مندرج تھے۔

ہیروگلیفیک | یہ بھی کتابت تصویری کی ایک قسم تھی جس سے قدیم مصری کام لیتے تھے۔ ان میں سے بعض تصاویر انسان کے خیالات کو ظاہر کرتی تھیں۔ مثلاً ایک

---

[1] یہ حکیم ارسطو کا بھتیجا اور شاگرد اور سکندر کا ہم سبق ۳۶۰ء قبل مسیح میں پیدا ہوا اور اپنی صاف گوئی کے باعث سکندر کے حکم سے ۳۲۸ قبل مسیح میں قتل ہوا۔

[2] بطلیموس ارسینو نامی ایک حسینہ جمیلہ خواص کے بطن سے فیلقوس کا بیٹا اور سکندر کا علاتی بھائی تھا بچپن میں ایک مرتبہ دونوں کو باپ نے جلاوطن کر دیا تھا اس وقت سے وہ برابر سکندر کے ہمراہ رہا کوئی ایسی جنگ نا ہم ایسی نہ تھی جس میں اس نے سکندر کا ساتھ نہ دیا ہو وہ اول مصر کا گورنر اور بعد میں مطلق العنان فرمانروا بن گیا تھا۔

دائرہ مستطیل مرتفع کو ترسم آفتاب کے لیے کھینچتے تھے اور شوق و شغف کے اظہار کے لیے ایک عورت کی تصویر بناتے تھے جو طنبورہ بجاتی ہوتی تھی یا ایک مرد کی صورت بناتے تھے جو ناچنے میں مشغول ہوتا تھا۔ اسی طرح تجسم عیاری کے واسطے گیدڑ کی شکل بناتے تھے۔ اور انسان کی حرکت کو دو پاؤں کی تصویر کے ذریعہ مصور کرتے تھے۔

ہیروگلیفک کی ایک اور بھی قسم تھی جس سے اشیاء کے بجائے آوازیں ظاہر ہوتی تھیں اور جو اشکال حرفوں کے اظہار کے لیے بناتے تھے وہ یا تو کسی حیوان کی تصویر ہوتی تھی یا اور کسی چیز کا خاکہ ہوتا تھا۔

کسی زمانہ میں مصری الف بائے (۲۹) حرفوں سے مرکب تھی جو بعض معلومہ اشیاء کے نمائندے تھے پھر تقریباً (۹۰) شکلیں اضافہ ہوئیں اور پھر ان اشکال میں اس قدر زیادتی اور بہتات ہوئی کہ (۱۷۰۰) شکلیں ہوگئیں۔ ان کو پتھر یا لکڑی پر چھپا کر کھود دیتے تھے اور کاغذ پر لکھتے تھے۔ جب ان ہی کے بنائے ہوئے کاغذ (پیپرس[1]) پر لکھنا چاہتے تھے تو لکڑی کے قلم سے کام لیتے تھے۔ دوات کے بجائے ایک مسطح تختہ کے ٹکڑے کو جس کے سرے پر کئی چھید ہوتے تھے استعمال کرتے تھے اور سیاہ قرمزی (سرخ) اور سبز رنگ کو کام میں لاتے تھے

---

[1] کاغذ کی بہت ہی قدیم قسم (پیپرس) سے بنتی تھی پیپرس ایک درخت کا نام ہے جو ملک مصر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا نیچے کا حصہ آدمی کے بازو سے ذرا موٹا ہوتا ہے۔ اور اس کی بلندی دس قدم تک ہوتی ہے اور اس کی پھننگوں میں پتوں کا ایک گچھا ہوتا ہے کاغذ کو اس کی اندر کی چھال سے اس طرح بناتے ہیں کہ پہلے رود نیل کے پانی میں بھگو کر اور کوٹ کر سکھا لیتے ہیں اس کے بعد ہیپر کو اس پر اس قدر رگڑتے ہیں کہ وہ مسطح ہو جاتا ہے۔ اس صنعت نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ ایک بار ایک مصری کاغذ ساز نے نہایت فخر سے بادشاہ سے دعویٰ کیا تھا کہ میں کاغذ کی تجارت کے منافع سے ایک لشکر نوکر رکھ سکتا ہوں۔ انگریزی زبان میں (پیپر) کاغذ کو کہتے ہیں یہ لفظ یونانی کلمہ پیپرس سے نکالا گیا ہے۔ یونانیوں میں سکندر اعظم کے عہد تک اور بعد بھی اس کاغذ کا رواج رہا اور مشرق و مغرب کے ممالک میں سنہ ۱۲ء تک متداول رہا۔ مصری کتابیں جو پیپرس کاغذ پر لکھی ہوئی پائی گئی ہیں ان کے متعلق خیال ہے کہ سنہ ۳۵۰۰ قبل مسیح کی ہیں۔

ان کو بطور اُفق کے لکھکر سیاہ لکیروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے الگ کردیتے تھے کتابت
کی حسب ذیل دو قسمیں اور بھی رائج تھیں۔

(۱) ہیراٹیک | اس کے معنی ہیروس مقدس کے ہیں وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کتابت کی یہ قسم ملاؤں
(آقا یا بادشاہ) کے لیے مخصوص تھی یہ کتابت کئی درجہ تک ہیراگلیفیک کا مخفف تھی
جو خط شکستہ کی شکل میں متشکل ہوتی تھی اور اصلی خط سے چنداں مشابہت نہیں رکھتی
تھی۔ اس کو سلطنت کے دفاتر، مذہبی رسالوں اور شرعی کتابوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔

(۲) ڈیماٹک | ڈیموس کے معنی (آدمی) کے ہیں۔ چونکہ اس خط کو عام لوگ اور عوام الناس
استعمال کرتے تھے اس لیے اس کا نام ڈیماٹیک رکھا گیا۔ یہ خط بھی ہیراگلیفیک سے
جو کسی قدر تعدیل پاکر بہت کچھ سیدھا سادھا ہوگیا تھا اور صرف متداول کاموں میں
مستعمل ہوتا تھا۔ یہ خط [illegible] قبل مسیح سے لے کر [illegible]ء تک رائج رہا۔ اس وقت عیسائی
قدیم یونانی الف باے کو کام میں لاتے تھے۔

ترجمہ خط ہیروگلیفک | سیاہ پتھر کے ایک ٹکڑے کے دریافت ہونے سے جو شہر (روزیٹا) میں ۱۷۹۹ء میں
نکلا (ہیروگلیفک اور ڈیماٹیک اور یونانی تحریریں لکھی تھیں) اس خط کے ترجمہ میں بہت کچھ
آسانی ہوئی۔ اس پتھر کے نوشتہ جات کا مضمون فتوائی تھا جس کو علمایان مصر نے
مملکت (ممفلیس) میں بطالمی چہارم کی توقیر و تکریم کے لیے تقریباً ۱۹۶ قبل مسیح میں
لکھا تھا۔

اسی طرح ۱۸۰۱ء میں ملک مصر سے (روسیٹا) پتھر دریافت کرکے جارج سوم
شاہ انگلستان کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اور شاہی حکم سے لندن کے عجائب خانہ میں
رکھا گیا۔ [illegible] اور شکل و صورت بھدی اور بھونڈی تھی اور اس پر تین
زبانوں میں ایک کتبہ لکھا ہوا تھا جن میں سے ایک کتبہ ہیروگلیفک زبان میں تھا۔
مستشرقین [illegible] انگریزوں نے باقی تحریروں کی مدد سے اسکے پڑھنے میں

کامیابی حاصل کی اور ایجپٹولوجی (مصر کے علوم وفنون) پر جو فولادی تالا لگا ہوا تھا
اُسکی کنجی مل گئی ڈاکٹر ینگ نے یہ بھی انکشاف کیا کہ حروف ہیروگلیفیک مخصوص اسامیوں
میں آوازوں کے بجائے مستعمل تھا - اسی طرح (چمپولیون) ایک فرانسیسی نے بھی بعض
دوسرے اہم انکشافات دکھائے اور اب وہ سب کتبے جو ہیروگلیفیک میں لکھے ہوئے
تھے ترجمہ ہو چکے ہیں -

۱۸۶۵ء میں پروفیسر لیپسیس نے شہر تنفن میں ایک چٹانی پٹیا پایا جو قدامت میں
روسٹیہ پتھر سے بھی قدیم تھی اور اس پر یونانی زبان اور مصر کے ہیروگلیفیک میں عبارت
کندہ تھی -

۱۸۴۲ء میں ایم بوٹا فرانسیسی سفیر نے دریاے دجلہ کے کنارے کے کھنڈرات کو
کھدوانا شروع کیا پھر لارڈ کی زیر نگرانی ایک تحقیقاتی مہم یہاں پہنچی - چنانچہ ان دونوں
کی جان توڑ کوششوں سے بہت سی تحریریں زمین کے اندر سے دستیاب ہوئیں اور
اسیریولوجی (آسوریہ کا علم وفن) کے متعلق انسانی معلومات میں قیمتی اضافہ ہوا - یہ تحریریں
تکونیہ حروف رکھتی تھیں اس لیے انگریزی میں "کیونی فارم الفبیٹ" کہتے ہیں اور
یہ سب سے پہلے موسیوپٹامیہ (ملک شام یا عراق عجم) میں پائی گئیں -

خطوط الف باے | فنیشیہ جو مشرقی بحر روم کے ساحل پر واقع تھا جس کو غور بھی کہتے ہیں
اور زبور میں کنعان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ایک چھوٹا سا خطہ تھا جس کی جنوبی
اور شمالی حد سیریہ (شام) اور (صوبہ) یہودیہ کے مابین واقع تھی اور مغربی سرحد بحر روم
(میڈیٹرینین سی) سے ملتی تھی - وہاں کے رہنے والے زمانہ قدیم میں مصریوں سے تجارت
کیا کرتے تھے - اس بنا پر انھیں ضرورتاً مصریوں کی طرز کتابت کو سیکھنا پڑا - انھوں
نے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو الفاظ میں ایک مختصر عدد علامتوں میں سے ہوتا ہے جو
آوازوں کا نمایندہ ہے - خیال ہوتا ہے کہ الف کا اسے کے نام کا ظاہر کرنے والا تھا

اور گائے کی سر اور کان کے ذریعہ توضیح ہوتی تھی - میم کے معنی پانی کے تھے اور اس کو بطور موج و معنی جو موج آب کی طرح ہوتا تھا لکھتے تھے - ایک مرتفع مستطیل دائرہ کو آنکھ کے بجائے قرار دیا تھا - اور رفتہ رفتہ آنکھ کی شکل دائرے کی صورت پیدا کر لیتی تھی - یعنے پہلے ایک نقطہ اسکے بیچ میں ہوتا تھا پھر نقطہ کو اُٹھا دیتے تھے غرض کہ الف بائے فینیقیہ قدیم صرف (۶ - الف) حرف رکھتی تھی - جب دوسری قوموں خصوصاً بنی اسرائیل نے انھیں محکوم بنایا ان کی دولت و حکومت پر قابض ہوگئے اور انھیں منہزم اور منتشر ہونا پڑا تو حرفوں کی شکلوں اور اُن کی آوازوں میں بعض جزوی اور نمایاں تغیر ہو گئے اور اس کے علاوہ جدید حروف بھی اضافہ ہوئے -

یونانیوں نے فنِ تحریر کو فینیقیوں سے سیکھا ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح میں ایک یونانی کاڈمس نامی نے فینیقی حروف کی ترویج اپنے ملک میں کی ہے یہی وجہ ہے کہ یونانی انھیں حروف کا موجد سمجھتے ہیں - لیکن تحقیقات اور چھان بین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصریوں کی تصویری تحریر اور اہل بابل[۱] کے تکونیہ حروف یہ سب فینیقیوں کے زمانہ کے پہلے کے ہیں - ہاں اسمیں شک نہیں کہ انھوں نے ان دونوں خطوں کو سیکھا، ان میں ترمیم تنسیخ کاٹ چھانٹ کی، اور بہت کچھ اضافہ کرکے ایک جداگانہ صورت پیدا کر دی -

اب الف بائے عبرانی (سامی) بائیس[۲۲] حرف رکھتی ہے لاطینی قدیم (لیٹن) اکیس[۲۱] حرف انگریزی جدید چھبیس[۲۶] اور موجودہ فارسی تینتیس[۳۳] - مختصر یہ کہ موجودہ حروف کا وہی حال ہے جو کئی ہزار برس قبل مسیح تھا جب الف بائے اصلی نہ تشکیل پائی تھی اور اسکی قسموں اور بعض دوسری صورتوں کو اہالی فینیقیہ اور دوسری قوموں نے سیکھا اور استعمال کیا تھا -

محمد اسمٰعیل ہاتف

---

[۱] شہر بابل یا خالدیہ کو سنہ بعد طوفان نوح ۲۲۳۳ قبل مسیح میں نمرود نے دریائے فرات کے مشرقی جانب مربع شکل میں آباد کیا تھا یونانی مورخوں کے بیان کے مطابق اس شہر کا رقبہ ۶۰ میل تھا فصیل ۳۰ گز سے زیادہ بلند رکھی اور اسقدر چوڑی کہ اس پر چار گھوڑوں کی گاڑی بخوبی پھر سکتی تھی اور بعد بنیشیفر ۵۳۹ قبل مسیح میں فارسیوں کے فتح کرنے سے سلطنت کے ساتھ اسپر بھی زوال آگیا ۳۳۱ قبل مسیح میں (جیسا کہ تکونیہ حروف کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے) یہ شہر سمندر کے بالکل کنارے واقع تھا مگر آجکل (۱۵۰) میل دریائے فرات سے دور آباد ہے - اور اس مقام کو ہلہ کہتے ہیں -

تم سے مل کر

تم سے مل کر میرے دل کو سکون حاصل ہوا میری روح میں تازگی پیدا ہوئی میرا شجرِ زندگی ترو تازہ ہو گیا۔ میرے دماغ نے جو غیر معمولی راحت تم سے مل کر پائی وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دل و دماغ کو جو تقویت ہوئی تو وہ ہوائی قلعوں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے ہائے افسوس کہ آج میں کہتا ہوں کہ وہ ہوائی قلعے تھے مگر کاش ان کے بننے اور بگڑنے سے بلکہ ان کی بنیاد قائم ہونے سے قبل یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ خواب ہوں گے تو دعا مانگتا۔ کہ ان کی بنیاد نہ پڑے۔ میں تم سے مل کر نشۂ الفت میں ایسا سرشار ہوا کہ ایک مدت کے لیے ایک قلیل مدت کے لیے یہ بھی بھول گیا کہ تم سے ملنے کی کتنی اور کیا کیا کوششیں کی تھیں کیونکہ تم تک پہنچنا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب تک میں نے تم کو نہ دیکھا تھا تو دل نے تمہیں دیکھنے کی خواہش میں کیا کیا نہ کیا وہ کچھ کیا جو کہ نہ کرنا تھا۔ اُف! روزانہ آنا ایک کی نہیں ہر ایک کی نہیں ہر ایک کی تمہاری نہیں، تمہاروں کی۔ تمہاروں کی نہیں غیروں کی منتیں کرنا اور خوشامد سے ہر ایک طریق سے کام لینا منتوں کی آرزوؤں کاوشوں اور خوشامدوں کے بعد کہیں کچھ اثر کسی کے دل میں پیدا ہوا نہیں نہیں یہ خوشامدوں کا اثر نہیں تھا بلکہ میرے جذبۂ دل کا اثر تھا جس نے کسی کے پتھر سے سخت دل کو پگھلایا۔ یہ سب وہ مراحل تھے جو میں نے طے کیے اور مشکل سے نہیں جانکاہی سے طے کیے مگر تم سے مل کر یہ سب کوششیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔ تم سے ملا۔ تم سے مل کے میں نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ پہلی ملاقات کا ہوشربا منظر تم کو شاید ہی یاد ہو مجھے یاد ہے۔ صاف شفاف کمرہ میں لیمپ کی روشنی تھی پلنگ پر تم جلوہ گر تھے اور میں محوِ حیرت سی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی مجھے خوب یاد ہے

کہ میرے تمھارے ہاتھ ملے اور تمھارے ہاتھ کی مقناطیسی قوت نے میرے دل و دماغ میں
بجلی کی رو دوڑا دی لیمپ کی روشنی نہیں روشنی کی کرنیں تمھارے چہرہ پر پڑ رہی تھیں
اور شرم سے جھکی ہوئی نظریں قیامت ڈھا رہی تھیں تمھارے دل میں کسی نئے آنے والے
کا خیال اور اس کے استقبال کا جذبہ پہلے سے تھا اور ضرور تھا مگر حیا کی بندش نے
تمھاری یہ آرزو پوری ہونے دی ہمت کی ہوگی لیکن حیا کی روک تھام غالب رہی اور
نظروں ملنے تک کا موقع نہ دیا ...... آہ یہ سماں منظر کسی متلاشی محبت کے مٹ جانے کو
کچھ کم نہ تھا کہ اس پر پھر کسی کا اصرار نیچی نظریں کیے اور سمٹے سمٹائے ہوئے اس کا
زبان حال سے اظہار کہ کچھ اور ٹھہرو یہ سب وہ باتیں تھیں جنھوں نے مجھے مدہوش
کر دیا تھا میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی گویا خوشی کا میں ہی
تنہا مالک ہوں مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ خوشی عارضی ہے اور تم سے مل کر جو نشۂ سرور
پیدا ہوا ہے وہ بہت جلد بے اعتنائی کی ترشی سے اتر جائے گا اور اس کے بجائے قدرت
میرے لیے ایک دائمی کیفیتِ رنج و غم بپا کر دے گی۔ ایک دفعہ نہیں میں کئی دفعہ تم سے
ملا مگر جو وقفہ آپ سے ایک دفعہ ملنے کے بعد دوسری دفعہ ملنے تک ہوتا تھا وہ مجھ پر کیا کیفیت
پیدا کرتا تھا اس سے میرا ہی دل خوب واقف ہے۔ دوسری دفعہ ملا لیکن پھر بھی تمھاری
شرم نے گرمجوشی سے آرزوؤں کو پورا ہونے دیا تم نے کسی قدر جسارت سے کام لیا پرشوق
نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے لینے کے لیے بڑھیں لیکن برا ہو اس حیا کا جس نے قدم اٹھنے نہ
دیا اس منظر کا اندازہ اہل دل اور صرف اہل دل کر سکتے ہیں جنھوں نے کچھ دیکھا ہو
جن کے دل میں کچھ درد ہو۔ آہ کیا یہ باتیں ایسی نہیں جنھیں کوئی دل رکھنے والا دیکھے
اور اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکے کسی کا تپاک سے آگے بڑھنا لیکن حیا اور ناز کا قدم
نہ بڑھنے دینا کچھ کہنے کی کوشش کرنا لیکن حجاب و [illegible] کا نہ کھلنا ایک نظر دیکھنا اور آنکھیں چار
ہوتے ہی نگاہیں نیچی کر لینا میرے لیے یہ ادائیں کیا تھیں میں کیا بتاؤں کیا تھیں اور

کیا ثابت ہوئیں۔ آہ کاش وہ وقت میری زندگی کا آخری وقت ہوتا مگر قدرت کو
تو یہ منظور نہ تھا کہ میں حیات کے دائمی سرور سے بہرہ ور ہوں آہ کیا قدرت کو یہی منظور تھا
کہ تم سے مل کر میں زندہ رہوں اور اپنے آپ کو زندہ درگور خیال کروں بعد کی ملاقاتوں
میں تمہارا خاصہ بے تکلف ہو جاتا اور بار بار اس کا اظہار کرنا کہ مجھے تم سے محبت ہے
تمہارے انتظار میں وقت خدا جانے کس کس مصیبت سے گذارتی ہوں سوچتی ہوں
کہ تم سے کیا کیا باتیں کروں گی مگر تمہارے آتے ہی وہ سب بھول جاتی ہوں صرف
تمہارے پاس بیٹھے رہنے تمہاری محبت آمیز باتیں سننے کو جی چاہتا ہے۔ میں تم سے
ملنا تم سے بات کرنا اپنی زندگی کے لیے اپنی راحت کے لیے ضروری خیال کرتی ہوں
اور چاہتی ہوں کہ تم اور میں ساتھ رہ کر زندگی گذاریں اور آخر میں کہتی کہ میں کیا بتاؤں
کہ میرا دل کیا چاہتا ہے .... یہ گفتگو میرے لیے اُس وقت شہد تھی مگر آج جو کچھ
اثر کر رہی ہے وہ ایک ایسا زہر ہے جو نہ زندہ رہنے کا لطف اٹھانے دیتا ہے اور نہ مرنے
دیتا ہے گورے ہاتھوں پر ریشمی چوڑیاں کیا بہار دیتی ہیں یہ کوئی وہ بتائے جس نے
کبھی یہ منظر دیکھا ہو عورت قریب قریب بے نیاز حسین اور زیور شرم سے آراستہ جس کے
دیکھنے ملنے باتیں کرنے کا لطف وہی جان سکتا ہے جس نے [illegible]
یہ پاک حسن دیکھا ہو۔ افسوس قدرت کے ہاتھوں نے مجھے اس سے جدا کر دیا۔ یہ نہیں
جانتا ہوں کہ قدرت نے ایسا کیوں کیا۔ میں اسے ظالم کہوں گا اس نے مجھ پر
ظلم کیا ہے اس نے میری زندگی کو تباہ کر دیا ہے مجھے قدرت کے ان تماشوں کی ضرورت
نہیں میں قدرت کی دستبرد کو ظلم سمجھتا ہوں۔ آہ مجھے جس وقت آخری ملاقات کا خیال
آتا ہے اور وہ نمی بھری پرنم آنکھوں کی تصویر نظر آتی ہے تو آج جب کہ تم سے الگ ہو کر تم سے
دور رہوں۔ ناقابل برداشت روحانی اذیت پاتا ہوں قدرت تو نے ظلم کیا ہے تو ہم بھی کر
مجھے دنیا میں رہنے کی ضرورت نہیں میں دنیا سے بیزار ہوں۔ یہ خیال مجھے اور بھی تکلیف

دیتا ہے کہ زندگی میں میری اور اس کی جدائی ایک انقلاب پیدا کر دے گی اگر مجھے کسی سے محبت ہے تو قدرت ظلم کے بعد تجھے رحم کرنا چاہیے اور تیرا رحم یہی ہے کہ یا تو مجھے اُس سے پھر ملا دے یا دنیا سے ایک ایسے وجود کو مٹا دے جس کو ممکن ہے کہ وہ بے وفا خیال کرتی ہوں مگر نہیں وہ مجھے بے وفا نہیں خیال کرتیں وہ مجھے جانتی ہیں وہ مجھ سے واقف ہیں اگر وہ مجھے بے وفا سمجھتی ہیں تو مجھ سے اُنھیں محبّت نہیں ہے۔ کسی سے ملنے سے قبل میں آدمی تھا ملنے کے ایام میں انسان کامل ہوا مگر ملنے کے بعد اب میں آدمی نہیں ہوں آدمی اشرف المخلوقات اس لیے ہے کہ اس میں صحیح ادراک و عقل ہوتی ہے مگر میری عقل گم ہوگئی میرا دماغ خراب ہوگیا میں انسان تو انسان حیوان بھی نہیں رہا۔

زمانہ کے انقلابات اکثر حیرت انگیز ہوئے مگر ان سب انقلابوں کی حقیقت آج مجھے پانی کا بُلبلہ معلوم ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ انقلاب صرف اُس چیز کا نام ہے جو ایک عورت کی ذات۔ ایک عورت کی جدائی اور ایک عورت کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے نفس پرست لوگوں کے لیے ہر عورت خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو بہت کچھ انقلاب پیدا کر سکتی ہے مگر میرے شیرازۂ زندگی کو منتشر کرنے والی صرف وہ عورت ہو سکتی ہے اور ہے جو عورت ہو۔ اور وہ

کون ہے!

— تم۔

یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں تم سے جدا ہوا ہوں یا جب کہ میں تم سے محبت کی باتیں کر رہا تھا۔ تمھاری محترم اور پاک نظریں مجھ پر پڑ رہی تھیں کاش تم میرے [illegible] ہوتیں اور میں تمہارا [illegible] لیے

اطہر

ہماری تاریخ کا ایک ورق

ذرا سی دیر کو تشریف آ بیٹھو مرے دل میں　　دکھاؤں لطف وہ دیکھا نہ ہو جو حسن بسمل میں

"جو لوگ اپنے اسلاف کے کارنامے فخر و ناز کے ساتھ یاد نہیں کرتے وہ گویا خود بھی کبھی ایسا کام نہیں کریں گے" (لارڈ مکالے)

مسلمانوں کا علمی شغف ہجرت کی دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے۔ خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس کی شہرۂ عالم فیاضی نے دلوں میں اُمنگ اور حوصلوں میں بلندی پیدا کر کے اس شغف علمی میں چار چاند لگا دیے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مختصر مدت میں وہ تمام بیش بہا علم و فن کے گرانقدر مخازن کے مالک بن گئے۔ تحقیق و تشویق کے میدان میں جھنڈے گاڑ دیے۔ اور کچھ اس سرعت اور تیز گامی سے چلے کہ جمیع اقوام متمدنہ کوسوں پیچھے رہ گئیں۔ اور جب مڑ کر دیکھا تو کوئی ہمسر و ہمتا نظر نہ آیا۔ یونان کے تمام علوم و فنون اُمنڈ آئے۔ خالد بن یزید نے ماہرین یونانی ادب و زبان کو جمع کیا۔ اور ترجمہ کی خدمت تفویض کی۔ عبدالملک کے عہد میں زبان عربی دولت اسلام کے محکموں میں ترقی پذیر ہوئی جس کا اثر تدریجاً مصر و شام اور عراق کی معاشرت پر پڑنا شروع ہوا۔ اور عربی ان بلاد و امصار کی مادری زبان بن گئی۔ مابعد ہارون رشید عباسی نے تصانیف و تراجم کا ایک یادگار عصر بعہد عدیم المثال محکمہ بیت الحکمۃ کے نام سے قائم کیا۔ اس محکمہ میں یونانی، سریانی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے باکمال ماہر جمع ہوئے۔ ثابت بن قرہ، حبیش بن الحسن، ابن اسحق وغیرہ نامور عیسائی مترجمین پانچ پانچ سو فی ماہانہ پر متعین کیے گئے۔ اور ۵۰ برس کے اندر اندر یونان اور روم کا سارا علمی خزانہ بیت الحکمۃ میں منتقل ہو گیا۔ فضل برمکی نے اپنے اہتمام سے کاغذ سازی کا کارخانہ جاری کیا۔

مامون رشید نے بایں شرط والی یونان سے دائمی صلح کر لی اور ایکسو چالیس من سونا دینے کا وعدہ کیا۔ کہ وہ چند روز کے لیے حکیم سیو کو فلسفہ آموزی کے لیے امیرالمومنین کے پاس بھیجدے مامون رشید کی حبِ علمی کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ مترجمین کو کتاب کے ہموزن سونا تول دیتا تھا۔ یہی وہ خلیفہ اولین ہے جس کے عہد میمون میں دمشق بغداد اور شماسیہ میں رسدگاہیں قائم کی گئیں۔ صحراے جار میں اس کی تجربتاً تحقیق خاص کی گئی کہ محیط کرۂ ارض ۲۴ ہزار میل ہے۔

صدی چہارم سے قبل کہ دائرۂ اسلام میں کوئی سررشتۂ تعلیم نہ تھا۔ ہم کو یزید بن ہارون المتوفی ۲۰۶ھ کے حلقۂ درس میں ستر ہزار طلبا و متعلمین کا ہجوم نظر آتا ہے۔ جب امام بخاری نے لکھر دینا آغاز کیے ہیں تو قریباً دس ہزار اہل مناظرہ محدثین حفاظ اور فقہا شامل تھے۔ ایجاد و اختراع کے چمن میں بھی عجیب عجیب پودے لگائے اور نئے نئے نکہت بیز پھول کھلائے۔ چنانچہ عربی میں چار سو مستند کتب تواریخ زیر تالیف سے آراستہ ہوئیں۔ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ علم کلام میں سب سے پہلی کتاب ترقیم فرمائی اور ثابت کیا کہ اصلی مسائل اسلام سے جس قدر فلسفہ مختلف اور متضاد الفہم ہے خود غلط ہے۔ ایک نامور فلاسفر ثابت دمشقی نے بعہد یزید ثانی آلات جاذب برق ایجاد کیے جن کے ذریعہ سے بادلوں سے بجلی جذب کی جاسکتی تھی۔ دربار خلافت سے اس فقید المثال ایجاد پر پانچ لاکھ روپیہ عطا ہوا۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں جنگی جہاز بنائے گئے۔ لوہا پگھلا کر ڈھالا گیا ۱۹۰ھ کے قریب میں علی بن تغلب گھڑی سازی میں شہرہ یاب ہوا۔ زبیدہ خاتون نے شموم عنبری کو بزم تکلف میں جگہ دی۔ انگریزی سال میں جو کسر چار صدیوں میں نکلتی ہے۔ وہ خیام نے ۳۳ برس میں نکال دی اور ہرائے نام ایک دن میں کچھ کم فرق رہ گیا اگر زندہ رہتا تو یہ بھی نہ رہتا۔ میزان الحکم میں وہ اصول بیان کیے جن سے مرصع جڑاؤ زیورات کا وزن بغیر توڑے اور جواہرات الگ کیے دریافت کیا جاتا ہے میزان ہشمیدس

اسلام کی ایک نادرۂ روزگار تصنیف ہے جس کے اصولوں سے نقرہ و طلا کا کھرا کھوٹا مع
وزن کے متحقق ہو سکتا تھا۔ زمانہ اس پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔

شیخ ابو القاسم بن اندلسی معروف بہ البقاس نے ایک معرکۃ الآرا کتاب التصریف تحریر
کی تھی اس میں زخم کا جلانا۔ آلات کے ذریعہ اپریشن کرنے کے قواعد امراض رحم و معدہ و فتق
اور پتھری نکالنے کا اپریشن۔ عوارض چشم میں اپریشن کرنے کے قواعد۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنے
کے اصول خصوصیت سے بالوضاحت بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مایۂ ناز حکیم اکثر آلات
جراحی کا موجد گزرا ہے۔ خصوصاً پتھری کے خارج کرنیکے آلات اسی کی ایجاد ہیں یا مختلف
یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ کچھ زمانہ پیشتر یورپ کی جراحی کا دارومدار اسی کتاب پر تھا
بوعلی سینا کا "قانون" جو فن طب کی مکمل کتاب ہے یورپ میں ایسی مقبول ہوئی کہ آج سے
پچاس برس پیشتر تک داخل درس رہی۔ ابو منصور بن بشیر بڑا سرکردہ اور نامور طبیب گزرا
ہے جس کو امراض اعصابی میں یدطولی تھا۔ حمام مائیہ کے اصول کا موجد ہوا ہے۔ یورپ
میں یہ فن رواج پا رہا ہے جس کو ڈاکٹران ہند ڈاکٹری ایجاد سمجھ کر بے جا ناز کر رہے ہیں۔
رشید الدین علم طب و نباتات کا ایک سرآمدِ عصر عالم تھا جو ایک گروہ اطبا کا سردار بھی تھا
اُس نے جبل البنان کے اطراف میں تحقیق نباتات کی غرض سے ان اطبا کو مقرر کیا تھا
ہر پسندیدہ بوٹی کا فوٹو لیا جاتا اور علمی طور پر جانچ کر کے خواص بھی فوراً لکھدیے جاتے
اس طرح علم الادویہ میں یہ ایک مبسوط کتاب ہو گئی۔ کالجوں اور شفاخانوں میں طبی عجائب خانے
بھی تھے جس میں جڑی بوٹی دکھلانے کی غرض سے باغات لگائے گئے تھے۔ یہ باغ میلوں
وسیع ہوتے تھے۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں ایک نہایت وسیع طبی باغ غرناطہ میں
اور مثل اُسکے ایک اور باغ قرطبہ میں [illegible] الرحمن اول موجود تھا جس کو اہل یورپ
تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلا دنیا [illegible] چند یسا پور کا کالج اور شفاخانہ ہے جو
قرونِ اولے اسلام میں قائم ہو کر زمانہ منصور تک شہرہ یاب رہا۔ بر جیس ابن جبرئیل مشہور

مشرقی طبیب اس کالج کا پروفیسر تھا۔ ماسویہ ابن یوحنا اس کالج کا تعلیم یافتہ تھا۔ ابن سہل نامی طبیب بھی اسی کالج کا متعلم تھا جس نے تمام امراض کے نسخے جدولی صورت میں مرتب دیے۔ اس اصول کی ایسی مقبولیت ہوئی کہ آج یورپ کے شفا خانوں میں اسکا رواج ہے۔ صاحب طبقات ناصری ابن عیسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ۳۱۳ھ میں عثمان ابن سعید دمشقی نے ایک عظیم الشان کالج و شفا خانہ قائم کیا جس میں ابن عیسیٰ پروفیسر مقرر ہوا۔ اور مکہ معظمہ اور بغداد شریف کی انسپکٹری پر مامور کیا گیا۔ طبیب سفری شفا خانوں کا موجد گزرا ہے جس نے ابن قرہ کی نگرانی میں کافی انتظام کیا کہ گاؤں بہ گاؤں بلا معاوضہ گھوم کر چارہ سازی کریں۔ عضد اللہ نے جب شفا خانہ مع کالج الرازی کی صدارت میں جن کی قابلیت اور تبحر کو اس وقت یورپ تسلیم کیے ہوئے ہے۔ قائم کرنا چاہا۔ تو اسکی بدقسمتی سے قبل تکمیل علامہ کا انتقال ملک کو ماتم کدہ بنا گیا اس شفا خانے اور کالج کے افتتاحی جلسے اس گرم جوشی سے ہوے کہ ہنوز اس ترقی وتہذیب کے زمانے میں کسی دارالعلوم کے افتتاحی جلسوں میں یہ بات حاصل نہیں ہوئی۔ غرض اس شفا خانہ میں ہر مریض کے واسطے جدا جدا وارڈ تیار کیے گئے تھے جن میں ہر مریض ایک دوسرے سے جدا رہتا۔ اسی طرح ہر طبیب کے لیے علحدہ علحدہ مکانات تیار رہتے تھے۔ ان شفا خانوں میں آجکل کی طرح رجسٹر بھی تھے جن میں مریض کے حالات مع مشاہدات درج ہوتے تھے۔ اسی طرح مصر۔ دمشق۔ مرو۔ رے اور ہمدان وغیرہ میں عالی شان اور نامی کالج و شفا خانے تھے۔ بقول ایڈورڈ گبن مشہور یورپین مورخ و مصنف یورپ کے تاریکی کے زمانے میں افریقہ اسپین و [illegible] میں عربوں کے قائم کردہ طبی مدارس جاری تھے۔ ہسپتالوں کا قیام بھی یورپ نے عربوں سے لیا۔ چنانچہ ۱۲۸۳ء میں قاہرہ میں ایک بہت بڑا پاگل خانہ موجود تھا۔ حالانکہ یورپ میں اسکی ابتدا کم و بیش ایک صدی بعد ہوئی۔ ابن الصیائغ نے علم الارتقا کی بنیاد ڈالی۔ ابو موسیٰ خواجہ [illegible] نے

جبر و مقابلہ کی بنائیں استوار کیں ابو البرکات بغدادی نے ارسطو و افلاطون کے بالمقابل حکمائے اسلام کا ایک جدید فلسفہ ترتیب دیا۔ ابن فرناس نے ہسپانیہ میں ہوائی جہازوں کا قاعدہ ایجاد کر لیا۔ اندلس کے عربوں نے ایک آتش بار آتش کشا آلہ ایجاد کیا جسے وہ مادہ کہتے ہیں اور آجکل کی اصطلاح میں توپ کہی جاتی ہے۔ ابن الہیثم نے علم المناظر و علم المرایا میں تبحر حاصل کر کے غرق شدہ جہازوں کو تیرا دینا اختراع کر لیا۔ ابن یونس نے علم الہندسہ میں کمال پا کے ایک تحیر خیز ایجاد کی کہ وہ اس سے مراکش میں کارخانہ آب رسانی (واٹر ورکس) کھولتے ہیں۔ پانی کے پمپ بناتے ہیں۔ مشہور فلاسفر و مورخ ادریس نے جابجا تشریح کی ہے کہ اس کل کے ذریعہ گھر گھر ہر ایک سڑک پر نلوں میں پانی پہنچاتے ہیں۔ مراکش کے دار السلطنت میں بیشمار پن چکیاں تھیں ہر مکان میں نل تھا۔ صبح اٹھتے تھے تو تمام گلی کوچے مکان سڑک نلوں سے دھلے صاف ملتے تھے۔ یہاں سے یہ صنعت اندلس گئی اور وہاں سے یورپ نے اس پر توجہ کی۔ صنعت و ترویج یورپ میں عربوں سے ہوئی۔ شکر کے ذریعہ شیریں کام کیا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپ ہوگا کہ انگلستان میں شیشہ کا رواج ملکہ الزبتھ سے پہلے نہوا تھا حالانکہ طلیطلہ میں ایک عرب کو شک میں شفاف اور تاریک دونوں قسم کے شیشوں کا پایا جانا تاریخ سے سکسن زمانہ ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ جغرافیہ دلچسپ مشغلہ تھا سائبیریا اور افریقہ کے ایسے مقامات میں پہنچے جہاں کا حال دنیا کو بہت کم معلوم تھا۔ شکر بھی عربوں کی ایجاد ہے ورنہ اس سے قبل یورپ میں شہد استعمال ہوتا تھا۔ تعلیم قرآن سے اسلام میں فلسفہ و حکمت کے اسکول اور کالج پیدا ہوئے جنھوں نے دورہ ترقی میں یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا یہ روشن و تابناک نتیجہ تھا۔ کہ وسط افریقہ جو اس براعظم کا دورترین حصہ ہے جس کو اس بیسویں صدی کی روشنی میں بھی تاریک و تار براعظم کہا جاتا ہے۔ وہ ترقی کے اعتبار سے اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یورپین سلطنتوں سے ترقی [illegible] میں بہتر تھا ترویج علوم کے لیے سوسائٹیاں

کثرت سے قائم تھیں۔ یہ ذوق ہر کہ و مہ کے اندر موجود تھا۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی خالی
نہ تھیں۔ وہ ہر قسم کی علمی مجالس میں کثرت سے شریک ہوتی تھیں۔ ان میں بعض اعلیٰ درجہ
کی جراح گزری ہیں۔ حالانکہ ابتک یورپ کی کسی عورت کو یہ فخر شاید ہی نصیب ہوا ہو۔
وہ یونیورسٹیوں تک میں بطور اعلیٰ پروفیسر کے فاضلانہ درس دیتی تھیں۔ ڈاک کا انتظام
نہایت وسیع تھا کبوتروں کے ذرائع سب سے اعلیٰ اور سہل تھے جن کی خرید و خورش میں
ملک عراق میں ۷ لاکھ ۷۰ ہزار روپیہ کا خرچ تھا۔ ۹۳۰ چوکیاں تھیں۔ مراسلات پر کسی
قسم کا محصول نہ تھا۔ ہشام کے عہد میں محض عملہ کا خرچ ایک لاکھ روپیہ تھا۔ پوسٹل
کارڈ بشمول فاصلہ موجود رہتے تھے۔ ایکہزار کوس کی ضروری اطلاعیں خبریں آسانی
سے جلد مل جاتی تھیں۔ دو سو برس برابر حاکم بامر اللہ کے عہد تک یہ طریقہ عمدگی سے
جاری رہا۔ شہری اطلاعات کا انتظام غضب کا تھا۔ مامون رشید نے ۱۷۰۰ بڑھیاں
عورتیں مقرر کی تھیں جو دن بھر گھوم کر کچا چٹھا بیان کر دیتیں۔ سوا خلیفہ کے کوئی
عام تک سے واقف نہ تھا۔ یہ سلسلہ عالمگیر پر ختم ہو گیا تمام ہند کی سرحدوں اور مخدوش
مقامات پر پرچہ نویس لشکر۔ صوفی مجذوب وغیرہ موجود رہتے تھے۔ مستنصریہ (۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء)
کالج چھ سال میں تیار ہوا۔ کتب خانہ شاہی سے ۱۶۰ اونٹوں پر لد کر کتابیں لائی گئیں
کاغذ قلم روغن، مکان سب مفت تھا۔ ایک اشرفی ماہوار علاوہ ہر طالب علم کو ملتی تھی۔
دربار سے ۴ ½ لاکھ کی جاگیر وقف تھی۔ نظامیہ کالج جس میں چھ ہزار طلباء زانوے ادب
تہ کیا کرتے تھے اور جس کا سالانہ نظام الملک نے ۱۵ ہزار دینار مقرر کیا تھا۔ ایک دوسرا
نظام الغان کالج تھا گویا [illegible] باقاعدہ بستگاہوں کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔
خاص شہر بغداد میں ساٹھ مدرسے قائم ہوئے۔ اب یہ وہ مبارک زمانہ تھا کہ اسلامی
تمدن کا آفتاب منزلت خط استوا سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف علم و فن کے دریا لہریں لے رہے
تھے۔ بر و بام سے عقل و علم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں جسے دیکھو باغ علم میں تمدن و تہذیب کی

شاخ پر بیٹھا مثل بلبل ہزار داستاں چہک رہا تھا نئے نئے نغمے تھے عجیب عجیب زمزمے۔ ہر روز گلبن حکمت میں ایجاد و اختراع کے سرسبز و خوش رنگ کلے پھوٹتے رہتے تھے۔ چنانچہ بغداد کے بعد اصفہان میں ۴۸۔ قرطبہ میں ۸۰۔ بیت المقدس میں ۳۸۔ دمشق میں ۴۰۔ قاہرہ میں ۴۰ نیشاپور میں ۵ شہرۂ زماں اور نامور عظیم الشان مدارس و کالج مختلف اوقات میں قائم ہوئے۔ اندلس میں بعہد حکم وہ علمی ترقیاں ہوئیں کہ ہارون و مامون کا نام بھی ماند پڑ گیا۔ دربار عباسی بھی حکم کی رقیبانہ حوصلہ مندیوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہر جگہ سفیر و وکیل نایاب و نادر کتب کی تلاش میں مقرر کیے گئے کہ ممالک شرقیہ میں بھی جو کتاب تصنیف ہو بغداد سے پہلے اسپین آئے۔ چنانچہ علامہ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کے لکھے جانے کی جس وقت خبر پہنچی تو حکم کے قاصدوں نے کتاب تمام ہونے سے قبل ایک ہزار اشرفیاں مصنف کی خدمت میں پیش کیں کہ پہلا نسخہ کتب خانہ شاہی کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ حکم کے کتبخانہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ صرف عربی دیوانوں کی فہرست ۸۰ صفحہ پر تھی علامہ مقری نے مجموعی تعداد کتب چار لاکھ لکھی ہے زیادہ تر منتخب و چیدہ کتب تھیں۔ شیر شاہ اپنے زمانے کے زبردست فاضل شیخ عبدہ کی اس درجہ وقعت کرتا تھا کہ خود ان کی جوتیاں سیدھی کر کے سامنے رکھ دیتا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی اس درجہ شغف علمی رکھتا تھا۔ کہ ہر ہفتہ میں تین روز خود طلبا کو درس دیتا۔ علماء و مشائخ سے برادرانہ برتاؤ کیا کرتا تھا۔ عربی فارسی ترکی روسی بنگالی جرکسی افغانی مرہٹی گجراتی فرنگی گرجی وغیرہ سب زبانیں جانتا تھا۔ ریاضی میں اعلےٰ پایہ رکھتا تھا۔ اس نے ۸۰۰ھ میں دولت آباد میں ایک رصدگاہ تعمیر ہونے کا حکم دیا اور اس کا اہتمام فاضل عبدحسن گیلانی کے سپرد ہوا۔ سید اسمٰعیل عادل شاہ والی بیجاپور نے مولانا شہید شاعر قمی کو جو کمالات شاعری میں بے نظیر تھا عواطف خسروانی سے حکم دیا کہ خزانہ میں جا کر جس قدر زر تجھ سے اٹھ سکے اٹھا لا۔ چنانچہ وہ پچیس ہزار ہون طلائی اٹھا لائے گئے اس

بادشاہ نے ایک دن میں پچاس ہزار ہوں علمائے بیجاپور میں تقسیم کردیے۔ ایک عظیم الشان دار العلم جونپور میں نوی صدی ہجری میں قائم کیا گیا تھا جس سے بڑا دار العلوم دیار ہند میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔ مولانا قاضی شہاب الدین جونپوری مدرس اول تھے۔ سلطان ابراہیم اس درجہ وقعت و عزت کرتا تھا کہ دربار میں اپنے سامنے نقرئی کرسی پر بٹھاتا تھا۔ ایک بار اُن کی بیماری میں عیادت کو گیا تو پاس بیٹھ کر کٹورہ پانی کا اُن کے سر پر سے اُتار کر خود پی گیا اور بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی کہ الٰہی مولانا کی تکلیف مجھے دے اور ان کو شفا عنایت کر۔ ماہم بیگم کی علمی قدر دانی نے بھی دہلی میں ایک عظیم الشان کالج قائم کرا دیا تھا شہزادی زیب النسا بیگم نے ایک ایسا بے نظیر کتب خانہ بنایا تھا جس کا شہرہ ایران و توران سے آگے پہنچ گیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے حیاتی کاشی کو ایک نظم کے صلے میں زر سرخ و سفید سے تلوا کر چھ تھیلیاں مرحمت کیں۔ سلطان الحکما جب شاہ مصر سے کبیدہ ہو کر چل دیے ہیں تو قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ تمام مصر پیچھے ہو لیا آخر بادشاہ بصد منت واپس لایا۔

ان واقعات پر نظر ڈالو اور چشم عبرت سے خون کے آنسو بہاؤ۔ یہ فیاضیاں تھیں جب اس کان سے ہیرے نکلتے تھے۔ اس نوعیت کی قدر دانیاں تھیں جب اسلامی چمن رنگا رنگ گلوں سے مہک رہا تھا۔ آہ! سے

کبھی یہ دل تماشا گاہ تھا عیش و مسرت کا اب اس میں حسرت و رنج و تمنا سیر کرتے ہیں

اُف! آج اُمید و کامرانی کی وہ شمع دل افروز جو کاشانۂ غیر میں ضو فشاں ہے وہ کبھی ہمارے ایوان تقدیر میں بھی جو اس وقت یاس و بیم کے کھنڈرات ہیں، روشن تھی۔ آج باغ و بہار کے سرور و نشاط سے اغیار گذر رہے ہیں کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں کل ہمارے خس خانہ میں بھی دیارِ جنوب کی سمت تازہ نسیم آتی اور خود چل کر آتی عبد الرحمن غالث کی شمشیر خونبار شام سے فرانس جرمن اٹلی یونان کے شہریار لرزتے تھے۔ ہیبت سے

کانپتے تھے۔ اس کی خوشنودی کے لیے مدینۃ الزہرا کی مایۂ روزگار عمارت کو بیش بہا اور نادر
مصالح سے سجا کر جنان بناتے تھے۔ اس کا عہد تاریخ اندلس کا ایک زریں باب ہے۔ طب ہیئت
تاریخ جغرافیہ ایجادات کیمیا اور طبیعیات نے اسقدر عروج پایا کہ آخر ترقی یورپ کا باعث بنی۔
دار الخلافہ اندلس قرطبہ ہی پہلا شہر ہے جس کی سڑکیں پختہ بنائی گئیں اور شب کے وقت ان پر
لالٹینوں کی ضیا بار روشنی کی گئی۔ صرف لیمپ میں اسقدر تیز اور صاف روشنی ہوتی تھی
کہ میلوں اس کی روشنی میں چل پھر سکتے تھے۔ آج لوگ یورپین طرز معاشرت اور تہذیب سے
مرعوب ہو کے اسلامی ترقیوں کے منکر ہیں اور کوٹھیاں فرنیچر دیکھ کے حیران رہ جاتے ہیں لیکن
قرطبہ میں صدیوں پہلے جب کہ یورپ کے اکثر حصص گہوارۂ توحش و بہیمیت بنے ہوئے تھے
عرب اعلیٰ زندگی بسر کرتے تھے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً دو لاکھ مکانات قرطبہ میں ایسے تھے جن کی
ساخت اعلیٰ تعمیر کی تھی ہر مکان کا دروازہ سنگ سودا اور چبوترہ سنگ رخام کا ہوتا تھا۔
اور ہر مکان کے ساتھ ایک سرسبز و سدا بہار زمین ملحق رہتا تھا۔ خیال کرو اور سوچو کہ یہ سماں
کیسی پُر لطف ہو گی اور تمدن اسلامی کا آفتاب اقبال دنیا پر کیسی سرور افزا و نشاط انگیز
شعاعیں ڈال رہا ہوگا۔ ابن زناسی، ابن رشد، ابن باجہ، ابن طفیل، ابو الحسن (جس نے
شعاع کو ثابت کیا کہ خود ہر چیز کی تصویر آنکھ میں آتی ہے۔ اس اثبات کا نتیجہ آج فوٹو کی
ایجاد ہے۔ اس وحید عصر عالم نے علاوہ ایجاد کیا۔ اسی کا قول ہے کہ ہوا جس قدر بلند ہو
اتنی ہی سبک و لطیف ہوتی ہے) خیام، محقق طوسی، بو علی سینا، غزالی، رازی، ابو ریحان
بیرونی، شیخ جمالی اور حکیم گیلانی وغیرہم سب ایک ہی درخت کے ثمر ایک ہی لڑی کے موتی ہیں
غرناطہ میں ۱۲۰ پن چکیاں دن رات چلتی تھیں۔ اشبیلیہ میں ایک لاکھ کارخانے تھے
جہاں زیتون کا تیل نکلتا تھا۔ تصنیف و تالیف کا بحر ایسا موج زن تھا کہ ایک وقت میں قرطبہ
میں ۱۵۰۔ خانقاہ میں ۵۰۰ مدرسہ میں ۲۰۰ پریس لگا ... [25] اور مدرسہ میں ... کتابیں
لکھی گئیں۔ وہاں سے ... نے یہاں برسوں تعلیم پائی ...ھ میں پوپ ہونے پر اٹلی میں

اس نے دو مدرسے کھولے۔ ارقام ہندسہ کو عرب سے سیکھ کر یورپ میں رواج دیا۔ حسب روایت
مورخ مقریزی قاہرہ میں ۲۰ کتب خانہ تھے۔ ایک پبلک لائبریری بھی تھی۔ جامع ازہر میں
دور دراز ممالک کے بارہ ہزار طلبا فقہ حدیث، منطق، لغت، فلسفہ، ریاضی، نجوم اور تاریخ کی
تعلیم پاتے تھے۔ جن میں ریاضی و تاریخ کے موجد مسلمان ہی ہیں جنھوں نے ہر دو علوم کو علم کے
درجہ تک پہنچایا۔ یونیورسٹی خاص۔ مراکو میں مصر اندلس اور فرانس سے طلبا آتے تھے۔
یہ یونیورسٹی [illegible] ۱۱۰۰ھ کے پس و پیش میں قائم ہوئی تھی۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی یونیورسٹی
نہ تھی۔ سلطان محمود غزنوی نے ایک عدیم النظیر اور نفیس روزگار مسجد جامع بنائی جس میں
سنگ مرمر اور سنگ رخام کے مثمن مسدس مدور مربع طرز کے تراشیدہ لگائے گئے تھے
نقش و نگار کی بہار اور نقاشی و صناعی کی دلفریبی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ فرش و فروش
جھاڑ فانوس و دیگر سامان آراستگی و زیبائش بہروں آنکھوں کو مصروف رکھتا تھا
ولید کی جامع مسجد دمشق اور بغداد شریف کی جامع عباسی اگرچہ گراں خرچ تھیں لیکن
یہ مسجد محمودی ایشیا میں بے نظیر تھی اور عروس الفلاک کہلائی جاتی تھی۔ قریب مسجد ایک
عظیم الشان کالج بھی منقول و معقول کی تعلیم کے لیے قائم کیا۔ طلبا مفت تعلیم پاتے تھے
مسافر طلبا کو کتب و سامان خوراک بھی ملتا تھا۔ کالج کے متعلق ایک بڑی لائبریری تھی جس میں
دور و دراز سے کتب نادرہ منگا کر جمع کی گئی تھیں۔ ابن ہیثم نے معرکۃ الآرا مسئلہ روشنی کی
حرارت و جسمیت کو نہایت زبردست دلیلوں سے لباس ثبوت پہنایا۔ سرزمین ہند کا قابل فخر
بادشاہ شیرشاہ سور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے مختصر عہد میں جس قدر رفاہ عام کے
کام انجام دیے اُس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ قلعہ رہتاس گڑھ (پنجاب) سے
ستارگاؤں (بنگالہ) تک (چار ماہ کا رستہ ہے) آگرہ سے برہان پور تک۔ آگرہ سے جودھپور تک
اور لاہور سے ملتان تک چار عظیم الشان اور بے بدل سڑکیں بنائیں جن پر دو طرفہ میوہ دار
درخت کوس کوس بھر پر ایک ایک سرا۔ ایک ایک مسجد ایک ایک کنواں۔ ہر مسجد میں ایک

موذن ایک امام تھا۔ مسافروں کے کھانے پکانے اور خدمت کے لیے ایک ہندو ایک مسلمان کو ہر سرا میں متعین کیا۔ سب سڑکوں پر سترہ سو سرائیں تعمیر ہوئیں۔ ہر سرا میں جدا جدا مکان تھا۔ مویشی کے لیے چارہ تک مفت ملتا تھا۔ ہر سرا میں ایک جمعدار چند چوکیدار حفاظت کو مقرر تھے۔ انتظام کا یہ عالم تھا کہ ایک بڑھیا اشرفیوں کا طباق لیے جہاں چاہے چلی جائے۔ چور کی مجال نہ تھی جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ان سرائوں کے اخراجات کے لیے بہت سے گاؤں وقف تھے۔ عالمگیر نے بھی نئی لنگر آب سانی کا سررشتہ قائم کیا تھا۔ زبیدہ بیگم نے نہر زبیدہ جاری کر کے شہرت دوام کا دامن تھام لیا۔ نورجہاں وجہاں آرا نے عالیشان سرائیں تعمیر کرائیں جن کا ذکر برنیر حسرت کے ساتھ کرتا ہے کہ کاش پیرس میں بھی کچھ ایسی عورتیں ہوتیں تاکہ مسافروں کو حیرانی نہ ہوتی۔ شیر شاہی لنگرخانوں کا خرچ پانچسو اشرفی روز تھا جہاں غربا کو عمدہ کھانے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ معذورین اور پردہ نشینوں کے وظیفے مقرر تھے۔ شہنشاہ عالمگیر ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ سالانہ فقرا کو تقسیم کیا کرتا تھا۔ عہد ولید میں اندھوں معذوروں کی امداد کو علاوہ وظیفوں کے ایک آدمی نوکر رکھا جاتا تھا جس کے مصارف سرکار سے ملتے تھے۔ غرض غربا پروری اور بیکس نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔

سولھویں صدی عیسوی تک دنیا کے ہر حصہ میں اسلامی حکومتیں موجود تھیں تونس میں دولت بربریہ۔ الجزائر میں حکومت عرب۔ مراکش میں شرفائے بنی فاطمہ سوڈان و مصر و شام میں ترکان عثمانی اور ایران میں سلطنت صفویہ قائم تھی۔ توران و ترکستان و ماوراءالنہر و قبچاق میں (وہ ملک جو ایشیائی روس کہا جاتا ہے) دولت ازبکیہ کی متعدد شاخیں اعلائے اسلام کر رہی تھیں۔ ارض کریمیا کے حاکم بھی مسلمان ہی تھے۔ اور روس کی مسیحی حکومت بھی ان دنوں مسلمانان تاتار ہی کے زیر فرمان تھی۔ زنجبار، مڈگاسکر، سقوطری واسلام

تھیں وہ ہماری محسودِ عالم ترقیاں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم اُن اسلاف کے خلف ہیں۔ آہ! اب
ہم میں زمانہ سے سبق لینے اور عبرت آموزی کرنے کا مادہ بھی نہیں رہا ہے۔ ولکن تعمی القلوب
التی فی الصدور۔ ہرچند کہ ہم میں پیدا ہو گئی کہ جس ہم وادی الکبیر پر غور کرتے تھے تو گنگا پر
نماز ہوتی تھی۔ دوزخ میں سوتے تھے تو صبح جنت میں نمودار ہوتی تھی۔ وانتم الاعلون ان کنتم
مومنین کا تو فیصلہ ہارا اور رفتہ رفتہ سب سبق بھلا دیا۔ بمصداق اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا کو فراموش
کر دیا۔ اس لیے ضربت علیہم الذلۃ کے مورد بنے اور فان لہ معیشۃ ضنکا کی خمیازہ کشی پر اندوہ
سزا پائی۔ آج ہم کرب و نکبت کے قعر آب میں تختہ بند ہیں مگر احساس نہیں۔ ذلت و تحقیر کی
جوتیاں کھاتے ہیں مگر شرم نہیں آتی کیونکہ یاد ہے کہ ہم ایک عظیم الشان و غیور قوم کے خلف ہیں
دنیا ہم پر ہنستی ہے قہقہہ لگاتی ہے مگر ہماں چنیں خفتہ اند کہ گوئی مردہ اند کے مصداق بنے ہوئے
ہیں۔ ہماری ترقی کی بنائیں علم قرآن کی اتباع پر استوار تھیں۔ اول ہم نے علم سیکھا مسلمان
نے واعتصموا بحبل اللہ کی ریشمی ڈوریاں تھامیں۔ یکدلی و یکجہتی کے پھول چنے۔ نفاق
و شقاق کے کانٹے ہٹائے۔ ایک ہی خمخانہ کے جرعہ نوش بنے۔ غیریت کے نقاب اُٹھ گئے
پھر کیا تھا نازنینِ مقصود بہ آغوش وا سامنے آگئی۔ دل آرائی کے جھولے نظر آئے۔ وہ
اسلام ایک پھلواری سی کر شاداب ہو گئی۔ اور آن کی آن میں وہ کوہ شکن طاقت آگئی۔ کہ
قیصر و کسریٰ کی وسیع و مقتدر حکومتیں پاؤں تلے پڑی ہوئی دکھائی دیں۔ اور دیکھتے دیکھتے
اُن دنیا پر چھا گئے اور وہ سطوت و اقتدار حاصل ہوا کہ عالم حیران رہ گیا۔ اور افق عرب
سے ایک ایسی تیز اور نورانی روشنی آنی شروع ہوئی کہ دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ مراکو سے
چین تک اور ہند سے روس تک ایک عالم جگمگا اُٹھا۔ وہ شمع جہاں افروز جو برسوں گھر گھر
ضو فشانیاں کرتی رہی تھی آج باد مخالف کے جھونکوں سے جھلملا رہی ہے۔ بحر خونیں ہماری
کشتی اُمید کو سپرد تلاطم پاس کر رہا ہے۔ وہ شجر جس پر آج خزاں کی حکمرانی ہے۔ کل
موسم بہار کے روح پرور جھونکے اُسکے محکوم تھے۔ یہ خشک جھیلیں اور نم ناآشنا آبشار

آج افسردہ ہیں مگر کل امرت کی لہریں ان ہی میں کھیلتی تھیں۔ زخم جگر کی تکلیفیں آج جتنی بھی ناگزیر ہوں جائز۔ کیونکہ کل کثرت تعیشات سے رگ گل کے نشان بھی جسم پر بار و ناگوار تھے۔ آہ مصیبت و کلفت کا احساس غم دائم کی شکل میں جسقدر بھی صعب و شدید ہے وہ اس لیئے کہ امید واروں کی بخشش بے اندازہ برسوں سہل انگار رہی ہے۔ نااتفاقی و نفسانیت کے جراثیم نے جب جسد قومی میں سرایت کی نظام ہوش و حواس بگڑ گیا جس دن کہ شاہراہ شریعت سے ہٹے آج تک پھر عافیت میسر نہ ہوئی۔ ہم کو اب عیش و سرور کے زمزمے اور مسرت و انبساط کے نغمے بھی ملول و حزیں کرتے ہیں شیشہ و ساغر کی کشش دلفریب دونی خلش و بیزاری پیدا کرتی ہے۔ گلگشت چمن جگر میں درد اور دل میں اضطراب کے نشتر چبھوتی ہے۔ سیر گلستاں کا لطف خانۂ دماغ میں تخیلات کی اعانت سے عجیب تصورات بناتا اور روح میں افسردگی پیدا کرتا ہے۔ عیش و مسرت بھی آکر دل مضطرب کو اور بیقرار کر جاتے ہیں۔ طبیعت میں حسرت و یاس کا ہجوم رہتا ہے۔ بزم کہن کی یاد ہمارے دن کو رات بنائے ہوئے ہے ؎

گئی باغ دہر سے فصل گل نہیں بلبلوں کا وہ شور و غل

نہ وہ پہچے نہ وہ جام و مل نہ شراب ہے نہ کباب ہے

شریف احمد قمر آو۔

حدیث فکری

میں اپنی خواب غفلت سے بیدار ہوا اور میرے عقل و شعور نے اپنے غلاف سے منہ نکالا! لیکن کس طرح؟ جیسے عروس صبح شب تاریک سے اپنا جلوہ نمایاں کرتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک نئی دنیا میں ہوں۔ میرے پاس لذت بھی ہے اور حیرت بھی، فرحت بھی ہے اور مسرت بھی۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ درختوں کی شاخیں رقص میں مصروف ہیں۔ پھولوں کی مہک اور سبزے کی لہک سے دماغ تر و تازہ ہو رہا ہے۔ آنکھیں نظارت حاصل کر رہی ہیں۔ دل تفریح پا رہا ہے۔ یہ نظارۂ جاں بخش دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

"اے پاک پروردگار، اے فاطر السموات والارض بے شک تو ہر تعریف کا مستحق ہے"

میں جو منظر اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں وہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور جو باتیں اس وقت سن رہا ہوں، وہ کبھی نہ سنی تھیں۔ یہ امر مجھے ہزار ہا مرتبہ پیش آیا۔ لیکن ایسی صورت کبھی نہیں واقع ہوئی۔ یہ خفا اور ظہور کیا ہیں؟ اور اس سے پہلے یہ احساس کہاں تھا؟ یارب! یہ خاموش چیزیں میری کچھ نہیں سنتیں۔ میں اپنا مدعا کس سے پوچھوں اور کون مجھے تسلی بخش جواب دے گا۔ ہاں! میں ان سے پوچھتا ہوں۔ وہ جواب دیتی ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا۔ مگر یا اللہ! میں ایسی چیز کے جواب پر کیونکر صبر کروں اور ان چیزوں سے کیسے قطع نظر کروں جس کا تعلق تیری ذات سے ہے۔ کیا یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے پتے خشک ہو ہو کر جاتے ہیں۔ ہم اگائیں سا ہوتی ہیں، پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں۔ لکڑیاں بنتی ہیں اور جل کر راکھ

پڑجاتی ہیں۔ کیا میں اسے سورج سمجھوں جو پہلے اپنی روشنی کو زمین کے ایک رخ پر ڈالتا ہے پھر دوسری جانب۔ غرض اس طرح وہ اپنی جگہ تو بدلتا رہتا ہے لیکن خود متغیر نہیں ہوتا

میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور منتظر تھا کہ شاید کوئی جواب ملے جو زخم جگر کا مرہم ہو۔ لیکن سب مبہوت! زمین کی طرف نظر ڈالی وہاں بھی یہی عالم دیکھا یا اللہ! کیا میرے سامنے وہی فضا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں؟ وہی دریا ہے جس کا کوئی ساحل نہیں؟ جس میں کبھی تو تجلیات نور مرکوز ہوتی ہیں اور کبھی حجاب ظلمت، کبھی روشنی پھیل جاتی ہے اور کبھی گھٹا ٹوپ اندھیرا آجاتا ہے نہیں معلوم یہ معمہ عظیم کیا ہے۔ اگر ان کے نام سے واقفیت ہوتی تو ممکن تھا کہ راز سربستہ کھل جاتا۔ مگر نہیں! نام سے اس حقیقت کا پتہ کیا لگ سکتا تھا جس کی مجھے تلاش ہے۔ دیکھو پھر روشنی پھیلی، نور نمودار ہوا۔ لیکن کیا اس لیے کہ مجھے پہچانے یا اس لیے کہ میں اسے پہچانوں۔ یہ تعلق میرے لیے تھا یا اس کے لیے یا ہم سب اس نور کے لیے تھے یا یہ نور ہمارے سب کے لیے تھا۔ مگر خیر کچھ بھی ہو۔ ہم سمجھ گئے کہ اگر نور نہ ہوتا تو ہم کسی کو نہ پہچانتے اور ہم نے اب پہچان لیا کہ نور کیا ہے۔ لیکن تب بھی یہ نہیں پہچانا کہ کیونکر پہچانا۔

آسمان و زمین کی وسعت اور ان کی عظمت کس قدر ہے وہ کتنی وسیع اور کتنی عظیم ہیں لیکن باوجود اس کے میں نے اسکو ایک ایسی لوح پر نقش کیا ہے جو میرے دماغ میں محسوس بھی نہیں ہوتا یہ دریا یہ سمندر میرے سامنے موجیں مار رہا ہے اور بہت بڑا ہے لیکن میرے نزدیک اسکی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ میں اسکی وسعت کا خیال کرتا ہوں نہ عظمت۔ لیکن کیوں؟ ہاں شاید اس لیے کہ وہ محدود ہے یا شاید اس لیے کہ جو کبھی طلوع ہوا ہے لوگ کہتے ہیں بہت بڑا ہے مگر میری آنکھوں میں بہت چھوٹا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ خود اسی دریا کا قطرہ ہے

جو غیر محدود ہے۔

میں نے، اس وقت سمجھا کہ یہ تمام بڑی بڑی چیزیں باوجود بڑی بڑی ہونے کے اس سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں جو غیر محدود ہے۔ اسلیے جن چیزوں کو میں محسوس کرسکتا ہوں ان سے نہ میری پیاس بجھ سکتی ہے نہ وہ میرے درد کی درماں ہوسکتی ہیں۔ یہ جتنی چیزیں ہم کو بینمیں اور جن کو دیکھ کر ہم خوش ہو جاتے ہیں، جنھوں نے ہم کو موہ لیا ہے، وہ ہماری ہی مسخر ہیں لیکن کیا؟ ہم باوجود اس قدر چھوٹا سا جسم رکھنے کے ان لوگوں سے بڑھ کر ہیں۔ نہیں؛ یہاں پھر حیرت نے دامن پکڑ لیا اور ان درختوں سے جو نئی دلھنوں کی طرح آراستہ تھے سوال کیا۔ لیکن یا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یا جواب دیا اور میں اُن کی سرسراہٹ کو سمجھا نہیں پھر میں نے رقص کرنے والے کبوتروں سے دریافت کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ یا اُن کی غٹرغوں میری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر مجھے ان چیزوں سے اُنس تھا کیونکہ وہ میری مالوف تھیں، محبوب تھیں، مطلوب تھیں۔ آخر کار میری محبت ان سرسبز جھومنے والے درختوں سے، گانے والے پتوں سے بڑھی اور اتنی بڑھی کہ میں ان کے کلام کی تفسیر کرنے لگا۔ انھوں نے مجھ کو حیات کے معنی سمجھائے اور مجھے میرے نفس کی طرف رجوع کیا۔ یہی میری گم شدہ متاع تھی جو میرے بغل میں تھی لیکن اس کی جستجو نے مجھے سرگرداں کیا۔ اس کی تلاش مجھے محدود عالم کے گوشے گوشے میں پھرا لائی۔ اب میں اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوا اور اسکی گفتگو پر غور کیا۔ تو اُس نے کہا یقیناً میں اسی چھوٹے ذرہ کا ایک نہایت چھوٹا ذرہ ہوں جو آسمان کے درمیان حرکت کر رہا ہے۔ اور اس ذرہ صغیرہ میں بھی ہزارہا ایسے ذرے ہیں، جو اس ذرے سے ادنیٰ کی نسبت نہیں رکھتے ان میں سے ہر ایک ذرہ میں حیات موجود ہے، ہاں بعض ذرے ایسے ہیں کہ اگر ان کی وضع میں فساد واقع ہو تو تمام ذروں سے حیات زائل ہو جاتی ہے، اور یہی وہ ذرہ ہے، جس کے مجموعہ سے جسم انسانی تکون ہوتا ہے، اس بات سے میری سمجھ میں یہ آیا کہ حیات ایک ادراک اور حرکت ہے جو ان تمام ذروں میں ساری ہے۔

ق سحر

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دینا چاہیے۔

فن طب زمانہ جاہلیت میں

ان بہت سے علوم و فنون میں سے، جن کی بنیادیں ازمنہ قدیمہ میں پڑ چکی تھیں، ایک فن طب بھی ہے جس کا سنگ بنیاد اور حجر اساس کلدانیوں کے ہاتھوں رکھا گیا، اور آئندہ چل کر اس پر دور ناپائدار زمانہ نے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں قائم کیں، کلدانی ہی دنیا میں پہلی قوم ہے جس نے امراض کے علاج کے متعلق غور و فکر تفحص و تجسس سے کام لیا اور موجد فن طب ہونے کا سنہرا تاج اپنے سر رکھا اور پھر دنیا کی اور قوموں نے ان سے یہ لطیف فن سیکھا عربوں نے بھی اس فن کو کلدانیوں ہی سے حاصل کیا جب یہ یونانیوں کو ملا، تو چونکہ خدا عزوجل نے ان کے دل و دماغ کو نہایت مناسب بنایا تھا، انھوں نے اس کو نہایت مستحکم اور استوار کر دیا، اس کے بابوں کی ترتیب دی، اس کے ہر حصہ کو الگ الگ بیان کیا، ان سے رومیوں اور فارس والوں نے لیا، چونکہ ان ممالک کا ہمعصر عرب تھا، عربوں نے کچھ یونانیوں کے طب سے انتخاب کیا، کچھ کلدانیوں سے حاصل کیا اور کچھ خود اپنی اس دماغی قوت سے کام لے کر جو ذات واحد کی طرف سے اس خطہ زمین کے بسنے والوں کو خاص طور پر عنایت ہوئی تھی، ایجادات و اختراعات کئے ان مواد سے ان کے پاس وہ چیز تیار ہو گئی جسے ہم "زمانہ جاہلیت کا فن طب" سے تعبیر کرتے ہیں جو آج تک بوادی و دیہاتوں کے بسنے والوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

ان کے علاج کرنے کے دو طریقے تھے، ایک تو کاہنوں اور عرافین کا طریقہ، دوسرا دوا اور علاج کا، کاہن اور عرافین افسوں، جادو، سحر، تعویذ اور گنڈہ وغیرہ سے علاج کرتے تھے (جس کو ہمارے ہاں جھاڑ پھونک کہتے ہیں) یا تھا کہ کعبہ پر ذبیحہ ذبح کرنے اور اس میں جا کر دعا کرنے یا مریض سے تاوان دلاتے تھے (غالباً یہی طریقہ ہمارے ہاں صدقہ کی صورت میں ہے) وہ جماعات قدیمہ اور امم عتیقہ جو سحر، جادو، تعویذ وغیرہ سے علاج کرتی تھیں، مشہور و معروف تھے، اور ان کو اپنے اگلوں سے بہت سے تعویذ اور گنڈے ورثہ میں ملے تھے جن کے ذریعہ سے

وہ مریضوں کا علاج کرتے تھے، جب وہ کسی مریض کا علاج کرنے جاتے تو ان کے ساتھ دو خادم ہوتے تھے، ایک تو دعا اور تعویذ کا دفتر لیے ہوتا تھا، دوسرا بھی دواؤں کا صندوق لیے چلتا تھا، اپنے تعویذ گنڈوں سحر اور جادو میں وہ اپنے کسی معبود خصوصاً ایزیس اور ہوریس یا درع کی طرف دھیان کرتے تھے، اور ان کا نام بھی لیتے تھے، دواؤں کے بنانے کے وقت کچھ الفاظ اپنی زبان سے کہتے تھے، مثلاً:-

"یہی کتاب الشفا ہے، پس کیا ایزیس مجھکو شفا میں بخشے گا، جس طرح اس نے ہوریس کو ان تمام مصائب اور آلام سے نجات دی جو اسکو اسکے بھائی ست کی طرف سے پہنچے تھے، جب اس نے اسکے باپ اوزیریس کو قتل کیا تھا، پس اے ایزیس تو جو بہت بڑا جادوگر ہے، مجھکو شفا بخش، مجھکو ہر برائی شیطانی کام اور ہر قسم کے مہلک امراض سے نجات دے، جس میں تو مجھ کو مبتلا کرتا ہے جس طرح تو نے اپنے بیٹے کو نجات دی ...... "

یہی دعا دوا پینے کے وقت بھی پڑھتے تھے، ان لوگوں کے پاس ادواح قبیحہ کے، جو انکے خیال کے مطابق امراض کا سبب بنتی تھیں، نکالنے کی دعائیں تھیں، انھیں خیالات کی بنا پر عرب جن اور شیطان کے نکالنے کے لیے اپنے بتوں کے نام کی دعائیں اور سحر پڑھتے تھے، اور اسیطرح جب انکو وبا کا خوف ہوتا تھا تو وہ گدھوں کی طرح چیختے تھے، اُن کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے وہ وبا سے محفوظ رہیں گے، ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ بادشاہوں کا خون ہلاکت سے نجات دیتا ہے۔

لیکن جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے میں وہ مصریوں اور دوسری قدیم قوموں کے مشابہ تھے، مفرد بوٹیوں اور پینے کی چیزوں خصوصاً شہد سے علاج کیا کرتے تھے، پیشکم کے امراض کے علاج کرنے کا طریقہ تھا (امراض کے علاج کی آخری صورت آپ کے ہاں زخم کرنا، فصد لینی اور داغ کرنا یا چھ کرنا) تھی، انکا قول تھا کہ ہر مرض کا آخری علاج اس عضو پر داغ لگانا ہے جس میں وہ مرض ہے، پھنسے لوگوں کے علاج کرنے کا قاعدہ یہ تھا کہ اس عضو کو بالکل کاٹ کر جدا کر دیتے تھے، جیسا کہ آج بھی بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر سانپ سے کاٹے ہوئے عضو میں زہر کو جسم سے الگ کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں، جب انھیں کسی آدمی کا کوئی عضو کاٹنا ہوتا تھا تو اسے آگ کے کندے سے گرم کرتے تھے اور پھر کاٹ ڈالتے تھے، چنانچہ انھوں نے بحرین عامر اور عفرا کے بھائیوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا تھا، جو آدمی احول ہوتا تھا اسے اطبا حکم دیتے تھے کہ وہ چکی کو چلنے کی حالت میں دیکھے، انکا خیال تھا کہ آنکھ اسی سے قائم رہتی ہے، معالجہ کے ان طریقوں میں سے جنکو ہم نے ابھی گنایا ہے ایک عجیب طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کوئی عورت ڈرتی تھی تو اسے گرم پانی پلاتے تھے تاکہ اس کا دل ٹھنڈا ہو جائے۔

محمد اسمعیل

کلامِ جوہر

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رُک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

غیروں کے ساتھ ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد

کیا زندگی وہ جس میں کوئی آرزو نہ ہو
رہتی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے، وہاں خوفِ خدا اور سہی

رتبۂ عزت کے لیے بھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

دل و دیں جا ہی چکا جان بھی جاتی ہو تو جائے
ترکشِ ناز میں اک تیرِ قضا اور سہی

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
ملک الموت پہ ایماں کی سزا اور سہی

ہم وفا کیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

جس نے ہنگامۂ عدالت کا تری دیکھا ہے
اُس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

عہد اوروں کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

مُکالمۂ محبّت

(ماخوذ از نظم سروجنی نائیڈو صاحبہ)

(۱)

چاند سے مکھڑے کی جھلک ہم کو دکھا دو تم ذرا
مُنھ پہ ہے یہ نقاب کیوں اسکو اُٹھا دو تم ذرا

پھولوں کے گجرے خوشنما چوٹی میں یہ پڑے ہوئے
بال یہ اسقدر سیاہ کیوڑے میں سب بسے ہوئے

جھالریں ریشمی تری نیند کو جو اُڑاتی ہیں
بالوں کی یہ سیٹیں مُنھ پہ جو ڈھلکے آتی ہیں

طرفہ جھانجھروں کی یہ صدا اور بھی دلگداز ہے
پاؤں میں جو پڑیاں ہیں یہ یا کوئی نے نواز ہے

غنچۂ دل کھلے ذرا روح فزا نظر فزا
زلفِ سیہ کا لخلخہ غش میں سنگھائیے ذرا

(۲)

تیرے دکھانے کے لیے چہرہ میں اپنا کھول دوں
میرے دھرم کی ننگ ہے ایسا میں کس طرح کروں

گاؤ کشی جو کرتے ہیں اُنکی میں آشنا بنوں
بیٹھے بٹھائے اپنے سر کیوں یہ عذاب مول لوں

اپنے حواس میں نہیں ہوگیا ہے تری ہوا
چھوڑ دوں ذات والوں کو دشمنوں کے لیے بھلا

ایسی ہی کیا تجھ نہیں آکے تمھاری بات میں
کرکے تمھارا میں کہا بٹہ لگاؤں ذات میں

تیری ہی ذات والوں نے خون بہت بہایا ہے
تیری ہی ذات والوں نے دیویوں کو مٹایا ہے

برسوں سے ہوتے آئے ہیں جھگڑے لڑائی دشمنی
میری تمھاری لوگوں میں بن نہیں سکتی ہے کبھی

(۳)

میری ہے آہیں کیا خطا میں نے تمھارا کیا کیا
سوچو تو دل میں مدعا ہوتے ہو مجھ پہ کیوں خفا

دیر ہو یا حرم سہی کعبہ ہو یا ہو بُت کدہ
مذہبِ عشق کو بھلا ان سے کہاں کا واسطہ

عشق میں دونوں ایک ہیں نغمہ سنکھ یا اذاں
شیخ ہو یا ہو برہمن دونوں ہیں ہمقدم یہاں

آنسو اگر بہا دیے آنکھوں نے آکے جوش میں
انکا یہاں کی شست وشو دھو گئی ساری گندگیاں

مانو وفا کا تم کہا چھوڑو خیال ذات کا
جانے دو پچھلی باتوں کو آؤ گلے ملو ذرا

وفا صدیقی

غنچہ و شاعر

(شاعر)

بہار باغ کے مہمان شاد کام ہے تو　　چمن کے ہاتھ میں عشرت کا ایک جام ہے تو
شمیم گل سے ہے لبریز عطرداں تیرا　　ہے عندلیب تری اور گلستاں تیرا
چمن میں اپنا تجھے دل سمجھ رہا ہے کوئی　　خوشی سے کانٹوں میں تیرے الجھ رہا ہے کوئی
مگر کہیں نہ غضب ڈھائے یہ جمال ترا　　ڈرا رہا ہے مجھے تو غم مآل ترا
نظر سے اہل جہاں کے نہ ہو گیا روپوش　　ہوا تو صحن گلستاں میں آ کے جلوہ فروش
صبا کا جھونکا جو تیری طرف کو آتا ہے　　تو جھوم جھوم کے کیسا تو مسکراتا ہے
خزاں کا خوف نہ گلچیں کا کوئی ڈر تجکو　　مآل حسن کی شاید خبر نہیں تجکو

غنچہ

مرا وجود مرقع ہے میری حالت کا　　یہ انبساط تقاضا ہے میری فطرت کا
مآل کار پہ رکھوں نظر تو ہوں مغموم　　میں لطف زیست سے تیری طرح رہوں محروم
اصول زیست سے تو آشنا نہیں ہے ابھی　　یہ ایک رمز ہے تو جانتا نہیں ہے ابھی
زیادہ مجھ سے نگہباں ہے میرا رب قدیر　　بدل نہ جائے گی گریہ سے کچھ مری تقدیر
ہے دست خالق عالم میں جب مرا انجام　　مصیبتیں بھی ہیں تجکو نشاط کا پیغام
جو زخم دل کا مرے رفتہ رفتہ چھپاتا ہے　　اور برگ برگ مسرت سے اور کھلتا ہے
دکھا دکھا کے تبسم سے جسم رنگیں کو　　لبھا رہا ہوں میں خود ہی نگاہ گلچیں کو

غرض یہ ہے مری ہستی کسی کے کام آئے
یہ جسم نازک مرا شاخ پہ نہ مرجھائے

محمود [illegible]

مزے

اغنیا کو نہیں حاصل زر و دولت کے مزے
متوکل کو جو ملتے ہیں قناعت کے مزے

دیکھو اشرار کا کیا حال گناہوں سے ہے
پوچھو ابرار سے کیسے ہیں عبادت کے مزے

نہ سے حاصل ہی نہیں منعمِ جاہل کو وہ لطف
عُلما لیتے ہیں جو علم کی دولت کے مزے

جن کو غیرت نہیں ذلت میں بسر کرتے ہیں
شُرفا جانتے ہیں غیرت و عزت کے مزے

مُبتلائے غم و مصیبت میں ہیں، جو کاہل ہیں
محنتی سے تو ذرا پوچھیے راحت کے مزے

جو نہیں ہارتے ناکامیوں سے بھی ہمت
کچھ انھیں لوگوں کو معلوم ہیں ہمت کے مزے

اب وہ شوکت ہے کہاں قبر میں کیا ہوگا حال
جا کے جمشید سے اب پوچھیے عشرت کے مزے

جن کی نیت ہو بُری ہوتے ہیں وہ رسوا بھی
پاک طینت ہی کو ملتے ہیں محبت کے مزے

کسی ناکام کے کام آؤ تو کچھ لطف ملے
کیا کہیں تم سے کہ کیا کیا ہیں اعانت کے مزے

بخل سے زیست کا ملتا ہی نہیں کچھ بھی مزہ
کرو بخشش تو ہوں معلوم سخاوت کے مزے

ذلتیں پاتے ہیں ارذال خیانت کے سبب
کچھ شریفوں ہی کو ملتے ہیں امانت کے مزے

اپنے کردار سے ہوتے ہیں ستمگر برباد
لیتے ہیں منصف و عادل ہی عدالت کے مزے

عافیت کی وہی کچھ قدر کیا کرتے ہیں
یاد رکھتے ہیں جو ایام مصیبت کے مزے

وہی کرتے ہیں اطاعت کی ذلت کو پسند
کچھ بھی معلوم نہیں جن کو تجارت کے مزے

ہو جو بیکار تو بیکار کی فکر میں نہ کرو
ہاں اگر دو کچھ کہ لیں صنعت و حرفت کے مزے

کرتے رہتے ہو ہمدردیِ احباب ذہینؔ
آپ کے دل سے کوئی پوچھے مروت کے مزے

ذہین

غزلیات

حضرت حسرت موہانی

پوچھا بھی تو اُس نے کبھی گھر سے نکل کر — شرمندہ ہیں نالے دلِ مضطر سے نکل کر

پائی ہے جگہ پاکیِ دامانِ نظر میں — خوشبوے حیا نے تری چادر سے نکل کر

کیا چیز تھی ساقی وہ پسِ پردہ مینا — جو سُرخ پری بن گئی ساغر سے نکل کر

دیکھا جو کہیں گرم نظر بزمِ عدو میں — وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

بن جاتی ہے دل میں خلشِ خارِ تمنا — جھنکار ترے پاؤں کے زیور سے نکل کر

پُرنور کیا خوب شہیدوں کے دلوں کو — چاہت کی چمک نے ترے خنجر سے نکل کر

حسرت مجھے بھاتی ہے پریشانیِ دل بھی
آئی ہے جو اُس گیسوِ ابتر سے نکل کر

(مرسلہ بیگم حسرت موہانی)

حضرت شوق قدوائی لکھنوی

وصل کے وعدہ سے پھر کیوں یہ ستم ہونے لگا — ہجر کی خو سے مرا درد اب تو کم ہونے لگا

ہوگئی شاید وہاں میری وفا بے اعتبار — ہر ستم کے بعد ہی عذرِ ستم ہونے لگا

یا گھٹی کچھ اُسکی نخوت۔ یا بڑھا کچھ میرا شوق — ورنہ کیوں مجھ کو خیالِ فرخِ غم ہونے لگا

کیا چھپاؤں دردِ دل خط میں کہ بے قصدِ رقم — عاشقانہ میرا اندازِ رقم ہونے لگا

حیف۔ اُسکے قصرِ عالی تک نہ پہنچا دودِ آہ — جا کے چرخِ نیلگوں میں وہ تو ضم ہونے لگا

تصحیح:۔ دسمبر کے پرچہ میں مولانا حسرت موہانی کی غزل کے حسبِ ذیل تین شعر غلط چھپ گئے ہیں صحیح شعر یہ ہیں

ہائے گریہ جو ہیں آپ۔ تو کیا ہم یوں بھی؟ — پارۂ جانِ حزیں و دلِ شیدا نہ کریں؟

ہم نے دس بار [illegible] شکوا نہ کیا [illegible] نہ کریں — شق بیداد میں ناحق [illegible] محابا نہ کریں

سُن کے [illegible] حال کہا [illegible] — ہیں وہ بدنام کہیں ہم کو بھی رسوا نہ کریں

جوشِ الفت نے کیا ہے مجھ کو کتنا سادہ لوح ۔ اُس کے وعدہ کا یقیں اب بے قسم ہونے لگا

سہو دیکھو شوق کا جو بھول کر لطفِ ستم
جا کے معشوقوں میں جویائے کرم ہونے لگا

حضرت دلؔ شاہجہانپوری

گو کسی سے درد و غم کا ماجرا کہنے کو ہیں ۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہنے کو ہیں
پیشِ دلبر قصۂ مہر و وفا کہنے کو ہیں ۔ مختصر یہ ہے کہ دل کا ماجرا کہنے کو ہیں
دیکھیے کب تک خدا پہنچائے اُس در تک ہمیں ۔ جس کو جملہ مرحلوں کی انتہا کہنے کو ہیں
چارہ گر جو کچھ تجھے تدبیر کرنی ہو وہ کر ۔ پھر تو اپنے درد کو ہم لا دوا کہنے کو ہیں
اے امید و یاس تم بھی غور سے سننا ذرا ۔ وہ سوالِ وصل پر کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
کہنے والے کہہ چکے اب جس کو سننا ہو سنے ۔ ہم بھی اپنے عشق کا کچھ ماجرا کہنے کو ہیں
کفر و ایماں کی حقیقت پوچھتا ہے جو کوئی ۔ پوچھنے والے ہم تجھے اپنا خدا کہنے کو ہیں
فرطِ خاموشی میں آخر بن گئی صورت سوال ۔ اب سبب خاموش دل کا مدعا کہنے کو ہیں
مٹ چکا ہے عشق میں جب مال ہوش [illegible] ۔ نقشِ دل کو ہم کسی کا نقشِ پا کہنے کو ہیں
واقعاتِ ہستیِ اہلِ فنا سنتے چلو ۔ بے زبانِ حال سے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
دفعۃً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد ۔ ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
ترکِ الفت ہو چکی یہ تذکرہ تو چھوڑ دیں ۔ وہ کہیں جو نہ کہو اسکے سوا کہنے کو ہیں

آخری الزام لیتے جاؤ اے دلؔ وقتِ نزع
اب کوئی دم میں وہ تم کو بے وفا کہنے کو ہیں

حضرت وفاؔ حیدرآبادی

ہیں مہر و مہ خجل رخِ انور کے روبرو ۔ سارا جہاں ہیچ ہے دلبر کے روبرو
کیسا ہے انقلاب زمانے کا آج کل ۔ نا چیز ہیں شریف تونگر کے روبرو

ارماں بہت تھے دل میں مگر رعبِ حسن سے
کچھ کہہ سکے نہ وصل میں دلبر کے روبرو

دنیا میں تم ستا لو مجھے چاہے جس قدر
لوں گا جواب داورِ محشر کے روبرو

اے تیغِ ناز اب مری حسرت نکال دے
بیٹھا ہوا ہوں کب سے ستمگر کے روبرو

اُس کو بھی اپنی آئینہ سازی پہ ناز ہو
تصویر تیری ہو جو سکندر کے روبرو

دونوں میں آج کس کی رہے بات دیکھیے
روشن ہیں داغِ دل مہ و اختر کے روبرو

بھیجوں نہ بھیجوں رشک سے اس سوچ میں ہوں میں
نامہ دھرا ہوا ہے کبوتر کے روبرو

تقدیر ہی میں وصل نہو گر تو فائدہ
بیکار کوششیں ہیں مقدر کے روبرو

دریا ہمارے دیدۂ پُرنم کے سامنے
چشمہ کی اصل کیا ہے سمندر کے روبرو

ارمانِ قتل آج تو پورا ہو یا خدا
بیٹھا ہوں سر جھکائے میں خنجر کے روبرو

کوشش وفا نے کی تھی ولیکن بقول داغ
چلتی نہیں کسی کی مقدر کے روبرو

حضرت صولت (از بنگلور)

نام لیوا عشق کے تھے قیس بھی فرہاد بھی
پر ہوا ہے کوئی مجھ سا عشق کا اُستاد بھی

ہے فدا ہم سازِ جمعیت پریشانی مری
دل کے ویرانے میں ہے اک گوشۂ آباد بھی

تو یہاں آیا تھا کر کے عہد اک روزِ الست
اے فدائے عہد! ہے وہ عہد تجھکو یاد بھی

کچھ خبر بھی ہے کوئی دن میں اُکھڑ جانے کو ہے
اے درختِ کبر! تیری بیخ بھی بنیاد بھی

ہے اُسی دل کا لقب صبر محبت آشنا
جس سے نغمہ بن کے نکلے آہ بھی فریاد بھی

شیفتہ حق کا کبھی گرویدۂ باطل کبھی
ہے بنی آدم ستم کش بھی ستم ایجاد بھی

موج زن اے بحرِ جوشِ غیرتِ حق پھر سے ہو
خندہ زن اسلام پر ہے کفر بھی الحاد بھی

دام باطل سے رہا ہے حق کا پابندِ اصول
زندگی اپنی ہے صولت قید بھی آزاد بھی

حضرت آفق امروہوی

تڑپ کر یوں اسیرانِ قفس گلشن میں مرتے ہیں — ہوا سے جس طرح برگِ خزاں دیدہ بکھرتے ہیں
گلا خود کاٹ کر مقتل میں اپنا آپ مرتے ہیں — تری تیغِ ادا کے آج ہم صدقے اترتے ہیں
وہی پاتے ہیں کچھ لذت حیاتِ جاودانی کی — جو اپنی جان تیری راہ میں قربان کرتے ہیں
یہ پروانے نے سوزِ شمع میں دکھلا دیا جل کر — کہ یوں جانبازِ الفت عشق میں جی سے گزرتے ہیں
چراغِ طور کے مانند شعلہ دل سے اُٹھتا ہے — چمک جاتی ہے اک بجلی سی جب ہم آہ کرتے ہیں
ہمارا امتحاں لے کر بہت پچھتاؤ گے دیکھو — زباں سے ہم جو کہہ دیتے ہیں وہ کر بھی گزرتے ہیں
ملا کر خاک میں بھی مجھکو چین اُن کو نہیں آتا — وہ میری قبر بھی ٹھکرا کے اب برباد کرتے ہیں
میں جتنا الفت و مہر و وفا سے پیش آتا ہوں — وہ مجھ پر اُتنا ہی جور و جفا و ظلم کرتے ہیں
خبر کیا ہے تمھیں صاحب کسی کے دردِ پنہاں کی — خدا ہی جانتا ہے مجھ پہ جو صدمے گزرتے ہیں
ترے پیچھے ہماری جان بھی جائے تو کیا غم ہے — جو ہیں جانبازِ الفت وہ کہیں مرنے سے ڈرتے ہیں

برے کو جو بھرے وہ شخص ہے تعریف کے قابل
بنو اچھے نہیں آفق اُن کو جہاں میں سب ہی بھرتے ہیں

رزولیوشن محکمہ سرکار عالی مجریہ معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ صیغہ تعلیمات

مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء م ۱۲ آذر ۱۳۲۷ف م یکم محرم الحرام ۱۳۳۷ھ

مقدمہ

ممالک محروسہ سرکار عالی کے لیے ایک جداگانہ یونیورسٹی کا قیام

کاغذات ذیل ملاحظہ ہوئے۔

(۱) عرضداشت مورخہ ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۳۵ ہجری مع یادداشت معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ جس میں ممالک محروسہ سرکار عالی میں اعلیٰ تعلیم کی موجودہ حالت پر نظر کی گئی ہے اور اسکی ترقی کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ حیدرآباد کے لیے ایک جداگانہ یونیورسٹی قائم کیجائے جسکی

خاص نوعیت یہ ہو کہ اعلیٰ ترین درجہ تک تعلیم کا ذریعہ اُردو زبان ہو مگر انگریزی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے برقرار رہے۔

(۲) فرمان خسروی مصدرہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ ہجری دربارہ صدور منظوری تجویز مذکورہ

(۳) عرضداشت مع یادداشت متعلقہ عدالت و کوتوالی و امور عامہ دربارہ قیام سررشتہ تالیف و ترجمہ معروضہ ۴ شوال ۱۳۳۵ ہجری۔

(۴) فرمان خسروی مصدرہ ۲۵ شوال ۱۳۳۵ ہجری دربارہ منظوری تقرر ہشت مترجمین مع عملہ۔

(۵) مراسلہ محکمہ فینانس نشان (۲۵۳۲) مورخہ ۱۰ آبان ۱۳۲۶ ف۔

حضرت اقدس اعلیٰ نے بذریعہ فرمان مصدرہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ ہجری م ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء ازراہ دانش خسروانہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا حکم نافذ فرمایا ہے اس اسکیم کی کامل صراحت ہنوز تک نہیں شائع ہو سکتی جب تک کہ پہلے تفصیلات و جزئیات طے نہ کر لیے جائیں مگر طریق عمل کے عام اصول متعین ہو گئے ہیں اور اب اطلاع عام کے لیے شائع کیے جاتے ہیں فرمان مبارک یہ ہے

مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کے مضمون سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں قدیم و جدید مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو جائیں جسمانی و دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل کیا جائے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورہ صدر محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیے سنہ آئندہ سے یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔

اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" رکھا جائے۔

یہ احکام مبارک فرجام اس حقیقت پر مبنی ہیں جو بہت سے اعلیٰ تعلیمی ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ طالب علم ان چیزوں کو جو دوسری زبان کے وسیلہ سے سکھائی جاتی ہے اس آسانی سے

ذہن نشین نہیں کر سکتا جس آسانی سے وہ ان خیالات کو ذہن نشین کر سکتا ہے جو خود اسکی مادری زبان میں سکھائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ علم جس قدر زیادہ ذہن نشین ہوتا ہے اُسیقدر زیادہ دل میں وہ تحقیق و تفتیش کا ولولہ پیدا کرتا ہے اس ریاست میں جو زبانیں رائج ہیں ان میں سے اُردو زبان عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم کا ذریعہ قرار دی گئی ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ اس ریاست کی سرکاری زبان ہے بلکہ نیز اس وجہ سے کہ یہی وہ زبان ہے جو کم و بیش تمام ممالک محروسہ میں سمجھی جاتی ہے خاص کر شہری آبادی میں جہاں حضرت اقدس و اعلے کے رعایا کے وہ لوگ زیادہ تر آباد ہیں جو بالعموم ثانوی تعلیم میں داخل ہوتے ہیں تاہم انگریزی تعلیم تمام طلبہ کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے کیونکہ گورنمنٹ کو اس امر کی فکر ہے کہ اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہندوستان کے موجودہ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں سے اس زبان کی علمی عام واقفیت میں کسی طرح کم نہوں جو زندگی کے ہر شعبہ میں ناگزیر ہو گئی ہے حیدرآباد کا دارالعلوم جہاں اُردو کے ذریعہ سے مشرقی علوم کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم ہوتی ہے اور متعدد مدارس فوقانیہ و وسطانیہ جو سارے ممالک محروسۂ سرکار عالی میں پھیلے ہوئے ہیں اور دارالعلوم کے لیے طلبہ بہم پہنچاتے ہیں ایک ایسی یونیورسٹی کے نشو و نما کے لیے جیسیکہ عثمانیہ یونیورسٹی تجویز ہوئی ہے اچھی بنیاد کا کام دیسکتے ہیں یہ مدارس کلیتاً از سر نو درست و منضبط کیے جائینگے اور انکے نصاب موجودہ میں ایسی ترمیم و اضافہ کیا جائے گا جس سے مقصود مدنظر حاصل ہو سکے سرکار عالی کو توقع ہے کہ جب یہ مضامین یکسو اس سے جو ایک دیسی زبان میں سکھائے جائیں گے یہ مدارس تعلیم و تربیت کے لیے نہایت موزوں ذرائع ثابت ہوں گے حضرت اقدس و اعلے کے اس فیصلہ میں کہ زبان اردو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے لابدی طور پر یہ ابتدائی تدابیر شامل ہے کہ زبان اُردو میں علوم جدیدہ کی درسی کتابیں حسب حال کتابیں مہیا کرنے کے لیے ایک جداگانہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے اور قبل اسکے کہ عثمانیہ یونیورسٹی مکمل ہو ایک معتد بہ زمانہ اس کام میں صرف ہوگا۔

فی الحال سرکار عالی کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ مدراس یونیورسٹی سے قطع تعلق کر لیا جائے اور یونیورسٹی مذکور سے جسقدر تعلق ہے بحالت موجودہ اس میں تبدیلی پیدا کی جائے چنانچہ اُن طلبا کے فائدہ کی خاطر جو اپنی تعلیمی زبان انگریزی رکھنا پسند کرتے اور مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل کرنا چاہتے ہیں نظام کالج اور اُسکے معاون انگریزی مدارس فوقانیہ انگلش ہائی اسکول برابر جاری رہیں گے اور انھیں نہایت قابل اطمینان اور بہتر سے بہتر حالت میں قائم رکھا جائے گا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا جس میں ایک دیسی زبان یعنی اُردو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے عالم وجود میں آنا بہت سے نامور ہندوستانی اور یورپین ماہر تعلیم کے مشورے پر مبنی ہے اور یہ حقیقت میں

ایک ایسا کام ہے جسے عام طور پر لوگ تجربہ کیے جانے کے لائق سمجھتے ہیں اور جس کے نتائج دیکھنے کا ہر شخص کو جو ملکی ترقی کا خواہاں ہے یقیناً دل سے اشتیاق ہوگا اور اگر یہ نئی یونیورسٹی ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کی نسبت زیادہ سہولت و خوبی کے ساتھ علوم جدیدہ کو طلبہ کے ذہن نشین کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اسی کے ساتھ اُسکے تعلیم یافتہ زبان انگریزی پر بھی وہی قدرت و دستگاہ حاصل کر سکے جو دوسرے یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ہوتی ہے تو بے شبہ یہی اصول تعلیم ہندوستان کی دوسری بڑی بڑی زبانوں کے واسطے بھی اختیار کیا جا سکے گا۔

نظر بریں سرکار عالی کو پورا اعتماد ہے کہ تمام ممالک محروسۂ بندگان حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہٗ کی عقیدت کیش رعایا رعثمانیہ یونیورسٹی کا دلی جوش کے ساتھ خیر مقدم کرے گی اور اس ذی خبر تحریک کی بارآوری اور کامیابی کے واسطے جو سرکار عالی کے نزدیک ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک نہایت پُر امید تجربہ ہے ہر طرح سے اسکی تائید و حمایت پر آمادہ ہو جائے گی اس تحریک کے متعلق پہلا عملی کام جو اس وقت تک کیا گیا ہے ایک سررشتۂ تالیف و ترجمہ کا قیام ہے جس میں انگریزی کے آٹھ قابل و لائق اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو زبان اُردو کی انشا پردازی میں روشناس زمانہ ہو چکے ہیں ان میں سے ہر ایک کی ماہوار تدریجی اضافہ کے ساتھ تین سو روپیہ سے پانچسو روپیہ تک قرار دی گئی ہے اور وہ اُردو زبان کے مشہور فاضل مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی نگرانی میں کام کرتے ہیں ان میں سے دو صاحب خاص طبیعات اور سائنس کی کتابیں اُردو زبان میں تالیف و ترجمہ کریں گے اور علوم ریاضی فلسفہ۔ سیاسیات۔ معاشیات۔ تاریخ اور قانون باقی مترجمین کے سپرد ہوں گے سررشتۂ ترجمہ و تالیف کے مصارف دائرہ یعنے مترجمین اور عملے کی ماہانہ تنخواہیں۔ مصارف طبع کتب اور اخراجات صادرہ کے واسطے بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی نے مناسب رقم ماہانہ کی منظوری صادر فرمائی ہے اور اسکے علاوہ سو ہزار روپیہ کی یکمشت رقم دوسری ضروری اور ابتدائی مصارف کے لیے بھی عطا فرمائی ہے جس میں سے دس ہزار روپیہ اس کام میں لایا جائے گا کہ نصاب تعلیم کی اُردو کتابیں (اُن کتابوں کے علاوہ جو ماہوار یافتہ مترجمین تیار کریں گے) علحدہ علحدہ باہر کے لوگوں سے بالمعاوضہ ترجمہ کرائی جائیں یونیورسٹی کے شعبۂ فنون (فیکلٹی آف آرٹس) کا نصاب تجویز کیا جا چکا ہے جو ہندوستان کے ممتاز ماہرین تعلیم کی خدمت میں تنقید و تبصرہ کی غرض سے گشت کرایا جا رہا ہے اور شعبۂ الٰہیات (فیکلٹی آف تھیالوجی) کا نصاب تجویز کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی کام کر رہی ہے۔

حسب الحکم

معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ

محبوب ہو، خلق تمہارے اور تمہارے نفس کے درمیان مین پردہ ہے،
تمہارا نفس تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان پردہ ہے،
جب تک تم خلق کو دیکھتے رہوگے، اپنے نفس کو نہ دیکھ سکوگے، اور جب تک
اپنے نفس کو دیکھتے رہوگے، اپنے رب کو نہ دیکھ سکوگے؟

(۷)

احباب کو نصیحت اپنے دوستوں سے، ہمیشہ ارشاد ہوتا تھا کہ

پہلوں کی پیروی کرو (دین مین نئی بات) بدعت پیدا نہ کرو، اطاعت کرو، مخالفت سے ڈرو، صبر کرو گھبراو نہین۔ ثابت قدم رہو، پراگندہ اور مذبذب نہ ہو، منتظر رہو، ناامید نہ ہو، متفق ہو کر ذکر کرو متفرق نہ ہو یعنی انہماک و اجماع خیالات سب طرف سے یکسو ہو کر گناہوں سے بچو، ان میں آلودہ نہ ہو، اپنے آقا کے دروازہ سے غیر حاضر نہ ہو،

جب کوئی بلا تمہیں گھیرے تو سب سے پہلے اسکے دفعیہ مین خود حرکت کرو، (انتظام) اگر نجات نہ ہو تو حاکموں سے مدد لو، اگر نجات نہ ہو تو اپنے رب کے سامنے کمال گریہ وزاری وعاجزی سے اپنے آپ کو ڈالدو، اگر شنوائی نہ ہو تو یہان تک صبر کرو کہ سارے اسباب وحرکات منقطع ہوجائین، تاکہ ایک ایسی روح ہو کر رہ جاو کہ حق جل وعلا ہی کا فعل تم کو دکھائی دینے لگے، یہانتک کہ (موحد ہوجاؤ) اس وقت تم کو یقین ہوجائیگا کہ سوائے اللہ کے کوئی فاعل نہیں جب اس کو وہ مشاہدہ کریگا، تو اللہ اُس کے کام اور شکل کا کفیل ہوجائیگا، جب وہ کفیل ہوا ب کیا غم ہے، عیش ولطف کی زندگی ہے اور وہ زندگی ہے جس سے بادشاہوں کو بھی حصہ نہیں ملا جب تک تم خلق سے مروگے تو کہا جائیگا کہ خدا تم پر رحم فرمائے اور تم کو تمہاری خواہشوں سے موت دے جب تم کو تمہاری

خواہشون سے موت حاصل ہوگی تو کہا جائیگا کہ خدا نے تم پر رحم فرمایا تمکو تمہارے ارادہ اور آرزو سے موت دے جب تم کو تمہارے ارادے اور آرزو سے موت حاصل ہوگی تو کہا جائیگا کہ اللہ نے تم پر رحم فرمایا اور تم کو زندہ کیا تب تم ایسی پاک زندگی بسر کروگے جس کے بعد پھر موت کا اندیشہ نہیں۔ پھر ایسے مالدار ہوگے جس کے بعد افلاس کا خطرہ نہیں، ایسا عطیہ پاؤگے جس کے بعد انکار نہیں۔ ایسا علم حاصل ہوگا جس کے بعد پھر جہل نہیں۔'

(۸)

فنا کے متعلق فنا ایک دولت ہے پس خلق سے فنا ہو جاؤ' اور اپنی خواہشون سے جیسا کہ پروردگار کا حکم ہے۔

(۹)

شرک خواص کا شرک یہ ہے کہ سہو و نسیان سے غلبۂ حال و خوف کے طور پر اپنے ارادہ کو حق کے ارادہ کے ساتھ شریک کریں پس رب العزت' بیدار کرنے اور یاد دلانے کے ذریعہ سے ان کی مدد کرتا ہے' تب وہ توبہ کرتے ہین اور مغفرت چاہتے ہیں' اس لئے کہ ارادہ سے ملایک اور انبیا علیہم السلام کے سوا کوئی بچا ہوا نہیں۔ جو مخلوق مکلف ہے وہ بچی ہوئی نہیں صرف اس قدر ہے کہ اولیا اللہ کی' نفسانی خواہشوں سے حفاظت کی جاتی ہے اور ابدال۔ کی ارادہ سے کہ ان کے لئے ارادہ بھی شرک ہو جاتا ہے۔

(۱۰)

دوستوں کو نصیحت اپنے نفس سے باہر نکلو' اس سے دور ہو جاؤ' اپنی املاک سے ملکیت سے دست بردار ہو جاؤ' سب کو اپنے آقا کے سپرد کرو' اپنے قلب کے دروازہ پر اسکی جانب سے دربان بنکر بیٹھو' جس کو وہ اندر بلائے' اس

کھانے دو جس کی وہ اجازت نہ دے اس کو دوازہ سے دور کردو ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

(۱۱)

ایضاً

بچے رہو، مائل نہ ہو، ڈرتے رہو بے غم نہ ہو، تفتیش کرتے رہو غافل نہ ہو ورنہ تم کو اطمینان جس کو موت کی خاموشی کہا جا سکتا ہے گھیرے گا، کسی حال یا مقال کو اپنی جانب منسوب نہ کرو۔ ان کی اطلاع سب کو نہ دو، کیونکہ اللہ تعالے ہر روز ایک نہ ایک کام میں ہے،

یعنی تغیر و تبدل میں آدمی اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہے جب تم جس کی خبر دو گے اس سے تم کو ہٹا دیگا، اور جس حال کے ٹھہر جانے کا خیال دل میں لاؤ گے اس سے تم کو الگ کر دیگا۔

پس اب جس کو تم اس کی خبر دو گے اس کے نزدیک تم شرمندہ ہو گے۔ بلکہ اس کی نگہداشت کرو، اور اس کو دوسرے تک پہنچنے نہ دو اگر ثبات و بقا ہو تو اس کی عنایت سمجھو اور شکر و مغفرت چاہو، اگر ثبات و بیداری بقا کے سوا اور کچھ ہو تو اس میں علم معرفت تادیب کی بیداری ہو گی رب العزت کا ارشاد ہے۔ ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا ہم کوئی آیۃ منسوخ کر دیں یا ذہن سے اتار دیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی نازل بھی کر دیتے ہیں جب رب العزت ایک حالت پر تم کو قائم کر دے تو اس کے سوا اور کسی حالت کو خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ نہ چاہو۔

اس مقام پر امام شعرانی رضی اللہ عنہ نے ایک توضیحی تقریر طبقات الکبریٰ میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ادنیٰ کی طلب کا ممنوع ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ ادنیٰ سے اس حیز کا بدلنا چاہیگا۔ جو اس سے بہتر ہوگی اور اعلیٰ

کی صورت میں یہ ہے کہ اس کی طالب میں نفسانی خواہش، ملاش، راہ پائی
گئی پس شیخ کی ممانعت اس کے لئے ہے جو ہنوز نفس کی خواہشوں کے
اندیشہ سے آزاد نہیں ہوا۔ جو آزاد ہے اس کے لئے ترقی مراتب کا سوال
خالص بندگی ہے۔

شیخ کے ارشاد میں یہ اغلاق واقعہ تھا کہ ترقی مراتب کا سوال نہ چاہئے
اس کو امام شعرانی نے صاف کر دیا۔ اور درمیان میں شرط تبلادی کہ جو
شخص نفسانی خواہشوں سے ہنوز آزاد نہیں ہوا اس کو شیخ کے کلام پر توجہ
کرنی چاہئے۔ جو آزاد ہے وہ مستحق سوال ہے۔

(۱۲)

بادشاہوں کے یہاں جانا آنا

اگر تم بادشاہوں کے گھروں میں جاؤ۔ تو اس طرح جاؤ کہ جبر سے
لے جائے جاؤ۔ صورت طلب پر جانا مہلک ہے اس وقت تک تامل کرو کہ
داخل ہونے پر مجبور کئے جاؤ۔

نگاہ کی حفاظت

(۱۳)

رب العزت کا نبی کریم کو حکم ہے، کہ "ولا تمدن عینیک الی ما ستعنا بہ
انا وجا منہم زہرہ الحیاۃ الدنیا لنفتنہم فیہ ورزق ربک خیر وابقی
(اے پیغمبر) ہم نے جو مختلف قسم کے لوگوں کو دنیاوی زندگی کی رونق
کے ساز و سامان استعمال کے لئے دے رکھے ہیں۔ کہ ان کو ان کے
حال میں آزمائیں (اس طرف) تم اپنی نظر نہ دوڑانا۔ تمہارے پروردگار کی
دی ہوئی روزی ان سے بہتر ہے اور پاکیزہ تر ہے۔

نعمتوں کے حصول اور آفات کے دفع میں خود کو کچھ نہ سمجھو، نعمتیں تو
ہر گز نہ رہیں گی، خواہ تم کو گوارا ہو یا نہ ہو، اور آفات تم میں موجود ہیں،

تم چاہے خوش ہو یا رنجیدہ، رضا کرو یا نہ کرو،

پس تسلیم اختیار کرو، جو چاہے وہ کرے، اگر نعمتوں کی بارش ہو شکر کرو اس کی یاد میں مصروف و مشغول ہو، اگر کوئی مصیبت و آفات آئیں تو صبر و موافقت رضا اختیار کرو، اور اس سے مزے لیتے اور اس سے معدوم و فنا ہو جانے میں ان حالات کی بنا پر جو تم کو عطا ہوں، ان میں مشغول ہو۔ اور ان میں منتقل ہوتے رہو، یہاں تک کہ رفیق اعلیٰ تک پہنچ جاؤ، یہاں تک کہ صدیقین و شہدا میں شامل ہو جاؤ،

مصیبت سے گھبرانا نہ چاہیے، ہر مصیبت جہنم کی آگ سے کم ہے،

مولانا فداہ امی ابی نے بتایا ہے کہ جہنم کی آگ مومن سے کہے گی، کہ اے مومن گذر جا، تیرے نور نے میرے شعلہ کو سرد کر دیا ہے۔ یہ وہی نور ہے جو ہر بندہ کے ساتھ دنیا میں ہے، اور اسی سے وہ نافرمانی کرنے والے سے ممتاز ہوگا، پس مناسب ہے کہ اسی نور سے مصیبت پر قابو پائے۔

کیونکہ مصائب ہلاک کرنے کے واسطے نہیں آیا کرتی ہیں۔ بلکہ آزمائش مقصود ہے۔ جو تکلیف پہنچے اس کا اظہار کسی پر مت کرو، دکھ یا سکھ جو ہو اس پر رازداری سے خاموش شاکر و صابر رہو، کسی پر تہمت مت رکھو کہ فلاں نے مصیبت ڈالی فاعل حقیقی وہی ہے؛

(۱۴)

نعمت کی حفاظت جبکہ تم عافیت میں ہو، اور تمہارے پاس کسی قسم کی نعمت ہو تو زیادہ طلبی کے لئے اس کو حقیر جان کر اللہ تعالےٰ کی شکایت نہ کرو ممکن ہے کہ وہ تم پر ناراض ہو جو ہے اس کو بھی تم سے واپس لے لیا جائے۔ جو تم نے کہا وہ سچ ہی ہو جائے۔ اور مصیبت اضافہ کر دی جائے۔ انسان پر اکثر

بلائیں ناشکری سے آتی ہیں،

بادشاہوں کی ہم نشینی

بادشاہوں کی صحبت کے لایق وہی ہے۔ جو نفسانی خواہشوں، ناپاکیوں، مخالفتوں سے پاک ہو پھر جو دو جہان کے بادشاہ کی ہم نشینی چاہتا ہے۔ اسکو کیسا ہونا چاہئے، رب العزت جو دو جہان کا بادشاہ ہے اسکے دروازہ کا قصد اسی کو زیبا ہے، جو دونوں خواہشوں سے جدا ہو گیا ہو، حالانکہ بھائی تم رات دن گناہ کیا کرتے ہو۔

یہ اس کا ہم پر احسان ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ ہم کو بڑی بڑی آلائشوں سے پاک کر دیتا ہے ایک دن کی تپ ایک سال کے گناہ کا کفارہ ہے،

بیماری تم پر اس لئے بھیجی جاتی ہے، مصیبت اس لئے آتی ہے کہ تم اس کی ہم نشینی کے قابل ہو جاؤ، سب سے پہلے بلائیں انبیا پر آتی ہیں۔ پھر درجہ بدرجہ دائمی بلا کے ساتھ ولایت کبری والے مخصوص ہیں یہ خاص انہی کا حصہ ہے کیونکہ یہ ہر دم کے حاضر باش ہوتے ہیں۔ جنت پاک کئے جاتے ہیں۔

جب بندہ پر مصیبت آتی ہے۔ تو دل اس کا قوی ہو جاتا ہے۔ اور خواہش کمزور، اور یہ دولت ہے،

(۱۶)

کمی و بیشی

اگر تمہارے پاس کمی ہو یا زیادتی اس کا شکر ہر حال میں بجا لاؤ۔ اس کے ازلی حکم میں اعتراض نہ کرو، ورنہ وہ تم کو جدا کر دیگا اس سے غافل نہ ہو، ورنہ تم کو خراب کر دیگا، اس کے دین میں اپنی نفسانی خواہش کو دخل نہ دو ورنہ تمکو تباہ کر دیگا۔

(۱۷)

ظلم

کسی پر ظلم نہ کرو، کسی کو برا سمجھنا اور اس سے بدگمان رہنا یہ بھی ظلم ہے،

ممکن ہے تم نے غلط سمجھا ہو، اور تمہارا پروردگار ظالم سے درگذر نہیں کرتا،

جب کسی شخص سے تم کو عداوت ہو تو دیکھو کہ اس کا عمل کتاب و سنت پر ہے

یا نہیں اگر نہیں ہے تو بلاشک اس کو برا سمجھو اگر موافق ہے تو اچھا سمجھو تاکہ

کچھ بھی عنداللہ ہو اور تمہاری ذاتی غرض اس میں کچھ نہ ہو،

کسی کو اس وقت تک برا نہ سمجھو جب تک اس کو گناہ کبیرہ اور صغیرہ کرتے نہ

دیکھو اپنی آنکھ سے، یا یقینی علم صادق سے۔

(۱۸)

نفس کی خواہش

رب العزت فرماتا ہے "ولا تتبع الہوی فیضلک عن سبیل اللہ" جہاں تک

ہو اس بلا سے بہت محفوظ رہنے کی فکر رکھو۔

اپنی نفسانی خواہش پر نہ چلنا ورنہ تم کو خدا کے رستہ سے ہٹا دیگی۔

(۱۹)

عنایت ایزدی

جب رب العزت کسی کو دوست رکھتا ہے، تو اس کے مال اور اولاد میں

افزائش بند کر دیتا ہے، تاکہ وہ متعلق خواہش کو اس سے یا دوسرے کی محبت

میں آلودہ نہ ہو،

رب العزت غیور ہے، شرکت کو پسند نہیں فرماتا،

امام شعرانی نے اس مقام کی توضیح میں فرمایا ہے اگر ولی ایسے مقام تک

پہنچ جائے کہ کوئی چیز اس کو خدا سے جدا نہ کر سکے تو اولاد و اموال کا مضائقہ نہیں

(۲۰)

روحانیوں میں شمولیت

جب تک تم اپنی ذات سے، جسم وجود دشمنی نہ کرو، اپنے کل جوارح و اعضا سے

جدائی نہ اختیار کرو، [illegible] تنہائی [illegible] وجود موجب علم عقل

ان کل چیزوں سے جدا نہ ہو جاؤ جو بغیر روح کے تم میں پیدا کی گئی ہیں

تم روحانیت نہیں پا سکتے" جیسا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بتوں کی نسبت کہا تھا اور رب العزت نے اس کو دہرایا (فانہم عدو لی الا رب العالمین)
یہ تو میرے دشمن ہیں، ہاں سوا سچا دوست پروردگار عالم ہے

تم اپنے آپ کو مجموعہ اور اپنے اجزا کو ساری مخلوقات کے ساتھ ثبت سمجھو اور حدود کی پابندی کرو، امر و نواہی کی نگہداشت کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ شامل رہو،

اگر امر و نواہی کی حدود میں کچھ کمی ہو تو سمجھو کہ مبتلائے فتنہ ہو، شیطان تم سے کھیل کر رہا ہے بس شرع کی جانب رجوع ہو،

(۲۱)

خداوندی مہربانی

جب رب العزت کسی ایمان دار پر مہربان ہوتا ہے، تو اس کے قلب کے سامنے رحمت احسان بخشش کا دروازہ کھول دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے قلب سے وہ نعمتیں دیکھے جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی، کان نہیں سن سکتے، اور کسی عقل اس کے تصور سے عاجز و ماندہ ہے یعنی غیب کی چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ لطافت آمیز کلام اور خوش آیند وعدہ دلایل اور دعائیں مقبولیت اور تصدیق مواعید، وفا اور حکمت کی باتوں کا خود بخود اس کے دل پر گذر شروع ہو جاتا ہے، اور اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے اور نازل ہوتا ہے۔

تب اللہ تعالی اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اس پر انواع و اقسام کی مصیبتیں آتی ہیں، جان، مال، اولاد کی جانب تکلیف پہنچتی ہے، تمام نعمتیں اس سے واپس لے لی جاتی ہیں، بندہ حیران رہ جاتا ہے کہ کیا ہوا اگر اپنے ظاہر کی جانب دیکھتا ہے تو مسرت کا منظر پیش نظر ہوتا ہے، باطن کو دیکھتا ہے تو غم کے دروازہ کھلے پاتا ہے،

ہر انسان کے پڑھنے لائق تندرستی کی بہترین باتوں کو بتلانے والی

طبی کتب

مصنفہ کوی و نود وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید موجد امرت دھارا الہامی

صرف نام اور قیمتیں لکھی جاتی ہیں مفصل حالات کیواسطے فہرست طبی مفت منگوائیں

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
کیا ہم لڑکا یا لڑکی اپنی مرضی پر پیدا کر سکتے ہیں (دوسرا ایڈیشن)	۰۲ر	رسالہ غذا و صحت	۱۲ر	دو غل گیان (علم الاخلاط) اردو	۱۲ر
رسالہ حفظ تقدم طاعون //	۰۷ر	کھی روگ یعنی دق و سل	۰۲ر	// // ہندی	۱۲ر
رسالہ گھر کا حکیم (چوتھا ایڈیشن)	۰۲ر	نوے سال تندرست کیوں و کیسے	۰۴ر	رسالہ چیچک	۱۴ر
کیا ہیں تندرست ہیں	۰۹ر	موت کے قاصد کرم دانکی حقیقت	۰۶	دانت و انکی امراض و علاج	۸ر
رسالہ ہیضہ (دوسرا ایڈیشن)	۱۰ر	میرے ڈاکٹر بھائی نے مجھے معاملات		رسالہ ملیریا یعنی موسمی بخار	۰۵ر
سیر شملہ	۸ر	دنیاداری کی تعلیم کیسے دی	۰۲ر	ویرج کے متعلق علمی و طبی تحقیقات	۰۶ر
رسالہ حکیم و مریض (//)	۰۲ر	رسالہ سرعت	۰۵	سشرت کا ترجمہ حصہ اول	۰۸ر
رسالہ زہروں کا علاج نمبر اول	۰۳ر	رسالہ آتشک (زیر طبع ہے)		گنج مجربات	۸ر
// // نمبر دوم	عہ ر	رسالہ سوزاک	۰۸ر	رسالہ کام درتی شاستر	صہ
رسالہ برہمی (دوسرا ایڈیشن)	۰ر	رسالہ مجربات حکماء ہند نمبر اول	۱۰ر	شباب جاودانی	۱۴ر
رسالہ دلچسپ طبی مضامین نمبر اول	۰۴ر	// // نمبر دوم	ے ر	رسالہ وضع حمل	۰۶ر
رسالہ صحت کے دس اصول	۰۶ر	// // نمبر سوم	۸ر	رسالہ میٹھی نیند و فلسفہ خواب	۰۱۲ر
ہدایت الموسم	۰۱۲	// // نمبر چہارم	ے	ہپناٹزم یا ذاتی تربیت	۶
پرورش اطفال	۱۴	// // نمبر پنجم	زیر طبع	فزیالوجی یا علم افعال الاعضا	۹
رسالہ قبض	۱۰	رسالہ درد سر	۰۷ر	تحفہ سرما [illegible]	۰۲ر
		رسالہ ہسٹریا دختناق الرحم	۸ر	// [illegible]	۰۲ر

ملنے کا پتہ:- کارخانہ امرت دھارا لاہور

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹۱۸ء

کافوری جنتری ۱۹۱۸ء

کی نہایت خوبصورت اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپ رہی ہے اور جنوری ۱۹۱۸ء کے پہلے ہفتہ سے بلا قیمت و محصول ڈاک قدردانوں کے پاس بھیجی جائے گی اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ پر دس متفرق جگہ کے لکھے پڑھے شریف اشخاص کے نام اور پتہ لکھ کر بھیج دیجیے مذکورہ بالا جنتری وقت پر آپ کے پاس روانہ کر دی جائے گی۔

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

آپ جانتے ہیں انسان کی زندگی خون سے ہے اس سے خون صاف رکھنا ضرور ہے اسکی ترکیب آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی اوڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اس میں کسی چیز کا پرہیز نہیں ہے یہ سالسہ صاف کرنے میں پوٹاس ای، روڈائڈ وغیرہ کئی ایک آزمودہ ادویات ملا کر بنتا ہے اس لیے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے گرمی، آتشک گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ گیا ہو تو اس کو استعمال کیجیے خون بگڑنے کی دو وجہ ہے آتشک گٹھیا ایسے عارضے میں پارہ ملی ہوئی ادویات استعمال کرنے سے خون بگڑ جاتا ہے۔ پوری حالت کی فہرست منگا کر دیکھیے قیمت دو روپیہ (عما) محصول چھ آنہ (۶ر)

مسافر حیران ہو گئے

جب انھوں نے کولا ٹانک کی تاثیر دیکھی۔ سفر میں گھوڑے کی سواری ہوئی مگر کچھ بھی تھکن معلوم نہ ہوئی پہاڑوں پر سیلوں چڑھے اترے لیکن ذرا بھی سانس نہ چڑھا کشتی کے لیے سفر کرنے والے پہلوان۔ گانے والے۔ مسافر۔ لکچرار۔ واعظ اور پبلک مسافری میں کولا ٹانک ساتھ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اسکے استعمال سے ان کے پھیپھڑے کی قوت بے نظیر ہو جاتی ہے اور انکے کام میں آخر تک سانس قائم رہتا ہے۔ شراب اور افیون کی عادت کولا ٹانک بھی چھڑا سکتا ہے۔ قیمت ۲۴ خوراک کی شیشی عہ۔

ڈاکٹر ایس۔ کے برمن کی دوائیاں ہر جگہ کے دکاندار فروخت کرتے ہیں۔ کہیں نہ ملے تو

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ سے منگائیے

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۱۷

فروری سنہ ۱۹۱۸ء

جلد ۱ — نمبر ۲

تمدّن

معاشرتی۔ تمدّنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ایم۔ اے قاری (علیگ) خلفِ اکبر جناب قاری

محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان وانگلستان

فہرست مضامین

پبلشر محمد عباس حسین قاری

نارڈرن انڈیا پرنٹنگ پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر نواب علی

قیمت سالانہ عہ

نمونے کے پرچے کی قیمت ۵ر

مقامِ اشاعت نیا گاؤں۔ لکھنؤ

دلچسپ ناول اور افسانے

جمیلہ کی ناکامیابی:- بقول حسرت موہانی اس زمانہ کا بہترین ناول ہے چونکہ علیحدہ نہیں چھپا ہے جو صاحب اس لاجواب فسانے کو پڑھنا چاہیں اُنکو رسالہ "معلومات" کی کمل بند رہ نمبروں کی جلد خریدنا پڑے گی کہ اسمیں یہ ناول چھپا ہے قیمت .... عہ

ناولہائے تماری:- قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (ممبگ) کے اخلاقی ناول سعید سعادت شاہد رعنا جو دو بار چھپکر قدردانوں کے ہاتھ میں پہنچ چکے ہیں اب ایک مجموعہ کی صورت میں چھپوائے ہیں ۳۰۰ صفحات کی مجلد کتاب جو نہایت عمدہ ولایتی کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور جسمیں مصنف کی ایک تصویر بھی شامل ہے عہ

جنگ جرمن و بلجیم:- ۱۹۱۴ء کی مشہور جنگ کے ہولناک کارنامے ناول کے پیرایہ میں قیمت ۱۰/

جرمن محکمہ جنگ کے اسرار:- جرمن محکمہ جنگ کے اسرار کا مجموعہ نہایت دلچسپ کتاب ہے قیمت .. عا

چابک سوار معشوقہ:- گھوڑدوڑ کی بدولت ایک رئیس کی تباہی و بربادی کا عبرت انگیز واقعہ قیمت ۹/

طلسمی فانوس:- انگلستان کے مشہور جادو نگار رینالڈس کے انگریزی ناول کا ترجمہ قیمت عہ

سرگذشت:- رینالڈس کے دلچسپ و دلکش ناول میری پرائس کا ترجمہ قیمت .... ۔

جرمن جاسوس:- جس میں حال کی جنگ یورپ کے متعلق جرمنی جاسوسوں کی ان تھک کوششوں کے تمام و کمال حالات جو دول یورپ کے خلاف کی گئیں نہایت پرلطف پیرایہ میں تفصیل سے درج ہیں وہ اسرار جن کے انکشاف کے حالات پڑھکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کتاب میں حسن و عشق کے سچے جذبات بھی موجود ہیں کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے صفحات ۳۹۶ قیمت عہ

مار آستین:- بنگال کے جادو نگار بنکم چندر چٹرجی کے بشا پرکشا کا اردو ترجمہ ترجمہ قیمت ... ۸/

بنگالی دلہن:- بنکم چندر کا مشہور بہترین ناول شوہر پرستی اور عورتوں میں جذبات خود داری پیدا کرنیکا آلہ ۱۲/

زہرا:- ایک ترکی ناول کا ترجمہ مترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے قیمت ۱۰/

نیرنگی دہر:- مجیدہ بیگم کے مصائب اور وفاداری کی داستان۔ شریف النسا کی کج ادائیوں کا انجام مصنفہ منشی عبدالغفور صاحب صفحات ۱۳۲ قیمت ۸/

گودڑ کا لال:- ایک نہایت دلچسپ اخلاقی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا طبعزاد فسانہ مصنفہ والدہ صاحبہ سید محمد افضل صاحب بی اے حصہ اول و دوم صفحات ۹۴۲ قیمت عہ

وکرم اروسی:- مہاکوی کالی داس کے ایک مشہور ناٹک کا ترجمہ مع ایک مبسوط مقدمہ کے جسمیں ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے ترجمہ جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔اے قیمت

تمنائے دید:- مصنفہ محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۰/

حاجی بغلول:- مصنفہ منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ قیمت ۴۰/

احمق الذین:- " " عہ

کایا پلٹ:- " " ۴۰/

ملنے کا پتہ:- منیجر رسالہ "تمدن" نیا گاؤں لکھنؤ

سفرنامہ یورپ و بلاد روم و شام و مصر:- یعنی منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کا مشہور سفرنامہ جس میں [illegible] رعایتی قیمت [illegible] صفحات ۹۷۰

تمدن

خیال اور انداز بیان

اگر قوت خیالیہ اور قوت بیانیہ یا طرز بیان ایک ہی ہوتا تو آج دنیا میں لٹریچر کی کوئی اور ہی صورت ہوتی قوت خیالیہ قوت متفکرہ۔ قوت متصورہ اور قوت متمیزہ تو بسا اوقات ایک ہی رنگ میں منتقل ہو جاتی ہیں لیکن قوت بیانیہ ان قوتوں سے الگ رہتی ہے اور اسکے تصرفات ایک جداگانہ رنگ میں وجود پذیر ہوتے ہیں کیونکہ اس کا کام بعد کو شروع ہوتا ہے

ہم ایک خیال ایک فکر اور ایک تصور کر لیتے ہیں تب جا کر قوت بیانیہ کی نوبت آتی ہے قوت خیالیہ۔ قوت واہمہ وغیرہ میں خیالات کی نشو و نما اور حدات کی طاقت ہے لیکن خیالات کا اظہار قوت بیانیہ پر موقوف ہے۔ درزی بجائے خود اگرچہ ایک فن رکھتا ہے۔ لیکن جب تک کپڑا۔ سوئی۔ دھاگا مشین وغیرہ نہو تب تک وہ نہ تو کتر بیونت کر سکتا ہے اور نہ سی سکتا ہے۔ جب تک ہمارے دل ودماغ میں کوئی خیال متموج نہ ہو تب تک اظہار اور بیان کی نوبت نہیں آتی۔ ہر شخص غور کر کے دیکھ سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسکے دل ودماغ میں خیال نشو و نما پاتا ہے زبان پھر وہ اسکی نسبت کچھ بیان کرتا ہے۔ زید کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ [illegible] کیوں ہے اور بڑا [illegible] کیوں پہلے ایک خیال ہی تھا جب اسے معرض اظہار میں

لایا جائے گا تو یہ ایک بیان ہوگا۔

لٹریچر کیا ہے ایک بیان۔ انشا پردازی کیا ہے ایک بیان، لٹریچر اُن مختلف خیالات کا مجموعہ ہے جو انسان کے دل و دماغ میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں اُن افکار اور اُن تصورات کی ایک بیانیہ کیفیت ہے جو ہر وقت نشو و نما پاتے رہتے ہیں، لٹریچر اُن مناظر قدرت اور مظاہر عالم کی وہ کیفیت ہے جسے انسان آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سُن کر اپنے دماغ میں جگہ دیتا اور پھر اپنے رنگ میں اُن کا اظہار کرتا ہے۔

خیالات اوہام تصورات اور افکار و مناظر قدرت ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے اُن میں فرق ہوتا ہے کوئی کچھ درجہ رکھتا ہے اور کوئی کچھ کسی کی کچھ تاثیر ہوتی ہے اور کسی کی کچھ بعض خیالات کمزور ہوتے ہیں بعض زوردار اور بعض ناقص بعض کامل بعض مناظر قدرت خوش آیند ہوتے ہیں اور بعض تکلیف دہ بعض ایک حُسن رکھتے ہیں اور بعض مبرا از حُسن اسی طرح قوت بیانیہ یا لٹریچر بھی مختلف رنگ رکھتا ہے۔

ایک قوت بیانیہ ہے اور ایک انداز بیان یا ادائے بیان، قوت بیانیہ ہر شخص کو دی گئی ہے جیسے قوت بیانیہ کے مقدار اور پیمانہ میں فرق ہے ایسے ہی ادائے بیان یا انداز بیان میں بھی فرق ہے ہر شخص کا طرز بیان یا انداز بیان جداگانہ ہوتا ہے ایک کا انداز بیان دوسرے سے نہیں ملتا ہے جس طرح اشکال نقوش خط و خال جدا جدا ہوتے ہیں اسی طرح انداز بیان بھی جداگانہ ہوتا ہے جس طرح شان تحریر جداگانہ رنگ رکھتی ہے اور باوجود ایک ہی اُستاد ہونے کے بھی شاگردوں کے خطوط میں گونہ فرق ہوتا ہے اسی طرح انداز بیان یا ادائے بیان میں بھی فرق ہوتا ہے یہ امتیاز کبھی بالمقابل دوسروں کے ہوتا ہے اور کبھی ایک ہی شخص دو قسم کے انداز بیان رکھتا ہے اگرچہ اُن دونوں میں بوجہ ایک ہی شخصیت کے گونہ یکسانیت بھی ہوتی ہے مگر پھر بھی کبھی کبھی ایک ہی شخص کے دونوں انداز بیان میں فرق ہوتا ہے۔ ایک شاعر عالم شباب میں جو کلام کہتا ہے بعض دفعہ اُسکا رنگ کلام پیری سے نہیں ملتا جو کلام عالم خوشی کہا جاتا ہے وہ عالم یاس کے مقابلہ میں کچھ اور ہی رنگ رکھتا ہے۔

جو شاعر دو استادوں سے اصلاح لیتا ہے بعض دفعہ اس کا کلام بھی دو رنگ رکھتا ہے۔ انداز بیان پر مضامین کا بھی اکثر اثر ہوتا ہے اور وقت کا بھی۔ موسیقی میں راگوں کی تقسیم اوقات پر اسی ضرورت سے کی گئی ہے بھیروں۔ دیس اور جوگ میں ضرور فرق ہوگا خود مضمون ہی شہادت دیتا ہے کہ وہ کون سے رنگ رکھتا ہے اور اس کا وقت کون سا ہے شاعری میں جس قدر مضامین ترکیب پاتے ہیں وہ بھی انداز بیان پر اثر ڈالتے ہیں اور ان میں یہ انداز بیان شاعر اختیار کرتا ہے۔ غزل کا رنگ مرثیہ اور قصیدہ سے جدا کا نہ ہوتا ہے واقعات کی وجہ سے بھی بہت کچھ فرق ہو جاتا ہے مثلاً مراثی میں ایک خوش مزاج شاعر کا رنگ بھی کچھ اور ہو جائے گا باوجود اس کے کہ مضامین اوقات اور مختلف تاثرات کی وجہ سے انداز بیان میں فرق آ جاتا ہے اور بیان کرنے والا ضرور کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتا ہے پھر بھی انداز بیان اپنی جھلک دکھانے سے باز نہیں رہتا جس طرح نشان تقریر اشارہ دے جاتی ہے اسی طرح ہر شخص کا انداز بیان بھی کچھ نہ کچھ اشارہ کر جاتا ہے نشان خط بصر میں بعض وقت جس طرح نقاط اور دوائر سے پہچانے جاتے ہیں اسی طرح انداز بیان کی شان بھی شناخت کی جا سکتی ہے۔

بعض لوگ گانے والوں کی خاص لے سے پہچان جاتے ہیں کہ فلاں شخص گا رہا ہے یا یہ فلاں کا مرثیہ انداز بیان کسبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر شخص کی طبیعت اور شعور کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے۔ یہ کچھ پڑھے لکھوں پر ہی موقوف نہیں ہے ان پڑھ لوگ بھی کوئی نہ کوئی انداز بیان رکھتے ہیں۔ جب ان پڑھ لوگوں سے کوئی کہانی سن کر دیکھو تو بعض پتہ لگ جائے گا کہ ان کے انداز بیان میں کیا کچھ فرق ہے بعض لڑکے اس خوبی سے بیان کریں گے کہ سننے والے ان کی قوت بیانیہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور بعض ان کے مقابلتاً ناقص ثابت ہوں گے۔ بیشک بعض لوگ مشق سے اپنے انداز بیان میں خوبی پیدا کر لیتے ہیں اور تقریر سیکھ کر بھی آ جاتی ہے لیکن وہی شخص تعریف کے قابل ثابت ہوتا ہے جو ایک طبیعی یا دہبی ملکہ بھی رکھتا ہو بیشک ایک شخص قواعد فصاحت و بلاغت کی مدد سے فصیح و بلیغ بن سکتا ہے لیکن جو شخص اپنی طبیعت میں ہی قدرتاً ایسا

ملکہ رکھتا ہے وہ کچھ اور ہی رنگ رکھے گا۔

قوانین فصاحت و بلاغت کی تدوین بعد کو ہی ہوئی ہے۔ شروع میں بعض طبائع ہی نے کلام سے اس کا پتہ بھی لگایا گیا ہے چند فصیح و بلیغ طبائع ہی کے تاثرات کے مجموعہ کا نام ہی ضابطہ فصاحت و بلاغت ہے بعض نقاد طبائع ہی نے شروع میں فصاحت و بلاغت کا پتہ لگایا ہے اور اُن ہی کی وجہ سے یہ داغ بیل پڑی ہے فصاحت و بلاغت بھی انسان کا ایک طبعی جوہر اور فطری جذبہ ہے بیشک ایسا فطری جذبہ اور طبعی جوہر اکتساب اور مشق سے بھی ترقی پذیر ہوتا ہے لیکن جو لوگ طبعاً ایسا ملکہ رکھتے ہیں وہ اکتساب اور مشق کی وجہ سے اور بھی کمال حاصل کر لیتے ہیں یا یہ کہ اُن کا کمال ایک خصوصیت رکھتا ہے اور اُن کے طبائع میں ایک ایسا ملکہ ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے جو اجتہادی رنگ میں بہت کچھ روشن اور کامل نمایاں ہوتا ہے اور اُس کی وجہ سے اُن غوامض اور اُن نکات پر روشنی پڑتی ہے جو ادبی اور علمی رنگ میں بہ مختلف وجوہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔

انداز بیان اگرچہ ہر شخص سے مختص ہوتا ہے اور ہر شخص کا انداز بیان بجائے خود ایک جداگانہ رنگ رکھتا ہے مگر جیسے کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے ہر شخص کا انداز بیان بہ مناسبت مواقعہ مختلفہ جداگانہ پہچان رکھتا ہے اور خوبی انداز بیان کی بھی یہی ہے کہ بہ مناسبت مواقعہ مختص ہو۔

جس طرح انداز بیان مختلف صورتیں اور مختلف کیفیات رکھتا ہے اُسی طرح خیالات کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور انھیں صور توں کے مطابق اُن کی تعبیر اور تفسیر بھی کی جاتی ہے۔ خیالات کی تین قسمیں ہیں:۔

(ا) اعلےٰ۔

(ب) اوسط۔

(ج) ادنےٰ۔

اسی طرح انداز بیان یا ادائے بیان کی بھی تین اقسام ہیں:۔

(ا) اعلےٰ

(۲) اوسط۔

(۳) ادنےٰ۔

اور ان تینوں کے ملانے سے چار صورتیں بنتی ہیں جن کا نام ادبی عناصر اربعہ ہے ان چاروں صورتوں سے دائرہ ادب کا باہر نہیں جاتا یعنے ادبیات ان ہی چار صورتوں میں منتشر ہیں:

(الف) اعلےٰ خیال اعلےٰ انداز بیان۔

(ب) اعلےٰ خیال ادنیٰ انداز بیان۔

(ج) ادنیٰ خیال اعلےٰ انداز بیان۔

(د) ادنیٰ خیال ادنےٰ انداز بیان۔

ادبیات کی دو کڑیاں ہیں ان ہی دو کڑیوں سے ادب کی زنجیر ترکیب پاتی اور مکمل ہوتی ہے یا یہ کہ ان ہی دونوں کڑیوں کا نام ادب یا لٹریچر ہے۔ پہلی کڑی خیال ہے اور دوسری کڑی بیان یا انداز بیان ہے جو لوگ اعلےٰ خیال اور اعلےٰ انداز بیان رکھتے ہیں وہ گویا ادبیات کے بادشاہ یا سلطان ادبیات ہیں ان ہی لوگوں کو سلطان الخیال یا سلطان القلم کہا جاتا ہے اور انہی لوگوں کے حق میں یہ کہا گیا ہے کلام الامام امام الکلام۔ جس قدر علوم شریفہ اور فنون لطیفہ اس وقت دنیا میں موجود ہیں یہ سب اعلےٰ خیالات اور اعلےٰ انداز بیان ہی کی برکت اور وجہ سے ہیں جب ایک شخص اعلیٰ خیال اور اس کے ساتھ اعلےٰ انداز بیان بھی رکھتا ہے تو وہ ایسے اصول اور ایسے قوانین کی داغ بیل ڈالتا ہے جو علمی اور ادبی رنگ میں ایک قیمت اور خصوصیت رکھتے ہیں۔

انداز بیان سے صرف کلامی یا تحریری اور تقریری انداز بیان ہی مراد نہیں بلکہ اس سے ایک عمدہ اور معقول عمل بھی مراد ہے جیسے ایک شاعر کے دل و دماغ میں ایک خیال نشو و نما پاتا اور شاعر اُسے ترتیب دیتا ہے ایسے ہی ایک صناع اور کاریگر کے دل و دماغ میں بھی ایک خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک عملی رنگ میں اسے ترتیب دیتا ہے ایک صناع کا ایک صنعت تیار کرنا اس کا ایک انداز بیان ہے بیان کا مفہوم اظہار ہے عام اس سے

کہ وہ لفظاً ہو یا کسی دیگر صورت اور کسی مصورانہ رنگ میں دیکھو ایک مصور خیال ہی کے تحت کس کس قسم کی تصویریں بناتا ہے اور اُن میں کیسا کمال اور لطافت ظاہر کرتا ہے کسی دوسری شے کی تصویر کھینچنا بھی ایک خیال کا انداز بیان ہی ہوتا ہے تصویر میں مصور جو بال بال اور شان وآن کا انداز دکھاتا ہے وہ بھی اُس کا ایک انداز بیان ہی ہے۔

بعض لوگوں کے دل ودماغ میں خیالات تو اعلےٰ مرکوز اور متموج ہوتے ہیں لیکن وہ چونکہ انداز بیان کامل اور خوب نہیں رکھتے اس واسطے وہ ایسے خیالات کی ترتیب اظہار اور بیان میں کوئی خاص لطافت اور خاص خوبی نہیں پیدا کر سکتے ہر شخص کے دل ودماغ میں بعض دفعہ اچھے اور لطیف خیالات بھی نشوونما پاتے ہیں جو اُن میں سے اعلےٰ انداز بیان رکھتے ہیں اُن کے خیالات عملی رنگ میں شہرت پا جاتے ہیں اور جو ایسا لطیف ملکہ نہیں رکھتے اُنھیں شہرت نصیب نہیں ہوتی۔

جو شخص خود کو کھینچ کھانچ کر شاعر بناتا ہے اُس کے دماغ میں بھی بعض دفعہ اعلیٰ خیالات پیدا ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ لطیف اور اعلےٰ انداز بیان نہیں رکھتا اس واسطے وہ بمقابلہ ایک طبعی اور پیدائشی شاعر کے اُنھیں ایک خوبی کے ساتھ ترتیب نہیں دے سکتا جو لوگ اعلےٰ انداز بیان رکھتے ہیں وہ اس خوبی اور اس کمال کی وجہ سے ادنیٰ خیالات کو بھی ایک اچھے اور دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کر سکتے ہیں آپ نے دیکھا اور سُنا ہوگا کہ بعض نغز گو خوش بیان لوگ ایک معمولی سی بات بھی اس خوبی سے بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں کہ باوجود اس جاننے کے بھی کہ یہ ایک معمولی سی بات ہے سامعین پھر بھی لطافت بیان کی وجہ سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔

انداز بیان ایک رنگ سازی ہے دیکھو بعض رنگریز ایک پُرانے کپڑے کو بھی اس خوبی سے رنگتے ہیں کہ وہ ہی تھوڑی دیر کے واسطے خوش نما اور دلاویز معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ خیال بھی ادنےٰ ہوتا ہے اور انداز بیان بھی ادنیٰ ہوتا ہے یہ ایک عام صورت ہے اس صورت میں خیالات اور انداز بیان ان کی کوئی قیمت نہیں پڑتی اگرچہ دنیا میں اُن کی کھپت بھی ہے مگر اُنھیں کوئی خصوصیت نہیں ہوتی اور نہ اُن کا شمار

نوادرات میں ہوتا ہے کام تو ایسے خیالات بھی دے ہی جاتے ہیں اور اکثر اوقات وہ
بے مصرف بھی نہیں ثابت ہوتے اور لوگ اُنھیں کسی نہ کسی حد تک کام میں لاتے ہیں
لیکن اُن کی قیمت اور وقعت کم ہوتی ہے باوجود اس کے ان کی بھی ضرورت ہوتی ہے
اور ان میں سے بھی بعض خیالات رفتہ رفتہ اعلےٰ خیالات میں منتقل ہوتے جاتے ہیں اور
اُن کی ہستی بھی کبھی نہ کبھی کوئی درجہ حاصل کر لیتی ہے خیالات تنزل پذیر بھی ہوتے
ہیں اور علو بھی اختیار کرتے ہیں جیسے عادات میں تنزل اور ترقی ہوتی رہتی ہے ایسے
ہی خیالات میں بھی ترقی اور تنزل ہوتا رہتا ہے اور یہی طرح انداز بیان بھی تنزل
اور ترقی پذیر ہوتا ہے - حالات - کیفیات اور اوقات سے بھی خیالات اور انداز بیان
میں کبھی کبھی فرق پڑ جاتا ہے آب و ہوا بھی ایک حد تک موثر ہوتی ہے اگر ایک غریب
مفلوک الحال لڑکے کو اچھے کپڑے پہنا کر گھوڑے پر سوار کرا دیا جائے تو اُسکی ظاہری حالت
میں ہی فرق نہیں آئے گا بلکہ اسکے خیالات پر بھی کچھ نہ کچھ اثر پڑے گا صحبت سے بھی
خیالات اور انداز بیان پر اثر پڑتا ہے دیکھتے نہیں ہو بعض حبشی لڑکے اچھے گھروں میں
رہ کر اور بعض عام لڑکیاں خاندانوں میں پرورش پا کر کیسی شائستہ اور سمجھدار ہو جاتی ہیں
اور خلاف اس کے بعض دفعہ اچھے گھروں کے بعض کم بخت لڑکے بُری صحبتوں میں رہکر
کس کمزور قسم کے ہو جاتے ہیں اگرچہ اُن میں طبعی شرف کچھ نہ کچھ ہوتا ہے لیکن پھر بھی صحبت کا
اثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اگرچہ اسی طرح رزائل کی عادتیں میں بھی باوجود اصلاح پذیر
ہونے کے بھی وہ کسی نہ کسی حد تک رہتا ہے مگر پھر بھی صحبت اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی
ہاں چند عرصہ کے بعد رفتہ رفتہ اور دوستیقاً دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے - سب انسان
ایک صحیح فطرت رکھتے ہیں اُن کے استعمالی طریقوں کی وجہ سے لوگوں کے خیالات اور
انداز میں فرق آ جاتا ہے بیشک عادت اور صفات طبع ایک فطری کیفیت ہوتی ہے
مگر دیکھی تربیت اُن کی اصلاح میں کچھ نہ کچھ کام دے ہی جاتی ہے ایسا فرق صرف
مقادیر ملکات کے مختلف ہونے کی وجہ ہی سے ہوتا ہے - قدرت کی جانب سے یہ
کائنات اور اس کائنات کے مختلف عناصر چند درجہ بندیاں رکھتے ہیں اور ہر درجہ

ہماسے خود ایک ضرورت اور ایک کیفیت رکھتا ہے اور دنیا کے کاروبار میں اسکی بھی ضرورت ہے تاک کان آنکھ اور سر کے مقابلہ میں پاؤں کم درجہ رکھتے ہیں مگر کیا پاؤں کی ضرورت نہیں ہے اور کیا ہماسے خود ان کی قیمت کم لگائی جا سکتی ہے - ہر کسے را بہر کارے ساختند

سلطان احمد

جذبات ٹیگور

جب میں رات کو اپنے محبوب سے ملاقات کرنے جاتی ہوں پرند و طیور عالم سکوت میں رہتے ہیں۔ ہوا کی حرکت بند ہوتی ہے اور سڑک کے دونوں طرف کے مکانات چپ چاپ کھڑے ہوتے ہیں۔

میری ہی چھاگلوں سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے جو بتدریج بڑھتی جاتی ہے اور میں خود شرمندہ ہوجاتی ہوں۔

جب میں اپنے بالاخانہ پر بیٹھ کر اُسکے پیروں کی آہٹ سُننے کے لیے بے تاب ہوتی ہوں درختوں پر پتے حرکت بند کر دیتے ہیں اور دریا اپنی روانی بھول جاتا ہے جس طرح ایک سوتے ہوئے سنتری کی تلوار قطع و برید سے بے خبر ہوتی ہے۔

جب میرا محبوب مجھے اپنے آغوش محبت میں بٹھاتا ہے میرے بدن میں رعشہ آجاتا ہے - میری پلکیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ رات زیادہ تاریک ہوجاتی ہے - ہوا کے جھونکے لیمپ کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیتے ہیں بادل ستاروں پر پردے تان دیتے ہیں - میرے سینہ کا ہیرا چمکتا ہے اور ضیافگن ہوتا ہے - اور میں خود حیران ہوتی ہوں کہ اُسے کس طرح پوشیدہ رکھوں۔

عبدالشکور

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر کیجیے - منیجر

ذات

کہتے ہیں کہ منو رشی نے ہندوستان کی درخشاں پیشانی پر ذات کا بدنما ٹیکہ لگایا۔ سوسائٹی کے مختلف مراتب و مدارج قائم کرکے آزاد انسان کو مقید کر دیا۔ قانون فطرت کے خلاف جمہور نوع انسانی کو اس شرف سے محروم کر دیا جس کا ہر شخص بہ حیثیت بنی آدم حق دار ہے

ہم اس مسئلہ کے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں:-

(۱) ذات کی حقیقت (۲) ذاتوں کی تقسیم (۳) اس تقسیم سے منو کا اصلی منشا کیا تھا۔

(۴) ذات کا پیشہ سے تعلق اور اس کے فوائد (۵) ذات کا وجود کن نقصانات کا موجب ہوا۔

(۶) ہر شخص فطری طور پر کن پیشوں کے بجا لانے پر مجبور ہے۔

ذات کی حقیقت | ابتداءً انسان حیوانات مطلق کی طرح وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی معدودے چند ضروریات نے دائرۂ احتیاج کو محدود رکھا۔ جسمانی قویٰ کی یکساں ساخت، حواس خمسہ کی مشابہت۔ المختصر قوت ظاہری و باطنی کی ہم رنگی نے میزان اقتدار کو گھٹنے بڑھنے نہ دیا۔ اور موجودات عالم پر جو شرف اس کو قدرتاً حاصل تھا اس میں مساوات قائم رہی۔ دماغی قوتوں نے اپنا فعل شروع کیا۔ دائرۂ احساسات وسیع ہوتا گیا۔ انسان نے عالم نباتات و جمادات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ دنیا کی اور ذی روح ہستیاں جن کی باگ فطرت نے انسان کے ہاتھ میں دی تھی اس کی مطیع ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ انسان کو اپنی قدر و منزلت کا احساس ہونے لگا یہاں تک کہ اس کی شان امتیاز غیر انسانی ہستیوں سے گذر کر خود نوع انسانی میں بھی اپنا فعل کرنے لگی۔ ہر خاندان کے بزرگ نے ایک شاہانہ حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے احکامات واجب التعمیل ہونے لگے۔ خاندان کا ہر فرد اس کے زیر فرمان ہو گیا۔ در اصل ذات کی بنا یہیں سے شروع ہوئی ہے جس طرح ایک خاندانی بزرگ سے اہل خاندان میں فرق مراتب پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ذات اہل قوم میں فرق مدارج قائم کر دیتی ہے۔

ذاتوں کی تقسیم | منو نے نوع انسانی کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا:-

(۱) برہمن (۲) چھتری (۳) ویش (۴) شُدر

برہمن:- اہل علم طبقہ کو برہمن قرار دیا، ان کو مذہبی پیشوا بنایا۔ وزارت کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ وہ راجہ مہاراجوں کے اتالیق اور ارباب حل وعقد سمجھے جانے لگے۔ اور یہ طبقہ واجب التعظیم والتکریم شمار ہونے لگا۔

چھتری:- تحفظ ملک کے لیے ایک خاص گروہ کی ضرورت تھی۔ اور یہ ذمہ داری اس طبقہ کے ذمہ عائد ہوئی ان لوگوں کو سپاہیانہ زندگی گذارنے کی ترغیب دی گئی۔ اور راجہ سے سپاہی تک اس ذات میں شمار ہونے لگے۔

ویش:- تجارت کے لیے یہ گروہ منتخب ہوا صنعت وحرفت کے کُل شعبے بھی اسی ذات کے افراد میں منتقل کیے گئے۔

شُدر:- یہ غریب گروہ اُن ہندوستان کے اصلی باشندوں پر مشتمل تھا جن کو اہل ہنود کی فاتح اقوام نے مغلوب کر کے اسیر بنا لیا تھا۔ ذلیل ترین خدمات ان کے سپرد کی گئیں۔ خاکروب، چمار وغیرہ آج اسی ذات کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ رفتہ رفتہ ان اصل ذاتوں سے بیشمار ذوعی ذاتیں بن گئیں۔

اس تقسیم سے منو کا اصلی منشا کیا تھا

اس سے منو کا منشا یہ تھا کہ نظام عالم میں ابتری پیدا نہ ہو اور ہر ذات کی نسل میں علیحدہ نشو ونما باقی رہے تاکہ ان کی نسلوں میں فقدان واقع نہ ہو اور ضروریات زندگی ہمیشہ بسانی پوری ہوتی رہیں۔ لوگ اہل علم اصحاب کی زرّیں نصیحتوں پر عمل پیرا ہوں اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ ہر نفس کو ان کی وقعت کرنے پر مجبور کیا جائے گر درحقیقت اس تحریک سے منو کو مختلف پیشوں کی بقا مقصود تھی۔ مگر یہ مقصد اس طرح بھی پورا ہو سکتا تھا کہ پیشوں کو مختلف افراد پر منقسم کر دیا جاتا اور ذاتوں کا تعین نہ کیا جاتا ہم اس لطیف نکتہ پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔

ذات کا پیشہ سے تعلق اور اس کے فوائد

یہ امر مسلّم الثبوت ہے کہ انسان کی جبلت میں خاندانی خصوصیتیں جلوہ نما ہوتی ہیں۔ آہن گر کے بچے کی فطرت میں دستکاری، زرگر کے طفل خوردسال کی مٹھی میں سونے کی جھلک اور مٹھائی کی لاگ ہوتی ہے معمار کے

لڑکے کے دماغ میں محلوں کی تصویریں منعکس ہوتی ہیں اور درودگر کے بچے کا میلان چوبی صنعتوں کی طرف ہوتا ہے۔ صنعت و حرفت ہی پر کیا موقوف ہے یہ کلیہ علوم پر بھی حاوی ہے۔ خوش نویس کا لڑکا خوشخط اور حکیم کا بچہ اگر کامل حکیم نہیں تو نیم حکیم ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ دوسرے پیشوں کے انسان اپنا آبائی پیشہ جلد سیکھ جاتا ہے اور فطری رجحان کی مدد سے اس میں جلد ید طولیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ ذاتوں کا تعین پیشوں کے تحفظ کا ذمہ دار ہے۔ علم و ہنر کی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نہایت ضروری ہے کہ لڑکا جادۂ معاش میں اپنے باپ کے نقش قدم کو اپنا رہبر بنائے۔ ہندوستان کی مفلوک الحالی کا یہی سبب ہے کہ لوگوں نے اپنے آبائی پیشے ترک کر دیے اور سطحی لیاقت علمی حاصل کر کے ملازمت کی جستجو میں سرگرم ہیں اگر اس علم سے صنعت و حرفت میں کام لیتے تو آج جاپان سے زیادہ ترقی کی منازل طے کر چکے ہوتے۔ جرمن کے مد مقابل نظر آتے۔ تجارت میں امریکہ کے حریف ہوتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل علم یا اہل حرفت کے دماغ میں کوئی خاص بات پیدا ہوتی ہے دنیوی مشاغل اسکو اتنی مہلت نہیں دیتے کہ وہ اپنی تحقیق یا ایجاد کو مکمل طور پر دنیا کے سامنے پیش کر سکے اور وہ اس کی زندگی میں ناتمام رہ جاتی ہے۔ ان جواہر ریزوں کے وارث اس شخص کے عیال و اطفال ہی ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنا آبائی علم یا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں تو تھوڑی سی توجہ کے بعد اس ناتمام شے کو مکمل کر کے ملکی علوم و فنون میں قابل قدر اضافہ کرتے ہیں۔ زمانۂ سلف میں صنعت اور دوسرے شعبوں میں اہل ہند نے جو نمایاں ترقی کی تھی اس کا راز یہی تھا کہ ہر شخص اپنا آبائی پیشہ اختیار کرتا تھا۔ ذات کی تخصیص مجبوراً اسکو اپنی ہی سوسائٹی میں جگہ دیتی تھی اور اسکے تخیلات کا مرکز ایک ہی رہتا تھا جس پیشے کی بقا اور اس کی آئندہ ترقی کے لیے ملک اس سے اور اس کی آنے والی نسل سے خدمت لینا چاہتا تھا وہ اس میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔

ذات کا وجود کن نقصانات کا موجب ہوا

ذات کے رواج نے مساوات کو زیر و زبر کر دیا جس کا فطری طور پر ہر ایک انسان مطالبہ کر سکتا ہے۔ منو کی اصولی غلطی یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں حد اعتدال سے گزر گیا۔ اس نے برہمنوں کی قدر و منزلت اس درجہ

قرار دی کہ خالق ومخلوق اور عابد ومعبود میں حد امتیاز قائم نہ رہی اور اس سے مذہب کو ناقابل بیان نقصان پہنچا۔ پھر شُدر یعنی آریہ ورت کے اصل باشندوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جس کو انسانی حمیت اور حق پسندی ہرگز جائز قرار نہیں دیتی۔ دولت علم خاص طبقے کی ملک ہو گئی اور برہمن اس کے وارث بنائے گئے لوگوں کو جبراً جہالت کی ظلمت میں رکھا گیا ان کو ذات کی زنجیر میں ایسا پابستہ کر دیا گیا کہ کسی صورت سے اُس قعر مذلت سے نہ نکل سکتے تھے جس میں ان کو قصداً ڈالا گیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ذات کا مسئلہ "تناسخ" کے مسئلے کے بالکل برعکس ہے اگرچہ یہ دونوں مسائل اہل ہنود ہی کے وضع کیے ہوے ہیں۔

انسان فطری طور پر کن پیشوں کے بجالانے پر مجبور ہے

وہ پیشے جن کی فطرت معاون ہے معیوب نہیں۔ اور جو لوگ ان کو اپنا ذریعہ معاش بنا کر ضروریات انسانی کو رفع کرتے ہیں قابل تنفر نہیں بلکہ لائق ستائش ہیں۔ انسان فطری طور پر بعض ان پیشوں کی بجا آوری پر مجبور ہے جن کو وہ نہایت ذلیل تصور کرتا ہے۔ اس کو خاک روب کا فرض کم از کم یومیہ انجام دینا پڑتا ہے۔ علی ہذا حجام کے پیشے سے بھی اس کو آشنا ہونا پڑتا ہے پھر جب وہ اپنے گھر جاتا ہے تو عورتوں کو مختلف پیشوں میں منہمک دیکھتا ہے۔ وہ کبھی باورچی کا کام کرتی ہیں کبھی درزی کا کبھی خاک روب کا کبھی دایہ کا کبھی رنگریز کا مگر بایں ہمہ ہم انکو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ جو عورتیں زیادہ پیشے جانتی ہیں ان کو باسلیقہ یا بہ الفاظ دیگر سگھڑ کہا جاتا ہے۔ ان میں اور عام پیشہ وروں میں صرف فرق اتنا ہے کہ یہ ان پیشوں کو اپنے اور اپنے لواحقین کی ذات تک محدود رکھتی ہیں اور وہ کسب معاش کے لیے ان کو عمومیت سے کرتے اور اسپر مجبور ہوتے ہیں۔

محمود اسرائیلی

ضروری گذارش:۔ تمدن بلا طلب جن حضرت کی خدمت میں نمونتاً یا کسی دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادۂ خریداری سے مطلع فرمائیں اور نہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں ان کا نام درج رجسٹر کر کے تیسرے ماہ کا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا ان کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔

مینیجر

تم سے خطاب

"تم سے" اس لیے کہ عرصہ کے بعد "تمدن" کے توسل سے تمہارے جواہر افکار بے چین
دماغ کے لیے باصرہ نواز ہوئے ہیں۔ الفاظ کے معنی۔ اور معنی میں بھرا ہوا جادو۔ مردمک دیدہ
سے گذر کر میرے دماغ پر منعکس ہوتے ہیں: دماغ پر بھی غلط؛ دل پر؛ بلکہ دل و دماغ کے
اُس حصہ پر جہاں دردِ دیرینہ نے نظرِ بد سے پناہ مانگ کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیا ہے!
اس حصہ کو میں الفاظ میں بتانے سے قاصر ہوں۔ مگر اس درد کی چسک چارہ گر کے تغافل
کے بدولت برابر محسوس کرتا رہتا ہوں! چارہ گر کون؟ تم نہیں: تم تو اُس درد کی دوا ہو؛
یہ اور صورتیں جو تمہاری عدم موجودگی میں چارہ سازی کا دعوے کرتی ہیں! تم میں اور ان
میں وہی فرق ہے جو سلطنت مغلیہ کے عالم زوال میں "بادشاہ" اور "بادشاہ گر" میں رہ چکا ہے!
تم تڑپنے سے فطرتاً لذت یاب ہو اور وہ تڑپ سکتے ہیں۔ تم دل سے بولتے ہو وہ زبان سے
بولتے ہیں۔ تم دل سے دیکھتے ہو وہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں تم قلب ہو وہ محض قالب!

+ + + + +

تمہارا قصیدہ لکھنا میرا مقصود نہیں۔ اور تمہارے جانشینوں کی ہجو کرنا بھی۔ حاشا
وکلا۔ میرے پیش نظر نہیں! میں محض اُس درد میں اضافہ کا طالب ہوں جس کو تم نے
دانستہ یا نادانستہ۔ پیدا کیا تھا! اُس اخگر کی شعلہ فشانی کا خواہاں ہوں جو سرد مہری یاران
وطن سے بجھنے کے قریب ہے! مبارک ہیں وہ نفوس جو ابتک اس میٹھے میٹھے درد کو
کلیجہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ مگر۔ میں اس کے خلاف ہوں! "رگوں میں دوڑنے
پھرنے کے ہم نہیں قائل ؛ جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے" لیکن آنکھ سے
نکالنے والی وہ زبان و دہن نہیں، جو اگر دو مگر کے ہیر پھیر پر ہمت وغیرہ کو قربان کردے۔
نہیں یہ جادو بیانی اگر ممکن ہے تو اسی وقت جبکہ کہنے والے نے فی الحقیقت درد پیدا کر لیا ہو
اور اسکے الفاظ "دہانِ زخم" سے نکلتے ہوں! میں تم کو بھی دیکھتا رہا ہوں اور سب ان کو بھی

دیکھتا ہوں۔ مجھے ان میں کسی چیز کی کمی نظر آتی ہے کسی ایسی چیز کی جو اس تمام زندگی کی روح رواں سمجھی جا سکے وہ کیا چیز ہے؟ میں نہیں بتا سکتا! بعض لوگ اُسے "ناعاقبت اندیشی" کہتے ہیں۔ اگر واقعی وہ آتشِ سیال جو تمہارے رگ و پے میں بجلی کی طرح متحرک تھی "ناعاقبت اندیشی" ہے تو میں ایسی "ناعاقبت اندیشی" پر ہزار "مصلحت وقت" کو قربان کردینا بہتر سمجھتا ہوں!

+ + + + +

تمہاری شرابِ محبت کے متوالے اب بھی متوالے ہیں! لیکن وہ نشۂ جذبات جو بیک کرشمہ تم نے پیدا کیا تھا اب خمار ہو چلا ہے: خدا مغفرت کرے اُس بے نظیر شخص کی جس نے تمہارے بعد بھی اُس نشہ کو اپنے حتی المقدور خمار نہ بننے دیا۔ مگر اب وہ بھی نہیں۔ اُسی نظر نہ آنے والے ہاتھ نے اس کو بھی ہم سے چھین لیا جس نے تم کو زندہ درگور کر دیا۔ مگر نہیں اُس قادر ہاتھ کے ان دونوں افعال میں فرق ہے! اُس مرحوم کا "مردہ درگور ہونا" اُس کا بلاواسطہ اور ناگزیر فعل تھا؛ اور تمہارا۔ معاف کرنا۔ "زندہ درگور ہونا" بالواسطہ ہی: اس "واسطہ" ہی کا تو رونا ہے! اور اس کے رونے والے اب معدودے چند ہیں! وہ بیچارے بلا کسی ذاتی مفاد کے۔ خواہ وہ شخصانہ ہو یا وقارِ قومی پر مبنی۔ بلا کسی جلبِ منفعت کے، بلا کسی ارمانِ نمائش کے، جب کبھی موقع ملتا ہے صفحۂ قرطاس پر اپنے گرم گرم آنسو بہا دیا کرتے ہیں! کیوں؟ محض اس لیے کہ ان کی اندرونی حدت اُنھیں مجبور کرتی ہے کہ وہ۔ اور کچھ نہیں کر سکتے تو۔ رو ہی لیا کریں! ایسے بیتاب صفت لوگ بہت تھوڑے ہیں۔ بہت تھوڑے!

+ + + + +

خدا شاہد ہے اور ہر آنکھ دیکھتی ہے۔ کہ تمہارے افعال ظاہری کی تحریکِ باطنی ہر نقطۂ نگاہ سے بے لوث نظر آتی ہے! تم کبھی لغوگوئی کے الزام میں طعنۂ ملامت نہیں بنے: تمہاری نسبت۔ برخلاف اور اونچی شان والوں کے کبھی کسی قومی غبن کا اتہام نہیں لگایا گیا: دوست بیچارے تو تمہاری یاد تک کے پروانہ ہیں، دشمن بھی اگر کبھی زبان اپنی

کام لیتے ہیں تو تم کو "ناعاقبت اندیش" کہتے ہیں اور بس! مگر واقعات عالمِ عشق توجہ کے لیے ناعاقبت اندیشی کا وجود ایک جزو لاینفک ثابت کرتے ہیں۔ اور تم مجنوں نہیں تو لبریز درد ضرور ہو۔ پھر اگر کسی غدار شہر میں تمھاری عظمت۔ اور کہیں نہیں تو۔ دل ہی میں باقی ہو تو تعجب کیا؟ اس عظمت و افز کا اظہار تمھارے کسی بزرگ کے استقبال میں غیر معمولی طور پر کیا جائے تو حیرت کیا؟ تاہم انگشت بدنداں ہے اور میں ہنستا ہوں غماز جلتا ہے اور میں خوش ہوتا ہوں! خوشی کا اظہار میں نہ کرسکوں مگر پھر بھی میرے چہرہ اور حرکات سے کچھ نہ کچھ ٹپکتا ہے! آہ! زمانہ ناموافق! یہ! برا نہ ہو ظالم یہ نشتر در کنار یہاں تو اجازت فریاد بھی نہیں! محض اس جرم پر کہ فریاد کا خیال محض کبھی کبھی دل و دماغ سے زبان تک آگیا! ایسی ناگفتہ بہ سزا ملی کہ بھول جانے کی کوشش بھی کروں تو نہیں بھول سکتا! سینکڑوں جرکہ ایسے ہیں جو تمھاری نگاہ کے سامنے پہنچے ہوں مگر۔ خدا عالم ہے۔ تمھارے فریادیوں کو اکثر موقعوں پر اور مختلف صورتوں میں دبے جاتے ہیں اور ارادۃً دیے جاتے ہیں! یہ بس بیرسی کا مارا ہوا اگر وہ برداشت کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ یہ نہ کرے تو اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ مرگِ مفاجات پر کسی کا بھی زور چلا ہے جو ہم ناتوانوں کا چلے جائے! صبر۔ اور صبر کے ساتھ یہ دعوے کہ سب گوارا ہے جو تم سُنتے رہو فریاد بھی!!

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

ضرور آئے گا وہ وقت بھی جب حق آفتاب عالمتاب کی طرح رقیبوں کی نظر خیرہ کرے گا مگر خوف ہے تو یہ کہ اس نور کا جلوہ حاصل کرنے کے لیے آنکھیں بھی باقی رہیں گی یا نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ نظارہ کا وجود ہے تو ناظر کا وجود بھی یقینی ہے۔ بالکل بجا۔ مگر کیا وہی آنکھیں جو بخارات دماغ سے پیدا ہوئے والے ابر سے گریۂ بےکسی کا مینھ برسایا کرتی ہیں اس وقت تک بہ نہ جائیں گی؟ ان کی جانشین آنکھوں نے نورِ حق کو جلوہ گر دیکھا تو کیا دیکھا؟ دکھانے والی قوت کاملہ کی شان تو جب ہے کہ ان رونے والی آنکھوں ہی کو دکھا دے۔ اور اس وقت سے پہلے

دکھاوے جبکہ امتداد زمانہ دل سے اضطراب۔ دماغ سے بے چینی۔ اور نظر سے گرمی نہ کھو چکا ہوا ہو زمانہ منقلب، یہ دنیا منقلب، یہ سب کچھ منقلب! مگر ظالم انقلاب آخر تیرا ظہور کب ہوگا؟ میں یہ نہیں کہتا کہ تو میرے دل کے موافق ہی کروٹ بدل۔ نہیں تو اپنی روشِ تباہ کُن کو نہ چھوڑ اور یہ ایک گردش مجھے۔ اور کچھ نہیں تو۔ نیست و نابود ہی کر دے: میں نابود ہونے سے رہی مگر انتظار کی تکلیف اب میری قوتِ برداشت سے باہر ہے! میری التجا یہ نہیں کہ مجھے سنبھلنے دے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ۔ تڑپا کر نہ مار! ذبح کر دے مگر نیم جان نہ چھوڑ! ادھر یا اُدھر جو تیرے من میں آئے!! مگر خدا کے لیے عجلت سے کام لے اور بس!! مستقبل قریب میرا مرثیہ لکھے یا مجھ پہ نکتہ چینی کرے مجھے پروا نہیں۔ مگر میں آخر وقت تک محبتِ باطنی میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہوں۔ اور قوتِ برداشت کے زائل ہو جانے کے خوف سے اُس وقتِ آخر کو جلد بُلانا چاہتا ہوں! کیا یہ تمنا بھی کچھ خلافِ شانِ تغافل ہے؟

+ + + + +

ہاں اے جوہرِ طبع دکھانے والی شمشیرِ قلم (پھر "تم" سے خطاب ہے) تو سکون اختیار نہ کر! تیرے الفاظ کُہنہ زخم میں پھر وہی لذتِ درد پیدا کر دیتے ہیں جن کا یہ دل متمنی ہے! پند و نصائح سُنتے سُنتے عاجز آ گیا! اب کچھ کفر کی باتیں سُننے کو بے چین ہوں: "زبان بریدہ سہی مگر "گوش بُریدہ" نہیں ہوں! تم جو کچھ کہو سُن لوں گا اور محض اس سُننے سے وہ لذت حاصل ہوگی جو کہنے سے کبھی نہ ہوتی! بس تم کچھ نہ کچھ کہے جاؤ۔ تم سوائے اُس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے جو میرا دل سُننا پسند کرتا ہے۔ تم مجسم درد ہوا اور درد میں اُلٹ پلٹ سے بھی درد ہی درد پیدا ہوتا ہے!

+ + + + +

میں کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہی جو کہہ نہیں سکتا! اور کیا کہہ گیا؟ وہی جو کہہ سکتا ہوں! مگر آہ! جو کچھ کہنا تھا وہ اب بھی باقی ہے اور کہنے کی تحریک عطا کرنے والا ہی جانتا ہوگا کہ کب تک باقی رہے گا! تم زندہ اور صحبت باقی!! جامع المتفرقین کبھی ان قیود کو دفع کرنے کے ساتھ ہی بُعدِ ظاہری بھی دور کر ہی دے گا! گویا۔ میں تمھارے لیے دست بدعا ہوں؟

ہم کیا بیمار قلب دست بدعا ہیں؟ مجہول و ناکارہ افراد لے دے کر دعا ہی کر سکتے ہیں! فی الحقیقت وہ کسی اور قابل ہی نہیں! اگر کسی قابل بھی ہوتے تو دعا کی نوبت ہی کیوں آتی! مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ وہ دعا کے قابل بھی ہیں یا نہیں؟ اور کچھ نہیں تو ان کی دعا اور اوقات استجابت سے ضرور بے بہرہ ہیں! بے بہرہ نہیں تو جان بوجھ کر التجا کے وقت سکوت اختیار کرتے ہیں! وہ تمہاری کیفیت ہے اور یہ ہماری حالت! اس حالت پر بھی تم جان دیتے ہو، اور اس کیفیت پر بھی ہم تم سے مس نہیں ہوتے! اور کیا کہوں؟ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ: بیتاب درد ہوں تو دل رازدار ہوں۔ لبریز شکوہ ہوں تو زبان بریدہ ہوں!"

"میں کون ہوں؟ — تم ہی پہچانو!"

کہکشاں

جگنو جو اب تک گلاب و یاسمن کے کنجوں میں آسودہ تھے اپنی مشعلوں کی روشنی میں نکل آئے اور سبزہ پر شہاب ثاقب کا ہوتا نظر آنے لگا۔ اس وقت جب دنیا کو بیہوش کرنے کے لیے ہلکی ہلکی ہوا افسوں پھونک رہی تھی ایسے پر سکون عالم میں اس طرح جیسے کسی مطرب مغنیہ کی تانیں بھٹکے مرلیوں کے ساتھ فضا میں نشر مسرات کرنے لگیں کہکشاں نمودار ہوتی ہے اور آسمان کے دیباے زریں پر پھیلنے لگتی ہے۔

کہکشاں کیا ہے؟

وہ محض اجرام فلکی کی ایک نامتناہی صف آرائی ہے۔

نہیں وہ محک امتحان پر طلاے عشق کے آزمائش کا چمکتا ہوا خط ہے وہ لوح حسینان ہے جسکے ہر ذرہ میں تمثیل آرائی کی صفت پیدا ہوگئی ہے وہ دریاے نور کی ایک لہر ہے جو پھر منبع نور میں جا کر غائب ہو جاتی ہے وہ جوے شیر ہے جسکے دہانے بے بہا اسکے سطح پر تیر رہے ہیں وہ ایسی دولہن کا زرتار سہرا ہے جس کی بزم عروسی رقص زہرہ سے آراستہ کی گئی ہے۔

وہ کسی برق جمال کا جو آسمان کے پردۂ زنگاری میں چھپا ہوا ہے دامن قبا ہے۔

کوئی کہتا ہے وہ خیمۂ عرش کی ایک نورانی طناب ہے۔ ایک عابد شب زندہ دار اسی نقش سلیمانی سمجھتا ہے اور صحیفۂ قدرت کا مطالعہ کرنے والے اسے بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں وہ شاخ سدرہ ہے جو اب تک لوری امین کے نغموں سے روشن ہے ایک بادہ خوار آسمان کے جام زمردیں فام پر اسے خط پیمانہ سمجھتا ہے اور ایک بت پرست اپنے لیے دربار عشق سے عطا کیا ہوا زنار سمجھتے لوگ کہتے ہیں کہکشاں ظلمات شب کا چشمۂ حیواں ہے جس میں لاکھوں کنول کھلے ہوئے ہیں اور انھیں پھولوں کی نسبت چرخ کو نیلوفری کہتے ہیں۔ جدید شکیں کے گرفتار اسے کسی لیلا وش کا سویا ہوا مقیش کہتے ہیں۔ نہیں کہکشاں ایک حسن عالم گیر ہے نمک پیا۔ وہ کسی نقرئی آواز کا قہقہہ ہے۔

یہ بہت سی مثالیں مجھے محو حیرت بنا دیتی ہیں کہ کہکشاں تو کیا ہے ان سب سے بالاتر۔

اے کہکشاں تو وہ سلسلہ افشاں کا رہے جو راتوں میں میرے پیغام اور آرزوؤں کو کسی کے حضور میں پہنچا دیتا ہے۔

ابرار فتحپوری

اے بادِ بہاری کے تازہ اور خوشگوار جھونکو! خدا تمہاری مستانہ وار اٹکھیلیوں کو دائم و قائم رکھے، اور تمہارے پھلتے پھولتے چمنوں کو دنیا کی ہزاروں بہاریں نصیب ہوں، سینکڑوں شاہدانِ گُل اور لاکھوں نونہالانِ گلشن تمہارے آغوش ہائے مسرت طلب سے فیضیاب ہو کر چمنستانِ دہر کی زینت کا مرتبہ پائیں اور رہتی دنیا تک اُن کی گرمیٔ بہارِ حُسن کا دور دورہ رہے۔

اے بہار! یاد ہے تجھے شام کا وہ ناسا عد وقت! ہائے! وہ منحوس گھڑی جب کہ میں نوعروسانِ چمن کی زیبائش اور اُن کی نکہت آگین مہک سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا سامنے والی روش پر اکبارگی مبہوت ہو کر رہ گیا تھا، آہ! پھولوں کا وہ دلدوز نظارہ جس کی تاب نہ لا کر میرے پُر ارمان قلب میں انتشار کا عالم پیدا ہوتے ہی میرے دستِ تمنا دراز ہو گئے تھے، یہ کیوں! صرف اس لیے کہ میرا دل جو ایک مدت سے شاہدِ حقیقی کی تلاش میں اپنی ہستی کو نیست و نابود کیے دیتا تھا اس وقت کامیاب ہوتا ہوا نظر آیا۔

ہاں اے نسیمِ بہار! تیری وہ پُرشوخ ادائیں جب کہ تو ترنم ریزِ عشق ہو کر بیباکانہ اُن کو اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کرتی نشتر کا کام دیتی تھیں، تیرے گستاخ ہاتھوں کا اُن کے جسمِ نازک سے مس کرنا اور اُن کا ایک ادائے دلربا کے ساتھ ادھر اُدھر مُنھ پھیر لینا، میں نے اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ یہ باتیں ایک دُکھے ہوئے دل، آہ! ایک وارفتہ مزاج کی تباہی و بربادی کے لیے کافی ہیں۔

بے شک اے نوعروسانِ بہار! تمہاری دلآویز ادا اُن پر ہزار جان سے فریفتہ ہو کر میرا غنچۂ دل بھی کھِل کھِلا اُٹھا تھا، اور خیال کیا تھا کہ تم کسی نازنین کے دستِ سیمیں کی زیبائش اور کسی معشوق کے گلے کا ہار بننے کے لائق ہوا تمہاری پاک ہستی

کسی عفت کوش اور حیا پرور وجود ہی کے ساتھ وابستہ ہونے کے قابل ہے، مگر آہ!
نسیم صبح کے بدمست جھونکوں، اور گستاخ اٹھکھیلیوں نے تمہاری بہار حسن لوٹ کر میری
تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

غضب خدا کا وہ بدذات حسن کے ڈاکو جو زخم خوردۂ الفت کی نظروں میں کانٹوں
کی طرح کھٹکتے ہوں تمہاری مجلس میں باریاب ہوکر تمہارے پہلوؤں میں جگہ پائیں اور
تمہارے متمنی، آہ! تمہارے وارفتہ یوں محروم و ناکام رہ جائیں؟

ہاں! عصمت و عفت کی سچی تصویرو، اور زمانہ کی گھمیں کو کھلا ہوا آغوش سمجھنے
والی بہنو! ذرا خدا لگتی کہنا کہ ان وابستگان حسن کی آشفتہ حالی کہاں تک قابل رحم
اور کس درجہ قابل افسوس ہے؛ بے شک اپنے شاہد حقیقی کو پاکر میں مطمئن ہو چکا تھا کہ
میرے دل کی تپش، میرا اندرونی اضطراب اب صرف چند لمحوں کا ہے، اُسکا جوش
شباب اور دلفریب ادائے شرم دیکھکر میں نے ویسا ہی ایک ہمدم جو اُس کی
وابستگی کا محل صادق ہو تلاش کر لیا تھا، اور چاہتا تھا کہ باغبانوں کے سفاک
ہاتھوں کی دستبرد سے محفوظ رکھکر اپنے معشوق حقیقی کے لیے اُسے شیرینی کا لذت کش
بنادوں، مگر کیا سچ مچ میری تمنائیں اُس پاک اور سچے وجود کے ساتھ وابستہ ہونے کے
قابل تھیں؟ کیا وہ دو بہار بوستاں میرے ہی سکون قلب کے لیے عالم وجود میں
آیا تھا؟ آہ! ایک تشنہ لب محبت اور ایک سوختہ دل مقدر کے دل سے کوئی پوچھے
کہ ان حسینوں کی بے قرار وحشی نگاہوں نے اُس کی دیرینہ تمناؤں کو اپنے ایک ہی
حملہ میں کس طرح ملیا میٹ کر دیا، اُس کے اندازِ بیخودی کو کوئی دیکھے کہ کیونکر ایک
جی سے گزرنے والے کے قلب و جگر کو برمایا جاتا ہے؟

اُف! باد بہاری کا پتوں کی ... سے چھیڑنا اور تیرا جوش شرم سے سرخ ہو جانا،
اسی حیا پروری اور پاکبازی نے میرے دل کو آسانی مسخر کر لیا تھا، مگر افسوس! اتنا
فلک کج رفتار نے بایں پیرانہ سالی سفاک حسینوں کی طرح میرے دل کو بسانِ طفلانِ
اشک بہا دیا؟

اے نکہتِ بادِ بہاری! تجھے معلوم ہے کہ تیرا نازپروردہ آہ! میرا جگر گوشہ آج تجھ سے چھین لیا گیا، اے باغ کے شگفتہ پھولو! تمھیں خبر ہے کہ ایک ہم نشین تمھاری ہر وقت کی صحبتوں اور نیرنگیِ انجمن سے بیزار ہوکر، تم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا، آہ! وہ دیکھو زبانِ حال سے کہہ رہا ہے، کہ

حسرت اے صبح چمن ہم سے چمن چھوٹے ہے خودہ اے شام غریبی کہ وطن چھوٹے ہے

جا، اے نکہت بادِ بہاری جا، اور اپنے شاہدِ گُل کا تابوت اپنے ہی دوشِ نازک پہ لے جا، رخصت، اے جسدِ خاکی سے پرواز کرنے والی روح! رخصت، دیکھ آسمانی فرشتے، مقدس روحیں اور حورانِ جنت تیرے استقبال کو آئی ہیں اور دامنِ بادِ صبا کا تابوت لائی ہیں، جا، جا، اے عدم کے مسافر جا، اور ایک مایوس محبت کا سلام، آہ! آخری سلام دل سے قبول کرکے اپنے اصلی وطن سدھار۔

ہاں! اے بلبلِ نوگرفتار تیری طرح میں نے بھی اُس کو چاہا، اُسے اپنا بنانے کی کوشش کی، مگر آہ! جس طرح تیرا ننھا سا دل آئے دن کے آلام و مصائب سے ملیامیٹ ہو گیا، اُسی طرح میری مسرات زندگی بھی مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔ ہائے! ہجوم غم اور پھر یہ مفارقت کیا دل ہلا دینے والا سانحہ ہے، اے نو بہار بوستاں مجھے کیا معلوم تھا کہ تیرا شیرازۂ ہستی اس قدر جلد پریشاں ہوکر، دلدادگانِ حُسن کی تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔

صبر! اے ننھی سی چڑیا صبر!

گلچیں کا کچھ خطر ہے نہ کچھ خوف پاسباں

جی کھول کھول روئیے خالی ہے گلستاں

نالے وہ کیجیے کہ جگر سے اُٹھے دھواں

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دل

سرور مارہروی

ہمارے اسلاف کی سیاسی غلطیاں

حریت و مساوات کہنے کو تو صرف دو سیدھے سادے لفظ ہیں مگر غور کیا جائے تو تمدن و تہذیب کی تاریخ ان کی شرح ہے۔ اقوام عالم کے عروج و زوال کے قصص ان کی تفسیر ہیں۔ اور اولوالعزم و نامور اشخاص کے کارنامے ان کی توضیح وہ حریت ہی کی روح تھی جس نے مدافعان تھرماپلی کو حیات جاوید بخشی ہے۔ وہ حریت ہی کا جوش تھا جس نے ایک لوہار کے چمڑے کو ایک پرشان و شوکت قوم کا لوائے قومی بنایا اور درفش کاویانی کا خیال اب بھی سیاسی آزادی کی تحریک کرتا ہے یہ حریت ہی کا صدقہ تھا کہ قوم ڈچ بمقابلہ ہسپانیہ عظمیٰ اپنی مذہبی و ملکی زندگی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی اور آج زندہ ہے۔ وہ مساوات ہی کا خیال تھا جس نے جولیس سیزر کو اپنے دوستوں کے ہاتھوں قتل کرایا۔ وہ مساوات ہی کا عمل تھا کہ عربوں کی سی شرافت نسب پر فخر کرنے والی قوم نے غلاموں کی سرداری قبول کی ہے۔ وہ مساوات ہی کا اثر تھا کہ امام شافعیؒ نے صحابیت کی جلالت کو نظر انداز کر کے کہا ھو رجال ونحن رجال۔ وہ حریت و مساوات ہی کا نشہ تھا جس نے انگریز جیسی قدامت پسند و قانونی قوم کو بادشاہ کشی پر آمادہ کیا۔ وہ حریت و مساوات ہی کی سرمستی تھی جس نے بانیان و کارکنان انقلاب فرانس کو کل اقوام یورپ کو جمہوریت کی دعوت دینے کی ہمت دلائی وہ حریت و مساوات ہی کا کرشمہ تھا جو جریدۂ عالم میں واقعہ کربلا کے نام سے ثبت ہے اور ایک طرف حریت و مساوات اور دوسری طرف استبداد و ظلم کا بہترین نمونہ مانا جاتا ہے۔

دنیا کا بہترین لٹریچر وہ ہے جس میں حریت و مساوات کی دعوت و تعلیم دی گئی ہے۔ ڈیستھنیس کے فلپکس، روسو کی معرکۃ الآرا کتاب۔ مازنی کے مضامین کومٹ کے اقوال۔ ٹالسٹائی کے فسانے حریت و مساوات کے جذبات سے لبریز ہیں۔ اور اس لٹریچر نے قوموں اور ملتوں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اور نفس انسانی کے بعض نہفتہ قویٰ

کارنامے اس کا نتیجہ ہیں۔

مسلمانوں کا عہد اول حریت و مساوات کی مکمل عملی تصویر ہے اور اسی لیے اس کو خیر القرون کہا جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عجمی تمدن کی یورش اور قدیم عربی تفاخر قومی و خاندانی کے ردعمل نے اس تصویر کو ایسا بگاڑا کہ تھوڑے ہی زمانے میں کیا سے کیا ہو گئی اور امتداد ایام نے نیم متمدن اقوام کے خیالات کے ساتھ مل کر حریت و مساوات کی اس مکمل عملی تصویر کو گویا مسخ ہی کر دیا۔ بایں ہمہ اسلامی روح نے جو تمام تر حریت و مساوات کے جذبات سے سرشار ہے وقتاً فوقتاً اپنا اثر دکھایا ہے۔ زمانہ نے مسلمانوں کو ہمیشہ موقع دیا ہے کہ اپنی وراثت ملی حاصل کریں مگر مسلمانوں نے عموماً اور ہندی مسلمانوں نے خصوصاً ان خداداد مواقع سے فائدہ اٹھانا پسند نہ کیا اور یوں اپنی سیاسی نااہلیت کا ثبوت دیا۔ اسلام نے انسانی روح کو وہ بزرگی و عظمت عطا کی کہ سجدہ صرف خدائے قادر و قیوم کے لیے مخصوص کیا گیا اور شخصیت پرستی کی ہر ممکن ذریعہ سے ممانعت کی گئی۔ مگر حریت و مساوات کی ناقدردانی نے اسلامیوں کی کایا پلٹ دی۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بعض ایسے حادثات وقوع پذیر ہوئے ہیں کہ بزرگان قوم کی بروقت ادنیٰ توجہ تاریخ کا رخ بدل دینے کا باعث ہوتی۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے اسلاف نے اسلام کے اس حاسہ خصوصی کو اس قدر کمزور بلکہ بیجان کر دیا تھا کہ انھیں ان واقعات سے کوئی تحریک ہی نہ ہوئی اور خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم سے ہماری قوم محروم ہوتی گئی۔ اس دعوے کے ثبوت میں اسلامی تاریخ سے متعدد واقعات پیش کروں گا۔ اب ایک نادر و عجیب مثال دیتا ہوں۔

سلطان محمد بن تغلق کی قبل از وقت سیاسی و اقتصادی پالسی کی ناکامیابی نے جب اس کے مزاج میں ایک طرح کا غصہ و خشونت پیدا کر دی تو بعض افعال اس سے ایسے سرزد ہوئے کہ امرا و علمائے قوم نے بازپرس مناسب جانی اور جا بجا بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس وقت دکن کو مسلمانوں کے قبضہ میں آئے ہوئے بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ ان کا قبضہ بھی بڑی حد تک سیاسیات حاضرہ کے حلقۂ اثر سے زیادہ

تفاوت نہ رکھتا تھا۔ فرق یہی تھا کہ جگہ جگہ مسلمان اعلیٰ افسر فوجی دستوں کے ساتھ عام نگرانی اور عہود و مصالحت کی پابندی و تکمیل کے لیے مقرر تھے۔ یہ افسر امرائے صدہ کہلاتے تھے۔ دکن کے امرائے صدہ نے بھی سلطان کے ناعاقبت اندیش احکام و افعال سے روگردانی اپنے و نیز قوم کے حق میں مناسب سمجھی۔ اور عہد اطاعت و انقیاد سے خود کو آزاد کیا۔ امرائے صدہ دکن نرے سپاہی نہ تھے بلکہ عموماً قلم و علم۔ دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ مسلمانوں میں اکثر قلم و شمشیر کا ساتھ رہا ہے۔ رزم و بزم کی صورتی ہمجنسی نے اپنے فدائیوں میں عملاً بھی ہمجنسی قائم کر دی تھی۔ اور ایک ہی اسلامی ہستی میدان جنگ و محفل چنگ میں رونق افروز ہوا کی ہے۔

اس زمانہ کے حسب ذیل امیران صدہ کے نام دریافت ہو سکے ہیں۔

اسمعیل فتح۔ حسن شاہ۔ سیف الدین غوری۔ ملا محمد بدخشانی۔ سید صدر الشریف سمرقندی۔ سید محمد بدخشی۔ سید رضی الدین بہرام خان مازندرانی۔ صفدر خان سیستانی۔ مولانا محمد اسحٰق سرہندی۔ فولاد خان سیستانی۔ سید احمد ہروی سید نور الدین شیخ منہاج الدین جنیدی۔ قوام الدین غوری۔ سید تقی اصفہانی۔ سکندر خاں۔ قیر خاں کلیم اللہ مازندرانی۔ بایزید خاں۔ سید جمال الدین نوایت۔ صلابت خان سیستانی۔ میر زین العابدین۔

ان میں سے بعض کا شمار علما میں تھا۔ جیسے مولانا محمد اسحٰق۔ ملا محمد۔ سید صدر الشریف سید محمد۔ سید احمد وغیرہ اور سید صدر الشریف اور سید محمد بدخشی علوم نجوم و ریاضی میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ بقیہ امرائے صدہ بھی ضرور تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی منصبی حیثیت اس زمانہ کے پولیٹکل ایجنٹوں کی سی تھی اور بغیر علم و تجربہ کے وہ اپنے فرائض منصبی نہ بجا لا سکتے تھے اس لیے ان کے متعلق بے علمی کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ ان بزرگوں نے جب بغاوت کا ارادہ کیا ہے تو یہ سوچ لیا کہ بغیر سر دھرے کامیابی محال ہے۔ اس لیے کثرت رائے سے انھوں نے اسمٰعیل فتح افغان کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ غور کیجیے انتخاب ہوا ہوگا تو کیا کچھ بحث و مباحثہ نہ ہوا ہوگا۔ ہر امیر نے اپنے حقوق و اہلیت

جتائی ہوگی۔ کیونکہ سب برابر کے عہدہ دار تھے اور رعیت و مساوات کے نشہ سے سرشار۔ اسمٰعیل فتح کی سرکردگی میں ان امراء وعلمائے قوم نے سلطان وقت کے خلاف کامیابی حاصل کی اور دکن کو اس عجیب و غریب فرمانروائی کی اطاعت سے آزاد کرلیا

اس آزادی کی جدوجہد میں حسن شاہ نے بہ نسبت دیگر امرا کے زیادہ حصہ لیا اور افواج سلطانی کی شکست بیشتر اس کی جوانمردی وکوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس وجہ سے خلائق کا رجوع اس کی طرف زیادہ ہونے لگا۔ اور یہ حالت منتخب شدہ سلطان کو بھی محسوس ہونے لگی۔ تاہم نہ حسن شاہ نے اپنی ہردلعزیزی و خلائق پذیری کی بناپر بغاوت کرنے کی جرأت کی اور نہ امراء وعلما نے اپنے انتخاب پر نظر ثانی کرنا پسند کیا۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہی کہ اس زمانہ کے مسلمان کسی کی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے اور پابند اصول تھے اپنے اپنے عہود کا بڑا پاس تھا اور بغیر کافی وجہ کے وہ فساد کرنا نہایت برا سمجھتے تھے لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا پر ان کا پورا عمل تھا مگر اسمٰعیل نے فرائض تاج تخت و عوائد سلطنت کے باحسن وجوہ بجالانے کی خود میں ہمت و قابلیت نہ پائی اور بے غرض و بے نفس ایمانداری سے کام لے کر جس کی مثالیں تاریخ عالم میں بہت کم ملتی ہیں اپنے فوائد کو فوائد قومی و ملی پر سے قربان کردیا اور بادشاہت سے استعفاد یدیا۔ امراء وعلما کی جماعت نے کثرت رائے سے حسن شاہ کو سرفرازی بخشی۔

امیران صدہ دکن کی پوری جماعت جیسا کہ اوپر بتلایا جاچکا ہے اچھی تعلیم یافتہ تھی اور حکمرانی کا کافی تجربہ رکھتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بعض امرا علوم مذہبی میں بہرۂ تمام رکھتے تھے اور بعض امرا علوم دنیاوی میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ غرض ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ انتخاب کرنے والی پوری جماعت یہی نہیں کہ اپنے فرائض منصبی سے اچھی طرح واقف تھی بلکہ یہ بھی کہ وہ بخوبی جانتی تھی یا جان سکتی تھی کہ انتخاب سلطان سے کیا مقصد ہے اور قوم و ملک پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اور غلط انتخاب کے نتائج سے ملک و ملت کو کس طرح محفوظ و مصئون رکھا جاسکتا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ان امرا نے اپنے بادشاہوں کے انتخاب کے وقت دوراندیشی

وسیاسی پیش بینی سے کوئی کام ہی نہ لیا۔ کیسا نادر موقع تھا جمہوری سلطنت کے قائم کرنے کا۔ کس قدر عجیب ذریعہ تھا قومی و ملی بادشاہت کے بنا کرنے کا۔ امراے دکن اسلام کے سیاسی عہد زریں کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے اور ان کے سامنے وہ معجز نما مرقع بھی تھا جسے مؤرخان عالم نے ہمیشہ استعجاب و حیرت کی نظر سے دیکھا ہے اور جس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ صحیح دنیا جمہوریت کا اوّل نمونہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ امراے دکن خلافت راشدہ کے طریقۂ قیام و انعقاد وطرز حکومت و اسلوب انتظام اور ان سب کے نتائج حسنہ کا کافی علم رکھتے تھے مگر سخت ماتم و افسوس کرنے کی بات ہے کہ انھوں نے اس علم سے کچھ کام نہ لیا اور بلا وجہ وضرورت اس خداداد نعمت عظمیٰ کو جسے علماے سیاسیات آزادی کہتے ہیں اور جو ہر فرد بشر کا حق طبعی ہے خود اپنے گروہ میں سے ایک شخص پر سے قربان کر دیا۔ اور اپنے ساتھ قوم کو بھی لے ڈوبے۔ سچ پوچھو تو وہ قوم کے نمائندے تھے اور جب انھوں نے ایک جائز سلطان کی ناجائز مطلق العنانی سے مسلمانوں کو رہائی دلائی تو ان کا فرض تھا کہ دوسرے سلطان کی لامحدود فرمانبرداری اور بلا قید فرمانروائی میں نہ پھنساتے۔

اے کاش وہ سلطنت کے لیے کوئی اساسی قانون وضع کرتے اور منتخب شدہ سلطان کو مجبور کرتے کہ وہ اس قانون کی پابندی کرتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سلطان سے عہد لیتے کہ جس طرح ان کی رائے سے اسکا انتخاب ہوا ہے اسی طرح ہر اہم معاملہ سلطنت انکی رائے اور مشورہ سے طے ہوا کرے۔ غرض ایک محدود الاختیارات آئینی بادشاہت قائم ہو سکتی تھی۔ مگر امیران صدہ نے نہ اسکی کوشش کی اور نہ جمہوریت کے لیے جد و جہد کی۔ انکی یہ فروگذاشت ناقابل معافی ہے اور ان کی یہ غلطی ثبوت ہے انکی سیاسی نااہلیت کا۔ تاریخ کی ورق گردانی کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کن کن ایام میں ہمارے اسلاف سے کس کس قسم کی سیاسی غلطیاں سرزد ہوئیں جنکے برے نتیجے دیکھنے کے لیے آج ہم [illegible] مذکورۂ بالا واقعہ بھی ان غلطیوں میں سے ایک ہے اور افسوس ہے کہ ہم سب [illegible] غلطی سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

تغیر ہو۔ اور علمی حیات پرور مشاغل ترک کرنے پڑیں۔ امیر معاویہؓ کی والدہ محترمہ نے اس وقت جب کہ آپ حضرت معاویہؓ کو کھلا رہی تھیں ایک عورت کی دعا سرداریِ مسلمین دینے پر سخت برافروختہ ہو کر کہا تھا کہ اگر یہ بچہ صرف مسلمانوں ہی کا سردار ہو سکے تو خدا اس کو ابھی اٹھالے مجھے ایسے قلیل الہمت اور قصیر الحوصلہ لڑکے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ دیکھو اور غور کرو کہ جن بچوں میں اس درجہ احساس علمی ہوگا۔ جو افراد ایسی مبارک اور بصیرت افروز گودوں میں پرورش پائے ہوئے ہوں گے۔ وہ دنیا میں کیونکر پست ہو کر رہ سکتے ہیں۔ اسلامی دور کے عہد اولیں ہی میں خواتین اسلام کے دماغ علمی شعاعوں سے مستنیر و مجلی ہو چکے تھے۔ بڑے بڑے پائے کی فضلا و عصر مخدرات منصۂ شہود پر جلوہ ریزیاں کر رہی تھیں۔ آسمان تہذیب ان علمی ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ حضرت فاطمہؓ اس پایہ کی فاضلہ و شاعرہ تھیں کہ وہ شعرا باکمال جنکی طلاقت لسانی دریا کی روانی پر حرف زنی کرتی تھی اپنے کلام کے باہمی نزاعات کے فیصلہ کو آپ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضرت سکینہؓ بنت امام حسینؓ کا علمی رنگ ان سے بھی زیادہ شوخ تھا۔ حضرت عائشہ دختر طلحہؓ کی تحیر افزا علمی قابلیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ ہشام جب حج کو آیا تو ان کی قابلیت و ہمہ دانی کا شہرہ سن کر اپنی ہمراہی جماعت کاملین کے ہر شخص کی معلومات علمی سے آپ کے علم و فضل کا موازنہ کیا خوب گرما گرم مباحث رہے مگر ہر شخص آپ کے مقابلے میں عاجز ہوا۔ تعلیم نسواں کے مخالف آنکھیں کھولیں اور دیکھیں کہ اسلامی دور میں کس فضل و لیاقت کی عورتیں ہوتی تھیں۔ ابھی دنیا نے اخت المزنی کو نہیں بھلایا جنھوں نے اپنی شہرۂ عالم قابلیت سے علامۂ امام شافعیؒ جیسے وحید العصر اور نابغہ روزگار کے فتوے میں اصلاح کی تھی۔ ماحال زیب النساء بیگم کی بدیع المثال علمی عجوبہ آفرینیاں ہم کو یاد ہیں جو علم و فضل تہذیب و تمدن اخلاق و اشفاق کی دنیا میں وہ مرتبہ رکھتی تھیں جس پر آج بھی یوروپین مستشرقات باایں ہمہ [illegible] کیا قرۃ العین کی فصاحت و دلکش بیانی کسی مرد سے کم تھی [illegible] شعرا اپنا جواب پیش کر سکتے ہیں۔ کیا مخفی کا کلام سلاست و شوخی میں [illegible]۔ کیا میڈم ڈی اسٹائل کی سحر کار تصنیفات نے یورپ بھر میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ [illegible] اعظم جیسے زبردست ترین اور اولوالعزم شہنشاہ کو مجبوراً یہ حکم سب سے اول

نہ دینا پڑا تھا کہ اسپیڈم وی اسٹائل علاج البلد کی جائے۔ اس قابل وفضیلت مآب خاتون کے
یہ دنیا بھری پڑی ہے صرف ایک پیرس اپنے لیے رکھ لیتا ہوں" یہ نہایت قابل خاتون تھی
ہمیشہ نپولین کی تدبیر کا کاٹ کرتی رہی۔ کیا رابعہ بصریؒ جیسا بلند مرتبہ کوئی پا سکتا ہے جن کے
استقبال کو خود کعبۂ مقدسہ نے اقدام کیا تھا۔ کیا جنگی کارناموں میں گل بہشت۔ عفرا۔ خولہ بھی
مردوں سے پیچھے رہی ہیں۔ کیا ہمت و صولت اور استقلال و پامردی میں رضیہ۔ چاند سلطانہ اور
حمیدہ بیگم نے اپنا جواب عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی کبھی پایا ہے۔ کیا گیتی آرا بیگم بنت مرزا شاہ
نے بقول مصنف سیر الشیا ایک جبریہ فوجی زنانہ اسکول [illegible] میں قائم کرکے نسوانی جرأت و
بسالت کی نئی مثال قائم نہیں کی تھی۔ اور اس کی فوجی تعلیم یافتہ گیارہ ہزار فوج نے آن کی
آن میں باوجود عدو کی صد ہزار جانفروشانہ کوششوں اور لاکھ گونہ مردانہ مدافعتوں کے
حیرت انگیز جرأت سے ملک خالی نہ کرا لیا تھا۔ کیا ابن جوزی کی والدہ نے انتہائی فراست
و عواقب بینی سے کام لے کر صاحبزادوں کی تعلیم پر یکمشت تیس ہزار اشرفیاں خرچ نہ کر ڈالی
تھیں۔ کیا امام بخاری کی ہمشیرہ نے بھائی کے سفر کرنے کے وقت پوشیدہ طور پر بستر میں اپنا زیور
آئندہ ضروریات کا خیال کرکے نہ رکھ دیا تھا۔ کیا اُن متعدد عربیہ عورتوں کے ایجادات و
اختراعات سے نظریں بند کی جا سکتی ہیں جن کے نام علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں
لکھے اور بڑے فخر سے لکھے ہیں۔ آخر وہ کون سا میدان ہے جس میں طبقۂ اناث اپنی جولانیاں
نہیں دکھا چکا۔ اور وہ کیا عظیم الشان کارنامے ہیں جو دنیا میں صرف مردوں سے زیادہ
منسوب ہیں اور عورتیں اُن کی انجام دہی سے محروم و مجبور ہیں۔ کسے کو کوئی کچھ کہہ لے مگر
تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ علم و فضل۔ سطوت و جبروت حکمرانی و سلطنت۔ صولت و شکوہ
ہمت و استقلال۔ ایجادات و اختراع۔ شاعری و فصاحت۔ تدبیر و تسخیر محبت و الفت
کے کسی شعبے میں ہم اُناث کو ہرگز ذکور سے کم نہیں پاتے۔ اور کوئی راہ ایسی نظر نہیں آتی
جس پر صرف مرد ہی گام زنی کر سکے ہوں اصل حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت کے جابرانہ
جذبہ نے دنیا میں بہت کم اُناث کو اُبھرنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا ہے۔ اور ہمیشہ اُن کے
سامنے بزدل بنا دینے والے قصص مختلف رنگوں میں مختلف طرزوں کے ساتھ بیان

کیے گئے ہیں اور یہ خیال فطرتِ نسوانی میں راسخ کر دیا گیا ہے کہ جرأت و ہمت صرف مردوں کا حصہ ہے۔ عورتیں محض مردوں کی تفریحی صحبتوں اور ان کی نازبرداریوں کے لیے مخلوق ہوئی ہیں۔ اُن کا کام محض زینت و آرائش اور ہر سال بچے جننا ہے۔ اسکی بدیہی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ آجکل حسن و جمال کی یہ خوبی بیان کی جاتی ہے کہ نزاکت اس درجہ ہو کہ ساعد سیمیں کی معمولی گرفت رگوں میں درد رنگ میں نیلاہٹ پیدا کر دے اگر اس کے برعکس ہوا تو گویا وہ حسنِ نسوانی کا سقم و عیب متصور ہوگا۔ مگر دو تین صدی قبل کے معیارِ جمال پر نظر ڈالنے سے ہماری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جبکہ ہم نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی مسلم الثبوت نازنین پری تمثال ملکہ نور جہاں بیگم سے شہنشاہ کو باوجود ہزار گونہ عشق و محبت کے محض اتنی سی کم ہمتی پر ناراض ہوتے ہوئے پاتے ہیں کہ کیمپ میں شیر گھس آنے پر وہ کیوں ڈر کر دوسرے دروازے سے نکل جاتی ہے اور کس طرح ایسی بزدلی دکھانے کی مرتکب ہوتی ہے۔ اور جب تک بیگم اپنے حسین اور برق پاش نازک ہاتھوں سے شیر کو مار نہیں گراتی کسی طرح شہنشاہ اپنی محبوبۂ جہاں پرور سے ہمکلام نہیں ہوتا اس کے بعد ایک دفعہ ایک نازک اور گنجان موقع پر دورانِ شکار میں یکبارگی چار شیر نکلے لیکن نور جہاں کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ نہایت اطمینان سے دو شیروں کو ایک ایک گولی میں اور دو کو دو دو گولیوں میں ٹھنڈا کر دیا۔ جہانگیر نے فرطِ مسرت سے ہاتھ چوم لیے اور چند بیش قیمت زیور انعام دیے۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ کتے بلی تک کو مارنا اور بھگانا بھی جرأت و جسارت کا کام سمجھ کر ہماری خواتین مردوں ہی کی اعانت ڈھونڈتی ہیں اور خود کو جملہ بزدلیوں اور بے ہمتیوں کا مجسمہ خیال کر کے ذرا سے خدشے سے سہم جاتی ہیں نہ مردوں کو کچھ خیال ہوتا ہے نہ عورتیں اپنی حالت کا احساس رکھتی ہیں۔ صدیوں کی غلامی نے بالکل بے حس بنا دیا ہے۔ طبقۂ اناث کی کمزوری کی یہ آخری حد تھی کہ ۱۵۸۵ء میں خاص روما میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کا مقصد انعقاد یہ تھا کہ آیا عورت میں روح ہے بھی یا نہیں۔

ایک فلاسفر نے ثابت کیا کہ عورت میں روح ہے اُسکو فوراً جلا دیا گیا۔ ایک علامہ حکیم نے

کہ عورتوں کو بھی دولتِ تعلیم سے مستفیض ہونا لازمی ہے زندہ زندہ دفن کر دیا گیا۔ یہی قوتِ متخیلہ
زبردست کرتے تھے کہ ایک فریق قعرِ مذلت میں گر گیا۔ اور حیاتِ دنیوی کی سائکل میں صرف
ایک پہیہ رہ کر سائکل کو بیکار کر گیا۔ تاریخ شاہد ہے اور ہماری متذکرہ بالا مثالیں مظہر ہیں کہ
جب اور جس عہد میں عورتوں کو موقع دیا گیا ہے وہ ہرگز کسی مرد سے کم ثابت نہیں ہوئیں
ایک نور جہاں اور چاند سلطانہ کی ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہزارہا عورتوں کی ایسی مثالیں ملتی
ہیں جن سے انسان خصوصاً مرد متحیر رہ جاتے ہیں کہ یا للعجب یہ دلوں کو فگار اور جانوں کو بسمل
کر دینے والی دل آرا اور پیاری مخلوق حجلۂ عروسی سے نکل کر جب اسٹیج عالم پر آگئی ہے تو اس
نے وہ سب کچھ کر دکھایا ہے جس کو چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھا تھا۔ غور کرنے کی جگہ ہے کہ ہنوز ہم
میں سے ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ تعلیم ایک فضول بلکہ خطرناک شے ہے۔ صرف چند
مسئلہ مسائل کی کتب کا پڑھ لینا اور قرآن حمید کا ختم کر لینا کافی ہے۔ اول تو یہ خیال
حرف شناسی کی تعریف سے باہر نکلتا۔ دوسرے اس قلیل المقدار علم سے حیوانیت فطری کیونکر دور
ہو سکتی ہے۔ عبارت پڑھ لینا محض حصول علم کا ذریعہ ہے۔ حساب۔ فلسفہ۔ تاریخ جغرافیہ طب
صرف و نحو کو علم کہہ سکتے ہیں اور ان ہی پر عقل و خرد کی افزونی کا مدار اور انسان بننے کا انحصار
ہے۔ گو عقل ایک خداداد شے ہے مگر اس کی ترقی بے علم غیر ممکن ہے۔ آسودگی۔ قائم مزاجی۔ استغنا
اور سیر چشمی جیسی علم سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ دولت سے ممکن ہے نہ حکومت سے تعلیم یافتہ عورت
مطالعۂ کتب کے ذریعے بڑے بڑے عالموں فلاسفروں اور ولیوں سے ہر وقت رائے لے سکتی ہے
جب کوئی کتاب ہاتھ میں لی جی بہل گیا اور کوئی نہ کوئی عقل کی بات ہاتھ لگ گئی۔ کس بُری
طرح جاہلوں کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ اس کی غیبت اُس کی بدی۔ مجھ سے لڑ تجھ سے بگڑ۔

آخر سوچو تو تعلیم نسواں کیوں معیوب ہے جب کہ جمیع علوم کا نتیجہ اور مقصد یہی ہے کہ انسان ہر چیز
کی اصل دریافت کرے۔ بات کی تہ کو دریافت کرے۔ تہذیب نفس حاصل ہو غور کا عادی ہو۔ دنیا کی
کشمکشوں اور مشکلوں سے بچنے کی صائب تدابیر سوچ سکے۔ ارسطو کا قول ہے کہ ہر پتھر میں خوشنما
تصویر اور ہر آدمی میں ایک عالم چھپا ہوا ہوتا ہے جس طرح سنگ تراش بھدا پتھر چھانٹ کر
عمدہ تصویر نکال لیتا ہے اسی طرح علم آدمی کی برائیاں اور وحشی پن دور کر کے انسان بنا دیتا ہے

حکیم شبلی کا قول ہے۔ کہ انسان اصل میں مجسم شر ہے لیکن صرف تعلیم و تلقین سے طبیعت اخلاق کو قبول کر لیتی ہے۔ پروفیسر ذکاء اللہ صاحب تاریخ ہند حصہ اوّل میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب کسی ملک کی تہذیب و شائستگی کا ذکر کرتے ہیں تو اوّل توجہ عورتوں کی لیاقت کی جانب منعطف کرتے ہیں۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ہدایت فرمائی ہے۔ کہ تمھارے پاس سب سے تیز ہتھیار تمھارا علم ہے۔ دنیا میں شکوہ سے زندگی بسر کرنے اور عاقبت سنوارنے کی تدابیر کو جتنا تعلق عورتوں کی ذات سے ہے۔ سچ پوچھو تو مردوں کو اتنا نہیں۔ کیونکہ ادنیٰ سے اعلےٰ تک تمام نسلوں کا جسمانی اخلاقی روحانی نشوونما نہ صرف پیدائش سے سنِ شعور تک بلکہ پیدائش سے بھی کچھ عرصے پہلے سے ان ہی کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ اگر مردوں کو درستیِ اخلاق کی احتیاج ہے۔ تو کیا مستورات اس سے مستغنی ہیں اگر شوہروں کو دیندار، پرہیزگار اور باخدا بننا چاہیے تو بیبیوں کو کیا معاذ اللہ بے دین بدکردار اور خدا فراموش رہنا زیبا ہے۔ اگر مرد عقل و دانش۔ نیک نامی و سرخروئی۔ علم و ہنر۔ خوش حالی و فارغ البالی کے خواہاں و حاجتمند ہیں تو کیا جنس لطیف کے لیے قدرت نے محرومی کا فتویٰ لگا دیا ہے۔ حاشا و کلا۔ کیا وجہ ہے کہ فلاحِ دارین حاصل کرنے کے لیے جو باتیں خدا اور رسولؐ نے فرمائی ہیں انھیں عورتوں سے متعلق نہ سمجھا جائے۔ اور لقوم یعلمون۔ لقوم یتفکرون لقوم یعقلون اور اولوا العلم درجات کی مخاطب وہ نہ سمجھی جائیں۔ یہ نہایت شرم و افسوس کی بات ہے۔ کہ ہم مرد ہو کر پہلے اپنی اصلاح نہ کریں اور ان غریبوں سے فرشتہ سیرت بن جانے کی توقع رکھیں۔ یہ ناممکن ہے کہ جب تک ماں کے اخلاق و عادات عمدہ نہوں۔ بچے صرف باپ کے اخلاق و آداب کا اثر قبول کر سکے۔ خانہ داری کا فن معمولی فن نہیں ہے کیونکہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے لیے بہت سے علوم و فنون سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی عورت جب تک کہ وہ تعلیم یافتہ نہو یہ دعوے نہیں کر سکتی کہ وہ شوہر کی آمدنی و خرچ کا انتظام اس طریقے سے کر سکے گی کہ گھر کی مالی حالت بھی درست رہے اور کوئی مشکل پیش نہ آئے اور عمدگی کے ساتھ نوکروں کی نگہبانی کر سکے یا تیمارداری کی خدمت بجا لائے۔ اپنے شوہر اور اعزا کے مزاج کے مطابق انتظام کرے۔ اور گھر کو شوہر کے لیے مسرت کا گھر بنا دے اور اپنی اولاد کی جسمانی و اخلاقی تربیت اور قوائے عقلی کو مجلّی کرے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک خوبصورت مگر جاہل عورت اپنے خاوند کی

وقعت جان سکتی ہے۔ اور اُسکو خوش رکھ سکتی ہے اور وہ تمام حقوق و فرائض ادا کر سکتی ہے جو
مذہب اخلاق نے اُس پر عائد کیے ہیں اور کیا اُسکی نیکی اصلی اور حقیقی نیکی ہو سکتی ہے۔ یہ
مسلّمہ ہے کہ عزتِ نفس اور عظمتِ روح کی یہی معلم اول ہیں۔ دنیا کی ساری دلچسپیاں ان
ہی کے دم سے ہیں۔ آج کی بچیاں کل کی مائیں ہوں گی قوم کا نصف وجود عدم تعلیم نسواں
سے بیکار ہو جاتا ہے۔ غضب ہے کہ ۹۵ فیصدی مرد اور ۹۹ فیصدی عورتیں خود رو گھاس
کی طرح پیدا ہو کر تعلیمی برکات و فیضان سے محروم رہ کر مٹ جائیں اور احساس تک نہ ہو۔
بھلا کوئی شرک و کفر کی کچھ تمیز نہ ایمان اسلام کی کچھ محبت جو پایا ہانک دیا۔ عورت نے صدہا قبائح یا
اُس کی طرف نسبت قبائح عرفاً موجب ذلت سمجھا جاتا ہے مرد کے صدور سے نہیں۔ اگر
عورت کیلئے معصیت مذموم ہے تو اُسی درجہ میں مرد کے لیے بھی ہے۔ اگر مرد کے لیے توبہ موجب طہارت
و نزہت ہے تو عورت کے لیے بھی ہے۔ شرعاً دونوں برابر ہیں۔ عرفاً متفاوت۔ اس طرح گویا
شرع پر عرف کو ترجیح دینا ہے۔ جس سے اندیشۂ کفر ہے۔ جب کہ علمی فضیلت احادیث صحیحہ
سے ثابت اور نصوص باہرہ سے منکشف و مستظہر ہے پھر طبقۂ اناث کو اس سے محروم رکھنا
صریحاً معصیت کبریٰ نہیں تو اور کیا ہے۔

مسلمانوں کی عجیب و غریب حالت ہے کہ باپ دادا سے جو سن لیا وہی اُن کا مذہب ہے
وہی اُن کا مشرب۔ اُس سے سر مو تجاوز اُن کی رائے میں کفر و الحاد ہے۔ دلیل و روایت کی کوئی
حاجت نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ فرض قضا ہو جائے۔ سنت چھوٹ جائے۔ بعض دفعہ اسلام کی پابندی
کا التزام نہ ہو۔ لیکن مراسم مروجہ سے ہٹنا اُن کے لیے صریح کفر ہے
محل تفحص و تعمق ہے کہ جس ملت عالیہ نے صنف نازک کو تمام دیگر مذاہب عالم سے زیادہ
حقوق عطا کیے ہوں۔ جس مذہب نے "و لهن مثل الذی علیهن بالمعروف"
(جس طرح شوہر کا حق اُن پر ہے اُسی طرح اُن کا حق بھی شوہروں پر ہے) ایک لفظ
مثل سے عورتوں کو وہ چیز دے دی جو تمام کرۂ ارض میں کسی قوم اور کسی شریعت نے
اُن کو نہ دی تھی اور پھر مزید اہتمام و تاکید کے لیے بار بار شوہروں کو "و عاشروهن بالمعروف"
(ان کے ساتھ نیکی و شرافت اور ہمدردی کا سلوک کرو) کا حکم دیا ہو۔ جس دین حنیف نے شوہروں کو

مخاطب کرکے سورۂ بقرہ میں فامساک بمعروف او تسریح باحسان اور سورۂ طلاق میں
ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن کے صریح و مؤکد احکام دیے ہیں اُس کی آج یہ حالت
ہوگئی ہے کہ صنف نازک کو تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے مساویانہ کے بجائے ظالمانہ تعلیم دی جاتی
ہے۔ رسم و رواج کی جکڑ بندیوں سے مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر مساویانہ حقوق کی تقسیم کی جاتی۔
باہم گر ذاتی نفس کی نگہداشت رکھنے کی تاکید ہوتی۔ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتا۔
لتسکنوا الیھا کے مطابق یکساں اُنس و محبت کے ساتھ پُر لطف زندگی بسر کرنے کی سعی ہوتی
بجائے درجہ حاکم و محکوم یا آقا و خادمہ کے یکرنگی اور یک جہتی پائی جاتی۔ تو اُس وقت
شادی ضرور زندگی کا ایک پُر بہار جلوہ کہی جا سکتی اور اس دن سے یقیناً حیات انسانی
کی بہار شروع ہو جاتی۔ دولھن کی آرائشوں سے آخری مقصد ہوتا ہے کہ زمانۂ عروسی
میں نئی نئی آرزوؤں اور تمناؤں کی کثرتِ استعانت سے یکایک قائم ہو جانے والی
سحر کار محبت جدید شوقوں اور ولولوں میں ڈوب کر استحکام حاصل کر سکے اور تصادم
نگاہ کے ساتھ ایک دوسرے کے دل ہاتھوں سے جاتے رہیں اور موافقت و مؤانست
کی وہ شمع جہاں افروز دلوں میں روشن ہو جائے جس کا گُل ہونا ایک دوسرے کی موت
پر مبنی ہو۔ تنہائی کی وہ دلفریب و مضطرب راتیں جن میں تجربہ و تصور کی دست درازیاں
کسی کے قیامت خیز اور تباہ کن شباب کو چھیڑ چھیڑ کر تمناؤں اور آرزوؤں کو رات رات بھر
شبہ بستر دیدۂ شرم و حیا سے دست و گریبان رکھ چکی ہوں مختتم ہو کر آئندہ زندگی کے لیے ایک
نشاط آفریں تمہید عشق ثابت ہوں اور نئی نویلی اور پُر شوق دولھن اپنے حُسن عالم فریب کا
سرور انگیز تماشا دکھا کر دولھا کے دل محبت کوش پر جادو کے ڈورے ڈال سکے۔ مگر یہاں عجیب
حالت ہے نکتہ چیں ہیں کہ یہ تمام ایام عروسی محض جاہلانہ رسمی شرم و حیا کی نذر ہو جاتے ہیں
اور عروسی رفتار و گفتار۔ طنازی و شوخی کا وہ حقیقی برقی اثر جو ان جملہ زینتوں اور آرائشوں
کا اصلی نشاء و مدعا ہے اپنا کام نہیں کرنے پاتا۔ یورپ میں شادی کے بعد دولھا دولھن
ایک ماہ کے لیے کسی پُر فضا مقام پر عشرت اندوزانہ زندگی بسر کرنے کو چلے جاتے ہیں۔ وہاں اُن
دل آرا زوقت کو ہنی مون کہا جاتا ہے اس کا یہی مقصد ہے کہ محبت کی جڑیں مضبوط و عمیق

ہوں۔ افسوس کہ ہم نے ادھر کو نظر انداز کر کے اسلامی شریعت سے سرتابی کی اور جہالت و سہل انگاریوں نے ہم کو طرح طرح کی مراسم کا پابند بنا کر مشکلات و معاصی میں پھنسا دیا ایک تعلیم یافتہ شوہر کے لیے کم از کم اتنی پڑھی لکھی بیوی تو ضرور ہو کہ ملکی معاملات اور بیرونی کوائف میں حقیقی دلچسپی لے سکے اور اگر کوئی پر سوز شعر سامنے پڑھا جائے تو بت کی طرح سرگرم ساکت و صامت نہ رہ سکے۔ بلکہ فرط ذوق سے صدائے آفرین تو منھ سے نکل جائے۔ اخباری دنیا سے ناواقفیت کا پُر استکراہ اور وحشت بار عیب اُس میں نہو۔ اس سے کم لیاقت بیوی کو کم از کم ہم تو صرف ایک مشین اور فراغت بار تفریحی گھنٹوں کا ایک معمولی و غیر دلچسپ مشغلہ خیال کر سکتے ہیں جس کا کام محض بچے جننا اور غلاموں کی طرح رن رات گھر بار کا کام کرتے رہنا ہے۔ انگلستان کے ایک وزیر اعظم نے نہایت درست کہا تھا۔ کہ کسی قوم کے اعلیٰ ترین تمدن کا اظہار اُس قوم کی عورتوں کی عزت و وقعت سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر حیف ہے کہ اس معیار سے ہماری حالت نہایت تنفر آفرین اور پست ہو گئی ہے۔ پروفیسر لیبو نے کیا خوب کہا ہے کہ مرد کی تعلیم اُس شخص کی تعلیم کی مثال ہے جو اپنے بعد کچھ نہ چھوڑ جائے۔ اور عورتوں کی تعلیم آئندہ نسلوں کی تعلیم ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہماری نسلیں جاہلوں کی گود میں پل کر کیا سیکھ سکیں گی۔ اور کیا کر سکیں گی۔ نپولین اعظم کا قول ہے کہ اگر کوئی ملک آزاد ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنی عورتوں کو تعلیم یافتہ بنائے۔ فی الحقیقت یہ قول غایت درجہ زریں اور نتیجہ خیز ہے تاریخ اس کی صداقت پر شاہد ہے۔ اگر مسلمانوں کو ذلیل رہنا ہے غلام رہنا ہے تو جو چاہیں کریں ورنہ جب تک اسلامی خواتین علم و ہنر سے آراستہ نہ ہو لیں گی اقوام عالم میں مسلمانوں کو کوئی درجہ ملنا موہوم ہے۔ ہم مکرر کہتے ہیں کہ اگر صنف نازک کو موقع دیا جائے تو وہ ہرگز کسی مرد سے قصیر و کم نہیں رہ سکتیں گذشتہ کو چھوڑ کر دور حاضرہ پر غور کرو کہ علم و فضل۔ عزم و استقلال ہمت و صولت میں صنف لطیف کیا مرتبہ حاصل کیے ہوئے ہے بیگم صاحبہ بھوپال کی شہرۂ آفاق قابلیتیں اور معروف زمانہ فیاضیاں کسی تعارف و توصیف کی محتاج نہیں۔ مسز بیسنٹ کس بات میں کسی مرد سے کم ہیں۔ کیا آج چھبیسویں نیشنل کانگریس میں آپ پریسیڈنٹ منتخب نہیں ہو چکی ہیں؟

کیا اس وقت ۲۰ آکسفورڈ گریجویٹس کی ذمہ داری اور سا ہم نیابت ان کے سپرد نہیں کی جا چکی ہے؟
کیا اس وقت ہند کی جملہ اقوام میں اُن کا وہی درجہ نہیں جو ایک شمع کو بزم میں اور ایک
تاجدار کو ملک میں حاصل ہوا کرتا ہے؟ کیا دیگر آٹھ مقتدر اور عظیم المرتبت ہستیوں کے مقابلے
میں اُن کا انتخاب اور وہ بھی اس لطیف ہونے کی حالت میں حیرت انگیز اور ہندوستان کی
تاریخ میں یادگار موقع نہیں۔ کچھ نہیں اگر ہم موقع دیں وقت دیں تو ہم میں بہت سی
مسز بیسنٹ پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیا مسز نائیڈو کی سحر خیز فصاحت اور بیگم حسرت کا تحیر افزا
استقلال اس بات کا صریح ثبوت نہیں کہ فطرت نے دونوں فریق میں ایک جوہر ودیعت کیے ہیں
استعمال کرنا نہ کرنا دوسری بات ہے۔ اقوام ہند میں بھی گو جہالت عام ہے مگر مسلمانوں کی حالت
سخت زبوں ہے۔ ہندوؤں میں فی ہزار آٹھ عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ پارسیوں میں فی ہزار ۲۴۶،
برہمو سماج میں ۴۸۰، سکھوں میں ۱۴۔ عیسائیوں میں ۱۳۵ ہیں اور مسلمانوں میں فی ہزار صرف
۴۔ سخت افسوس و حیرت کی جگہ ہے کہ نوم علی علم خیر من صلوٰۃ علی جہل (سلمانی) طالب
العلم بین الجہال کالحی بین الاموات کی روشن ہدایتیں رکھنے والی قوم آج علمی مراتب
میں جملہ اقوام عالم سے پست و ذلیل ہو۔ اور پھر بھی اُس کی آنکھ نہ کھلے۔ اسی عالمگیر جہالت کا
نتیجہ ہے کہ شیر خوار بچوں کی اموات کی کثرت ہے۔ یہ شرح اموات ۱۸۸۱ء تک ۱۵۰ فی ہزار
سے گھٹ کر ۱۹۰۱ء تک ۱۰۵ فی ہزار رہ گئی۔ ہند کے بعض حصص میں ۲۰۰ فی ہزار سے
زائد شرح اموات ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا بدقسمت ملک نہ ہوگا جس میں ہند سے نصف بھی
زچہ خانے کی اموات ہوں۔ یہ سب کچھ مقدر کے نہیں بلکہ اپنی جہالتوں کے ثمرے ہیں۔
برادران ہنود سرعت سے اس جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ میسور میں دس برس سے کالج
نسواں تعلیم دے رہا ہے۔ مدراس میں دو اول سے موجود تھے تیسرا زیر تجویز ہے۔ کلکتہ میں
بہت سے پرائیویٹ کالج ہیں۔ ڈھاکہ میں عنقریب کھولا جائے گا۔ بنارس کے پاس
پہلے ہی سے کالج موجود تھا۔ بمبئی میں زیر غور ہے۔ پروفیسر کاروے کی کوششوں نے
ایک زنانہ یونیورسٹی کی بنیاد بھی پھر ڈال دیا ہے۔ لیکن دیکھیے اس سمندر کی لہریں اپنے
شور سے مسلمانوں کو کس دن بیدار کرتی ہیں۔ اللہ ہمارے خاتون آمنہ میں کب شمع

روشن ہوئی ہے۔ دنیا میں بیدار قومیں دن رات صبح شام ترقیات کی افکار میں سرگرداں ہیں لیکن بستر نکبت سے ہنوز مسلمانوں کا جی اٹھنے کو نہیں چاہتا۔

کرۂ ارض کی بہت سی اقوام مصائب و شدائد کے تازیانے کھا کر اپنی حالت کا احساس کر چکی ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ قوم باوجود صد ہزار گونہ تکالیف و ستم انگیزیوں کے اب تک ہوشیار نہیں ہوتی۔ اور کس گھڑی کا انتظار کر رہی ہے کیا اسرافیلؑ کا صور بیدار کرنے کے لیے پھونکا جائے گا۔

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

شریف احمد مراد

غزل

سرورِ بادۂ الفت فقط ضبطِ فغاں تک ہے
جو سچ پوچھو تو پینے کا مزہ سوزِ نہاں تک ہے

تمھارے دل میں جو کچھ ہے زباں تک آ نہیں سکتا
سبب یہ ہے بڑا ہی فاصلہ دل سے زباں تک ہے

ہمارے سامنے بلبل نہ کر دعوے محبت کا
یہ سارا ولولہ تیرا بہارِ بوستاں تک ہے

کیا جب یاد کا شکوہ تو وہ منہ پھیر کر بولے
ابھی ہم آزماتے تھے تمھیں الفت کہاں تک ہے

جتا نہ دو محبت غیر کو کھل جائے گی حالت
یہ ساری لن ترانی صرف وقتِ امتحاں تک ہے

قدم لیتی ہے اٹھ کر خاکِ مجنوں آج ناقے کی
سماں ہے پُر اثر بیتاب دیکھو ساربان تک ہے

مجھے فریاد کرنے دو نہ روکو کیا یہ کرتے ہو
تمھارے حسن کی شہرت مری آہ و فغاں تک ہے

کہیں کیا بدگمانی کس قدر بے چین رکھتی ہے
یہ سنتے ہیں رقیبوں کی رسائی پاسباں تک ہے

میں اس کے قصہ گو سے سامنا تو کر لوں یہ ممکن ہے
مگر سنتا نہیں اب عشق کی وہ داستاں تک ہے

خیالِ حضرتِ زاہد پہنچتا ہے تو جنت تک
تصور ہے وہی پرواز جس کی لامکاں تک ہے

شرر ہے یاد اتنا قدر دانِ داغؔ کہتے تھے
فصاحت شعر اردو کی اسی شیریں زباں تک ہے

شررؔ کاکوروی

ایک روحانی بھید

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر حضرت سری سقطی علیہ الرحمۃ جن کی وفات بغداد میں بتاریخ ۳۰ رمضان المبارک ۲۵۳ھ واقع ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک رات نامعلوم اضطراب و قلق نے ایسا بیخود بنا دیا کہ نماز تہجد تک اُس رات نہ پڑھ سکا۔ خدا خدا کر کے صبح نمودار ہوئی۔ نماز بامداد ادا کر کے تفریح طبع کے لیے گھر سے باہر نکلا اور ادھر اُدھر ٹہلنے لگا مگر سکون دل نہ نصیب ہونا تھا نہ ہوا۔ آخر حصول عبرت و تنبیہ کے ارادے سے مسپتال چلا گیا الحمد للہ کہ وہاں کسی قدر فرحت میسر ہوئی میں نے وہاں ایک حسین لڑکی پُر تکلف اور معطر لباس پہنے ہوئے دیکھی۔ جو بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی مجھے دیکھتے ہی اشعار عربیہ پڑھنے اور بے اختیار رونے لگی اُس کے اشعار کا مفہوم یہ تھا۔

لوگو! میں حقیقتاً دیوانی نہیں ہوں البتہ بظاہر مست ہوں میں۔ میرا دل ہوشیار ہے۔ میں ایک ایسے دوست کی محبت میں مبتلا ہوں جس کی درگاہ سے سرکشی کرنا جرم عظیم خیال کرتی ہوں۔ مجھے بند کیا گیا ہے حالانکہ کوئی گناہ بجز میری پریشانی آشفتگی و خود رفتگی مجھ کے نہیں پایا جاتا ہیں۔ اپنے پیارے محبوب کی محبت میں گرفتار اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں جس چیز میں میرے لیے نفع و اصلاح خیال کی جاتی ہے وہی چیز حقیقت میں میرے لیے موجب ضرر و فساد ہوتی ہے اور اس کے برعکس عکس جو شخص مالک الملوک سے محبت رکھتا ہو اُس کو کسی چیز کا غم نہیں اور نہ اس کو کوئی چیز ضرر پہنچا سکتی ہے حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ لڑکی کے اشعار سُن کر میرا دل بھر آیا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے وہ لڑکی بھی مجھے روتے ہوئے دیکھ کر یہ کہتی ہوئی بیہوش ہو گئی ... اس وقت تو تو پانی کے آنسو رو رہا ہے لیکن اگر تو دوست کو حق معرفت کے موافق جانتا تو خون کے آنسو روتا۔

جب اُس حالت سے لڑکی کو افاقہ ہوا تو میں نے پوچھا تم نے مجھے پہچانا۔

کنیز۔ جب سے کہ دوست سے واقف ہوئی اُس روز سے کسی چیز سے لاعلم نہیں رہی۔

سریؒ:۔ تم دوست کا ذکر کرتی ہو آخر تمہارا دوست کون ہے۔

کنیز:۔ جس نے مجھے اپنی نعمتوں سے شناسا کیا اور اپنے عطیات سے مجھے سرفراز و ممنون فرمایا۔ جو سبھوں کی دعاؤں کا مجیب اور تمام بندوں کے دلوں سے قریب ہے۔

سریؒ:۔ تم کو یہاں کس نے قید کر رکھا ہے۔

کنیز:۔ حاسد لوگوں نے۔ اتنا کہنے پائی تھی کہ پھر بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کچھ دیر بعد ہوش بجا ہوئے اور اپنے مناسب حال اُس نے نہایت دردانگیز لہجہ میں چند اشعار پڑھے جس سے مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں نے ترس کھا کر ڈاکٹر ہسپتال سے اُس کی رہائی کی درخواست کی۔ اُس نے فوراً اجازت دیدی۔ میں نے لڑکی سے کہا لڑکی اب تم جہاں جانا چاہتی ہو جاؤ تم آزاد ہو لڑکی نے کہا۔

میرے دوست نے مجھے اپنے بعض غلاموں کے ہاتھ میں دیدیا ہے اگر وہ اجازت دے تو البتہ جا سکتی ہوں ورنہ صبر میرا مونس ہے۔

اتنے میں اس کا مالک بھی آ گیا اور افسر ہسپتال سے دریافت کیا کہ تحفہ کہاں ہے ڈاکٹر نے جواب دیا کہ اندر شیخ سریؒ سقطیؒ سے باتیں کر رہی ہے وہ خوش خوش میرے سامنے آیا اور نہایت ادب سے سلام کیا اور بہت زیادہ عزت کی میں نے کہا اے خواجہ مجھ سے زیادہ یہ عورت تعظیم و تکریم کے لائق ہے اُس سے قید کی کیا وجہ ہے۔

خواجہ:۔ یہ دیوانی ہو گئی ہے دور از عقل باتیں کرتی ہے کھانا پینا چھوڑ بیٹھی ہے خود سوتی ہے نہ مجھے سونے دیتی ہے ہمیشہ متفکر اور مہدوق رہتی ہے۔ میری ساری عمر کی کمائی یہی ہے میں نے اس کو بیس ہزار درہم میں خریدا ہے مجھے امید تھی کہ اُس کے کمال کی وجہ سے میں بے حد فائدہ اُٹھاؤں گا۔

سریؒ:۔ اس میں کون سا کمال ہے۔

خواجہ: یہ مطربہ ہے۔

سریؒ:۔ اس کو یہ عارضہ کب سے اور کیونکر لاحق ہوا۔

خواجہ:۔ ایک سال سے زیادہ ہوا۔ ایک روز (عود) کے ساتھ ذیل کے اشعار گا رہی تھی

یکا یک خود بخود پینک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور زار زار رونے لگی۔

وعقلت لانقضت الدھر ابدا — وکدرت بعد الصفو دا

یعنی جو عہد کہ تجھ سے کیا تھا عمر بھر نہیں توڑا اور بدصفائی کے پھول کو مکدر نہیں ہونے دیا

اس روز سے اس کی حالت دیوانگی کے مشابہ ہے اشعار پڑھتی اور روتی رہتی ہے میں نے اسکی حالت کو کسی شخص کی محبت سے تعبیر کیا اور اس پر سختی شروع کی لیکن میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔

سری سقطیؒ :- (تحفہ سے مخاطب ہوکر) کیا در اصل ایسا ہی ہے۔

تحفہ :- اللہ نے مجھ سے پوشیدہ خطاب کیا وہ میری زبان پر جاری ہوگیا۔ دوری کے بعد اس نے مجھے نزدیک کیا اور مجھے مخصوص و برگزیدہ بنایا۔

سری :- خواجہ سے مخاطب ہو کر۔ تو تحفہ کو آزاد کردے اس کی قیمت بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ مجھ سے لے لے۔

خواجہ :- حضور آپ میں اتنی استطاعت کہاں کہ اتنی قیمت ادا فرما سکیں۔

سری :- عجلت نہ کر صبر سے کام لے میں اتنی ہی قیمت تجھے لا کر دوں گا اور تحفہ کو آزاد کراؤں گا۔ شیخ فرماتے ہیں یہ کہکر میں ہسپتال سے باہر نکلا۔ بخدا اس وقت میرے پاس ایک درہم بھی نہ تھا بڑی رات تک تحیر و تضرع نے مجھے سونے نہ دیا۔ بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو کر میں نے دعا کی کہ الٰہی سری کی شرم تیرے ہاتھ ہے اور تو ظاہر و باطن کا حال جاننے والا ہے تو اپنے فضل پر بھروسہ کرنے والوں کو رسوا نہ کر۔ یکایک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی میں نے پوچھا کون ہے۔

آواز :- یکے از دوستانِ تو۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص چار غلام اور ایک مشعلچی ساتھ لیے ہوئے دروازہ پر کھڑا ہے مجھے دیکھ کر اس نے کہا کہ اے سری کیا مجھے اندر آنے کی اجازت ہے۔

اجازت پا کر وہ اندر آیا اور میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور اس وقت یہاں تشریف لانے کا کیا سبب ہے اس شخص نے کہا میرا نام احمد بن مثنی ہے۔ ابھی ابھی مجھے خواب میں آواز سنائی دی کہ جلد پانچ تھیلیاں زر کی سری کو دے جا کر دے تاکہ وہ اس زر سے

تحفہ کو خرید نے کیونکہ تحفہؒ پر ہماری خاص عنایت ہے۔ یہ آواز سن کر میں نے اللہ تعالیٰ کی نعموں پر سجدۂ شکر ادا کیا اور صبح صادق کا انتظار کرنے لگا صبح ہوتے ہی نماز سے فارغ ہو کر مسپتال پہنچا تو ڈاکٹر نے مجھے غور سے دیکھکر کہا کہ آئیے آپ کو خوشخبری ہو کہ بارگاہ ایزدی میں تحفہؒ کا نہایت بلند مرتبہ ہے میں نے کل ہاتف سے یہ آواز سنی ہے اِنَّهَا مِنَّا بِمَكَانٍ لَيْسَ يَخْلُوْا عَنْ نَوَالٍ یعنی ہمارا سوال اس دل والے سے ہے جو عطا سے خالی نہیں ہے۔ جب تحفہؒ کی نظر مجھ پر پڑی تو آبدیدہ ہو کر آسمان کی طرف منھ کر کے کہنے لگی کہ اے دوست آخر تو نے مجھے خلق میں رسوا کر دیا۔ اتنے میں مالکِ تحفہؒ بھی آگیا۔ میں نے ہر چند اسکو معہودہ رقم دینی چاہی مگر اس نے وہ رقم نہ لی۔ اور کہا کہ میں نے خالصاً للہ تعالیٰ تحفہؒ کو آزاد کر دیا اس پر میں نے متعجب ہو کر اس سے دریافت کیا کہ آخر ماجرا کیا ہے اس نے کہا۔ مجھے کل زجر و توبیخ کی گئی اب میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ بِالسَّعَةِ كَفِيْلًا وَّ بِالرِّزْقِ جَمِيْلًا یعنی خدایا تو میرا کفیل رہ اور رزق کی کشادگی میں جمیل۔

شیخ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ وہ شخص یہ بیان کر چکا تو میں نے احمد کی طرف غور سے دیکھا وہ زار زار رو رہا تھا میں نے رونے کا سبب پوچھا اس نے کہا شاید کہ حق تعالیٰ مجھ سے راضی نہیں اس لیے کہ مجھے حکم دیا مگر قبول نہیں کیا اس لیے میں نے بھی اپنی ساری رقم خالصاً لوجہ اللہ تعالیٰ وقف کر دی۔ تحفہ نے جو اس وقت یہاں آگئی تھی دونوں کی تقریر سن کر اپنے کپڑے جو اس وقت اس کے جسم پر تھے اتار دیے اور پرانے ٹاٹ کا لباس زیب تن کر کے رونے لگی۔ شیخ فرماتے ہیں میں نے پوچھا کہ دوست کہو یہ کیا موقع ہے تحفہ نے کہا اس کے قہر سے اس کی مہربانی کی طرف بھاگتا ہوں اور روتا ہوں اس کے قہر سے اس کے لطف کی جانب جانا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر تحفہ بیابان سمت ہوا کی طرح چل دی۔ شیخ فرماتے ہیں اس واقعہ کے بعد میں احمد اور خواجہ تینوں بارادۂ حج گھر سے چلے اثنائے راہ میں احمد کا انتقال ہو گیا صرف میں اور خواجہ دونوں مکہ معظمہ پہنچے جب کہ ہم خانہ کعبہ کے طواف میں مصروف تھے ایک جانب سے کسی خستہ دل والہ کی یہ صدائے جگر خراش سنائی دی۔

مُحِبّ اللّٰہِ فِی الدُّنیا سَقِیمٌ تَطاوَلَ سُقمُہٗ فَدَواہُ دَاءٌ

یعنے اللہ کا دوست رکھنے والا دنیا میں اکثر بیمار رہتا ہے اُسکی بیماری قائم رہتی ہے اور اُسکا علاج بالمثل ہے۔ اس کے بعد چند شعر اور سنائی دیے جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

اُس نے شراب محبت کے جام یکے بعد دیگرے پلائے اور پھر نگہبانی کی یعنی ستان محبت کو حرکات ناپسندیدہ سے روکا شراب محبت سے جب سیراب ہوا تو متحیر ہو کر آسمان کی طرف چڑھا اور علو ذات کی جانب چلا پھر بجز محبوب کے کسی کی خواہش نہیں رہی۔ شیخ فرماتے ہیں کہ جس طرف سے یہ آواز آئی تھی میں اُسی جانب بڑھا۔

ایک قتیل تیغ محبت کو دیکھا جو بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا جب اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو کہا یا سریؒ میں نے کہا لبیک لبیک اُس نے کہا آپ نے مجھے پہچانا۔

سریؒ:۔ نہیں۔

مریض:۔ لا الٰہ الا اللہ۔ افسوس کہ تم نے مجھے بہت جلد بھلا دیا میں وہی تحفہ ہوں۔

سریؒ:۔ تحفہ جب سے تجھے آزادی ملی کیا کیا منافع حاصل ہوئے۔

تحفہ:۔ مجھے اللہ جل شانہٗ نے قرب اُنس بخشا اور اپنے غیروں سے متوحش کر دیا۔

سریؒ:۔ احمد بن مثنیٰ میں اور خواجہ حج کے ارادہ سے چلے لیکن افسوس ہے کہ راستہ میں احمد کا انتقال ہو گیا کیا تجھے معلوم ہے۔

تحفہ:۔ خداوند تعالےٰ نے اُسکو بخش دیا اور اتنے انعامات اور قیمتی اشیا بخشیں کہ دُنیا والوں کی آنکھوں نے اُن کو دیکھا تک نہیں وہ بہشت میں میرا ہمسایہ رہے گا۔

سریؒ:۔ جس نے تجھے آزاد کیا وہ بھی میرے ساتھ یہاں آیا ہوا ہے اس کے جواب میں اُس نے آہستہ آہستہ کچھ دعا کی اور کعبہ اللہ کے مقابل زمین پر گر پڑی اور دم توڑ دیا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ ۝ شعر

جان گئی جان کے جویا کے پاس

پہنچا مریض اپنے مسیحا کے پاس

اسی وقت اُس کا آقا خواجہ بھی آ گیا اور بے اختیار اُس پر مضطربانہ گر پڑا۔ تھوڑی

دیر بعد معلوم ہوا کہ اُس نے بھی دنیا کو خیرباد کہا۔

پیاسے نے دریا سے ملاقات کی
خوب تلافی ہوئی مافات کی

شیخ فرماتے ہیں میں اُن لوگوں کی تجہیز و تکفین اور ادائے صلوٰۃ کے بعد سپردِ خاک کر کے گھر لوٹ آیا۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔ آمین۔

سید احمد شاہ ابن سید بہادر شاہ

غزل

رخِ روشن کے آگے ماند ہیں شمس و قمر دونوں — لب و دنداں سے شرمندہ ہوئے لعل و گہر دونوں
عجب اک کشمکش میں آ گئی ہے جان بسمل کی — ادھر قاتل کا شوقِ دید ادھر ہیں تیغ و سر دونوں
ہزاروں کوششوں کے بعد دل ٹھہرا تھا پہلو میں — مگر اب چار ہونے کو ہیں چشمِ فتنہ گر دونوں
مرے دل اور جگر تو کشتۂ اندازِ جاناں ہیں — حسینوں کی نگاہوں [illegible] دونوں
مریضِ عشق کا ہو چارہ گر یا ناصحِ ناداں — خدا لگتی کہیں گے ہم کہ ہیں شوریدہ سر دونوں
نگاہیں دو بدو ہو کر انھیں شرمندہ کرتی ہیں — کسی کی نیچی نظروں میں دکھاتی ہیں اثر دونوں
دعائے مرگ میری التجائے وصل دشمن کی — نصیبوں سے ہوئی ہیں آج ممنونِ اثر دونوں
مجھے تا قفس سے یہ خبر مل جاتی ہے اکثر — کسی کے عشق کا بھرتے ہیں دم دل اور جگر دونوں
کوئی امید باقی ہو تو ہو کسبِ کمال آساں — برابر ہیں یہاں اہلِ ہنر اور بے ہنر دونوں
نگاہیں مل کے دل کا راز جا کر دل سے کہتی ہیں — خموشی معنیِ وارد کی دیتی ہیں خبر دونوں
نشیلی آنکھیں ساقی کی یہ کہتی ہیں حریفوں سے — کہ خوں آلود کر دیں گی بیاضِ چشمِ تر دونوں
دلِ زاہد پہ ڈورے ڈالتی ہے آنکھ ساقی کی — کریں گی شامِ جنت کا سماں پیشِ نظر دونوں
وہی ہے عارفِ کامل اسی کی آنکھ حق بیں ہے — اگر یکساں دکھائی دیں کسی کو خیر و شر دونوں

کسی کا جذبِ الفت اور دلِ سودا زدہ اپنا
حسن میرے طریقِ عشق میں ہیں راہبر دونوں

حسن گیاوی

ایران میں شاعری کی نشوونما حکومت کے زیرسایہ ہوئی، اس لیے کہ سلاطین و امرا ایران خود شاعر اور سخن فہم ہوتے تھے اور بقائے نام کا ذریعہ ہی شعر کو سمجھتے تھے۔ امرا، اعیانِ دولت اور بادشاہ کی قدردانی کی یہ کیفیت تھی کہ اکثر شعرا کو مدحیہ قصائد پر ہزاروں لاکھوں اشرفیاں انعام دی جایا کرتی تھیں۔

باوجودیکہ عرفی حسب و نسب کے خیال سے نخوت پرست و مغرور تھا لیکن خان خاناں نے اس کے ساتھ جو فیاضیاں محض اس کے کمالِ فن کی بنا پر کیں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ ایک مرتبہ ایک قصیدہ پر ستر ہزار روپیہ عرفی کو خان خاناں نے انعام دیا۔

نظیری نیشاپوری نے حسب الحکم جہانگیر بادشاہ ایک عمارت کے کتبہ کے لیے جب یہ شعر پیش کیا۔

اے خاک درت صندل سرگشتہ سراں را　　بادہ مژہ جاروب رہت تاجوراں را

تو بادشاہ نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگہ زمین عطا فرمائی۔

عہد عالمگیری میں جب نواب جعفر خاں وزیر اعظم مقرر ہوا، مرزا صائب نے یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

دوردستاں را باحساں یاد کردن ہمت است　　ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر مے افگند

تو جعفر نے مرزا کو پانچ ہزار اشرفیاں انعام دیں۔

۱۰۴۴ھ میں شاہجہاں نے آگرہ میں تخت طاؤس کی تیاری کے جشن کے دن ایک مدحیہ قصیدہ پر ابوطالب کلیم کو اس کے جسم کے برابر تلوا کر روپیہ دیا تھا۔

شعرا کو جاہ و منصب بھی عطا کیے جاتے تھے۔ چنانچہ فیضی کو چار ہزاری کا منصب دیا گیا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی ابوالفضل کو دو نیم ہزاری منصب عطا ہوا۔ چونکہ ایشیائی درباروں میں خوشامد کے بغیر کوئی شاعر فروغ نہیں پا سکتا تھا اس لیے شعرا امرا اور بادشاہوں کی تعریف میں اس قدر مبالغہ کرتے تھے کہ بسا اوقات ان کی تعریف میں [illegible] نہایت گستاخی ہوتی تھی جیسا کہ فیضی [illegible] بادشاہ کے فرمان کو قرآن سے تشبیہ دیتا ہے۔

اصحاب چساں مصحف از اصحاب ستانند گہ نیتم از احباب بہ تعظیم نشاں را

اس صلہ میں نظیری کو ایک ہزار روپیہ ایک گھوڑا اور ایک بیش بہا خلعت عطا ہوا تھا۔ شاہزادہ مسعود ابن سلطان محمود جب خراساں سے غزنین آیا تو قریب قریب تمام شعرا نے قصائد تہنیت پیش کیے چنانچہ اس موقع پر اکثر شعرا کو بیس بیس ہزار اور عنصری کو پچاس ہزار درہم عطا کیے گئے۔

غفاری رازی کو سلطان محمود کے دربار سے ہر قصیدہ پر ایک ہزار اشرفیاں مقرر تھیں۔

مولانا جمال الدین جب سلطان محمد تغلق کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر گئے جسکا مطلع تھا۔

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطان را

تو سلطان نے فوراً روک دیا اور کہا کہ بس میں دوسرے شعر کا صلہ دینے سے عاجز رہوں گا۔ یہ کہہ کر اس قدر اشرفیاں منگوائیں کہ مولانا کے برابر ڈھیر لگا دیا۔ مولانا بیٹھے ہوئے تھے کھڑے ہو گئے۔ سلطان کو یہ ادا نہایت پسند آئی اور قد آدم اشرفیوں کا انبار لگا دیا۔

دانش مشہدی کو دارا شکوہ نے اس شعر پر ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مے می تواند شد چرا گوہر شود

یہ سب کچھ تھا لیکن فارسی شاعری کی عظمت و شان اسی مدح سرائی سے برباد ہوئی اور شاعری وہ شاعری نہ رہی۔ جذبات، معاملات اور حسن و عشق کی مؤثر کیفیات کا خاتمہ ہو گیا ذریعہ اظہار کمال کیے بجائے لالچ اور طمع کی خواہش سے فارسی شاعری ذریعہ معاش بنی اور پھر کرتے کرتے گداگری کے درجہ تک پہنچ گئی۔ ایک مرتبہ نظیری نے خان اعظم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر درخواست کی کہ میری زاد راہ کا انتظام کر دیا جائے اسی طرح اکثر شاعر شعر گوئی کے ذریعہ سے چیزوں کی درخواست کیا کرتے رہتے تھے۔

برخلاف اس کے عرب کے شعرا ایرانی شعرا کی طرح حاکم وقت کی مدح میں قصیدے

کمینا مار سمجھتے تھے، وہ زر و مال اور گدائی کے خوگر نہ تھے بلکہ وہ ایک فاتح، ایک سپہ سالار، ایک
جنگ آزما اور صاحب تیغ و قلم ہوتے تھے عربی شاعر اپنے اشعار میں وہی کہتا تھا جو خود کر چکا
ہے۔ اس کے چند منظوم الفاظ کے مقابلہ میں طبل جنگ بیکار ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک شعر سے
فوج میں وہ جوش پیدا کر دیتا تھا جو بڑے سے بڑا سپہ سالار بھی اپنی للکار سے نہیں کر سکتا
تھا۔ عرب میں قوم کی باگ ایک شاعر کے ہاتھ میں رہتی تھی، وہ جس طرف چاہتا تھا اپنے
رزمیہ اشعار سے قوم کا رخ بدل دیتا تھا۔

عمرو بن ہند عرب کا ایک مشہور تخت نشین گذرا ہے۔ ایک دن اس نے اپنے دربار
میں مقربین سے کہا کہ کیا عرب میں کوئی ایسا ہے جو میری بارگاہ میں گردن نہ جھکائے؟
درباریوں نے کہا کہ شاہی عمرو کلثوم شاعر، اگر وہ کا مطیع ہو جائے تو پھر کسی کی
مجال نہیں جو سر اٹھا سکے اسکے رجزیہ اشعار زبان تک۔ بچہ بچہ کی زبان زد ہے۔

حضرت عثمان علیہ السلام کے خون کی دہائی دیکر جب حضرت عائشہ صدیقہ
جناب امیر معاویہ سے معرکہ آرا ہوئیں تو اثنائے جنگ میں قریب تھا کہ ان کی فوج
شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ لیکن قبیلہ ضبہ کے ایک شاعر نے ان کے اونٹ کی مہار
پکڑ کر یہ اشعار پڑھے۔

نحن بنو ضبة اصحاب الجمل　　الموت احلى عندنا من العسل
نعي ابن عفان باطراف الاسل　　ردوا علينا شيخنا ثم بجل

یعنے ہم قبیلہ ضبہ کے لوگ ہیں ہم کو موت شہد سے زیادہ میٹھی معلوم ہوتی ہے ہم عثمان کی
موت کی خبر برچھی کی زبان سے سنانے ہیں۔ ہمارے شیخ کو ہمیں دیدو پھر کوئی جھگڑا نہیں
ان اشعار پر سپاہ دلیر ہو گئی اور لڑائی کا رخ بدل گیا۔

جب خلیفہ عبد الملک نے عمر بن ابی ربیعۃ القریشی شاعر سے اپنی مدح کے لیے کہا،
تو اس نے جواب دیا کہ میں عورتوں کی تعریف کرتا ہوں نہ کہ مردوں کی۔

ولید جیسا بادشاہ جس نے اسپین سے ترکستان تک فتح کر لیا تھا، اور جس کے
مقابلہ کا دوسرا شخص بنو امیہ میں کوئی نہیں گذرا۔ اس نے ایک مرتبہ جمیل نامی شاعر سے

کہا کہ کچھ اشعار سناؤ۔ ولید کا منشا یہ تھا کہ اشعار میری مدح میں ہوں لیکن جمیل نے اپنی شان میں یہ شعر کہا۔

انا جمیل فی السنام من معد　　فی الذروۃ العلیا والرکن الاشد

ولید جمیل کا کچھ نہ کر سکا۔

غرض کہ عرب شعراء نے شاعری کو قوت روحانی اور جذبات صحیحہ سمجھکر اس کا استعمال جائز طور سے کیا۔ اور اس سے بڑے بڑے مفید کام نکالے۔ اگرچہ عرب کی شاعری اکتسابی شاعری نہ تھی بلکہ فطری شاعری تھی اور اسی لیے ابتداً اس میں ردیف و قافیہ کی پابندی نہ تھی بلکہ طرفین میں سے جس وقت دو فریق ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے اُس وقت دونوں فریق کی زبان سے فخریہ کلمات نکلتے تھے اور وہی اُن کے خیال کے بموجب شعر تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی فقرے کلام موزوں بن گئے اور بتدریج ردیف و قافیہ کی پابندی ہونے لگی۔

ثبینہ کے آغاز عشق میں جمیل نامی شاعر کہتا ہے۔

واول ما قاد المودۃ بیننا　　بوادی بغیض یا ثبین سباب

عام قاعدہ ہے کہ ہر پیکر حسن کے رخسار تاباں حالت غضب میں سُرخ ہو جایا کرتے ہیں یہی سرخی اپنے دامن رنگیں میں التہاب و احتراق کا وہ اثر رکھتی ہے جو برق جہاں سوز میں بھی نہیں ہو سکتا شاعر اسی کیفیت کو بیان کرتا ہے یعنی کہ شروع میں محبت جس ادا نے پیدا کی اے ثبینہ وہ تیرا غصہ تھا۔

آگے چل کر اسی عاشق کا جوش محبت جب حد صبر و تحمل سے بڑھ جاتا ہے تو باد نسیم سے کہتا ہے۔

ھبی لی نسمۃ من ریح بثن　　ومنی بالھبوب الی جمیل

اے نسیم بوئے ثبینہ کا کوئی جھونکا لا دے۔ اور جمیل پر اتنا کرم کر کہ ثبینہ کی طرف سے نکل کر اُس کی جانب آ۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے

حبیبٌ لیس یعدلہ حبیب　　وما لسواہ فی قلبی نصیبٌ

ایک دوست ہے جس کا دوستوں میں نظیر نہیں　　اور بجز اُسکے میرے دلمیں دوسرے کو دخل نہیں

حبیبٌ غاب عن عینی وجسمی — وفی قلبی حبیبٌ لا یغیبُ

ایک دوست ہے جو میری آنکھ اور بدن سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن میرے دل میں ایک دوست ہے جو دور نہیں ہوسکتا!

عرب کی اصلی شاعری اگرچہ اسلام سے پہلے شروع ہو کر خود اسی کے زمانہ تک ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد بھی اسکا جو اصلی رنگ تھا وہ تخت وحکومت یا مال و زر کی طمع سے بدل نہ سکا کیونکہ عرب کے شعرا کے ضمیر میں حقیقی حریت وآزادی کا مادہ تھا۔ گو اس زمانہ میں عربی حکومت کا دارالخلافہ بغداد قرار دیا گیا تھا اور اس سے عرب وعجم کے رسوم وعوائد کے اختلاط پر جو اثر پڑا اس نے عربی شعرا کے تخیلات میں ایک گونہ انقلاب پیدا کیا۔ لیکن نہ اتنا جتنا کہ ایرانی شعرا مال وزر کی طمع سے متاثر ہوئے۔ اس کے ثبوت میں ولید جیسے بادشاہ کے مقابلہ میں [illegible] کو دیکھیے جو اس کا ہمعصر تھا۔

حافظ امام الدین

غزل

بتکدے میں بتِ کافر ترا جلوا دیکھا — ہم نے اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھا

اپنی آنکھوں سے شبِ غم یہ تماشا دیکھا — منھ کو آتے ہوئے سو بار کلیجا دیکھا

جو رقیبوں نے کہا اس سے سنا محفل میں — جو مقدر نے دکھایا وہ تماشا دیکھا

اپنے دل ہی میں وہ ہم دیکھ رہے ہیں سب کچھ — تم نے جو جلوہ [illegible] دیکھا

اہلِ محشر ہوئے یوں دیکھ کے تم کو بیخود — حشر کے دن بھی نہ دیدار کسی کا دیکھا

دمِ گلگشت چمن ہم سے وہ ڈر کر بیٹھے — چاندنی رات میں زلفوں کا جو سایا دیکھا

وہی کعبہ میں ہے اے دل وہی بتخانہ میں — ہم نے تو دونوں جگہ ایک ہی نقشا دیکھا

سیکڑوں سجدے کیے اے بتِ کافر ہم نے — جس جگہ ایک ترا نقشِ کفِ پا دیکھا

کھل گئی آنکھ جو آغوش میں پکڑا کیا کیا — اس نے لوٹا ہوا [illegible] دیکھا

سر کو دھنتا ہے کبھی ہاتھوں کو ملتا ہے کبھی
کیا وفا تو نے پھر اس شوخ کا جلوہ دیکھا

وفا [illegible]

جلوۂ پیہم

رموں میں یوں ہی ازخود فسیا جینے سے بانا اُں؟ — تمھارے جلوۂ پیہم کی ہوتی ہے اجتماعکیا؟

ایک خمار ہے جو کم ہو کر اور تیز ہوتا ہے اک نشہ ہے جو ترشی ہی سے بڑھتا ہے۔ اک کیفیت ہے بیان سے باہر، اک یاد ہے ہر وقت رہنے والی، اک خیال ہے دل میں چٹکیاں لینے والا، کھٹک ہے پُر لطف، کسک ہے پر کیف۔

غرض فرصت جب کبھی ملتی ہے وہی خیال سودا ہوتا ہے، فرصت نہیں ملتی ہے تو بار ہا تے ہی کام چھوڑ کر تھوڑی دیر عالم خیال کی سیر ہوتی ہے، اس پر سے ضروری سے ضروری مشغولیت قربان کیونکہ

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے — بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

سالانہ امتحان کو صرف چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ حساب کی خامی بہت کچھ پوری کرنی ہے، ہر قسم کے خیالات دماغ سے نکال کر اقلیدس کے مقابلے پیش تھے کہ اسی کتاب پر یہ شعر لکھا ہوا نظر آیا

شبِ ماہ تھی چاندنی کا سماں تھا — بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

یہ شعر نہ تھا مرقع تھا ایک دل کش یاد کا، ایک اشارہ مبہم، ایک پُر اسرار خاموشی، ایک طلسم حیرت، اس میں معلوم نہیں کہاں کی تاثیر تھی کہ دماغ ایک دفعہ کام سے معطل ہو گیا اقلیدس کی شکلیں کیڑے مکوڑے بن گئیں۔ میں تھا اور بیہوشی، یاد آ گیا جو نہ یاد آتا تھا۔ آنکھیں بیقرار تھیں دل پریشاں اور میں حیران،

برسات کی چاندنی ایک تو یوں ہی مشہور ہے لیکن اس لطف کو کچھ سرخوشان کیف شباب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ایک پوری نیند کے بعد پلنگ کی سفید چاندنی پر سے

نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل
وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا

نگاہ [illegible] کی نورانیت اور ماہ تمام کا شباب دیکھنا ہی دل میں جذبات سے

پیدا کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن اپنے ہی پہلو میں اُسی نورانیت کے عکس میں اُسی جوان چاند کے سامنے، وہ تصویر خموش و ساکن، مجسمۂ حسن و شباب تھی جس کی خموشی میں فغانِ تمنا، جس کے سکون میں تحریک بیتابی، جس کے تنفس و تموج میں دعوت مبہم، جس کے خزینۂ شباب پر خود اُسی کا بایاں ہاتھ سرور و تقاضائے دل کا اعلان کر رہا تھا۔ اُس وقت بے خودی میں ایک کج خلقی کے ساتھ اس عیش لطیف کو فنا کر دینے کی خواہش ظلم کے ساتھ مملکت حسن و شباب پر جبر و حکومت کی خواہش کے ساتھ، غیر متحرک اور خاموش لبوں کو اذیت لطف پہنچانے کی خواہش کے ساتھ، آلام و افکار دنیا اور ہنگام زائی جذبات کی طرف سے مطمئن اور بے خبر چشم و دل کو اپنا شریک حال بنانے کی بیجا خواہش کے ساتھ، دل کو دل کے قریب رکھکر تاکہ اُس کی بیتابی اس کے سکون کو مٹا دے۔ گلاب کی ناشگفتہ کلی یعنی لب نازک کی سی لطیف شے کے نشۂ عیش میں خلل انداز ہوا اور صرف ایک پیام تھا جس میں محبت و قدر دانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ آنکھ بھی کھل گئی جس کا بند رہنا بھی غضب ڈھا رہا تھا، چہرہ کے آثار ایک چشم زدن میں ہونٹوں کی دکھلا کر ایک خوشگوار متانت، ایک پُر لطف تبسم کے ساتھ بشاش ہو گئے۔ اور ایک دبی ہوئی انگڑائی کے بعد لطف و تشکر نے مبہم اشارات کو صاف کر دیا۔

باہمہ دعوئے تمکیں نتوانی خواست زمن | کہ نوازش پذرہ بر آگی و برجا باشم
جلوہ او نہ گزارد کہ بہرہ بہرہ ز وصل | ہمہ صبح و ہماں محو تماشا باشم

الفرید علیشن

کلامِ اکبر

میں کیا کہوں اُسے اور کیا کروں گلا اُس کا — مجھے ہنوز پتا ہی نہیں ملا اُس کا
سال شوق سے کرتا تھا میں اطاعتِ نفس — اب اُسکا جبر ہے مجھ پر یہ ہے صلا اُس کا
اگرچہ دل کو ہے سودا اُسے بُرا نہ کہو — کسی کی زلف سے ملتا ہے سلسلا اُس کا

علم پر گو غرور بیجا ہے — جاہلوں سے ہے اجتناب روا

[illegible] کر خود رکھنا غیروں سے جھک کے ملنا — ایسا جو ہو تو جائز ہے اُس سے رک کے ملنا

ہے عالمِ فطرت پیشِ نظر آیاتِ الٰہی ظاہر ہیں
غافل جو رہیں نابینا ہیں انکار کریں وہ کافر ہیں

اکبر الٰہ آبادی

انسانِ کامل

(چینی ہادی کنفیوشس کے خیالات کی جھلک)

[illegible] ہمارے ہیں آپ [illegible] — اپنا ذمہ دار ہر سود و زیاں میں آپ ہے
[illegible] ہر انساں میں — اور ترقی و تنزل اُن کا ہے امکان میں
[illegible] آسماں سے کم نہیں — عالم اُس کا بندہ ہے وہ بندۂ عالم نہیں
اُسکو [illegible] خوب و زشت — اب وہ کرے جیسی چاہے اپنی فطرت اور سرشت
جا [illegible] — آسمانی قوتیں آجائیں گی خود ہاتھ میں
[illegible] — دوسروں کی بھی یوں ہی اصلاح کر سکتا ہے وہ

یہ درستیِ طبائعِ عام مخلوقات کی — تربیت گویا ہے ہر ہر جزو موجودات کی
سب کہ ہو حسنِ عمل جلوہ طراز کائنات
کیوں نہ ہو انسانِ کامل وجہِ نازِ کائنات۔

ارشد تھانوی

اطواق الذہب

کیا سنائیں ہم تمھیں نیرنگیِ عالم کا حال — ہے کتاب اک جام۔ اس میں دیکھ لو تم جم کا حال
آئینہ حالِ سکندر ہے۔ عیاں رستم کا حال — ہست اس جا۔ ہر عروجے را زوال......

غافلو انجام کی تم کو خبر کچھ بھی نہیں — مال کیا اور کیا مآل مال و زر کچھ بھی نہیں
آرزوئے زر سے حاصل جز ضرر کچھ بھی نہیں — عشرتِ دنیا ہے نیرنگِ خیال.........

مال و زر پایا جو تو کہ میں تو اس پہ کیا غرور — بار ہو سکتا نہیں یہ تم اگر ہو بے شعور
آدمی بننا اگر چاہو تو ہے کوشش ضرور — چاہیے کسبِ ہنر کسبِ کمال.........

ایک جا بیٹھے ہوئے کیوں شکوۂ قسمت کرو — ہاں اٹھو چل پھر کے دیکھو کوشش و ہمت کرو
فکر کی زحمت اٹھاؤ سعی کی عادت کرو — سعی کا انجام ہے جاہ و جلال.........

بات شیریں ہوتی ہے شیریں تر از قند و نبات — بات شیریں ہوتی ہے شیریں تر از آبِ حیات
خلق سے تو سب سے مل کر سب سے تو نرمی سے بات — خلق سے پیمانہ کر رنج و ملال.........

غیر اپنے ہو گئے شیریں ہوا گر اپنی زباں — دوست ہو جاتے ہیں دشمن تلخ ہو جس کی زباں

اپنے قابو میں نہ ہو غصے میں۔ وہ کیسی زباں　　کرنہ بیہودہ تو ہر گز قیل وقال ....

نیکیوں سے دل لگاؤ تم یہ عادت خوب ہے　　نیک ہو یا بد اُسے نیکی بہت مرغوب ہے
نیک ہو جو شخص اک عالم کا وہ محبوب ہے　　نیک ہے محبوبِ ربِّ ذی الجلال ....

کچھ کرو فکرِ تجارت تم میں غیرت ہے اگر　　یا ہنر سیکھو کوئی منظور راحت ہے اگر
کچھ نہ کچھ کرتے رہو فکرِ معیشت ہے اگر　　کاہلی سے ہے تمہارا خستہ حال ....

کیجے احساں مفلسوں پر پاس دولت ہے اگر　　بیکسوں کے کام آؤ تم میں ہمت ہے اگر
اے ذہین خستہ جاں تم میں مروت ہے اگر　　خاطرِ احباب کا رکھو خیال ....

سید غلام مصطفےٰ ذہین

فلسفۂ محبت

(انگریزی نظم سے ماخوذ ہے)

چشمۂ شیریں ہوا دریا سے جا کر ہمکنار　　اور دریا جستجو سے بحر میں ہے بے قرار
غنچہ و گل سے نسیمِ صبح اٹھلا کر ملی　　پھول کی نکہت نسیمِ صبح سے جا کر ملی
جس کو دیکھو دلربا سے اپنے ہم آغوش ہے　　آہ! پھر محبوب میرا مجھ سے کیوں روپوش ہے

ساحلِ دریا سے پھر موجیں حسیں ملنے لگیں　　آہ پھر الفت کی شمشیریں بہم چلنے لگیں
مہر نے بھیجی فلک سے پھر شعاعوں کی لڑی　　کرہ کی چوٹی میں ہو بافت زری ہو کر پڑی
پھر زمیں پر جلوہ ہائے آسماں پڑنے لگے　　مہر کے انوار ذرّوں پہ نگیں جڑنے لگے
ماہ کی تنویر نے بوسے سمندر کے لیے　　منہ صدف کھولے ہوئے ہے اپنا گوہر کے لیے

غنچہ و گل مسکرائے ٹہنیاں ہلنے لگیں　　پتیاں گلشن میں جھک جھک کے گلے ملنے لگیں

آہ میں فرقت زدہ کیوں موردِ آلام ہوں

اور ابھی تک آرزوئے وصل میں ناکام ہوں

محمود اسرائیلی

عندلیب

ہو چمن میں کیا بیاں سوزِ نہاں عندلیب　　میں کہاں سے لاؤں اے باسطؔ زبانِ عندلیب

کان دھر کر تو سنے گر شاہدِ گل کی طرح　　خندۂ غنچہ سے ملے داستانِ عندلیب

چاک ہوں رنگیں گریباں لب پہ نالے گرم ہوں　　وہ تو شانِ گل ہے لیکن یہ ہے شانِ عندلیب

غیر ممکن ہے کہ کر ڈالے نہ دامن چاک چاک　　جوشِ گل سے گر سنے کوئی فغانِ عندلیب

گرم بازاری چمن میں آتشِ گل کی کہاں　　رنگ لایا ہے مگر سوزِ نہانِ عندلیب

آبِ شبنم سے بھرے ہیں ساغرِ گل جا بجا　　سوکھ کر کانٹا ہوئی پھر بھی زبانِ عندلیب

گل کو توڑا تو نے گلچیں جان پر اسکی بنی　　گل میں تھی شاید چھپی روحِ روانِ عندلیب

برق کو اہلِ چمن بدنام کرتے ہیں عبث　　آشیانہ خود بتاتا ہے نشانِ عندلیب

توڑ نا گل کو! نہ اے گلچیں خدا کے واسطے　　کیونکہ روحِ گل سے وابستہ ہے جانِ عندلیب

عشق کی افتاد سے آئی قفس میں باغ سے　　بن گیا صیاد ظالم پاسبانِ عندلیب

ذکر یہ باسطؔ میں یوں ہی حشر تک کرتا رہوں

کوئی گر دگر سنے مجھ سے بیانِ عندلیب

باسط بسوانی

غزلیات

حضرت محشر لکھنوی

نہ پوچھو کیفیت زخمِ جگر کی — نشانی ہے کسی بیداد گر کی
حیاتِ مختصر چھٹ کر کسی سے — بسر کی اور بہر صورت بسر کی
دیا خط اور رو رو یہ سمجھ کے — یہیں تک زندگی تھی نامہ بر کی
میں اپنی خانہ بربادی پہ خوش ہوں — وطن سے کم ہیں ایذائیں سفر کی
فراقِ روح و تن ہے باعثِ وصل — خبر مل جائے گی اُس بے خبر کی
جوابِ اشکِ غم تارے تو ٹوٹے — اب آگے جو خوشی ہو چشمِ تر کی
خدا رکھے مرے زخمِ جگر کو — حقیقت دیکھ لی تیرِ نظر کی
ہوئے ہم زندۂ جاوید مر کے — کرامت ہے نگاہِ فتنہ گر کی
قیامت کر گیا افسانۂ طور — حقیقت کھل گئی اہلِ نظر کی
نکالا جزوِ روح ایک ایک آنسو — حیاتِ ہجر یوں ہی مختصر کی
ہوئے پروانے خاکِ شمع میں دفن — بڑے کام آئی محنت رات بھر کی
صدا نکلی یہ شہ رگ سے دمِ ذبح — دُہائی ہے کسی بیداد گر کی
جہاں ٹھہرا سمٹ آیا زمانہ — خدائی ہے ترے شوریدہ سر کی

خموشی سے سلامت ہے یہ دُنیا
قیامت ہوگی محشر آہ اگر کی

حضرت بیخود موہانی

صدمے زمانے بھر کے جب [illegible] گزر گئے — زندانِ آب و گِل کے گرفتار مر گئے
تنگیِ قفس کی۔ دل کی تڑپ دام کی گرفت — ان سب کی کشمکش ہی میں مر مر کے مر گئے
ہم کیا بتائیں بزمِ تمنا کی واردات — آئے تھے با حواس مگر بے خبر گئے

اجزائے دل کا نام تھا ہستی کائنات　　　وہ کیا مٹے جہان کو برباد کر گئے

پھر مل سکیں نہ قوت اسیری کی بیڑیاں　　　ہاں اڑ کے تا بہ بام مرے بال و پر گئے

جھلکا ہے ذرہ ذرہ میں میری وفا کا رنگ　　　دل کے لہو میں غنچے ہاتھ بھر گئے

اب وہ مچل رہے ہیں مگر ٹوٹ ٹوٹ کر

کل تن میں سانس بن کے جو نشتر اتر گئے

حضرت دل شاہجہانپوری

دل خاک میں ملا جو نہ مٹتا کوئی دن اور　　　کرتے ترے ملنے کی تمنا کوئی دن اور

مر مر کے محبت میں ہے جینا کوئی دن اور　　　دیکھیں گے ابھی ہم یہ تماشا کوئی دن اور

پھر ذوق خلش مشغلۂ حسرت دل ہے　　　کرنا ہے ہمیں خون تمنا کوئی دن اور

ہشیار کہ ہے نشۂ غفلت قلق افزا　　　کر لیجیے شغل مے و مینا کوئی دن اور

اے دشمن دل دیکھ بہار گل و ریحاں　　　زینت ہے ترا عشوۂ بیجا کوئی دن اور

کہتا ہے یہ باہم نظر و دل کا تعلق　　　کھٹکے گا ابھی خار تمنا کوئی دن اور

ممکن تھا کہ تسکیں کا پہلو نکل آتا　　　سینہ میں اگر درد نہ اٹھتا کوئی دن اور

بیکار ہے محشر میں ترا وعدۂ فردا　　　آنے کو ہے اس دن کے سوا کیا کوئی دن اور

معلوم ہے جن کو ترے وعدے کی حقیقت　　　ہے ان کی نگاہوں میں یہ دنیا کوئی دن اور

چل دی ہے اجل تک مرے بالیں سے یہ کہہ کر　　　رہنا ہے ابھی ممنون مسیحا کوئی دن اور

ہر زخم دل قیس کے لب پر یہ صدا ہے　　　سرسبز رہے دامن صحرا کوئی دن اور

کچھ شغل تو ہو گرچہ یہ بے سود عمل ہے　　　اس در پہ رہو ناصیہ فرسا کوئی دن اور

مانا کہ ہے بیم مری ہمت کے خلاف　　　ہمت کا ہے بیم یہ تقاضا کوئی دن اور

جاؤ تم سے کہ اس تن میں ہیں دم توڑنے والے　　　اچھا ہے نہیں آپ مسیحا کوئی دن اور

دنیا میں جفا ورنہ ہوتے اگر اے دل　　　ہوتا نہ مرے عشق کا چرچا کوئی دن اور

حضرت رعب قریشی انصاری

اے ہستیِ موہوم ہے بقا کے لیے — نوید عیشِ ابد جانِ مبتلا کے لیے

ہوس پرست بھی مرنے لگے خدا کے لیے — ادا تمہاری کھلونا ہوئی قضا کے لیے

تری جفائیں سلامت کہ جستجو بھی نہیں — محلِ حسرت کی سرمایۂ وفا کے لیے

نگاہِ گرم کی تکلیف کیوں کرے کوئی — مری تپش ہے بہت برقِ ماسوا کے لیے

ہوئے ہم آپ سے بیگانہ پھر بھی یا قسمت — تڑپتے ہیں کبھی بیگانہ آشنا کے لیے

خجل کریں مرے ہمدرد چارہ سازوں کو — یہ ننگ بھی سہی اک دردِ بے دوا کے لیے

رخِ یقیں سے کہیں اٹھ چکے حجابِ گماں — کہ ابتدا مری بیکل ہے انتہا کے لیے

بغل میں ایک دل آزار دوست رکھتے ہیں — کسی کے حوصلۂ جورِ ناروا کے لیے

طلسمِ زلف سے نکلے بھی دل تو جائے کہاں — جگہ بھی ہو کہیں اس محشرِ بلا کے لیے

نہیں تو ننگِ خلائق ہیں اے عطائے ازل — تلاش کس کی ہے حرمانِ مدعا کے لیے

دبی زبان سے ہمدرد! مژدۂ بیداد — ارے سپہر نہ سن لے کہیں خدا کے لیے

ہم اور فغاں کا مبدل بہ خامشی ہونا؟ — تہیہ کرتے ہیں تمہیدِ التجا کے لیے

نوید وصل یہ پیغامِ عجز فریب نہیں — بہانہ چاہیے صبرِ گریز پا کے لیے

ادھر تو دیکھئے! کیوں ضبط شیوہ ہائے ستم؟ — وفا ہے مضطربِ اندازۂ جفا کے لیے

مرے ہی دم سے ہیں بیتابیوں کے ہنگامے — کہ درد پھر نہ ملے گا کہیں دوا کے لیے

حرم نشینوں میں رعب اور یہ کفر کی باتیں!
بتوں کا تذکرہ؟ مردِ خدا! خدا کے لیے

حضرت باسط بسوانی

عبرت فزا زمانے کا نقش و نگار ہے — باقی مزار ہے نہ نشانِ مزار ہے

پیری کے دور میں جو دل داغدار ہے — گویا خزاں کے دور میں رنگِ بہار ہے

اُس چشمِ مست ناز کا عالم نہ پوچھیے ۔۔۔ دیکھا تھا ایک روز ابھی تک خمار ہے

دم ہے لبوں پہ۔ جینے کی اُمید دل میں ہے ۔۔۔ تھوڑی سی زندگی کا بڑا اعتبار ہے

اے اہلِ غم بتاؤ کہ رو دوں کہ یا ہنسوں ۔۔۔ لے دے کے ایک اپنا چراغِ مزار ہے

تم اور ربطِ غیر سے - میں مانتا نہیں ۔۔۔ میری قسم نہ کھاؤ - مجھے اعتبار ہے

کم تیر سے نہیں ہے تمھاری نگاہِ شوخ ۔۔۔ کچھ دل میں رہ گئی ہے تو کچھ دل کے پار ہے

پامال کر چکے مری تربت تو کیا ہوا ۔۔۔ میری طرف سے دل میں ابھی تک غبار ہے

کیا لطف دے رہے ہیں اسیری میں داغِ دل ۔۔۔ مجھ سے جو پوچھیے تو قفس میں بہار ہے

بادِ صبا بچاتی ہے دامن چراغ سے ۔۔۔ کس دل جلے کا یہ ترے در پر مزار ہے

صیاد میرے زخمِ کہن پھر ہرے ہوئے ۔۔۔ دل کہہ رہا ہے آمدِ فصلِ بہار ہے

جامہ دری کا مجھ سے سبب ہمنشیں نہ پوچھ ۔۔۔ دنیا یہ جانتی ہے کہ فصلِ بہار ہے

لکھتا ہے چشمِ یار کے مضموں نئے نئے
باسطؔ اسی سے شاعرِ جادو نگار ہے

سید اللہ بخش صاحب ادیبؔ

حیرت سے کسی کو تک رہا ہوں ۔۔۔ گویا کہ کسی کا آئینہ ہوں

حیرت مری آئینہ ہے میرا ۔۔۔ تصویر میں اپنی بن گیا ہوں

کیا پوچھتے ہو ثبات میرا ۔۔۔ میں بحرِ فنا کا بلبلا ہوں

پایا نہ کبھی کسی نے مجھکو ۔۔۔ نکلا نہ کبھی وہ مدعا ہوں

ہوں شورشِ دل کا بانیِ حسرت ۔۔۔ ہنگامۂ نالۂ رسا ہوں

غم بھی ہے خوشی میں میری مضمر ۔۔۔ میں صورتِ زخم ہنس رہا ہوں

ہے نقشِ حباب میری ہستی ۔۔۔ میں اپنے میں آپ ہی فنا ہوں

عالم میں آ کے جب ہوا یہی تو میں

پروردہ حسرت جینا ہوں

حضرت رنجور عظیم آبادی

پلا دو چار جام بادۂ گلرنگ سائل کو — خدا آباد رکھے پیارے ساقی تیری محفل کو

ڈبو یا تو نے اے طوفانِ غم اک کشتیِ دل کو — کہ جب میں دیکھتا تھا سامنے آغوشِ ساحل کو

کسی صورت جدائی کی یہ شب کاٹے نہیں کٹتی — گلے کیونکر لگائیں ہم نہ اب شمشیرِ قاتل کو

چمن میں سیر کو کس گل بدن کی آمد آمد ہے — یہ ہے آج انتظام اے باغباں [illegible] کا

یہ جاتے تو ہو خوش خوش مگر ہے احتیاط اتنی — کہیں بیتاب کر دینا نہ میرے گریہ دل کو

میں اپنی مشکلوں کو مشکلیں رنجور کیوں سمجھوں؟

اسے آساں ہے حل کرنا مری ہر ایک مشکل کو

حضرت [illegible] جعفری بریلوی

دل میں پھر درد محبت کا گزر ہوتا ہے — اے جگر منت کا جھگڑا درد سر ہوتا ہے

ہم نے چاہا جسے افسوس وہ اپنا نہ ہوا — لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے

موت بھی گھات میں ہے وہ بھی سراپا میں موجود — دیکھیں یہ معرکہ کس طرح سے سر ہوتا ہے

لے کے دل بوسہ کی تکرار یہ کہنا ان کا — دیکھو دیکھو انہی باتوں سے تو شر ہوتا ہے

دل بھی بیتاب جگر کے بھی ہیں ٹکڑے ٹکڑے — کچھ عجب شوخ نگاہوں میں اثر ہوتا ہے

حال دل ان سے بیاں کر کے بھلا کیا لیں گے — ایسی باتوں کا بھلا ان پہ اثر ہوتا ہے

دل ہے آمادۂ فریاد جگر بھی بیتاب — کچھ عجب درد محبت میں اثر ہوتا ہے

ایک بوسہ پہ مری جان یہ بخل یہ ملال — کوئی اس طرح بھی آمادۂ شر ہوتا ہے

نرگسی آنکھوں پہ ان کی نہ مرو دیکھو [illegible]

ان کا بیمار ادھر الله [illegible] ادھر ہوتا ہے

اگر وہ اپنی مصیبت کو دفع کرنے کی خواہش کرتا ہے تو قبولیت کی امید نہیں۔ مگر
خلق کی جانب رجوع ہونا چاہتا ہے تو اس کا کوئی راستہ نہیں پاتا۔ اگر
شرعی اجازتوں پر عمل کرتا ہے تو سزا پاتا ہے۔ اس کے جسم و دل پر علائق مسلط ہو
جاتے ہیں۔ اگر وہ گناہ کرنا چاہتا ہے تو معاف نہیں کیا جاتا۔ اگر بلاؤں پر صبر و شکر کرنا
چاہتا ہے تو یہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کا نفس پگھلنے لگتا ہے اس کی
خواہشیں مر جاتی ہیں۔ ارادے اندر ہی مٹ جاتے ہیں۔ تمام چیزوں کی ہستی
مٹ جاتی ہے یہ حالت اس کی دائمی کر دی جاتی ہے بشریت کے اوصاف و
شرائط فنا ہو جاتے ہیں صرف روح رہ جاتی ہے پس اس وقت وہ اپنے
قلب سے یہ پیام سنتا ہے۔ ارکض برجلک ھذا مغتسل بارد و شراب۔
(اپنے پاؤں سے زمین کو ٹھوکر دو تمہارے نہانے اور پینے کیلئے ٹھنڈا پانی حاضر ہے)
پھر وہ تمام نعمتیں جو اس کو پہلے حال میں ملی تھیں مزید فضیلت کے ساتھ عنایت ہوتی
ہیں اور حق سبحانہ و تعالیٰ اس کی تربیت خود فرماتا ہے

فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین
(کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے)
ان دونوں آیتوں کا لطف حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں آتا ہے۔

(۴۲)

ما سوا اللہ کی محبت یا رجوع

جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو چاہتا ہے یا اس کی جانب رجوع ہوتا ہے اس کا
سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو پہچانتا نہیں اور قوت ایمانی و صبر کی کمی ہوتی ہے۔
جو شخص غیر اللہ سے رجوع نہیں ہوتا اس کی معرفت مکمل ہے اور محبت و قوت ایمانی
و صبر بلند ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ شرم کرتا ہے۔

(۴۳)

قبولیت یا عدم قبولیت دعا

رب العزت اگر اپنے بندہ کے کسی سوال کو پورا نہیں کرتا تو یہ از راہ شفقت ہے تاکہ غرور غالب نہ آجائے اور نفس کی کمر پر ٹوٹ کر آداب خدمت سے غافل نہ ہو جائے۔

(۲۴)

شناخت حالات ابتلا

جو ابتلا عقوبت و مقابلہ کے طور پر ہو اس کی علامت یہ ہے کہ بلا پر صبر نہ ہو گھبرائے خلق سے شکایت کرتا پھرے۔ یہ قہر الٰہی ہے۔

جو ابتلا گناہوں کے کفارہ اور کمی کیلئے ہوتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ صبر جمیل اطمینان طاعات میں مستعدی یہ رحم الٰہی ہے۔

جو ابتلا کہ درجات کی بلندی کے لئے ہو اس کی علامت یہ ہے کہ اس وقت بھی حکم خدا کے انہی حکموں سے خوشنودی موافقت نفس کی طمانیت حاصل ہوتی ہے یہ انعام الٰہی ہے۔

(۲۵)

خوف فنا سے آزادی

جو آخرت چاہتا ہے اس کو دنیا کا زہد اور جو اللہ کو چاہتا ہے اس کو عاقبت کا زہد اختیار کرنا چاہئے۔ جب تک بندہ کامل خواہشات میں آلودہ ہوگا جیسا کہ حکومت دولت ریاست نکاح اور ان کی خواہش باقی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے دروازے اس پر کبھی وا نہیں ہوتے۔

مکمل جنتوں سے اندھے بن جاؤ کسی کو پیش نظر رکھو تمامی توجہات اپنی توحید سے بند کر لو اور ان کو اپنے یقین سے پھر اپنی فنا سے پھر اپنے وجود سے پھر اپنے علم سے مٹا دو تب اپنی چشم سر سے خدا کو دیکھو گے جس کے بعد پھر خوف فنا سے آزاد و بلند تر ہو جاؤ گے

(۲۶)

نفس کی زندگی و موت

جس قدر بندہ نفس کو مجاہدات کی تلوار سے ہلاک کرتا ہے اور اس پر غالب آ جاتا ہے رب العزت اس کو زندہ کرتا رہتا ہے وہ اپنے جگہ سے

کا حرام و مباح خواہشوں اور لذتوں کا مطالبہ کریگا تم اس کے ساتھ پھر
مجاہدہ اور مقابلہ کروگے، یہاں تک کہ تم جہاد میں فتحیاب ہو۔

سرور کائنات کا ارشاد ہے "جعلنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر"

ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی جانب لوٹتے ہیں

ہر مومن اس پہ مامور ہے کہ جو چیز اس کے سامنے آئے، اس پہ غور کرے
اس وقت تک کہ اس کی مباح و جائز ہونیکا اس کو یقین نہ ہوجائے، منافق
حرام و حلال کی پرواہ سے بے نیاز ہے"

خاتمہ

میرے عزیز دوستو! اس کے مطالعہ سے کیا کوئی گرمی قلب میں محسوس
ہوئی؟ اگر ہوئی ہے تو پھر خدا کے لیے تم بھی معرفت سے بہرہ ور ہونیکی کوشش
شروع کرو۔

خوب یاد رکھو دنیا اسی وقت درست ہوگی جب اُسے دین کے
کے زیور سے آراستہ کروگے۔ ورنہ دنیا اور دین دونوں سے محروم
رہنا یقینی ہے۔

میں اور تم بلاشک آج اولیاء اللہ سے نہیں مگر ہم کو چاہئے کہ ہم ان
سے محبت رکھیں حضرت عمر بن الفارض رضی اللہ عنہ نے کیا خوب

فرمایا ہے،

وانا نرجو کل خیر بحبهم وادخالنا فیهم بتلك المحبة

ہم کو ان کی محبت سے ہر طرح کی بھلائی کی امید ہے کہ اسی محبت کے باعث ہم بھی ان میں داخل کر لئے جائیں۔

موت کا کوئی اعتبار نہیں ممکن ہے یہی سانس تمہارا آخری ہو، مہلت کو غنیمت سمجھو اور اللہ سے قربت ڈھونڈو،

اچھا رخصت ہوتا ہوں

سید ظفر حسن علوی ابن سید احمد حسین علوی

ناظم دائرۃ الادب دہلی

مسکن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۶ء یوم جمعہ

کیا آپ کو پری جمال کی آرزو ہے!

اور آپ نے اس کو اب تک نہیں دیکھا ہے۔ تو آج ہی پیسہ کا کارڈ لکھ دیجیے۔

پری جمال صابن

حسن و خوبصورتی پیدا کرنے اور چہرے کی رنگت صاف کرنے میں بے نظیر ہے۔ صرف سات روز ملکر نہانے سے کالا رنگ نکلا ہوا چہرہ گلاب کی پنی کے مانند خوبصورت اور مخمل کے مانند ملائم ہو جاتا ہے۔ خاص حکیم صاحب کی ایجاد ہے چہرے کے تمام مہاسے۔ داغ دھبے چھائیاں دور کرکے خوشنما بنا دیتا ہے۔ اکثر نوابوں۔ راجاؤں اور رئیسوں اور ان کی بیگماتوں نے اسکو نہایت ہی پسند کیا ہے۔ بلحاظ خوبصورتی۔ خوشبودار فوائد کے اپنی نظیر آپ ہے۔ فی بکس تین ٹکیہ مع ایک فیشن ایبل صابن دانی صرف عہ

پری بہار ہیر آئل

سر میں لگانے کا خوشبودار تیل جو اپنی نفاست اور خوشبو اور فائدوں میں لاجواب مانا گیا ہے بالوں کو خوشنما بنا دیتا ہے انکے استعمال سے بال لمبے اور ریشم کی طرح ملائم ہوتے ہیں۔ اسکی خوشبو لاجواب ہے فیشی ۱۰ تولہ ایک روپیہ (عہ)

پتہ حکیم محمد یعقوب خاں دواخانہ نورتن دہلی۔

ہماری دہلی ہندوستان کا صدر مقام ہے!

اور تجارت کی منڈی ہے۔ ہر قسم کی چیزیں یہاں سے دنیا بھر میں جاتی ہیں۔ دہلی سے عمدہ و نفیس مال منگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کی آپکو ضرورت ہو۔ بتہ ذیل پر فرمائش [illegible] ہر علم و فن کی چیزیں بلا تکلف منگائیے

عمدہ و نایاب کتابیں

یادگار دہلی

اس کتاب کے دیکھنے سے دہلی کے مفصل حالات مع نقشہ جات اور مشہور مقامات و زیارت گاہیں اور جو جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں سب درج ہیں۔ فی جلد ۱۰/

کرکٹ گائیڈ مع کھیل ٹنس فٹ بال

اسمیں کرکٹ وغیرہ کے عمدہ قاعدے تحریر ہیں اس کے موافق مشق کرنے سے چند روز میں کھیل آجاتے ہیں فی جلد مجلد ۲/

چاندی کے نفیس زیورات

بٹن چاندی کرتہ زنجیردار

چاندی کے چار بٹن ایک سنہری زنجیر لگے ہوئے بٹنوں میں نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے فی سیٹ عہ

بٹن چاندی قمیص یا کرتہ

چار بٹن پھولدار پاکیزہ بنے ہوئے فی سیٹ عہ قمیص کے گلے کے ہاتھوں کے [illegible] بٹن فی سیٹ [illegible]

سونے کی ناک کی کیل

یہ کیل خالص سونے کی بنی ہوئی [illegible] خوبصورتی بے حد لاجواب ہیں خاص حسن کا نمونہ [illegible] درجہ اول [illegible] درجہ دوم عہ

پتہ ایچ محمد یوسف خاں منیجر شہرت ایجنسی دہلی فراش خانہ

اپنے بچوں کو دانت نکلنے کی تکلیف سے بچائیے

کیونکہ دانت نکلنے کی تکلیف سے زیادہ بچوں کے لیے کوئی چیز سخت نہیں۔ آپ بھی اپنے لخت جگر کے لیے

ہارپر صاحب کا سوتھنگ سرپ

منگائیے۔ اسکو صرف سوڑوں پر ملا جاتا ہے جس سے مسوڑے نرم پڑ جاتے ہیں اور دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔ آنکھوں کا دکھنا۔ بخار کھانسی۔ پیاس۔ معدے کی خرابیاں وغیرہ یکدم دور ہو جاتی ہیں کیونکہ سرپ کے ملتے ہی مسوڑے نرم پڑ جاتے ہیں۔ ذائقہ اچھا ہے اس لیے بچے اسکا استعمال پسند کرتے ہیں۔ کوئی نشہ آور یا نقصان کرنے والی چیز شامل نہیں ہے

ہارپر صاحب کے سوتھنگ سرپ سے بچے اور ماں باپ میٹھی نیند سوتے ہیں"

پرچۂ ترکیب استعمال ہمراہ ملے گا قیمت فی شیشی خورد ۱۲؍ بڑی علاوہ محصولڈاک۔ اگر فائدہ نہ ہو تو ہم پوری قیمت واپس کر دیں گے آج ہی لکھیے۔ اور چاہے جس زبان میں خط و کتابت کیجیے۔

ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ دوکاندار صاحبان غرضکہ ایجنسی بذریعہ خط و کتابت طے کر سکتے ہیں۔

Imperial Chemical Co P.O. Box 351 Calcutta

سول ایجنٹ امپیریل کیمیکل کمپنی (۱۰) پوسٹ بکس ۳۵۱ کلکتہ

مفت

آٹھ آنے کا ناول مفت

مفت

پُراسرار قلعہ

ایک بدن میں سنسنی ڈالدینے والا حیرت انگیز ناول۔ جنوں بھوتوں کی اور سائنس کا کرشمہ۔ پیچ در پیچ خوفناک عجیب اسرار۔ یہ ناول رسالہ گلشن کی سالانہ خریداری پر مفت ملتا ہے۔ گلشن علمی ادبی تواریخی ظریفانہ مضامین نظم و نثر کا ماہواری گلدستہ جنوری ۱۹۳۰ء سے اپٹوڈیٹ جاری ہے جس پر ۳۰ اخبارات نے شاندار ریویو کیے ہیں چندہ سالانہ عہ ششماہی ۱۲؍ نمونہ ۲ ۰ مع محصولڈاک۔ حوالہ اخبار ضرور دیجیے۔ پتہ منیجر رسالہ گلشن۔ لاہور۔

حکیم عبدالقوی صاحب۔ لکھنوی

مراد آباد کی ایک خاص خبر

قابل توجہ ناظرین کرام

اشتہار کتب قابل دید

نوٹ۔ کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس۔ کے برمن کی تیار کردہ ۱۳۱۵ھ(?) کی کافوری جنتری نہایت خوبصورت اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور بلا قیمت و محصول ڈاک قدردانوں کے پاس بھیجی جاتی ہے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ پر دس متفرق جگہ کے خوش خط لکھے پڑھے اشخاص کے نام اور پورا پتہ لکھ کر بھیجدیجیے۔ جنتری بواپسی ڈاک آپ کی خدمت میں روانہ کردی جائے گی۔

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی کان بہنے کی دوا

کان کا بہنا یعنے کان پک کر اسکے اندر سے مواد کا نکلنا۔ نیا ہو یا پرانا اس دوا کے استعمال سے فوراً ہی آرام ہو جاتا ہے۔ اس علاج میں چونکہ کان کو اندر سے دھو کر اس میں دوا ڈالنی پڑتی ہے اس لیے پچکاری کی بھی ضرورت ہوتی ہے

قیمت فی شیشی (۴؍) چار آنہ۔

پچکاری کانچ (۴؍) محصول ڈاک (۵؍)

ڈاکٹر برمن کا جوہر پپرمنٹ

یہ غالباً سب ہی لوگ جانتے ہونگے کہ معمولی درد شکم میں جوہر پپرمنٹ کو استعمال کرتے ہیں مگر بازار کے جوہر میں دوسری چیزیں ملی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ پورا نفع نہیں کرتا ہے یہ پپرمنٹ کا خالص جوہر جاپان کے ایک مشہور کارخانہ سے تیار کرا کے منگوایا گیا ہے اور اس لیے آدھے چاول کے برابر پان میں رکھ کر کھانے سے منہ کی بدبو پیٹ کے درد اور ریاح کو دور کر دیتا ہے کافور اور جوہر پپرمنٹ برابر حصوں میں تیل میں ملانے سے اور وہ تیار شدہ تیل کنپٹی میں لگانے سے درد سر کو دور کرتا ہے ہتھیلی میں تھوڑا سا جوہر ملا کر درد کی جگہ مالش کرنے سے درد کو فوراً آرام ہو جاتا ہے

قیمت فی شیشی ۶؍ محصول ڈاک ایک تا چار تک ۵؍

ڈاکٹر ایس کے برمن ۵۰ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

[illegible] رسالہ [illegible] صاحب

ایڈیٹر صاحب رسالہ [illegible] لکھتے ہیں [illegible]

[illegible] اپنے رسالہ میں بہت سے اشتہار [illegible]

[illegible] ڈاکٹر برمن صاحب [illegible]

[illegible] سال [illegible]

[illegible] ۱۹۱۴ عیسوی [illegible]

[illegible] کان بہنے کی دوا [illegible]

[illegible] ثابت ہوئی [illegible]

[illegible] محصول ڈاک ۵؍ [illegible]

زندگی کی بہار

نظام عالم اور انسان کی زندگی پر غور کرنے سے بے شمار نتائج نکلتے ہیں۔ یہ کھلی بات ہے کہ چاند سورج۔ آسمان۔ زمین۔ سب کا موضوع ہے۔ ع

"تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری"

غالباً "بغفلت نخوری" کے بجائے "بعزت بخوری" بجا ہوگا۔ مذہب جو ہمیشہ سے انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ دخیل رہا ہے دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس کے لیے پاکیزگی خیالات اور طہارت نفس کے ذریعے سے زندگی کی سہولتیں بڑھاتا ہوں۔ اور دنیا اور عقبیٰ دونوں میں آرام اور تسکین مہیا کرتا ہوں۔ تہذیب بلند ہمت اسی میں مصروف ہے کہ جہاں تک ہو سکے انسان کو ہر قسم کی آسایش کے وہ سامان عطا کر دوں جو عالم بالا والوں کو بھی نصیب نہ ہوں۔ دولت۔ صنعت۔ لٹریچر سب اسی دھن میں ہیں کہ ہمیں جنت بنا دو۔ دل اور دماغ دونو قومیں اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی ہیں کہ تکلیف کا نشان باقی نہ رہے اور ہر طرف چین ہی چین نظر

گئے۔ ذرہ ذرہ پکار کر انسان سے کہہ رہا ہے ع رخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ البتہ اس سلسلۂ
راحت کو توڑنے والے دو چار ایسے بد نصیب سامان موجود ہیں جن سے انسان کی عقل عاجز
آجاتی ہے اور دنیا دار المحن معلوم ہونے لگتی ہے۔ موت سے بھاگ کر کہاں جائیے۔ ہزاروں
بیماریاں پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ نفع ہے تو نقصان بھی ہے۔ پیدا ہوا ہے تو مرے گا بھی۔
جوانی کی ترنگ ختم نہیں ہونے پاتی کہ بڑھاپا ملاقات کا کارڈ بھیج دیتا ہے خیر ان باتوں کا تو انسان
عادی ہو ہی گیا تھا مگر دوسری چیزوں سے علاوہ جو چیز بہت تکلیف پہنچا رہی ہے وہ بے شمار
ریفارمروں کی بے تکی ہدایتیں ہیں زندگی کی بہار کا ناس کئے دیتے ہیں۔ حضرات ریفارمر کی سنیئے
کہ ایک صاحب شد و مد سے کہتے ہیں کہ سمبل بالکل مٹا دو یعنی انسان کی زندگی کو رنگینی اور
پوئٹری سے بالکل معرا کر دو۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ شاعری کا نام نہ لے یعنی لطافت نفس
کیفیت اور چاشنی بالکل میٹ دی جائے خیر یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا کہ مرد لباس اور تمدن میں
سادگی اختیار کرے بعض صاحب یہاں تک بڑھے ہیں کہ عورت زیور بالکل چھوڑ دے گوٹا
کناری۔ ریشمی لباس۔ چوڑی مہندی سب اپنے اوپر حرام کرے۔ یہ لوگ فطرت انسانی سے کس
قدر ناواقف ہیں! خدا تو کہتا ہے کہ زندگی میں بہار پیدا کرو مگر یہ صاحب تحت الثریٰ سے عرش
اعظم تک خزاں خشکی۔ ریت۔ اور کنکر پتھر بھرنے چاہتے ہیں۔ خدا ان سے ناراض اور بندے
ان سے نالاں ہیں۔ ہم اس مضمون میں مختصر طور پر زندگی کی بہار کے جائز ذریعوں کا ذکر کریں گے
اور ثابت کرنا چاہیں گے کہ زندگی کا اعلیٰ مقصد اور نجات کا بہترین مفہوم بھی بہار ہے۔ خدا سے
چلئے، مذہب بتاتا ہے کہ ذات مطلق بیچون و چرا این و آن سے منزہ سبحانہ تعالیٰ عما یصفون
کے مصداق بحث میں تمکن تھی۔ اپنے کمالات کا ظہور منظور ہوا کن سے یک لخت سینزوں کی طرح آناً فاناً
میں یہ سب باغ بہاری موجود کر دی۔ نور پیدا کیا اور اسے اپنی ذات کا آئینہ بنایا پھر عرش کرسی۔
لوح و قلم۔ آسمان زمین غرض سب کچھ پیدا کیا اور ان کو اپنے جمال کا عکس مقرر فرمایا۔ یک میں ذات
کی روح پھونکی تو دوسرے پر صفات کے نقوش رنگین کھینچے۔ پھر کمال یہ کہ نہ وہ اس سے جدا نہ یہ
اس سے۔ اجزار کائنات کا شمار اور ان کی خاصیتوں اور خصوصیتوں کو کون جان سکتا ہے۔ لا
احصی ثناءً مگر پھر بھی جب چیز چیز کو نظر غور سے دیکھا جائے تو اس میں ایک سلیقہ۔ خوش اسلوبی۔

آن کمال۔ پوئٹری یعنی رنگینی دکھائی دیتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ یہ جلوہ گری ہے بھی تو اسی کی جو منبع کمال مخزن جمال۔ سر بسر بہار۔ ہمہ تن رنگینی ہے۔ وہی دیکھ رہا ہے اور وہی دکھا رہا ہے۔ ؎

دل سے مانگے ہے تمہیں شمع طلسم حیرت   آئینہ خانۂ عالم میں تماشا تم ہو

عالم بالا سے شروع کرو۔ علی العرش استویٰ شان کو غور کرو۔ ہر چند ہمہ سے بالکل باہر ہے مگر یا عظمت کیا کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ عرش اعظم ہے۔ ملائکہ جو بہ حسن لطافت مجسم ہیں اس کے حامل ہیں۔ ہر چہار طرف یہی لطافت ہے۔ بے شمار ملائکہ تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ ایک کیفیت ہے جس میں مگن ہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ سراسر کیفیت و رنگینی ہے۔ جلال و جمال کا بہترین مفہوم بلکہ اس سے بھی آگے ہی ہے۔ ذرا آسمان کو غور فرمایئے۔ چاند۔ سورج۔ ستارے۔ مختلف رنگ یہ ساری دھوپ چھاؤں۔ ہر کیا بتاتی ہیں؟ وہی بہار و رنگینی۔ اب زمین پر اتر آیئے۔ جنگل پہاڑ۔ دریا۔ درخت۔ چرند۔ پرند۔ یہ سب قدرتی باجے ہیں جو پاکیزہ سروں میں بہار اور رنگینی کا نغمہ گا رہے ہیں ع کوہ و صحرا و درختاں ہمہ در تسبیح اند۔ دور نہ جایئے۔ حضرت انسان ہی کو لے لیجئے۔ سب کا اتفاق ہے کہ یہ "اشرف المخلوقات" ہے۔ بہترین مظہر ذات و صفات ہے۔ ذخیرۂ رموز نیچر کی پاکٹ بک ہے۔ روح ہے۔ عقل ہے۔ حواس ہیں۔ جلال ہے۔ جمال ہے ؎

یہی نقشہ ہے یہی رنگ ہے سامان ہے یہی   یہ جو صورت ہے تری صورت جاناں ہے یہی

انسان میں اس پر لطف تقسیم کو ملاحظہ فرمایئے۔ ایک مرد ہے ایک عورت چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اپنے اپنے کمال و جمال میں یکتا۔ دونوں اس سرچشمۂ لطافت سے فیض یاب۔ ان دونوں کے خمیر میں بعض اجزا مشترک ہیں بعض غیر مشترک۔ طبائع کا قوام کچھ اس طرح ڈالا گیا ہے کہ مرد عموماً کاروباری طبیعت والا محنتی۔ روپیہ پیدا کرنے والا۔ کسی قدر سخت مزاج اور عادت والا۔ ذرا روکھا بنایا ہے۔ عورت عموماً بھولی۔ محبت والی۔ جان تک فدا کرنے والی۔ نرم دل۔ بردبار اور لطیف طبیعت بنائی گئی ہے۔ زندگی کی گاڑی میں ان دونوں کو جوت دینے سے عجب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مرد جسمانی یا دماغی محنت کر کے روپیہ پیدا کرتا ہے تو عورت گھر کو سلیقہ سے رشک جنت بناتی ہے۔ سامان راحت بہم پہنچاتی ہے۔ محبت و نرمی کی وہ چاشنی ملتی ہے کہ مزہ آجاتا ہے۔ مرد کے مشاغل کس قدر سخت اور روکھے ہیں۔ مگر عورت کی شرکت سے اس کی

زندگی میں رنگینی اور بہار نہ ڈالی جائے تو دنیا وبال ہو جائے۔ جب فطرتاً خدا نے مرد کو افزائش لطف زندگی کے لیے بنایا ہے تو جس حال میں دنیا وما فیہا سب اسی انسان کی خدمت اور امداد کیلئے بنے ہیں تو ہماری رائے میں تہذیب اور ہر مذہب کا فرض اعلیٰ یہ ہونا چاہیے کہ اس بہار کو ترقی دینے کے سامان مہیا کرے۔ سب سے ضروری چیز جو اس اہم کام کے انجام کے لیے اللہ نے بندوں کو عطا فرمائی ہے وہ محبت ہے اسی بارود سے یہ آتشبازی چھٹ رہی ہے۔ یہ چاشنی نہ ہوتی تو کیک ایک کو کھاجاتا۔ ماں باپ کا اولاد سے تعلق۔ بھائی بہنوں میں محبت۔ عزیز و اقارب اور دوستوں میں رشتہ مودت پھر اسکی مراعات اور ان کی بدولت ہزاروں مشکلات سہولتیں یہ سب کچھ اس عشق کی ہی بدولت ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کُل کائنات عشق کی ہی بدولت ہے مگر اس قدر تو ہر غور کرنے والے کو معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تین چوتھائی چلت پھرت یا مصروفیت صرف اسی کے صدقہ میں ہے۔ مذہب میں بھی کم و بیش اسی قدر حصہ عبادات اور اعمال حسنہ کا محبت الٰہی کے طفیل ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ جو چیزیں عشق کے مادے کو تحریک دیتی ہیں کیا وہ۔ کھری پھیکی۔ خشک۔ کریہ اور مسائل ریاضی کی طرح نپی تلی دو اور دو چار کی مصداق ہیں یا حسین جمیل۔ رنگین۔ حلاوت بخش۔ روح دار اور پوری طرح سے بھری ہوئی ہیں۔ کون اس سے انکار کر سکتا ہے۔ واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ شق دوم میں بیان کیا گیا ہے پھولوں کا خوش رنگ ہونا اور ان کی بھینی خوشبو اچھی معلوم ہوتی۔ صحن چمن کی فرحت آبشار کی کیفیت۔ بادآورد رخوں کا نظارہ مرغان خوش الحان کے چہچہے کیسے دل کو بھلے معلوم ہوتے ہیں یہ چیزیں میسر ہوں تو لطف زندگی ہے۔ خبر بھی نہیں ہوتی کہ دن کہاں آیا اور رات کہاں گئی طبیعت پر لطف ہو تو اپنا آپ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دوست احباب سب اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ الغرض ساری دنیا اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر ظرف ذرا اچھا ہے اور جسمانیات اور نفسانیات کا غلبہ کم ہونے پایا تو یہی بہاریں خدا تک پہنچا دیتی ہیں۔ سالک سے تو لگ جاتی ہے انسانوں میں آئیے تو

اٹھائے صورت کو مرکز جمال ٹھہرا دیا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

[illegible] نقش [illegible] زنانہ گفتند جا بجا ب یہ سب

زبردستی کھوتے ہیں۔ ؎

جگہ کس کس کو دو دل میں تیرے ہاتھوں اے اقبال ۔۔۔ کنایہ کو چھری کو بانکپن کو خنجر کو پیکان کو ۔

اس حسن صورت اور قیامت ڈھانے والے حدود اربعہ کے ساتھ دل کس قدر پیارا بنایا ہے۔ عورت بالطبع محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہے ہزار برس کا تجربہ بتاتا ہے کہ ظاہر ہے کہ یہی محبت کرنا عورت ہی کا خاصہ ہے سمجھدار لوگوں نے عورت کی جائز قدر کی ہے اور اس کے حسن و صورت و سیرت دوبالا کرنے کے لیے نرم اور رنگین لباس ۔ پھول ۔ عطر سندور ۔ جواہرات سب اس کے پاس لکھے کر دیئے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر عورت حیات انسانی کے ہر رمکے میں بشرت کو خنگی اور نامعقولیت کو فتح کرے اور وہ خوش نصیب نوگ جسے آنکھوں پر بٹھائیں اور اسکی صحیح تمکین ان کے لیے دنیا کو نمونہ جنت کر دے سبحان اللہ کیا نعام الٰہی ہے۔ مصرعہ

کافر شود آن کس کہ بانکار برآمد

عورتوں کے زیوروں کی مخالفت کرنی یا ان کے لیے ٹاٹ اور مارکین داخل قانون کرانا جیسا ہمارے بعض بیفا مردوں کو شاید پسند ہو کس قدر ظلم کی بات ہے۔ آگے چلیے باوجود عشق کی ۔۔۔ چاشنی کے باوجود فضا قدرت کی رنگینی کے اور باوجود گھر بار کی اس بہار کے جو عورت کے دم سے قایم ہے۔ زندگی کے بعض مشغلے انسان کو پریشان کر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ باوجود اپنی ہر آن کی نت نئی نیرنگی کے وخالی ورزہ ہو کر مزا دینا کم کر دیتا ہے۔ انسان ٹھہرا جدت پسند یہ سویا ہوا پن اسے انگریزی میں مونا ٹونی کہتے ہیں اکھرتے کیونکہ اس نیچرل ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کچھ تو مذہب نے اور کچھ دنیاوی عقلمندوں نے رسمیں وضع کی ہیں جو وقتاً فوقتاً جدت اور تازگی پیدا کرتی رہیں۔ کہیں عیدیں تازگی پیدا کر جاتی ہے تو کہیں ہولی بسنت سے نچا جاتی ہے۔ عیسائیوں میں بڑا دن جان ڈال جاتا ہے وغیرہ وغیرہ پھر شادی غمی اور میل محبت کی جتنی رسمیں مختلف ملکوں میں جاری ہیں وہ بلاشک متذکرہ بالا سوال پر مبنی ہیں۔ گو عمدہ ہیں یہ رسمیں ہوتی ہیں۔ ملکوں میں ہوتی ہیں غابران رسمیں ۔ زندگی اور تمدن ملکہ تسلط و مملکت کا بھی جزو لاینفک ہیں۔

دنیا کا ہر بڑا واقعہ اپنے اندازہ قدر و منزلت کے موافق سکون حیات کو متحرک کرتا ہے۔ جسکا نام

رسم ہے۔ اب فرمایئے کس رسم کو چھوڑیں کسکو نہ چھوڑیں جن لوگوں کی آرزو یہ ہے کہ اہل دل سے کی موت نہ مریں اور انسانوں کی زندگی میں تلخکامی کے اجزا اجتماع نہ ہو سکے نہ آنے دیں وہ تو ایسے بیہودہ رسموں کا قلع وقمع کرنے پر غالباً راضی نہ ہوں گے۔ فضول رسمیں فضول خرچی کی رسمیں جاہلانہ رسمیں۔ ان رسموں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ افلاس کے دور کرنے کی کیا یہی تدبیر ہے کہ چھ آنے چار پائی میں نکاح ہو جائے۔ کوڑیوں کے اندر مردہ دفن ہو جائے۔ صاحبوں اور بارگیروں کی وردیاں مرد اور عورتوں کو پہنادی جائیں پتھر اور لوہے کے دو چار برتن گھر میں ہوں فرش کی اوّل تو ضرورت ہی نہیں قالین وغیرہ تو فضول خرچی ہے صرف پائنیر اخبار کے کاغذ بچھے ہوں؟ کیا ہمارے بعض ریفارمر ایسا ہی چاہتے ہیں؟ توبہ توبہ اور اس قسم کے سب مشورے حیات انسانی کی بہار کو خراب اور برباد کرتے ہیں۔ کوتاہ بین لوگ انہیں افلاس و نکبت کا باعث سمجھتے ہیں حد یہ نہیں کہ اصلی سبب جفاکشی کا نہ ہونا۔ جہالت اور بے عزتی کی محنت سے روپیہ پیدا کیا جائے تو چوبیس گھنٹے میں چوبیس رسمیں بھی مضر نہیں۔ ایک بڑا لطف اس بات میں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ہمارے بعض ریفارمر پرانی رسموں اور پرانی باتوں کو معاف کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ وہاں اس بات کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ خود کس قدر نئی رسموں اور نئی باتوں میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔ عورتوں کا تو زیور تک آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ مگر حضور یہ کالر نکٹائی اور انگریزی جوتوں کی جو پلٹن کی پلٹن حضور کے ساتھ ہے یہ تو مفلسی پیدا نہیں کرے گی؟ ہمارا تو چھٹے چھ ماہی کا مولود شریف پڑھوانا یا مجلس عزا آپ کو ناگوار معلوم ہوتی ہے مگر حضور کے ہاں جو یہ آئے دن فی پارٹی کھیل کود ہزاروں نئی طرح کی لغویات ہوتی رہتی ہیں ان کا کچھ مضایقہ نہیں بصاف کیوں نہیں فرماتے کہ رسمیں چھوڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ پرانی رسموں کو چھوڑ کر نئی رسموں کو اختیار کرو۔ خیر اس تو تو میں میں میں قصہ طول پکڑ جائے گا۔ ہم غالباً اس قدر ثابت کر چکے کہ عورتوں کو عمدہ لباس اور قیمتی زیور پہنانا۔ اور شادی غمی وغیرہ کی زندگی کی رسمیں بالکل بچا ہیں اور بہار زندگی قائم رکھنے۔ اسے استحکام بخشنے اور ترقی دینے کے لیے انتہا ضروری ہیں وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ہماری رائے لائیں۔ ریفارمری کے قانون میں پہلی دفعہ یہ ہونی چاہیے کہ انسانوں کی زندگی کی بلاوجہ تنگی سے کسی حال میں مزاحمت نہ

کی جائے گی۔

اے نیک نیت مگر اسرارِ زندگی سے ناواقف ریفارمر آ ہمارے ساتھ چل اور دیکھ کہ اللہ کے بندے محلوں میں۔ گھروں میں۔ اور جھونپڑوں میں زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔ شاید تو بھی ہمارا ہمزبان ہو کر یہی ہدایت کرے کہ اے بنی نوع انسان خدا کی محبت۔ عشق کے جوش اور فضائے قدرت اور انعاماتِ الٰہی کی محویت میں ہمیشہ مسرور و مست اور پُر بہار زندگی بسر کر۔

محمد سرفراز حسین قاری

ایک حسین کی قبر

اک دن جو سوئے گورِ غریباں ہوا گذر — آیا وہاں عجب تماشا مجھے نظر

کل کرتے تھے نفیس مکانوں میں جو بسر — دنیا ہی میں نمونۂ جنت تھے جن کے گھر

گو پھر زمیں میں وہ پڑے ہیں دبے ہوئے — ممنون ہے اُن پہ وہ اس میں لٹے ہوئے

وہ ایک گھڑی نیند میں ہیں آج سو رہے — بیداری کی وہ جان کو گویا ہیں رو رہے

جس دم سوئے ہیں راحتِ دنیا کو کھو رہے — اب تو وہ اس زمین کے کیڑے ہی ہو رہے

خاموشی اور سکوت کا غلبہ ہوا اسقدر — یہ بھی انہیں خبر نہیں لیٹے ہیں ہم کدھر

باتیں تو باتیں اُن میں تو حرکت ذرا نہیں — ان کو جہاں لٹایا تھا لیٹے ہیں بس وہیں

بستر کے بدلے اُن کو ملی ہے یہی زمیں — وہ پھر فقیر و شاہ ہوں بدشکل یا حسیں

ہر اک کا اس مقام پہ بس ایک حال ہے — جس پر یہ پھنس گئے ہیں وہ مٹی کا جال ہے

سب جانتے ہیں رہنے کا لائق ہے یہ مکان — لیٹے ہیں سب زمین کے اندر جہان تمام

لیکن یہ لطف ہے نہیں آتا کوئی یہاں — رونے کی جا ہے آہ یہ اے دوستو سماں

ساتھی تھے زندگی ہی کے سب یار یہ عزیز — مرنے کے بعد ان میں وفا کی نہیں تمیز

یہ حال دیکھ کر مری حالت ہوئی زبوں — آنکھوں سے بھی ٹپکنے لگے اشک ہائے خوں

مستولی مجھ پہ ہو گئی کیفیتِ جنوں — غم دل میں وہ ہوا کہ میں اب کیا بیاں کروں

رسم ہے اب فرمایئے کس رسم کو چھوڑیں کس کو نہ چھوڑیں جن لوگوں کی آرزو یہ ہے کہ اہل دل
کسی کی موت کا غم نہ کریں اور انسانوں کی زندگی میں تلخکامی کے اجزا جہاں تک ہو سکے نہ آنے دیں وہ تو ایسے
بیہودہ رسموں کا قلع قمع کرنے پر غالباً راضی نہ ہوں گے۔ فضول رسمیں فضول خرچی کی رسمیں
جاہلانہ رسمیں۔ ان فقروں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ افلاس کے دور کرنے کی کیا یہی تدبیر ہے کہ
چھ آنے چارپائی میں نکاح ہو جائے۔ کوڑیوں کے اندر مردہ دفن ہو جائے۔ سائیسوں اور
بارگیروں کی وردیاں مرد اور عورتوں کو پہنا دی جائیں پتھر اور لوہے کے دو چار برتن گھر میں ہوں
فرش کی اول تو ضرورت ہی نہیں قالین وغیرہ تو فضول خرچی ہے۔ صرف پائنیر اخبار کے
کاغذ بچھے ہوں؟ کیا ہمارے بعض ریفارمر ایسا ہی چاہتے ہیں؟ توبہ توبہ توبہ اور اس قسم کے
سب طریقے حیات انسانی کی بہار کو خراب اور برباد کرتے ہیں۔ کوتاہ بین لوگ انہیں افلاس
اور نکبت کا باعث سمجھتے ہیں حد یہ نہیں کہ اصلی سبب جفاکشی کا نہ ہونا، جہالت اور بے عزتی ہے
محنت سے روپیہ پیدا کیا جائے تو چوبیس گھنٹے میں چوبیس رسمیں بھی مضر نہیں۔ ایک بڑا لطف
اس بات میں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ہمارے بعض ریفارمر پرانی رسموں اور پرانی باتوں کو معاف
کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ وہاں اس بات کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ خود کس قدر نئی رسموں
اور نئی باتوں میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔ عورتوں کا تو زیور تک آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ مگر حضور
یہ کالر نکٹائی اور انگریزی جوتوں کی جو پلٹن کی پلٹن حضور کے ساتھ ہے یہ تو مفلسی پیدا نہیں کرے
گی؟ ہمارا تو چھٹی چھ ماہی کا مولود شریف پڑھوانا یا مجلس عزا آپ کو ناگوار معلوم ہوتی ہے مگر حضور
کے ہاں جو یہ آئے دن فی پارٹی کھیل کود ہزاروں نئی طرح کی لغویات ہوتی رہتی ہیں ان کا کچھ
مضایقہ نہیں۔ صاف کیوں نہیں فرماتے کہ رسمیں چھینا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ پرانی
رسموں کو چھوڑ کر نئی رسموں کو اختیار کرو۔ خیر اس تو تو میں میں میں قصہ طول پکڑ جائے گا۔ ہم غالباً
اس قدر ثابت کر چکے کہ عورتوں کو عمدہ لباس اور قیمتی زیور پہنانا۔ اور شادی غمی وغیرہ کی زندگی
کی رسمیں بالکل نیچرل ہیں اور بہار زندگی قایم رکھنے۔ اسے استحکام بخشنے اور ترقی دینے کے
لیے بے انتہا ضروری ہیں وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ہماری رائے میں۔ ریفارمری کے قانون
میں پہلی دفعہ یہ ہونی چاہیے کہ انسانوں کی زندگی کی بیباکانہ رنگینی سے کسی حال میں مزاحمت نہ

کی جائے گی۔

اے نیک نیت مگر اسرار زندگی سے ناواقف ریفارمر آ ہمارے ساتھ چل اور دیکھ کہ اللہ کے بندے۔ محلوں میں۔ گھروں میں۔ اور جھونپڑوں میں زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔ شاید تو بھی ہمارا ہمزبان ہو کر یہی ہدایت کرے کہ اے بنی نوع انسان خدا کی محبت۔ عشق کے جوش اور نظارۂ قدرت اور انعامات الٰہی کی محویت میں ہمیشہ سرمست اور پُر بہار زندگی بسر کر۔

محمد سرفراز حسین فارسی

ایک حسین کی قبر

اک دن جو سوئے گورِ غریباں ہوا گذر
آیا وہاں عجیب تماشا مجھے نظر

کل کرتے تھے نفیس مکانوں میں جو بسر
دنیا بھی جن کی نمونۂ جنت تھے جن کے گھر

گو بھر زمین میں وہ پڑے ہیں دبے ہوئے
مٹی منوں ہے اُن پہ وہ اس پہ لدے ہوئے

وہ ایک گہری نیند میں ہیں آج سو رہے
بیداری کی وہ جان کو گویا ہیں رو رہے

جس دم سوئے ہیں راحت دنیا کو کھو رہے
اب تو وہ اس زمین کے کیڑے ہی ہو رہے

خاموشی اور سکوت کا غلبہ ہو اسقدر
یہ بھی انہیں خبر نہیں لیٹے ہیں ہم کدھر

باتیں تو باتیں اُن میں تو حرکت ذرا نہیں
ان کو جہان لٹایا تھے لیٹے ہیں بس وہیں

بستر کے بدلے اُن کو ملی ہے یہی زمین
اور پیر فقیر و شاہ ہوں بدشکل یا حسین

ہر اک کا اس مقام پہ بس ایک حال ہو
جس میں یہ پھنس گئے ہیں وہ مٹی کا جال ہو

سب جانتے ہیں رہنے کا لائق ہے یہ مکان
لیٹے ہیں سب زمین کے اندر جہان تمان

لیکن یہ لطف ہے نہیں آتا کوئی یہاں
رونے کی جاہے آہ یہ اے دورِ آسمان

ساتھی تھے زندگی ہی کے سب اپنے اور عزیز
مرنے کے بعد ان میں وفا کی نہیں تمیز

یہ حال دیکھ کر مری حالت ہوئی زبون
آنکھوں سے بھی ٹپکنے لگے اشک ہائے خون

مستولی مجھ پہ ہو گئی کیفیت جنون
غم دل میں وہ ہوا کہ میں اب کیا بیان کروں

تصویر سی بن گیا حیرت میں رہ گیا
صبر و شکیب آنسوؤں میں مل کے بہ گیا

ایک قبر کے قریب کھڑا تھا میں نیم جان
چپ اس طرح تھا گویا کہ منہ میں نہیں زبان

تھے دل میں جوش تھا نہ طبیعت میں شوخیاں
اس حال میں تھا میں کہ سنا میں نے ناگہاں

آواز آئی کون ہو تم کیوں کھڑے ہوئے
کس واسطے لحد پہ ہو میری اٹے ہوئے

تم جانتے تھے جس کو وہ میں اب نہیں رہا
زیر زمین ہوں میں مرا نقشہ بدل گیا

وہ حسن وہ شباب فنا ہو گیا فنا
قسمت نے میری مجکو تو مجبور کر دیا

وہ میں نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی
وہ ناز و ادا وہ نزاکت نہیں رہی

مجھ میں کہاں یہ تاب کہ اب تکلم کر سکوں
طاقت نہیں ہے اتنی کہ سرد آہیں بھر سکوں

ہمت نہیں کہ جو رستے اپنے کہہ سکوں
غیرت نہیں رہی ہے کہ میں پھر بھی مر سکوں

اپنے کئے پہ آپ میں ہوں آپ ہی خجل
کیونکر کہوں کہ کتنا ہوں شرمندہ و منفعل

کیوں ہے مری تلاش تجھے بعد مرگ بھی
دیوانہ کیوں بنا ہے تو اے نجو عاشقی

رائج ہے رسم غمکدۂ دہر میں یہی
مر جائے گا ہر ایک جہاں موت آ گئی

مجبور ہو کے کرنی پڑیگی جفا سے
کیا اس سے اسکو پیار کہیں بیوفائے سے

یہ سن کے میری اور بھی حالت ہوئی نزار
حد سے بھی کچھ سوا ہوا اس وقت بے قرار

نکلا مری زبان سے یہ لفظ ایک بار
اب سمجھا میں بیان ہے تو اے میری گلعذار

افسوس تو زمین میں ہے ہوں میں زمین پہ
اف یہ ستم کا بوجھ ہے تجھ سے حسین پہ

سر پھر گیا تو ضبط کا یارا نہیں رہا
شدت سے غم کی زور سے میں کانپنے لگا

تاب و توان نے بھی نہ مرا ساتھ کچھ دیا
غش آیا اور میں چکرا کے گر پڑا

زیر زمین تھا وہ تو زمین پر میں سو گیا
زندہ رہا اگرچہ مگر مردہ ہو گیا

محمد اسمٰعیل رہا

خوشی

خوشی اُس چیز کا نام ہے جس کی بہت دنیا کی قریب قریب کل آبادی کہتی ہے کہ ہر قسم کی کوئی چیز جو اپنا دائمی اثر رکھے اس عالم میں پیدا ہی نہیں ہوئی اور در اصل یہ سچ بھی ہے کیونکہ اگر آپ زید سے دریافت کریں کہ کیوں جناب آپ خوش ہیں تو زید نہایت جھنجھلا کر جواب دیگا کہ میاں خوش کیا ہوں خانہ برباد ہیں ہر طرح تنگ ہوں یہی جواب۔ بیچے گو نہایت خوب ہیں مگر ۔ غرض جس کسی سے پوچھا جائے وہ کہتا ہے ہم ہرگز خوش نہیں ہیں مگر وہ در اصل خوش خوش نظر آتا ہے آپ کسی بھیڑ میں جائیے کسی کلب میں جائیے کسی بات پہ جائے تو معلوم ہوگا سب تو شاداں و فرحاں ہیں اس وقت تو آپ کہیگا کہ یہ لوگ تو مست ہو رہے ہیں گے کہ ہم خوش ہیں مگر ان میں سے ایک صاحب کو بلائیے جو ان سب میں سب سے زیادہ خوش معلوم ہوتے اور سب کو چھیڑتے سب کو ہنساتے جاتے ہیں کیا آپ خوش ہیں؟ اول تو یہ صاحب مہلت اس وقت طلب کرنے سے جس کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے ان کو ان کی تفریح سے تھوڑی دیر کے لیے معطل کر دیا بہت ناراض ہیں مگر جواب میں کہتے ہیں کہ جناب خوشی دنیا میں کس کو نصیب ہے اگر آپ میری داستان سنیں تو آپ بھی خوشی کی جگہ رنج رنج کا نوحہ پڑھنے لگیں۔

اب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ حضور آخر یہ آپ کے قول اور فعل میں اتنا فرق کیوں ہے؟ آپ اپنے جائے نظر پر تو ایسے شاداں و فرحاں ہیں کہ لوگوں کے پژمردہ دل آپ کی خوشی سے متاثر ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ہم خوش نہیں ہیں جی جناب یہ تو عارضی چیز ہے اگر میں اپنے دل کو اس طرح درست نہ رکھوں تو ابھی اتنا خوش نظر نہ آؤں شاید مجھے دق ہو جائے اگر آپ میرے دل کو دیکھیں تو غم کے نشتروں سے چھلنی نظر آئے گا اور آپ بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ چلئے آگے بڑھئے کہیں اور کسی خوش آدمی کی تلاش کریں۔ جی ہاں یہ ضرور خوش ہوں گے کیونکہ ان کو اپنے مطلوب سے قرب حاصل ہے۔ لیجیے آپ تو اپنے مطلوب کو بھی

فراغت سلام کیا اور ایک کنارہ جاکر بیٹھے۔ بزرگ صاحب نے نئے آنے والے صاحب کو دیکھ لیا اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں اور کہا میاں تم آخر کس بات کو پوچھنے کے لیے نکلے ہو دنیا میں کوئی خوشی ہے ہی نہیں۔ دنیا دار تو دنیا دار وہ لوگ بھی جن کو دنیا سے واجبی سا تعلق ہے خوش نہیں کسی کو اپنی دولت دنیا سے کو دنیا کی چیزوں کے متعلق رنج رہتا ہے مگر اور لوگوں کا جو دنیا سے اپنا تعلق بہت کم رکھتے ہیں دوسرے لوگوں کا فکر رہتا ہے جو فی نفسہٖ رنج پیدا کرنے والا اور خوشی کو مفقود کرنے والا ہے۔ میاں تم ایک ایسے راز کے دریافت کرنے کو نکلے ہو جس کا حل ہونا ناممکنات سے ہے اور یہ بزرگوں کا قول کہ دنیا خوشی کی جگہ ہی نہیں ہے جھوٹ نہیں ہے۔ اب آپ جائیے اور ان حضرت کو دیکھیے جنہوں نے آپ کو گھنٹہ بھر بعد بلایا ہے۔ اب وہاں جو پہنچے تو وہ حضرت جو بھی اپنے آپ تو تمام دنیا کی خوشی کا مالک بتا رہے تھے تنہا بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں اور اپنے آپ کو تمام دنیا کے رنج کا مالک بتا رہے ہیں۔ فوراً دبے پاؤں جاکر ان کے پیچھے کھڑے ہو کر سنتے آخر کہہ کیا رہے ہیں۔ اب آپ کے دماغ میں نہ دنیا کی خوشی کا سودا ہے نہ اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے۔

آداب عرض جناب۔ ہم حاضر ہیں جواب دیجیے گا۔

جناب جواب۔ میری صورت میری حالت جواب ہے اور کیا کہوں۔

غرض ہم تمام طبقوں میں سے ہوتے ہوئے اور ہر جگہ یہی دریافت کرتے ہوئے اپنے گھر آئے اور فیصلہ یہ کیا کہ دنیا میں خوشی ہے ہی نہیں۔ یہ تو فیصلہ ہو چکا مگر اب اس کو بھی تو سوچیے کہ آخر خوشی کو رنج سے تبدیل کر دینے والی چیز کیا ہے۔ اس کا جواب میں تو یہ دوں گا کہ امید اور در اصل امید جڑ ہے رنج کی۔

اگر آپ کو کسی سے کچھ امید ہے اور وہ امید پوری نہیں ہوتی تو آپ کو رنج ہوگا اور اگر آپ کی امید کے مطابق کوئی بات پوری ہوگئی تو کچھ بہت زیادہ خوشی نہ ہوگی۔

مگر کسی سے کوئی امید وابستہ نہیں ہے اور بغیر امید کے مطلب براری ہو جاتی ہے تو یقیناً

یہ انتہا درجہ خوشی کا باعث ہوتا ہے اور اگر مطلب برآری نہیں ہوتی تو رنج تو ہوتا ہے مگر اتنا نہیں جتنا اُس حالت میں ہوتا جس وقت امید کامل ہوتی ہے۔

اس سے نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آدمی کو بہت کم توقعات وابستہ کرنی چاہئیں اور جب ہی وہ نسبتاً خوش رہ سکتا ہے۔ رنج اور خوشی کے لیے کیپروا اسمٰں کا یہ دوہا کس قدر موزوں ہے۔

کوئی تو تن دکھی کوئی چیت اُداس | ایک ایک دُکھ سبھی کا خوشی بسنت کا داس

مگر اصل تو یہ ہے کہ خوش نسبت کا وہ اس بھی نہیں ہے +

محمد ابراہیم دہلوی

غزل

مجھے فراق میں حاصل وصال ہوتا ہے | نظر کے سامنے تیرا جمال ہوتا ہے

خرام ناز سے ظالم نہ حشر برپا کر | تجھے خبر ہے کوئی پائمال ہوتا ہے

جفا و جور تو شیوہ نہیں ہے جاناں کا | مرے نصیب سے مجھکو ملال ہوتا ہے

جفا کے ذکر سے عاشق کی جان جاتی ہے | وفا کے نام سے اس کو ملال ہوتا ہے

کسی سے کہہ نہیں سکتا خدا کو روشن ہو | تمہارے جانے سے دل کا جو حال ہوتا ہے

ذرا سے شکوہ پہ ایسے بگڑ گئے مجھ سے | ہنسی ہنسی میں تمہیں تو ملال ہوتا ہے

ہمیں تو جینا بھی تیرے بغیر ہے دشوار | کبھی تجھے بھی ہمارا خیال ہوتا ہے

خیال آگیا ان کے جمال رنگین کا | دل شکستہ زیادہ نڈھال ہوتا ہے

یہ کس کے حسن کا صوفی پہ چل گیا جادو | کہ حال ہوتا ہے دلکش نہ قال ہوتا ہے

ازل سے جاری ہیں دنیا کے یونہی کاروبار | کسی کو رنج ہوتا ہے کوئی نہال ہوتا ہے

نہ کیوں سرور ہو دل کو وہ جب کہیں ناصر | ترے ملن سے مجھ کو ملال ہوتا ہے

(جناب مولانا سید محمد محمد صاحب ناصر ایڈیٹر شعلہ)

آثارِ عرب اسپین میں

تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ ہماری نظر سے ایک یورپین کا سیاحت نامہ گزرا جس میں اُس نے تفصیل
کے ساتھ اندلس کے ان تمام آثار کے چشم دید حالات لکھے ہیں جو اب تک اسپین میں اپنے
بنانے والوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدیداست صنادید عجم را

چونکہ ان آثار سے دولتِ عرب کے عظمت و وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی سلسلۂ تمدن
اسلامی کی ایک کڑی ہے لہذا ہم اس کو نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔

جامع قرطبہ

چونکہ قرطبہ خلفاء امویہ اسلامیہ کا دار السلطنت تقریبًا پانچ صدیوں تک رہ چکا ہے اس لیے
کسی زمانے میں اس میں بڑے بڑے علماء، حکماء اور مجاہدین پیدا ہوئے۔ مگر آج اس میں ان
کے نشانات باقی ہیں جب وہاں کوئی مسلمان جاتا ہے تو آثار اسکو دیکھ سکتے ہیں مگر اسکے
ساتھ ہی تمام ٹیلے زبانِ حال سے یہ آواز نکالتے ہیں۔ "سبحان اللہ فی خلقہ"
ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ مشہور و معروف جامع مسجد ہے جو دریائے وادی الکبیر کے
کنارے پر واقع ہے وہ بہت بڑی اور شاندار مسجد ہے جس کی بلندی آٹھ میٹر ہے یہ مضبوط اور
سخت پتھروں سے بنی ہوئی ہے اور اس کے کئی دروازے ہیں۔ صحن کے محراب جن کی کنگنی عمدہ
رنگین سنگ مرمر کے ستون سے جڑی ہوئی ہے، چھائے ہوئے ہیں۔ مسجد اسقدر وسیع اور کشادہ
ہے کہ اس کا رقبہ تقریبًا ۱۰۰۰۰ دس ہزار مربع میٹر ہے زمین کا فرش شفاف سنگ سفید کا ہے
اور جامع مسجد اس صحن کے مغرب کی جانب واقع ہے مسجد کی بلندی آٹھ میٹر سے زیادہ نہیں ہے اور

اس میں بارہ دروازے ہیں اساس کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ اس کا طول ۱۶۵ میٹر اور عرض ۱۲۵ میٹر ہے۔ اس کی چھت کمانوں کے اوپر جو کاشانی رنگ سے آراستہ ہیں اور رنگین خوشنما سنگ مرمر کے ستونوں پر کھڑے ہیں قایم ہے۔ اس کا ہر ستون چار میٹر لمبا ہے اور جامع مسجد کے تمام ستونوں کا شمار ۹۰۰ ہے۔ ہر ایک جانب کے ستونوں کا مجموعہ دلکش ہے۔ مسجد کا فرش مضبوط رنگین قسم قسم کی اینٹوں کا ہے محراب اور منبر مصفا سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر عمدہ نقوش بنے ہوئے ہیں جن سے اتقان صناعی کے راز کا پتہ چلتا ہے۔ محراب میں آب زر سے خط کوفی میں یہ الفاظ کندہ ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطےٰ وقوموا للہ قانتین پھر اس کے نیچے اسی طرح سے یہ الفاظ کندہ ہیں۔ الامام الحکم امیر المومنین

یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جب اسپین کے ملکی باشندوں نے ملک پر قبضہ کیا تو رؤسا نے بادشاہ قیصر شرلکان کے عہد میں اجازت چاہی کہ جامع مسجد میں ایک گرجا بنایا جائے اور ان کو اجازت مل گئی اور انہوں نے اس کے بیچ میں ساٹھ ستونوں کے مقدار کے برابر جگہ الگ کر لی اور اس کو اپنا معبد بنایا جو اب تک باقی ہے

دریائے گاڈل کیویر کا پل

ایک اور اثر جو اب تک باقی ہے، دریائے گاڈل کیویر کا پل ہے یہ سخت مضبوط پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ اس کا عرض تقریباً بیس قدم اور طول پانچسو قدم سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کا حصہ ٹوٹا ہوا کیونکہ جب تم پل کے ایکطرف سے دوسری طرف تک دیکھتے ہو تو بیچ میں زمین کا ایک ایسا حصہ نظر آوے گا جس سے پتہ چلتا ہو کہ یہاں کسی وقت آبادی اور مکانات تھے۔

لیکن قصر زہرا جو مشہور عام اور دنیا کے عجائبات میں سے تھا اور محل جسکو عبد الرحمن داخل نے بنوایا تھا اُن کا کوئی ایسا اثر سوائے تھوڑے کھنڈروں کے باقی نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے۔

حمراءِ غرناطہ

غرناطہ تمدن اسلامی کے زمانے میں دار السلطنت و دار الامارت، شاہان بنو احمر کا مرکز، اپنے حسن و جمال میں یکتا اور بے مثل تھا۔ اس کا تا ہنوز سب سے زیادہ اثر باقی ہے قصر حمرا جو اس کے باشندوں کے صنعتی و اخلاقی قابلیت کی شہادت دیتا ہے۔ اس کا ایک دروازہ صنوبر کا ہے جس میں دو موٹے ہٹ لگے ہیں اور جن پر ایسے نقوش بنے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کی محراب مصفا ہے جس پر عمدہ پھول پتے بنے ہوئے ہیں۔ نیز اس دروازے پر ایک سنگ مرمر کی تختی ہے جس پر خط کوفی میں بہت صاف یہ عبارت مرقوم ہے۔

هذا الباب المسمى بباب الشريعة امر ببنائه
ابو عبد الله بن يوسف بن حجاج الخزرجي

جب تم اس دروازے سے آگے بڑھو گے تو تم کو ایک ڈیوڑھی ملے گی جس کا فرش مضبوط سنگ مرمر کا ہے اور جس کی دیواریں عمدہ عمدہ اینٹوں کی ہیں پھر اس کے بعد ایک باغ ملے گا جس میں قسم قسم کے پھول پھل و سایہ دار درخت ہوں گے اور اسی باغ میں کوشک حمرا ہے اور وہ کوشک بھی ملیگا جس کو قیصر شرلکان نے بنوایا تھا۔ وہ بہت بڑا اور مضبوط پتھروں سے بنا ہوا ہے اور اس میں ہسپانی عربی کے طرز پر بہت سے نقوش بنے ہیں۔ اس کوشک کو بادشاہ شرلکان نے اس وجہ سے بنایا تھا کہ کوشک حمرا کا جواب ہو جائے لیکن اس کام کو شرلکان پورا نہ کر سکا۔ علاوہ اس کے نقاشی اور عمارت کی فن تعمیر کی حیثیت سے عمدگی میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

پھر جب تم اس باغ اور کوشک شرلکان سے آگے بڑھو گے تو تم کو ایک دروازہ نظر آئے گا۔ جس کا طول و عرض حد سے زیادہ ہے اور جو قسم قسم کے سنگ مرمر سے مزین ہے۔ دروازے کے اوپر کے حصے میں ایک سنگ مرمر کی تختی ہے جس پر خط کوفی میں بالکل صاف یہ عبارت مرقوم ہے هذا باب السلاطين پھر جب تم اس سے بھی آگے بڑھو تو تم کو ایک صحن ملیگا جس کے ہر سمت

خط کوفی میں ایک قصیدہ لکھا ہوا ہے اِس کا فرش انواع و اقسام کے سنگریزوں کا ہے پھر تم اسکے بعد اپنے دائیں جانب کوشک حرم پاؤ گے جو بہت زیادہ چوڑا ہے اور اس میں کئی کھڑکیاں ہیں اور اسکے صحن مختلف شکلوں کے ہیں جو بہت زیادہ آراستہ دیکھنے میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور اسکی ایک فصیل بھی ہے۔ تمھارے بائیں جانب "قصر سفرا" ہوگا اسکے لیے بھی ایک فصیل ہے اور شاہان اندلس اس میں سفیروں کا استقبال کرتے تھے۔ وہ بہت خوشنما محل ہے جس کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے اِس کا فرش سنہری رنگین اینٹوں کا ہے۔ اسکی دیواریں سفید سنگ مرمر کی ہیں جن پر زرد رنگ کی پچی کاری ہے۔ اسکی چھت بلند قبہ ہے جس پر رنگا رنگ کے نقوش بنے ہیں۔ محل کے وسط میں زمین سے دو ہاتھ اونچا ایک چبوترہ بنا ہوا ہے دیواروں کے اوپر والے حصہ اور قبہ کے شروع حصوں کے درمیان بہت سے طاق ستاروں کے شفاف بلور سے مزین ہیں۔

تمام دیواروں پر اور قبہ کے اندرونی جانب بہت سے واضح اور عجیب شکل کے نقوش بنے ہوئے ہیں جن سے ہسپانی عربوں کے ذوق صناعی کا پتہ لگ سکتا ہے محل کی اکثر سمتوں میں یہ عبارت واضح خط کوفی میں مرقوم ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وَلَا غَالِبَ اِلَّا اللّٰہ وَالْغِبْطَۃُ الْمُتَّصِلَۃُ
وَالنَّصْرُ وَالتَّمْکِیْنُ وَالْفَتْحُ الْمُبِیْنُ لِمَوْلَانَا اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ

اور یہ عبارت قصر کی دیواروں میں مکرر ہے۔ دوسرے چند الفاظ بھی ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرب المثل یا اخلاقی نصیحتیں آب زر سے لکھی ہوئی تھیں لیکن زمانے نے طلا کے اوپر اثر کیا اور اکثر کو برباد اور بعض کو رکھ چھوڑا۔

پھر تمکو ایک دوسری فصیل نظر آئیگی جو بہت مضبوط ہوگی اور دونوں فصیلوں یعنی کوشک حرم کی فصیل اور کوشک سفرا کی فصیل کے درمیان ایک خالص شفاف سنگ مرمر کا حوض ہے جس کا طول ۲۰ ہاتھ عرض ۸ ہاتھ گہرائی ۲ ہاتھ ہے اور پانی سیسے کی نالیوں کے ذریعہ سے اس میں پہنچتا ہے۔ پھر جب تم قصر سفرا سے آگے

بڑھو تو اخیر میں تمکو ایک کشادہ جگہ ملیگی جس میں چار دالان ہونگے اور وہ سفید سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور اس میں سے ہر ایک کا طول ۱۰ ہاتھ ہے یہ کشادہ اور مضبوط جگہ ہے۔ اِس کا فرش سنگریزوں کا ہے۔ جب تم یہاں سے اگے بڑھیگے تو تمکو خالص سفید سنگ مرمر کا مربع حوض ملے گا جسکی گہرائی تقریباً ایک ہاتھ ہوگی۔ یہ بارہ سنگ مرمر کے شیروں کے اوپر بنا ہوا ہے جو اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ پانی انکے مُنہ سے ایک گہری گول جگہ میں جاتا ہے جہاں سے دوسرے کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔ حوض کے بیچ میں ایک سفید سنگ مرمر کا عمود ہے جسکے ذریعہ سے پانی ٹپکتا ہے اور حوض میں چلا جاتا ہے یہانتک کہ حوض بھر جاتا ہے اور جو کچھ زیادہ ہوتا ہے وہ شیروں کے منہ سے بہ جاتا ہے۔ تمام حوض عمود شیر ایک ہی سنگ مرمر کے ٹکرے سے بنے ہیں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ تم کتنا ہی غور کرو لیکن تمکو وہ جگہیں نظر نہ آئیں گی جہاں سے پانی حوض سے شیروں کے مُنہ میں جاتا ہے۔ اِس کشادہ جگہ کے اندر بہت سی عمارتیں اور منقش طاق ہیں جو مزین ستونوں پر قائم ہیں اور جن کے بعد لمبے حجرے اور صحن پڑتے ہیں مسافتیں طولاً عرضاً۔ ارتفاعاً ہر طرح سے مختلف ہیں اور سب میں عمارہ عمارہ قبے لگے ہیں لیکن انکی شکلیں اور نقوش مختلف ہیں کوشک حمرا کے قریب ہی ایک بہت مضبوط پتھروں کا مکان ہے جو کسی زمانے میں ایک اسلامی فوج کا قیام گاہ تھا اور ابتک اپنی حالت پر قائم ہیں۔

کوشک اشبیلیہ

وہ اشبیلیہ کا بہت مضبوط کوشک ہے جس کا دروازہ صنوبر کا ہے اسکے دیکھنے سے ناظرین کی طبیعت خوش ہوتی ہے اور متفکرین کو عبرت ہوتی ہے وہ ایک باغ کے درمیان ہے جس میں قسم قسم کے سایہ دار درخت و پھل ہیں اور اس میں بہت سے حوض و تالاب عمدہ ترتیب سے بنے ہوئے ہیں جن کے پاس شاہان اشبیلیہ بیٹھے

سطے اس کا فرش اینٹوں کا ہے وہ سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم ہے۔ اس میں بہت سے حجرے اور عمارہ عمدہ صحن ہیں۔ تمام چھتیں، دیواریں، دروازے، اور کھڑکیاں سب جو عمدہ نقش و نگار سے مزین ہیں اور جن پر سونا چڑھا ہوا ہے مگر زمانے نے ان میں سے بہتوں کو برباد کرتا ہے۔

مرزا بن احمد بیگ
متعلم درجۃ الاصلاح رہلے میر

غزل

او حیا پرور یہ شرمیلی دلہن چلمن میں ہے
یا نگاہِ ناز تیرے دیدۂ پرفن میں ہے

تم کو اک دل دیجئے گویا بلائیں مول لیں
وا مصیبت میں جگر آفت میں جاں الجھن میں ہے

اور پھولوں سے مجھے مطلب نہیں اے گلعذار
جس میں تیری بو ہو ایسا پھول کس گلشن میں ہے

اس طرف بیٹھے ہیں بالیں پر وہ منہ پھیرے ہوئے
اس طرف بیمارِ ہجراں نزع کی الجھن میں ہے

لے زلیخا دامنِ یوسف سے گستاخی نہ کر
یہ سمجھ لے تیری عصمت بھی اسی دامن میں ہے

طور پر تڑپایا تھا جس نے کلیم اللہ کو
وہ تجلی اب تمہارے عارضِ روشن میں ہے

دلبری سے ہے مشیر اتنا تو بتلا دے مجھے
کچھ وفا بھی او ستم آرا تری چتون میں ہے

میں بتا دونگا تمہیں کتنی کشش الفت میں ہے
میں دکھا دونگا تمہیں کتنا اثر شیون میں ہے

اسکی آنکھوں میں لگاوٹ ہے تری آنکھوں میں ہے
اسکی چتون میں شرارت ہے تری چتون میں ہے

جو پتنگا اس طرف آیا وہ جگنو بن گیا
کسکی شمعِ حسن کا جلوہ مرے مسکن میں ہے

زنگِ الفت بھی دل میں داغِ حسرت ہے شفق
آگ ٹھنڈی ہو گئی لیکن دھواں گلخن میں ہے

شفق امروہوی

دفتر تمدن کا موجودہ پتہ مٹیا محل دھلی

نل دمن

لیلیٰ و مجنوں کے نام کو جاننے والے۔ شیریں و فرہاد کو پہچاننے والے، وامق و عذرا کے نام لیوا، یوسف و زلیخا کے قائل یقینی اس سے بھی ناواقف نہ ہونگے کہ انہیں سرگشتگانِ بادیہ عشق میں ایک عاشق "راجہ نل" اور اُسکی معشوقہ "دمینتی" بھی ہو گذری ہے۔ عاشقوں کی فہرست میں اِس دیوانہ کا نام بھی جلی قلم سے لکھا ہوا ہے اس میں بالکل کلام کی گنجایش نہیں ہے کہ ان سب کا سرگروہ قیس ہے۔ مگر تھوڑے بہت تفاوت کو نظر انداز کرتے ہیں تو غریب راجہ نل کو بھی دربار عشق میں ہم ایک زرنگار کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ نل و دمن کے عشق کے افسانہ کو ایک مختصر طور پر بیان کر جائیں۔ اِنکی بیقراریاں ایسی تو نہ تھیں کہ اُسے میں پورا پورا لکھ سکوں۔ اور میرا قلم اُنکی تصویر دکھا سکے۔ یہ کام مشکل ہے اور اس لئے قبل از مرگ واویلا کے مصداق پر عمل کرکے میں سہو و خطا کی معافی مانگنے پر مجبور ہوں۔

شہر اُجین کا نصیبہ زوروں پر تھا۔ رونق۔ آبادی، صنعت، دستکاری وغیرہ میں یہ اپنا آپ ہی ثانی و مثال تھا اسکے کوچہ و برزن پر بہشت ارم کا گمان ہوتا تھا۔ اُسکے بازاروں میں وہ چہل پہل تھی جس کا آج کیا اِس اُجڑے ہوئے شہر میں مدتوں سے نشان نہیں ملتا۔ جیسے کہ ہند کے بہت سے برو شہروں میں بھاگوان راجہ تھے اسی طرح یہاں بھی راجہ نل گدی پر بیٹھا ہوا رعایا کے عدل و انصاف میں مشغول رہتا تھا۔

یہ راجہ سخی۔ بہادر۔ خوبصورت۔ نیک۔ رعایا پرور ہونے کی وجہ سے ہر دلعزیز تھا۔ جیسے وہ رعایا کی بہبودی اور فلاح ہر وقت مدِ نظر رکھتا تھا۔

... کرنے کے لئے تیار رہتی تھی +

اگست ۱۹۱۱ء

تمتن

نل اپنے عالم شباب کے ہرے بھرے باغ کی گلگشت میں مصروف تھا۔ یا اُسکی [۲۱]
جوانی کا پودا پھولوں میں لدا ہوا تھا کہ اُس میں حسن پرستی کا مادہ جو پیدا ہوتا تھا پیدا
ہو چلا۔ وہ اکثر اچھی اچھی صورتیں دیکھ کر تڑپ جاتا تھا۔ حسینوں کی تیز تیز نگاہیں
چھریاں بنکر اُسکے دل میں اُتر جاتی تھیں۔ معشوقوں کی ستانہ چالیں اُسے دیوانہ
بنا دیتی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنے حسن پرستی کے مادہ کو چھپاتا تھا۔ اُس کا یہ زنگ
ابھی عشق کے درجے پر نہ پہنچا تھا۔ اُس کا کوئی خاص معشوق نہ تھا بلکہ جو صورت
اچھی نظر آئی وہی اُسکی دلبر اور اُسی کا یہ دلدادہ تھا۔ وہ اسی تدبیر میں مصروف
تھا کہ کسی صورت سے یہ مرض اُسکے دل و دماغ سے نکلے اور ہوش میں آکر وہ
آدمی کہلانے کا مستحق بنے۔ مگر جذبِ حُسن کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اگر اسکی آزادی
کی فکر ترقی کر رہی تھی، تو وہ اس گھات میں تھا کہ اسکے دل پر ایسا جال پھیکا جائے
جس سے عمر بھر اسکی رہائی دشوار ہو۔ یہی ہوا بھی "نل" اپنی تدابیر میں ناکامیاب
رہا، اور عشق کامیاب ہو گیا۔ یعنی ایک دن کی طوفانی۔ بلا خیز۔ سہم انگیز رات آئی
عالم پر اپنی مشکیں چادر بچھائی، اور اپنی معمولی تاریکی کی ایک اور بھی سیاہی لائی۔
جو راجہ نل کے نصیبہ کے لئے خاص تھی۔ جو زمانے کے کسی تیزاب سے اُتر سکتی
تھی نہ کوئی پانی اُسے دھو سکتا تھا۔ اور نہ کوئی دن اُسکے گہرے زنگ کو اس
تیرہ بخت کے نصیب سے مٹا سکتا تھا۔ شام ہوتے ہی دستور کے موافق راجہ نل
دربار برخاست کر سیر و تفریح سے فارغ ہو اپنے خاص محل میں آپہنچا۔ جہاں دن بھر
کی تھکاوٹ دور ہوتی تھی اور تمام کلفتیں دل سے دُھل جاتی تھیں ٭

اِس خاص کمرے یا آرامگاہ کے سامان ایسے تھے کہ معمولی معمولی کیا
اچھے اچھے راجہ بھی اُسکو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مشرقی طرز
تحریر کے موافق اگر میں اُن سب کی تعریف لکھنے کا ارادہ کروں تو اپنے اصلی
مقصد سے بہت دور پہنچ جاؤنگا اِس لئے اس کو چھوڑ کر سیدھی سیدھی باتیں
قلمبند کرتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ دنیا کے عیش و آرام کی چیزیں یہاں موجود تھیں

راجہ دستور کے موافق اس میں داخل ہوئے۔ مگر آج تو طبیعت کا کچھ اور ہی رنگ جاتی ہوئی رنگ برنگ کی شمعیں اور انکی روشنی آنکھوں کو ناگوار تھی۔ قرینہ سے رکھے ہوئے گلدستے اور خوبصورت گلدان آنکھوں میں کھٹکتے تھے مخملی فرش پر قدم رکھتے تھے تو اسکے نرم اور نازک روئیں کانٹوں کی طرح تلووں میں چبھتے تھے کوئی قوت تھی جو نازک اور نرم مسہری سے زمین پر دھکیل رہی تھی کوئی دانشمند تھا جو نل کو بار بار مشورہ دیتا تھا۔ زمین پر لیٹ جاؤ۔ کوئی دشمن تھا جو گرجہ دمرتہ نل سے کہہ رہا تھا۔ تاج شاہی سر سے اتار پھینکو۔ تخت سلطنت خالی کر دو۔ وطن کو خیرباد کہو جنگل کو نکل چلو۔ کوئی مرض پیدا ہو گیا تھا جسنے زبان بند کر دی تھی جس سے آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ روز کے ساتھ رہنے والوں، ہردم کے خدمتگاروں کے چہرے پر متعجبانہ پڑ رہی تھی اور باوجود کوشش کے انکو پہچان نہ سکتی تھیں۔ کانوں میں کسی نے پارہ بھر دیا تھا۔ کوئی کہتا تھا دشمنوں کا مزاج کیسا ہے تو نل اس کو سن سکتا تھا۔ اگر کوئی آواز سن سکتا تھا تو وہ یہ تھی ؎ درعشق بجز گداختن نیست ☆ ایں سوختن است ساختن نیست ؎ ہر کجا سلطان عشق آمد نماند ☆ قوتِ بازو و لقوی را محل ☆ ماسوا اسکے اگرچہ ہر طرف چہل پہل تھی۔ مگر نل کے پیش نظر اجاڑ سنسان سناٹے کا عالم تھا۔ کوئی چیز تھی کہ جب وہ اپنے حال پر غور کرنے بیٹھتا تھا تو اسکی عقل پر غلبہ کرتی اور اسے کچھ بھی نہ سوچنے دیتی تھی ☆

خدام ادب آئے۔ مزاج پوچھا۔ جواب ندارد۔ پھر دست بستہ گذارش کی گئی۔ صدائے برنخاست۔ سب کے سب گھبرا گئے۔ ڈر گئے سہم گئے۔ دم کے دم میں ایک ایک کو سو سو طرح کا وہم گذر گیا۔ مشورہ ہوا کہ کیا کریں۔ بالاتفاق یہی رائے پاس ہو گئی کہ طبیبوں کو بلایا جائے۔ فوراً حکیم صاحب۔ بید جی۔ ڈاکٹر صاحب آ پہونچے۔ چہرہ متغیر اور پریشانی نظر منظر آئیں۔ دیکھتے ہی مرض کی تہ کو پہنچ گئے۔ نبض وغیرہ دیکھ کر رسم معمولی ادا کی گئی اور معاً قصہ خواں بلائے گئے اور حکم یہ دیا گیا کہ دنیا کے بہتر سے بہتر حسینوں کی داستانیں سنائی جائیں۔

ادھر قصہ خوانوں کا بازار گرم - اُدھر یہ استغنا کہ کوئی داستان سنی جاتی ہے نہ سننے کو جی چاہتا ہے - اپنے ایسے اپنے برسوں کے رفیق دشمن معلوم ہوتے ہیں تنہائی پسند ہے - قصہ سُنانے والے گھبرا گئے مگر طبیبوں کی یہی تاکید رہی کہ سُنائے جاؤ نل کا دماغ زیادہ کا تحمل نہ ہو سکا - وہ بگڑ کر حکیم دینے والا تھا کہ سب دفع ہو جاؤ مگر فوراً ہی کسی نے حسین راجکاری دمنتی کے حسن عالم سوز برق افگن کی داستان چھیڑ دی کہ ملک دکن میں راجہ ہے جسکی چشم و چراغ لڑکی دمن ہے - یہ ہزاروں آرزوؤں لاکھوں تمناؤں سے پیدا ہوئی ہے - ایسی ایسی صورتیں چشم فلک نے بھی نہیں دیکھیں - وہ پیاری پیاری صورت پائی ہے کہ حسن کی دیوی یا حسن مجسم کہدیا جائے تو کم ہے +

اُدھر اُس نے تھوڑا بہت اس قصے کو طول دیا - دمن کی تعریف کی - اِدھر نل کا مرغ رنگ مائل پرواز ہوا - اسکی نبضیں بجھ گئیں - چہرہ پر ہوائیاں اُڑیں - ہاتھ پاؤں میں سنسنی پھیلی - ایک ایسی صورت - فضائے آسمان سے پیدا ہوئی جس میں وہ ساری صفات موجود تھیں جو قصہ گو بیان کر رہا تھا - عالم خیال ہی میں نل سے کچھ اشارہ ہوئے - چپکے چپکے کوئی بات کہی جس کا خندہ زیر لبی لبہا ہونٹوں کے ہلنے میں انداز ہوا - نل دیوانہ وار بڑھنے کو ہوا کہ یہ غائب ہو گئی کیونکہ وصال وہاں کیا رکھا تھا - اُدھر یہ دیوانہ دوبارہ دم سرد کھینچ کر بیہوش ہو گیا - طبیبوں نے جو کچھ شناخت کرنا تھا شناخت کر لیا اور قصہ گوؤں کو رخصت کر دیا خاص دمن کے ذکر کرنے والے کو روک لیا - ابتک بے توجہی سے سب حال سُنا تھا - اب خاص توجہ کے ساتھ سُنا - پورا پورا پتہ پوچھا اور اُسے بھی رخصت کیا - مرض سمجھ میں آ گیا - کہ نل کا مرغ دل دمن کے دام گیسو میں اسیر ہوا - راجہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کی گئیں - اور بالآخر متواتر کوششوں کے بعد اُسے ہوش بھی آیا - مگر پھر بھی آنکھوں میں اندھیرا چھایا رہا - اور سر بدستور گھومتا رہا - جلوۂ یار پیش نظر ہونے لگا - اور یہ بے تکے الفاظ آہ و نالے کے ساتھ اُسکی زبان سے نکلنے لگے

لِلّٰہ مجھے محمل میں رکھکر دیوانہ نہ بناؤ مجھے جانے دو

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو	خوب گزریگی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مگر معمولی آدمی تو تھے نہیں جو یونہی آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ خدام بادب دست بستہ گذارش کرنے لگے۔ ایں یہ حضور کو ہو کیا گیا؟ اگر آسمان کے تاروں کے لئے حکم ہوگا تو آسمان سے توڑ لئے جائینگے۔ کوئی پری ہوگی تو حضور کے لئے اسکو بھی تسخیر کیا جائیگا۔ بہشت سے حور کو بلا لیا جائے گا۔ دمن آدمی ہے اب خط و کتابت کیجائیگی۔ باقاعدہ سب رسوم ادا ہونگی۔ جواب حسب نشانہ آیا تو پھر جو کچھ حکم ہوگا دیکھا جائے گا۔ غرض جب تک ہمارے دم میں دم ہے حضور کو کیا غم ہے۔ صبر تو ان باتوں سے کسی عاشق کو کیوں آنے لگا۔ ننگ و رسوائی کے خیال کو تو نل نے سعًا خیرباد کہدی تھی مگر انیسوں کے کہنے سننے کو کیا کرتے۔ آہیں بدستور سرد رہیں۔ نالے اسی طرح گرم تھے۔ انتہا اِس سمجھانے کا اثر البتہ ہوا کہ در بدر خاک بسر۔ خاک اُڑاتے۔ دامن صحرا کو قطع کرتے نہ پھرتے تھے وہ بھی امید وصل یار کے صدقے ورنہ اُمید اسکی ہرگز نہ تھی ✦

جو لوگ جذب حسن و عشق کے قائل نہیں۔ جو لوگ دل کی بجائے پہلو میں پتھر رکھتے ہیں وہ مانیں نہ مانیں اور سچ یہی ہے کہ

درد بے درد کی بلا جانے	جس پہ گذری ہو وہ کیا جانے

مگر تجربہ اور عاشق و معشوق کے مشہور قصوں نے منکروں کی گردنیں خم کرادی ہیں اور بالآخر یک زباں ہو کر زمانہ کو یہ کہدینا پڑا ہے کہ جیسے حسن میں وہ بے پناہ جذب ہے کہ ایک دل و دماغ کیسا۔ ایک ہوش و حواس کیا عشاق کی تمام تر قوتوں کو کھینچ لیتا ہے۔ اِسی طرح عشق میں بھی وہ انجذاب، وہ اثر۔ وہ کشش ہے کہ بالآخر حسن اُسکے خاردار دام بلا میں پھنس جاتا ہے اور آخر حسن و عشق میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ معشوق بھی عاشقوں کی طرح دیوانہ وار صحرا کی خاک ریزی کرنے میں اپنی عمریں گذار دیتے ہیں ✦

ادھر نل کے دل میں آگ لگی۔ اس کے شعلے دم کے دم میں دکن کے ملک تک پہنچ گئے اور ایسے
پہنچے کہ دنیا کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کسی نے دیکھا نہ سنا۔ نابینہ دمن کے جسم و جان میں وہ
سوزش پیدا کر دی جو خود نل کے یہاں موجود تھی ابھی نل نہ سوتوں نہ ہو، مگر خضہ ور اسی صورت کا
کوئی آدمی ہوا کے گھوڑے یا بادل کے کاندھے پر سوار ہو کر۔ دمن کی آنکھوں کے سامنے
ایک سکنڈ ٹھیرا۔ دمن کو شرم آئی آنکھیں نیچی کر لی چاہیں۔ مگر کسی طاقت نے آنکھیں نیچی نہ کرنے
دیں۔ دم بھر اس کو دیکھ کر اس سے کچھ سننے والی تھی کہ خیالی تصویر آنکھوں کے دروازے سے
دل کے محل سرا میں پہنچ گئی۔ اب کیا تھا۔ لاکھ لاکھ کوشش کی مگر وہ تصویر کی لکیر ہو کر بیٹھ
گئی۔ وہ رات خدا جانے کیسے کیسے کٹی آنکھیں بند کیں کہانیاں سنیں ایک ایک سے ستارے گنتی
گنتی گئی رہی کہ خواب آئے۔ دوا کا بھی استعمال کیا۔ مگر کمبخت نیند صبر و قرار کی طرح آنکھوں سے
فقرہ ہو گئی تھی۔ ہزاروں ترکیبیں کی گئیں۔ مصرعہ

ع کا دل دلبر میں ہو کب اسکو پھر آتی ہے نیند

مگر چونکہ ہر بات کا انجام اور ہر کام کا اختتام ہوتا ہے۔ جوں توں کر کے دمن کے ایک دو ہفتے
گزر گئے۔ زمانہ موافق تھا عشق بے سہارا نہ تھا کہیں نہ کہیں سے ایک نل کی تصویر بھی بہم
پہنچ گئی۔ بس پھر کیا تھا ؎

یا حق تیرا تصور یا تو ہی ہو کوئی ہو   دل لگی سے دل کو مطلب لگی ہو کوئی ہو

والا مضمون ہوا۔ بے قراری کے وقت کے لئے سامان تسکین ہاتھ آ گیا جب یاد یار نے
بے تاب کیا۔ تصویر کو سینہ سے لگا لیا حسرتوں کی نظر سے دیکھتی۔ مگر کمبخت عشق و مشک
کا رنگ پکڑتا گیا۔ اس کا چرچا مشک کی خوشبو بن کر چار طرف پھیلتا رہا اور آخر کار تجسس اور
تلاش سے درد کو معلوم بھی کر لیا گیا اور دمن کے باپ سے کہہ بھی دیا کہ راجکماری
کے ہوش و حواس اڑ کر اجین کی سیر کو چلے گئے۔ ماں باپ نے در پردہ بہتیرا سمجھایا۔ عشق
کا انجام۔ اپنا غصہ۔ دنیا کی حالت اور بدگمانی کا نقشہ کھینچ کھینچ کر دکھایا۔ مگر عشق کا جن نہ اترا
جیسے یہاں دیوانگی عشق بڑھتی رہی نل کے یہاں یہ رنگ پختگی پر پہنچ گیا۔ اشک خون
پتہ دینے لگے کہ اب پورا پورا رنگ چڑھ گیا کوئی کمی نہیں۔ ایک دن باغ میں [illegible]

سرو، گل، نرگس، روانی نہالوں کو دیکھ کر کسی کے قد و رخسار، آنکھوں کو یاد کرکے آٹھ آٹھ
آنسو رو کر دل داغدار کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ تھوڑی دیر کا سامان تفریح ہاتھ لگا۔ جانوروں
کی ایک ٹکڑی آ پہونچی نوکر کو حکم ہوا۔ ان پر جال مارو۔ تعمیل حکم ہوئی۔ بہت سے اڑ گئے ایک کبوتر
پھنس گیا۔ اندازے سے نل نے سمجھا کہ اگر کام لیا جائے تو یہ کبوتر نامہ بری کے کام آ سکتا ہے۔
اندازہ صحیح ہوا۔ ایک خط دمن کے نام لکھکر مرغ نامہ بر ... کے موافق جانور کے
بازو پر خط باندھا اور اُسے دمن کے کاخ معروف کی طرف اڑا دیا۔ مرغ مع الخیر دمن کے باغ
تک پہونچ گیا۔ خدا جانے کیونکر دمن کو پہچان لیا اور آشفتہ نامہ عشق پیشکش کر دیا گیا۔
دمن اپنے باغ میں سیر کرتے جی بہلاتے کسی کو یاد کرتے پھر رہی تھی ... کنیزوں سے
ساتھ ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھی۔ کبوتر دم پر آ بیٹھا۔ اور جذب عشق نے
دمن کی نگاہ کو وہاں تک پہونچا دیا جہاں خط تھا کچھ کپکپی کچھ دھڑکن کچھ امنگ کچھ بیخودی عشق کچھ
توقع کچھ جذب دل کا گمان وغیرہ وغیرہ سب چیزیں ایسی آ موجود ہوئیں کہ ... کبوتر کے
پکڑنے کو اُٹھی۔ مگر وہ جانور خود اسی کا منتظر تھا وہ خود ہی گرفتار ہوا۔ نامہ پہونچا دیا اور اُسے پڑھا
ابھی، اُس وقت جذب دل نل نے جو کام کیا وہ کم نہ تھا۔ منہ پر زردی چھا گئی ہاتھ پاؤں میں
سنسناہٹ آ گئی۔ خط پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہو گئی۔ مگر آپ کو سنبھالا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ
کر مرغ سے کچھ باتیں کیں اور جواب میں اپنی بے قراری کا فوٹو بھیجدیا۔ نل کو خط پہنچتے ہی تاب
نہ رہی۔ رازداروں کے مشورے سے نل کے باپ سے خط و کتابت کی گئی۔ ادھر سے انہیں شرف
قبولیت دی گئی۔ آخر ایک دن آیا کہ نل نہایت حشمت و جاہ سے دولہا بن کر اجین سے روانہ
ہوا اور دمن کے شہر میں پہنچ کر اسے بیاہ لایا۔ مجھے اُن کی بارات کی شان و شوکت لکھنی نہیں ہے
ہونے کو کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔ وہ بھی راجہ یہ بھی مہاراجہ۔ مجھے شان عشق اور جذب محبت سے
بحث منظور ہے۔ یہ دیکھئے حسن نے ایک آن اور دیر میں جال ڈالا۔ اور جذب عشق نے کیا کیا
کام کیا۔ یہ جذب محبت یہیں ختم نہیں ہوا۔ ان دونوں کی زندگی میں اور جو واقعات پیش
آئے وہ بھی نہایت درد انگیز اور دلچسپ ہیں جو بہت مشہور ہیں۔ ان سے بھی عشق کی عبرت
انگیز کارروائیوں کا پورا پتہ چلتا ہے ٭

نل کی اپنی آوارگی کے زمانہ میں یہ شرمندگی کہ دمن میرے ساتھ کیوں تکلیف اٹھائے اور اسی خیال نے اس سے جدا ہو کر اپنے سینہ پر جدائی کی سل رکھنا۔ دمن کا اس سے جدا ہو کر مارا مارا پھرنا دمن کا سانپ سے گزند پانا۔ تو ہر نل کا سانپ سے دغا پانا۔ آوارہ ہو کر جہاں دمن کا پہنچنا وہیں قضائے کار سے نل کا جا نکلنا۔ دونوں کے رنگ کا تبدیل ہونا اور آخر میں مصائب و شدائد کے بعد پھر ملنا۔ یہ سب دل کے جذبے اور عشق صادق کے نمونے ہیں۔ اگر عشق عشق ہے تو اس سے بہتر دنیا میں کوئی شے نہیں اور اگر بوالہوسی ہے تو بد از دل ترین ناخلائق ہے ؎

غالب عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

عبدالباری آسی

غزل

اب کہاں ہے بار غم سے وہ سبکدوشی میری
چارہ گر! اس ہوش سے اچھی تھی بیہوشی میری

واعظا مغرور ہو جانا یہ، کہ میں مخمور ہوں
تیری خود بینی بھلی، یا خود فراموشی میری؟

بادۂ الفت کے اے دل! خم پہ خم پیتا تو ہوں
رنگ لائے گی کس دن یہ بلانوشی میری

شیشۂ دل پہ میرے پندار کا داغ آگیا
تیغ نازک سے تو اچھی تھی ہم آغوشی میری

دم بخود پا کر مجھے وہ سنگ دل بھی رو دیا
کم نہیں تاثیر میں نالوں سے خاموشی میری

حال دل کیونکر چھپے، ہاں چہرہ ہے دل کا آئینہ
کر رہی ہے شوق کا اظہار خاموشی میری

چارہ سازو! بادۂ الفت سے ہے میرا خمیر
جا نہیں سکتی کبھی ترشی سے مدہوشی میری

کہنے کو مرتا ہے قاتل کی ادا پر غیر بھی
کر نہیں سکتا مگر مشتاق ایسی ہمدوشی میری

حشر کے میدان میں رسوا ہونے سے میں بچ گیا
اس کی رحمت کو ادا نے کی خطا پوشی میری

مجرم الفت ہوں، بہتر ہے لحد میں جا چھپوں
ہے مناسب حضرت رنجور روپوشی میری

رنجور عظیم آبادی

قوم عاد

جنت شداد

ابتدائے آفرینش عالم سے اپنے زمانہ تک مورخین عرب نے ملک عرب کے باشندوں کو دو بڑی قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ ایک عرب بائدہ دوسری عرب باقیہ اور عرب باقیہ کی بھی دو قسمیں کر دی ہیں (۱) عاربہ۔ (۲) مستعربہ۔

بائدہ ان کا نام خود اسبات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان سے عرب کے وہ قبیلے مراد ہیں جو مدت ہوئی تباہ و برباد ہو چکے تھے اور ظہور اسلام سے پہلے ہی ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا۔ مورخین عرب نے ان کے نو قبیلے شمار کرائے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) عاد (۲) ثمود (۳) امیم (۴) عبیل (۵) جدلین (۶) طسم (۷) عملیق (۸) جرہم (۹) جاسم

اس وقت ہماری نیت صرف یہ ہے کہ عرب بائدہ کے سب سے قدیم طبقے قوم عاد کی تاریخ بیان کریں۔ جس کا نام و نشان صفحۂ دنیا سے مٹ گیا اور آثار معدوم ہو گئے۔

عاد کا نسب عاد کے بھی دو قبیلے تھے (۱) عاد اولیٰ (۲) عاد اخریٰ جن میں سے اوّل الذکر کے حالات ہم بیان کرتے ہیں۔ ارم بن سام بن نوح کے چار فرزند۔ عوص۔ غاثر۔ حویل اور مس تھے۔ اور عوص کا عاد تھا۔ از روئے توریت عاد آدم سے ایکہزار آٹھ سو اٹھارہ سال بعد اور حضرت نوح کے سات سو باسٹھ سال بعد پیدا ہوا۔

قوم عاد عاد اولیٰ کی اولاد ان قوموں میں سے تھی جو نہایت قوی ہیکل اور طاقتور ہوتی تھیں اور یہ قوم ایک ہزار سے زیادہ قبائل کا مجموعہ تھی۔ اس قوم کا مسکن "احقاف" "اور شحر" کے حدود تھے جو "عمان" اور "حضرموت" کے فی مابین واقع تھے۔ اور اب بجائے ان کے موجودہ زمانہ میں یہ مہرہ۔ شحر۔ احقاف۔ اور رمال پائے جاتے ہیں۔

اس قوم کے آدمی نہایت عظیم الخلقہ اور تنومند ہوتے تھے۔ اہل عرب ان کی قد کی درازی میں ایسے مبالغہ سے کام لیتے ہیں جس کے صحیح ماننے میں تامل ہے۔ مثلاً وہ بیان کرتے ہیں کہ

قوم عاد کا ہر ایک شخص ستر گز سے سو گز تک بلند قامت ہوتا تھا۔ اور ان میں جو شخص سب سے زیادہ پست قامت ہوتا تھا اس کے قد کی بلندی بھی ساٹھ گز سے کم نہ ہوتی تھی۔ اُن کے سر بڑے بڑے گنبدوں کے برابر اور آنکھیں وحشی جانوروں کے غاروں کی طرح ہوتی تھیں۔ اور اسی کے قریب قریب ان کی ناکوں کے نتھنے بھی کشادہ ہوتے تھے۔ مگر ہمارے خیال میں اس مبالغے کی وجہ یہ ہے کہ حیرت انگیز روایتیں ایک زمانہ سے دوسرے زمانے میں منتقل ہو کر پہلے سے زیادہ تعجب انگیز بن جایا کرتی ہیں۔ تاہم یہ مبالغہ اپنی تہ میں ایک گونہ اصلیت کو بھی ضرور مخفی رکھتا ہے۔ اور وہ اصلیت یہ ہے کہ قوم عاد کے لوگ بہت تنومند اور طاقتور تھے۔ اور اس باب کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ وہ "عمالقہ" کی مشہور قوی ہیکل قوم سے متفرع ہوئے تھے۔ اور جسامت و قوت "عمالقہ" کا خاصہ تھی۔

قوم عاد خیمہ نشین یا خانہ بدوش نہیں تھی بلکہ وہ اپنے ریگستان کے ٹیلوں پر بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے لیکن اب اس قوم کے آثار بالکل مٹ گئے اور کھنڈرات معدوم ہیں۔ اُن مکانات و عمارات کو جو قوم عاد نے تعمیر کئے تھے عرب کے عہد عتیق کے اصل تاریخ نے عادیہ کہا ہے۔

عاد اولیٰ کے تاجور

ان کے حکمرانوں میں سے صرف چند شخصوں کا نام معلوم ہو سکا ہے پہلا فرمانروا "عاد" ہے جس کی طرف یہ قوم منسوب ہوتی ہے

مورخین عرب کا بیان ہے کہ "عاد" نے بارہ سو برس کی عمر پائی۔ اس نے ایک ہزار عورتوں سے نکاح کیا۔ اور چار ہزار اولاد نرینہ خاص اس کے صلب سے پیدا ہوئی اور اس نے اپنی اولاد کی دسویں پشت تک اپنی زندگی میں دیکھ لی۔ بعض مورخین عاد کی عمر صرف تین سو برس کی بتاتے ہیں۔ تاہم یہ مبالغہ بھی ایک قسم کی حقیقت سے ملتا جلتا ضرور ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ اہل عرب "قوم عاد" کی قدامت سے واقف تھے۔ مگر ان کو اس قوم کے حکمرانوں میں سے صرف چند گنتی کے لوگوں کا نام معلوم تھا۔ لہذا انہوں نے ان کی عمریں بڑھا بڑھا کر قدامت زمانہ کی گنجایش نکال لی۔ اور درازی عمر کی بنیاد پر بیویوں کی کثرت بھی ٹھیک ہو گئی۔

"عاد" کے بعد اُس کا بیٹا "شدید" پانچسو برس تک حکمران رہا۔ اور اس کے بعد اُس کا بیٹا "شداد"

زیب دہ مسند ایالت ہوا دو شداد نے نو صدیوں تک فرمانروائی کی۔ اور اس کا عہد بقیہ عاد اولیٰ کا منتہائی عروج اقبال کا زمانہ بتایا گیا ہے۔ اس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ ملک شام کے اکثر حصوں کے علاوہ ہندوستان اور عراق تک پھیلا دیا تھا۔ اور ایک نہایت زبردست حکومت قایم کر لی تھی۔

ارم ذات العماد

وہ شداد کا عہد حکومت قوم عاد کے عروج کا زمانہ تھا۔ وسعت قلمرو شان و شوکت اور ثروت و قوت غرضکہ تمام وسائل ترقی ان کے ہاتھوں میں تھے۔ انہوں نے بہت بڑے بڑے شہر آباد کیے۔ شاندار اور خوشنما قصور بنا اپنے تعمیر کیے اور تمدن کے آثار ان میں پورے طور پر ظاہر ہو گئے۔ اسی "شداد" کی جانب ایک عالیشان شہر کی تعمیر منسوب کی جاتی ہے جسے اُس نے "جنت عدن" کے مشابہ بنوایا تھا۔ اور اسی لحاظ سے اہل عرب نے اس شہر کا نام "ارم" بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُسی "ارم" کا ذکر قرآن پاک میں ہوا ہے۔ مورخین عرب اس شہر کے حالات میں اسقدر مبالغہ آمیز روایتیں لکھتے ہیں جن کی صحت کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے بعض روایتوں کو اس مقام پر درج کرتے ہیں

مورخین عرب کا بیان ہے کہ شداد کتب قدیمہ کے مطالبہ کا دلدادہ تھا۔ اور ان میں جنت کا تذکرہ پڑھ کر خدائے پاک کی نافرمانی اور اس سے سرتابی کرنے کے زعم میں یہ خیال اس کے دل میں گزرا کہ وہ دنیا کا لطف اٹھائے اور ایک عالی شان شہر اسی صفت کا بنوائے رفتہ رفتہ جب یہ سودا اس کے دماغ میں پختہ طور پر سما گیا تو اُس نے "ارم ذات العماد" کی تعمیر کا تہیہ کیا۔ اپنے افواج کے زمرہ سے ایک سو تجربہ کار اور بری سپہ ساروں کو منتخب کر کے ہر ایک کی ماتحتی میں ہزار ہزار سپاہیوں کی جماعت مقرر کی اور اس طرح پر ایک لاکھ سپاہ مرتب کر کے ان سرداروں کو حکم دیا کہ سرزمین عرب میں کسی ایسے وسیع اور شاداب قطعہ ارضی کی تلاش کریں جس میں ایک نہایت خوش فضا اور شاندار شہر تعمیر ہو سکے اور اس شہر کی تعمیر میں سونے چاندی۔ یاقوت۔ زبرجد اور موتیوں سے کام لیا جائے۔ اس کی عمارتوں کو ایسی وضع سے بنایا جائے کہ یاقوت و زبرجد کے ستونوں پر محل بنائے جائیں اور محلوں پر برآمدے اور

کہ سونے چاندی کی اینٹوں سے تعمیر ہوں جن میں اعلےٰ درجہ کے جواہرات سے پچی کاری
و منگکاری کی گئی ہو۔ محلوں کے صحن میں خوشنما پائیں باغ ہوں جن میں خوبصورت اور تازگی
بخش شیرین پانی کی نہریں جاری ہوں اور گل و ریاحین کی عطر بیزی دماغ کو معطر کر رہی ہو۔
میں نے کتابوں میں جنت کا ذکر پڑھا ہے اور میں اس بات کی خواہش رکھتا ہوں کہ دنیا میں
اسی کا ایک شہر تعمیر کر کے اس میں سکونت اختیار کروں

اس کے سرداران فوج نے کہا کہ جہان پناہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے بجا اور درست ہے۔ لیکن
اس افراط کے ساتھ زر و جواہر ہم کو کہاں دستیاب ہوگا جس سے ایک ایسے عظیم الشان
شہر کی تعمیر کا سامان مہیا کیا جائے؟

شداد۔ کیا تم کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں تمام روئے زمین کا حکمران ہوں۔

سرداران فوج۔ بیشک آپ ہفت کشور کے فرمانروا ہیں۔ پھر؟

شداد۔ جن ملکوں اور مقاموں میں یاقوت، زمرد، سونے اور چاندی کی کانوں کا پتہ چلے
وہاں کان کنی کا اہتمام کر کے ان چیزوں کو نکلواؤ اور دریا۔۔۔ غوطہ خوروں کو موتی نکالنے
کے لیے متعین کرو اور اس بات کی تدقیق کرتے رہو کہ کن کن لوگوں کے پاس ان اشیاء کا ذخیرہ
ہے ان سے بھی حاصل کرو۔ غرض کہ اس ترکیب سے ان چیزوں کی اس قدر کافی مقدار جمع ہو
جائے گی جس سے ایسے کئی بلکہ شہر تعمیر ہو سکیں گے۔

سرداران فوج۔ بہتر۔ سر تسلیم خم کر کے اطراف عالم میں منتشر ہو گئے اور زر و جواہر کی فراہمی میں
مصروف۔ شداد نے ان لوگوں کو تمام سلاطین روئے زمین کے نام فرمان دے دیئے تھے
کہ وہ لوگ اس کے سپہ سالاروں کو علوبہ اشیاء کی بہم رسانی میں امداد پہنچائیں۔

دس برس کی محنت اور کاوش میں جب سرداروں نے بے پایاں ذخیرہ زر و جواہر کا فراہم کیا
تو شداد اب کسی ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں مشغول ہوئے جو اس قسم کے وسیع اور عالیشان
شہر کی بنیاد ڈالنے کے لیے موزوں اور بکار آمد ہو۔

شہر کا ہموار اور صاف قطعۂ زمین بہت کچھ تگ و دو کے بعد ان کو ملک عدن کی سرزمین میں
دستیاب ہوا۔ اور جس وقت انکی نگاہیں اس وسیع اور ہموار تختہ پر پڑی ہیں وہ بے اختیار

نعرۂ مسرت بلند کرکے بول اٹھے "روئے آہا! اہا۔ اسی قسم کا ہمارا تخیتہ ہم کو مطلوب تھا" یہ قطعۂ زمین پہاڑیوں اور ٹیلوں سے خالی اور نہایت سرسبز و شاداب تھا۔ ان لوگوں نے بہت جلد اس میں سے ایک معقول قطعہ کی پیمایش اور حد بندیاں کرکے ضرورت کے موافق اُس کے ہموار کرنے اس میں قرب و جوار کی ندیوں اور نہروں سے کاٹ کاٹ کر نہریں نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ اور اس سے فارغ ہوکر تازہ دودھ اور روغن بان کے گارے سے سنگ موسیٰ کی بنیاد دیں قائم کیں اس عرصہ میں روے زمین کے حکمرانوں نے تعمیر کا مطلوبہ سامان ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ اور بڑے بڑے ہوشیار انجنیر اور معمار بھی آگئے تھے۔ نقاش۔ دستکار اور ہر پیشہ کے بیشمار لوگ وہاں موجود تھے۔ کسی حکمران نے سونے چاندی کے مرصع ستون بنوا کر بھیجے تھے اور کسی نے صاف شدہ زر و نقرہ کی ڈھلی ہوئی اینٹیں۔ بعضوں نے مونگے اور موتی کے ذخیرے روانہ کئے تھے اور کچھ لوگوں نے دوسرے بیش بہا جواہرات کی بڑی مقدار ارسال کی تھی۔ الحاصل تعمیر کا کام شروع ہوگیا اور پورے تین سو برس میں وہ عجیب و غریب شہر مکمل ہوگیا جس کا نام بوجہ ان جواہر کے ستونوں کے جو اُس کی عمارتوں میں لگے تھے "ارم ذات العماد" رکھا گیا۔

شداد کو اس بات کی اطلاع ملی کہ شہر بالکل تیار ہے تو اس نے حکم دیا کہ اب اُس کے گرد فصیل قائم کرکے ایک عالیشان قلعہ اور اس کے گرد ایک ہزار قصر تیار کردو کیونکہ ہر ایک قصر میں میرا ایک وزیر رہے گا۔ اور نیز ہر ایک قصر پر ایک ایک پہرہ نصب کیا جائیگا۔ جس کے لیے ایک ایک محافظ متعین ہوگا۔ اس حکم کی تعمیل بھی تھوڑی مدت میں ہوگئی اور جس وقت شہر کے ہمہ تن مکمل اور مرتب ہو جانیکی اطلاع شداد کو دی گئی اور اُس نے اپنے خواص اور درباری عمائد اور وزیروں میں سے ایک ہزار شخصوں کو منتخب کرکے انہیں سامان سفر درست رکھنے اور "ارم" کو چلنے کا حکم دیا۔ اور اپنے حشم و خدم اور محلات میں سے بھی جن کا لے جانا مناسب تصور کیا ان سے بھی تیار رہنے کا ایما کیا۔ عملداری خدمت کے واسطے ایک ہزار آدمی ملازم رکھے اور "ارم" کے جانے کے واسطے تمام عملہ و فعلہ از سر نو منتخب ہوا جو تنخواہوں کے علاوہ خلعت و انعام سے بھی مالامال کر دیے گئے۔

بیس برس تک سامان سفر کا تہیہ ہوتا رہا اور آخرکار شداد مع اپنے تجویز کردہ رفقا کے شہر

مذکور کی جانب روانہ ہوا۔ قوم عاد کا بہت بڑا حصہ اپنے اصلی وطن میں سکونت پذیر رہا تھا۔ اور شداد کے ہمراہ صرف اسی قدر لوگ گئے تھے جتنے اس کے حکم سے تیار ہوئے تھے۔ شداد کوچ و مقام کرتا ہوا شہر ارم میں داخل ہونے کے شوق میں جا رہا تھا۔ اور اپنی دیرینہ آرزو کے حاصل ہونے پر مسرت کا اظہار کرتا تھا لیکن کارکنان قضا و قدر کچھ دوسرا انتظام کر رہے تھے جس وقت ارم میں داخل ہونے کو ایک دن کی مسافت باقی رہ گئی حق سبحانہ تعالے نے شداد کے ایسے گمراہ اور خیرہ سر کو قرار واقعی سزا دی اور اس پر اور اسکی قوم پر ایک ایسی مہیب ناک صدا نازل کی جس نے ان کے جگر کو شق کر دیا۔ اور دم کے دم میں سب کو ہلاک۔ شداد اسی طرح پر حسرت دل اپنے سینہ میں لئے ہوئے راہی عالم ہو گیا۔

بنانے تو بنالی پر یہ شداد نے سونچا | نہ میں جنت کے قابل ہوں نہ جنت میرے قابل ہے

اور وہ باغ اس کی قوم میں سے کوئی شخص آج تک ارم میں داخل ہونے پر قادر نہیں ہو سکا۔ پس شہر ارم اب کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ اور مقام بالکل خالی اور غیر آباد ہے۔ اور بعض مفسرین کا یہ بیان ہے کہ ارم آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص کا اونٹ کھو گیا۔ وہ اسکی تلاش میں جاتے جاتے شہر ارم میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں کی عمارات عجیبہ کا حال نہایت دلچسپی سے لوگوں میں بیان کیا کہ ارم کی تعمیر میں ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہے۔ جب یہ خبر امیر المومنین تک پہنچی تو آپ نے کعب بن مانع سے جو کعب الاحبار کے عرف سے مشہور تھا پوچھا کہ کیا تم نے کتب متقدمہ میں کسی ایسے شہر کا ذکر دیکھا ہے جس کا یہ شخص بیان کر رہا ہے انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! وہ شہر ارم ہے جس کا ذکر اللہ تعالے نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور آپکے یعنی امیر المومنین کے زمانہ میں وہاں ایک شخص گذرے گا۔

یہ ہے شہر ارم کا قصہ جس کو مورخین عرب نے لکھا ہے۔ اور ہر چند یہ مبالغہ اور غلط ملط روایتوں سے مملو کہا جائے گا۔ تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں قوم عاد کی دولت و عظمت کا پتہ ملتا ہے۔ اسکی فی الجملہ صداقت بھی ہم کو بتاتی ہے کہ عہد قدیم میں ملک عرب کیسے بیش قیمت اور گراں بہا سنگ و جواہرات کا مخزن تھا اور اسوقت کے سیاح بھی اسباب

کی شہادت دیتے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ زر و جواہر ہندوستان اور غیر ممالک کی پیداوار تھے اور ملک یمن کی خوشبودار پیداوار مُر اور لوبان کے تبادلہ میں حاصل کئے جاتے تھے۔

اور اگر فی الحقیقت شہر ارم کی بنیاد تعمیر کچھ اصلیت رکھتی ہے تو ممکن ہے کہ اس شہر کی بعض عمارتوں میں مرصع ستون لگے ہوں یا ان کی دیواریں جواہرات کی پچی کاری سے تیار کی گئی ہوں۔

عاد اولیٰ کی ہلاکت

شداد اور اس کے ساتھ والوں پر جو حادثہ گزرا اسکی تفصیل اوپر بیان کیجا چکی ہے۔ اب قوم عاد کے باقیماندہ حصّہ کا حال سنئے جو اصلی وطن میں مقیم رہا تھا۔ اُن کی نسبت مورخین عرب نے ارقام کیا ہے کہ وہ قوم متواتر تین سال تک قحط کی سختیاں جھیل کر بالآخر تنزل ہوا اور گردباد کے طوفان سے تباہ ہوئی۔ اور وہ تباہی کے وقت تک اپنے عروج اقبال سے بہرہ ور تھی۔

انکی ہلاکت کا سبب سرکشی اور کفر بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ پتھروں اور درختوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ سنّتِ خداوندی ہے کہ پہلے گمراہوں کو راہِ راست بتائی جاتی ہے اور جب وہ نہیں مانتے اور اپنے فعل سے توبہ نہیں کرتے تو ان پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اسی اصول قدرت کے مطابق قبیلہ عاد کے اعلےٰ اور افضل خاندان میں سے ایک نبی مبعوث ہوئے جن کا نام ”ہود“ تھا۔ ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو راہ راست کی ہدایت کی اور عبادت الٰہی کی تعلیم دی۔ لیکن ان لوگوں نے سرتابی اور سرارتوں پر کمر باندھی جس کے باعث سے ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔ بارش باران مسدود ہو گئی۔ اور چونکہ ملک عرب کی سرسبزی بارانی سیلابوں پر موقوف تھی اس لیے ان کے ملک میں قحط پڑ گیا۔ اور تین برس تک وہ فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا رہے۔ لیکن اس پر بھی انکی آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ اپنے کفر اور شرارت سے باز نہیں آئے بالآخر جبکہ وہ پانی کی تلاش میں تتر بتر ہو کر ایک وادی میں جس کو مغیث کہتے تھے پڑے ہوئے تھے کہ دور سے کالی گھٹا نظر آئی۔ ساری قوم میں بہجت و سرور کی روح دوڑ گئی لیکن اسی وقت جبکہ قوم خوشی میں مصروف و منہمک تھی خداوند تعالےٰ نے گرم ہوا بھیجی جس میں سے شرارے نکل رہے تھے۔ یہ آگ کی سات رات اور آٹھ دن تک برستی رہی۔ اس میں قوم عاد کا فیصلہ ہو گیا اور حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے متعلقین جنہوں نے ایک اونٹوں کی پناہ گاہ میں نشست

بنا کہیں متی زندہ بچ گئے۔

جمہور مورخین کا اتفاق ہے کہ عاد اولیٰ کی ہلاکت کے بعد باقی قوم "عاد اخریٰ" کے لقب سے ملقب ہوئی اور یہ وہی لوگ تھے جو حضرت ہود پر ایمان لا کر یا بطور وفد ملک احقاف سے نکلکر دوسرے ملکوں میں نکل گئے اور اس طرح ہلاکت سے بچ گئے

شیخ محمد انوار الدین

غزل

ہم سا بھی خوگر جفا نہ ہوا	تم سا دنیا میں بےوفا نہ ہوا
اور دو چار جام دے ساقی	ایک ساغر میں کچھ بھلا نہ ہوا
تم نہ آئے تو آ گئی ہم کو موت	یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
دوست کی کیا شکایتیں کرتے	غیر سے بھی کبھی گلا نہ ہوا
ہم بھی پچھتائے کرکے نہ وفا	وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا
وہ جو آئے دکھاتے اپنا حال	ہم کو اتنا بھی حوصلا نہ ہوا
پھر بھی سات آسمان الٹ دیگا	نالہ میرا اگر رسا نہ ہوا
کشتیٔ عمر اور سیل فنا	میرے اللہ ناخدا نہ ہوا
کچھ عجب ہے روش زمانہ کی	کوئی آفت میں آشنا نہ ہوا
کیا ہی ہے باوفا خیال تیرا	دل سے میرے کبھی جدا نہ ہوا
ایک عالم کو کر دیا بے خود	کون ہے تجھ پہ جو فدا نہ ہوا
دیکھنا کاش تیرا اچپتا نا	کوئی ہیں زندہ پس فنا نہ ہوا
مجھ کو مارا اداے دلبر نے	شکر احسان موت کا نہ ہوا
روز آئیں نیا ستین تازہ	دل کی دنیا میں صمد کیا نہ ہوا

سید الاسلام صمد

افسانۂ صنوبر

ذیل میں ہم حضرت ابو المعانی خلیقی دہلوی کی قلم سے لکھا ہوا ایک ایسا افسانہ درج کرتے ہیں جو افسانہ بھی ہے اور ملک کی فلاکت کا آئینہ بھی۔ اس سے جہاں ایکطرف ادب لطیف کے دلدادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں وہاں قوم اور ملک کی عشرت اور تباہ حالی پر رونے والے بھی دل دکھا سکتے ہیں یہ کہنا بالکل مبالغہ سے بری ہے کہ اس وقت دلی میں اس طرز میں جو سجاد خلیقی نیاز کا مخصوص رنگ ہے خلیقی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ سید سجاد حید رصاحب نے ترکی لٹریچر سے مستفید ہوکر اردو میں ایک نئے طرز تحریر کی بنیاد ڈالی اس کے بعد اس رنگ کو بہت کم لوگوں نے اختیار کرنے کی جسارت کی مگر حضرات خلیقی اور نیاز کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ اب جادۂ تقلید سے بہت کچھ الگ ہیں اور انہوں نے اسی رنگ کو ایک مستقل رنگ کی حیثیت سے ادب اردو میں شامل کر دیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب یہ رنگ ہی ادب اردو کی جان اور اصل جان ہے حضرات خلیقی اور نیاز کے مضامین سے تمدن کے اوراق مزین ہوتے رہے ہیں مگر اس وقت تک جناب خلیقی کی رستاخیز قلم سے تمدن کبھی کبھی مستفید ہوتا تھا لیکن اب امید قوی ہے تمدن اپنے دوسرے دہلوی دور میں خلیقی صاحب جیسے تغافل شعار اور معشوق صفت مضمون نگار سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گا

(اڈیٹر)

"وہ روز آتے ہیں اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں!!"

میرے کمال موسیقی کی پر کیف تعریف، مگر میرے پیشہ کی تضحیک، میرے حسن کی پر شوق مدح، لیکن میری عریانیوں کی طویل مذمت، میرے وفا پیشہ جسم کی پرواز محترم ثنا، مگر میرے ہرجائی ہونے کا تلخ ترین گلہ، یہ ان کے روز کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پھر کیا میں ان سے ناراض ہوگئی؟ نہیں!

کیا میں نے ان کی ان جسارتوں کو کبھی رد کیا؟ نہیں!

کیوں —— ؟

ان کے انداز خطاب میں کچھ سنجیدگی کی اس طرح آمیزش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ بھی کہے نہ بنتا تھا ـــــ وہ سب کچھ کہتے، اور میں اس لطف مجبور سے تباہ ہوتی تھی ـــــ

انہوں نے میری خاموشی کو فریب متانت کہا، کیا میں بھی نہیں ؟ نہیں بھئی!

انہوں نے میری تعزیر شکستہ کو پیام تضرع کہا، کیا مجھے اس سے تکلف نہ ہوئی ؟ ـــــ

نہیں ہوئی!

میرے تپاک پذیرائی کو انہوں نے طلسم آداب کہا، میں نے سُنا، مگر کس طرح ؟ ـــــ

تلملا!

میرے حسن امتفات کو انہوں نے عقدۂ طمع سے تعبیر کیا، میں دیکھا کی مگر ـــــ

کس دل سے ؟ بہ خاطر مجبور ـــــ!!

پھر ـــــ ؟ حقیقت تو یہ ہے اخلاص کے اس ردّ عمل سے میں پریشان تو ضرور ہوتی تھی، مگر ناراض ہو جانے، اور بیچ بیچ بگڑ بیٹھنے کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوا ـــــ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی جی چاہتا تھا کہ یہ اس کج بحثی سے باز آجائیں تو بہتر، یہ میرے ہر وقت حریف نہ بن جایا کریں تو کیا ہی اچھا ہو!!

ـــــ بھری ہوئی بزم میں جب میری وزدیدہ نگاہوں کا کوئی ہدف ہوا ـــــ تو وہ بھی منہ پھیر کے پکار اُٹھے "میں بھی"!

ـــــ میں نے اطمینان سے، جب کسی کو دومنٹ دیکھا بس انہوں نے چپکے سے کہدیا! "اب تو بس کرو" ـــــ میں نے ذرا فکر و تفحص سے نگاہیں نیچی کیں اور کچھ سوچنے لگی۔ وہ بھی معاً کہہ اُٹھے: خدا کرے، "انفعال ہو ـــــ"

ان کی ان بڑھتی ہوئی ملیح شوخیوں کو دیکھکر ـــــ مجھے انہیں متنبہ کر دینا چاہیے تھا، مجھے انہیں روک دینا چاہیے تھا وہ میرے رجحانات طبع، اور میلان خاطر، کو جس جد و جہد کے ساتھ بوجھنا چاہیے، اور پھر اس کے ساتھ ہی کسی خاص سمت کو جو وہ میرے داعیات و حسیات کا رخ پھیر دینا چاہتے تھے مجھے لازم تھا اُن کی اس حریفانہ سعی کو فوراً روک ٹوک میں لے آتی!!

اور یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ میں ہمیشہ ایسے مواقع "تعرض و تمسخر" پہ بگڑ جایا کرتی ہوں۔ ــــ مگر خدا ہی جانتا ہے، کیوں میرا دل ہی سے "اُن کے اس استہزا کے مضحکہ" سے مانوس ہوتی گئی اور کبھی جرأت نہ ہوتی کہ میں ان سے کہہ دوں "بس صاحب بس"!

تاہم ایک خلش دروں تھی اور وہ یہ کہ آخر یہ کیا بات کہ

"وہ روز آتے ہیں اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں!!"

ہر چند کہ میرے گرد و پیش کے حالات، اور میرے ناز و تنعم کے اہتمامات مجھے اس قسم کی گہری چٹکیوں کے بل اسے لینے پر مجبور نہ کرتے تھے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آہستہ آہستہ اندر ہی اندر میں کسی مخفی تحریک سے متاثر ضرور ہو رہی تھی، میری آنکھیں، میرے مضحکہ اڑانے والے کا پرخلوص احترام کرنے لگی تھیں، ہاں کچھ ایسا احترام کرنے لگی تھیں جو اس سے پہلے وہ کسی کا بھی نہ کر چکی تھیں۔

میرا دل، حافظہ کی امداد سے ان کی محبت پذیر باتوں کا، ان سے دور ہو کر بھی لطف اٹھانے لگا تھا، اور اب تو اس ایک گونہ شکستِ پندار کا بھی احساس کم ہونے لگا تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میری خود داری، میری جبیں تمکنت، اس تذلیل گوارا ــ اس تحقیرِ منظور کی عادی سی ہو گئی ہے!

آہ، بالضرور میرے اندر اک ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی، جو مجھے اس قسم کے انداز کلام و طرزِ خطاب کی جانب مائل کرتی رہتی تھی! آہ کسے معلوم ہے کہ "وہ جو روز آتے ہیں اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں"!! وہی میرے اندر ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دینے کے ساعی ہیں، اور کون ہے جو نہ جان جائے گا کہ اُن کی ان حسین کوششوں میں ان کا کوئی بلیغ مدعا تو پنہاں نہ تھا ــــــــ!!

میری حیات رقص و نغمہ، آہ میری ہستی عریان و رسوا! مجھے تسلیم ہے میرے فطری گداز و ترنم کو مسخ و پامال کر چکی، میں نے کسب معیشت میں سعی مذموم کی، میں نے اکل و شرب کے لیے ناچ ہی قدم بڑھایا، تاہم یہ صحیح ہے کہ میری فطرت اس اقدام سے زخمی ہو گئی، اس سے میری شہرت ماند پڑ گئی، مگر سبیل پند و نصیحت سے فائدہ، غالباً تمہیں اعتراف کر لینا پڑے گا،

آپ یاد کر لیجیے، مجھ سے اپنی ساری عریان زندگی میں صرف ایک مرتبہ غلطی ہوئی ہے اور پھر وہ بھی مجبور ——— "اگر میرا حریف میری رانہ نالی پر ذرا دل دکھا لیتا ——— میری التجاؤں پر ذرا توجہ کر لیتا، میرے اضطراب کو ذرا سمجھ لیتا تو میں ساری عمر کے لیے عصمت اور عزت کو بچا لیتی" ——— اب نہ مجھے ماں باپ کا گھر قبول کر سکتا ہے، اور نہ اشتراک جنسی کے لیے کوئی عزت حاصل ہو سکتی ہے، میں میری روح تاریک نہیں ہے، میری حسیات مردہ نہیں ہیں، مجھے نہ ستاؤ، مجھے نہ چھیڑو، مجھے زیادہ ذلیل نہ کرو ———

ہاں میں تمہارے شریفانہ جذبات سے اپیل کرتی ہوں کہ اگر مرد ہو تو ہندوستان کے تباہ حال گھرانوں کو نکبت و فلاکت کی اس آخرین ذلت تک پہونچنے سے بچاؤ، ہمارے ملک کی روز افزوں مالی نزاکتوں اور اقتصادی مشکلوں نے ہماری عفیفہ اور باعصمت بچیوں کی عزت پر بنا دی ہے یہ فواحشات کی کثرت، اور زنا و حرام کے مخصوص مقامات کی یہ رونق، اور خفیہ آوارگیوں کی یہ زیادتیاں۔ آخر کب تک تمہاری توجہ کو اپنی جانب مائل کر سکیں گی" اب زیادہ وقت نہیں کہ تم ملک کی اس تکلیف، اپنے معاشرت کے اس زخم سے اغماض کرو اس کے بعد اگر عزت کی وہی نگاہیں میرے واسطے مخصوص کر سکتے ہو جو اک باعصمت خاتون کا حق ہیں تو آؤ میرا ہاتھ پکڑ لو، مجھے رقص و نغمہ کی زندگی سے اٹھا لو۔ مجھے بوالہوسوں کے حسن سلوک اور فریب مطامع سے بچا لو، میرے حسن کو نمایش مذموم کی عادت ثانیہ سے سبکدوشی بخشو، عورت ہاں مثل حباب ہے اس کی فطرت بدل نہیں جاتی، ایک ذرا سا سہارا دو، وہ پھر تجدید عہد کرتی ہے۔ اس کو موقع دو کہ وہ وعدہ کی شان ایفا پھر پیش کر سکے!

سنبھل اگر چاہتے ہو، تو صنوبر کو، ہاں جس کا اصلی نام صغریٰ ہے تم ذرا سی امداد میں اس کو قعر مذلت سے نکال کر عزت و فراغت کی بلند ترین جگہ پر بٹھا سکتے ہو"

محبت و پرستاری کا مفہوم تو میں نہیں جانتی، طاعت و بندگی کے جذبات سے ہاں میرا سینہ معمور ہے، کیا تم اس کو، اس متاع حقیر کو خرید لو گے؟

فخر جنسی، اور غرور فطرت، مجھ سے میری قسمت نے لے لیا ہے، اگر تم چاہو تو زخمی دل،

اور منفعل حیات پیش کر سکتی ہوں "۔

اقتدار محبت، اور دل پر حکمرانی، میں اب سنگر سکوں گی گر سلامی کا عرصہ ہے، شکیبا آنکھوں کی سمت موجود، اور عجائبات آثار جبین کے سجدے میرے پاس سے بھی کہیں نہیں گئے ——"

کچھ کہو، کچھ فیصلہ کرو، خدا کے واسطے مجھے یہ کہنے کے قابل بنانے رکھو کہ ——،

"وہ روز آتے ہیں، اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں"

یہ تفصیل تھی، اس اختصار کی جس کا اختصار میری اس تفصیل کا محتاج نہیں جبکہ میں اس اخلاص عمیق کا، اس آزمائش عظیم کا چار سال مسلسل مقابلہ اور مطالعہ کرتی رہی" اور وہ

"وہ روز آتے اور میرا مضحکہ اڑا جاتے"

آپ یقین کیجئے، اب مجھ میں اس مزاج کے برداشت کی زیادہ قوت نہ تھی، اس قدر بسیط امتحان کے بعد کچھ اور دنوں میں مزید آزمائش کے لیے آمادہ نہ تھی جبکہ ایک روز شام کو وہ آئے اور میرے خیالات میں ایک طوفانی تموج پیدا ہو گیا، میں بخار میں مبتلا تھی، ان کی عیادت، آہ بیماری سے آگاہ، اجنبی کی عیادت نے ستم برپا کر دیا، جبکہ میرے آنسوؤں کی فراوانی نے ان کو بیتاب الم کر دیا وہ میرے پاس بیٹھ گئے، خادمہ چلی گئی، سب لوگ ہٹ گئے، میں نے کہا نہیں آخر یہ چار سال کے مسلسل مصارف کی برداشت اور یہ بے تو ضعانہ سلوک، اخلاص آخر اپنی نفاسعات کی کوئی غرض بھی رکھتا ہے؟

بوالہوسوں کے اندازِ صرف سے تم نے ہمیشہ بلندی دکھائی، اور اس مکان کی مالک بڑی بی سے کبھی تم نے وہ نہ کہا —— جو روز ظلوم کہتا ہے ——"

اچھا پھر آسان ظلم اور اسی میں میری سرزمین بھی پنہان نہیں کہ کہہ دیتے شاید تم "مجھے کرلطف سے دیکھتے ہو" لیکن آہ! میری نظروں کا آشیانہ یوں بھی تاراج ناکامی ہی رہا —— پھر بتلاؤ تم کو اس طرح جینے میں کیا لطف ہے، اور میرے مر جانے میں اب کیا روک ہے؟

یہ حقیقت ہے ہذیان نہ کہو، یہ پیغام موت ہے اس کو بخار نہ سمجھو، کاش اس آخری لمحہ حیات میں تم مجھے اپنی پاک محبت کا پیغام دے سکتے آہ —— دیدیتے!"

بخار کی شدت اور ضعف نے مجھے بیہوش کر دیا اور نہیں معلوم میں کب تک بے ہوش رہی

——— مگر ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے جس خواب کو میں نے دیکھا، اسکی بناء پر کہہ سکتی۔ اس وقت سے آج تک میں دن کو اور رات کو ہمیشہ وہ خواب ہی دیکھتی ہوں، آہ! میں نے دیکھا تمہیں نہایت مضطرب و پریشان میری مسہری کے پائیں میں بیٹھے ہیں اور میرے پیروں پر اُن کا سر ہے!

میں نے آنکھیں بند کر لیں ——— "تاکہ بیداری کی پہلے تو تشفی ہو جائے۔ آہ! **فرشتہ** نے **گنہگار** عورت کے دونوں پاؤں چشمۂ کوثر کے پانی کے قطروں، آہ، اپنے پاک آنسوؤں سے تر کر دیئے! مجھے ایک برقِ اضطراب نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اور میری آغوش مسترحم انداز کے ساتھ وا ہو گئی ——— "اور دنیا شاید نہیں جانتی کہ محبت کا خمیر آنسوؤں کے پانی سے گوندھا گیا ہے"!

میرے کان اس تقریر کی لذت سے ابھی تک سرشار ہیں اور میری حالت اس اعلانِ شرافت کی شاہد موجود جو اس وقت تمہیں کے انقلاب عمل سے پیدا ہو کر قائم رہ گیا!

صنوبر! پاک خیال صنوبر! مجسمۂ حسن و شرافت صنوبر! تم ماں باپ کی صغرا اور اپنے پرستار کی صنوبر ہو!!

تم باور کرو! میں تمہارے واسطے جہاد کرتا ہوں اور اپنی بلا زوال محبت کا اعلان! مجھے تسلیم ہے سوسائٹی ابھی فرضی عزتوں کے گورکھ دھندوں میں مبتلا ہے۔ اس کے اہل اصلاح مقاصد کی عملی تدبیر مذموم ہے! تاہم مجھے پرواہ نہیں، یہ چار سال کی خاموشی۔ اور یہ صرف جائزہ اس بنا پر اور رکھا کہ میں تمہارے کیریکٹر کا مطالعہ کر لوں، اور زیر باری اس واسطے کہ تم غریب طمع کے ہاتھوں جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں ان سے محفوظ رہ سکو!

شک ہے تمہاری دلپذیر صورت نے جو نقش قائم کیا تھا اسکو تمہاری جمیل سیرت نے اور مستحکم اور گہرا کر دیا!!

میں ملک کے ان لفظی اصلاح کی چیخ پکار کرنے والوں کے سامنے تمہارے الفاظ کیساتھ اپیل کروں گا کہ وہ خدارا بیدار ہوں۔ اور ہماری معاشرتی غلطیوں عسرت و فلاکت سے مبتلا ہونے والوں کی حالت پر متوجہ ہوں۔ ایک عالمگیر بیت المال کی طرح ڈالنا چاہیے،

کثرت سے دار الامان قائم ہونے چاہئیں۔ اور بروقت امداد دینے والے بہت سے
انتظامات ہونے چاہئیں، جس سے بخت وعسرت ہماری قوم سے دور ہو۔ اور فلاکت
وفاقہ زدگی سے جو مصیبتوں کا ارتکاب انسان سے ممکن ہے اس سے قوم محفوظ رہ سکے!
مرد، آزاد مرد، جو بے حس، اور بعض مواقع پر حد درجہ حقیقتہً درندہ ثابت ہوتا ہے، خدارا اسلامی
کے نظام امن کو درہم وبرہم نہ کرے، وہ نہیں جانتا کہ اسکی شہوت! اسکی سیہ مستی۔ اسکی
معصیت، اسکا فریب جنس نازک کے حق میں بعض اوقات کیسا ناقابل تلافی ظلم ثابت
ہوتا ہے علی الخصوص اسکی وہ ابلیسانہ جسارت جبکہ وہ حسن نسائیت کے برباد کردینے پر
جری ہوجائے!
آہ عورت ایک مرتبہ بہک جائے، پھر کسی قابل نہیں رہتی!
اور مرد، ناہنجار، مرد تو روز مشغول معصیت ہے، اور پھر سوسائٹی تجھے اپنے میں سے
باہر نہیں نکالتی؟
اس کمزوری، اس احتساب نفس کے احتراز سے ایک جنس فائدہ اٹھائے۔ اور دوسری
جنس، رسوائیوں، ذلتوں، اور مصیبتوں کی زندگی بسر کرے۔ شرم! شرم!!
صنوبر! پیاری صغرا!! میری جانب سے تیرے واسطے یہی عزتیں ہیں جو پاکدامنوں کا حصہ
ہیں۔ میرا دل اور اس کی محبت بجنسہ پیمان الفت کے ساتھ تیرے حضور پیش ہے تو قبول کر!
تو نے جہاد علی النفس کیا ہے۔ تو نے مرد کے مظالم کی پاداش میں مصیبتیں جھیلیں ہیں۔ تو نے
سوسائٹی کی غفلت سے درندوں میں استقامت بسر کی ہے، تو نے ملک کی مشہور ذی حسن
آبادی کو پیغام توجہ دیا ہے، تو نے گنہ گار طبقہ میں رہ کر اس شے کی حفاظت کی جسکی
حفاظت پر تو قطعاً قادر نہ تھی"
سترہ سال کی نازنین عمر میں، تنہا جس مضبوط کیرکٹر کا تو نے نمونہ پیش کیا ہے آج وہ
ستر سال کے معمر مرد سے ناممکن ہے۔
ہاں پیاری تیرا وہ راز جو مخصوص تباہی کے ہاتھوں تیرے خاندان سے وابستہ ہو گیا ہے۔
ہاں جب ایک خاندان کی وہ رسوائی جو انکی لڑکی کے چھ سال کی عمر میں غائب ہوجانے سے،

تمہارا بھید بن گئی ہے۔ کبھی کسی پر ظاہر نہ کروں گا ——— صنوبر اس وقت میرا وعدہ تو اپنی تشفی کا ذریعہ بنا۔ بہت جلد ہم تم وہ ہوں گے جس کا مجھ کو اور تم کو اشتیاق ہے۔" میں محبت کے ساتھ تیرا احترام کرتا ہوں ——— " اور ہمیشہ کروں گا!

خلیق دہلوی

اضطراب عشق

پھر کسی ماہ رُو پہ دل آیا — پھر مقدر نے رنگ دکھلایا

پھر زبان پر ہے ہائے ہائے جگر — دل ہے بیتاب جان ہے مضطر

پھر وہی آج بے قراری ہے — سینہ کوبی ہے آہ و زاری ہے

جوش گریہ کی پھر ہے طغیانی — سر سے اونچا ہوا ہے پھر پانی

پھر وہی اضطراب ہے دل کو — پھر وہی پیچ و تاب ہے دل کو

پھر پریشانیاں ہیں الجھن ہے — درد لب ہائے مشفق من ہے

جوش وحشت نے پھر شتاب مہر — ہاتھ جاتا ہے پھر گریبان پر

آپ میں آنا پھر ہوا دشوار — پھر زبان پر ہے ہائے صبر و قرار

پھر وہی بے ہوشی سی طاری ہے — پھر وہی کیفیت ہماری ہے

پھر ترقی پہ درد فرقت ہے — جان امیدوار رخصت ہے

پھر ستانے لگی کسی کی یاد — جگر و دل ہیں مائل فریاد

پھر ہے آشوب پھر کسی کا خیال — جی ہے پھر اضطراب غم سے نڈھال

پھر وہی بے کسی ہے اور ہم ہیں — ہائے پھر ہاتھ صرف ماتم ہیں

ہائے پھر بیٹھا بیٹھا درد اٹھا — رنگ پھر اضطراب دل لایا

نالے پھر آسمان پہ جانے لگے — فتنۂ حشر کو جگانے لگے

پھر وہی سلسلے ہیں اور سادن — سر پہ وحشت کا پھر سوار ہو جن

پھر وہی کیفیت ہے سکتے کی — نبض دو دو پہر نہیں چلتی

پھر ہے موجود شام تنہائی۔ پھر مرے گھر میں یہ بلا آئی۔

پھر وہی ہم ہیں اور ہجر کی رات دل مضطر ہے مورد آفات

پھر وہی شوق گوشہ گیری ہے پھر وہی ہم وہی اسیری ہے

ٹوٹا غم کا پہاڑ پھر سر پر زندگی ہو رہی ہے پھر دوبھر

پھر تمنا ہے خاک ہونے کی کنج مرقد میں جا کے سونے کی

مروا دے ضبط اضطراب دروں کہیں پھر ہو نہ جائے مجھ کو جنوں۔

پھیل جائے کہیں نہ یہ قصہ دردِ دل کر نہ دے کہیں رسوا

عشق کافر کہیں نہ لائے رنگ دوستوں سے نہ ہو کہیں پھر جنگ

دل کو صبر و قرار دے یارب

ضبط پر اختیار دے یارب

میر آزاد جعفری

ہرن

کوئی عاشق سے دنیا میں نہیں ہے خالی۔ ہر روش گلشن دنیا کی ہے دیکھی بھالی۔

[illegible] کس کی نظر جب ڈالی بادۂ حسن سے مدہوش ہیں اور متوالی۔

چشم بد دور ہیں آہو کی رسیلی آنکھیں

دیدۂ حور سے بڑھ کر ہیں نشیلی آنکھیں

چشم لیلٰے ہیں غزالانِ ختن کی آنکھیں دل سے عاشق کے لیے ہیں یہ ہرن کی آنکھیں

پہچانتے کیا ہو نہیں کیسی ہرن کی آنکھیں پہلی شب جیسی ہو اس شرمیلی دلہن کی آنکھیں

سرمگیں آنکھ بھی ہے چال بھی مستانہ ہے

جب سے دیکھا ہے ہرن دل مرا دیوانہ ہے

دیکھو صحرا میں ہرن کو جو دم جلوہ گری سرمگیں آنکھیں ہیں کیا غضب سحر بھری۔

چال وہ چال فسانہ جس پہ دل کبک دری دیکھیے چھل بل کو تو سو جان سے صدقہ ہو پری

محو گلگشت جو صحرا میں ہرن ہوتا ہے

نشۂ حسن حسینوں کا ہرن ہوتا ہے

شوخ معشوق سراپا ہے یہ آہو کب ہے زہرِ چشم فسوں ساز میں جادو کب ہے
اس پہ صیاد کو آسانی سے قابو کب ہے نکہتِ مشک سے بڑھکر کہیں خوشبو کب ہے

شیفتہ اپنا زمانے کو بنا رکھا ہے

نافۂ مشک کو پہلو میں چھپا رکھا ہے

شوخ و طناز غزالوں کو بنایا کس نے نافۂ مشک سے صحرا کو بسایا کس نے
ناز و انداز و ادا ان کو بتایا کس نے کر کے جنگل کو پرستان دکھایا کس نے

اے رسا خاک سے جو چیز عیاں ہوتی ہے

مظہرِ صنعتِ خلاقِ جہاں ہوتی ہے

سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی۔

درسِ محبت

جوڑا کبوتروں کا ایک بیٹھا تھا ایک درخت پر پھوٹے وہ سبز و نیلگوں اور زمردیں وہ پر
گنڈے وہ صاف اور سفید جیسے ہو چاند پر ہلال ایک پری کی شکل کا دوسرا حور کی مثال -
آنکھوں میں نور کی چمک دل میں سرور کی جھلک لطف فزائے باغ تھی ان کی زبان کی چہک
خوف نہ باغبان کا تھا اور نہ شکاریوں کا ڈر گوج رہے تھے بے خطر بیٹھے ہوئے وہ شاخ پر

آیا تھا سیر باغ کو نورِ نگاہِ شہریار چشم و چراغ ہند کا یعنی سلیم نامدار
پھرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتا تھا بہار باغ چہچہے تھے باغ میں چار طرف ہزار بلغ
دل میں امنگ سر میں جوش اور چڑھا ہوا شباب جیسے پیے ہوئے کوئی بادۂ تیز و مشکناب

اہوئے بیزر کی طرح چا ہا ادا سے رم کرے
بہر کے طرار و ناز سے قتل سلیم ستم کرے۔

ہو گئی شاہزادے کو اس کے ارادوں کی خبر
دامن یار کو لیا جوشش دل نے دوڑ کر

شرم سے سر جھکائے وہ بادۂ عشق سے مست
ناز کا تھا وہ انتظام شوق کا تھا یہ بندوبست

دے کے وہ طائر اسیر اس سے سلیم نے کہا
دوسرا ابھی کروں گا صید اس کو لیے رہو ذرا

اتھیں لیے ابھی ابھی جانا نہ تم کسی طرف
چھوٹ نہ جائے یہ کہیں دھیان نہ ہے ادھر

صورت بوئے گل سلیم کنج سے جب نکل گیا
زینت دست نازنین تھا وہی طائر خوشنما

وصلی کو فرصت پاکے وہ زور سے پھڑپھڑا اٹھا
خوف سے یہ اچھل پڑی صاف اسیر چھٹ گیا

ہو کے رہا اسیر تو اڑ گیا بام چرخ پر
دوسرے کو لے سلیم اتنے میں آ گیا ادھر

دے کے کبوتری لے پوچھا کہ نر کہاں گیا
ہاتھ میں خالی کس لیے صید حزین کو کیا کیا۔

خوف سے شاہزادے کے کانپ گئی وہ تن
نظریں زمین پہ گاڑ دیں کچھ نہ کیا مگر سخن۔

پوچھا سلیم نے یہ پھر کچھ تو کہو کہ کیا ہوا
خوف سے کانپتے ہوئے اس نے کہا کہ اڑ گیا

پوچھا کہ کس طرح چھٹا اڑ کے گیا ہے اب کدھر
تم سے سنبھل سکا نہ حیف ذرا سا جانور۔

کچھ تو کہو زبان سے سامنے چپ کھڑی ہو کیوں
پاکے مصر سلیم کو وہ بھی اڑا دیا کہ یوں"

آہ وہ اے سادگی کچھ نہ سلیم کہہ سکا۔
روئے نگار کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا

مکتب عشق میں اڑے ہوش و حواس اس طرح
نورجہان کے ہاتھ سے پہلا اسیر جس طرح

نخجر ادیب حسن نے یوں دیا درس اولین
ہو گیا ایک ایک حرف نقش کی طرح دل نشین

فرزند علی رضوی جبلپوری

ضروری گذارش تمدن بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں نمونۃً یا کسی دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنی خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائیگی اور دوسرے ماہ میں نکالا ہوا پرچہ بجبر کر کے تیسرے ماہ کا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائیگا جسکا وصول کرنا انکا اخلاقی اور قومی فرض ہوگا۔

غزلیات

حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

زیر مزار جا کر ڈرتا فلک سے کیا میں — یوں مٹ کے رہ گیا ہوں جیسے کبھی نہ تھا میں

کھل جائیگی حقیقت اس عاریت سرا کی — جس دن اتار دونگا یہ جامہ فنا میں

اظہار حسرت و غم اب کیوں مری لحد پر — گو آج میں نہیں ہوں لیکن کبھی تھا میں

دنیا کے اہل عبرت پڑھ لینگے یہہ کتابت — مٹی پہ چھوڑتا ہوں اک نقش بوریا میں

ناز و ادا کی چوٹیں سہنا تو اور شے ہے — زخموں کو دیکھ لیتا تو دیکھتا میں

جو ہم سفر تھے انکو اتنی خبر نہیں ہے — آگے نکل گیا ہوں یا پیچھے رہ گیا میں

محشر نما تھا عالم سرتنگنائی دل کا — وہ بھیڑ حسرتوں کی دیکھی کہ کھو گیا میں

کچھ بولتا تو کھلتے کلبے کو راز عالم — شمع خموش بنکر سب کی سنا کیا میں

برق جمال وحدت تو ہی مجھے بتا دے — شعلہ تو دور بھڑکا پھر کس لئے جلا میں

نالوں کو ضبط کرتی کب تک مری خموشی؟ — اب دو میں اک رہیگا یا آسمان یا میں

دل لے سکا نہ گردش تیر نظارہ کر کے — بزم جہاں میں دیکھا کس کو ترے سوا میں

ہجراں نصیب دل کو وصلت کا ہوش کب تھا — کہتا ہے مجھ سے کوئی تجھ سے قریب تھا میں

ثاقب غزل نہیں تھی یہ ماجرائے دل تھا
جو کچھ تھا راز الفت باتوں میں کہہ گیا ہے

وحید العصر جناب منشی وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی جانشین داغ

تم سے کھلنے نہیں دیتا دل بدظن میرا — مرے پہلو میں چھپا بیٹھا ہے دشمن میرا

عشق میں سینہ بنا وادی ایمن میرا — دوسرا طور ہے گویا دل روشن میرا

کون کہتا ہے ہے دوست وہ پرفن میرا — ذکر تو یہ ہے کہ نادان ہے دشمن میرا

[illegible] پھرا کرتا ہے سر شیخ و برہمن میرا — دل میرا کعبہ ہے بت خانہ ہے مسکن میرا

چار تنکوں کو جہاں جوڑ کے رکھا میں نے — بنگیا باغ میں صیاد نشیمن میرا

پھیر کر منہ دم رخصت وہ کسی کا کہنا
اب نہ اتراؤ چلو چھوڑ دو دامن میرا

غیر پہ راز محبت نہیں کھلنے پاتا
پردہ رکھ لیتی ہے کیا تری چلمن میرا

بزم میں آنکھ ملاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
راز کہہ دے نہ کہیں آپ کی چتون میرا

چاک کے ساتھ ہے گریہ کا اثر بھی موجود
باغ میں چھین لیا پھول نے دامن میرا

جیتے جی سیکھ لیا میں نے فنا ہو جانا
یہ مرا جسم نہیں یہ تو ہے مدفن میرا

آنکھ کھلتے ہی یہ غنچہ نے کہا حسرت سے
چٹکیوں میں یوں ہی اڑ جائیگا جوبن میرا

حسن ہے ۔ ناز ہے ۔ شوخی ہے ادا ہے ۔ تو ہے
مجکو اتنو ہیں بتا کون ہے دشمن میرا

مسکرا کر جو کیا وصل کا وعدہ تم نے
بھر دیا ہے گل امید سے دامن میرا

خاک کے ڈھیر ہی کو میں حاصل نہ سمجھا
برق کی راہ تکا کرتا ہے خرمن میرا

تیغ بھی ہاتھ میں تیور بھی بُرے ہیں انکے
وار سب روک رہا ہے خم گردن میرا

ظلم سہکر بھی شکایت کا نہیں منہ مجکو
دوست کے نام سے مشہور ہے دشمن میرا

ہیں مرے رتبہ شناسو ہیں محبت والے
لے گیا قیس کفن کے لئے دامن میرا

عشق کے بعد کہاں دل میں امنگ اور ترنگ
لیگیا لوٹ کے سامان تو رہزن میرا

غیر کے ساتھ جو وہ پھول چڑھانے آئے
ہٹ گیا اپنی جگہ چھوڑ کے مدفن میرا

خار حسرت کے سوا اور ملے گا کیا خاک
دل ٹٹولے گی اگر آپ کی چتون میرا

ہجر میں داغ جگر خوب دکھاتے ہیں بہار
جب خزاں آتی ہے کھل جاتا ہے گلشن میرا

نظر آتا ہے شب و روز مجھے عکس جمال
تیرا آئینہ بنا ہے دل روشن میرا

اون سے پوچھا تھا کہ مشہور دل آزار ہے کون
لیکے انگڑائی کہا کان میں جوبن میرا

نام پیچو دے رہا کرتا ہوں میخانہ میں
جس سے پوچھو گے بتا دے گا وہ مسکن میرا

خوشی سے شیخ اب ساقی کہیں محفل سے نکلیگا — بڑی مشکل سے آیا ہے بڑی مشکل سے نکلیگا
تری محفل میں جو بیٹھا ہے وہ کس دل سے آیا ہے — تری محفل سے جو اٹھیگا وہ کس دل سے نکلیگا
اشارہ شمع گریاں کر رہی ہے بزم جاناں میں — کہ جو آیا ہے وہ روتا ہوا محفل سے نکلیگا
نگاہ ناز کا ناوک کہیں پہلو سے جاتا ہے — کچھ ایسا دل میں بیٹھا ہے بڑی مشکل سے نکلیگا
وفا کا شوق بے پایاں جفا کا ذوق بے پایاں — نہ میرے دل سے نکلیگا نہ انکے دل سے نکلے گا
سوال وصل پر میرے کہا منہ پھیر کر اس نے — یہی ارمان تو تیرا بڑی مشکل سے نکلیگا
یہی رونق رہے گی تا قیامت اس بھرے گھر کی — نہ حسرت دل سے نکلے گی نہ ارمان دل سے نکلیگا
بھلا ہو بیخودی کا جسنے پوچھا آج غیروں سے — ہمارے دل کا ارمان کب ہمارے دل سے نکلیگا
تمہارا تیر پیوستہ میرے دل کا وہ ارماں ہے — کہ تم خود بھی جو چاہو گے بڑی مشکل سے نکلیگا
دکھاؤنگا زمانے کو میں رنگ جادہ پیمائی — کہ میرا شوق بڑھکر دوری منزل سے نکلیگا
سفر کیا آخرت کا طے کریگا قبر میں انساں — قیامت کو بھی ہو پھر وہ اسی منزل سے نکلیگا
دل نالاں میں جیتے جی کوئی ارماں نہ رہجائے — یہ وہ ارمان ہے جو مر کر بھی مشکل سے نکلیگا
تری نظروں میں کرینگی یوں ہی سرشار اے ساقی — تو ساغر کس میکشی میں تیری محفل سے نکلیگا
نگہ نے تیری مارا ہے خبر کیا اہل محفل کو — نہ دل دکھلاؤنگا اپنا نہ ناوک دل سے نکلیگا
ملا ہے دیکھیے بحر فنا بحر محبت سے — جو اس ساحل میں اتریگا وہ اس ساحل سے نکلیگا
تصور رات دن رہتا ہے تیری بزم کا مجھکو — نہ محفل دل سے نکلیگی نہ دل محفل سے نکلے گا
وہ کیوں تکلیف فرمائیں مقابل بعد کو ہونگے ؟ — سر بام آکے پوچھیں تو مہ کامل سے نکلے گا
سنبھلگا پر وہ فانوس نے لیلا ترا پردہ ؟ — کہ اذن شمع رخ چھین کر تری محفل سے نکلیگا

اٹھاؤ بزم سے باسط کو اتنا سوچ لو پہلے
کہ وہ کس دل سے آیا تھا مگر کس دل سے نکلیگا

کسیکو دیکھتا ہے پھر نگاہ شوق سے دیکھو
یہی نظریں ہیں باسط کی تو پھر محفل سے نکلے گا

حبیب النبی خاں صاحب صولت کلکتہ

خلوص دل سے جہاں کوئی خیر سگال آیا — تو اس کے لینے کو آغوش عفو یار آیا
سکون لطف فزا ہے جو یوں قرار آیا — خیال دوست مگر وقت انتشار آیا
ہری نہال وفا کی ملی نہ ایک بھی شاخ — چمن چمن چمن دہر میں پکار آیا
جلوس اشک رواں ہم عنان صد فرق — عجیب شان سے پیغام وصل یار آیا
نگاہ رنگینی حیرت زدہ زبان خاموش — عجب پیام پیامی لئے سوار آیا
شراب خانۂ الفت کی ہے یہ کیفیت — گیا جو مست وہ آخر کو ہوشیار آیا
چلی ہے رحمتِ خاص آج بہر استقبال — حریم ناز پہ کیا گناہ گار آیا
فراق اصل میں ہے مژدۂ وصال ابد — پیام دل پہ تسکین جان زار آیا
غرور نفس جو توڑا تو درد الفت نے — اسی سے نشۂ غفلت میں کچھ اتار آیا
غرور نفس شکن ہو تو بادہ کب ہے حرام — ہزار حیف کہ زاہد کو اس سے عار آیا
بنائے کعبۂ دل - توڑ کر بت پندار — ازل سے ایک ہی فرمان بار بار آیا
رواج ملک محبت کے جائیے قرباں — کہ باوقار بنا جو ذلیل و خوار آیا
کبھی نہ قطع محبت کی دیکھیو تعلیم — اسی سبق کو پڑھانے کو ہجر یار آیا
جو ڈگمگائے قدم منزل محبت میں — تو تھامنے کو خیالِ وفائے یار آیا
کتاب عشق و محبت وہی ہے ایک کتاب — جسے لئے ہوئے محبوب کردگار آیا

درِ کریم سے صولت پھرا نہ وہ محروم
خلوص لے کے جو کوئی امیدوار آیا

حضرت شیدا دہلوی

ہجوم یاس و غم میں دل لہو بن کر ٹپکتا ہے — ہر آنسو چشم گریاں کا مرے خون تمنا ہے
بتائیں بھید کیا دنیا کی آنکھوں نے تو پردہ ہے — ہماری آنکھ اب کس سیر میں محو تماشا ہے
خلش کا لطف پنہاں آبلہ پائی نے کھینچا ہے — کسی کی نوک مژگاں پر خیال دشت پیما ہے

ایک نظر

تمدن دہلی میں ۔ ۳ سال کا عرصہ ہوا کہ ہم تمدن کو دہلی سے منتقل کرکے لکھنؤ لے گئے تھے اس عرصہ میں "تمدن" نے کافی ترقی کی اور اپنی اشاعت کو حصہ زیادہ کرلیا۔ جس وقت "تمدن" ہمارے ہاتھوں میں گیا تھا اسوقت بے قاعدگی کی وجہ سے تمدن کی حالت نہایت خراب تھی۔ ہم خواہ تمدن میں کوئی اور خوبی پیدا کر سکے ہوں یا نہ کر سکے ہوں مگر گزشتہ ۴ ماہ کو مستثنا کرکے ہم نے "تمدن" پر سے بے قاعدگی کا داغ مٹا دیا جس کے مٹنے کی توقع جناب مولوی عبدالرشید صاحب نے اپنے اس مضمون میں کی تھی جو انہوں نے ناظرین "تمدن" سے خاکسار کا تعارف کرانے کے لئے لکھا تھا۔

"تمدن" پر ہمیں بہت محنت کرنی پڑی اور ایک کثیر رقم بھی صرف کرنی پڑی جو ڈیڑھ ہزار روپیہ کے کسی طرح کم نہیں اس کے باوجود بھی تمدن آج تک اس قابل نہیں ہے کہ وہ تمدن پورے اخراجات برداشت کر سکے بدیں وجہ ایڈیٹر "تمدن" کو ہمیشہ اپنے بسر اوقات اور تمدن کے اخراجات کے لئے کوئی دوسرا سلسلہ قائم رکھنا پڑا ہے۔ لکھنؤ میں جس دن سے ہمدم نکلا اسی دن سے اڈیٹر تمدن کو اس کے ایڈیٹوریل اسٹاف سے تعلق پیدا کرنا پڑا صاحب جمہور کے اجرا کا خیال خاکسار کے محترم بزرگ اور دوست اور استاد قاضی عبدالغفار صاحب نے کیا خاکسار کی خدمات کو بطور سب اڈیٹر حاصل کرلیا اور اس سلسلہ میں کئی ماہ کلکتہ رہنا پڑا جس زمانہ میں خاکسار کو "جمہور" میں کام کرنا پڑا اس زمانہ میں "تمدن" کا بیشتر کام لکھنؤ میں آغا رفیق صاحب بلند شہری اعزازی طور پر کرتے رہے جس کے لئے ہم شکریہ ادا کرنا ضروری۔ آغا صاحب کے زیر ترتیب جو پرچے نکلے وہ کسی لحاظ سے خاکسار کے زمانہ کے پرچوں سے کم نہیں مگر افسوس ہے کہ چند ماہ سے تمدن پر بے قاعدگی کا داغ پھر لگ گیا۔ خاکسار اب اپنی چند پرائیوٹ ضروریات سے وطن میں مستقل قیام کرنے کی ضرورت

[illegible] ... تمدن کو دہلی میں منتقل کرنا چاہا، اور یہ بھی چاہا کہ اس وقت تمدن پر جو بے قدری کا داغ ہے وہ بھی دہل جائے

مگر۔ من درچہ خیالیم فلک درچہ خیال

جولائی نمبر زیادہ سے زیادہ ۷ جولائی تک نکال دینے کا ارادہ تھا مگر لکھنو کی آفت سماوی نے اسے ۲۰ اگست کو شائع کرایا اس عرصہ میں ہم نے اگست کا پرچہ چھپنے کے لئے بھیج دیا آج ۲۴ اگست کو آخیری کاپی جارہی ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ۲۷ اگست تک اگست کا پرچہ شائع ہو جائے خدا معلوم یہ آرزو پوری ہوگی یا نہیں۔ رجسٹرڈ نمبر کی درخواست ۱۷ جولائی کو بھیجی جاچکی ہے بذریعہ تار یاد دہانی بھی کی جاچکی ہے مگر اس وقت تک رجسٹرڈ نمبر حاصل نہ ہوا اب یہ پرچہ اس وقت شائع ہوگا جس وقت رجسٹرڈ نمبر حاصل ہو جائیگا اور ستمبر نمبر ۷ ستمبر کو شائع ہوگا اس کے بعد انشاءاللہ ہر ماہ کا پرچہ حسب دستور سابق یکم کو شائع ہوا کریگا۔

اس قدر گزارش کے بعد ہمیں یہ لکھنے کی مجبوری ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پچھلے ناظرین ”تمدن“ نے تمدن کی توسیع اشاعت کے متعلق اپنے فرائض کو محسوس نہیں کیا اور نہیں مالی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ کرنے میں کوشش نہیں فرمائی ہے۔ امید ہے کہ آیندہ اس طرف توجہ ہو گی۔ آخیر میں ”تمدن“ اپنے لکھنوی دور کو کامیاب دور کے لئے حضرات لکھنو کا خصوصیت کے ساتھ اہل قلم حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے بدرجہ احسن مہمان نوازی کی اور ہمیشہ قابل قدر قلمی امداد فرمائی۔ امید ہے کہ تمدن کے سرپرست اب بھی تمدن پر نظر عنایت رکھیں گے۔ اس کے ساتھ دہلی کے اہل قلم حضرات سے بھی درخواست ہے کہ وہ قلمی معاونت فرمائیں

نئے رسائل۔ ناظرین تمدن کو اشتہارات کے حصہ میں دو نئے رسالوں کے اشتہارات ملیں گے۔ المذہب۔ اور بیگم۔ اور اس سے معلوم ہوگا کہ دفتر تمدن سے دو نئے ماہواری رسالے جاری ہونے والے ہیں۔

المذھب ۔ یہ رسالہ والد ماجد قاری محمد سرفراز حسین صاحب دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان و پرائیویٹ مشنری آف اسلام کی خاص سرپرستی میں عنقریب دہلی سے جاری کیا جائیگا۔ اس رسالہ میں ایسے مضامین درج ہوں گے جنمیں مذہب کی خوبیاں فلسفہ عقلی۔ سائنس اور دیگر علوم کی رو سے بیان کیجائیں گی اور تعصب فرقہ بندی آور دل آزاری کی رکیک باتوں سے قطعاً احتراز کر کے خلوص کے ساتھ یہ کوشش کیجائے گی کہ جدید معلومات کی روشنی میں عقل و نقل کو جمع کر کے انسانوں میں اعلیٰ روحانی و اخلاقی جذبات پیدا کئے جائیں محاسن و فضیلت اسلام کا ظاہر کرنا اس رسالہ کا ممتاز فرض ہوگا مگر دیگر مذاہب کی خوبیوں سے ہرگز ہرگز چشم پوشی نہ کیجائے گی اور جملہ ادیان و ملل کیساتھ کماحقہ انصاف کیا جائیگا۔ تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی ۲۰۔ قیمت سالانہ سے ر نمونہ کا پرچہ ۴ر

بیگم ۔ اس رسالہ کا واحد مقصد نظم و نثر میں خواتین کے لئے مفید اور دلچسپ مہذب معلومات فراہم کرنا ہے یہ رسالہ انشاء اللہ عنقریب دہلی سے جاری کیا جائیگا تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی ۱۰۔ قیمت سالانہ عه نمونہ ۳ر

ان رسالوں کے متعلق اس وقت کچھ لکھنا قبل از وقت ہوگا جب رسائل شائع ہونگے وہ خود اپنے متعلق رائے قائم کرائیں گے۔ رسالہ بیگم کا پہلا پرچہ انشاء اللہ ۱۵ ستمبر کو شائع ہوگا اور رسالہ المذہب کا ۲۰ اکتوبر کو اس لئے مضامین نگار حضرات جلد مضمون عنایت فرمائیں۔ بیگم میں خواتین کے مضامین زیادہ شائع ہوا کریں گے اس لئے خواتین سے التجا ہے کہ وہ جلد سے جلد مضامین روانہ کریں

سرگذشت شہاب ۔ افسوس کہ تمدن کے انتقال شہر کی غیر معمولی پریشانیوں کی وجہ سے حضرت نیاز کا مضمون سرگذشت شہاب اس پرچہ کیلئے حاصل نہ ہوسکا انشاء اللہ آئندہ پرچہ میں جو ۱۵ ستمبر کو شائع ہو جائیگا ہدیہ ناظرین کیا جائے گا

مذہب، علم، تہذیب

دین و دنیا و فلاح، مذہب، علم، اور تہذیب پر منحصر ہے اور ان شعبوں میں خلوص کے ساتھ قلمی خدمت انجام دینا داخل عبادت ہے۔ بنابراں متوکلاً علی اللہ ہم رسالہ تمدن کے مقاصد کو جو معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن ہے، اور جو جولائی ۱۹۱۵ء سے ہمارے ہاتھوں میں ہے، وسیع اور ذیل غرض ۲ رسالہ اور جاری کرتے ہیں ۔

(۱) رسالہ بیگم :- اس ماہواری رسالہ کا واحد مقصد نظم و نثر میں خواتین کیلئے مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرنا ہے۔ یہ رسالہ انشاء اللہ عنقریب دہلی سے جاری کیا جائے گا۔ تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی دس۔ قیمت سالانہ ۲ (نمونہ ۳) بیگم کا پہلا پرچہ انشاء اللہ ۱۰ ستمبر کو شایع ہوگا۔

(۲) رسالہ المذہب رسالہ الماجد قاری محمد سرفراز حسین صاحب علیگ سیاح جاپان، انگلستان و پرائیویٹ مشنری اوف اسلام کی خاص سرپرستی میں عنقریب دہلی سے جاری کیا جائیگا۔ اس رسالہ میں ایسے مضامین درج ہونگے جنمیں مذہب کی خوبیاں فلسفہ، عقل، سائنس اور دیگر علوم کی رو سے بیان کیجائیں گی اور تعصب، فرقہ بندی اور دل آزاری کی کمکب باتوں سے قطعاً احتراز کر کے خلوص کیساتھ یہ کوشش کیجائے گی کہ جدید معلومات کی روشنی میں عقل و نقل کو جمع کر کے انسانوں میں اعلے روحانی اور اخلاقی جذبات پیدا کئے جائیں۔ محاسن و فضیلت اسلام کا ظاہر کرنا اس رسالہ کا ممتاز فرض ہوگا۔ مگر دیگر مذاہب کی خوبیوں سے ہرگز ہرگز چشم پوشی نہ کیجائیگی اور جملہ ادیان و ملل کے ساتھ کما حقہ انصاف کیا جائیگا۔ تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی ۱۵۔ المذہب کا پہلا پرچہ ۱۵ اکتوبر کو شایع ہوگا ۔

خریداری کی درخواستیں اور جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر بنام منیجر رسالہ جات مذکورہ ہونی چاہئیں ۔ مضامین وغیرہ بنام ایڈیٹر آنے چاہئیں ۔

المشتہر

پتہ: خاکسار محمد عباس حسین قاری مینیجر تمدن دہلی

سینی لائن

خونی بواسیر اور خون بند کرنے کی دوا

یہ عجیب دوا ہے واقعی چند بوٹیوں سے بنی ہے۔ خون کے بند کرنے میں یہ بے مثل ہے ناک سے خون جاتا ہو تو تھوڑا سا یہ عرق سونگھ لینے سے اسی وقت بند ہو جاتا ہے۔ مسوڑھوں سے اگر خون جاری ہو تو مساوی مقدار سے گرم پانی میں عرق ملا کر روز کلی کرنے سے مسوڑھے سخت ہو جاتے ہیں اور خون بند ہو جاتا ہے منہ کے راستہ یا بلغم کے ساتھ خون جاتا ہو تو اس دوا کے پینے سے بند ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے پردہ سے سرخی کا جانا کی بیماری میں یا حمل کی حالت میں خون جاتا ہو تو جلد اس دوا کو استعمال کرنا چاہئے

خونی بواسیر

خونی بواسیر میں یہ خاص کر فائدہ مند ہے اس بیماری میں رگیں کمزور پڑ جاتی ہیں یا ان میں زخم ہو جاتا ہے جس سے برابر خون بہتا ہے۔ اس دوا کے کھانے سے اور پچکاری لینے سے رگیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور مرض جڑ سے جاتا رہتا ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنہ پچکاری کا نسخہ ۴؍ محصول ڈاک ہر دو ۱۰؍

داد کا مرہم

ہر وقت کے کھجلانے سے آرام کرنا بہتر ہے۔ دیکھئے جناب مہاراجہ صاحب کیا لکھتے ہیں یہ دوا موقع ہے کہ آپ کے داد کا مرہم نے جادو کا اثر دکھلایا جس سے میں نے ہر وقت کی پریشانی سے نجات پائی ہے آپ کا نہایت درجہ ممنون و مشکور ہوں اس کے استعمال کرنے والے بھی جناب مہاراجہ صاحب کی طرح سے علاج ہیں کیونکہ دو ہی تین مرتبہ کے استعمال سے بغیر کسی تکلیف کے ایک دم اچھا کر دیتا ہے قیمت فی ڈبیہ ۴؍ محصول ایک سے چھ تک ۶؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

ذی الحجہ ۱۳۳۶ — ستمبر ۱۹۱۸ع — جلد ششم

تمدن

نمبر ۲

معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی اور تاریخی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر محمد عباس حسین قاری (علیگ) خلف اکبر جناب قاری
محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپا

پبلشر
محمد عباس حسین قاری

مقام اشاعت
مٹیا محل دہلی

پرنٹر
محبوب بیگ

علمی - ادبی - اخلاقی کتب وغیرہ

بھوپال کی روشن زندگی کے کارنامے اور ان کی علمی و اسلامی خدمات کا مرقع باتصویر پڑھنے کے قابل کتاب ہے قیمت صرف ۲/

خیالات ممتاز جس میں ہندو کا مذہب اور اس کی حقیقت بدھ مذہب کے بانی کا حال مسیحی اور یہودیوں اور آتش پرستوں کے اصول اور انکی اشاعت تثلیث کا ذکر ہندوؤں کے خیالات توحید و رسالت و فطرت کے مقابلہ کا بیان اور پاک اسلام اور اس کے بانی کا تذکرہ اور دنیا میں کس قدر مذاہب شائع ہیں اور اسلام کس مذہب کے موافق اور کس کے مخالف ہے۔ مذہب کیا چیز ہے اور دنیا کو اس سے کیا فائدہ ہے قابل دید کتاب ہے قیمت ۸/

آثار خیر۔ اسلامی عہد حکومت کے محکمہ پبلک ورک [illegible] سڑکوں نہروں وغیرہ کے مفصل حالات قیمت ۸/

حیات حافظ جس میں لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں اور انکی شاعری پر نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے قیمت عہ

نیشنل قدامہ ہندو مسلمانوں کی موجودہ حالت ان کو عروج دلانے کا نیا طریقہ اور تعلیم کی ضرورت کے اظہار کا جدید طرز قیمت ۸/

انقلاب ترکی سلطنت عثمانیہ کے گذشتہ انقلاب اور پارلیمنٹری دور کے آغاز کی ایک مفصل [illegible]

جامع التواریخ مولفہ منشی عبدالرؤف خان صاحب ہاتف قیمت عمر

گنج شائگان قدیم شاہان اسلام [illegible] ممالک دنیا بھر کی سلطنتوں ریاستوں وغیرہ کے سونے چاندی تانبے کے سکوں کی دو دو رخ کی اصلی تصاویر مع حالات وزن وغیرہ قیمت عہ

پروفیسر ومبری کا سفرنامہ پروفیسر مذکور کا خیوا، بخارا، ایران و کردستان کا سفرنامہ قابل دید کتاب ہے قیمت عہ

خیابان عجم۔ شعرائے عجم کی سوانح عمریاں اور انکے کلام کا انتخاب مع انگریزی ترجمہ قیمت ۱/

چمنستان عرب یا غنچہ حج قرآن شریف احادیث اور تواریخ سے حج کے مفصل کعبہ مقدسہ مدینہ منورہ اور عرب کے تاریخی جغرافیائی حالات اس کتاب میں نہایت تفصیل سے درج کئے گئے ہیں ادعیہ حج بھی اس کتاب میں درج ہیں قیمت عہ

مکمل محاربات روس جاپان روس و جاپان کی گذشتہ ہولناک جنگ کے حالات حصہ اول و دوم قیمت ہر دو حصہ ۱۲/

تاثیر صحبت۔ عجیب خیز و دلچسپ قصہ اپنی اولاد کو ضرور پڑھائے قیمت ۱۲/

بزم خیال اس کتاب میں شعرائے عجم و ہند کے وہ دلفریب و منتخب اشعار ہیں جن سے کسی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمدن

زبان اور حسن بیان

جس طرح ایک شاعر یا شاعری کیواسطے انتخاب مضمون لطافت و نزاکت بندش اور حسن بیان کی ضرورت ہے اسی طرح عام بول چال تحریر و تقریر تکلم و تخاطب کے واسطے بھی ان باتوں کی ضرورت ہے

بہ فحوائے آیت کریمہ

علمہ البیان

ہر شخص قوت بیانیہ سے کام لیتا ہے۔ مختلف لوگوں کی قوت بیانیہ مختلف صورتیں اور مختلف پیمانہ رکھتی ہے اگرچہ قوت بیانیہ ہر فرد یا ہر بشر کو حاصل ہے لیکن وہی قوت بیانیہ ایک لطافت خیستا نزاکت جامعیت اور شوکت رکھتی ہے جو فطری رنگ لئے ہوئے وہ خصوصیتیں بھی رکھتی ہو جو ترکیب بیان کے واسطے علمی رنگ میں موضوع ہیں اگرچہ انکا رنگ بھی فطری ہوتا ہے مگر انکی ترتیب اور تنظیم میں جو کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے وہ ایک جداگانہ ہی رنگ رکھتی ہے

تمدن — ستمبر ۱۹۱۸ء

اگر شاعری کی لطافت نفاست جدت شوکت اثر چند قواعد حسن انتخاب اور حسن بیان شاعر کی تابع ہے تو عام بول چال تکلم و تخاطب تحریر و تقریر کی لطافت نفاست اور حسن بیان بھی اوس فطری حسن اور فطری انتخاب یا اُن قواعد عام کی تابع ہے جو ہر انسان کو طبعاً حاصل ہیں یا ایک جمہور نے جنہیں مان لیا ہے۔

فصاحت و بلاغت کے ادبی قواعد بعد میں بنے ہیں شروع شروع میں اُن ہی قواعد فصاحت و بلاغت پر مدار رکھتا ہو ہر انسان اپنی طبیعت ہی میں فطرتاً رکھتا ہے۔ انسان طبعاً حسن پسند اور لطافت شناس ہے یہ خصوصیت اس کی کسی بیرونی قاعدہ اور اجتہادی قانون کی تابع نہیں ہے۔ اگرچہ کوئی انسان کیسا ہی کثیف خیال ہو پھر بھی اوس کی طبیعت میں حسن پسندی کا مواد اور کشش موجود ہوگی۔ چھوٹے بچے گود میں لیکر کسی بازار کسی باغ میں گزرو تم دیکھوگے کہ ہر بچہ فطرتاً ان ہی چیزوں کی طرف کھنچا چلا جائے گا جن میں کوئی خوبی اور کوئی حسن ہے۔

اُن اشیاء سے نفرت کریگا اور ان چیزوں سے خوف کھائیگا جو کریہ المنظر اور بدوضع ہونگی پھولوں میں سے تصویروں میں سے چھوٹے بچے اُن ہی پھولوں اور ان ہی تصاویر کا انتخاب کریں گے جو دلاویز خوبصورت ہیں بدنما پھولوں اور تصویروں کا اول تو انتخاب ہی نہیں کریں گے اور اگر کوئی ہاتھ میں لے بھی لے گا تو فوراً ہی پھینک دیوے گا۔ اسیطرح ہر انسان خواہ خواندہ ہو اور خواہ ناخواندہ انتخاب کلام میں بھی حسن و خوبی اور اثر ہی کا جویاں رہتا ہے ایک مقرر یا ایک لیکچرار کی تقریر سننے کے واسطے جب جاہل اور ان پڑھ بھی آجاتے ہیں تو وہ بھی اچھے تاثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ گو وہ قواعد فصاحت و بلاغت اور استدلال کلام سے واقف نہیں ہوتے مگر لیکچرار کا طرز موثر اور حسن بیان اثر کئے بغیر نہیں رہتا ہر انسان جب کسی دوسرے سے گفتگو کرتا ہے تو وہ اپنا پہلا فرض یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا کلام موثر ہو۔

جاہل بھی جب ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو زم کلام در تحت کلام میں تمیز کرتے ہیں اثر ہونے پر فوراً اعتراف کرتے اور داد دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک جاہل اور ایک ان پڑھ کی کوئی نہ کوئی بات بمقابلہ ایک خواندہ کے زیادہ تر صاف اور موثر ہوتی ہے بعض موقعہ پر ایک سادہ فقرا یسا موثر ہوتا ہے کہ اوس کی قیمت اور اس کا اثر ایک لیکچر سے بھی بڑھ جاتا ہے اگرچہ قواعد فصاحت و بلاغت مع قواعد حسن بیان بھی ایک قیمت رکھتے ہیں اور ان کی بھی ضرورت ہے لیکن حسن بیان عموماً قواعد کے تابع نہیں ہوتا ہے ایک طبعی خاصہ اور فطری فیضان ہوتا ہے بعض لوگ شاعر بنائے سے اگرچہ شاعر بنجاتے ہیں لیکن جو پیدائشی شاعر ہوتے ہیں اون سے دوسری قسم کے شاعر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ شاعری میں بھی ایک فطری ملکہ ہے اور وہی شاعر شہرت پاتا ہے جو اس فطری ملکہ کے تحت شاعر ہے وہی شاعر کے دل و دماغ میں مختلف قسم کے مضامین خودبخود جاگزیں ہوتے ہیں بعض وقت اوس کے دماغ میں اس قدر مضامین بھر جاتے ہیں کہ اونکا اظہار اور اونکی تنقید اس پر گونہ مشکل ہو جاتی ہے اور چونکہ اونکا اکثر حصہ بجائے خود منتخب ہوتا ہے اس واسطے نہ تو اونہیں وہ رد کر سکتا ہے اور نہ کام لے سکتا ہے

دوسری قسم کے شاعر مختلف مضامین مختلف حیلوں سے جمع کرتے ہیں اور چونکہ اون کا دماغ وسعت نہیں رکھتا اس واسطے ان کے طریق اظہار میں بھی ایک قسم کی تنگی اور کدورت ہوتی ہے

حضرت اکبر الہ آبادی۔ حضرت امیر۔ حضرت داغ حضرت اقبال اور حضرت اثر کے دماغ میں جو خیالات اور جو مضامین ممتوج ہو سکتے ہیں اور حضرت ریاض انتخاب مضامین اور تنقید مضامین میں جو ناقدانہ نظر رکھتے ہیں اون سے ایک عام دماغ کس طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست

گو ایک ایسا شخص جس نے ایک ضابطے کے تحت فلسفہ نہ پڑھا ہو اور وہ فلسفہ کے نام

سے علمی رنگ میں واقف بھی نہ ہو لیکن اگر وہ اپنی طبیعت میں کوئی وہبی ملکہ رکھتا ہے تو اُس کا کلام اور اس کا استدلال ضرور فلسفیانہ ہوگا اور ہم اوسے بھی رنگ میں فلاسفر کے نام سے نامزد کرنے میں شاید غلطی پر نہ ہوں۔

ہماری رائے میں قطع نظر قیود فصاحت اور شرائط قواعد بلاغت کے عام طور پر زبانوں میں ایک حسن بیان ہوتا ہے اور یہ حسن بیان اور حسن انتخاب مدتوں کے تجربہ اور مشق کے بعد خود بہ خود ہوتا گیا ہے اور اس سے تمام زبانوں کی فصاحت و بلاغت یا قواعد فصاحت و بلاغت کی بنیاد پڑی ہے زبانوں کے قواعد فصاحت و بلاغت محتاج ہیں اوس حسن بیان اور اوس حسن استدلال کے جو کسی زبان کے عام بولنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کیا ہے، وہ حسن بیان اور حسن استدلال کا نچوڑ جو قواعد فصاحت و بلاغت کی تدوین سے ایک خاص گروہ میں پہلے سے معمول اور موجود تھے۔

مخرج زبان
اور
مخرج حسن بیان

زبان کو زبان اسواسطے کہا جاتا ہے کہ وہ اوس عضو دہاں کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا نام زبان ہے اس عضو دہانی کے بغیر چونکہ انسان بول نہیں سکتا اور یہی ایک آلہ طلاقت اور کلام کے واسطے قدرت کی طرف سے مخصوص ہے اس واسطے مجازاً فارسی اور اردو میں عمل کلام یا تکلم کو زبان کہا جاتا ہے اگرچہ عضو زبان طلاقت کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے لیکن اوسے مجازاً مخرج اور مصدر زبان کہا جا سکتا ہے اور فی الاصل مخرج زبان وہی ملکہ تکوین ہے جو قدرت کی جانب سے انسان کو عطا ہو چکا ہے۔ ہمارے انداز ہی سے حروف نکلتے ہیں اور انداز ہی سے الفاظ فقرات اور جملے بھی اطلاق پاتے ہیں یہ عضو زبان صرف انکے اظہار کی

شئیں یاد رہے جس مخزن میں سے یہ الفاظ اور یہ فقرات نکلتے ہیں وہ ایک ایسا مخزن عامرہ ہے کہ جس میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی دن بدن اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور انسان باوجود اس صرف کے یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ خزانہ کہاں سے آتا ہے کس طرح اس میں کمی نہیں ہوتی تب مخرج زبان یہ عضو زبان نہیں تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ

حسن بیان یا حسن کلام کا مخرج اور یہ بھی یہ عضو زبان نہیں بلکہ وہی ملکہ تکوین اور قدرت انتخاب ذریعہ طبعی ہے جو ہر انسان اپنے بشری حدود کے مطابق اپنے اندر رکھتا ہے بے شک بعد میں بہت سے قواعد اور ضوابط انسان کی جانب سے حسن زبان اور حسن کلام کے متعلق بنائے گئے ہیں لیکن اون کی بنیاد بھی اوسی طبعی ملکہ کا ظہور ہے جو انسان کی طبیعت میں موجود ہے جب انسان منہ سے بات نکالتا ہے اور کوئی کلام کرتا ہے تو وہ خود بخود ہی اوس ملکہ انتخاب کے ذریعہ سے یہ جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ

ان الفاظ اور ان فقرات میں سے کون سے لفظ اور کون سا فقرہ جامع موزوں اور موثر ہے۔ بعض طبائع ایک خصوصیت سے یہ انتخابی قوت استعمال میں لاتے ہیں اور بعض اس طرف توجہ نہیں کرتیں جو طبیعتیں اس طرف لگ جاتی ہیں اون کی بدولت ہی یہ قواعد فصاحت و بلاغت وجود پذیر ہوئے ہیں ورنہ حسن بیان اور حسن کلام کا مادہ ایک سادگی کیساتھ فطرتاً انسان کی اپنی طبیعت میں ہی پایا جاتا ہے۔

یہ انتخاب موقوف ہے مضمون کی عمدگی برجستگی اور موثرانہ کیفیت پر

اور مضمون کی موزونیت اور غیر موزونیت کے انتخاب پر تعریف سے انسان خوش ہوتا اور مذمت سے رنج ہوتا ہے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ

انسان عمدہ الفاظ اور موثر فقرات سے متاثر ہوتا ہے اور خراب الفاظ اور

بڑے نفرت سے کرتتا ہے اور گھبراتا ہے چونکہ انسان کی طبیعت قدرتاً ہی ایسی واقع ہوئی ہے اس واسطے لازماً اوسے ایسے قواعد کی ترتیب کرنی پڑی جو انتخاب مضامین اور حسن بیان اور حسن کلام کیواسطے ایک ادبی ضابطہ کا کام دیں ایسی کوشش بھی ایک طبعی کوشش ہی متصور ہوگی اور کہا جاویگا کہ

مخرج حسن بیان اور حسن کلام ایک طبعی میلان کا خواستہ اور طبعی میلان کا اثر ہے اور تمام قواعد فصاحت وبلاغت اوسی کا اثر اور نتیجہ ہیں

فصاحت اور بلاغت کے قوانین کس نے بنائے اور اس کا معیار کس کی فکر رسا کا اثر ہے اگر قوانین فصاحت وبلاغت انسان کی پیدائش کے پہلے مدون اور موضوع تھے یا درختوں اور پتھروں پر تحریر اور کندہ تھے تو کہا جاویگا کہ یہ اوس کی طبیعت کا اثر نہیں ہیں اور اگر یہ کیفیت نہیں ہے تو ماننا پڑیگا کہ وہ انسان ہی نے وضع کئے ہیں اور وضع بھی اوس وقت کئے جب اوس کی کسی حد تک حالت سنبھل گئی کیا اوسے کوئی فرشتہ سکھا گیا یا آسمان سے فصاحت وبلاغت کا کوئی صحیفہ نازل ہوا ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی۔

یہ اوسی حسن بیان اور حسن کلام اور ملکہ تکوین کا اثر ہے جو انسان کی طبیعت میں رکھا گیا ہے اور جو اس کا زیور ہے یا جو اس کی میراث ہے جو لوگ قوانین فصاحت وبلاغت سے واقف نہیں ہوتے وہ حسن کلام اور حسن بیان سے عاری ہوتے ہیں یہ ایک غلط خیال ہے یہ ضرور ہے کہ وہ ضوابط اور قوانین بلاغت سے واقف نہیں ہوتے لیکن انہیں فصاحت وبلاغت سے قطعاً ناواقف نہیں ہوتے کبھی جاہلوں کے بنائے ہوئے راگ اور بولیاں سنو تو تمہیں پتہ لگ جاوے کہ اون میں کیسا اثر اور کیسا جذب ہے ایک یہ بھی غلطی ہے کہ فصاحت وبلاغت کی تعریف بہ لحاظ علامات بہت ہی محدود دیکھی جاتی ہے حالانکہ فصاحت وبلاغت سے مراد صرف ایجاد کلام ایراد و تلازمات ہی نہیں ہے بلکہ اہم پہلو اسکا اثر و جذب بھی ہے جس کلام میں اثر اور جذب نہیں وہ کیسا ہی فصیح وبلیغ ہو اوس کا نتیجہ کچھ نہیں

گو بعض رنگوں اور کافیوں کے الفاظ موٹے ہوتے ہیں مگر اونکا مضمون غضب کا اثر رکھتا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ فصاحت و بلاغت الفاظ و اوزان فقرات ہی سے مختص نہیں عمدگی مضمون اور نفاست مفہوم بھی ورکار ہے اور اس کے سوائے کوئی فصاحت و بلاغت کوئی قیمت نہیں رکھتی۔

اب ذرا یہ بھی سن لو کہ بلاغت سے مراد کیا ہے۔ کلام بلیغ سے وہ کلام مراد ہے جو برموقعہ اور برمحل ہو یا یوں کہو کہ بلاغت نام ہے کلام برمحل کا یا جو کلام مقتضیات محل و موقعہ کا محتوی ہو اور حال سے متعلق جو بات مقدم کرنی ہے وہ مقدم ہو جو موخر ہے وہ موخر ہو۔

اب جو کلام ان اوصاف اور ان مقتضیات سے خالی اور معرا ہو اوسے کون بلاغت کہہ سکتا ہے ایک بڑا بلیغ بھی اگر بے موقعہ مغائر حال گفتگو کر رہا ہو تو اوس کے کلام کو کون بلیغ کہے گا۔ فصاحت سے مراد اصل میں خوش گوئی ہے اور اسپر یہ حاشیہ بھی چڑھایا گیا ہے کہ ایسے الفاظ میں تقریر اور تحریر کرنا جو معمولی نہوں

یہ پچھلا فقرہ دراصل ایک زائد حاشیہ ہے اصل مراد خوش گوئی سے ہے۔ اگر یک شخص کلام تو ان الفاظ میں کرے جو معمول بلغائے زبان ہوں مگر وہ خوش گوئی اور اثر سے خالی ہوں تو اوسے کون فصیح کہے گا ہاں لغوی معنوں میں رائے بہادروں و خان بہادروں کی طرح فصیح کہہ لو تو یہ ایک دوسری بات ہے۔ فصیح کلام وہی ہے جس میں خوش گوئی اور شیرینی و اثر ہو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ عام لوگوں کے کلام اس سے خالی ہوتے ہیں یا اون میں اثر و شیرینی نہیں ہوتی بعض وقت ایک جاہل کے بھی بعض فقرات وہ اثر رکھتے ہیں کہ یکسندی فصیح و بلیغ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

کیا ان تقاریر سے یہ ثابت نہیں کہ حسن زبان اور حسن کلام ایک حد تک فطری ملکہ اور فطری حسن پر بھی موقوف ہے جو لوگ فطرتاً یہ وصف رکھتے ہیں یا

جنہیں طبعاً یہ جوہر حاصل ہے وہ اگر قواعد فصاحت و بلاغت سے بھی واقف ہو جاویں تو اپنی نظیر آپ ہی ہوں

دیکھو شاعروں کے مقابلہ میں فطری شاعر کیا کمال اور کیسی وسعت خیال رکھتے ہیں فصیح و بلیغ شاعر محض عروض کے پڑھنے اور قافیہ ردیف کے جوڑ میل سے نہیں بنتا بلکہ اس خوبی کے تحت شہرت پاتا اور اثر رکھتا ہے جو اسے فطرتاً حاصل ہے حضرت ریاض - حضرت اکبر اور دیگر شعرائے نامدار کی جادو بیانیاں نری عروض اور قوافی و ردیف ہی کا صدقہ نہیں ہیں بلکہ اوس ملکہ فطری اور جذبہ طبعی کا جو انہیں قدرتاً حاصل ہے - شاعر اور بھی ہیں مگر ایسے نامور شعرا کی ریس کون کرسکتا ہے بعض لوگ عروض اور قوانی و ردیف بحور و اوزان کو خفیف اور بحر طویل کی طنابیں تو بڑی خوبی اور وضاحت سے ناپ لیں گے مگر کلام میں اثر نہ ہوگا - عروض سیفی کی شرح بھی پچاسوں ورق پڑھ لیں گے اور خود بھی عروض میں رسالہ تصنیف کر دیں گے مگر ایک شعر کا کہنا بھی دوبھر ہو جاوے گا اون کا اس میں قصور نہیں اونکی طبیعت ہی اس کام کے واسطے موزوں نہیں ہوتی -

یہ خدا کی دین ہے اس میں کسی کی محنت اور مشقت کام نہیں آتی الفاظ متعلق و غیر متعلق کی بھیڑ بھاڑ تو بہت ہو گی مگر حسن کلام اور حسن بیان تلاش سے بھی نہیں ملیگا یہی دیکھکر متقدمین نے کہہ رکھا ہو کہ دنیا میں ناظم تو بہت سے ہو سکتے ہیں شاعر بہت کم ہوتے ہیں اگرچہ کسی قدر وقت سے ہر شخص چھدرے موتیوں کو پرو لیگا لیکن ہار کے انداز اور کمی بیش سے وہی لوگ آگاہ ہونگے جن کا یہ کام ہے پھولوں کا ہار کون نہیں بنا سکتا مگر جو خوبی ہار بنانے والے چند پھولوں میں پیدا کر دیتے ہیں وہ کہاں

سلطان احمد

تمدد حیات انسانی

آجکل لوگوں کے لئے ۸۰ - ۹۰ سال کی عمر حیرت و تعجب میں ڈالدینے والی
چیز ہے۔ اگر کسی شخص کو ۹۰ یا ۹۵ سال قدرت کی عطا سے نصیب ہو جائیں تو انکا
تحیر بڑی حد سے تجاوز ہو جاتا ہے لیکن اگر یہ سوچنے والے واقعہ کو عظیم الشان سمجھ لینے
والے وجوہ اس حقیقت پر غور کریں جو کوئی سر و عجیب نہیں ہے تو انہیں اس
تقصیر حیات بشریہ کے اسباب وعلل پر اطلاع ہو جائیگی۔ تقصیر عمر کی اس وبا کے
غیر محسوس و معروف کے دو اور صرف دو اسباب ہیں ماں باپ کی کمزوریوں اور
لغزشوں سے اولاد نہایت نحیف و لاغر پیدا ہوتی ہے پھر جہالت اور علم حفظان
صحت سے ناواقفیت بچوں کے لئے قتل بے شمشیر ثابت ہوتی ہے سینکڑوں بچے
اس جہالت کے شکار ہوتے ہیں اور اگر موت سے بچ گئے تو امراض کا ہجوم ہوجاتا
ہے اور ہر مرض انکو ایک طعام لذیذ تصور کرکے کھالیتا ہے ہم ایسی بیسیوں
مثالیں پیش کرسکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ماں باپ طاقت ور اور ہوشیار ہوتے
ہیں اونکی اولاد بھی بڑی عمر کی ہوتی ہے۔ ۲۱ جولائی ۱۸۵۵ء کو کارڈینل (اس
افسر کو کہتے ہیں جو پوپ کے ماتحت ہو) ڈومانیوک نے رستہ سے گزرتے
ایک ہشتاد سالہ لڑکے کو دیکھا جو ایک پتھر پر بیٹھا رو رہا تھا ڈومانیوک نے رونے کا
سبب دریافت کیا اس نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے مارا ہے ڈومانیوک بہت
حیران ہوا اور اس نے اس کے باپ کو بلوایا۔ اسکا باپ ۱۱۳ سالہ نوجوان تھا
کیونکہ اس میں وہ تمام صحت کے آثار وعلائم موجود تھے جو ایک نوجوان میں ہوتے
ہیں کارڈینل نے اس سے بیٹے کو مارنے کا سبب پوچھا اس نے کہا کہ وہ میرے
والد کو سلام کرنے نہ گیا کارڈینل کے حیرت واستعجاب کی اوسوقت انتہا نہیں رہی
اور اس نے اسکو بغرض زیارت بلوایا۔ ۱۱۳ سال کے لڑکے کا باپ اپنے باپ کو لینے

انسان کے خون میں چھوٹے چھوٹے سفید جراثیم خداے عزوجل نے پیدا کئے ہیں تا وہ ان جراثیم کی مدافعت کریں جنسے سخت امراض پیدا ہوتے ہیں تو جس شخص میں یہ جراثیم بہت وہ قوی ہوتے ہیں یہ بہشت کا ستمال انکو بالکل فنا کر دیتا ہے۔ تمام معاصی جنکو مفسرین نے منع کیا ہے انسانی عمر کو گھٹا دیتے ہیں انبیا جنسے بڑھکر کوئی نظر نہیں ہوسکتا بہت بڑی بڑی عمر کو پہنچے چنانچہ ہم تمام پیغمبران کی ایک فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں

آدم ابو البشر	۹۳۰	توریت میں ہے۔ بقول وہب یوسف ہزار سال
شیث بن آدم	۹۱۲	توریت
نوح	۹۵۰	" بقول وہب ہزار سال ہے وہب کا مطلب توریت کی تکذیب نہیں
ابراہیم بن تارح	۱۷۵	" بلکہ توریت نے انکی پیغمبرانہ عمر بتائی ہے اور وہب نے
اسمٰعیل بن ابراہیم	۱۳۷	" پوری۔ نوح ۵۰ سال میں مبعوث ہوئے
اسحٰق بن ابراہیم	۱۸۰	"
عیص بن اسحٰق	۱۴۷	"
یعقوب بن اسحٰق	۱۴۷	عزیا توریت
یوسف بن یعقوب	۱۱۰	"
موسے	۱۲۰	"
ہارون	۱۲۳	"

انکے سوا جس قدر لوگ ایسے گزرے ہیں جو نہایت نیک و پاکباز تھے اونہوں نے نہایت حیرت میں ڈالدینے والی عمر پائی مثلاً صحابہ اولیا اور دیگر صلحا چنانچہ حویطب بن عبد العزیٰ نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی ۶۰ سال کافر رہے اور ۶۰ سال مسلم۔ حسان بن ثابت جو اسلام کے مشہور شاعر تھے ۱۲۰ سال زندہ رہے سعید بن یربوع ابو ہود ۱۲۴

ا توریت میں حضرت ابراہیم کا نام تارح بتایا ہے اور قرآن مجید نے آذر ۲ بتفصیل المعارف لابن قتیبہ سے لیگئی ہے ۳ المعارف ابن خلکان ۔ ۵ شمائل نبوی امام ترمذی

سال کے تھے ۱۱۰ ورقہ بن نوفل ۱۵۰ سال کے۔ عدی بن حاتم طائی نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی۔ عمرو بن مسیح طائی ۱۷۰ سال کا سن رکھتے تھے اور حکیم بن حزام ۱۲۰ سال کا۔

لبید بن ربیعہ جو بہت اچھے شاعر تھے اور جنہوں نے اسلام لانے کے بعد شعر نہیں کہا، ۱۵۰ سال زندہ رہے۔ زہیر جیسے حضرت عمر جیسے نقاد سخن نے اشعر الشعرا کہا اور نابغہ و امرا لقیس جیسے شعرا پر ترجیح دی ۱۲۰ سال سے زیادہ جیا جیسا خود اسکے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اس وقت کہے جبکہ وہ اپنی عمر کے کل سال پورے کر چکا تھا

الا لیت شعری هل یری الناس ما اری　　من الامر و یبدو لهم ما بدا لیا

بدا لیا انی عشت تسعین حجة　　وعشرا و تسعا بعدها و ثمانیا

فلم الفها لما مضت و عددتها　　بحسبتها فی الدهر الا لیالیا

اسحق کی والدہ سارہ نے ۱۲۷ سال کی عمر پائی۔ اور ابو عبدالرحمن نسائی جنکی کتاب سنن نسائی مشہور ہے ۱۰۱ سال کی۔ ابو الطفیل جنہوں نے صحابہ میں سب سے پیچھے انتقال کیا ۱۲۰ سال کے تھے

مورخ اسحاق لکھتا ہے کہ قس بن ساعدہ نے ۶۰۰ سال کی عمر پائی۔ اسلام سے قبل عرب میں سب سے بڑی عمر ربیع بن ضبع کی تھی یعنی وہ ۳۴۰ سال تک زندہ رہا جس وقت اسکی عمر ۲۰۰ کو پہونچی تو اس نے یہ شعر کہے

اذا جاء الشتاء فادفئونی　　فان الشیخ یهدمه الشتاء

فاما حین یذهب کل قر　　فسربال خفیف او رداء

اذا عاش الفتی مائتین عاما　　فقد اودی المسرة و الفتاء

مستوغر بن ربیعہ ۳۲۳ سال زندہ رہا۔ اور جس وقت وہ اپنی پوری عمر کو پہنچا تو اس نے یہ شعر کہے

ولقد سئمت من الحیاة وطولها　　وعمرت من عدد السنین مئینا

هل ما بقی الا کما قد فاتنا　　یوم یمر و لیلة تحدونا

اکثم بن صیفی ایک بڑا مشہور حکیم تھا بعض لوگوں کے قول کے مطابق ۳۳۰ سال کا شیخ تھا

دو بخوبی ... وسال بتاتے ہیں۔ عبداللہ بن ربیع الحمیری کے متعلق مشہور ہے کہ ۵۰۰ سال عمر تھا اس نے آخری عمر میں کہا

اذا انی کمامت یوماً انی من بعد لا یوم جدید
یعود شبابه فی کل فجر و یاتی لی شبابی لا یعود

دینوری اپنی مجالستہ میں لکھتا ہے کہ عبید بن شسریۃ الجرہمی ۳۰۰ برس کا تھا حتی کہ داعی اسلام صلعم زادعرب میں مبعوث ہوا اور عبید نے اوس کی دعوت کو قبول کیا ابن ظفر کی کتاب النصائح میں ہے عبد المسیح بن قیس نعمانی کی عمر ۳۵۰ سال سے بھی زیادہ تھی۔

معترضین کو یہ اعتراض کرنے کا بہت بڑا موقع مل سکتا ہے کہ جس قدر لوگوں کے نام ہم نے گنائے ہیں کیا وہ داعی اسلام سے زیادہ صالح تھے کیا وہ جاہل عربونکو صراط مستقیم پر لانیوالے سے بھی زیادہ پاکباز تھے۔ پھر کیوں اونہوں نے اس قدر عمر پائی اور عرب کے پیغمبر نے صرف ۶۳ سال مگر سب سے پہلے انہیں آنحضرت کی زندگی کے مقصد پر غور کرنا چاہیے کہ خدائے عزوجل نے انہیں کیوں ضلالت آباد عالم میں بھیجا انکی حیات کا مقصد عظمیٰ اشاعت اسلام تھا انکی زندگی عبارت تھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے اس مقصد کے پورا ہونیکے بعد انکے رہنے کی ضرورت نہ تھی چنانچہ تکمیل اسلام کے بعد خدائے عزوجل نے فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم و رضیت لکم الاسلام دیناً۔ اور یہی آنحضرت کی اختتام حیات کا پیام تھا اور اس کے بعد ہی ان کے پیدا کرنے والے اور انکو مبعوث کرنے والے نے انکی پاک روح کو بلالیا۔

جس قدر اعمار طویلہ ہم نے اوپر بتائے ہیں وہ قرون ماضیہ کی تھیں اور اس زمانہ میں وہ ظہور پذیر ہوئی تھیں جبکہ تمدن نے اعضائے انسانی کی قوتوں کو بیکار نہ کیا تھا اس مدنیت و عمرانیت سے جدید دور نے عمر انسانی پر جس قدر برق رفتار گرائی ہیں وہ یکسر لاتعداد و لاتحصے ہیں۔ ہمارے اعضا کی قوتیں کمزور ہوگئیں ہمارے دست و پا کو اپنے ذمہ کا سطبعی سے نفرت ہوگئی اور ظاہر ہے

کہ جب مشین کے پرزے نہ چلیں گے تو اس میں زنگ لگ جائیگا اور بیکار ہو جائے گی
اسیطرح انسان جب اپنے اعضا سے کام لینا چھوڑ دے تو یقیناً اس کی زندگی کا
خاتمہ ہو جائیگا جس زمانہ میں تمدن کے کاہل بنا دینے والے آلات نمودار نہیں ہوئے
تھے ابو العباس نے ۹۰۰۰ میل مسافت پیادہ پا طے کی تھی سعدی شیرازی کی
جولانگاہ سفر خراسان ترکستان تاتار و بلخ و کاشغر شام فلسطین تبریز وسط
طرابلس مشرق بصرہ و کوفہ حجاز و بیت المقدس وغیرہ ممالک بعیدہ تھے۔ وہ
سومنات تک بھی آئے تھے جیسا کہ بوستان کے باب ہشتم سے ظاہر ہوتا ہے بغداد
کے نظامیہ میں اسپین تک سے طالب علم آتے تھے لیکن کیا انکے واسطے ریل بنی
کیا وہ ٹرامویز میں بیٹھ کر پھرتے تھے انکی ریل انکے پاؤں تھے وہ اپنے دست و پا
میں قوت رکھتے تھے وہ کاہل طبائع لیکر پیدا نہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس
زمانہ کی عام عمریں نہایت حیرت فزا اور اس زمانہ کی عمروں کا اوسط ۸۰-۹۰ سال تھا
اس دور تکمیل و تکسل میں جو لوگ اپنی حفاظت اور اپنے اعضا کے وظائف طبعی کا
خیال رکھتے ہیں وہ غیر معمولی عمر پاتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی اگر کوئی شخص اپنے
قوائے جسمانی کے نشو و نما کا باقاعدہ خیال رکھے اور خطرات خارجی سے محفوظ ہے
تو وہ ایک حد تک موت و زیست پر قادر ہو سکتا ہے آخر میں ہم ایک اعمار ممدودہ
کی فہرست دیتے ہیں جو حال میں ظہور پذیر ہوئیں۔

ہیوں کلوفاس	۱۲۰	سال کی عمر میں مرا	کینٹ البرٹس	۱۴۳	سال کی عمر میں مرا
پیدرو بسیر (برکن)	۱۲۰	〃	ڈاؤ فینگم	۱۴۴	〃
جاف بانی	۱۳۰	〃	قاعدہ المس لوتمس	۱۴۶	〃
مسز پنیا پاٹر (انگریز)	۱۳۰	〃	کوبرنٹ (فرنچ)	۱۵۰	
جام لارنس	۱۴۰		یتوس باری	۱۵۲	
سپیان سوک	۱۴۰		یوسف سورنگیتوں	۱۶۰	

(یہ سب تفصیل تاریخ الانسان الطبیعی سے لیگئی)

...تحریکیں بھی ہیں جو اصلاح عمل کی طرف اپنے ابنائے قوم کو توجہ دلاتے ہیں اور انسے خواہش رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کو درست کریں اپنی عمروں کو بڑھانے کی کوشش کریں تاکہ ہر شخص کو اس جہان میں ایک وسیع میدان عمل ہاتھ آئے اور ہر شخص ایک زمانہ دراز تک زندہ رہکر اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبودی کیلئے سعی بلیغ کر سکے

(ابوالاعلیٰ مودودی)

شل ہوئی خواہش دیدار ہو کر رہ گئی — برق جب چمکی نظر بیکار ہو کر رہ گئی

سرنگوں سب شرم سے چلتی نہیں مقتل میں آج — تیغ بھی گویا نگاہ یار ہو کر رہ گئی

رازدار عشق ہیں ہم کیا کوئی غماز ہیں — ہم سے دل کی بات کیوں اظہار ہو کر رہ گئی

باغ میں بلبل پہ توڑا کیا ستم صیاد نے — ہر کلی کیوں صورت منقار ہو کر رہ گئی

حشر میں پرساں کوئی نکلا نہ میرے حال کا — دو گھڑی کو گرمی بازار ہو کر رہ گئی

آگیا مجھکو فسانہ حضرت موسےٰ کا یاد — آج پیدا حسرت دیدار ہو کر رہ گئی

ہر گلی میں ان بتوں کی میں تو مرتا ہی رہا — ہر جگہ تربت میری طیار ہو کر رہ گئی

وہ چمن سے دیکھکر نرگس کو رخصت ہوگئے — نرگسی آنکھوں کی یہ بیمار ہو کر رہ گئی

حرف آتا تھا نزاکت پر جو کٹتا سر میرا — تیغ بھی قاتل کی جانب دار ہو کر رہ گئی

آہ سینہ سے چلی تھی ۔ تھا ارادہ عرش کا — دھیان اونکا آگیا بیکار ہو کر رہ گئی

صبح انتظار ہے دیکھا ۔ تو لگن میں کچھ نہ تھا — شمع کی بھی گرمی بازار ہو کر رہ گئی

کیوں کلیجہ سے لگالی شوق میں تصویر یار — ہائے وہ آمادہ گفتار ہو کر رہ گئی

اوس کی حسرت کو جدائی میں بنایا تھا رفیق — یہ بھی دل کے واسطے آزار ہو کر رہ گئی

اوس کی الفت ۔ اوس کی حسرت ۔ اوسکی خواہش — اوسکی یاد یادوفا ونکے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

بھولنے والے کو کب آیا میرے دلکا خیال — یاد اوس کی جان کا آزار ہو کر رہ گئی

وہ بگڑ جاتے ہیں تو صادق دم پہ بن آتی ہے
خیر گذری وصل میں تکرار ہو کر رہ گئی

سید شمیم احمد (صادق)

١٦

حضرت ابراہیم اور انکے کنبے والوں کی قبریں

حبرون یا خلیل (قریب یروشلیم) میں

حبرون یا خلیل

حبرون جسکو مسلمان خلیل یا خلیل الرحمن کہتے ہیں ایک بہت قدیم شہر ہے جس کا قدامت کے لحاظ سے سوا دمشق و یروشلیم کے اور کوئی ہمپایہ شہر نہیں ہے بیت المقدس سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے اور ایک پہاڑ کے سامنے اور ایک چھوٹی لمبی ترائی کے بائیں کنارے پر ہے۔ مسلمان جب بیت المقدس کا حج کرتے ہیں تو وہاں بغرض زیارت قبر ابراہیم و سارہ وغیرہ جاتے ہیں یہ قبریں ایک بہت پرانے غار میں ہیں پہلے تو اس شہر کے باشندے دوسرے مذہب والوں کو بالکل ہی نہیں جانے دیتے تھے پہلا شخص جس کے مقدر میں اس کی زیارت لکھی ہوئی تھی اور جو مسلمان نہیں تھا، اسپین کا بہت بڑا سیاح علی بک عباسی تھا جس نے شروع انیسویں صدی عیسوی میں اس کی زیارت کی وہ بھی اس وجہ سے کہ لوگ اسکو مسلمان سمجھتے تھے اس لئے جو کچھ اپنے سفر میں دیکھا شائع کیا اور کسی چیز کی تصویر نہیں بنائی صرف ان کا خاکہ کھینچ لیا جس سے اونکی ترتیب کا اندازہ ہو سکتا تھا اس نے اپنے سیاحت نامہ میں بعض منقش پردوں اور بیش قیمتی دریوں کو دیکھا لکھا بیان کیا ہے۔

لیکن پہلا وہ شخص جو باوجود اس بات کے معلوم ہونیکے کہ وہ مسلمان نہیں ہے ان قبروں کی زیارت کی، وہ شاہ ایڈورڈ ہفتم تھے، انہوں نے سنہ ۱۸۶۲ء میں بذریعہ فرمان سلطان عبدالعزیز مرحوم کے اس کی زیارت کی لیکن انکو اور انکے ساتھیوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیگئی کہ وہ کسی چیز کی تصویر لیں اسی وجہ سے جب ڈین سٹینلے نے جو انکا سفر میں مددگار رہتا ایک سیاحت نامہ لکھا تو اس میں

سفرنامہ [illegible] نے دیکھا۔

موجودہ خلیل الرحمن کی مردم شماری پندرہ ہزار ہے جن میں سب مسلمان ہیں مگر تقریباً ایک ہزار یہودی ایسے ہیں جو شہر کے شمالی مغربی حصہ میں رہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اس کی زیارت یورپین سیاحوں کے لئے یورپین فیشن میں خطرے سے خالی نہیں ہوتی تھی سیاح جب اس کی زیارت کرنا چاہتے تھے تو اس بات کی بہت احتیاط کرتے تھے کہ مبادا کوئی انپر انکے غیرمسلم ہونے کا شبہہ نہ کرے بعض باشندگان شہر اکثر اس بات پہ فخر کرتے ہیں کہ کسی عیسائی کی مجال نہیں کہ اس مکان مقدس کی عمارت پاسکے۔ اسلام سے قبل یہ شہر یہودیوں کے اہم مقدس شہروں میں تھا۔ یروشلیم طبریہ صفد، حبرون ایک اور چیز جس سے اس کی قدامت معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ سفر التکوین میں اس کو حضرت ابراہیم کے عہد میں ذکر کیا گیا ہے انہیں عبارتوں سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ وہ حیثین کی سلطنت کے سایہ میں پرورش پاتا تھا اور اس کا نام قریۃ اربع تھا شاید اسکا سبب یہ ہو کہ وہ چار حصوں میں منقسم تھا جسمیں سے ہر حصہ میں ایک خاص قبیلہ یا خاندان سکونت گزیں تھا کیونکہ تدمار کے یہاں شہروغیرہ کی وجہ تسمیہ ایک یہی ہوتی تھی یونانیوں نے طرابلس شام کا نام ٹریپولی اسی وجہ سے رکھا تھا۔ آج بھی حبرون چار ٹکڑوں پر منحصر ہے جنکو حارات کہتے ہیں وہ یہ ہیں

(الف) حارۃ الشیخ (کیونکہ اس میں شیخ کی جامع مسجد ہے۔

(ب) حارۃ باب الزاویہ (جو وسط شہر میں واقع ہے)

(ج) حارۃ الحرم (جس کی نسبت اس حرم کی طرف کیگئی تھی جس میں حضرت ابراہیم کی قبر ہے۔

(د) حارۃ المشرقۃ (کیونکہ وہ پورب میں واقع ہے

۲ حرم خلیل

حبرون میں ہمیں اس مکان کا ذکر کرنا ہے جس میں حضرت ابراہیم اور انکے خاندان کی قبریں ہیں اس مکان کو اس وقت حرم کے نام سے پکارتے ہیں زمانہ قدیم میں یہود

حقل ملفیلہ کہتے تھے اور اسی نام کیا تھا اس کا تذکرہ سفر التکوین میں آیا ہے چنانچہ یوں
تذکرہ کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کی بیوی حضرت سارہ جبرون میں انتقال کر گئیں
تو آپ روئے اور نوحہ کرنے لگے اور حقل کو چیثین سے اس غرض سے خرید لیا کہ اس
میں انکو دفن کر دیں ۔ اس واقعہ کو توریت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ
اپنی بیوی کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے اور بنی حثا سے کہنے لگے کہ میں ایک مسافر آدمی
ہوں اور تمہارا مہمان ہوں ۔ تم مجھکو اپنا مقبوضہ مزار گاہ دیدو تاکہ میں اس میں اپنے
مردہ کو دفن کروں بنو حث نے حضرت ابراہیم کو جواب دیا کہ اے ہم لوگوں کے سردار
تم ہمارے درمیان خداوند کے منتخب کردہ ہو تم جس عمدہ سے عمدہ قبر میں چاہو دفن کرو
ہم میں سے کوئی تمکو اپنی مملوکہ زمین میں دفن کرنے سے نہیں روکیگا ۔ حضرت ابراہیم
کھڑے ہوئے اور زمین کے لئے بنو حث کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر تم مجھے دفن کرنیکی
اجازت دیتے ہو تو میری بات بھی سن لو کہ تم عفرون بن صوحر سے یہ کہو کہ وہ مجھکو
مغارۃ المکفیلہ جو اس کی ملکیت ہے اور اس کے حقل کی ایک طرف ہے پوری قیمت
میں جو تم لوگ اس مزار گاہ کی تجویز کرو دیدے ۔ عفرون بنی حث کے سامنے بیٹھا ہوا تھا
اس نے حضرت ابراہیم کو بنی حث اور ان تمام لوگوں کے سامنے جو اس کے شہر
میں آئے تھے جواب دیا کہ میں نے حقل کو تمہیں ہبہ کیا اور وہ مغارہ بھی جو اس میں ہے
تمہارے نام ہبہ ہے ۔ میں اسکو اپنی قوم کے سامنے تمہارے اوپر ہبہ کرتا ہوں میں
اپنی لاش تم وہاں دفن کرو حضرت ابراہیم نے عفرون سے با دب ان لوگوں کے
سامنے کہا کہ میری بات بھی سن لو کہ میں تم کو حقل کی قیمت دیتا ہوں اس کو
میری جانب سے لیلو اور میں وہاں اپنے مردہ کو دفن کر دوں ۔ عفرون نے حضرت
ابراہیم کو جواب دیا کہ زمین کی قیمت ۴۰۰ مثقال چاندی ہے ۔ حضرت ابراہیم نے
بنی حث کے سامنے ۴۰۰ مثقال چاندی وزن کر کے اس کو دیدی اب عفرون کی
وہ زمین جو مکفیلہ میں واقع تھی اور وہ غار جو اس میں تھا اور جو شجر و حجر وغیرہ جو اس کے
حدود میں آ سکتے تھے بنی حث کے سامنے حضرت ابراہیم کی ملکیت میں آ گئے ۔

شرح

اس کے بعد حضرت ابراہیم نے وہاں اپنی بیوی سارۃ کو دفن کیا۔
دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس قطعہ زمین میں حضرت ابراہیم انکی بیوی سارۃ
حضرت اسحاق انکی (حضرت اسحاق کی) بیوی کے خویش اقربا، حضرت یعقوب اور انکی
بیوی دفن کیگئیں۔

یہاں حضرت یعقوب کے مدفن کے بعد اس قطعہ زمین کا تذکرہ نہیں کیا لیکن اس بات
کی بہت سی دلیلیں ہیں کہ یہود حضرت ابراہیم کی قبر کی عزت کیا کرتے تھے اور یہ کہ وہ
جبرون میں سے ہے اس کو یوسیفوس نے اپنی تاریخ میں کئی جگہ ذکر کیا ہے اور علاوہ یوسیفوس کے اور دوسرے یہودی بزرگوں سے بھی یہ واقعہ منقول ہے۔ جبرون ہمیشہ یہود کا
مقدس شہر رہا تاوقتیکہ اسلام ظہور میں آیا اور مسلمانوں نے یروشلیم فتح کیا اور فلسطین
انکی سلطنت میں داخل ہوا، اوسیوقت جبرون بھی اسکے لپیٹ میں مسلمانوں کے زیر
حکومت ہو گیا اوسوقت مسلمان یہودیوں کی تقلید کرکے ان قبروں کی عزت کرنے لگے۔ انکا
حج از سر نو شروع کیا، اور شہر کا نام خلیل یا خلیل الرحمن رکھا اور اس کے مقبروں کے گرد
چار دیوار کردی جب جنگ صلیبی کا واقعہ ہوا اور فلسطین کو یورپ نے لے لیا تو اون لوگوں
نے اس کو انکی مذہبی جماعت کا قیام گاہ بنایا ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں نے پھر بیت المقدس
لے لیا اور جبرون بھی ان کے زیر حکومت ہو گیا اور اس وقت سے برابر آج تک انہیں
کے سایہ میں پرورش پا رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کروسیڈر ان آثار کی حفاظت
میں بہت کوشش کرتے تھے اس کا ثبوت وہ روایت ہے جس کو یاقوت حموی نے
اپنی کتاب معجم میں لکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ مجھ سے بہوی نے کہا کہ میں ۵۶۷ ہجری میں
یروشلیم گیا، اور وہاں اور نیز شہر خلیل میں بہت سے لوگوں نے مجھے کہا کہ ۵۱۳ ہجری
میں شاہ بہند ویل کے عہد میں یہ معلوم ہوا کہ مزار کا کوئی حصہ خراب ہو گیا ہے یہ سنکر
بہت سے یورپین حضرات اس میں بادشاہ کی اجازت سے داخل ہوئے اور انہوں
نے اس میں حضرت ابراہیم حضرت اسحاق حضرت یعقوب علیہم السلام کو پایا۔ ان کے
کفن پرانے ہو گئے وہ لوگ ایک دیوار سے ٹیکہ لگائے ہوئے تھے اور ان کے

سروں پر قندیلیں روشن تھیں اور انکے سر کھلے ہوئے تھے یہ دیکھکر بادشاہ نے ان کے کفنوں کو بدلوا اور وہاں پہ چہار دیواری کرادی ۔

یہ تو پہلے ہی بتلایا گیا ہے کہ زمانہ حال کے لوگوں میں علی بک عباسی نے انیسویں صدی عیسوی کے شروع شروع میں اس کی زیارت کی تھی وہ لکھتا ہے ۔ حضرت ابراہیم اور آپ کے خاندان کی قبریں ایک مسجد میں ہیں جو اصل میں ایک یونانی گرجا تھا اس کے اوپر پہونچنے کے لئے ایک عمدہ زینہ ہے جس پر سے ہم پہلے ایک مستطیل کمرے سے گزرتے ہیں جس کی بائیں طرف ایک مربع دروازہ ہے مسجد کی دہلیز میں دو حجرے ہیں ایک تو داہنی طرف جس میں حضرت ابراہیم کی قبر ہے دوسرا بائیں طرف جس میں حضرت سارہ کی قبر ہے مسجد کے نیچے کا حصہ زولیت ہے اس کے داہنی طرف کے دو ستونوں کے درمیان ایک حجرہ ہے جس میں حضرت اسحاق کی قبر ہے اور اسی کے بائیں طرف ایک اور حجرہ ہے جس میں انکی بیوی کی قبر ہے اس مسجد میں محراب اور نماز جمعہ کیواسطے منبر بھی ہیں صحن کی دوسری جانب اور زیارتیں ہیں جس کے ہر جانب ایک ایک حجرہ ہے جنمیں سے ایک میں حضرت یعقوب اور دوسرے میں انکی بیوی لیہ کی قبر ہے ۔

پھر اس کے بعد وہی لکھتا ہے کہ یہاں ایک حجرہ میں حضرت یوسف کی قبر ہے ۔ انکی لاش اسرائیلی یہاں اٹھالائے تھے ۔ ان بزرگوں کی قبریں بیش قیمت ہرے ریشمی قالینوں سے ڈھکی ہوئی ہیں جن کے اوپر سنہلا رنگ چمکتا ہے ۔ لیکن انکی بیویوں کی قبروں میں سے بعض سفید مخمل سے ڈھکی ہوئی ہیں اور ان پر سنہلا رنگ چڑھا ہے یہ سب پردے سلطان روم کے عطیے ہیں جو اس مسجد کیواسطے آتے ہیں اور خاص معین وقت کے بعد بدل دئے جاتے ہیں میں نے صرف حضرت ابراہیم کی قبر پر نو شمار کئے تھے ۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ تمام حجروں کو جن میں قبریں ہیں قالینوں سے نقاب پوش کیا گیا ہے

لکے دروازے لوہے کی کنڈیوں کے ذریعہ سے بند کردئے گئے ہیں جن پر چاندی کا ملمع ہے۔

ملی بک نے قبروں کی جگہ بھی بتلائی ہے مسجد ان قبروں کے اوپر بنی ہوئی ہے جو غار میں ہیں جو شخص اصلی قبروں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضرور ہے کہ غار میں داخل ہو لیکن اس کام کی تو مسلمانوں کے لئے بھی اجازت نہیں دیگئی ہے۔ زائرین صرف ان مزاروں کو دیکھتے ہیں جو مسجد میں غار کے اوپر بنی ہوئی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے پہلے ان قبروں کے مشاہدہ کی اجازت غیر مسلم کے لئے نہیں تھی۔ جب ۱۸۶۲ء میں انگلستان کے ولیعہد ایڈورڈ ہفتم فرمان سلطانی لیکر اس کی زیارت کو آئے تو ان لوگوں نے مقصد تک پہونچنے میں بہت مشقت اٹھائی کیونکہ فرمان حاکم قدس کے نام تھا اور ان لوگوں کو جبرون جانے سے پہلے وہاں جانا ضروری تھا اس کے بعد ان لوگوں نے بیت المقدس پہونچکر اجازت لینے میں بھی بہت زیادہ مصیبت اٹھائی۔ حاکم قدس اجازت دینے سے جس وجہ سے رکتا تھا وہ صرف پرنس ایڈورڈ ہفتم کے بارے میں عوام کا اعتقاد اور انکے غضب کا خوف تھا پہلے تو حاکم نے در گزر کرنا چاہا لیکن جب ان لوگوں نے اصرار کیا تو بہت پیچکچایا اور جب اجازت بھی دی تو اس شرط پر کہ مسجد میں صرف ولیعہد اور دو انکے ساتھی داخل ہو سکتے ہیں اور یہ اجازت صرف پرنس موصوف کی تخصیص کی وجہ سے دیگئی تھی اس نے انکے ساتھ پولیس بھی کردی تھی تاکہ کوئی متعصب انکے اوپر دست اندازی نہ کرنے پائے جب وہ لوگ مسجد کے پاس آئے انکا باقاعدہ استقبال کیا گیا اور دربان نے انکو اندر جانے دیا۔ سینلے نے مسجد کی وہی تعریف کی ہے جو ملی بک نے کی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ تمام قبریں جو مسجد میں ہیں انپر دیبا اور اطلس منڈھی ہوئی ہے یہ اصل میں قبروں کے تعویذ ہیں اور اصلی قبریں نیچے غار میں ہیں جہاں رسائی ناممکن ہے دربان نے اسے پادری کو ایک گول سوراخ بتلایا جس کا قطر ۸ انچہ تھا اور کہا کہ یہ غار تک پہنچ جاتا ہے اور یہ سوراخ اس لئے ہے کہ اس میں سے ان بزرگوں کی روحیں نکلکر مسجد میں آئیں

وہ لوگ اس سوراخ کے راستہ سے ایک چراغ بھیجتے ہیں جو کہ قبر کے اوپر روشن ہوتا ہے خود شہر کے باشندے غار تک کا یہی راستہ جانتے ہیں"

۳۔ مسجد خلیل اپنی موجودہ صورت میں

اس مسجد کی شکل مستطیل ہے اس کا طول ۱۹۷ قدم اور عرض ۱۱۱ قدم ہے اس کے اردگرد چار دیواری ہے جس میں ۲۹ ستون ہیں جن میں سے ہر ایک کی بلندی ۲۵ قدم ہے اپنی ساخت میں یہ بیت المقدس کے حرم سے مشابہ ہے اور اسی وجہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اسکو یہودیوں نے بنایا ہے اس کے دروازوں کا ارتفاع تقریباً ۱۴ قدم اوسط کے لحاظ سے ہے اس کی عمارت کے اندر بہت سے موٹے موٹے پتھر ہیں جن میں سے بعض کا طول ۱۴ قدم ۸ انچہ عرض ۲ قدم ۸ انچہ ہے مسجد میں دو منارے ہیں ایک تو شمال مغرب کی جانب اور دوسرا جنوب مشرق کی جانب اسلام کے قبل یہ عمارت ایک گرجا تھی اس کے بعد جامع مسجد بنائی گئی غالباً اس کی بنیاد ۱۱۸۷ء میں ڈالی گئی تھی شمال و مشرق کے گوشہ میں کچھ یونانی الفاظ کندہ ہیں جو قیصر یونان کے زمانہ کے معلوم ہوتے ہیں انمیں حضرت ابراہیم کا تذکرہ ہے اور ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس کو بنایا تھا دعائے خیر ہے مسجد اپنی موجودہ صورت میں دوسری مساجد سے بہت کم مختلف ہے۔

یہ غار بہت قدیم ہے اس کی قدامت کے بارے میں متواتر روایتیں ہیں اور نیز یہود نصاریٰ کی تاریخیں اس بات کو بتلا رہی ہیں کہ تین ہزار سات سال کا ہے۔ مسجد کی تعمیر میں بہت کچھ تجدید بھی کی گئی ہے اور اس وقت مسجد کی جو موجودہ صورت قائم ہے اس کا بہت کم حصہ تعمیر شدہ ہے لوگوں کا خیال ہے کہ خارجی چار دیواری قیصر روم ہیرودیان کے عہد میں بنی ہے اور مسجد گرجا صلیب کے زمانہ میں ۱۱۶۷ و ۱۱۸۷ عیسوی کے درمیان میں بنے ہیں بطور مقام یوسف خارجی گر رگاہیں ۱۰ اور سیڑھیاں مسلمانوں نے چودہویں صدی عیسوی میں بنایا ہے اور کھڑکیوں کے شیشے ۱۹۱۶ء میں لگوائے گئے ہیں

اس کے علاوہ اور بھی زیادتیاں ہیں جو بعد میں کی گئیں ہیں۔
اگرچہ ان کے نیچے تک رسائی ناممکن ہے لیکن پہلے اس میں جانے کیلئے کافی راستہ تھا جسے مسلمانوں نے پتھر لگادئے اور بغیر اس کے کہ جامع مسجد کا فرش توڑیں غار تک رسائی ناممکن ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسجد کے فرش توڑنے کی اجازت نہیں ہے ہر قبر کے واسطے ایک مستقل حجرہ ہے جنکا دروازہ آہنی چھڑوں کا ہے اور ان چھڑوں پر سونے کا ملمع ہے اس کے بیچ میں ایک قبہ نما مزار ہے جو عام مزاروں کے تعویذ قبر کے مشابہ ہے ان میں سے ہر ایک پر رنگین کپڑا چڑھا ہوا ہے جن پر بہت سی آیتیں اور فقرے لکھے ہوئے ہیں اور عمدہ نقوش بنے ہیں

۴ قبر ابراہیم و سارہ علیہما السلام

حضرت ابراہیم کی قبر ایک مثمن حجرے میں ہے جس میں اندر کی طرف سے سنگ سفید لگا ہوا ہے اس کے اوپر چھت کے قریب بہت سے کتابی نقوش کندہ ہیں حضرت سارہ کی قبر بھی ایسی ہی ہے انھیں سے ہر ایک چھت گنبد سے بنی ہوئی ہے جو سونے یا چاندی کی کڑیوں پر قایم ہے ان کڑیوں میں سے بعض پر ایسے کتابی نقوش بھی ہیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ سب سنہ [illegible]ھ میں از سرنو تعمیر کئے گئے ہیں چھت کے اوپر بہت سے چاندی کے چراغ یا شتر مرغ کے انڈے بھی لٹکتے ہیں دونوں مزاروں کا طول ۸ قدم عرض ۴ قدم اور بلندی ۸ قدم ہے ان کے اوپر گندمی و دیباج یا سبز و سفید حریر پڑا ہوا ہے اور ان پر آب زر سے چند عربی کے فقرے لکھے ہوئے ہیں حضرت سارہ کی قبر پر یہ الفاظ کندہ ہیں ’’ہذا قبر سیدتنا سارۃ رضی اللہ عنہا زوجۃ النبی خلیل الرحمن علیہ السلام‘‘ قبر کے اوپر ایک اور پردہ ہے جس میں عربی میں کچھ فقرے اور تسبیح کندہ ہیں لیکن وہ پڑھے نہیں جاسکتے قبر کے وسط میں بہت سے چھوٹے بڑے اطلس و دیباج کے کپڑے

ہیں جنمیں بعض تو سفید ہیں اور بعض ہرے ہیں دوران پر بہت سے نقوش آب زر سے
بنے ہوتے ہیں اور نیز اس پردے پر بھی جو قبر کا لباس ہے مزخرف نقوش بنے ہوئے

۵ قبر حضرت یعقوب ولیہ علیہما السلام

حضرت یعقوب اور انکی بیوی لیہ کی قبر ایک مستطیل حجرے میں ہے جس کے اوپر چھت
کے قریب مذکورہ بالا دونوں حجروں کی طرح نقوش بنے ہوئے ہیں ان قبروں پر بھی
منقش پردے پڑے ہوئے ہیں وہ پردہ جو حضرت یعقوب کی قبر پر ہے بالکل ویسا ہی
ہے جیسا کہ حضرت سارہؓ کے مزار پر ہے حضرت یعقوب کی قبر پر ایک مربع جگہ میں عبارت
کندہ ہے

۶ ،، ھذا قبر یعقوب النبی علیہ السلام

اور اس کے اوپر بہت سے چراغ لٹکتے ہیں جو چھت کے ذریعے سے بندھے ہوئے ہیں
حضرت لیہ کی قبر پر جنکو لائقہ کہتے ہیں ایک پردہ ہے جو اور تمام پردوں سے مختلف ہے
اس کے اوپر ایک مستطیل جگہ میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے ،، ھذا قبر سیدتنا لائقہ
رضی اللہ عنہا زوجہ النبی یعقوب علیہ السلام ،، پردے کے بیچ میں سورہ احزاب کی
چند آیتیں منقوش ہیں جو فارسی خط میں ہے۔

۷ قبر حضرت یوسف علیہ السلام

وہ قبر جس کو لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور تمام مزاروں سے
شکلاً مشابہ ہے اور اس کے اوپر بھی ایک پردہ ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے پردے سے
شکلاً ونقشاً مشابہ ہے لیکن مربع میں یہ عبارت کندہ ہے

،، ھذا قبر النبی یوسف علیہ السلام ،،

مزاروں کے دامن میں بہت سے قرآن مجید رکھنے کی جگہیں ہیں

مرزا نبی احمد بیگ

اسیر ازدواج

شیرازی مست ادب سے بھی ہجو سب کی تلخی کو اک علتِ مشکر لب کی خاطر گوارا کرلیا تھا - پھر ابو المعانی حضرت خلیقی کی زبان قلم سے اگر کوئی سرفراز رسوائی ہے تو اسکو بھی چاہیے دشنام کی تلخی کو فراموش کرے اور حلاوتِ سخن کی داد دے کہ یہی مذاقِ شعری ہے - (اڈیٹر)

تم مجھسے کچھ کہو یا نہ کہو مگر اس بات کا یقین کرلو کہ تمہاری موجودہ زندگی کی ایک وہ خلش جس کو تم نے ہمیشہ کے لئے راز بنائے رکھنے کا تہیہ کرلیا ہے، وہ وابستہ ہمت پر افشا ہوتی جارہی ہے ۔ میں باوصف تمہاری اس سعی اخفا کے، تمہارے اندر جو رستخیز انقلاب اور طوفان تہ نشیں ہے اس سے آگاہ ہو رہا ہوں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم مجھے اپنی تکلیفوں سے خبردار کردو، مجھے اس کی فرصت کیوں ہو، جو کسی کی رسوائیوں سے اپنا دل دکھاؤں، مگر یہ سمجھ لو تمہاری یہ پژمردگی اور خاموشی اسرار ایک بھید بنتی جاتی ہے اور تمہارے احباب یہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ یہ طویل اضمحلال اگر کوئی دل کا چور نہیں تو کیا ہے ؟!

"ٹھہرو! تم آدمی ہو یا الہام ناطق، جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، اوسکو تم خود پڑا نہیں کرتے ! اور وہ جو میرے دل میں نہیں، خواہ مخواہ فرض کئے لیتے ہو — میں پھر کہتا ہوں نہ میرا کوئی راز ہے اور نہ میں کسی تذبذب میں مبتلا - آپ کیوں صفائی سے گفتگو نہیں کرلیتے ! میں تمہاری بھول میں ڈالدینے والی انسان کو سوچ میں مبتلا کردینے والی قابلیت کا پہلے سے معترف ہوں، خواہ مخواہ مجھ میں تو لقمہ کوئی پندار پیدا کردینے والی کوشش نہ کرو - ایسا نہ ہو میں سچ مچ دیوانہ ہو جاؤں !!

یوسف ! تم ندامت سے زیادہ برباد ہوتے جارہے ہو - اس وقت اس میں کیا ہرج ہے

کہہ ڈالو جب ہوجاتا ہی انسانیت کی ایک جبل جس ہے۔ مگر میں تم کو یقین دلاتا ہوں
واقعہ کے خلاف۔ اس خوف سے کہ حقیقت کا انکشاف نہ ہوجائے، اگر کوئی بات آج کر گزرے
اور کل پاس سخن کے لئے اوس کی حمایت کی تو سمجھ لو پھر یہ حماقت طویل ہوجائیگی۔ اور
یہ جس قدر طویل ہوگی اوسی قدر وسیع ہوتی جائیگی! پایانِ کار تمہارے اندر انفعال و ندامت
کے احساسات مضطرب ہونگے اور تمہارے باہر تصنع و فریب کے اعمال متحرک۔
اس سے پہلے کہ تم دوسروں پر اپنا دل دکھاؤ، یاد رکھو تم خود اپنی حالت سے
دوسروں کے لئے دعوت الم، اور پیام درد ہو جاؤگے!!

—— اظہر: میں نے پہلے بھی کہا ہے مہمل گوئی بڑا مشکل فن ہے پھر اگر آج اسکا اعتراف
نہ کرلوں، تو سمجھتا ہوں تم اپنی تقریر کا جواب دیکر ملول ہو جاؤگے۔ مجھے اقرار کرنے
دو کہ میں تمہارے استہزا کا حریف نہیں، میں تمہارے پاس اسی لئے آتا ہوں کہ
تم میرے جذبات کا خون کرو۔ مجھے اس میں لطف آتا ہے کہ تم کچھ نہ کچھ کہا کرو اور
میں تشنگیٔ ذوق کیا تھا اوس وسعت بے معنی میں ٹھوکریں کھایا کروں

—— یوسف: میں اب مجبور ہوں کہ تمہارے مرض کو لاعلاج سمجھوں، اور مجھے
الزام نہ دیجئے اگر یہ کہوں کہ تم پہلے ہی میری نظر میں کچھ سے کچھ ہو رہے تھے مگر
اس مجلس نے یقین دلا دیا کہ تم زیادہ دماغوں پر جری ہوتے جا رہے ہو!
اچھا میں تم سے بالکل صاف کہے دیتا ہوں کہ تم بیمار ہو
اور وہ بیماری تمہاری مفادی ہو جاتا ہے:
ق بس ہے تم خوش نہیں
وہ بے پڑھی لکھی ہے اور تم نے احباب سے خواندہ کہا ہے!
وہ طول و رجوع کی بد مذاقی ہے تم نے خوش مذاق مشہور کیا ہے!
تم خیر سے دو تین ادبی رسائل کے اڈیٹر، اور وہ محض خبطی کبوتر۔ تم کو اپ ٹو ڈیٹ
فیشن کی ضرورت، اور وہ صرف سیر خانہ اور وہ دوغلہ مطیع ہے!
تم ذوق ادب سے عمدہ اشعار اور دلچسپ مضامین خواں کے حریص، اور وہ

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی مراۃ العروس کی ہیروین عاقل کی دلھن!
شادی ہو چکی - بی بی گھر میں ہے - ماں باپ فرض سے سبکدوش ہو چکے
اب الجھن ہے تو یہ ہے کہ اللہ یہ عمر قید ،، کون بھگتے - وہ قلم جو جذبات لطیف
کو جھوم جھوم کے لکھتا تھا سرنگوں ہو گیا ہے اور وہ دل جو شعر کا پرستا تھا
اپنی شعریت کی بربادی سے متالم ہے -
ایک طرف اپنی حیات و جذبات کی پامالی کا غم - دوسری طرف احباب میں بیگم کی بہ
اپنی آبرو سمجھ کر بنائے رکھنے کی دلخراش کوشش کی تکلیف - دو گونہ عذاب ست
جان مجنوں را ، کا مضمون - یہ ہے وہ بات جو آپ راز بنائے جا رہے ہیں
اور یہ ہے آپ کی حیات مشترک کا وہ راز جس کو آپ اپنی چھاتی سے لگائے بیٹھے
ہیں

—— اظہر ! میں نہایت کھلے دل سے آپ کی تقریر کے مفہوم کا استعمال کرتا ہوا
اور افسوس کرتے ہوئے آپ کے بیان کی تردید ، آپ باور کریں کہ آپ کے
قیاسات کا بہت سا حصہ قطعاً غلط ہے ! اور علی الخصوص —
—— یوسف ! میں نہیں سنا چاہتا وہ وہ تو قطعاً نہیں سننا چاہتا جو واقعہ کے
خلاف ہے ، میں تم سے تمہارے اس سے پیشتر کہے ہوئے چند جستہ جستہ
جملے دوبارہ کہوانا چاہتا ہوں -
—— آپ نے شادی کس سے کی ؟
—— عجیب سوال ہے - جس سے شادی ہوتی ہے -
—— شادی کس سے ہوتی ہے ، جواب دیجئے !
—— شادی ہوتی ہے صنف نازک جنس لطیف کے کسی ایک منتخب
فرد سے
—— جی - تو یوں فرمائیے شادی ہوتی ہے عورت سے !
اچھا آپ کو یاد ہے آپ کہا کرتے ہیں میں نسائیت کا پرستار ہوں -

وہ نسائیت کیا چیز ہے ؟

_____ اظہر ! نسائیت نام ہے جنس لطیف و نازک کے گداز فطرت کا اور وہ کوئی
شے جو اکی دوسری چیز نہیں

_____ یوسف ! تم گھبراؤ نہیں میں ابھی خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں ۔ سنو
مردانہ سطی جذبات کے بندے شباب کی تحریکوں سے متاثر ہو کر شادی کرتے
ہیں اور انکی نظروں میں عورت نہیں ما۔ شے ہورت قابل پرستش چیز
ہوتی ہے اور اشتراک جنسی کے تمام قوانین منحصر ہیں اسی قسم کے جذبات پر
اور وہ مقصود اس اشتراک سے محض توالد و تناسل ہے ۔

لیکن ایک وہ طبقہ جو اپنے آپ کو پرستار فطرۃ کہتا ہے وہ ان پابندیوں سے
بیزار ہے ۔ وہ کبھی نیچر کی سادگی کو آلودہ معصیت نہ کریگا ۔ اور باور کرلو
ان کے ہاں عورت ایک اور چیز ہے اور نسائیت ایک دوسری چیز ہے ۔
نسائیت کا عورت ہو جانا ممکن ہے مگر عورت کا پیکر نسائیت نہ ہونا تعجب خیز
نہیں ہے

پھر وہ جو فطرت کے گداز پرستش کو آلودہ معصیت کئے ڈالتے ہیں نہایت
بیوقوف ہیں اگر عورت میں نسائیت کی تلاش کرتے ہیں ۔ عورت ۔
اپنی شے پرستش سے ایک گروہ میں مقبول ہے ۔ ہو سکتی ہے ۔ مگر
نسائیت اپنی فطری سادگی و معصومیت کیوجہ سے تلوث سے لرزاں ۔

پھر اظہر تم نے اگر عورت سے شادی اسواسطے کی ہے کہ اس میں
نسائیت بھی ہوگی تو بتلاؤ تم کس قدر بیوقوف تھے ۔ اور نہ صرف بیوقوف
بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اور یہ پندار رکھتے ہوئے کہ نسائیت چیز ہے پرستش
کی ۔ تم نے نسائیت کو غارت استعمال کرنے کی جسارت بھی کی یہ تم گنہگار
بھی بنائے گئے ہو !

تعجب ہے ایک ایسی حقیقت غیر فانی جو ہم سے ہمارے اظہار عبدیت اور

اعتراف عجز کی خواہش مند ہو۔ بس کے حضور ہم خدا و تعالیٰ
جبار توں اور جبر ماتر و بیابانہ قدرتوں سے جاتے ہیں کبھی نظر کی
اچھوتی دلکشی، چاہے ہم لذت نظارہ پیش کرے ہم اسکو پامال غفلت
کر دیں ۔ ایک طرف تم نسائیت کی پرستش کا ادعا رکھتے ہو۔ دوسری طرف
گداز فطرت کا اپنے ہی اعمال سے استہزا کر رہے ہو ۔؟

—— اظہر! میں خوش ہوں آج اس بہانے سے تم مجھے پھر لذت ادب و شعر سے
سرشار کرسکے تمہارے علاوہ تخیل تمہارے رفعت فکر کا مجھ سے زیادہ کون
مداح ہوگا۔

مگر اس بحث میں تم ذرا قوانین قدرت، اور منشائے اشتراک جنسی کو غلط
سمجھے ہو ۔ علم اس سے کہ تم میری اس تقریر کے اکثر حصص سے کیا
معنی نکالو گے ۔ میں پھر کہونگا عورت، شے عورت ۔ اور نسائیت
ایک ہی چیز ہے ۔ اور قدرت نے اس کو اسی واسطے وضع کیا ہے کہ مرد اس کی
آغوش میں آسودہ ہو لیکن ایسے مواقع معدود ہیں جبکہ تلاش ناکامیاب
اور سعی ناکام رہے انسان جو چاہے کہہ سکتا ہے

قانون اشتراک جنسی اپنی برکات قدیم سے وہی رکھتا ہے جیسی کہ تخلیق آدم
اول کیوقت اس رشتہ سے منسوب کیگئیں ہیں میرے خیال میں انداز انتخاب
اور طریق ایجاب و قبول پر اگر جانبین کے خود ساختہ مالک ذرا توجہ کرلیں تو یہ
خیال اور عمل کی بربادیاں ایسی عام نہ ہوں"

—— یوسف! میں نہیں دیکھ سکتا کہ تم یوں اپنی حماقت کی جنبہ داری میں
میرے ذوق کی جراحت روا رکھو۔

خدا کیواسطے میں کب مسئلہ مناکحت پر گفتگو کر رہا ہوں کہ آپ قاضی جی ۔ اس
جلدی سے عیالدار بن گئے

یوسف پیارے محبت میں نفس اشتراک جنسی سے متنفر ہوں ۔ اور

میرا محبوب

کیا بتاؤں کون ہے؟ وہ ہے جسکی جلوہ ریزیاں دماغ کو معطل کر گئیں۔ جس کا سحر طراز تبسم محبت آگین سکر بہت دل کو دونیم کر گئی۔ اسکا حسن ہیبت ضیا فگن ہوا تو برقی اثر نظروں سے اوکی آنکھوں میں کھبکر اوہ میرے دل میں اتر گیا۔ اور دنیا ایک غیر فانی نقصان چھوڑ گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آئینہ وحاصل زندگی ظلمت ہے۔ اور ظلمت آب حیات کی امانت دار کیا تعجب ہے کہ تپش دلی مجکو بھی خضر راہ بنکر میرے محبوب تک پہنچا دے۔

میری آنکھوں سے سیل اشک نکلے و نیا لئے اوس کو زرتار سہرے کی لڑی جانا جس میں حسرت و آرزو کی افشاں کاری کی گئی تھی۔ محبت لے شوق۔ آرزو و ارمان کا مرصع کار تاج پیش کیا دست تمنا پھیل گئے آرزومند قدم آگے بڑھے۔ سر راہ تسلیم میں خم ہوا اور میں تاجدار الفت کہلایا۔

ایک پر اسرار طاقت مجکو اپنے میں ملائے لیتی ہے اور میری یہ کوشش کہ پیارے محبوب کو اپنی روح میں ضم کروں۔ لیکن وائے قسمت نہ روح میں لذت ہے نہ صورت میں دلفریبی۔ میرا محبوب میری طرف اگر محبت سے دیکھتا ہے تو وہ خود اوسکا پرتو حسن ہوتا ہے گویا میری آنکھیں آنکھونکی پتلیاں اوس کے غرور حسن کا آئینہ ہیں۔ ورنہ خود مجھ میں کوئی دلاویزی نہیں۔ آہ —— زیبائش حسن کی یاد —— سحر خیز نگاہوں کی یاد —— لب لعلیں کی یاد —— دُر دندان کی یاد —— عنبر بیز تبسم کی یاد۔ اور پھر آہ —— آہ خود تیرا یاد —— مال زندگی اور میری گہری محبت کا نچوڑ میں —— جس وقت چاہتا ہوں اپنے ذہن میں تیرا سراپا کھینچ لیتا ہوں سرخ سفید رنگ۔ محبت بھری آنکھیں۔ نازک لعلیں لب۔ جنکی حلاوت کا تصور مرمان میرے دل میں ایک شورش ایک ہلچل مچا دیتا ہے۔ چکدار پیشانی اور تابدار ریشمی گیسو یہ سب کچھ ایک پر مسرت کیفیت پیدا کر دیتی ہیں کہ میں بیخود ہو جاتا ہوں۔

ستمبر ۱۹۳۱ء

حسن

تاریکی میں تیری حسن کی روشنی میرے دماغی تخیلات کی رہبر ہوتی ہے۔ شب ماہ میں تیرا خیال میرا مونس ہوتا ہے اور میں مسرت کے مزے لیا کرتا ہوں۔

ہر صبح تیری حسن کے سنہرے خوشنما پھولوں کو جو آفتاب مجھکو بخشتا ہے خود تیرے اوپر نثار کر دیتا ہوں ——— ہاں۔ شام ——— سنسان شام میرا دل دکھاتی ہے۔ کیونکہ مجھکو وہی وقت یاد آ جاتا ہے جب میں تجھے ——— آہ تجھ سے نہ معلوم کب تک کے لئے جدا ہو گیا۔ اب میں ہوں اور میرا حسرتمند دل۔ دل میں تو ہے اور تجھ میں تعلیم محبت - دل پھر بھی کچھ چاہتا ہے ——— وہ کیا ؟

یہی کہ تیرے نازک پاؤں کے تلاؤں سے اپنی آنکھیں ملوں اور پلکوں سے اپنے نوشتۂ تقدیر پر سیکڑوں باریک خط کھینچ دوں

اور

اور ——— تیرا لطیف تبسم جو میرے شگوفہ دلکو کھلا دے اور جس کی خوشبو میری روح کے اردگرد ہو جائے اور اسکو معطر کر دے ۔ نیں

(عبدالحی مالک)

⁂

جو آنکھ حسن پرستی شعار کرتی ہے — وہ شکر نعمت پروردگار کرتی ہے

زبان جو ذکر ترا بار بار کرتی ہے — وفا کے عہد کو اور استوار کرتی ہے

ہماری آنکھ کہاں رہی ہر فرقت میں — کسی کی یاد پہ گوہر نثار کرتی ہے

کوئی ہوا بھی کبھی اپنی جان کا دشمن — کسی کی یاد ہمیں بے قرار کرتی ہے

خدا کیواسطے دنیا ہے مر مٹو تو یونہی — یہ دیکھ لو کہ تمہیں بھی پیار کرتی ہے

خفا ہے میری طبیعت سے خلق کیا جانے — ہر ایک فعل یہ بے اختیار کرتی ہے

ہوس نہ ہو تو ہیں آدمی فرشتہ ہے — یہی خبیث ہے جو اس کو خوار کرتی ہے

ابن حسین

مذہب یا فیشن

میں ایک ایسے مضمون پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو اصولی بھی ہے اور عملی بھی جس میں فلسفہ
بھی اسی قدر بھرا ہوا ہے جس قدر رنگینی اور بہار اور جو ہر شخص کی اعلیٰ تعلیم کا ایک معقول
درجہ تک بہت ضروری جزو ہے میں ان دو چیزوں میں حد تمیز قائم کرنا چاہتا ہوں
ایک تو مذہب ہے جس کو لوگ اس قدر کم سمجھے ہیں۔ دوسرے فیشن ہے جس کے لوگ
اس قدر زیادہ مرید ہیں۔ میری یہ خواہش نہیں ہے کہ ناظرین کو حدود بیان کر کے
یا ابتدائی مقدمات و تفصیلات سے پریشان کردوں اور اس لئے میں فوراً اس اسٹیج پر آ ملوں
جس پر یہ دونوں ناٹک کھیلے جاتے ہیں۔ ناٹک وہی مذہب اور فیشن کے۔ وہ اسٹیج انسان
کی زندگی ہے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں کہ زمانہ حال ماضی کا نتیجہ ہے یا نہیں یا استقبال
پر حال کا اثر پڑے گا۔ مگر یہ امر بدیہی ہے کہ زمانہ حال موجود و قائم ہے اور اس سے بحث
کرنا ہر طرح جائز ہے۔ ہم زندہ ہیں اور دنیا میں کچھ کرتے ہیں زندگی عمل کرتی ہے اور
اس پر عمل کیا جاتا ہے اس لئے سب سے مفید بات یہ ہے کہ ہمیں ایک تو زندگی کے
معنی معلوم ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ وہ عمل کیونکر کرتی ہے اور اگر ممکن ہو تو یہ بھی معلوم
کریں کہ کیونکر زندگی سے حسب دلخواہ کام لیا جا سکتا ہے عقل کی رو سے دیکھا جائے تو زندگی
میں کم از کم یہ دو اجزاء شامل ہیں (۱) جو قابلیتیں انسان میں ودیعت کی گئی ہیں۔
اور (۲) جو حوالی اور موقع اسے دنیا میں نصیب ہیں۔ اس حساب سے مقصد حیات
عقلاً صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ودیعی قابلیتوں کو ترقی دی جائے اور نصیب شدہ موقعوں
سے بوجہ احسن کام لیا جائے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص ایسا ہے کہ اللہ نے اس میں بمقابلہ
اور قابلیتوں کے محبت کی قابلیت زیادہ پیدا کی ہے اور وہ اوروں پر غالب ہے فرض
کیجئے کہ بیرونی مواقع اسے یہ نصیب ہوئے ہیں کہ خوشحال گھر میں پیدا ہوا۔ اچھے استاد
ملے سچے دوست دستیاب ہوئے اور سب ذرائع ایسے بہم پہنچے جن سے وہ اپنی معاش

عزت و آبرو کے ساتھ پیدا کر سکے اور خوشحالی سے بسر کر سکے۔ اس شخص کا مقصد حیات ہمارے متذکرہ بالا دعوے کے موافق یہ ہونا چاہیے۔ کہ (۱) اپنی محبت کی قابلیت کو بدرجہ غایت ترقی دے۔ اس درجہ تک ترقی دے کہ انجام کار سلسلہ مدارج سے فارغ ہو جائے۔ (۲) عمدہ تعلیم۔ عمدہ تربیت۔ عمدہ اخلاقی سبق۔ جائز ذرائع معاش۔ سچا لطف خانہ داری وغیرہ وغیرہ حاصل کرے اور روز مرہ کی زندگی میں ان سب کی چاشنی کو ملائے۔

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ سب کچھ کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہ مقاصد کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں؟ ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ مذہب سے دنیا کہتی ہے۔ نہیں فیشن سے۔ آؤ ان دونوں کے نفع و نقصان کا مقابلہ کریں۔

مذہب انسان کو شرافت زندگی سکھاتا ہے۔ مقصد حیات جتا دیتا ہے اور یہ تعلیم کر دیتا ہے کہ زندگی سب سے بہتر طور پر کس طرح بسر ہو سکتی ہے

فیشن کیا کرتا ہے کہ انسان پر ایک اوپر کا پچارا پھیر دیتا ہے خواہ اس سے اصلی نفع پہنچے یا نہ پہنچے۔

مذہب انسان کے پاس اس کی خدمت کرنے جاتا ہے۔ فیشن اسے بلاتا ہے کہ آ میری خدمت کر۔

مذہب اندر سے جلوہ گر ہو کر ظہور پذیر ہوتا ہے فیشن باہر سے انسان کے گرد حصار باندھتا ہے۔ مذہب سکھاتا ہے کہ ہر انسان ایک معین مقصد رکھے۔ اس میں ایک ہموار ترقی کرے اور اپنی ساری زندگی کو بنی نوع انسان کے فائدہ اور خدمت کے لئے وقف کر دے۔ فیشن کا تقاضہ ہے کہ خود غرضی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہو اور ہر انسان کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہماری اغراض کی خدمت کرے۔

ایک پس ماندہ بھائی کی مدد کرنا کسی افتادہ قعر مذلت کو سہارا دینا۔ غرضکہ بنی نوع انسان کے نفع کے واسطے جان تک قربان کر دینا مذہب ہے گو وہ شخص جو ان باتوں کا عامل ہو وہ ایک لقمہ نان سے شکم سیر ہو۔ برعکس اس کے تام آوری ثروت اور دولت کا فخر کرنا اور کسی کی مصیبت کی مطلق پرواہ نہ کرنا۔ اوروں کا حرج اور نقصان کر کے اپنی مطلب

برتری کرنا فیشن ہے گو وہ شخص جو ان باتوں کا عامل ہو کتب ساوی کا حافظ ہو اور دن رات معاد میں سر دق افروز ہوتا ہو۔

جس قدر جلد ہو سکے مذہب۔ اور فیشن کے فرق کو سمجھ لینا چاہیے۔ سمجھنا ہی نہیں بلکہ اس پر کاربند ہونا چاہیے۔

یہ سب مصیبت قحط۔ طاعون اور دیگر آفات کیوں ہے؟ مذہب کی کمی اور فیشن کی ترقی اس کا صحیح سبب ہے۔ بے غرضی مذہب ہے اور خود غرضی فیشن ہے۔

تھوڑے عرصہ کے واسطے زندگی کے ہتھیار دکھا دے اور نمود کی باتوں کو رد کرد۔ فرقہ بندیوں کی وقت ضائع کرنے والی باتوں اور حرکتوں کو استعفا دیدو۔ ذاتی اغراض اور نفس پروری کے خیال کو چھوڑ دو لوگوں کی مصیبت میں اپنے آپ کو جھونک دو۔ بے غرضی سے جو برکات زندگی کے حاصل ہوتے ہیں، انھیں ڈھونڈو۔ قطعی تمہارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ سچا مذہبی بننے کی عملی تدبیریں یہ ہیں کہ عرفان ذات حاصل کیا جائے لوگوں کی موجودہ مصیبتوں اور ضرورتوں کا اندازہ کر کے اپنی خواہشوں کو مرتب کیا جائے کچھ کر گزرنا چاہیے دماغ فرسائی کرنی چاہیے اور آخر کار عشق میں فنا ہو جانا چاہیے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

محمد سرفراز حسین قاری

آج سننے میں کل سنانے میں || عمر کھوتے ہیں اک فسانے میں
بھول جاتا ہے دام کو صیاد || جب چہکتا ہوں آشیانے میں
وائے بر حیات صد افسوس || بہ گئے ہم ترے بہانے میں
بے ثباتی مرا گزارہ ہے || زندگی میری آنے جانے میں
چھوڑ تسبیح اور بن دانا || قدرت حق ہے دانے دانے میں
جب تلک پڑ ہے چشم اشکوں سے || لاکھ گوہر ہیں اس خزانے میں
ساقی بزم انکسار ہوں میں || لطف پینے کا ہے پلانے میں
میں وہ دریا ہوں خاک ہستی کا || جس کا منبع ہے خود دہانے میں

(ایک خوان)

سحاب کی سرگذشت

بسلسلہ جولائی ۲۶ء

محمود! اگر تمہاری تحریر سے مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ تم میری طرف سے ایک سخت غلطی میں مبتلا ہو، تو شاید میری فرصت تم کو مخاطب کرنے کے لئے یا تمہاری کسی تحریر کا جواب دینے کے لئے بہت تنگ نظر آتی، کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ میرے نزدیک دنیا میں ہر نقصان کی تلافی ممکن ہے مگر وہ نقصان جو روح کو پہنچ جائے اور اس عالم میں ہر شکست کیلئے ایک پیوست ہے مگر وہ شکست جو کسی دل کو پہنچائی جائے۔ خیر، بہرحال اس تحریر کا مقصود صرف تمہاری اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے تاکہ تم آئندہ اس اظہار خیال کی جسارت نہ کرو اور کم از کم یہ کہ مجھے تم ہمیشہ کے لئے معاف ہی رکھو۔ کہ دل دنیائے عشق کے قابل نہیں رہا تمہارا میرے پاس سے جدا ہو جانا، مجھے معلوم تھا، دوسروں سے مل جاتا ہے اور اس لئے اب مجھے وہ خبر کیا سناتے ہو جو میرا دل سحاب سے ایک ماہ قبل سن چکا تھا۔ تم نے مجھے تکلیف پہونچائی۔ تم نے مجھے ایذا دی۔ مجھے اس کی بھی شکایت نہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے دنیا میں ایک خود غرض شخص سب سے پہلے جن لوگوں کو اپنے غیر شریفانہ حملہ کا مستحق سمجھتا ہے وہ اس کے احباب ہوتے ہیں اور اس لئے اگر تم نے مجھے بہت زیادہ صدمہ پہونچایا تو کیا عجب کیونکہ میں تمہارے ساتھ بہت زیادہ محبت رکھنے کا مدعی تھا کہ نہیں۔ تم نے مجھے تقریب عقد میں یاد کیا تھا، اور واقعی مجھ سے غلطی ہوئی کہ تمہاری اس دلنوازی کا شکریہ برمحل نہ ادا کر سکا، لیکن اب جب کہ سب ہو چکا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ لذات مسرت سے تھک جانے کے بعد اپنی فرصت معطل میں نشتر چبھونے کے لئے مجھی کو منتخب کرو۔ شاید اس لئے کہ میں تمہارے عقد کے خلاف تھا۔ شاید اس لئے کہ میں نکاح کو تمہارے لئے مضرت رساں سمجھتا تھا اور اب تم مسرور ہو، کامیاب ہو۔ گویا مجھ پر طعن کرتے ہو۔ خیر میں اس ذکر کو مختصر کرنا چاہتا ہوں اور تم کو اور تمہاری مسرت کو خیر المودت کے سر پر چھوڑتا ہوں۔ خدا

کرے وہ اپنے حصول تمہارے لئے بدل دے اور تم کو اپنے زعم و پندار سے پشیمان نہ ہونا چاہئے

اس تمہاری جس غلطی کا میں نے ذکر کیا وہ یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے دل کا کہنا کیا اور نہ یہ کہ تم

مجھ سے جدا ہو گئے۔ بلکہ وہ غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ زمانہ

اس صدمہ کو بھلا دے گا اور تم مجھ سے معافی چاہ کر اس خلا کو پر کر دو گے جو میرے تمہارے

مراسم محبت میں پیدا ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ میں کمی پیدا کر دے، یہ بھی

ممکن ہے کہ تم مجھ سے طالب عفو ہو لیکن، محمود، یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں

پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو اس سے مجھ سے مل کے کیا کرو گے، اور کیونکر پھر اس تمنا کو

زندہ کرو گے جو شکستہ ہو گیا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ میرے تعلقات تمہارے ساتھ دے تھے

بلکہ تمہاری فطرت و طینت کے ساتھ تھے۔ میں تم کو اس لئے محبوب رکھتا تھا کہ تمہارے

خد و خال حسین اور تمہارے انداز و اطوار دلکش تھے۔ بلکہ میں تو تم سے اس لئے محبت کرتا تھا

کہ تمہاری طبیعت حسین تھی۔ تمہاری فطرت دلکش تھی اور یقین کرتا تھا کہ میں اُن کے حسن و دلکشی

سے ہمیشہ لطف اٹھاتا رہوں گا۔ لیکن اب جبکہ تم میں وہ حسن، وہ دلکشی باقی نہیں، مجھے

تمہاری کیا پروا ہو سکتی ہے، اور میں اپنا وقت تمہارے لئے کیوں ضائع کروں جب کہ

اس سے بہتر مصرف وقت کا موجود ہے، یعنی تم سے احتراز و گریز، تم سے نفرت

و استکراہ جس میں اب میرے لئے لذت ہے جو اس سے قبل کبھی تمہاری طرف کھنچ جانے

میں تھی۔ ممکن ہے تم اسے میری خود غرضی خیال کرو اور تمہارا یہ خیال صحیح ہوگا، کیونکہ ہر وہ

امر جس میں تمہارا نفع مجھے نظر آتا تھا، میں اس کے حصول کی کوشش کو ہمیشہ اپنی ہی خود

غرضی پر محمول کرتا تھا اور اب جبکہ میرے تمام معاملات میں تمہارا سوال ہی اٹھ گیا ہے، تمہارا

وجود بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، یقیناً میں بہت زیادہ خود غرض ثابت ہونگا، کیونکہ تم سے

چھٹنے کے بعد میں خود اپنے آپ سے محبت کرنا سیکھوں گا اور کوشش کرونگا کہ تم کیا ساری

دنیا کو اس خود غرضانہ جذبہ پر قربان کر دوں۔ تم نے اگر میری محبت کو ٹھکرا دینا سہل سمجھا، تو

میں تمہاری طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لینا اس سے زیادہ آسان سمجھونگا، اگر تم نے میرے

خلوص و صداقت کا خون کر دینا دشوار نہ جانا تو میں تمہاری التجاؤں اور زاریوں کو ٹھکرا دینا کیوں

مشکل سمجھوں۔ اور غنیمت جانو اگر میرا جذبۂ انتقام صرف اسی حد تک وسیع ہو کر رہ جائے، ورنہ تم سمجھتے ہو کہ اگر میں چاہوں تو ایک دن، ایک لمحہ کے لئے بھی تم چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ اب کہ تم نے الگ اپنی دنیا بنالی ہے۔ شاید یہ خیال کرو کہ اس وقت تک تمہارے اوپر میرا اثر کسی خاص قوت کی وجہ سے تھا۔ لیکن میں نے تمہیں ہمیشہ یقین دلایا اور اب پھر یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کبھی اس قوت سے کام نہیں لیا۔ اور ہر چند اب کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے اقتدار سے اچھی طرح آگاہ کر دوں۔ لیکن نہیں تم مطمئن رہو، میں ایسا نہیں کرونگا کیونکہ اب ایسا کرنا بھی میری توہین ہے۔ جس کو میں خود بھلا دوں اسے پھر کبھی یاد نہیں کرتا اور اس لئے اگر آئندہ اب مجھے کوئی خط بھیجو تو اس یقین کے ساتھ کہ اس نے صرف میری ردی کی ٹوکری کا ایک کونہ آباد کر دیا اس حال میں کہ میری نگاہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ لفافہ کے اندر کچھ تھا بھی یا نہیں "

"شہاب"

یہ تھا جواب اس تحریر کا جو شادی ہونے کے بعد محمود نے شہاب کے پاس بھیجی تھی۔ محمود نے جو کچھ لکھا وہ ایک اپیل تھی طلب عفو کے لئے اور معذرت نامہ تھا جس میں اُس نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا تھا، لیکن شہاب نے جو فطرت کی طرف سے ایک نہایت عجیب و غریب دل و دماغ لیکر آیا تھا، محمود کی لجاجتوں اور التجاؤں کی مطلق پرواہ نہیں کی اور اس نے عہد کر لیا کہ محمود کی اس غلطی کو کبھی معاف نہیں کریگا اور کبھی اس سے سلسلہ خط وکتابت جاری نہ رکھے گا۔
شہاب کو معلوم تھا کہ محمود پر اس تحریر کا کیا اثر ہوگا، لیکن وہ اپنی تمام عمر میں کسی سے برہم ہو کر پھر کبھی خوش نہیں ہوا اس لئے وہ اس مسئلہ میں بھی اپنی طبیعت سے مجبور رہا۔
شہاب و محمود کے باہمی تعلقات کی نسبت کا عام خیال یہ تھا کہ شہاب نے محمود کو اپنی انجھونی قوت مقناطیسی سے متاثر کر رکھا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ شہاب میں یہ قوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شہاب نے محمود کو کبھی اس سے متاثر کرنا نہیں چاہا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو نہایت آسانی سے کر سکتا تھا اور ایک نگاہ میں محمود کو ہمیشہ کے لئے سکینہ کی طرف سے متنفر بنا دینا اس کے قبضہ میں تھا۔ لیکن چونکہ محمود ہی ایک ایسا شخص تھا جس کو وہ خارجی

طاقت سے دبا رکھنا چاہتا تھا، اس لئے شہاب نے اس قوت سے کام نہیں لیا بلکہ صرف اپنی محبت و خلوص کی بدولت سکینہ کو محمود سے علیحدہ رکھنا چاہا، جسکو محمود نے آخرکار توڑ ڈالا اور شہاب کو ایسا ناقابل برداشت صدمہ پہنچایا۔ شہاب کو محمود کیساتھ ایسی گہری محبت کیوں تھی، وہ کیا بات تھی جس نے شہاب میں محمود کی طرف سے اس درجہ گرویدگی و شیفتگی پیدا کر دی تھی؟ اس کے متعلق اگر ہم شہاب کی گفتگو کو صحیح سمجھیں تو ماننا پڑیگا کہ وہ محمود کے اندر نہایت بلند فطرت دیکھتا تھا اور چونکہ شہاب خود فطرتاً نہایت بلند ہستی کا شخص تھا اس لئے محمود کے ساتھ اس کا مانوس ہو جانا بھی فطری تقاضہ تھا، لیکن بعض پست خیال کے لوگوں میں یہ بھی چرچا تھا کہ محمود چونکہ بہت حسین ہے اور اس کی ادائیں نہایت دلکش اس لئے شہاب کی گرویدگی کا باعث یہی ہے اور اسی لئے وہ نہیں چاہتا کہ محمود شادی کرے کیونکہ پھر محمود کا تعلق دوسری طرف ہو جائیگا جس کو شہاب کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ بہر حال شہاب کی محبت محمود کیساتھ کسی وجہ سے ہو اس میں کلام نہیں کہ وہ تھی بہت بے پناہ اور غالباً حقیقت کا چھپانا ہوگا اگر کہا جاوے کہ محمود کو بھی کچھ کم وابستگی نہ تھی۔ وہ شہاب کی نہ صرف عزت کرتا تھا بلکہ اس کی پرستش کرتا تھا اور ایسی عظمت اس کی اپنے دل میں رکھتا تھا کہ بسا اوقات وہ اس جذبہ کی قوت سے کانپنے لگتا تھا۔ یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ شہاب اس سے کسی بات پر برہم ہو اور محمود نے پھر آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا ہو۔ لیکن سکینہ کے معاملہ میں وہ کچھ ایسا مجبور ہو گیا کہ باوجود سعی و کوشش اپنی طبیعت کو سنبھال سکا اور آخر کار عقد کرنے کے سوا اس نے کوئی چارہ نہ دیکھا۔

۱۰

بمبئی میں ساحل اپالو پر ایک شام جب کہ ابر برس کر آسمان و زمین، ہوا و فضا میں ایک عجیب نکھار پیدا کر گیا تھا، خلیل و اختر ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے سمندر کی تازہ تازہ ہوا اور پانی کے ہلکے ہلکے جھکولوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ شاندار فٹنوں اور قیمتی موٹروں سے اتر اتر کر ساحل پر خرام ناز کی مشق کرنے والیاں، تصنعات آرائش و لباس کو بدن کی ہر ہر جنبش سے نمایاں کرنے والی جوان جوان لڑکیاں یوں تو یہاں روزانہ ہر شام اپنے خرام سے ساحل کے ہر ہر ذرہ اور اپنے جلوۂ شباب سے فتنہ گر ہر دل کو بیقرار و مضطرب کر دینے کے لئے جمع ہو جاتی ہیں، لیکن کئی دن کی مسلسل بارش کے بعد جو آسمان کھل گیا تھا تو معمول سے زیادہ ہجوم نظر آ رہا تھا اور چونکہ وہ [illegible]

کی وجہ سے نائق جن کا فرض ہوا نہیں ہو سکا تھا، اس لئے اس دن نہایت جوش اور بہت محنت سے اہتمام کیا گیا تاکہ ایام کی غیر حاضری سے جو سکون و جمود پیدا ہو گیا ہے اُسے آسانی سے دور کر سکیں اور اس طرح تلافی مافات جلد ہو جائے

طفیل جو اپنی زندگی کا ایک ناقابل فراموش فرض سمجھ کر بیان دیا کرتا تھا، آج بہت مسرور تھا یہ دیکھ کر مینی کے ایک ایک گوشہ کا حسن کھنچ کر جمع ہو رہا ہے اور بس آخر جو کبھی اتفاق سے ادھر آ نکلتی تھی محض تھی یہ معلوم کرنے کے کبھی وہ ایک ساحل کی خلوت سے لطف نہیں اٹھا سکتی علی الخصوص اس وقت جب وہ موسم کے لحاظ سے اس سکون کی بہت زیادہ مشتاق ہو۔ وہ شاید اگر طفیل سے اصرار کے ساتھ یہاں دو لے آتا اور چلی جاتی۔ اگر لانے کے بعد اسی اصرار سے روک نہ لیتا۔

اختر فطرتاً بہت خلوت پسند تھی اور وہ باوصف اس کے کہ تھیٹر کے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں نگاہوں کے سامنے ہر رات اپنے آپ کو ظاہر کرنا اس کا روز کا مشغلہ تھا کبھی اس خیال سے خوش نہ ہوتی تھی کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے اور وہ اس کے بچنے کو دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیا کیا سمجھ رہی ہے۔ اس کی طبیعت میں حیا تھی، اس کی جوانی میں شرم تھی، اور وہ عرق عرق ہو جاتی تھی جب اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بار بار اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور اسی لئے وہ بسا اوقات بیزار ہو کر اسٹیج کو چھوڑ دینا چاہتی تھی، لیکن اسباب و موانع کے سامنے مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی اس حال میں بسر کر رہی تھی

اس وقت وہ اپنی سپید ساری میں، جو اس کی محبوب وضع تھی، خاص محویت کے عالم میں سمندر کے اندر ہلکے ہلکے ہچکولے لینے والے جہازوں کو دیکھ رہی تھی اور متحیر تھی کہ کیونکر لوگ آسانی سے اپنی جانوں کو اس تعمیر انسانی پر اعتماد کر کے پانی کے مہیب دیوتا کی آغوش میں سپرد کر دیتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ سمندر انسان کے اس پندار و غرور پر برہم ہو کر ان لوگوں کو کیوں نہیں نگل جاتا۔ وہ طفیل سے اسی کے متعلق گفتگو کر کے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوئی تھی کہ شہاب بھی آ گیا، اور اختر اک سرور تحیر کیا تھا اس کی پذیرائی کے لئے کھڑی ہو گئی اور طفیل سے بولی کہ آن سے دریافت کرنا چاہے، شہاب جو محمود کے واقعہ خاص سے بہت متاثر تھا کچھ نہ بولا اور بنچ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اختر تھوڑی دیر انتظار کر کے

مہ جبیں — شہاب صاحب، میں آج آپ کو خلاف معمول اگر مضمحل نہ دیکھتی تو آپ سے شکایت کرتی اور کہتی کہ آپ کیوں ایک ہفتہ سے نہیں ملے اور اگر نہیں آ سکتے تھے تو کیوں مجھے یاد نہیں کیا؟

شہاب۔ مضمحل تو ہوں، لیکن خلاف معمول نہیں، اس لئے آپ شکایت کیجئے۔ اگر میری طرف سے بجز اعتراف قصور کے کسی اور جواب کی توقع ہو،

طفیل (شہاب سے) اس اختر نے شکایت نہ کرتے ہوئے شکایت کر لی اور آپ نے بھی جواب نہ دیتے ہوئے نہایت حسن سے اس کا جواب دیدیا اس لئے اب اس کے متعلق گفتگو فضول ہے یہ بتائے کہ محمود کی شادی کیسے ہوگئی جب کہ آپ اس قدر مخالف تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس مسئلہ میں محمود نے بہت عجلت سے کام لیا، میرا خیال بھی ان کی نسبت یہی تھا کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں، اور وہ اپنی زندگی خراب کر لیں گے،،

شہاب میں انکی شادی کا مخالف نہ تھا، بلکہ صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ ایسا نہ کریں، یا ان کے اس فعل پر تاسف، سو یہ بھی فضول ہے۔ اب آپ کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ان کی زندگی زیادہ خراب و دشوار نہ ہو اور یہی بڑا احسان ان کے ساتھ ہے۔ زخمی ہو جانے کے بعد اندمال جراحت کی فکر کرنی چاہئے نہ کہ اظہار افسوس و ملال "

طفیل۔ "ہاں درست ہے، لیکن یہ کوشش بھی مفید نہیں ہو سکتی اور اس نوع کے ساعی کو کامیاب دیکھنے کی تمنا کرنا بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی ڈوبنے والے کو پانی سے نکالنا اور اس بات کی توقع رکھنا کہ اس کے کپڑے تر نہ ہوئے ہونگے۔ میرے نزدیک اب صرف اظہار افسوس و ملال ہی کا وقت رہ گیا ہے،،

شہاب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد اختر سے مخاطب ہوا،،

"دیکھو اختر صاحب آج کیا خوشگوار و دلکش موسم ہے۔ آپ کشتی کی سیر کو پسند نہیں فرماتیں"

اختر — "موسم ضرور دلکش ہے، لیکن یہ کشتی کا ذکر آپ نے کیا کیا؟ میری تو روح اس خیال سے کانپ اٹھتی ہے۔ بلکہ میں تو متحیر ہوں کہ لوگ کس طرح جانوں اور کشتیوں میں سفر کرتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ اپنی جانیں کیونکر بچا لاتے ہیں۔ میں اگر سمندر ہوتی

تو ایک کو چھوڑتی اور سب کو ڈبو دیتی۔ صرف اس غصہ میں کہ لوگ ایسی جسارت کیوں کرتے ہیں حقیقتاً سمندر کے سینہ پر اس آزادی سے پھرنا سمندر کی توہین ہے، جس کو میں تو کبھی برداشت نہ کرسکتی۔"

نجاب، یہ آپ نے کیا فرمایا۔ آپ سمندر بننے کی خواہش کرتی ہیں، حالانکہ اگر کوئی سمندر سے پوچھے تو وہ کہے کہ میں عورت کیوں نہ ہوا، جس کی صرف ایک نگاہ کے عمق میں میری تمام گہرائیاں ڈوب سکتی ہیں۔

اختر صاحب، آپ کیوں اپنی توہین کرتی ہیں جب کہ محض ڈبو دینے کے معاملہ میں ایک عورت سمندر سے بہتر کام کرسکتی ہے۔ رہا یہ امر کہ پانی کی اس طغیانی سے لوگ جانیں کیونکر بچالاتے ہیں یقیناً حیرتناک امر ہے۔ لیکن اس سے تعجب انگیز واقعہ یہ ہے کہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں۔ آپ سے ملتے ہیں اور پھر زندہ رہتے ہیں۔ اس کی تاویل ممکن ہے۔ لیکن اس کی تو کوئی توجیہ بھی نہیں ہوسکتی سوائے اس کے کہ خدا کا فضل شامل حال ہے۔"

اختر (مسکرا کر) آپ کی ذہانت جس قدر دلچسپ ہے کاش اتنی ہی متین بھی ہوتی تو خوب ہوتا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ عورتوں کو اپنی جنس سے بہتر خیال کریں۔ لیکن اس قدر توہین بھی مناسب نہیں کہ آپ واقعات کی حد سے گزر جائیں۔ افسوس ہے کہ ہر شخص اپنے تئیں مظلوم ظاہر کرکے اپنی غلطیوں اور اپنے مظالم کو چھپانا چاہتا ہے۔ لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کا عجز ہے۔ آپ عورتوں کو ملزم قرار دینے میں کس قدر جری ہیں اور خود اپنے جرائم و معاصی پر کبھی نگاہ نہیں کرتے، خود اپنے دست تطاول کے کارنامے کو یاد نہیں کرتے کہ غریب عورتوں کے دل کس کس طرح دکھائے جاتے ہیں اور پھر کبھی فکر اندمال نہیں کی جاتی۔ آپ افعال سے گزر کر شخصیت سے بحث کرنے لگتے ہیں، کیونکہ آپ کو معلوم ہے اس کے جواب میں ایک عورت آپ کی شخصیت سے بحث نہیں کرسکتی۔ آپ اس کی کمزوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جب کہ وہ آپ کی قوت کا ہمیشہ اعتراف کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ آپ کے نزدیک عورت کا وجود ہی تباہ کن ہے کیونکہ آپ اس کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اگر انصاف کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں

غلطی صرف آپ کی ہے۔ اور کمزوری آپ کے نفس کی ہے۔ اگر آپ نظام تہذیب و قانون و مذہب کے مطابق اپنی آزادی میں یکسانی پیدا کر دیں تو آپ کو کوئی شکایت کا موقعہ مل سکتا ہے، اور نہ عورت کا، جو آپ کے لئے تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ آپ کیوں وہ آرزو اپنے دل میں پیدا کرتے ہیں جو پیدا نہ کرنی چاہیے، آپ کیوں ایک چیز کو دیکھکر ایسی خواہش کی اپنے دل میں پرورش کرتے ہیں جو بے محل ہے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ آپ دیکھنے کی چیز کو ہاتھ سے چھونا چاہتے ہیں اور صرف چھونے کی چیز کو کھا لینا اور جب آپ اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس چیز کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر عورت کے ساتھ مردوں کی طرف سے وہی سلوک کیا جائے جس کی وہ مستحق ہیں، جس کی وہ اہل ہیں تو ایک طرف اگر عورتیں اپنی جگہ آرام سے رہ سکتی ہیں تو دوسری طرف مردوں کو بھی تکلیف نہیں پہونچ سکتی۔ مرد و عورت کا تعلق ایک فطری تعلق ہے جس سے مجبور ہو جانا نہ صرف مرد بلکہ عورت کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ اور اس لئے اگر صرف مجبوری باعث شکوہ ہو سکتی ہے تو اس میں مرد و عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ جدا بات ہے کہ آپ اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، ایک عورت ایسا نہیں کر سکتی اور اگر کرتی بھی ہے تو اس قدر مخفی طریقہ سے کہ آپ سمجھ نہیں سکتے۔ (باقی آیندہ)

نیاز فتحپوری

جو آنا فاتحہ پڑھنے تو ٹھوکر بھی لگا دینا — مری سوتی ہوئی قسمت کو تربت میں جگا دینا

ستم ڈھانا تمہارے ظالم یہ تیرا مسکرا دینا — مرے دل پہ ہزاروں بجلیاں اکدم گرا دینا

ہمارا کام تمکو دیکھکر آنسو بہا دینا — تمہارا کام رونا دیکھنا اور مسکرا دینا

غضب ڈھایا حیا نے بیچ میں پڑ کر شب وصلت — ذرا سی بیخودی یہ پردۂ حائل ہٹا دینا

مجھے بھی قتل ہونے کی ہے حسرت ایک مدت سے — سر مقتل چلو بھی خون لے قاتل بہا دینا

کہیں ظالم نہ وعدے سے قیامت میں مکر جانا — نہ پیش داور محشر ہی تو مجھکو دغا دینا

وہ مفلس ہوں وصیت کی ہے یہ مرتے ہوئے اتنا

شراب حسن ساقی میری مٹی میں ملا دینا

(محمد اسمٰعیل ہاتف)

شعاع مہر

جا رہا ہے رفتہ رفتہ سوئے مغرب آفتاب کوہ کی رفعت سے رخصت ہو رہی ہے آب و تاب
اک شعاع آخری لیکن ہے وقف اضطراب ارغوانی رنگ سے پیدا ہے شان التہاب

منظر قدرت پہ ہے گویا شباب آیا ہوا
کوہ پہ ہے یا کوئی مست شراب آیا ہوا

نور افزا جب سپیدہ صبح کا ظاہر ہوا نغمۂ بلبل سے گونج اٹھتی تھی جنگل کی فضا
اوس کے قطروں میں نے نور کو چمکا دیا نقرئی چادر کو گویا کھیت پر پھیلا دیا

اے شعاع مہر تو ہے رونق بزم جہاں
گرم تیری غمزے سے ہے ہنگامہ رزم جہاں

بحر پر طوفاں کے سینہ پر رواں ہے اک جہاز بادباں لہرا رہا ہے تو ہے اوس سے محو ناز
کر چکا جب بند ساز نغمہ ہائے جان نواز تجھکو چرواہے نے دیکھا گھاس پر جلوہ طراز

تیتری نے بھی نگاہ شوق سے دیکھا تجھے
شاہد گل نے دفور ذوق سے چوما تجھے

کس قدر ظلمت ربا ہے تیرے چہرے کی ضیا جس کے پرتو سے ہر اک گوشہ منور ہو گیا
کنج تاریکی تھا - اک افلاس کا مارا ہوا صبح کے پردہ میں جو پہروں تجھے ڈھونڈا کیا

روزن دیوار ہی میں تجھکو رقصاں دیکھکر
ہو گئی بشرے پہ اوس کے موج خندہ جلوہ گر

دیکھتا ہے خانہ کی سلاخوں سے اسیر نامرادی، حسرت و ارماں ہیں جس کے ہم صفیر
کہہ رہا ہے مہرباں ہو کاش پھر چرخ پیر اے شعاع مہر بن جا تو ہی میری دستگیر

میں مرقع ہوں الم و رنج کی تصویر ہوں
فرط غم ہوں ملت افسردہ کی تقدیر ہوں

رفتہ رفتہ اے شعاع مہر تو ہو یا نہاں   اضطراب شوق دل میں لے رہا ہے چٹکیاں
کاش میرے قلب میں پیدا ہوں ایسی گرمیاں   جنکو برساتی رہیں تیری تبسم ریزیاں

جوش مستی میں، وفور شوق میں رقصاں ہوں
زمزمہ پیرا رہوں، فرحاں رہوں شاداں رہوں

ترجمہ   محمد یحییٰ ۔ اشہر

تارے

مسز ہمنس کی انگریزی نظم کا ترجمہ

گرمیوں میں نام تک رہتا نہیں ہے ابر کا   ماہ انور چرخ پر پھرتا ہے اٹھلاتا ہوا
اور تارے آسماں پر رہے ہیں چمکے ہوے   جیسے نیلی چھت میں ہوں الماس کے جڑے ہوے

خاک کے پتلے! نظر اوپر کی جانب کو اٹھا   کر نظارہ وسعت چرخ منور کا ذرا
اس کی عظمت پر ذرا تو اپنے دل میں غور کر   اور ہو جا غرق دریائے تحیر سر بسر

بستے ہیں چرخ پر جو یہ کواکب اور ماہ   کیا نہیں یہ خالق بیچوں کی قدرت کے گواہ
کیا الگ تجھ کو نظر آتا نہیں اے مشت خاک   آسماں پر آتشی حرفوں میں اسکا نام پاک

کون تعداد ہائے نور کا بتلا شمار   رات بھر رہتی ہے جنکی جگمگاہٹ کی بہار
ہے کوئی انسان جو صرف کرے اسکا بیان   ہم بتائیں گے شمار شمع ہائے آسماں؟

جب دیکھ رات میں چمکے ستارے جنکو تک   دور سے پڑتی ہے تیری آنکھ پر جنکی چمک

[illegible]

[illegible] آئینہ [illegible] ... [illegible] کہاں [illegible]

یہاں پیدا جو ہوا کوئی تو مرنے کے لئے

اس گزرگاہ میں آیا ہے گزرنے کے لئے

پھر نہ نکلا جو چھپا اب مہ کنعاں ہے کہاں — کہاں وہ مورِ ضعیف اور سلیماں ہے کہاں

اب وہ قارون کہاں اور کہاں گنج اس کا — اب وہ شداد کہاں اس کا گلستاں ہے کہاں

بچے نہ رستم نہ زوران کا اجل نے توڑا — اب وہ سہراب کہاں رستم دستاں ہے کہاں

بزم جمشید کا اک نام چلا آتا ہے — ہے کہاں سازِ طرب عیش کا ساماں ہے کہاں

نیک یا بد ہو کوئی نام ہی رہ جاتا ہے — اب وہ فرعون کہاں موسیٰ عمراں ہے کہاں

نہ تو مفلس نہ تو ذی جاہ رہے گا باقی

سب ہیں فانی فقط اللہ رہیگا باقی

کبھی عزت کرے انساں اگر دنیا میں — اور کس کے لئے ہے علم و ہنر دنیا میں

ہے اسی کے لئے سب کچھ یہی سب سے افضل — کب بشر سے ہے فزوں قدر گہر دنیا میں

جو کہ نیکی جہاں میں ہے اسی کی عزت — خوار رکھتا ہے مگر فتنہ و شر دنیا میں

حال یا گر نہیں معلوم ہے لیکن سب کو — نفع نیکی سے بدی سے ہے ضرر دنیا میں

سامنے جائیں گے اللہ کے ہم کس منہ سے — ہم کو عصیاں کا نہیں خوف و خطر دنیا میں

موت کیسی ہے ذہین اور یہ جینا کیا ہے

ابھی سمجھا ہی نہیں ہم نے یہ دنیا کیا ہے

ذہین

نیچر

قطرہ شبنم ہے دامان سحر میں جلوہ ریز — کر رہی ہے نکہت گلزار جس کو مشک بیز

تاب [illegible] سے خرام ناز ہے — بیکسی کا جس کی خاموشی میں اک انداز ہے

ایک گوہر ہے کہ صحن چمن میں جلوہ گر — آہ! جو اپنی فنا کے وقت سے بے بہرہ
جس کی ہستی بحر عالم میں ہے مانند حباب — منحصر ہے رحم پر موجوں کے جس کی آب و تاب
قطرۂ ناچیز کی گوہر فشانی دیکھئے !
پھر یہ اس کی بے بسی اور بے زبانی دیکھئے !!

محمد اسلم قریشی

برسات کی بہار

موتی برسانے کو آئی ہے گھٹا ساون کی — ابر گوہر بار نے باندھی ہے ہوا ساون کی
زیب بر سبزہ تر کے ہے قبا ساون کی — روئے گلشن سے برستی ہے فضا ساون کی
جلوۂ رحمت حق بنکے بہار آئی ہے — فصل گل ساتھ لئے پھولوں کے ڈالی آئی ہے
گلشن دہر پہ ہے سایہ دامان بہار — پردۂ غیب سے ظاہر ہوئے سامان بہار
چشم بد دور۔ دو بالا نہو کیوں شان بہار — بارش ابر کرم بنگئی ہے جان بہار
غیرت دامن گلزار بیابان ہوئے — یعنی جنگل میں بھی منگل کے ہیں سامان ہوئے
ابر رحمت کے جو چھینٹوں سے زمیں ہے سیراب — کہیں کھیتی ہے ہری ہیں کہیں جنگل شاداب
ہیں بصد جوش کہیں آپے سے باہر تالاب — لب دریا ہیں کہیں پھول کنول کے خوش آب
جھولتے ہیں سمن اندام کہیں جھولوں میں — ڈالیاں گل کی تلی ہیں کہیں پھولوں میں
جس طرف دیکھئے آتی ہے نظر ہریالی — پتہ پتہ ہے ہرا سبز ہے ڈالی ڈالی
پھول کی بادۂ شبنم سے بھری ہے پیالی — چشم نرگس بھی اسی دور کی ہے متوالی
مستی حسن کے ہیں ناز بہار گل میں — نشے کے ہیں انداز بہار گل میں
دست مشاطۂ قدرت نے کیا ہے جو سنگار — آب آئینہ سے بڑھکر ہے رخ گل کا نکھار
قابل دید ہے غنچوں کے تبسم کی بہار — سیر گلشن سے خلیق ہوتی ہیں آنکھیں سرشار
موسم گل میں ہیں ہر سمت غضب کے جلوے — حق تو یہ ہے کہ یہ ہیں قدرت رب کے جلوے

خلیق دہلوی

کلامِ اکبر

ہاتھ میں زنجیر ہے ظاہر کوئی گُن کیا کروں
دوسروں کے بس میں ہو فکرِ تمدن کیا کروں

آگ برسانے لگی جب اس گلستاں کی ہوا
خوبیٔ نشو و نمائے نخلِ گلبن کیا کروں

قبلہ کالج بن گیا سب کچھ ہے بس اپنا قیاس
کیا بتوں میں شیوۂ اظہارِ تسنن کیا کروں

مہربانی سے مجھے گودام کی کنجی تو دی
لیکن اب گیہوں نہیں باقی مطمئن کیا کروں

دیر میں کل گا رہی تھی اک زنِ زہرہ جبیں
جب پیا پاپی ہے تجھ کو تو میں جوگن کیا کروں

عقل رو دیتی ہے کہ یہ گتھی سلجھتی ہی نہیں
ہر گرہ جو ہو بنی ہے شکلِ ناخن کیا کروں

(اکبر الہ آبادی)

غزلیات

حضرت سائل دہلوی

غیر سے روٹھے رہے تکرار ہو کر رہ گئی
کروٹیں قسمت نے لیں بیدار ہو کر رہ گئی

فیض یابِ زخم دمساز ہو کر رہ گئی
یعنی پہلو کی چھری تلوار ہو کر رہ گئی

جلوہ ریزی طور پر اک بار ہو کر رہ گئی
قسمتِ موسیٰ سے عمراں یار ہو کر رہ گئی

اپنے کوچے میں اٹھایا حشرِ عام چھوڑ کر
دو قدم ہی شوخیٔ رفتار ہو کر رہ گئی

ہائے کہکر ہو گئے خاموش وہ اللہ رے ضبط
آہ کی برچھی جگر کے پار ہو کر رہ گئی

جس جگہ تھے داغ جس جا زخم تھے ناسور تھے
حسرتِ دل بھی وہاں آزار ہو کر رہ گئی

نشۂ جوشِ جوانی سے ٹپکتی ہے یہ بات
آنکھ تیری بے پئے سرشار ہو کر رہ گئی

دانہ دانہ جپتا پھرتا بتکدہ میں شیخ کو
سبحہ کچھ ہم رشتۂ زنار ہو کر رہ گئی

دم کہاں رہتا جو دل کے پار ہو جاتا خدنگ
جان قرباں تا لبِ سوفار ہو کر رہ گئی

قتل کی نیت میں قاتل کس لئے ایذا رس
یہ بتا دے کیوں طلب تلوار ہو کر رہ گئی

*

وہ جب آئے ہو چکی جب جان صرف انتظار
میری کشتی تمنا پار ہو کر رہ گئی

غیر کی گردن میں کافر گیسو کی بانہیں پڑیں
یا اجل اُس کے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

پہلے تھی بجلی کی جھلی اب لہو کی آب سے
نامزد تیغ ستم گلنار ہو کر رہ گئی

آج واعظ نے فقط ذکر قیامت ہے کیا
تیری شرح شوخی رفتار ہو کر رہ گئی

مدعا یہ تھا کہ کل کی تھی آن آجائے اجل
دو ہی دن بس پرسش بیمار ہو کر رہ گئی

کل نہ ملکر کیجیے گا عیش خلوت کر کرا
بہت سلامت آج تو انکار ہو کر رہ گئی

شرم آتی ہے یہ سنکر دل بتو تمکو دیدیا
یوں کہو دل پہ خدا کی مار ہو کر رہ گئی

میکشو کیوں بجومی پر شیخ کی پگڑی نہ لی
جاؤ بس تمسے ہماری یار ہو کر رہ گئی

دل نثار غمزہ نوخیز ہو کر بچ گیا
جان فدائے شوخی رفتار ہو کر رہ گئی

مانع لطف نظارہ تھی تری تنویر حسن
در میں وقت دید جو دیوار ہو کر رہ گئی

جتنیا ہوتے ہی قاصد کہہ گیا فرصت نہیں
عیش کی شب میری شام تار ہو کر رہ گئی

ابن عمر کا فسانہ سنکے جی سا چھٹ گیا
دل میں پیدا حسرت دیدار ہو کر رہ گئی

آپ فرماتے تھے اب تو ہم کریں گے دیکھ بھال
دلدہی خاطر بیمار ہو کر رہ گئی

قید طاعت کی علامت برہمن میں شیخ میں
سبحہ بنکر رہ گئی زنار ہو کر رہ گئی

تا قیامت فتنہ اٹھیں گے ترے کوچے سے روز
ہو گئی اور شوخی رفتار ہو کر رہ گئی

جور گلچیں سے اڑے بلبل کے اس درجہ حواس
شاخ گل بر نقش بر دیوار ہو کر رہ گئی

اُنکے تیور دیکھکر مشکل کیا ہوتا سوال
بات اتنی اس قدر دشوار ہو کر رہ گئی

حضرت محشر لکھنوی

کیا کہیں اس کے سوا اور حقیقت دل کی
اک نگاہ غلط انداز ہے قیمت دل کی

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ زبان بند رہے
کیا کہیں کیا نہ کہیں آپ سے حالت دل کی

وہ بھی دن تھے کہ امنگوں سے خوشی تھی کیا کیا
ہائے کس منہ سے کریں آج شکایت دل کی

سمجھیں بیچے سبھی اک قطرہ خون ہے بس بس
اور کیا اس کے سوا ہوگی حقیقت دل کی

ایک نظر

ایک غلط فہمی

من آنم کہ من دانم

ڈیر عباس! تمدن کے اگست نمبر میں ایک تحریر درج کرتے ہوئے جس انداز سے اپنے ناظرین سے میری معرفی کرائی ہے، یقین کیجئے کہ آپ کے اس طرح کے اظہار اخلاص نے مجھے منفعل کر دیا۔ ڈرتا ہوں مبادا احباب اور ارباب ذوق میں کچھ غلط فہمیاں نہ پیدا ہو جائیں اس واسطے جناب سے میری درخواست ہے کہ میری ان سطور کو بھی شائع فرمائیے،

جہاں آپ نے حضرت نیاز اور مسٹر سجاد میں فرق و امتیاز کی گفتگو کی ہے وہاں میرا ذکر بھی آپ نے کچھ اس طرح کیا ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ میں بھی حضرت نیاز کا ہمسر و ہمعنان ہوں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میں تو حضرت کے بعض شاگردوں کا بھی ہم پرواز و ہم آہنگ نہیں، چہ جائیکہ حضرت نیاز کی ہمسری! یہ فیض صرف حضرت ہی کا ہے کہ آپ کی لطیف صحبتوں نے متاثر کر دیا۔ میں تو اپنے دل کو شاگردانہ خلوص سے معمور پاتا ہوں، لہذا آپ بھی میرے جذبات کو ٹھیس نہ پہونچائیے۔

اب رہی گفتگو جناب سجاد اور حضرت نیاز کی رعنائی انشا و ادب میں، یہ بحث مستقل فرصت چاہتی ہے، حضرت نیاز کے اختراعات ادبی، ایک مفکر چاہتے ہیں۔ وقیق، آپ بھی نقاد کا دوراول اٹھا کر دیکھئے، کیوپڈ سالک۔ مصور فرشتہ، اک شب کی قیمت وغیرہ اس وقت تک ملک سے جواب نہ پا سکے۔

میں نہیں چاہتا کہ اس بحث کو طویل کیا جائے بہر حال میں تو بندہ نیاز ہوں حاشا کہ معنی ہمسری نہیں اور نہ یہ سنکر خوش کہ کوئی مجھکو ان کا ہمسر کہے! اب مجھے اگر آپ مسرور کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے پرچہ میں میری یہ تحریر شائع فرما دیں تاکہ میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں!!

ہم بلاشبہ خلیقی صاحب کا ایک خط ہے جسے ہم نہایت خوشی سے شائع کرتے ہیں خلیقی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے انکے اس خلوص اور عقیدت اور محبت کا پتہ چلتا ہے جو انکو جناب نیاز سے ہے ہم نے پچھلے پرچہ میں جو نوٹ افسانہ صنوبرا پر لکھا تھا اس میں ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ جناب سید سجاد حیدر صاحب جناب نیاز صاحب اور جناب خلیقی صاحب کا کوئی تقابل کریں اور نہ اب یہ مقصود ہے۔

خلیقی صاحب اپنے متعلق جو جی چاہے لکھیں اور جس قدر جی چاہے انکساری سے کام لیں مگر ہمارے پاس حضرت نیاز کا ایک اعتراف موجود ہے جو انہوں نے انکے ایک مضمون پر نوٹ لکھتے ہوئے خطیب کی پہلی جلد کے نمبر ۲ میں تحریر کیا ہے حضرت نیاز تحریر فرماتے ہیں

مرزا نوشہ غالب نے کسی کی گفتگو سے لطف خاص اٹھانے کی حالت میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کیسی پیاری سی بات کہی کہ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے یہ بات ہمیں خلیقی صاحب کے لطیف تخیلات میں وہ کیفیت ہے جس کی نسبت بے اختیاری کہنے کو جی چاہتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ خیالات میں کوئی نمایاں تسلسل نہیں مگر یہی وہ بے ربطی جو شاعرانہ لب لہجہ میں بزبان محبت کہی جاتی ہے اردو میں اس رنگ کے لکھنے والے کم ہیں اور اس کی قدر کرنے والے بھی تاہم وہ حضرات جو ادب لطیف سے متنفر نہیں ہیں اس مضمون میں بعض بعض جگہ دلچسپی کا سامان پائیں گے جسے ہم شکریہ کیساتھ درج کرتے ہیں اس رنگ میں اپنے دوست کی کامیاب کوشش کی داد دیتے ہیں

خلیقی صاحب کی تحریر پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کم از کم حضرت نیاز تو انکے اس درجہ انکسار پر خوش نہیں ہو سکتے ہمیں یہ معلوم کرکے سخت افسوس ہوا کہ جناب نیاز کے بعض معتقدین نے یہ خیال قائم کر لیا کہ ہم نے مذکورہ بالا تینوں حضرات کا کوئی تقابل کیا ہے حضرت خلیقی اور حضرت نیاز کی بحث پر ہم نے جو کچھ لکھدیا اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں البتہ حضرت نیاز اور حضرت سجاد کے متعلق ہم یہ عرض کرینگے کہ نیاز اور سجاد کا کوئی مقابلہ ہی نہیں انکا رنگ جدا اور انکی روش الگ ان دونوں حضرات کو کوئی مقابلہ میں لانے کی جرات نہیں کرسکتا حضرت نیاز کی تحریر میں اور خیالستان کی جاذبیت جس شخص کی نظر سے گذری ہوں وہ اس غلط فہمی میں بہت مشکل سے گرفتار ہوگا۔ البتہ یہ ہم اب بھی لکھتے ہیں کہ سید سجاد حیدر نے ترکی لٹریچر سے مستفید ہو کر ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی اور یہی وہ طرز تھا جس نے آگے چل کر حضرت نیاز سا ادیب اردو میں

ایک نئے اور نہایت خوش نما رنگ کی بنیاد ڈالی اور پھر اس رنگ کو معراج پر پہنچا کر اردو ادب کی اصل جان از رنگ بنوا دیا
ہمیں تعجب ہے کہ حضرت نیاز کے رتبہ شناسوں کو یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ حضرت نیاز کو ہم نے مجاذب کا مقلد بتایا ہے اور ہم
ان دونوں حضرات کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں لاکر ٹکرانا چاہتے ہیں ہم اوس بار دو کے قدردان جانتے ہیں کہ نیاز ایک دوسری چیز ہیں
اور مجاذ قطعاً ایک اور چیز۔ امید ہے کہ ہماری اس تحریر کے بعد ہمارا مقصد صاف ہو جائیگا حضرت نیاز کے مخلص قدرشناس ان
چند لوگوں کو مستثنے کرکے کہ جنکی قدردانی حضرت نیاز کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتی، در یقینا مطمئن ہو جائیں گے۔ ہم
اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے اور اسلئے خیال کرتے ہیں کہ ہماری یہ تحریر بحث کو ختم کرنیکے لئے کافی ہوگی بعض لوگوں کا خیال
ہے کہ ہم نے حضرت نیاز کی پیروی کو کثرت میں محدود کرکے انکی توہین کی ہے انکے لئے ہمارا یہ لکھنا کافی ہوگا کہ وہ اپنے رنگ کا خاتم ہو

چند مطرح غزلیں ۔ اس پرچہ میں چند مطرح غزلیں درج کیگئی ہیں۔ یہ غزلیں دہلی کے ایک مشاعرے کی
ہیں جو پنڈت امرناتھ صاحب ساحر کے مکان پر گذشتہ آخیر ہفتہ میں منعقد ہوا تھا ان غزلوں کی ردیف ہو کر رہ گئی
ہے افسوس ہے کہ بعض غیر خوشگوار واقعات کے رونما ہونے کی وجہ سے جلسہ عام طور تکلیف سے خالی نہیں حضرت
سائل اور جناب قیصر کی غزلیں مشاعرے میں پڑھی نہ جا سکیں

آئینی اصلاحات کی اردو رپورٹ ۔ ہمارے کرم محترم عنایت فرما سید جالب صاحب دہلوی ایڈیٹر
ہمدم لکھنؤ نے صاحب وزیر ہند کی آئینی اصلاحات کی رپورٹ کا اردو ترجمہ اصل رپورٹ کے شائع ہونیکے ایکماہ
بعد شائع کرکے ملک اور زبان اردو پر گراں بہا احسان کیا ہے۔ سید جالب صاحب کا نام اونکا وسیع تجربہ
اور اخباری قابلیت کا تجربہ اس بات کی کافی سے زیادہ ضمانت ہے کہ یہ ترجمہ نہایت صحیح لفظی اور بامحاورہ
ہوگا آئینی اصلاحات کو ہندوستانی اسپرانٹو اردو کا لباس پہنا دے اور اسطرح ملک کے بیشتر حصہ کو
مسٹر مونٹیگو کی رپورٹ سے روشناس کرانے کی جس قدر زیادہ ضرورت تھی اوس سے کوئی شخص انکار
نہیں کر سکتا۔ سید جالب صاحب کی محنت اس بات کو مدنظر رکھتی ہوئی کہ یہ کام اونہوں نے اپنی اخباری
مصروفیت کو جاری رکھتے ہوئے کیا ہے اور بھی زیادہ قابل داد ہو جاتی ہے۔ سید صاحب کی اس محنت پر ملک کو
بدرجہ اتم انکا مشکور ہونا چاہئے۔ یہ کتاب بیس چھبیس کی تقطیع پر دوسو سولہ صفحہ کی ہے کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ
زیب ہے اور اس پر اس کی ایک روپیہ قیمت بہت کم ہے جن لوگوں کو ملک کی سیاسیات اور اوسکے سیاسی مستقبل
سے خفیف دلچسپی بھی ہے اونکے پاس اس کتاب کی موجودگی نہایت ضروری ہے امید ہے کہ یہ ہاتھوں ہاتھ فروخت
ہوگی اور اس طرح سید صاحب موصوف کو اونکی محنت کی عملی داد ملیگی۔ **ملنے کا پتہ**

ہمدم بک ایجنسی امین آباد روڈ لکھنؤ

تمدن — اکتوبر ۱۹۱۸ء

رجسٹرو نمبر ایل ۱۱۳۲

جلد ۱۲ نمبر ۳

تمدن

معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی، اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر۔ محمد عباس حسین قاری (علیگ) خلف اکبر جناب قاری محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

مطبع محبوب المطابع گلی اڈن دہلی میں چھپا

پبلشر محمد عباس حسین قاری — مقام اشاعت سنیما محل دہلی — پرنٹر محبوب بیگ

ایک نظر

تمدن کے دو نمبر - ستمبر نمبر ۵ ستمبر کو تیار ہو گیا تھا اور ڈاک خانہ سے ۸ ستمبر کو درخواست کی گئی تھی کہ وہ ۱۰ ستمبر کو ستمبر نمبر کی اشاعت کی اجازت دیدے۔ مگر اس تاریخ کو پوسٹ کرنیکی اجازت ۱۷ ستمبر کو وصول ہوئی اس حالت میں ۲۰ کو پرچہ کیونکر پوسٹ ہو سکتا تھا اس لئے خیال کیا گیا کہ پھر حسب دستور ستمبر نمبر کو یکم ہی کو شائع کیا جائے اور اسکے ساتھ اکتوبر نمبر کو بھی شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ اکتوبر نمبر لکھا کر پریس روانہ کیا گیا ہے پریس کی دقتوں کا حال ناظرین کو معلوم نہیں یہ دقتیں ویسے تو پریس ایکٹ کی بے نیام تیغ کی بدولت ہر جگہ ہیں دہلی میں اس خون آشام تلوار کا ڈر بہت غالب ہے اس وجہ سے دہلی میں پریس کے حسب دلخواہ انتظامات نہ ہو سکے۔ پریس کی کمانی ٹوٹی۔ پریس میں بیمار ہوا۔ غرضکہ پریس نے اکتوبر کا پرچہ یکم اکتوبر تک چھاپ دینے کر انکار کر دیا۔ مجبوراً رسالہ کا شائع اور کم کرنا پڑا اور اکتوبر نمبر کے صفحات کم رہ گئے۔ اسوقت یہ اخیری کاپی پریس میں جا رہی ہے۔ امید کامل ہے کہ پرچہ یکم اکتوبر کو شائع ہو جائیگا بشرطیکہ ڈاک خانہ کی طرف سے رکاوٹ نہ ہو۔ اکتوبر نمبر میں جو صفحات کی کمی ہوئی ہے اس کی تلافی آیندہ نمبروں میں ہو جائیگی اکتوبر اور ستمبر نمبروں کے ایک ساتھ شائع ہو نیسے پرچہ وقت پر آجائیگا اور ناظرین کی یہ شکایت دور ہو جائے گی کہ تمدن اپنی یہ نمایاں خصوصیت قائم نہیں رکھ سکا کہ وقت پر شائع ہو۔ موجودہ ایام میں جنگ کی وجہ سے طباعت کی ہر چیز گراں ہے اور بعض چیزیں تو دستیاب ہی نہیں ہو سکتیں۔ سب سے اہم مسئلہ کاغذ کا ہے جو کاغذ ہم نے پہلے تمدن میں لگایا ہے وہ تو ہندوستان میں کسی داموں بھی نہیں ملتا۔ ستمبر نمبر میں جو کاغذ لگا ہے وہ بھی دہلی میں کسی قیمت پر دستیاب نہ ہو سکا۔ [illegible] کاغذ لگانا پڑا۔ کاغذ کی مشکلات طباعت کی اشیا کی گرانی کیوجہ سے اسوقت ہندوستان کے [illegible] رسایل بادامی کاغذ پر شائع ہونے لگے مگر ہم نے اسوقت تک سفید کاغذ کو ہی قائم رکھا اور ہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمدّن

تعلیم نسواں
ہماری حالت

ہر تنزل پذیر قوم کی جو حالت ہوتی ہے وہ ہماری قوم کی بھی ہے چنانچہ ہماری قوم کا دیگر فضولیات کے علاوہ ہزاروں روپیہ فضول اور بیہودہ رسموں میں تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور ہزاروں امیر اسی باعث محتاج و مفلس ہو جاتے ہیں، لیکن باوجود تجربات کے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا اور انہیں بے خبر کر کے ذلت و تباہی کے گڑھے میں گر پڑتا ہے۔

اگرچہ ہمارے بھائی تعلیم کی طرف مائل ہیں، اور بہت کچھ سندیں حاصل کرنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، لیکن، میں خیال کرتی ہوں کہ وہ بجائے علم کی تحصیل کے، تحصیل جہالت کرتے ہیں، اور نادانی کا سرٹیفکٹ حاصل کرتے ہیں۔ علم تو حیوان ناطق کو انسان بنا دیتا ہے لیکن یہاں علم پڑھ کر انسان حیوان ناطق بن جاتے ہیں اور یہ چودھویں صدی کا معجزہ ہے حقیقت میں ہماری قوم علم کو علم سمجھ کر حاصل نہیں کرتی۔ بلکہ علم کو وسیلہ شکم پری سمجھتی

ہے۔ اسی وجہ سے ہم علم سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے جو اٹھانا چاہیے۔ ہمارے نوجوان علم محض تقلید یورپ کی غرض سے حاصل کرتے ہیں اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ علم ہماری قوم کے لئے مجموعہ فیشن و تباہی ہے۔ علم سے ہم یہ ترقی کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک سے لاکھوں روپیہ یورپ چلا جاتا ہے اور وہی اشیاء ہمارے ملک سے ایک روپیہ میں خریدی جاتی ہیں وہی ہم کو (۲) روپیہ میں دی جاتی ہیں۔ ایسے علم سے ہم کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جس کی تکمیل کے بعد ہمارے نوجوان دیسی صنعت کے دشمن ہو جائیں اور یورپ کی ہر چیز پر جان دیں آج ہم ایک پیسہ کی سوئی کیلئے بھی یورپ کی محتاج ہیں اور انکے خوان کرم کے آگے اپنا جام سفال دراز کرتے ہیں یہ ہماری قسمت ہے، اور یہ ہماری تعلیم کا اثر ہے، کیا ہماری قوم اسی تعلیم سے ترقی کر سکتی ہے، نہیں ! ہرگز نہیں !! اس کے لئے مذہبی، اور خالص مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے آج کوئی ایسا نوجوان نہیں جو اسلام سے واقف ہو اور اپنے مذہب کو جانتا ہو، آپ فرمائیں گے۔ ہم بی۔ اے ہیں، ہم نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنیکی جان توڑ کوشش کی ہے، ہم ساری دنیا کے حالات سے واقف ہیں، ہم قوموں کی ترقی و تنزل کے واقعات سے آگاہ ہیں، ہم نے کالج میں تعلیم پائی اور عمر گزار دی ہے۔ لیکن میں خیال کرتی ہوں، اور جواب دیتی ہوں، بی۔ اے۔ یا ایم اے ہو جانا اور بات ہے اور انسان حقیقی بننا اور بات، آپ ایک مینڈک کے مانند ہیں جس نے کنوئیں میں پرورش پائی ہو اور اسی کو عالم سمجھتا ہو، یہ فرمائیے آپ نے انسانیت بھی حاصل کی یا نہیں، یا بعض انگریزی پڑھکر جوکر اور نیوٹن بن بیٹھے۔ اس وقت قوم کو سب سے زیادہ اس تعلیم کی ضرورت ہے جو روح مذہب ہے، اور جس سے انسان ترقی حاصل کر سکتا ہے، علیگڈہ کالج آج پچاس سال کی سرگرم کوششوں کے بعد ایک مسلم بھی ایسا پیدا نہ کر سکا جس سے ملک و قوم کو حقیقی فائدہ پہنچا ہو اور وہ مفید ثابت ہوا ہو، سوٹ بوٹ پہنکر، انگریز و نکی نقالی کرنا ترقی نہیں ہے، انگریزی گفتگو کرنے کو انسانیت نہیں کہتے، بلکہ انسانیت اس تعلیم سے حاصل ہو سکتی ہے، جس سے مسلمانوں نے ترقی کی اور دس برس کے قلیل عرصہ میں جزیرہ عرب سے نکلکر عالم میں پھیل گئے۔ موجودہ تعلیم بے روح ہے، اور اسے ضرورت ہے کہ اس میں

رہے تو پھر کچھ ہو جائے اور صنعت و حرفت میں ترقی کیا ہے آج انتہائی ترقی خیال کو سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ترقی نہیں بلکہ پستی ہے، اور یہ پستی اوس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک تعلیم میں سُدھار اور عورتوں میں اعلےٰ تعلیم نہ ہو، عورتوں کی جہالت یہی قوم کی بربادی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، عورتیں جہالت کی وجہ سے رسم و رواج کو قرآن و حدیث سمجھتی اور قرض دام کر کے ان رسوم کو ادا کرتی ہیں، جو حقیقت میں بدعت اور خلاف اسلام ہوتے ہیں شادی و غم کے مواقع پر فضول دولت برباد کرنے میں ان سے بڑھکر اور کوئی فدا نہیں ہوتا، ذرا ذرا سی بات پر سیکڑوں روپیہ خرچ کر دیتی ہیں کہ ٹھکانا نہیں رکھتی اس لئے میں کہہ سکتی ہوں سخاوت و عالی ظرفی کے یہی معنی سمجھتی ہیں کہ دولت خواہ مخواہ برباد کیجائے۔ مگر وہ تو خدا کا شکر ہے کہ دولت ہی نہیں اور اگر دولت ہو تو خدا جانے عورتیں اپنی جہالت کی وجہ سے کیا کیا باتیں ایجاد کریں اور کیسی کیسی نئے رسمیں گھڑیں۔

ہم عورتوں کے لئے قدم قدم پر سرکار عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال کی مثال موجود ہے ابھی سرکار عالیہ کے حکم سے سلک مروارید نامی قابل قدر کتاب صاحبزادی عابدہ سلطان کی سالگرہ پر شاہ میمونہ سلطان بیگم صاحبہ بانو عالی محترم جناب میجر حمید اللہ خاں صاحب نے نہایت قابلیت سے لکھکر شائع کی

آجکل مدعیان اصلاح کی کثرت ہے، لیکن سچ پوچھیے تو کوئی مصلح نہیں، جن نام نہاد مصلح کو اصلاح کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے، وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا، اور اس کی تمام کوششیں نام و نمود کی شکل میں ملتی ہیں، اس کی تمام تقریریں عمل کے وقت نا سخ تنزل ہوتی اس کے اخلاق پند ہائے ذلت نظر آتے ہیں۔

ہماری مفلس و محتاج قوم یورپ کے نقش قدم پر چلکر ترقی نہیں کر سکتی بلکہ اس کی سچی ترقی اسلام کے اتباع سے ممکن ہے، لیکن ہمارے نام نہاد لیڈر اس سے ناواقف ہیں اور بلا تفریق نیک و بد یورپ کی تقلید میں ترقی نظر آتی ہے، اور ہماری تنزل کی یہی سبب ہے غیر اقوام کی تقلید کو ہم اچھا خیال کرتے ہیں اپنے ملک کی روایات اپنے مذہب کی تعلیمات حتیٰ کہ اپنی مادری زبان تک سے تعلق رکھنا ہمیں ناگوار گذرتا ہے لیکن ایک

[illegible] فرد دوسرے ملک میں اگر بھی اپنی قومیت اور قومی روایات پر قائم رہتا ہے افسوس کہ
ہم ان کے اس طریقہ عمل سے سبق نہیں لیتے ہیں بلکہ گرفتار تقلید ہو جاتے ہیں

ہماری درماندہ قوم جب تک رسول اللہ کی حیات مقدسہ کو نصب العین نہ بنائے گی
اور سلف صالحین کے نقش قدم پر نہ چلے گی اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی، ہمکو
تہذیب یورپ کی اخلاق و اطوار اختیار کرنے کی ضرورت نہیں وہ ہمکو تباہ کر دے گا
اس کی تہذیب اور نت نئی چالیں ہمکو برباد کر دیں گی، بلکہ ہماری ترقی کے لئے اسلام
اور خالص تعلیمات الہیہ کی حاجت ہے جس سے ہم بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔ جب
مردوں کے لئے یورپ کی تقلید اس قدر مضر ہے تو ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یورپ
کی تقلید خواتین کیلئے کس قدر تباہ کن ہو گئی ہے

اسلامی معاشرت آرام دہ ہے لیکن بخلاف اس کے یورپین طرز زندگی تکلیف دہ
حد اقتصاد سے کوسوں دور، یورپ کی تہذیب میں ایثار گناہ عظیم ہے حالانکہ شریعت
اسلامیہ میں ایثار، ایک جزو ہے، اور بدقسمتی سے ہم لوگ اسکو ترک کرتے اور یورپ
کا اتباع کرتے ہیں۔

لیکن میں اسکو ناواقفیت اور نادان کہونگی یہ مسلمان کی پالیسی ہے کہ وہ ترقی
کرنی والی تعلیم نہیں دیتے، اور وہ سبق پڑھاتے ہیں جو بدنصیبی کے گڑھوں میں گراتے
ہیں اور اس کی یہی وجہ ہے کہ عورتیں جاہل ہوتی ہیں وہ کسی بات کو سمجھ نہیں سکتیں
بچوں کی تربیت سے ناواقف ہوتی، اور جس طرح مرد چاہتے ہیں انکو لکھاتے پڑھاتے
اور بری تربیت دلاتے ہیں عورتیں اپنے فرائض سے نابلد ہوتی ہیں اور اسکو اپنی مصیبت
سمجھ کر آرام سے بیٹھ جاتی ہیں جس کا اثر تمام قوم پر پڑتا اور کوئی ثبوت اس قابل نہیں پیدا
ہو جاتا قوم کیلئے اسوہ حسنہ ہے۔ اس لئے میں نہایت زور سے کہونگی کہ عورتوں کو
[illegible] لڑکیوں کو تعلیم و تعلم کی جانب مائل کیا جائے اور مدرسے قائم کئے
جائیں جن میں تہذیب بھی ہو اور تعلیم و تربیت بھی جو عصمت کا بھی سبق دیں اور
عفت کا بھی جن کی معلمات برباد کنندہ مدرسے نہوں بلکہ نہایت پاکدامن و پاکباز

باعصمت و باعفت ہوں اور ہر ممکن طریقہ سے نسوانی مدارس کے متعلق بدگمانی دور کی جائے کہ زنانہ مدارس میں لڑکیوں کی حالت بجائے بہتر ہونے کے واقعتاً از حد خراب ہو جاتی ہے اور یہی بدگمانی ہی زنانہ مدرسے کے متعلق ہے۔ آجکل زنانہ اسلامی مدارس میں جو معلمات ہیں وہ زیادہ تر غیر اقوام کی ہیں اور انکو کیا غرض کہ اعلےٰ پیمانہ پر تعلیم دیں، اور لڑکیوں کو عصمت و عفت کا بدرجہ اتم خیال رکھیں۔ یورپین استانیاں جب اس کی سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی ہیں تو بے غیرتی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور جو نیچ قوم کی عورتیں جو اپنا مذہب تبدیل کر کے مشنری میں داخل ہوتی ہیں وہ تو بری طرح کھیل کھیلتی ہیں

اگر ہماری قوم کو دنیا میں رہنا اور کچھ ہو کر اور بن کے رہنا ہے طوق ذلت کو اتارنا اور زندہ اقوام کے دائرہ میں شریک ہونا ہے تو اپنے بزرگوں کی سوانح عمریوں کو دیکھے، ان کے اخلاق و عادات انکی طرز معاشرت اور قومی و ملکی زندگی پر گہری نظر ڈالے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ ابتدا سے بچوں کو اس جانب متوجہ کیا جائے جس سے ان کو کتب سیر و سوانح سے لگاؤ رہے اصل تو یہ ہے کہ لڑکیوں کے موجودہ نصاب تعلیم میں بہت زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہے۔

رقیہ سلطان

نوٹس یہ "تمدن" کے مندرجہ ذیل نمبر مطلوب ہیں جو صاحبان علیحدہ فرمانا چاہتے ہوں قیمتاً یا بلا قیمت ارسال فرما دیں مشکور ہوں گے

مارچ ۱۹۱۵ء دسمبر ۱۹۱۵ء مارچ ۱۹۱۶ء مئی ۱۹۱۶ء جون ۱۹۱۶ء

جنوری ۱۹۱۷ء فروری ۱۹۱۷ء

تصحیح جولائی ۱۹۱۶ء کے تمدن میں "مجادل" کے عنوان سے حضرت آیس کی جو غزل شائع ہوئی ہے اس میں سہواً کاتب کی غفلت کی وجہ سے چند غلطیاں رہ گئی ہیں ناظرین تمدن ذیل کی تصحیح فرمالیں (۱) پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بدولت یہ سب خزینے یاں نہیں بلکہ گوہر دریاں صحیح ہے۔ (۲) چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں

حسن کا عالمگیر تسلط

عالم ہو کا سکون مطلق، ظلمت عدم کا آغوشِ خلوت، اور ردائے سویدا کا کنج عزلت، جبکہ راز ہائے سربستہ سے بالکل خالی تھا، اور جبکہ اس تیرہ خاکداں عالم کا وجود محض ایک ظلمت کدہ تھا، تو اوسوقت ایک حرکت، مگر غیر محسوس۔ ایک جنبش مگر نامعلوم، یکایک لرزش میں آئی جس نے اپنی تشہیر و انکشاف کیلئے اس طلسم خاموشی کے قفل کہنہ کو توڑکر ایک چمک ایک نور، ایک شعاع، عالم ظلمت کے ہر ذرہ پر ڈالکر اسکو منور کردیا جو دوسری شکل میں نمایاں ہوتے ہی ایک حسن تھا اور جس کے یہ تمام جزیات تھے۔ پھر کیا تھا جب اس ساز خموشی پر، مضراب حسن کی ایک اور صرف ایک ہی چوٹ لگے ہر تار ساکت میں نغمہ ہائے حسن کی ترانہ سنجیاں پیدا ہونے لگیں اور اوس کے مختلف الالوانی کا ظہور ہر رنگ میں مختلف نظر آنے لگا۔ لیکن اس کی کشمکش کا معیار ایک ہی رہا، جو ہر قوت کو اپنے اندر جذب کرسکتا ہے کبھی اس نے اپنی ضیا سے تنگ و تاریک غاروں کو روشن کیا (غار حرا) کبھی یہ کوہستانی چوٹیپر (جبل طور) برق جمال جہاں سوز بنکر چشم ستارہ کے خیرہ کرنے کے لئے نمودار ہوا۔ کبھی بزم عالم مین شمع بنکر پروانہ قلب تپیدہ کے جذبات و حسیات کو خاکستر کیا۔ کبھی چمنستان دہر کے برگہائے گل میں رنگ آمیزیاں کرکے عندلیب خوشنوائی آہو یہ لطیفہ کی روح کیلئے مسرت ہوا، کبھی شمس و قمر کا نور ستاروں کی نیم باز آنکھوں کی درخشندگی اور ذرات عالم کی چمک کا باعث ہوا

اہ! اے حسن کون ہے جو کہتا ہے کہ معشوق کی زلف سیاہ میں تیری چمک نہیں"؟ اوس کے خال مشکیں میں تیری ضیا نہیں؟ اور اوس کی آنکھ کی سیاہ

پانچویں میرا جلوہ نہیں ہے وہی، مگر اوس تمدن تطہر کیلئے جو کبھی تیری شعاع کے موہائے آتشیں سے متصادم و منفعل ہو رہا ہے۔

وہ تو وہی ہے، جو کسی پیکر عالی کے سبز فضا میں، نمایاں ہوکر، اپنی طراوت آب سے رنگ گل کی تغذیہ و تنمیہ کرکے اوس کی نشو و نما کا باعث ہوا۔ وہ تو وہی ہے، جو کسی کے اختیار تاباں کو، جو تیرا ہی سبب ہے اپنی روائے رنگیں کی نقاب پوشی سے تجلیات انفعال کے انتشار و توزیع کیلئے کافی ہوا اور پھر خود بھی اپنی تشویق دیدے اونکی چشم پرنم و دل زخم خوردہ کی تکمیہ کرتا ہے۔

آہ! جب تو کسی پیکر تصویر میں، مجسم حسن بنکر نمایاں ہوتا ہے، اور جب اپنی سحر آفرینوں سے حیران تعجب کے اجتماع اور انضمام کو مسحور کر لیتا ہے، تو اونکی غشاوۂ بصر، و غطائے قلب کے درمیان، تیرا اور صرف تیرا ہی جلوہ ہوتا ہے، تیرے وصل سے وہ تصور اچھا ہے جو اوس کے خیال میں کیا گیا ہو۔ تیرے انتظار کی خوشی نہیں بلکہ اوس کی یاد کی خوشی ہے، جو اوس کے لئے کی گئی ہو۔ آہ! وہ یاد، جو ہمیشہ پافشردان جنون و دشت نوردان وحشت وردوں کے ساتھی، ایک برق ساطع و لامع کسی وجود کی طرح، اونکی رگوں میں، خون، جسم میں روح، مضغہ لحم و استخواں میں تاب و تواں، نگاہ میں نور، دل میں سرور، طبیعت میں جودت، دماغ میں فراست و فطرت بنکر، اونکی نظام حیات سے وابستہ ہو رہی ہو، وہ یاد، جو سرجوشان، بادہ جنوں، اور مستان کیف بیخودی عشق کمزوں کے تخیل عالم آشوب کے کرۂ فلک پر، ابر محیط کی طرح سایہ فگن ہوتی ہے، اور جس میں سے ایک برق تیز رو نکلکر انکے صبر و سکون کو کہلیات کرتی ہوئی، معمورۂ استقلال ڈھاتی ہوئی، اور چمن زار امید کو خاکستر کرتی ہوئی نمایاں ہوتی ہے اور پھر اوس کے تصادم سے ایک ایسی صدائے غیر فانی نکلتی ہے، جس سے زمین و زماں لرز جاتے ہیں، سپہر نیلی کے سائبان جلکر خاکستر ہو جاتے ہیں۔

آہ! اس آواز رعد کو عشاق جہاں، "نالہ" اور اوسکے دیر تک گونجنے کو

...ہیں۔ اے جلوہ حسن! تو ہتاپائی داماں نگاہ شوق ہے، تو ضیا افزائے چشم عشاق ہے۔ تو جس آنکھ میں نظر آتا ہے، تو پیمانہائے بادہ گلگوں باہم ٹکرا جاتے ہیں، تو جب گوشہ خورشید سے شعاع بنکر نکلتا ہے، تو سنگہائے دشت وجبل اوس کے عکس سے یاقوت والماس بنجاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرا عالمگیر تسلط کائنات کے ہر ذی روح وغیر ذی روح کے وجود پر محیط ہے

اچھی صورت کی پرستش رہی ہر ملت میں
حسن سب کیلئے اک رشتۂ ایماں نکلا

حافظ امام الدین اکبرآبادی

غزل

صیاد حیف تجھکو ذرا بھی ترس نہ آئے
منہ پھیر کر چلے تو سوئے قفس نہ آئے

روکا رقیب نے تھا کیوں چلے تو پہنچو
کل شب کا وعدہ کر کے تم اپنے بس آئے

رنج باغباں کا ہمسے پہلے ہی سے پھر رہے
اللہ موسم گل اب کی برس نہ آئے

یہ آتش جدائی کیوں دل میں شعلہ زن ہے
روئے رقیب کچھ تو جا کر مجلس نہ آئے

بیمار درد ہجر اچھے ہوں یا الٰہی
جا کر تپ جدائی لاکھوں برس نہ آئے

آنے کا وعدہ کر کے وہ شوخ بھول جائے
رک جائے دم بھی لب پر آ کے نفس آئے

رہ جائیں دشت میں ہم یوں کارواں سے چھٹکر
بھولے سے بھی ادھر کو بانگ جرس نہ آئے

صیاد ہی کے سر پہ جا کر گرے الٰہی
بجلی چمک چمک کر سوئے قفس نہ آئے

بیتاب ہو زمانہ ان بیقراریوں پر
جو دن ہوں ہجر تجھکو ظالم پھر ترس نہ آئے

سارے زمانے کا وہ جان فلک ہے جتنا
اکدن اگر گیا جائے پھر سو برس نہ آئے

کہدو رقیب سے تب گر خیر چاہتا ہو
آگے غزل کے ہرگز وہ [illegible] نہ آئے

عذر گناہ

"تمدن" کے قدیم کرمفرما جناب سلطان حیدر صاحب جوش کی تحریریں اکثر تمدن کے صفحات کو زینت دیتی رہی ہیں اس لئے انکی قوت قلم کا تذکرہ یہاں فضول ہے جناب جوش نے مذکورہ بالا عنوان سے ایک نئے طرز کا مضمون لکھا ہے۔ آپ نے ایک کارڈ بھی مضمون کے ہمراہ روانہ کیا تھا جس کی بجنسہ نقل مضمون میں موجود ہے جناب جوش مضمون نگاری کو "گناہ" قرار دیتے ہوئے عذر گناہ پر آمادہ ہیں خواہ جوش صاحب پہلے سے بھی اسے گناہ قرار دیتے ہوں یا نہ دیتے ہوں۔ اور عذر کے ارادہ میں ہوں مگر اس وقت تو "عذر گناہ" کا محرک جناب ابوالاحرار کا کارڈ ہے جناب جوش صاحب مضمون نگاری کے گناہ کے ارتکاب میں ہمیں بھی شریک کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہم اونکے شریک ہیں ہماری شرکت سے اس "گناہ" کے عذاب میں ان پر کچھ تخفیف ہو جانی چاہیے اور یقینی ہوئی ہوگی مضمون نگاری کے سلسلہ میں آپ نے دو تصانیف بھی شائع کیں افسوس ہے **ابن مسلم** جیسے اپنے رنگ کے بے نظیر ناول کی ملک نے قدر نہ کی اور اس کی اشاعت سے جناب جوش کو مالی نقصان ہوا آپ نقصان مایہ کے ساتھ شماتت ہمسایہ کے بھی شاکی۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ میں ہندوستان کا ہر رسالہ والا جناب جوش کی ہی سی حالت رکھتا ہے کیا جناب جوش اسے پسند کریں گے کہ وہ بھی "عذر گناہ" کر کے گنا ہگاروں کی فہرست میں سے اپنا نام کٹوالے۔ غالباً اس کا جواب نفی میں ہوگا پھر "عذر گناہ" کے بعد جوش صاحب ترک گناہ پر کیوں مصر ہیں ہم تو جناب سید ابوالاحرار صاحب سے خوش ہیں کہ اونکے کارڈ نے جناب جوش سے عذر گناہ لکھوایا خدا کرے جناب جوش کے پاس روزانہ ایسے اور اس سے زیادہ قابل اعتراض کارڈ آیا کریں اور وہ روز "عذر گناہ" لکھا کریں اور اسی طرح ارتکاب گناہ کا تواتر جاری رہے کیونکہ اس گناہ میں ابھی لذت ہے۔

ایڈیٹر

"عذر گناہ" عام طور پر "بدتر از گناہ" سمجھا جاتا ہے۔ مگر اکثر اوقات گناہگار کو اس کے سوائے چارہ نہیں وہ مجبور ہوتا ہے کہ گناہ کے بعد "عذر گناہ" کا بھی مرتکب ہو!

"شوق مضمون نگاری" کا عارضہ مجھے کالج کی آب و ہوا سے سب سے پہلے پیدا ہوا۔ احباب نے اس کا معالجہ اظہار خیالات اور اشاعت افکار بتایا۔ طبع حیلہ جو کو بہانہ مل گیا۔ علاج کیا گیا کہ مرض کو لاعلاج بنا لیا! سب سے پہلے پیارے علیگڈھ کی سرزمین پر اور عزیز کالج کی حدود میں "مضمون نگاری" کا گناہ مجھ سے سرزد ہوا۔ اس وقت میں اس کو ثواب سمجھتا تھا اور معمولی سی داد میری طبع دادپسند بڑا وقیع معاوضہ تصور کرتی تھی!

میں بہک گیا اور احباب کا محدود دائرہ مجھے ہمت افزائی کرتا تھا اس کوشش فضول پر آمادہ کیے رہا!

اس گناہ کا دوسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب مخزن کے علاوہ تمدن، الناظر، عصر جدید اور کئی دیگر رسائل نے تقاضائے مضمون شروع کیا اور غالباً ہر پرچہ میں میری ہرزہ سرائی متعدد صفحات کو کالا کرتی رہی! ایک عرصہ کے بعد "شہید" مرحوم کا وجود دہلی میں دلکش صورت اختیار کرنے لگا اور ان کے احباب نواز ایڈیٹر کی عنایات نے میرے مرض کو اور زیادہ چمکا دیا! "اولڈ بائے" انجمنی اور اس کے کرمفرما ایڈیٹر کا غصہ آمیز تقاضہ بھی کچھ کم حد تک باعث ایذاء مرض ثابت نہ ہوا!

میں بڑی مسرت کے ساتھ "گناہ مضمون نگاری" کے ارتکاب میں سرگرم تھا اور متعدد نفوس اس ارتکاب کے باعث تھے!

میرے متعدد مضامین علیحدہ "افسانہ" کی صورت میں بلا میری اجازت کے مختلف ایڈیٹر اور مالک مطبع صاحبان کی عنایت سے شائع ہوئے۔ مگر میری طبیعت نے کبھی محسوس نہ کیا کہ یہ مرض کیسی مہلک اور مستقل صورت اختیار کرتا جاتا تھا! کاش میں اس وقت سمجھتا اور باز آتا!!

اس کے بعد "ابن مسلم" اور "ثواب فریدہ" دو مستقل تصانیف کے شائع کرانے کا جرم مجھ سے

بذات خود سرزد ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس پیدا ہوا کہ میں ایک سخت مرض میں مبتلا ہوں! اب زالہ مرض کا خیال کبھی کبھی پیدا ہوتا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی! میں چاہتا تھا کہ لکھنے کی عادتِ قبیح سے دست کش رہوں مگر دماغ کو ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ ایک عرصہ تک نہ لکھنے سے ایسا ہی کسل محسوس ہوتا تھا جیسا حقہ کے عادی شخص کو حقہ نہ پینے سے یا۔ شاید۔ مرزا مرحوم کو آتشِ سیال نہ ملنے سے!

اب میں افسوس کرتا ہوں۔ پچھتاتا ہوں اور کسی طرح گئے ہوئے وقت کو واپس نہیں لے سکتا! اڈیٹر "تمدن" اور اڈیٹر الناظر جو دونوں میرے عنایت فرما ہیں۔ اب بھی مجھے اُکساتے ہیں کہ میں اُسی "گناہ" کا ارتکاب جاری رکھوں جس کا مجھے تاسف ہے!

میں کیوں "اس گناہِ دیرینہ" سے دست کش ہونا چاہتا ہوں؟ ایسا سوال ہے جس کا جواب نہایت طول طویل ہوگا اور پھر بھی ممکن ہے ناپسند ہو!

میں اگر یہ کہوں کہ مصروفیتِ فرائض مجھے وقت نہیں دیتی۔ تو کہا جاتا ہے کہ یہ ایک پرانا حیلہ ہے کسی نہ کسی طرح وقت نکالو! اگر یہ عذر کروں کہ دماغ آجکل کام نہیں دیتا خیالات بھی آتے ہیں تو بھرتی کے۔ جواب ملتا ہے کہ یہ بھی عذر لنگ ہے دماغ پر زور ڈالو! اگر ناقدرشناسی زمانہ کی وجہ سے ہمت ٹوٹ جانے کا عذر کروں تو ارشاد ہوتا ہے کہ ایسی شکایات بھی مصنفین کا شعار دیرینہ ہیں، سعدی شیرازی سے لیکر مرزا غالب مرحوم تک ہر فرد اس قسم کا شاکی رہا، یہ شکایات بھی کچھ نئی اور قابل لحاظ نہیں!

اب فرمائیے کیا کروں اور کس طرح اس "گناہ" کے ارتکاب سے بچوں؟ "گناہ" کا مرتکب میں ضرور بذاتِ خود ہی مگر کیا یہ تقاضائے شدید ایک حد تک اس کا محرک نہیں؟ کیا اس کو میں "عذر گناہ" کی صورت میں پیش نہیں کر سکتا؟ ایک بڑی لمبی داستان لکھنی پڑے اگر میں یہ بتاؤں کہ اس دماغی محنت کی داد

کیا ملتی ہے؟

"ابن مسلم" کی اشاعت کی ناقابل معافی خطا میں جو مالی نقصان ہوا اس کا احساس سوائے میرے شاید اور کسی کو نہ ہوا ہوگا۔ اور مجھے اس کی تفصیلی داستان کا دکھڑا رونے کی حاجت نہیں۔ مگر اس کے علاوہ اور جس طرح اس کی قدر کیگئی وہ بھی میں نہ بھولونگا۔ "نقصان مایہ" کے ساتھ "شماتت ہمسایہ" بھی ضرور ہونا چاہیے اس لئے اسکا اظہار بھی فضول!

حال ہی میں ایک کارڈ میرے نام آیا ہے جس کی نقل لفظ بلفظ درج ذیل ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۷۸۶

جناب جوشش صاحب زاد لطفہ تسلیم

مہربانی فرماکر بہت جلد ذیل کی باتوں کا خلاصہ صاف صاف نمبروار جواب ارسال فرماکر سرفراز کریں۔

(۱) آپ کی تصانیف سے کس کس فن میں کونسی کونسی کتابیں ہیں اور وہ سب کتابیں کہاں سے کس قیمت پر مل سکتی ہیں۔

(۲) آپ کو شاعری میں کن سے تلمذ حاصل ہے۔ آپ کا کوئی دیوان چھپا ہے یا نہیں اگر چھپا ہے تو کہاں سے کس قیمت پر مل سکتا ہے۔

(۳) ناول "ابن مسلم" کے مصنف کون ہیں۔ یہ ناول کہاں سے کس قیمت پر مل سکتا ہے۔

(۴) آپ کا اصلی وطن کس جگہ ہے۔ بردوئی کے کس محلہ میں آپ تشریف رکھتے ہیں

(۵) مرقع عالم پریس کس محلہ میں ہے اس کے مالک کا کیا نام ہے۔

(۶) مولوی حکیم محمد علی خان صاحب میونسپل طبیب بردوئی کس محلہ میں رہتے ہیں

والسلام

سید ابوالاحرار کلرک ہیڈ پوسٹ آفس شہر میدنی پور صوبہ بنگالہ
بی این ریلوے یوم پنجشنبہ ۲۸ اگست ۱۹۳۰ء

اب اس کارڈ کو دیکھکر اور یہ سمجھکر کہ یہ کارڈ اپنی قسم کا پہلا خط نہیں ہے آپ کیونکر سمجھتے ہیں؟ کیا آپ امید رکھتے ہیں کہ میں اب پھر اسی "گناہ" کا ارتکاب کرونگا جس کا نتیجہ اس قسم کے خطوط ہیں!

حاشا وکلا میں اب ایسا جرم نہیں کرونگا۔ مضمون لکھنے کا وقت اور دماغ اگر مل بھی جائے تو ان جرح کے سوالات کا جواب دینے کے لئے ایک پورے دفتر کی ضرورت ہے!

سوال نمبر (۱) کے لئے ضرورت ہے کہ میں اپنی تاریخ مضمون نگاری لکھوں جس کے آخر میں فہرست مضامین مع حجم و حوالہ درج ہو۔ سوال نمبر ۲ یہاں اگر میں یہ کہوں کہ عاجز کو کسی سے تلمذ کی عزت نصیب نہیں ہوئی تو میرے عنایت فرما سے یقینا لغو اور خودستائی سمجھیں گے۔ سوال نمبر ۳ اس سوال کے جواب میں میں خود لا جواب ہوں۔ سوال نمبر ۴ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے میرا حلیہ، قد، اور سینہ کی ناپ اور خاندانی شجرہ نہیں پوچھا ورنہ اور زیادہ دقت ہوتی۔ سوال نمبر ۵ ایک نشد دو شد گویا ہردوئی میں تعینات ہو نیسے میرا یہ فرض بھی ہوا کہ ہردوئی گائیڈ کا کام دوں سوال نمبر ۶ معلوم ہوتا ہے کہ میرے عنایت فرمانے ہردوئی میرا وطن فرض کرلیا ہے اور اس سے یہ بھی رائے قائم کرلی ہے کہ میری ناول نگاری کو حکیم محمد علیخاں صاحب طبیب کی ذات سے کوئی تعلق ہے "معاملہ فہمی عالم بنگالہ معلوم شد"!

اپنے عنایت فرما کا نام پڑھکر اور زیادہ متحیر ہوں۔ جماعت احرار سے میں واقف ہوں۔ کچھ عرصہ سے "حریت" و "احرار" کے الفاظ بھی بڑی فضول خرچی کیساتھ استعمال کئے جارہے ہیں۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو "امام الاحرار" کا لقب بھی اخباروں میں ایک مرتبہ شائع ہوچکا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ "سید ابو الاحرار" صاحب آج تک پردہ گمنامی میں روپوش رہے! موجودہ زمانہ میں انکی بہت سخت ضرورت تھی جماعت احرار کا آج تک ان کو کس مپرسی کے عالم میں رہنے دینا ایک گناہ عظیم ہے!

کیا میں امید کروں کہ سید ابو الاحرار صاحب کو کوئی ایسا موقع ملیگا وہ سمجھینگے جیسے لوگ

نام کے لحاظ سے ہونی چاہیے ؟
خیر اب یہ بتایئے کہ مضمون لکھ کر ان جرح کے سوالات کا جواب دوں یا نہ دوں؟
اگر جواب دوں تو ایک باقاعدہ محرر کی ضرورت ہے۔ اگر خاموشی اختیار کروں تو خلاقی
گناہ کا مرتکب ہوں! گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی یہ دوسری مثال ہے! پھر اس کارڈ
کی شروع کی دو سطریں کارنگ خاص طور پر قابل لحاظ ہے جہاں صاف صاف شرح وار
اور بہت جلد" جوابات مانگے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی یونیورسٹی
کے امتحان میں سوالات کا جواب لکھنے بٹھایا جاتا ہوں!
میں اس سے زیادہ اور کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ "مضمون نگاری" فی الحقیقت
ایک گناہ تھا جو مجھ سے سرزد ہوا۔ عمل کے لیے مکافات عمل اس کا نتیجہ ہے!
"چار باید زیستن ناچار باید زیستن"! مگر میں کیا پھر اسی گناہ کا مرتکب ہوں ؟
میں کچھ نہیں کہتا۔ آپ ہی فرمائیے! "مضمون نگاری" یا ذوقِ تصنیف" ناقابل معافی
گناہ۔ مجھ سے ضرور سرزد ہوا مگر ایمان کی یہ ہے کہ ایک کافی حد تک احباب حوصلہ افزا
اور اڈیٹر صاحبان عنایت فرما کا تقاضہ بھی اس ارتکاب گناہ کا ذمہ وار ہے۔ اسی کو
"عذر گناہ" کہتے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ اسے بھی بدتر از گناہ" سمجھ لیں"
گنا ہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں"!

سلطان حیدر

ناکام حیات

دنیا میں ہر ایک کو عروج - عزت رفعت کی خواہش ہوتی ہے - مجھے بھی تھی -
مگر - آہ - میں ناکام حیات ——————
مجھے رفعت کی امید نہ کرنی چاہئے تھی - مجھے عزت کی توقع نہ کرنی چاہئے تھی
مجھے عروج کے خوابوں سے اپنے دل امیدوار کے داغوں کو ہرا نہ کرنا چاہئے تھا -
اف - میں نے جو کچھ کیا - وہ میری کامیابی حیات کی کوشش تھی - مگر جو
کچھ ہوا اسے کیا بتاؤں کیا تھا - کیا تھا - صرف مایوسی ناکامی - ذلت - پستی -
رفعت کی کوشش مجھے قعر مذلت کی طرف لے جاتی تھی - سعیدہ سے میں نے محبت
کی اس سلسلہ میں کہ امید بار آور ہوگا - میری روح کو تازگی پہنچے گی میری حیات میں
بالیدگی پیدا ہوگی مگر کیا ہوا - نہ پوچھو کیا ہوا ناکامی اور صرف ناکامی سعیدہ نے
نہ صرف یہ کہ میری محبت کا جواب نہیں دیا بلکہ اس نے میرے واعبائے جگر پر نمک پاشی
کی اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا - آج وہ ہے اور رقیب کا پہلو میں ہوں اور پژمردگی
حیات کا قبرستان -
جمیل کو میں نے چاہا اس لئے کہ شاید میرے پہلے زخم پر کچھ مرہم لگے مگر اف کیا ہوا
کہتے ہوئے آنسو نکلے پڑتے ہیں —————— ذلت —— اور ناکامی
میں نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے جو کچھ کیا اس سب کا میں کیا بتاؤں کہ کیا
ثمرہ ملا - ناکامی - اور فقط ناکامی - ناکامیوں سے میں تنگ آگیا میں ناکامیوں کا
پہلا ہدف بن گیا —————— یہاں تک کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ میں مجسم ناکامی
ہوں —————— میں ناکامی ہوں ——————
میں سلسلہ ازدواج میں اپنے آپ کو منسلک کیا میں نے اس امید پہ کہ میرے پچھلے

زخموں کا اندمال ہو گا۔ میں سب کچھ سہہ سکوں گا مگر میں ـــــ بد قسمت
میں۔ ایسا کہاں تھا ـــــ قدرت کو برا نہیں کہتا۔ خدا سے جنگ نہیں کرتا۔
یہی کہتا ہوں کہ ـــــ میں۔ ایسا کہاں تھا۔ ہائے ملک کے مرشد جاہلانہ
اور طرز عمل احمقانہ کی بدولت۔ نہیں میں یہ کیوں کہوں صرف مجھ ناکام ازلی کی بدولت
مجھے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی میرا مونس ہو گا۔ کوئی
ـــــ کون؟ ـــــ بیوی میری مونس ہو گی ـــــ مگر ہائے
میرے زخموں کا مرہم اس غارت آباد ــــ دنیا میں موجود نہیں مجھے اس سے
بھی مایوسی ہوئی اور ایسی مایوسی کہ میں اب اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتا اور
خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب میں۔ اپنے پہلے زخموں کے ساتھ اس
آخری اور سب سے آخری زخم کا خیال کرتا ہوں۔ تو میری روح تک زندگی سے
بیزار ہو جاتی ہے میں مرنا چاہتا ہوں اور کس طرح کہہ سکوں

مارا دیار غیر میں مجھکو وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

دنیا والو آؤ اور دیکھو ایک ناکام حیات کا نظارہ کرو۔ اس کے دل کرب دماغ
کے ہیجان کو دیکھو اور عبرت حاصل کرو تم نے مجھے پہلے بھی دیکھا تھا آج دیکھو میں
کیا تھا اور کیا ہوں ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ کوئی میرے پاس نہ آؤ
کوئی مجھ سے بات نہ کرو بلکہ میرے سایہ تک سے بھاگو۔ میں ناکام محبت
ناکام رفعت۔ اور ناکام حیات ہوں۔ ناکامی کا ایک ایک داغ مجھے حیات سے
ڈراتا ہے دھمکاتا ہے۔ اب تو میں کسی کامیاب سے کامیاب انسان کی پرچھائیں
تک سے ڈرتا ہوں کہ یہ بھی میرے لئے ناکامی کا کوئی داغ ہے۔ اے کامیاب
انسان جا اور یہاں سے اتنی دور، اتنی دور جا کہ میں تیری آواز تک نہ سن سکوں میری آنکھیں
تیری پرچھائیں نہ دیکھ سکیں میرے۔ میرے حواس تیرے وجود کو نہ محسوس کر سکیں
دیکھو میں ڈرتا ہوں دیکھو میں کانپا جاتا ہوں گا۔

بھائیوں اور والدین سے مجھے کیا دیا ناکامی — دوستوں نے مجھے جو کچھ دیا ناکامی - بیوی نے مجھے کیا دیا ناکامی - خدا کیا ہے مجھ ناکام جسم کو چھوڑ دو مرنے دو - دیکھو میں مرتا ہوں - کوئی میرا نام نہ لینا - کوئی میرا ذکر نہ کرتا - کوئی میرا خیال نہ کرنا ورنہ زمین جب تک میں فنا کیا جاؤں گا ٹھہر جائیگی اور دنیا ایک سلسلۂ ناکامی بن جائے گی

اچھا جاؤ - جاؤ - فوراً جاؤ مجھے ایک ناکام وجود سے دنیا کو خالی کرنے دو - دیکھو وہ خالی ہوتی خالی ہوگئی -

اطہر

نامراد

نجم النسا اور حامد

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

رات کے نو بج چکے ہیں - حامد اس وقت تمام کار ضروری سے فراغت پاکر کمرہ میں اکیلا بیٹھا ہے - میز پر خط رکھے ہیں ایک ایک کو اٹھاتا ہے - پڑھتا ہے پھر چاک کر ڈالتا ہے ان ہی خطوں میں کی ایک رجسٹری بھی ملی ہے - جسکو کھولتا ہے تو اس میں یہ لکھا ہوا پاتا ہے

غالباً آپ مجھے بھول گئے ہوں گے میں آپ کی قدیم فرمانبردار نجم النسا ہوں - جس روز سے آپ نے آگرہ کو خیرباد کہا معلوم نہ ہوا کہ آپ کہاں اور کس حالت میں ہیں خدا خدا کرکے ایک عرصہ کے بعد پتا لگا کہ آپ جبل پور میں انسپکٹر پولس ہیں میری یہ تمنا شاید بیجا نہ ہوگی کہ جناب کبھی کبھی اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں -

آپ کی
نجم النسا

نجم النسا سوچ رہی تھی کہ بھولی ہوئی باتیں یاد آگئیں احمد کی سنجیدہ گفتگو مختصر تقریر کا نقشہ
آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ اسے خیال آیا کہ بیشک نجم النسا ایک وفادار عورت مروت دار
خاتون ہے ۔ اوس کے احسانات میرے اوپر بہت ہیں ۔ اس نے اب بھی باوجود خانگی
کشمکشوں کے ایک عرصہ کے بعد یاد کیا ہے یہ بھی اوسکا احسان ہے ۔ اوسی وقت نجم النسا
کو ایک خط لکھا

محسنہ !

بے شک میں تم کو بھولے ہوئے تھا اور یہ میری غلطی تھی معاف کرو ۔ اگرچہ میں عدیم الفرصت
رہتا ہوں مگر انشاء اللہ اب ضرور ہفتہ وار تم کو اپنی خیریت سے مطلع کرتا رہوں گا مطمئن رہو

طالب عافیت

حامد

نجم النسا اسی فکر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ معلوم نہیں حامد جواب دیں یا نہ دیں ۔
خط بھی ملا یا نہیں ۔ اتنے میں خادمہ نے حامد کا خط لے جا کر دیدیا ۔ جس کو دیکھ کر چہرہ پہ خوشی
اور ہونٹوں پہ تبسم کے آثار نمایاں ہوگئے ۔ خط کو دو تین مرتبہ پڑھا ۔ اور میز کی دراز میں
حفاظت رکھدیا لیکن ایک ایک لفظ دل پر نقش ہوگیا اور اس طرح نقش ہوا کہ نجم النسا
ہر وقت حامد کے خیال میں مستغرق رہتی ۔ اکیلے میں جا جا کر بیٹھتی اور دل سے باتیں کرتی کہ بے شک
حامد مجھکو بھول گئے ہوں گے ۔ یہاں سے گئے ہوئے زمانہ ہوگیا ، ورنہ حامد ایسے نہ تھے
کہ مجھکو خط بھی نہ لکھتے میں انکی عادت سے خوب واقف ہوں وہ بے مروت نہیں لیکن
کسی قدر کاہل ضرور ہیں خدا کرے میرا اور انکا عمر بھر کا ساتھ ہو وہ میرے سرتاج
رہیں اور مجھے اون کی خدمت کرنے کی عزت حاصل ہو ۔ وہ تعلیم یافتہ اور ہونہار
نوجوان ہیں ۔ اون میں دلیری اور جرأت بھی ہے ۔ اور خدا رکھے سب تجربہ ابھی ہوگا
خصلتوں کے بھی اچھے ہیں ۔ میرے ساتھ پڑھا بھی ہے ۔ میں اونکی طرح سے بخوبی
واقف ہوں ۔ اور وہ بھی میری طبیعت کو خوب جانتے ہیں اگر کہیں ایسا ہو جاتا
تو دونوں کی زندگی بہت خوشی سے بسر ہو ۔ لیکن میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے

[illegible] اور درد کی جدائی میں [illegible]
[illegible] نہیں۔ مگر نہیں
پہلے سے طے ہو چکا ہے جب میں زہر کھا لوں اور اس طرح [illegible] مرنا جائز نہیں اس لئے
ایسا تو نہ کرونگی۔ پھر آخر کیا کروں، نہیں کچھ نہیں، کچھ بھی ہو اپنی ضد تو پوری کر
دکھاؤنگی۔ یہ باتیں دل سے کر رہی تھی کہ ماما آئی اور کہا اماں جان یاد کرتی ہیں چلیئے۔ دونوں
ہاتھوں سے کلیجہ تھامے ہوئے کہ ہم کرسی سے اٹھی اور بادل ناخواستہ ماں کے پاس گئی
سلام لینے کے بعد۔ ماں نے کہا کہ آج تم نے نہ کارچوب کا کچھ کام کیا اور نہ کتاب کا سبق
پڑھا تمام دن کمرہ میں ہی گذار دیا اور اب بھی جب میں نے بلایا تب آئی ہو خیر تو ہے
چہرہ بھی تمتا رہا ہے۔ دشمنوں کے نصیب سے طبیعت کیسی ہے۔ لڑکی! آج تو
چپ چپ کیوں ہے کچھ کہو نہ؟

نجم النسا خاموش ماں کی باتیں سنتی رہی اور آفتابہ ہاتھ میں لیکر وضو کیا عصر
کی نماز پڑھی اور کتاب لیکر پڑھنے لگی اب روز یہی دستور رہنے لگا کہ کھانا کھایا اور
آرام کرسی پر ایک خیالی تصویر لیکر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ ماں حیران
پریشان کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے تمام تمام دن اکیلی کمرہ میں رہا کرتی ہے آدمیوں کی صورت
سے گھبراتی ہے۔ نہ چکن کاڑھتی ہے نہ زردوزی بناتی ہے اور نہ کچھ پڑھتی ہے خدا
خیر کرے۔ ماں اسی خیال میں تھی کہ خادمہ نے چپکے سے آکر کہا کہ آج تیسرا روز ہے کہ بیوی
کے پاس ایک خط آیا جب سے اوسکو پڑھا ہے کبھی خوش ہوتی ہیں کبھی غمیدہ صورت
بنا لیتی ہیں اور اپنے دل ہی دل میں باتیں کرتی ہیں نہ معلوم وہ خط کس کا تھا
اور کیا لکھا تھا۔ ماں کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور وہ خط حامد کا ہوگا۔ یہ خیال کر کے چپکی ہو رہی
رات کو جب نجم النسا کے باپ گھر میں آئے سارا قصہ اونکو سنایا۔ باپ نے کہا خدا کے
فضل سے لڑکی جوان ہے اب اوسکی شادی میں جلدی کرنی چاہی۔ رہا حامد کے ساتھ
شادی کرنا تو یہ میری زندگی میں ناممکن ہے میں فقیر سے شادی کردونگا مگر [illegible] تو ماں
ہے

و سی وقت حامد نے نوکر کو بلا کر کہا دیکھو کوئی خط نجم النسا کا بغیر ہم کو دکھائے اسکو نہ دیا کرو۔

یہ کہکر نجم النسا کے والد باہر چلے گئے اور سب اپنے اپنے کام مشغول ہو گئے اور ادھر حامد کے خط نہ آنے سے نجم النسا بیقرار ہو رہی تھی اور تمام تمام دن خط کے انتظار میں گذرتا تھا جب کئی روز گزر گئے اور خط نہ آیا تو پھر لکھا۔

مجھکو تعجب ہے کہ باوجود ایک ہفتہ گزرنیکے آپ نے خط نہ بھیجا۔ ایسی بھی کیا عدیم الفرصتی کہ وعدہ کو بھی پورا نہیں کرتے اگر یہی حال رہا ہو تو تمام امیدیں خاک میں مل جائیں اور یہ جان زار رفتہ آپ کی محبت کا شکار ہو جائیگی۔

بے چین
نجم النسا

نجم النسا کا خط جس وقت حامد کو ملا اوسوقت اسکے مکان پر دوستوں کا ہجوم تھا اس میں کوئی خبر یا دی تھا کوئی ملاقاتی پولیس خیریت کی رپورٹ کرتی ہوئی تھی۔ ڈاکیے نے خط لا کر دیا۔ حامد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ نجم النسا کا خط ہے فوراً بڑھکر خط لیا اور شیروانی کی جیب میں حفاظت رکھ لیا۔ پولیس کو واپسی لین کا حکم دیا ملنے والوں سے ملنے کے بعد اپنے کمرہ میں جا کر خط کھولا اس خط کا اس کے دل میں خاص اثر ہوا اور خیال کیا کہ بے شک نجم النسا کو مجھے محبت ہے جو پہلے تھی اگر میری طرف سے توجہ ہوئی تو عجب نہیں کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائے۔ یہ سوچکر اوسی وقت ایک خط لکھا اور رجسٹری کرکے نجم النسا کے پاس بھیجدیا۔

نجم النسا کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے خطوں کی نگرانی ہو گئی ہے تو اپنی خاص ماما سے کہا کہ کیا اباجان نے تم کو یہ حکم دیا ہے کہ کوئی خط میرا ونکے بغیر دکھائے مجھ تک نہ پہونچے تو تم ہو کہ عادت کہ آج سے نہیں ہمیشہ سے جانتی ہو کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔ تم تو جب کبھی میرا خط آ سے مجھکو لا کر دیدیا کرو۔ یہ کہکر ایک روپیہ لوس کے ہاتھ پر رکھدیا۔

عدن — اکتوبر ۱۹۱۰

دوسرے روز حامد کا خط پہونچا تھا دوسرے نجم النسا کے حوالے کردیا جس میں لکھا تھا:
مجھ سے خطا ہوئی کہ حسب وعدہ خط نہ بھیج سکا میرا ارادہ ہے کہ ایک ہفتہ کی رخصت
لیکر آگرہ آؤں اور کسی طرح آپ سے ملوں ۔ مدت گذر گئی ۔ اب ملنے کو جی چاہتا ہے
تاریخ روانگی سے بعد میں اطلاع دونگا۔ لیکن حیران ہوں کہ آپ تک کیونکر پہونچوں
خیر دیکھا جائیگا ۔

مشتاق دیدار

حامد

جس وقت یہ خط پہونچا نجم النسا پھولی نہ سمائی دل ہی دل میں خوش ہوتی جاتی
اور جو جو گلے شکوے کرنا تھے اونکو یاد کرتی جاتی تھی غرض ہزاروں طرح کے خیالی پلاؤ
پکاتی مگر جب یہ خیال آتا کہ ملاقات کیونکر ہو سکتی ہے ماشاء اللہ بھرا گھر ماما لونڈیوں
کا مجمع تو مایوس ہو جاتی تھوڑی دیر بعد پھر خوش ہو جاتی کہ خدا مسبب الاسباب
ہے ۔ وہی ارادوں کو پورا کرنے والا ہے جب اللہ نے اتنے دن کے بعد کھوئی ہوئی
دولت کا پتہ لگا دیا تو اوس کا ملانے والا بھی وہی معبود ہے اوس کے نزدیک
کونسی بڑی بات ہے۔

آہ! بدقسمت نجم النسا کو کیا معلوم تھا کہ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے
گا اور اس آرزو کی حسرت دل ہی میں بنا لینے پڑیگی۔ اوس کی امیدوں پر پانی
پھر جائے گا۔ جس اپنے چراغ زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں گل کریگی اوسکو وہ اپنی
پچھلی باتیں بھی یاد رہیں گی یا نہیں آہ! جس وقت محبت کے دریا میں سیلاب
آتا ہے تو سنبھلنے کی فرصت نہیں دیتا"

میں ۲۵ مارچ کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۶ مارچ کو ۴ بجے دن کے آگرہ
پہونچونگا اور اسٹیشن کے قریب اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھیروں گا اور آپ
تک پہونچنے کی کوشش کرونگا۔ ظاہر میں تو ملنے کی کوئی صورت نہیں۔
جذبہ محبت کو راہ نما بنا لیا ہے اور دل کو رفیق سفر!

نجم النساء کے والد اسی وقت اس کے عقد کی فکر میں تھے جب سے سنا تھا کہ اس کے پاس حامد کے خط آتے تھا تے ہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ اور افتاد پڑے اور تمام خاندان میں میری رسوائی ہو اس لئے ایک تعلیم یافتہ شخص سے جو ۷۰ روپیہ کا ملازم تھا نسبت قرار دیدی اور جلد سے جلد فراغت کا تہیہ کرلیا۔ بعد رسومات منگنی، بر دکھائی وغیرہ کے عقد اور رخصت کی تاریخ ۲۷ مارچ مقرر ہوئی سامان ضروری، جہیز وغیرہ عجلت کیساتھ تیار ہونے لگا۔

ادھر نجم النساء کو جو معلوم ہوا کہ میرے عقد کی تاریخ بھی معین ہوگئی تو سکتے میں رہگئی کہ الٰہی یہ کیا قیامت ہے نہ مجھ سے پوچھا جاتا ہے نہ میری مرضی معلوم کی جاتی ہے۔ اگر خود والدین کا دریافت کرنا معیوب تھا تو ہمجولیاں تو نہیں گئی تھیں۔

دل نہ مانا اوسی وقت اپنی ایک سہیلی کو بلا کر کہا کہ تم اماجان جاکر اپنی طرف سے کہو کہ نجم النساء کی شادی حامد سے کیوں نہ کی جائے وہ ہمارے عزیز ہیں۔ صاحب علم نوکر چاکر۔ رہے خاندانی تنازعات تو وہ اونکی ماں اور پھوپی کے دم کے ساتھ گئے اب تو وہ تن تنہا ہیں اور غالباً یہاں شادی کرنے پر بھی رضامند ہیں اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترکہ کی تقسیم میں ایسے ہی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں یہ کوئی ایسا بڑا جرم نہیں ہے کہ معاف ہی نہ ہو سکے اور حامد کی ذات سے اونکو کیا تعلق "

یہ تمام باتیں سہیلی نے جاکر نجم النساء کی والدہ سے کہیں، ماں نے اس کا تذکرہ اپنے شوہر سے کیا وہ چپ ہو رہے۔ مگر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بناتے رہے اور اپنی ضد پر برابر اڑے رہے۔ نجم النساء نے جب خاطر خواہ جواب نہ پایا تو خاموش بیٹھ رہی اور سوچنے لگی کہ میرے ماں باپ نے خاندانی نزاعات اور ذاتی بگاڑ کو میری دائمی خوشی اور راحت پر مقدم رکھا۔ خیر — دن گذرتے گئے اور نجم النساء کی شادی کا زمانہ سر پر آپہونچا اور خوشی خوشی بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں دور دور سے مہمان بلائے گئے۔ ادھر حامد حیل پور سے روانہ ہو کر ۲۶ مارچ کو

اگلے روز صبح ہی حامد وہاں سے پھر کلثوم النسا کے مکان کی طرف چلا اور خیال کیا کہ اس نے کوئی صورت نہیں کہ چچا نذیر احمد صاحب (کلثوم النسا کے والد) سے ملاقات ایک بار پھر ہو سکے دل میں جو اوسکو رنج کیا جائے اور پھر اوسکی والدہ کا عرف حاصل کرنے کے لیے پیغام بھیجا جائے یہ خیال کرتا ہوا مکان پر پہونچا اور اطلاع کرائی کلثوم النسا کے والد نے اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ "آپ امیر ہیں میں ایک غریب ۔ میں آپ کی ملاقات کے لائق نہیں ۔ اپنا وقت آپ ضائع نہ کریں اور مجھے معاف فرمائیں"

حامد بسنکر نہایت رنجیدہ اور غمدیدہ ہو کر اٹھا اور کمرہ سے باہر ہی ہوا تھا کہ ماما نے چپ چاپ ایک پرچہ لاکر دیا کہ چھوٹی بٹیا نے آپ کو دیا ہے ۔ حامد نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا سیدھا اپنے مقام پر آیا اور پرچہ کھول کر پڑھا لکھا تھا:-

"میں کم بخت بدنصیب ناشاد و نامراد اس دنیا ٔ فانی سے سفر کا ارادہ رکھتی ہوں ۔ اگر اس خدائے ذوالجلال کو منظور ہوا تو حشر کے روز تم سے ملاقات ہوگی وہاں ان بے رحم ماں باپ کا دامن اور میرا ہاتھ ہوگا اور خدا کے سامنے فریاد کرتی ہونگی کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ ذاتی رنجشوں کو پیش نظر رکھکر میری رضامندی و خوشی کو کچھ نہ سمجھا اگر کبھی ہماری یاد آجائے تو حشر میں ملنے کی دعا کرنا میں آپ سے اتنی شرمندہ ہوں کہ میری روح ہمیشہ بے چین رہے گی کہ آپ میرے لیے یہاں تک آئے اور میں نہ مل سکی ۔ مگر نہیں! خدا کو دائمی ملاقات منظور تھی اب وہیں ملیں گے ۔ آخری عرض ہے کہ برائے خدا میرا قصور اور کہا سنا معاف کرنا اور دعائے مغفرت سے یاد رکھنا۔"

جس وقت یہ پرچہ حامد نے پڑھا اوس کا دل بھر آیا اور ایک آہ کھینچکر بے ہوش گیا۔ اس وقت حسرت و یاس اوس کی مونس تھیں اور نامرادی اوس کی ہمدرد کون تھا جو اس وقت اس کو سمجھاتا اور کون تھا جو اوس کے اس لاعلاج مرض کا علاج کرتا میزبان نے جو آکر یہ حال دیکھا ہوش اڑ گئے حامد پر پنکھا جھلا موںہہ میں پانی ڈالا ہوش تو آگیا مگر وہی۔

جنوں کا جوش گھٹنا تھا کہ بڑھے گل آئی
سمند ہوش رکا تھا کہ تازیانہ ہوا

جب طبیعت کچھ سنبھل گئی میزبان اجازت لیکر اندر گئے۔

ادھر حامد نے نجم النسا کو خط لکھا کہ

"پیارے تمہارے خط کو آج دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور"
دل میں ہجر کے غم کی آگ جسم پر تپ چڑھی کچھ اور"

"آہ میرا بھی آخری سلام قبول ہو تم بدنصیب و نامراد تھیں مگر میرے اوپر یہ فقرے صادق ہیں۔ اللہ تمہاری اور میری مشکل کو آسان کرے۔ میں تمہاری اس تحریر سے زندہ درگور ہو گیا اور غالب گمان ہے کہ میرا بھی جلد وصال ہو جائے بے شک تم پاک محبت کی دیوی اور باعصمت ہو اور اس کی گواہی میں اس مالک یوم الدین کے سامنے دونگا جس کے ہاتھ میں عدل و انصاف کی میزان ہوگی"

نامراد
حامد

نجم النسا نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی شادی کے دن صبح ۸ بجے ہیرے کی کنی کھالی کچھ دیر اچھی رہی مگر کیوقت اس نے اپنا اثر دکھایا بیہوشی طاری ہو گئی ہر چند دوڑ دھوپ کی گئی لیکن وقت گذر چکا تھا کچھ علاج و تدبیر کارگر نہ ہوئی اور عصر کی نماز کیوقت اس نے دنیا کو خیرباد کہا اور ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرکے سو رہی

آہ! وہی گھر جو کل تک خوشی اور مسرت کا مخزن تھا آج وہی ماتم خانہ بنگیا۔ یہی گھر جس میں مہمان خوش خوش تہنیت ادا کر رہے تھے اس وقت تعزیت کی رسم ادا کر رہے ہیں آہ! زمانہ کو رنگ بدلتے دیر نہیں لگتی تھوڑی ہی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا سب رو دھو چکے تو کفن دفن کا سامان کیا گیا اور اس معصوم لاش کو سپرد زیر خاک کر دیا انا للہ و انا الیہ راجعون

اس وقت مولوی نذیر احمد اور ان کی بیوی کی دردناک حالت لڑکی کے غم میں دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے مگر کیا ہو سکتا تھا

دوپہر جاسے بجز اسنا کی ناگہانی موت کا حال سنا تو دونوں ہاتھوں سے دل کو تھامنے کی کوشش کی مگر ضبط نہ ہو سکا اور ایک آہ بھر کر بیہوش ہو گیا تھوڑی دیر بعد ہوش آیا اور پھر کسی کی یاد نے ہمیشہ کے لئے دیوانہ کر دیا اور اسی حالت میں ایک عرصہ کے بعد ناشاد و نامراد داعی اجل کو لبیک کہا، اور تھوڑی مدت میں صرف ایک والدین کی دو "بہنیں" کی خاطر دونامراد سپرد خاک ہوئے آہ! -

حشر جانکاہ ہو نگی جنازہ پہ مرے　　بال کھولے ہوئے تربت پہ سب ارمان ہونگے

سیر گورستان

عبد القدیر

دحشت دل ایک دن حد سے زیادہ بڑھ گئی　　منہ اٹھا کر ہو گیا میں سوئے گورستان رواں
کیا بتاؤں اوس جگہ کیا کیا نظر آیا مجھے　　کیا کہوں جو کچھ کہ چشم غور سے دیکھا وہاں
تھا سبق آموز ہر ہر ذرہ اوس کی خاک کا　　اوس کی ہر ہر اینٹ سے تھی عبرت جیرت عیاں
تھے در و دیوار اوس کے خود مجسم بیکسی　　اوس کے ہر گوشہ میں تھی بیچارگی گریہ کناں
ایک سناٹے کا سا عالم تھا اوسمیں ہر طرف　　خامشی استادہ تھی ور پہ بطور پاسباں
کشتگان غم کے ارمانوں کا نیچے فرش تھا　　اور اوپر حسرت و اندوہ کا تھا سائباں
وہی بادسی عشاق تھی جاروب کش　　اور تمنائے شہیداں ستم قرآں خواں
اک طرف گریہ کناں تھا بیکسوں کا اضطراب　　اک طرف فرقت زدوں کا درد مصروف فغاں
یہ بھی دیکھا کون ہے کس قبر میں مصروف خواب　　کیسے کیسے لوگ ہیں اس خاک کے اندر نہاں
سلطنت کے نظم کی تھی باگ جن کے ہاتھ میں　　بیکس و بے بس پڑے تھے اک طرف وہ حکمراں
جن کے حسن و حاقت بل کی جہاں میں دھوم تھی　　ایک جانب سو رہے تھے بیخبر وہ نوجواں
ایک عالم کشتہ تھا جنکی نگاہ ناز کا　　منہ چھپائے تھے پڑے وہ خوبرویان جہاں
کچھ عجب انداز کی وحشتگی تھی اوسطرف　　جس طرف خواب گراں میں تھا گرو ہ عاشقاں

اس مآل زیست کو میں دیر تک دیکھا کیا
اور پھر دل تھام کر اک خاص جانب کو بڑھا

مضمحل میری طبیعت ہو رہی تھی دمبدم — بڑہتی ہی جاتی تھی ہر ہر قدم پر میری افسردہ دلی
میں بہت حیران تہا دل کو مرے کیا ہو گیا — مجھپہ طاری ہو رہی تھی اک طرح کی بیخودی
بے ارادہ کھچتا جاتا تھا بڑا ابر اوسطرف — میں نے دیکھی ہی نہیں ابتک کشش ایسی کبھی
دیکھا طرفہ ماجرا چشم تخیل سے مری — دھیمی دھیمی اوسطرف جلتی تہی شمع عاشقی
کہل رہا تھا اوس جگہ گویا نہال عشق آج — بیطرح پودے محبت تھی وہاں پھیلی ہوئی
اک نحیف و ناتواں لیٹا تھا فرش خاک پر — تہیں کفن میں ہڈیاں ہی ہڈیاں لپٹی ہوئی
حکم خلاق جہاں سے اوس کے جسم زار کی — اب بہی تھی بالکل وہی حالت جو مرتے وقت تہی
یعنی کچھ اوسمیں نہ تبدیلی ہوئی تھی آجتک — یہ بھی قدرت کی ہی تھی ادنی سی اک کاریگری
کشتہ تھا بیچارہ اک تیر نگاہ ناز کا — رہ گئی تھی کام اک برچھی کسی جلاد کی
آتش غم نے جو پہونکا تھا کبھی اوسکا جگر — وہ حرارت ابتک اوس کے جسم میں موجود تہی
شربت وصل اوس نے چکھا ہی نہیں تھا عمر بہر — تھی عیاں ہونٹوں سے اوس مظلوم کی تشنہ لبی
حسرت و ارمان تھے مصروف ماتم اوس کے پاس — زندگی بھر کوئی حسرت اوسکی نکلی ہی نہ تھی
چاہتا تہا میں کہ اوس سے ہی کہلے کچھ اوسکا حال — تھی مگر اوس کے تو لب پہ مہر خاموشی لگی

شوق استفسار جب میرا زیادہ بڑھگیا
وہ زبان حال سے تب اسطرح گویا ہوا

دیکھ او مست شراب عشق و الفت اسطرف — میرے حال زار کو اچھی طرح سے دیکھلے
ہے یہ انجام محبت دیکھہ آنکھیں کھولکر — تاکہ اوس کے پھر تو نام الفت کا نہ لے
جب میں دنیا میں نہیں آیا تہا تب ماں باپ کو — میری پیدائش کے کیسے کیسے کچھہ ارمان تھے
اور جب پیدا ہوا میں تب ہوئی کیسی خوشی — پرورش میری ہوئی پھر کیسے چاہ و پیار سے
پھر اوسی ناز و نعم میں میں جوان بہی ہو گیا — بس یہیں رخصت ہوے دن عیش کے جو کچھہ بھی تھے
رنگ لائی میری طبع کلفت و حسرت پسند — دن میری برگشتگی کے رونما ہونے لگے
میں بھی تیری طرح اس انجام سے لاعلم تھا — دے دیا دل میں نے اک ظالم کو بے سوچے ہوے
پہلے پہلے دل لگی ہی سی نظر آئی فقط — لیکن آنکھیں جب کہلیں جب پوری پوری مل چکی

اب بھلا قابو میں آتا تھا دل وحشی کہاں
بس ذرا چھیڑا کسی نے اور فوراً رو دیے

رفتہ رفتہ صبر و استقلال بھی رخصت ہوا
الغرض سامان سب آرام دل کے ہٹ گئے

کوئی ہمدردی نہ میرا ساتھ ہمدردوں نے کی
دوست دشمن بن گئے سب دیکھتے ہی دیکھتے

بڑھ گئی اس درجہ آخر اپنی شوریدہ سری
خاک صحرا چھانتے ہم رات بھر پھرنے لگے

حسرت دل ایک بھی نکلی نہ میری عمر بھر
جتنے تھے ارمان سب دل کے ہی دل میں رہ گئے

وہ بھلا کیوں رحم کرتا جس سے تھی الفت ہمیں
آخرش نوبت یہ پہونچی خاک میں ہم مل گئے

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

شوخ یہ انجام الفت دیکھکر رونے لگے
کیونکہ ہوتا ہے یہی اک روز اونکے واسطے

سید علی متقی امروہی

حضرت دل شاہجہانپوری

ساقی کی اک نگاہ سے مخمور ہو گئے
کیا بھر کے دیدیا ہے کہ دل چور ہو گئے

محو جمال بیخود و مخمور ہو گئے
یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

مستی کا خواب دیکھ رہی تھی سفر نصیب
چونکے تو کارواں سے بہت دور ہو گئے

اے جوش گریہ تو بھی کوئی رنگ اب بدل
اپنے جگر کے زخم تو ناسور ہو گئے

انداز چشم تاب شکن تھا کہ الاماں
اک پنکھڑی کی چوٹ سے دل چور ہو گئے

راحت کی آس ٹوٹ گئی آہوں کے ساتھ
جو دل میں زخم پڑ گئے ناسور ہو گئے

کچھ ہم کو پائمالی دل کا قلق نہیں
محشر خرام آپ تو مشہور ہو گئے

نیرنگیاں حدوث قدم کی ہیں دیکھئے
مختار بن گئے کبھی مجبور ہو گئے

کیف نشاط و ولولہ انگیز اب کہاں
ساغر مرے نصیب کے سب چور ہو گئے

رہ رہ کے کہتی ہے دل بسمل کی آرزو
قاتل برائے نام وہ مشہور ہو گئے

موہائے سفید دیکھ کے جی سرد پڑ گیا
سب ولولے شباب کے کافور ہو گئے

صبح فراق شام الم تھی نصیب میں
ہم رات دن کی قید سے مجبور ہو گئے

ہوتی نہ بے ظرف کی مدد ساقیا
ساغر تری نگاہ سے سب چور ہو گئے

کیا جانے کس سرور میں ہیں مست بیخودی
دنیا یہ جانتی ہے کہ مخمور ہو گئے

بے غل بے نیاز تو شایان کبر و ناز
بت اپنے کس گھمنڈ پہ مغرور ہو گئے

ساغر کیا کہ ٹوٹ گئے میکشوں کے دل
کس نے پٹک دیا ہے کہ سب چور ہو گئے

اس انتہائے یاس میں تم کو جناب دل
کیا آ گیا خیال کہ مسرور ہو گئے

حضرت باسط بسوانی

ہو بھلا اپنی سوخت جانی کا
آگیا لطف زندگانی کا

اتنا کہتا ہوں تجھ سے پیر فلک
صبر تجھ پر میری جوانی کا

دیجئے للہ بوسہ عارض
صدقہ اپنی بھری جوانی کا

ہو گئے غش جو حضرت موسیٰ
کھل گیا بھید لن ترانی کا

ذکر چھیڑو نہ ہمنشین للہ
میری حسرت بھری کہانی کا

آسمان گردشی ترے دیکھے
اف رے عالم تیری جوانی کا

میزباں ہو جو ساقی مہوش
لطف باسط ہو میہمانی کا

حضرت قیصر لکھنوی

چادر تربت پہ میری سب وہ گل بوٹے
جو بچے تھے پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

کھینچ کر صیاد بلبل کو چمن سے لے گیا
آشیاں میں رہ گئے دو چار پر ٹوٹے ہوئے

توڑ کر اک بار میخانہ میں پھر شیشے نہ توڑ
بادہ خوار دیکھتے ہیں دل سے عہد ٹوٹے ہوئے

جس طرح چاہو ہنسو رو دیکھیں گے یہ بھی
دیدہ ہائے چشم تر آئینہ میں کچھ لٹے ہوئے

کیا اعتقاد ہوا ز عدم و فضل پہ
راغب کو اُن سے توقع طلبگار جگر

منشی عبدالکریم صاحب نشتر چھپردی ہوا منٹ سکرٹری "انجمن حمایت اردو" کلکتہ

ہے مرغ دل مرا یوں مضطرب چمن کیلئے — کہ جیسے قید میں تڑپے کوئی وطن کے لئے
نہ اس لئے ہے کہ ہر دم ہوں دلکش باتیں — یہ مانا ہم کو ملی ہے زبان سخن کے لئے
وہ لیگئے دل سوزاں مرا یہ کہتے ہوئے — ہمیں تو چاہیے اک شمع انجمن کے لئے

بھرے ہیں سینہ نشتر میں داغہائے کہن
کہ پھول لیتے یہی سوزوں کچھ اس چمن کیلئے

ابو محمد صاحب حقیقی آنریری مجسٹریٹ و ناظم انجمن العلاج گیا

نہ دیکھے نبض بیمار محبت چارہ گر پہلے — کہیں سے مانگ تو لائے دوا تو میں اثر پہلے
مآل عاشقی پر پڑ گئی کیا میری نظر پہلے — عجب لذت دکھاتا تھا یہی درد جگر پہلے
تیرے وعدوں کی تھی یہ وضع کب اے حیلہ گر مجھ — ہمارے ساتھ یوں ہوتی نہ تھی شام و سحر پہلے
شب فرقت میں کیا ہوتا ہے کچھ کہتا نہیں یا رب — ہماری جان جاتی ہے کہ ہوتی ہے سحر پہلے
شہید وعدہ نہ وہ آئے نہ چین آیا نہ موت آئی — نہ تھیں یا رب دعائیں میری اتنی بے اثر پہلے
قفس کا در بھی کھل جائے تو اڑ سکنا نہیں ممکن — برا ہو ضعف کا نہیں تاب میں اب بال و پر پہلے
سفر ملک عدم کا ہے اگر درپیش انساں کو — تو لازم ہے ہوئے اندیشۂ زاد سفر پہلے
زیادہ وصل سے ہے فکر بربادی رقیبوں کی — مقدم ہے حصول نفع سے دفع ضرر پہلے
تو یہ وصل لیکر لاکھوں بار آئی ہی ولیں — نہ کرتی تھی نگاہ ناز کار نیشتر پہلے
ہمیں امید میں بیٹھی تھیں یہیں ارمان جلتے تھے — یہ دل اپنا الٰہی حسرتوں ہی کا نہ گھر پہلے
یہ طرز ناوک انداز کی نئی ہے ورنہ او ظالم — یہی تیر نظر تھا ہم زخم جگر پہلے
اسیران قفس کو چھوڑتا بھی گر ہے مدت میں — وہ صیاد ستم پیشہ کتر لیتا ہے پر پہلے
حسن شامت بھی کیا اپنی کہ دل تجھے دیتے ہم — ہمیں درد جدائی کی اگر ہوتی خبر پہلے

[illegible] بشیر الدین احمد صاحب ایم اے [illegible]

واقعات مملکت بیجاپور - تین جلد صفحات ۱۲۰۰ ہاف ٹون تصاویر بھی [illegible]
مفصل کتاب ہے جس میں سلاطین عادل شاہیہ اور ان کے ہمعصر بادشاہوں کے مفصل حالات
اور بیجاپور کی مشہور عمارات کے فوٹو شامل ہیں یہ کتاب تین حصوں میں ہے (۱) حکمرانان عادل شاہیہ
کے حالات ضخامت ۵۰۰ صفحہ (۲) اس میں خاص شہر بیجاپور کی مشہور عمارات کے علاوہ وہاں
کے مقابر سلف و اولیاء کرام کا مفصل تذکرہ ہے ضخامت سوا سو صفحہ ۱۲۵ -
(۳) اس میں ان مشہور مقامات کے تاریخی حالات درج ہیں کسی زمانہ میں سلاطین عادل شاہیہ
کے مقبوضات شمار کئے جاتے تھے ضخامت آٹھ سو صفحہ تینوں جلدوں میں ساٹھ عکسی تصاویر
شامل ہیں غرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہاتھوں ہاتھ خریدی جائے قیمت ہر سہ جلد مجلد [illegible]

نشاط عمر ہر قوم کے نوجوان ناکتخدا لڑکوں کے لئے بیش بہا نصائح کے علاوہ اخلاقی تعلیم قابل
قدر ذخیرہ اور افعال قبیحہ اور عادات ذمیمہ کے ہولناک نتائج سے بچنے کی عمدہ تدابیر نہایت دلچسپ
پیرایہ میں بیان کی گئی ہے - ڈاکٹر سلوانس سٹال کی مشہور و معروف کتاب - وہاٹ اے ینگ مین
اف ٹو نو کا سلیس اردو ترجمہ آجکل کے نوجوانوں کے کام کی چیز ہے قیمت صرف ۱۲/

عصائے پیری یہ کتاب ڈاکٹر سلوانس سٹال کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ ہے جو عمر
رسیدہ لوگوں کے لئے ایک بیش بہا اور قابل قدر ذخیرہ ہے اور مفید معلومات کا جو دنیا کی آخری
منزل میں بھی کار آمد ہے قیمت ۸/

اقبال دولھن شرفائے دہلی کی روزمرہ کی زندگی کی دلچسپ تصویر جس میں مردوں
اور عورتوں کی تعلیم شادی بیاہ وغیرہ کی رسوم زن و شوہر کے باہمی تعلقات وغیرہ کو قصہ کے
پیرایہ میں نہایت خوبی کیساتھ بیان کیا گیا ہے - قیمت صرف ۱۲/

حسن معاشرت جس میں دو پھوہڑ اور سلیقہ مند بیویوں کے حالات زندگی بالمقابل ایک
نہایت دلچسپ نتیجہ خیز اور نصیحت آمیز پیرایہ میں قلمبند کیا گیا ہے ۱۲/

پتہ: آہنگ [illegible] مشاعرہ , دہلی

جلد ۱ جون سنہ ۱۹۱۹ء نمبر ۱

تمدن

علمی، ادبی، سیاسی، تاریخی، معاشرتی، تمدنی، فلسفی اخلاقی مضامین کا مخزن

فہرست مضامین

تمدن کی ایک جلد

اشتراکی

ایڈیٹر صاحب رسالہ اشتراکی مطلع فرماتے ہیں کہ اشتراکی بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے سپرد خاک ہو گیا یعنی وہ اب کبھی شائع نہ ہو گا۔ اسکو متعلق ان حضرات کی رقوم جو آئی ہیں جو حافظ محمد سعید صاحب مالک رسالہ اشتراکی سے طلب کی جاتی ہیں بعض حضرات غلطی سے خاکسار ایڈیٹر سے اس قسم کی رقوم طلب کرتے ہیں اس لئے ان تمام حضرات سے استدعا ہے کہ آئندہ اس قسم کا مطالبہ حافظ محمد سعید صاحب مالک رسالہ اشتراکی علیگڑھ سے کرنا چاہیے میں اسکا ایڈیٹر تھا نہ کہ مالک۔

تمدن کا دورِ جدید

ہندوستان میں دنیائے صحافت ایک بحر طلاطم خیز ہے۔ کوئی شخص اس بحر ناپیدا کنار کی تباہ کن امواج سے بالکل دامن بچاتے ہوئے اسے عبور نہیں کر سکتا۔ خوش قسمت ہے وہ کشتی جو اس سمندر میں ڈالی جائے امواج سے دست و گریباں ہو اور بغیر غرق ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ اس خوش نصیب کشتی کے بعد اس کا نمبر آتا ہے جو ایک خوشگوار منزل مقصود کے خیال میں محو منزل مقصود کیطرف بڑھی چلی جاتی ہے تختے بوسیدہ ہیں حالت خستہ ہے امواج کشتی سے ٹکراتی ہیں اور آخر کشتی غرق ہو جاتی ہے۔ منزل مقصود تک پہونچنے کی طلب صادق کی چنگاری اس کشتی کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور وہ سمندر کی تہ میں بھی اپنے کام سے غافل نہیں طلب صادق صندوق کا ل کشتی کو پھر ابھار لاتا ہے اور پھر وہ منزل مقصود کیطرف معلق ہوتی ہے۔ سمندر کا طلاطم پھر اسکا امتحان لیتا ہے اور پھر وہ غرق ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں زندگی ہے اور پائندگی کا مادہ موجود ہے وہ پھر منزل مقصود کی راہ لیتی ہے کون جانتا ہے کہ منزل مقصود تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن جب عزم کا یہ عالم ہو تو منزل اسکا حق ہے

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یہی حال "تمدن" کا ہے۔ تمدن ایک ایسے ملک میں جاری ہوتا ہے جہاں ادبار کی نشانیاں چاروں طرف نظر آتی ہیں۔ باوجودیکہ تمدن خدمت زبان اور تحفظ حقوق نسواں کا بیڑا اٹھا کر عالم شہود میں آتا ہے۔ مگر اسکی ۸ برس کی قلیل عمر جو اردو رسالوں کی عمروں کے لئے بہت طویل عمر کہی جا سکتی ہے۔ "اکثر بے مہری احباب" کے شکوہ میں گذری اور اکثر اوراق "ناقدری" کے طوفان حیات شکن اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گذشتہ چند ماہ سے تمدن بند رہا۔ اور وجہ بندش میں سب بے مہری احباب اور ناقدردانی ملک کو بہت بڑا دخل تھا۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں آج ان مقاصد جدوجہد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے جو ابتدا سے تمدن کا نصب العین رہے ہیں۔ آج بھی ہندوستان کے بے زبان طبقہ پر اس طرح ظلم ہونے میں جو ہندوستان مردوں کی عادت ثانیہ ہوگئے ہیں اور آج اردو کو حمایت اور حفاظت کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ پہلے تو اردو کے فنا کی کوشش ایک حد تک محدود تھی۔ مگر اب ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور ہوتا جائے گا۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ اردو ملک سے اس طرح ناپید ہو جائے جس طرح ہندوستان سے اسکی تہذیب اور تمدن غارت ہو گیا۔ پہلے ہندوستان کے سیاسی لیڈر اس جدوجہد سے الگ تھے مگر جن لوگوں نے گذشتہ چند سال کی رفتار ہندکو بغور دیکھا ہے وہ محسوس کرسکتے ہیں کہ اب برسر اقتدار سیاسی لیڈران ایک ایک کرکے اس جدوجہد میں شریک ہو رہے ہیں یعنی زبان کی ترویج اور ترقی کے لئے یہ یقیناً ایک فال نیک ہے مگر کانگریس پنڈال میں "ہندی ہندی" کی آوازیں اردو کے فدائیوں کے لئے اپنے اندر ایک نہایت دلخراش سبق پنہاں رکھتی ہیں۔ اردو کے فدائیوں نے اپنی جدوجہد کا بہت قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اگر اس تضیع کا سلسلہ اب بھی جاری رہا تو خدا معلوم مادر ہند کی اس بیٹی کا کیا حشر ہوگا +

ہمیں تمدن کے متعلق کافی سے زیادہ تلخ تجربے ہو چکے ہیں۔ مگر ہم پھر بھی اس منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ اور کوتاہی کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ رہتی الامکان اس کوشش میں آخری وقت تک کوتاہی نہ کرینگے۔ اب یہ ملک کا کام ہے کہ وہ ہماری حوصلہ افزائی کرے اور اگر ملک نے ہماری کوششوں کو قبولیت کا شرف نہ عطا کیا اور تمدن کی حمایت نہ

دیگر اردو ما ہواری رسائل کیطرح نذر گرداب ہوگی جسکو ہم حتی الامکان گوارا نہ کرینگے۔ تو بھی شاید تمدن ان چند خادمانِ حقوقِ نسواں اور غلامان زبان اردو میں سے ہو گا جو اپنی زندگی کی آخری ہچکی میں یہ کہہ سکیگا ؎

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

اور اگر حقیقتاً وہ یہ کہہ سکا تو ہمارے نزدیک اسکی حیات کامیاب اور مشن پورا ہے۔ کیونکہ آخر منزل تک منزلِ مقصود اسکی نظر کے سامنے ہوگی۔ اور نیت نیک ہوگی۔ خوش قسمت ہو وہی جو اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اپنے نیک ارادوں سے باز نہ آئے۔ اس قسم کی زندگی کو ممکن ہو کہ بعض لوگ بیکار کہیں مگر ہم اسے ہی فتح سے تعبیر کرینگے کیونکہ ؎

فتح شکست نصیبوں پہ ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

نصیب کا علاج کسی کے بس میں نہیں یہ ہمارا فرض ہے کہ آخر تک ہم دل ناتواں سے مقابلہ اور خوب مقابلہ کرائیں۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے ؎

مرے دل کا سفینہ ہے اس آفت خیز دریا میں
جہاں چلتی ہیں طوفانی ہوائیں ذکر ساحل سے

اگر قدر دانوں نے اس نکتہ کو محسوس کیا۔ اور بے مہری احباب کے افسوسناک شکوہ سے ہم کو نجات ملی تو خیر ورنہ ہم ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بنکے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

ہم اپنی جد و جہد کو آخر تک جاری رکھیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ احباب تمدن کی سرپرستی پہ مائل ہو سکتے ہیں۔ یا ہم تمدن سے دست بردار۔

آج تمدن ان حضرات کی خدمت میں بھی روانہ کیا جارہا ہے جو پہلے تمدن کے خریدار تھے اور اب نہیں ہیں امید ہو کہ وہ تمدن کی خود بھی سرپرستی فرمائینگے اور اسکی توسیع اشاعت میں کوشش فرمائیں گے کیونکہ انہیں کی کوشش پر تمدن کی ظاہری اور معنوی خوبیوں میں اضافہ ہوسکتا ہے +

سیاست حاضرہ

تحریک صلح - یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ اس وقت تک دنیا کے امن کے مسودے ہو رہے ہیں مگر مکمل نہیں کیونکہ معلوم ہو گیا ہے کہ تحریک صلح اپنی نہایت عامیانہ نظر سے خود غرضی کا شکار ہو۔ صلح نامہ تیار ہو گیا اور جرمنوں اور آسٹریوں کو دے بھی دیا گیا۔ ترکی بلغاریہ وغیرہ سے ابھی اس مسئلہ پر باقاعدہ گفت و شنید نہیں ہوئی۔ مگر آج بھی یقینی طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ صلح ضرور ہو جائے گی اس خیال سے حفظ ما تقدم کی ضرورت برطانیہ اور اتحادی مدبر بھی کر رہے ہیں کیونکہ جرمنوں کی حالت خواہ کسی قدر خراب بھی کیوں نہ ہو مگر وہ شرائط صلح کے متعلق ایسا رویہ اختیار کر رہے ہیں جو صلح کو خطرے میں ڈالتا ہے +

جنگ افغان - اب تک تو لڑائی ہندوستان سے بہت دور تھی مگر اب سرحد پر لڑائی ہو رہی ہے بظاہر یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ افغانستان کا نوجوان حکمران افغانستان کی فوجی قوت کو مد نظر رکھ کر کیونکر سلطنت برطانیہ سے برسر پیکار ہو سکتا ہے۔ اور اسے یہ صریح بات کیوں نظر نہیں آتی کہ اتنی بڑی سلطنت سے جنگ افغانستان کے لئے باعث تباہی ہے۔ باہر والے یہ سمجھتے ہونگے کہ جنگ ہندوستان کی سرحد پر ہو رہی ہے یہاں جنگ کی خبریں زیادہ مفصل مل سکتی ہونگی حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بہرحال جو خبریں سرکاری حیثیت سے شائع کی جاتی ہیں یا انکی نوعیت نیم سرکاری ہوتی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ افغانستان کو جنگ پر ابھارنے میں بالشویکوں کا ہاتھ ہے انہیں خبروں میں ایک مرتبہ یہ خبر بھی تھی کہ ترکی فوجیں بھی افغانستان کے محاذ پر دیکھی گئیں۔ ابتدا میں کچھ افغانی پیش قدمی کی خبریں تھیں اس کے بعد برابر سرکاری فتح کی خبریں آ رہی ہیں ہر روز فتح اور کامیابی کی خبر رفتار ہے اسکے حساب سے اس وقت تک افغانستان پر قبضہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس وقت تک اسکی کوئی خبر نہیں آئی۔ اس محاذ کی جنگی خبروں کو مد نظر رکھ کر معمولی شخص بھی یہی نتیجہ اخذ کریگا کہ افغانستان کو یہ جنگ تباہ کرنے والی ہوگی +

ہندوستان - رولٹ ایکٹ نے ہندوستان میں گذشتہ چند ماہ میں جو قیامت برپا کر رکھی تھی اسکا

نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے علاوہ جو مرے اور زخمی ہوئے بہت سے ہندوستانیوں کو سزائے موت
اور مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ گو پنجاب کے بعض حصوں میں سے مارشل لا اٹھا دیا گیا مگر بعض جگہ
باقی ہے۔ رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں پنجاب میں جو کچھ ہوا اسکو سنکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔
پارلیمنٹ میں پنجاب کا تذکرہ کرتے ہوئے مسٹر مانٹیگو نے فرمایا " ۹ انگریز اور ۴۰۰ ہندوستانی
مارے گئے "۔ لیکن پنجاب اس قدر کفارے کے بعد بھی مبتلائے مصیبت ہے۔ ابھی حال ہی میں
ایڈیٹر ٹریبیون کو دو سال کی قید کی سزا دی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ نہ تو اپنے
مقدمہ کے لیے گواہوں کو بلا سکے نہ وکلا کو۔ بلکہ اسی کے سلسلہ میں سر مائیکل اوڈوائر کا ایک
حکم جاری ہوا کہ کوئی بیرونی وکیل پنجاب نہ آئے۔ اسپر ملک میں سخت شور مچا ہوا ہے۔ مگر پہلے
مسٹر رائے کو سزا مل گئی۔ اب پنجاب کے بعض لیڈروں
کے مقدمات کی سماعت ہو رہی ہے نہ پنجاب میں زبردست لاٹ صاحب ہمیشہ رہ سکتے تھے
وہ تشریف لے گئے اور نہ یہ زمانہ ہمیشہ رہے گا مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ تاریخ میں پنجاب کا
ان ایام کا فسانہ خونی حرفوں سے تا ابد لکھا ہوا رہے گا۔ پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصص
میں بھی رولٹ بلز کے ہنگاموں کے مقدمات جاری ہیں۔ چنانچہ دہلی میں مسٹر شنکر لال سکرٹری ہوم
رول لیگ کا مقدمہ ہو رہا ہے ٭

اصلاحات۔ ۲۰۔ اگست ۱۹۱۷ء وہ یادگار دن تھا جبکہ ہندوستان کو اصلاحات دئے جانے
کا فرحت افزا پیام ہمارے کانوں نے سنا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک میں خاموش مقابلہ شروع کرنے
کے منصوبے ہو رہے تھے مگر اس فرحت افزا پیام نے امید کی ایک جھلک پیدا کر دی اور لوگوں کی آنکھیں
صرف اسطرف مبذول ہو گئیں۔ اسکے بعد سے اس اعلان کے متعلق کارروائیاں شروع ہو گئیں۔
آخرکار مسٹر مانٹیگو ہندوستان تشریف لائے اور مختلف وفود انکی خدمت میں باریاب ہوئے۔ جو
طریقہ انکی نقل و حرکت کو محدود رکھنے کا اختیار کیا گیا تھا اس نے ہندوستان میں پھر ایک قسم کی مایوسی
پیدا کر دی تھی۔ وہ ہندوستان سے تشریف لے گئے۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں اصلاحات کی رپورٹ
شائع ہوئی۔ اس نے ہندوستانی سیاسی حلقوں میں ایک نہایت غیر خوشگوار صورت حالات
پیدا کر دی۔ گو ہندوستان کا کوئی معتدبہ طبقہ ایسا نہ تھا اور نہ ہے جو رپورٹ کو قابل اصلاح نہ سمجھتا ہو

مگر بعض طبقوں نے اسے مایوس کن بتایا اور کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں یہ بالکل بیکار ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ ہندوستان کی واحد سیاسی قائم مقام مجلس کانگریس میں اسکی بدولت تفریق ہوگئی بہت سی باتیں رہی تھیں جنکے متعلق اصلاحات کے سلسلہ میں یہ تجویز ہوا کہ:- مجوزہ اسکیم کے تفصیلی امور کے طے کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی جاوے گی کہ جو کونسلوں کی ساخت ووٹرن کی تعداد اور اوصاف اور منتقل اور محفوظ محکموں کی تقسیم کا فیصلہ کرے گی اور اسکی سفارشوں کی بناء پر آئینی اصلاحات کا قانون مرتب کیا جاوے گا کہ جو پالیمنٹ میں پیش ہو کر پاس ہوگا۔ چنانچہ لارڈ ساؤتھ برو کی زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ جسکے دو حصے کئے گئے ایک کونسل کی ساخت اور ووٹرین کے اوصاف وغیرہ کا طے کرنا سپرد کیا گیا اور اس کا نام فرنچائز کمیٹی رکھا گیا اور دوسرے کے ذمہ منتقل و محفوظ محکموں کی تقسیم رکھی گئی اسکو سبجکٹس کا نام دیا گیا یہ دونوں کمیٹیاں موسم سرما میں ہندوستان کے مختلف اطراف کا دورہ کرکے اپنے فرائض انجام دیتی رہیں اور اب ان کی رپورٹ ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شائع کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ گورنمنٹ ہند کے وہ مراسلے بھی کہ جو انہوں نے کمیٹی کی سفارشوں کے متعلق لکھے ہیں شائع کئے گئے ہیں۔

ساؤتھ برو کمیٹی کی رپورٹ دو حصوں میں یعنی فرنچائز کمیٹی کی رپورٹ اور سبجکٹس کمیٹی کی رپورٹ تقسیم کی گئی ہے اول الذکر ۲۸۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور آخر الذکر ۱۲۱ صفحوں پر کمیٹی کی اصلی رپورٹ ۱۰۰ صفحوں سے زائد نہیں لیکن مختلف صوبوں کی اسکیم اور مختلف لوکل گورنمنٹوں کی تجاویز وغیرہ کے ضمیموں نے رپورٹ کی ضخامت کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے گورنمنٹ ہند کے دونوں مراسلات بھی تقریباً ۹۰ صفحے کے ہیں اور ان دونوں مراسلات کے ساتھ دو اختلافی نوٹ بھی شامل ہیں پہلے مراسلے کے متعلق سر ولیم ونسنٹ ہوم ممبر نے کانگریس لیگ اسکیم کے ہندو مسلمانوں کے سمجھوتے کے متعلق اختلافی نوٹ لکھا ہے اور بعض دوسرے امور پر بھی گورنمنٹ ہند کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور دوسرے مراسلے کے ساتھ سر شنکرن نائر ممبر تعلیم نے ایک علیحدہ مراسلہ درج کیا ہے جسمیں انہوں نے گورنمنٹ ہند کی اکثر تجاویز سے قطعی اختلاف کیا ہے اور ساؤتھ برو کمیٹی کی سفارشوں کی تائید کی ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ساؤتھ برو کمیٹی کی اکثر سفارشوں سے گورنمنٹ ہند شدید اختلاف رکھتی ہے

افسوس ہے کہ اس نمبر میں عدم گنجایش کی وجہ سے اس موضوع پر مفصل بحث نہیں کر سکتے۔

انشاء اللہ آیندہ اپنی مفصل رائے درج کرینگے۔ اس وقت اس کے متعلق خاص طور پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس مایوسی کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ہندوستان میں عام طور پر اصلاحات کے متعلق جاری وساری ہوگئی تھی یہ کہہ دینا بیجا نہیں ہے کہ کمیٹی کی سفارشات ایک بڑی حد تک امید افزا ہیں گو کمیٹی نے ان محکموں کے انتقال کے متعلق کافی تحمل برتا ہے جو ہندوستانی وزرا کو سپرد کئے جانے چاہئیں تاہم گورنمنٹ ہند کی ان خواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اصلاحات کے متعلق کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق اس نے ظاہر کی ہیں کمیٹی نے کافی فیاضی سے کام لیا ہے۔ اور جیسا کہ خطرہ تھا گورنمنٹ آف انڈیا نے کم سے کم دینے کا اظہار کرنے میں ان ہندوستانی ماہرین سیاست کے خیال کی تائید کی ہے کہ ہمارے راستہ میں اصل میں گورنمنٹ ہند مانع ہوگی ”مسر ونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے معتمد آرگن ہندوستانی نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے طرزعمل کے متعلق ذیل کے فقرات نہایت صحیح طور پر لکھے ہیں جن سے گورنمنٹ کی پوزیشن پورے طور پر واضح ہوتی ہے +

”گورنمنٹ ہند نے مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم میں جو کچھ دینا قرار پایا ہے اس سب کو لینے کی سفارش کی ہے گورنمنٹ ہند کے دونوں مراسلے بہت کچھ قابل اعتراض ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم میں جو مراعات دینا تجویز کیا گیا ہے انکی ہی کتر بیونت اس طرح کی جائے کہ ڈھانچہ ہی ڈھانچہ باقی رہ جائے“

اسی سلسلہ میں سر سنکران نائر کے اختلاف رائے کا یہ فقرہ بھی قابل لحاظ ہے :۔

”میرے ہم جلیسوں کا اسکیم ۲۰ ر اگست کے اعلان کے بالکل خلاف ہے“

کمیٹی کی سفارشات اور گورنمنٹ آف انڈیا کے طرز عمل کا ایک مبہم سا خاکہ ناظرین کے سامنے ہے وہ رپورٹ اصلاحات کمیٹی کی رپورٹ“ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے طرزعمل کو مدنظر رکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ انکی پوزیشن کیا ہے۔ غالباً یہ واقعہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کہ سر سنکران نائر ممبر تعلیم نے استعفا دیدیا ہے +

معاملات اسلامی۔ وزیر اعظم انگلستان کی درخواست پر اسلامی معاملات پر گفتگو کرنے کیلئے اتحادی مبصرین نے مسلمانان اہل انگلستان سے ملاقات کرنا منظور کر لی تھی نتیجہ ابھی معلوم نہیں ہوا۔ جناب مولانا عبدالباری صاحب نے اسلامی معاملات کے تصفیہ کے متعلق ایک تار صاحب وزیر ہند کی خدمت میں روانہ کیا ہے۔ مسٹر محمد علی شوکت علی نے ایک خط ہز ایکسلنسی وائسرائے کی خدمت میں روانہ کیا تھا جس کی اشاعت کو روکنے کے خیال سے کسی وکیل گورنمنٹ نے استعمال جیل قرار دیدیا۔ بر اعلان موصوف نے قانون تحفظ ہند کی پابندی اب نہ کرنیکی اطلاع حکومت کو دیدی ہے +

کمانڈور پیری ایک امریکن افسر تھا جس نے ۱۸۵۳ء میں پہلے تجارتی جہازوں کو جاپان کے کنارے لگایا، جاپانی من حیث القوم بڑے مغرور تھے اور وہ ہمیشہ سے اپنے چھوٹے سے جزیرہ کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھتے آئے ہیں۔ ۱۸۵۳ء سے پہلے وہ اجنبیوں کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتے تھے، اپنے جزیرہ کے بندرگاہوں پر پرانی وضع کی توپیں رکھتے تھے، جب کوئی اجنبی جہاز کنارے کے قریب آتا تو ان توپوں سے پتھر کے گولے برساتے تھے، کمانڈور پیری چار جہاز لیکر جاپان پہنچا، اور جب حسب دستور جاپانی عمال نے امریکن سوداگروں کو خشکی پر اوترنے سے روکا تو پیری نے چند گولے جہاز کی نوایجاد توپوں سے کنارے پر پھینکے، اور ملک برباد کر دینے کی دھمکی دی۔ یہ دیکھ کر جاپانی عمال کی آنکھیں کھلیں، اون کو اپنی کمزوری، بے بسی، اور اجنبیوں کی قوت کا اندازہ ہوا۔ وہ سمجھے کہ دنیا ترقی کر گئی، اور ہم اس خواب خرگوش میں رہے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں، کمانڈور پیری سے چار و ناچار معاہدہ کیا۔ اس واقعہ سے تمام قوم کو اس قدر غیرت آئی کہ سب نے متفق ہو کر اصلاح کی جانب توجہ کی۔ ہزارہا برس سے وزیر کے خاندان میں شاہی قوت چلی آتی تھی، جس وقت اکابر قوم نے یہ طے کیا کہ ملکی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام قوت ایک مرکز پر نہ لائی جائے اور بادشاہ کو قید تنہائی سے نکال کر سرگروہ نہ بنایا جائے۔ چنانچہ قومی ہمدردی کی مجالس میں آکر وزیر شوگن نے تمام دنیاوی اقتدار اور قوت کو خوشی بادشاہ کے قدموں پر صدقے کیا، اور پھر گوشہ نشین ہو گیا۔

بادشاہ بھی قید تنہائی سے رہائی پاکر ہمہ تن ملکی ترقی کی جانب مائل ہو گیا اور تعلیم کو سب سے مقدم سمجھا۔ کچھ دنوں میں تمام قوم تعلیم یافتہ ہو گئی۔ شہنشاہ نے بلا طلب رعایا کو پارلیمنٹ عطا کیا۔ یعنی اپنے حقوق رعایا کو دیدئے۔ اس اتحاد و جوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج جاپان تمام دنیا میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور متمدن یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں جاپان کی دوستی پر فخر کرتی ہیں یہ کایا پلٹ صرف پچاس سال کے قلیل عرصہ میں ہوئی، اور یہ سب کچھ اپنی سرگرمی اور محنت کی بدولت وہ گمنام

جاپانی جنہیں کمانڈر پیری نے پچاس سال ہوئے کہ خواب غفلت سے بیدار کیا تھا آج دنیا کو

اپنی شجاعت، دانشمندی، صنعت و حرفت سے متحیر کر رہے ہیں (حاشیہ مستقبل اسلام صفحہ ۱۲۹)

(۱)

ہم ایشیا والے جو ہر چیز کو قسمت، ہر معاملے تلخ و شیریں کو ید قدرت پر محمول کرتے ہیں، ہمارے واسطے یہ بیان شاید تعجب خیز ہوگا کہ حکومت "آفرینش فطرۃ" میں خیال نہیں کی جاتی، اس کے برخلاف بلکہ محض انسانی سعی و تدبر کا نتیجہ تصور کی جاتی اور سمجھی جاتی ہے۔ اون اشخاص کے پاس غلط سے جو ہر چیز کو "جبر و اختیار" کی دوربین سے دیکھتے ہیں اور ہر شے میں قضا و قدر کے مسائل کا دیکھنا جزو ایمان سمجھتے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت چونکہ محض سیاسی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اور انسانی زندگی میں اس جد و جہد کا مادہ فطرۃً مضمر ہے، اس اعتبار سے حکومت کو فطری شے کہا جا سکتا ہے، لیکن اس مشاہدہ تاریخی کا رد کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ سیاسی رجحان کا عمل بالکل انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

(۲)

انسانی جماعتیں اور انکی کوئی منتظم حالت، اس کو نظام تمدن اور ترتیب معاشرت، اور حسن بود و باش کہتے ہیں۔

کسی قطعہ ارضی کا کسی جماعت انسانی کے لیے مختص ہو جانا، اور دیگر طبقات انسانی سے کسی طبقہ کا اختلاف، پاسداری، اور عصبیت یہ تمام کیفیات سیاسیہ ہیں، آگے جب ان معاملات میں جا بیجا برتاؤ، اور احتساب بین الافراد شروع ہو جائے تو یہی ہے باعث تخلیق حکومت کا؟

حکومت میں پختگی و خامی کے اعتبار سے بڑھنے اور گھٹنے کی قوۃ اور قابلیت پنہاں رہتی ہے۔ یا یہ کہنا چاہیے کہ حکومت بھی مثل دیگر اجسام نامیہ کے ایک جسم ہے نامی، وہ پیدا ہوتا ہے ترقی کرتا ہے، اور ایک حد تک پہونچکر بعض امراض، یا بعض اسباب جمع ہو جانے پر، وہ بھی مثل دیگر اجسام کے فنا ہو جاتا ہے۔

(۳)

حکومت کو نامی فرض کر لینے سے ہمارا مدعا یہ نہیں ہے کہ وہ مثل نباتات اور حیوانات کے

اپنے واسطے تقدیر پیدا کرنے، اور مادی اشیار کے حاصل کرنے کیلئے حریص دمحتاج ہے ،
بلکہ ہمارے اغراض و مقصد پر ان خصوصیات کو ذہن نشین کر لینا کافی ہے،

(الف) ہر نامی شئے صعود و ہبوط اور ترقی و تنزل پذیر ہونے کی خصوصیت رکھتی ہے
اور وہ مجموعہ ہوتی ہے دو چیزوں کا یعنی جسم و روح ، یعنی مادی اور روحانی قوتوں کا ،

(ب) جسم نامیہ مجموعۃً ایک واحد شئے سمجھا جاتا ہے۔ اور عرف عام میں ایک ہی کہلایا جاتا ہے مگر یہ سب کو معلوم ہے کہ اسکے مختلف حصص ہوتے ہیں۔ جو فرداً فرداً شمار کئے جا سکتے ہیں اور جداگانہ حیثیات رکھتے ہیں، علیحدہ علیحدہ خاص احساس، قابلیت اور قوت ثابت کرتے ہیں، اور جب یہی سب یکجا ہوئے تو کل جسم کی مختلف ضروریات کو پورا کر دینے کے اہل ہو گئے۔

(ج) جسم نامی اپنی اندرونی قوتوں کے باعث بسیط ہوتا اور بالیدگی حاصل کرتا ہے اور بیرونی قوت کا اختیار و دسترس اسکو بڑھاتا اور ترقی پذیر کرتا ہے۔

یہ تمام خصوصیات بھی حکومت میں پائی جاتی ہیں اسواسطے ہم نے حکومت کو شئے نامیہ سے تعبیر کیا!

(۴)

چنانچہ حکومت کا جسم و روح، اور اعضائے متحرک ملکر ایک زندہ با احساس نظام متصور ہوتا ہے،

قومی روح، جو ہر فرد جماعت سے کسی قدر بلند و با اثر شئے ہے، حکومت کی روح ہوتی ہے!

نظام حکومت، اور اسکے متعدد شعائب، جن کے ذریعہ حکومت کی مرضی قانون کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے!

صوبجات، اضلاع کے حکام، محکمہ پولیس، (جو امن و امنیت کا ذمہ دار کیا گیا ہے) عدالتیں اور ان کے مجسٹریٹ جو انصاف کا قانون بنائے گئے ہیں معصعت اور دیگر عہدہ داران ملکی جو نظم و نسق میں مدد دیتے ہیں۔ فوج جو حکومت کی قوت و طاقت کا اعلان کرتی ہے۔

یہ سب کچھ ملا کر حکومت کا جسم طیار ہوتا ہے! اور یہی شکل ہے جس کے ذریعہ حکومت کی زندگی اپنا اظہار کرتی ہے،

جس طرح ہم ایک انسان کو دوسرے سے یہ لحاظ قیافہ اور شکل و شمائل اور اوسکی روحانی و جسمانی قوتوں کے مختلف تمیز کرتے ہیں، اسی طرح حکومتوں کو تمیز کیا جاتا ہے،

جس طرح افراد انسانی کی ترقی و بہبود منحصر ہے اس بات پر کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز و بلند ہونے کی کوشش کرتے رہیں اور خصائل فاضلہ کی نشو و نما رہیا ری رکھیں اسی طرح حکومتیں بھی معاصر حکومتوں سے تہذیب و تمدن اور وسعت و رفعت میں گوئے سبقت لیجانے کی ساعی رہتی ہیں!

(۵)

حکومت مجموعہ ہے سیاسی شعبوں کا، ہر ایک عہدہ اور پولٹیکل جماعت، بہ منزلہ عضو کے ہے جو کوئی نہ کوئی ضروری خدمات انجام دیتا ہے۔

حکومت کے اعضا کو کسی مشین کے پرزوں کی طرح نہ سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ استعارہ سراسر غلط ہے، اسلیئے کہ مشین خواہ کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، اسمیں خود بخود بلا خارجی امداد اور تغذیہ کے کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اگر خارجی ذرائع سے چلانے کی قوت جسکو موٹر پاور کہتے ہیں، نہ پہونچے یا بہ الفاظ دیگر کسی دخانی انجن کو کوئلہ پانی یا برقی طاقت مشین کو باہر سے نہ ملے تو پھر مشین بیکار ہے۔ مشین خارجی قوت کی محتاج ہے اور اسمیں تمیز و احساس کا مادہ نہیں ہے، کوئی اس میں خاطر خواہ روغن دیدے تو وہ اوس سے خوشنودی کا اظہار نہیں کر سکتی، اور کوئی اوسکا کوئی پرزہ توڑ ڈالے تو وہ اُس سے انتقام نہیں لے سکتی، اسکے برخلاف حکومت کے تمام اعضاء روحانی خصوصیات سے متصف ہوتے ہیں، اور پبلک زندگی حیات جمہوریہ اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اوس کے نظام اور عمل میں خوشگوار تبدیلی ہوتی رہتی ہے، وہ خود زندہ رہتی ہے۔ اور دوسرے اجزاء حکومت کو زندہ رکھتی ہے۔

ہاں جب حکومت کا کوئی شعبہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے مثل بیکار مشین کے بگڑے ہوئے پرزے کے بے جان ہوکر، غافل ہو جاتا ہے۔ تو پھر اوس شعبہ میں محض ضابطہ، اور

ظاہرداری کے تنگ دائرہ میں قانون سمٹ کر پست یا شل ہوکر رہ جاتا ہے۔ اسوقت یہی نہیں کہ صرف یہی شعبہ بیکار ہوجاتا ہے بلکہ نظام سیاست میں برہمی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات نظام حکومت کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے جہاں حکومت کے شعبوں اور عہدوں میں سے اثر اور حیات سیاسیہ پست، روح اور زندگی معقود ہوئی پھر حکومت بھی مثل ایک بےجان اور بے حس مردہ شے کے ہوکر رہ جاتی ہے!!

(۶)

حکومت کے عہدہ دار اور نہ صرف اس کے عمال ہی حکومت کی روح سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ آپ غور سے دیکھینگا تو معلوم ہوگا کہ حکومت کا ہر ایک عہدہ بجائے خود ایک خاص زندگی اور روح اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور یہی بھی مثل دیگر اجسام نامیہ کے قوت احساس کام کرتی رہتی ہے۔

ہر عہدہ خاص طور پر روحانی صفات وخصوصیات کا مظہر ہے اسلئے جو شخص بھی کسی عہدہ پر فائز ہوتا ہے لامحالہ وہ اوس سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔

آپ کسی ملک کے وزراء اور وہاں کے دیگر جلیل القدر حکام کو دیکھیے، انکی سی قابلیت کے اوسی ملک میں اور بکثرت آدمی ملیں گے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ بلحاظ صحت اطوار اور شستگی چال چلن، اور عمدگی دماغ اُن سے بہتر ہوں گے۔ لیکن جب کبھی کسی مجلس میں تقابل ہوجاتا ہے تو وہ سراپا اعتراف عجز و بےچارگی کی تصویر بن جاتے ہیں!

کوئی معمولی قابلیت کا آدمی جب کسی بڑے عہدے پر فائز ہوجاتا ہے تو اس میں اپنی علو مرتبت کا خاص احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں کا احساس اوسکو اس درجہ ترقی کرجاتا ہے کہ اسکی سابقہ حالت سے موجودہ حالت میں جو فرق و امتیاز پیدا ہوجاتا ہے وہ نہایت آسانی سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

ہم اپنے ہی ملک میں دیکھتے ہیں کہ جب کوئی کمزور اور ناتوان اور محض معمولی قابلیت کا انسان ججی وغیرہ جیسے جلیل القدر عہدہ پر پہونچ جاتا ہے۔ تو اوس عہدہ کی خصوصیات فاضلہ، اور اہم ذمہ داریاں، اوسکی دماغی حالت اور قوتِ فیصلہ۔ اور انصاف پسندی، کی پچھلی عادات کو

اونکی پہلی سطح سے غیر معمولی طور پر بلند کر دیتی ہیں۔ اوسکے اخلاق اور آداب انسانیہ میں ایک
نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کسی عہدہ کی روحانی خصوصیات اہل عہدہ دار کی حیثیت کو نہیں
بدل دے سکتیں، لیکن اسکے ساتھ ہی اسمیں بھی شک نہیں کہ اعلیٰ عہدہ پر کسی انسان کا پہنچنا
اوسکی آیندہ زندگی پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ اوس کے چال چلن اور اخلاق کیفیات، بہت
شایستہ ہو جاتے ہیں! کم از کم اسی خیال کا پیہم آتے رہنا کہ ہمارے افعال و عادات کی
لغزشیں کہیں عہدہ کی بلند پایگی اور اوسکے وقار کو ضائع نہ کر دیں۔ اس خیال کا پیدا ہونا ہی
صحت عمل کا ضامن ہے، اور یہیں سے اخلاق فاضلہ کا اکتساب شروع ہو جاتا ہے،
جو لوگ فطرۃً سلیم الطبع ہیں یا جو نسبتاً زیادہ گداز اخلاص رکھتے ہیں، یا وہ جو تاثرات
سے بہت جلد متاثر ہو جانے کی صلاحیت کے مالک ہیں، اون کے دل و دماغ پر ایسے جلیل القدر
عہدوں کی ذمہ داریاں، ایک خاص اثر چھوڑتی ہیں اور روز کا یہ احتساب عمل کا احساس آیندہ
زندگی کی ہنگامہ زا مصروفیتوں میں بہترین رہنما ثابت ہوتا ہے۔

(۷)

دنیا میں جس قدر قومیں اور حکومتیں ہیں، اون میں فطرتاً ترقی حاصل کرنے، اور بڑھنے کا مادہ موجود
ہے، انسان کی زندگی، اور اوسکی قوتوں کا اندازہ مہینوں اور سالوں کے حساب سے لگایا جاتا ہے
لیکن قوموں، اور حکومتوں کی ترقی کا معیار صدیوں اور قرنوں سے کرنا پڑتا ہے۔

جس طرح انسان اپنی عمر کے مختلف مدارج جسمانی و روحانی میں ترقی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے
اسی طرح قومیں اور حکومتیں بھی بتدریج ترقی کرتی رہیں۔

جس طرح ایک انسان اپنے اندر بچپن، جوانی بڑھاپا رکھتا ہے۔ اور مدارج طبعی کا خلاصہ ہے
اسی طرح قومیں اور حکومتیں بھی طفولیت۔ شباب، اور کہولت کا زمانہ رکھتی ہیں،
چنانچہ جب کسی قوم اور حکومت کی ارتقائی حالت پر گفتگو کی جاتی ہے تو ان ہی منازل ثلاثہ کو تقسیم
کر لیا جاتا ہے۔ جس طرح۔
ایک معمر انسان پختہ مغز، تجربہ کار اور بیدار فکر کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پرانی

حکومت رعیت کے رسم و رواج، آداب ملک۔ اور ان کے جذبات کو زیادہ سمجھنے کے اعتبار سے مضبوط کہی جا سکتی ہے۔

ضعیف انسان کی جس طرح عدم تجربہ اور پختہ کامی نہ ہونے کی وجہ سے آزار کو ضعیف سمجھا جاتا ہے، اسی طرح حکومت کا بھی گو زمانہ کہولت ہو، لیکن اگر وہ رعیت کے جذبات سے لاعلم، ملک کے رسم و رواج سے بے خبر، پبلک جذبات و داعیات سے اعتنا نہ کرنے والی ہے، تو وہ بھی ضعیف ہے۔

افراد جماعت کے اعمال کا اثر جس طرح قوم پر پڑتا ہے اسی طرح افکار قومی سے حکومت متاثر ہوتی ہے اور قوموں کے اعمال کے اثرات حکومتوں میں بہت جلد تغیر پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً سر سید احمد خان مرحوم ہیں کہ ان کے شخصی اعمال کے اثر نے تمام قوم کے نظام عمل میں خوشگوار تزلزل پیدا کیا۔ اور قوم کے انحطاط و تنزل کی رو کو نہ صرف روک دیا بلکہ ترقی کی جانب اوس کا رخ پھیر دیا۔ یا جس طرح کمانڈر پیری کے چار جہازوں نے حکومت جاپان کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا جس کا خلاصہ ہم نے عنوان پر دیا ہے۔

یا جس طرح ہندوستان میں ہوم رول تحریک نے ہندوستانی آبادی کے جمود سیاسیہ میں تحرک پیدا کر دیا ہے۔ بہرحال

افراد کا اثر جماعت پر، اور قوم کا اثر حکومت پر جس قدر ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے اوسکے نیک و بد کی مثالیں تاریخوں میں بھری پڑی ہیں۔ ہم کو تو صرف اس بات سے بحث کرنی ہے۔ اور فقط یہ دکھانا مقصود ہے کہ حکومتیں صرف نمو ہی نہیں رکھتی بلکہ افراد قوم، اور اقوام کے ذاتی اعمال بھی اوس کے عروج و زوال پر معتد بہ اثر ڈالتے ہیں۔

اگر اقوام محکوم کی بیداری، روشن خیالی حکومت کی ترقیات میں اضافہ کر سکتی ہے، تو وہیں قوموں کی بد اطواری، حکومت کی بنیادوں کو کمزور بھی کرتی ہے۔

افراد کی بہتری جماعت سے وابستگی میں ہے اور قوموں کی فلاح حکومت سے تعلقات خوشگوار قائم رکھنے میں، اسی طرح حکومت کی بھلائی رعیت کی فلاح اور اون کے داعیات کی پذیرائی میں مضمر ہے جہاں رعیت اور حکومت میں ارتباط و اخلاص کی کمی ہوتی ہے وہاں نظام امن و انصاف خطرے میں

پڑجاتا ہے اور اسکالازمی نتیجہ حکومت کے زوال کی صورت میں بتدریج نمایاں ہونے لگتا ہے کیونکہ:-
فلاح ملکی رک جاتی ہے۔ برکات روحانی کے ابواب مسدود ہوجاتے ہیں - اور سلطنت و حکومت الگ الگ اپنی بقا کی خیر منانے لگتے ہیں۔

موسیو لیبان نے کیا خوب کہا ہے (دیکھو تمدن عرب نمبر ۵۴۳)

"قوم کا تنزل اسی روز سے شروع ہوجاتا ہے جسدن سے اُسکے پاس کوئی ایسا تخیل نہ رہے جسکی حفاظت کے لیئے ہر ایک فرد قوم اپنی جان دینے پر آمادہ ہو"

اور یہ تخیل کونسا تخیل ہے؟ رعیت اپنی نادانی سے قودمین اپنی بے وقوفی سے اپنے ملک کو اپنا ملک اور اپنی حکومت کو اپنی حکومت نہ سمجھیں! اور یہ ظاہر امر ہے کہ جب شیرازۂ اقوام منتشر ہوجاتا ہے تو پھر نہ ملک ہے اور نہ حکومت - اور نہ تمدن ۔ اپنی سب چیز بیگانی ہوجاتی ہے - اور برکات تمدن و حکومت انسانوں پر سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیتی ہے +

"انشا"

"قدرت کی دلفریب کاریگری پر جان کھونے والی ساکنان دہر کو پر درد نالوں سے بیچین کرنیوالی بلبل اپنے محبوب اور مطلوب کے انتظار میں خوف صیاد سے شاداب پتیوں کے آغوش میں چھپی ہوئی ساکنان گلشن پر ایک حسرت اور یاس کی نظر ڈالتی ، اور بزبان بے زبانی چرخ فتنہ ساماں کی حسینان چمن سے شکایت کرتی تھی کہ زلف لیلی کو چمکا دینے والا اور مجنوں کے لئے خضر راہ بننے والا **جگنو** نظر آیا بلبل ناشاد جسکو فراق یار میں اپنا خون دل پیتے ہوئے اور لخت جگر کھاتے ہوئے اور کئی طویل راتیں گذر گئی تھیں اسی نور کے تنکے کی طرف بڑھی اور جگنو نے دیکھا بلسو نچا کہا:- **اے** ظالم! صبر کر!! اور نظر انصاف اور حقیقت سے دیکھ - کہ مجھے اور تجھے عدم سے وجود میں لانیوالا ایک اور اکیلا **معبود** ہے اور اسی نے اپنی عقل کامل سے مجھے دولت تاباں اور تجھے لحن داؤدی بخشا ، تاکہ ہم دونوں اوسکی رحمت اور نعمت کے صلہ میں سر بسجود رہیں ۔ دل بلبل جو کہ جور فلک سے خود ہی پاش پاش ہورہا تھا مجگھل گیا اسلئے وہ نہ ہوسکا جسکا اس نے ارادہ کیا تھا"

کنور جعفر حسن درد بلگرامی

ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم کے خطوط

آج ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر اس قابل فرد قوم کی یاد آج نہیں برسوں تک ہمارے دل میں موجود رہے گی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمن جیسی قابلیت کے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں اس لئے ایسے حضرات کے افکار جمیلہ کو جس قدر بھی عزت کے ساتھ محفوظ کیا جائے وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ زندہ قومیں اسلاف کی یادگار کو جانوں سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ اگر ہمیں بھی قوم کو عروج کے راستہ پر لگانا ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اپنے قابل لوگوں کے ایک ایک حرف کو قدر اور منزلت کے ساتھ محفوظ رکھیں۔ ذیل میں ہم ڈاکٹر مرحوم کے خطوط کا اقتباس اپنے ایک بزرگ سے حاصل کر کے درج کرتے ہیں جو مرحوم نے مختلف اوقات میں انہیں لکھے تھے۔ اگر یہ خطوط محض سادے خطوط ہی ہوتے تو بھی کچھ قابل قدر نہیں تھے مگر ان میں اہل ذوق کے لئے بہت کچھ سامان عیش پنہاں ہے۔ انشاء اللہ آئندہ بھی خطوط کی دوسری قسط شائع کریں گے جو ان خطوط سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ آخر میں ہم اپنے کرم فرما کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اس چشمۂ فیض سے پبلک کو مستفید کر دینے کی اجازت دی جو محض ان کے لئے جاری ہوا تھا۔

ایڈیٹر

مراد آباد

مورخہ ۱۴ فروری سنہ ۱۵ء

آداب عرض کرتا ہوں۔

آپ کے دو قطعہ محبت نامجات داخل ہوئے۔ اور دونوں میں کلام سحر بیان بھی میرے آنکھوں پر نازل ہوا ؎

سینۂ اہل میں رہنے کا فنا نام سہی غالب مردہ تو زندہ ہے دل عالم میں
تو بھی کہنہ کے نئے نیں جو معنی ہیں خاکۂ موم ہی ہیں کے گل عالم میں

سبحان اللہ۔ مرحبا۔

اس سے بڑھ کر روح غالب کی کیا کسی کی کسی نے کم لکھی ہوگی۔ مضمون کی بلند پائگی اپ
آپ کی زبان قیامت پیدا کردی ہے۔ پھر بھی موزون تر ملنا ناممکن ہے۔

خاک مرحوم ملی جائے گل عالم میں

آپ ہی کا حصہ ہے۔

دوسرے صحیفہ ہمایوں میں سے

فردوس میں گناہ کی جب قدر ہی نہیں　　کیا جئے وہاں کہ جہاں آبرو نہ ہو

یہ مضمون آپ نے طرفہ پیدا کیا آپ کے سوا کسی کے بس کا نہ تھا۔ مقطع ماشاء اللہ
استادانہ رنگ میں ہے۔

آپ کے عالی نامے تو ایک ضیافت روحانی ہوتے ہیں مگر میری کوتاہ قلمی بلکہ کوتاہ
نصیبی کہ جواب عرض کرنے میں ہمیشہ تاخیر ہی کرتا ہوں اور مزید تکرار کتابت کے خط سے
محروم رہتا ہوں۔

تقصیر کرنا میری عادت ہو گئی ہے آپ عفو کو اپنا شیوہ بنالیے جب یہ تضاد موافقت
پائے تو سلسلہ مستوار رہو۔

میرے مضمون کی بابت آپ نے اتنی تعریف کی کہ گونہ ندامت سی ہوئی۔
کاتب نے واقعی بہت ظلم کیا۔ مگر کاتب ہی کیا کریں۔ اگر یہ نہ کریں۔
آپ کی قدر دانی کا بہت ممنون ہوں۔

کیا کیے جو شرت سے دی داد سخن　　شک مجھ کو بھی اپنی بے کمالی میں ہوا

سنا ہے کچھ کہہ کے لیے۔

جلد دونوں باقی ہے۔ اور پہلے سے اطلاع دیجئے ؎

ہما نے اوج سعادت بدام ما افتد　　اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

آداب۔

عبدالرحمن

براہمن

محب من۔

آداب۔ کل پہلی مرتبہ کی طرح پھر آستانہ پر حاضر ہوا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ نقل مکان کر رہے ہیں۔ ملاقات نہ ہوئی۔ محروم واپس ہوا۔

اپنی کتاب کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ہمراہ لایا تھا وہ مکان کی صاحبزادی کو آپ کو دینے کے لیے دے آیا۔ گر قبول افتد۔

جنوبی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت صرف اس وجہ سے کی کہ یہ یقین ہے کہ جو کچھ بھی مجھ سے عمل میں آتا ہے اس سے آپ کو بوجھنا کا رہ سے اس۔ کیسے اس سے،

میں نے آپ کی اجازت لیے بغیر اس امر کی جرأت بھی کی ہے کہ دیباچہ میں آپ کا شکریہ بڑے الفاظ کیا ہے کہ جن احباب نے ہمیشہ اس کام میں میری ہمت افزائی کی ہے اس میں آصف علی صاحب کا بھی حصہ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے شاہد کا اور آپ کا نام اپنے کسی بہانہ منسوب کرنے سے ایک قلبی تقویت اور دلی خوشی ہوتی ہے۔

کتاب پر ہدیہ کے چند الفاظ پنسل سے یوں لکھے کہ قلم اور روشنائی اس وقت آپ کے مکان پہ نہ مل سکی۔

میں بخیریت ہوں اور جلد آپ سے آکر پھر ملوں گا۔

ابوالحسن صاحب کی کامیابی سے از حد خوش ہوا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

آپ سے ملاقات کو از حد جی چاہتا ہے باقی عند الملاقات عرض کروں گا۔

زیادہ والسلام

عبدالرحمٰن

کتاب ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے۔ دو تین روز میں شائع ہو جائے گی۔ عبدالرحمٰن
اکسفورڈ۔ یکم رجنوری ۱۹۱۴ء

مجی شفیق

تسلیم۔ سال نو طلوع ہوئے دیر نہیں آپ کی خدمت میں عریضہ کے ذریعے حاضر ہو کر

اس کو آغاز کرتا ہوں اور شگون نیک لیتا ہوں۔

امید ہے کہ آپ کے لیے نیا برس گذشتہ امیدوں کی کامرانی ہمراہ لایا ہوگا اور اپنے تحائف پیش کرنے میں بجائے تاخیر کے عجلت کو کام میں لائے گا۔

علاوہ بریں نئی امنگیں اور نئے ارادے نہ صرف قلب میں پیدا ہی ہوں گے۔ بلکہ عالم خیال سے رونے کار پر ظاہر ہونگے۔

میں شروع ہی میں اشیر باد عرض کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ اختتام سال پر آپ میری بابت کہہ سکیں،

اک برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

زیادہ والسلام

عبدالرحمٰن

۲۰ر مارچ ۱۹۱۰ء

رفیق شفیق وحبیب صدیق

تسلیم۔ صد تسلیم۔ گذارش ہے۔

شب سیاہ کی زلف کمر رسیدہ ہو چکی ہے مگر قریب کے ایک مکان سے آواز نغمہ آرہی ہے اور آج غیر معمولی طور پر خواب کا بھی طبیعت پر غلبہ نہیں اس سے چند سطریں اور لکھتا ہوں۔

آپ کی تصویر پہنچی۔ قدیم مصر بھی افق تواریخ پر ایک عجیب وغریب نقش ہے جس کو وقت بھی محو نہیں کر سکا۔ آپ کے اس فقرہ سے کہ

احرام تا ہنوز ایک راز ومعمہ ہیں

میرے دل میں سحریات۔ نجوم۔ کیمیا۔ وغیرہ کا خیال پیدا ہوتا ہے بجھے یقین ہے کہ انسان میں فوق الفطرت طاقت تھی جو بوجہ تحمل نہ ہوسکنے کے اس سے واپس لے لی گئی، صحرائے اعظم میں ضرور کوئی شہر دبا ہے بلکہ شاید آباد ہے۔ بہشت شداد میں ہے آواز نغمہ خاموش ہوگئی۔ تحریر بالا اس سرود کے اثر میں لکھی گئی اسلئے لائق معافی ہے۔

آپ نے بارہا مطالعہ فرمایا ہوگا کہ ابوالہول ایک معمہ ہر کس و ناکس کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ اس معمہ کا جواب "انسان" تھا۔ آپ کی تصویر گویا اس معمہ کا مرقع ہے،

ابوالہول بھی موجود ہے۔ جو سراپا استفہام ہے اور آپ بھی۔ مصر یونان۔ روما یہ سب مے خانے ہیں جہاں ساقی زمانہ آتش بجام کر چکا ہے۔ جدید یورپ بھی ایک میخانہ ہے جس کے ساغر الوان شراب سے پر ہیں اس کے جام بہت سی قوموں کے خون سے لبریز ہیں۔ ساقی زمانہ رہی ہے اور اہل بزم کے رقص و خندہ پر خود خندہ کناں ہے۔ یہ لوگ آخری دور سے کام آشنا ہو رہے ہیں۔ اب دیکھیے کہ دوسرا مے خانہ کہاں قائم ہوتا ہے۔

آپ اپنے مشاغل اور حالات سے بھی اطلاع دیجئے۔

میں بخیریت ہوں۔

گو وقت اور فاصلہ درمیان میں حائل ہو گیا ہے، دوری ابدان انشاء اللہ تعلقات دل و جان کو کم نہ ہونے دیگی ہمیشہ آپکی اور آپ کے متعلقین کی صحت اور عافیت کے لیے دعاگو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ بحصول عریضہ آپ بمع وجوہ مع الخیر ہونگے۔ جواب عنایت

بندہ عبدالرحمٰن

فرائی برش

۸۔ فروری سنہ ۱۹ء

حبیبم

تسلیم۔ یہاں پہنچ گیا دل نہیں لگتا۔ شاہد اور آپ دونوں سے ایک ساتھ جدائی سخت گراں ہے۔ خدا جانے کیوں زمانہ کے ہاتھوں اس سرزمین میں سرگرداں ہوں۔

وقت آنست کہ پرسی خبرم از بغداد

یہاں کوئی امر قابل گزشتنا نہیں۔ سردی لندن سے بیشتر ہے۔ برف ہر طرف چھا رہا ہے۔ قدرت کی اس کیفیت کو دیکھ کر دل اور بھی تنگ ہوا جاتا ہے۔

اپنی کیفیات سے بالتفصیل اطلاع دیتے رہیے۔ "د جیترا" کے ترجمہ کی کوشش ہنوز ختم کر دیجیے۔ ذرا سی دلیری اور آمادگی سے لاجواب چیز ہو جائے گی۔ بتاکید التماس ہے کہ کوتاہی

بھیجیے گا۔ جب مقتنس مکمل ہو جائے تو ضرور روانہ کیجیے گا۔ اور جو کچھ طبع آزمائی ہو اس سے مطلع اور سرفراز کرتے رہیے گا۔

لندن کے کیا تازہ حالات ہیں۔ سید صاحب کی خیریت لکھیے اور سلام علیکم و نیاز میری طرف سے عرض فرمادیجئے۔

مسز نائیڈو صاحبہ کی کیفیت صحت سے بھی باخبر ۔ کیجیے گا آپ کے اُس دن یہ کہنے سے کہ مرض کے عود کرانے کا احتمال ہے تعلق خاطر ہے۔

اس مرتبہ دوبارہ پیرس کے راستہ سے فرانس برٹش آیا پیرس کا دیکھنا میری قسمت ہی میں نہیں بغیر قیام کیے ہوئے ویسا ہی ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کو روانہ ہو گیا۔

شاہد کا خط آکسفورڈ سے ملا بخیریت ہیں۔ اپنی جملہ کیفیات سے باخبر رکھیے۔ حیدرآباد سے کوئی زیادہ مفصل خبر دریافت ہوئی ؟

میری تو اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب اپنے اشعار کو دیکھتا ہوں تو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ شعر بھی کہہ سکتا تھا۔ روح شاعری کسی صدمہ قلبی کے باعث جان بحق تسلیم ہو چکی ہے۔ خدا ہی ہے جو اب شعر کہہ سکوں۔

میں ہمیشہ سکون کا طالب تھا روز بروز سکون حاصل ہوتا جاتا ہے اگر اسی کو سکون کہتے ہیں تو ایک روز سکون دائمی حاصل ہو جائے گا۔ اس سے تو پہلا درد دائم ہی منتظم تھا کہ اب

نہ نالہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

اور کوئی امر لائق گزشگذار نہیں جو عرض کروں۔

ہمیشہ جویان عافیت ہوں۔

زیادہ سلام شوق عبد الرحمن

۱۱ اگست ۱۹۱۳ء

یونش (ریونک)

محبّی مولائے من۔

باوجود میری تقصیر کوتاہ نویسی کے آپ ازراہ دوستی برابر یاد فرماتے رہے۔ آپ کی

وہ عنایت اور میری یہ نالائقی معافی تک مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔
اس زمانہ میں پریشان بھی رہا اور بیمار رہی۔ بہرحال اب تندرست ہوں۔
آپکے ارسال کردہ مضمون ودو اعداد کو حسب ارشاد واپس کرتا ہوں ماشاءاللہ خوب ہی ہے خصوصاً آغاز اور انجام بہت پرزور ہے۔ وقولات اشک، دادہ النقیب مسرت " اپنے اپنے انداز میں وقار اور ادا میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ چونکہ اپنی کم بیانی کے باعث انگریزی کلام کی نادر ماہیت کے پانے سے باوجود کوشش بے بہرہ رہ جاتا ہوں اردو کلام کا ورزیادہ تشنہ ہوں اگر کوئی چیز ارقام فرمائی ہو تو روانہ فرمایئے۔ نثر ہو یا نظم، " دریا و " کو پورا کیوں نہیں فرمادیتے۔ افسوس کہ جنکو تخیل نصیب ہے ان کو صبر نہیں اور جنہیں ضبط ہے وہ مرغ خیال کے شہپر کی آواز تک نہیں سن پاتے اسکی پرواز دیکھنا تو کیسا،
آج دو ہفتہ سے اس شہر میں ہوں سہروردی صاحب بھی ہمراہ ہیں یہاں چند یوم اور قیام ہے پھر لندن کا قصد ہے، آپ تو اس مقام کو دیکھ ہی چکے ہونگے، یہاں کے نگارستانے حقیقت میں تعریف سے بالا ہیں۔ لوئی ثانی (Ludwig) کی دیوانگی نے اس شہر کو یک فردوس نظر بنادیا۔ دیوانہ ہونا بھی ایک راز الہی ہے۔
آپ غالب اسوقت اسویج (سوئزرلینڈ) میں ہوں گے۔ کب تک ان اطراف میں رہنے کا قصد ہے۔ کیسا افسوس ہے کہ جب آپ نے فرانس برش تشریف لانے کا قصد فرمایا تو بخت نارسانے مجھے وہاں سے یہاں پہنچایا۔
والا نامہ جات تحریر فرماتے رہیئے آپ کی خطا پوشی اور عذر پذیری سے اسی کا متوقع ہوں از راہ شوق مدتات ہے۔ احوال تازہ سے مطلع کیجئے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بہمہ وجوہ بہبود نیک ہو گا۔ سہروردی صاحب سلام کہتے ہیں +

عبدالرحمٰن

جسے جو جینے دوں کیطرح جینا اسی کا ہے جو چھاتی سے لگالے تیغ کو سینہ اسی کا ہے

امین سیالکوٹ

دو شہزادے جیل خانہ میں

میرزا تیغ جمال کی عمر اب اسّی برس کی ہے، غدر ۵۷ء میں وہ انیس بیس برس کے گبرو جوان تھے۔ اور ان کو غدر سے پہلے کی باتیں ایسی یاد ہیں جیسے ابھی کل کی گزری ہوئی حالت کو بیان کیا کرتے تھے۔

تیغ جمال میرزا فخرو ولی عہد دوم کے لڑکے ہیں۔ میرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولیعہد تھے، لیکن جب ان کا انتقال ہوگیا تو میرزا فخرو ولیعہد قرار پائے۔

میرزا فخرو بہت دیندار اور متقی شہزادے تھے۔ اگر دہلی کا تخت باقی رہتا تو یہ ہندوستان کے بہت ہی نیک بادشاہ مانے جاتے مگر جوانی کے دیوانہ پن میں بڑے بڑے پارساؤں کا قدم ڈگمگا جاتا ہے میرزا فخرو تو پھر بادشاہ ہند کے بیٹے اور ولی عہد تھے جنکو شباب کی آنکھ مچولیاں کرنے میں کسی کا خوف و لحاظ نہ تھا۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں لال قلعہ خانگی بد چلنی میں اس قدر بدنام تھا جس کی کچھ حد نہیں پھر اگر میرزا فخرو سے کوئی غلطی ہوگئی اور وہ جوش شباب کی مستی کو روک نہ سکے تو کچھ زیادہ گرفت کے قابل نہیں سمجھا جاے گا۔

میرزا تیغ جمال اسی پہلی اور خفیہ مگر نہایت دلچسپ غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بعد ان کی والدہ سے پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی اور میرزا فخرو کی دوسری اولاد میرزا فرخندہ جمال وغیرہ انکی نکاحتہ بیوی سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے بڑی پنشن کا حقدار میرزا فرخندہ جمال کو قرار دیا جنکو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ اور تیغ جمال کو پانچ روپیہ کی پنشن بھی نہ ملی۔

تیغ جمال عجب زندہ دل اور خوش طبع شہزادہ ہیں۔ ان کو پنشن نہ ملنے اور شہزادہ مشہور نہ ہونے کا ذرا بھی غم نہیں ہے اور وہ اپنے والدین کے خفیہ تعلقات کو اس لطف سے بیان کرتے ہیں گویا ان کا اس عشق بازی کے نتیجہ سے کچھ ذاتی واسطہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اس چھپی ہوئی اور لال قلعہ کی بلیات میں نہایت مبالغہ آمیز [illegible] مشہور عشق بازی

کا بولتا ہوا ماحصل مقصد ہیں

تیغ جمال کہتے ہیں، اماں جان کی عمر سولہ برس کی تھی اور ابا جان تیرہ برس سے کچھ ہی زیادہ کا سن رکھتے تھے جب یہ عشق بازی شروع ہوئی تھی۔ پوچھا جائے کہ جناب تیرہ برس کا بچہ سولہ برس کی عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے۔ تو سنجیدہ صورت بنا کر کہہ دیتے ہیں جب ملن اتنی بڑی کا بڈھا سولہ برس کی کم سن عورت سے محبت کا دم بھرا کرتا ہے۔

ہم مغلوں میں بچے بہت جلدی جوان ہو جاتے تھے۔ لڑکیاں تو بعض اوقات دس اور گیارہ سال کی عمر میں نمود شباب کا اعلان کر دیتی تھیں اور لڑکے بھی بارہ تیرہ برس کے سن میں عشق و محبت اور اسکے نتائج پر غور و عمل کرنے لگتے تھے۔ میں خود بارہ برس کا تھا تو آجکل کے اٹھارہ سالہ جوانوں سے زیادہ جذبات اپنے اندر پاتا تھا۔

تیغ جمال نے کہا۔ اماں جان ایک کہار کی لڑکی تھیں۔ نانی اماں کو محل کی کہاریوں میں سب سے پیارو کہاری کہا جاتا تھا حضرت اکبر شاہ ثانی کی نظر کردہ تھیں گر جو حسن اور جو غمزہ و ملاحت اماں جان رکھتی تھیں وہ نانی اماں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرے ہونگے ہونے کو تو اماں جان بھی محل شاہی کی نوکر تھیں مگران کا قیام اکثر خانم کے بازار میں رہتا تھا جہاں نانی اماں۔ نانا ابا۔ اور ہمارے ننہیال کے سب کہار رہتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے ابا جان ڈیوڑھی کے داروغہ کے ساتھ اپنی کمان درست کرانے خانم کے بازار چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کہیں اماں جان کو دیکھ لیا۔ اور اسی وقت ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ گھر آئے تو اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئے۔ اور رونا شروع کیا ہر چند لوگ پوچھتے تھے کہ میاں مزاج کیسا ہے۔ دادی اماں کہتی تھیں بیٹا کسی نے کچھ کہا ہو۔ سنا ہو۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی ہو تو مجھے بتاؤ میں ان کا تدارک کروں۔ مگر یہ تو عشق کے ستائے ہوئے تھے ایک بات منہ سے نہ کہتے تھے۔ اور چپ چاپ پڑے روتے تھے

آخر رفتہ رفتہ یہ بات کھل گئی۔ اور محل میں اس کے مذاق اور چرچے ہونے لگے۔ بیگمات ابا جان کو چھیڑنے لگیں۔ اور ہم سن لڑکوں میں بھی اشارہ بازیاں اور آوازہ کشیاں شروع ہوئیں۔ رفتہ رفتہ نانی اماں کو خبر ہوئی تو انہوں نے اماں جان کو محل میں بلا لیا اور دادی اماں

بکی ڈیوڑھی پر حاضری لکھوادی۔ مگر ابا جان کی حالت یہ تھی کہ باوجود اس مہاراجانہ ٹھاٹھ کے وہ اماں جان سے بات کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اماں جان کبھی اکیلے دکیلے مل جاتیں تو ہنسکر ابا جان کا ہاتھ پکڑ لیتیں اور کہتیں صاحب عالم آپ غمگین کیوں رہتے ہیں تو ابا جان ہاتھ چھڑاکر بھاگ جاتے۔ اور اماں جان کی طرف مخاطب نہ ہوتے۔

بظاہر تو یہ حالات تھے۔ اندر کی خبر نہیں کیا ہوا اور میرزا تیغ جمال کیونکر پیدا ہو گئے میرزا تیغ جمال کا بیان ہے کہ انکی پیدائش کے وقت اماں سترہ برس کی اور ابا چودہ ساڑھے چودہ سال کے تھے۔

دادی اماں نے بہت چاہا کہ اب اس کہاری کے ہاں میرا پوتا پیدا ہو گیا ہے۔ یہ محل میں بیگمات کی طرح رہے مگر نانی اماں نے اسکو قبول نہ کیا۔ اور اماں جان بہرو میں خانم کے بازار میں رہنے لگیں۔ میرزا تیغ جمال جب چھ برس کے ہوئے تب وہ لال قلعہ میں اپنے باپ کے پاس آکر رہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بھائی ہم کہاروں ننہیال کی طرف سے۔ اور بادشاہ ہیں ددھیال کے رشتہ سے دونوں میں انسانوں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور یہاں بھی۔ ہماری برابری کون اس دنیا میں کرسکتا ہے کہ ہماری زندگی خدا کے بندوں کے بوجھ اٹھانے اور خدمت خلق کرنے میں بسر ہوتی ہے۔

غدر کے بیس برس بعد

میرزا تیغ جمال کہتے ہیں۔ غدر کے ایام میں اپنی والدہ کے ساتھ دہلی سے بھاگ کر ہم شاہ جہاں پور چلے گئے تھے جہاں ہماری ننہیال کا قدیمی کنبہ رہتا تھا۔ قلعہ کی افراتفری دیکھ کر میں نے شہزادوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اماں کے پاس چلا گیا۔ کیونکہ شاہزادوں کی زندگی اس زمانہ میں دو کوڑی کے برابر بھی نہ تھی۔ مجکو جان کی خیر اسی میں نظر آئی کہ کہاروں میں جاکر رہوں اور کہار کہلاؤں وہ کہتے ہیں اماں جان کے پاس اتنی دولت تھی کہ ہم نے شاہ جہاں پور میں جاکر ایک دکان کرلی۔ اور بیس برس بڑے عیش آرام میں گزارے۔

میں حلوائی کی دکان کرتا تھا۔ ایک دن کسی پٹھان نے مٹھائی کی خرابی بیان کرکے مجکو گالی دی۔ میں شاہی خون کا مغل گالی کو برداشت کیونکر کرتا لوہے کا چمچہ اٹھاکر پٹھان صاحب کے

مارا جس سے وہ چکرا کر گر پڑے اور پانچ منٹ کے اندر تڑپ کر مر گئے۔
میں پکڑا گیا۔ اور مقتول مقدمہ سادہ حالات کا جھمیلہ برداشت کر کے چودہ برس کی قید کا سزاوار بنا۔

بریلی کا جیل خانہ

پہلے دن جب میں جیل خانہ کے اندر داخل ہوا تو مجھے ذرا بھی پریشانی اور غم اپنے قید ہونے کا نہ تھا۔ کیونکہ شروع سے ہر وقت خوش اور بے فکر رہنے کی عادت تھی۔ اور غم کبھی میرے پاس نہ آنے پایا تھا۔ قید کا حکم سننے کے بعد بھی میں خوش رہا۔ اور جب اماں جان ملنے آئیں اور رونے لگیں تو میں نے ہنس کر کہا۔ ارے بی روتی کیوں ہو۔ دکان میں اتنی مٹھائی چھوڑ کر آیا ہوں جو کئی مہینہ تک کھاتی رہو گی۔ اماں جان بولیں۔ بس تجکو تو ہر وقت مسخرہ پن سوجھتا ہے۔ میرا کون وارث ہے جو چودہ برس تک خبر گیری کرے گا۔ میں نے تو تیرے دم کی بدولت اس پردیس میں بیس برس گزار دیئے ورنہ دلی کی تھی اس گاؤں میں بات کہاں۔ میں نے جواب دیا۔ جب ابا جان کا سارا خاندان تباہ ہو گیا اور بڑی حویلیاں خاک میں مل گئیں۔ اور ہمارے شہزادے بھائی تخت سے تختہ پر آ گئے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ چودہ سال کی بات ہی کیا ہے پلک مارتے گزر جائینگے۔ اور میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ ذرا میری بیوی کا خیال رکھنا اسکا دل تمہاری بدمزاجی سے میلا نہو۔ تم تو ملکہ کا سا دماغ رکھتی ہو اور وہ بیچاری محض ایک کہاری ہے مہربانی کر کے اس پر شاہانہ مزاج ظاہر نہ کرنا۔ اماں جان یہ گفتگو سنکر ہنسنے لگیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔ خبر نہیں تو اتنا بے غیرت اور ڈھیٹ کیوں ہے۔ خیر جا خدا کے سپرد کیا۔

جس وقت مجکو جیل خانہ کے کپڑے پہننے کو دیئے گئے تو میں نے مذاق سے کہا۔ اس جانگیہ کو رہنے دیجئے۔ مجکو اپنا پاجامہ اس سے زیادہ پیارا ہے۔ یہ گفتگو برقنداز جیل کو کب گوارا ہو سکتی تھی اسلئے دو تین ڈنڈے رسید کئے۔ اور کہا یہ تمہاری نانی اماں کا گھر نہیں ہے۔ جو دل لگی کی باتیں کرتے ہو۔ میں نے ڈنڈے کھا کر بھی ہنسی کا جواب دیا کہ بھائی نانی اماں کا گھر خانم کے بازار میں تھا۔ اور وہ محلہ کے ساتھ کھود کر برابر کر دیا گیا۔ دادی اماں کا گھر لال قلعہ میں تھا۔ اسے اب گورے سنبھالے ہیں میں تو اسکو سسرال سمجھ کر آیا تھا۔ وہاں جوتیاں تو مارا کرتے ہیں

ڈنڈے مارنے کبھی نہیں سنے، تم میرے سالے ہو یا سسرے۔

برقنداز تنگ ہو گیا۔ اور اس نے دو تین قیدیوں کی امداد سے مجھ کو اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو ایک کوٹھڑی کے اندر لیٹا تھا۔ اور برقنداز سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا جناب۔ مارنے کا شگون ہو چکا۔ اب اپنی بہن کو یہاں لایئے جو مجھکو کھانا دے اور میری چوٹ پر لگائے۔ برقنداز کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور اس نے کہا تم آدمی ہو یا پتھر کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔ میاں یہ جیل خانہ ہے۔ یہاں یہ خوش مذاقیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ تم کو چودہ برس گزارنے ہیں سیدھے ہو کر رہو گے تو خیر ہے ورنہ پٹتے پٹتے چودہ دن کے اندر مر جاؤ گے۔

میں نے کہا۔ مرنے کے بعد بھی آدمی کو قبر کے جیل خانہ میں جانا پڑتا ہے مگر مجھکو مردہ پر بڑا غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں چپ چاپ کفن اوڑھ کر قبر میں چلا جاتا ہے۔ میں تو مرنے کے بعد بھی خاموش نہ رہونگا۔ اور جو شخص میرے پاس رہے گا اسکو بھی ایسا بنا دونگا کہ اگر وہ مرے تو چپکا نہ رہے بلکہ ہنستا ہوا قبر میں جائے۔ اگر تم کو شک ہو تو تم ابھی مر کر دیکھ لو۔ یا کہو تو میں مار ڈالوں۔

برقنداز نے سمجھا یہ کوئی پاگل ہے۔ اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھکو چکی خانہ میں لے گئے جہاں ایک چکی پر دو آدمی کھڑے ہو کر آٹا پیستے ہیں۔ میری چکی کا شریک ایک بڈھا آدمی تھا اور شاید نیا نیا قید ہو کر آیا تھا۔ اسواسطے زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے پہلے تو جھک کر ایک فرشی سلام اسکو کیا اور اسکے بعد بولا۔ نانا ابا آپ روتے کیوں ہیں۔ فدوی ایک دوغلی قسم کا آدمی ہے۔ آدھا تیموری شہزادہ۔ اور آدھا کہار اور جب آپ کے ہمراہ چکی کا کام کریگا تو تیسری شاخ میرے اندر اور لگ جائے گی اور وہ یہ کہ پاؤ پُوربیہ۔

بڑے میاں نے میری بات پر ذرا توجہ نہ کی۔ انکو اپنی حالت کا اتنا سخت صدمہ تھا کہ آخر مجھ پر بھی اسکا اثر پڑا اور میں نے کہا آپ بیٹھ جایئے میں اکیلا چکی چلا لونگا اور آپ کے حصہ کا بھی پیس ڈالونگا۔ ان حضرت نے اسکا بھی جواب نہ دیا اور کھڑے روتے رہے۔ لیکن جب برقنداز نے ان کی سفید کتری ہوئی داڑھی پکڑ کر ایک طمانچہ مارا اور کہا بس ہو چکا۔ کام کرو تو بچارے نے آسمان کو دیکھا اور بے اختیار رو کر چکی چلانے لگے انکی اس حالت کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنی ساری شوخیاں

بھول گیا اور ان کے ساتھ چپ چاپ چکی چلانے لگا۔

کئی روز یہی نوبت رہی میں ہرچند ان سے بات کرتا تھا مگر وہ جواب نہ دیتے تھے۔ اور روتے رہتے تھے۔ آٹھ دن کے بعد انہوں نے اپنی سرگذشت سنائی۔

شاہ عالم کے پڑپوتے کی داستان

میں مرزا جہانگیر کا بیٹا ہوں۔ جو اکبر ثانی بادشاہ دہلی کے بیٹے۔ شاہ عالم بادشاہ کے پوتے اور بہادر شاہ بادشاہ کے بھائی تھے۔

جب میرے والد مرزا جہانگیر نے سیٹن صاحب انگریز کے گولی ماری اس قصور کے عوض نظربند ہوکر الہ آباد بھیجے گئے۔ تو الہ آباد میں انہوں نے ایک عقد کر لیا تھا۔ میری والدہ نظربندی کے افسر پہرہ دار کی لڑکی تھیں۔ نکاح ہونے کے بعد سے لیکر میرے پیدا ہونے تک والد نے میرے نانا اور والدہ کو اتنی دولت دی کہ سات پیڑی کو کفایت کرلی۔ میری دادی اپنے بیٹے کو دہلی سے برابر جواہرات اور اشرفیاں بھجا کرتی تھیں اور انکے پاس دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔

میں نے والد کے انتقال کے بعد نانا کے پاس پرورش پائی۔ اور ایسے نازونعمت سے پلا کہ شاید دنیا میں کوئی بچہ میری طرح آرام سے نہ ہوگا۔ ہوشیار ہوا تو ہر قسم کی تعلیم مجکو دلائی گئی عربی فارسی کی تکمیل کے بعد میں نے کپڑا کی دکان کرلی۔

دن بھر دکانداری۔ رات کو خدا کی مہربانی سے تھوڑی سی عبادت و بیداری میں عمر صرف ہوتی تھی۔ چار بچے خدا نے دئے۔ بوڑھی والدہ ابتک زندہ ہیں۔

ایک روز ایک تھانہ دار صاحب کچھ کپڑا خریدنے آئے۔ میں نے عادت کے موافق ایک بات قیمت کی کہدی انہوں نے حجت شروع کی تو میں نے کہا جناب میری دکان پر جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ اسپر وہ بدزبان بگڑ کر بولا۔ بڑا ایمان دار۔ تجھ جیسے ٹھگ میں نے بہت سے جیلخانہ میں بھجوا دیے ہیں۔ میں نے کہا تھانہ دار صاحب زبان سنبھالکر بولیے۔ شریفوں کی گفتگو ایسی نہیں ہوا کرتی۔ اسپر اسکو اتنا غصہ آیا کہ فوراً ایک تھپڑ میرے کلہ پر ملا۔ مجھ میں بھی مغلئی خون تھا۔ جواب میں دو تھپڑ میں نے بھی ماردئے۔ سپاہیوں نے مجکو پکڑ لیا۔ اور تھانہ لے گئے۔ وہاں تھانہ دار نے مجکو حوالات میں بند کرا کے میرے گھر کی تلاشی لوائی۔ اور چوری کا کپڑا برآمد کرا کے

مقدمہ قائم کر دیا۔ ہر چند میں نے اپنی بے گناہی ظاہر کی۔ اور حکام سے اصلی واقعات کہے مگر کسی نے نہ سنا اور چھ ماہ کی قید سخت کا حکم دید یا۔

میری بیوی اور ضعیف والدہ نے گھر کا سارا اثاثہ فروخت کرکے مقدمہ میں خرچ کر دیا اور وہ بچارے مفلس ہو گئیں لیکن نتیجہ خاک نہ نکلا اور یہاں جیل خانہ میں آنے کی نوبت آگئی۔

سب سے زیادہ مجھے والدہ کا صدمہ ہے۔ جو مجھ سے حوالات میں ملنے آئی تھیں اور میری یہ حالت دیکھ کر ۃ کا نعرہ مار کر گر پڑیں اور روح پرواز ہو گئی۔ اسوقت میرا بڑا لڑکا جسکی عمر بارہ سال کی ہے ان کے ہمراہ تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ اور مجھ سے کہنے لگا ابا دادی جان مر گئیں۔ میں چاہتا تھا کہ اماں جان کو جھک کر دیکھوں مگر ظالم داروغہ کے سپاہی مار کر مجکو جیل خانہ میں لے آئے اور والدہ کی لاش وہیں پڑی رہگئی۔ چلتے وقت میں نے اپنے لڑکے کو یہ کہتے سنا۔

ابا جان۔ ہم کہاں جائیں۔ اب یہ سپاہی ہم کو بھی مارینگے۔ دادی جان کو کیونکر گھر لیجائیں تم ذرا ٹھیرو۔ ابا جی۔ ابا جی۔

میں اس غم میں راتدن گھلا جاتا ہوں۔ خبر نہیں بیوی بچوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اور ظالم تھانہ دار نے ان پر کیسی کیسی زیادتیاں کی ہونگی۔

میرزا تیغ جمال نے یہ سُنکر ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ یہ دنیا بھی عجب مقام ہے میں بھائی ایک سی حالت ہو اور ایک ہی نسل کا تم میں مجھ میں خون ہے مگر تم غم کے تحت الثریٰ میں پڑے ہو اور میں خوشی کے آسمان پر زندگی بسر کرتا ہوں۔

واہ واہ ایک صورت کا آدمی ایک کھانا۔ ایک پہنا۔ ایک طرح سونا۔ ایک طرح جاگنا مگر کسی کو عادت تڑپنے تڑپنے کی دی۔ کسی کو ترسلنے تڑپانے والا بنایا۔ کوئی ہر وقت مغموم و رنجیدہ رہتا ہے کوئی صبح سے شام اور شام سے صبح تک سوائے ہنسنے ہنسلنے کے کسی غم کے پاس نہیں پھٹکتا۔

بھائی صاحب قید تم بھی کاٹو گے اور میں بھی کاٹونگا۔ تم کو یہ زندگی وبال اور اجیرن معلوم ہوگی۔ اور میں اسکو ذرا بھی خاطر میں نہ لاؤنگا اور مرتے دم تک یونہی ہشاش بشاش رہونگا جیسا کہ اب ہوں +

(حسن نظامی)

فرعونِ بے سامان

اے حضرت انسان مذہب اور عقل نے تجھے کس قدر انکساری۔ عاجزی۔ حلم۔ رافت۔ خلق اور حسنِ صفات حسنہ ہیں سب سکھلائے ہیں منت سے۔ سماجت سے۔ محبت سے۔ ڈرا او سے۔ غرض ہر طرح سے تجھے پاک [illegible] عاجزانہ زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اکڑ پھوں۔ غرور اور تکبر سے منع کیا ہے۔ بندگان خدا کو تکلیف پہنچانے سے باز رکھا ہے۔ خدا خود فرماتا ہے وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ ذرا زمین پر اترا کر نہ چل۔ دیکھ کیسے کیسے تاجدار زمین کے پیوند ہو گئے۔ موت نے کیسے کیسے سرکشوں کو نیچا دکھایا۔ یہ بلبلہ کی سی زندگی ہستی ہی کیا رکھتی ہو جو اس قدر اینٹھتا ہے۔ روپیہ پر پھولا ہے عزت و ثروت کا گھمنڈ ہے اولاد اور کنبے پر ناز ہے ہاتھ پاؤں کا بل ہے تو یہ کیا جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا کیا تجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ ہمیشہ رہے گا۔ یا جن لوگوں پر تو ظلم کرتا ہے جنکی بے عزتی کرتا ہے وہ ہمیشہ اسیطرح تیرے پاؤں کے نیچے کچلے رہینگے۔ کیا ان کا خدا نہیں ہے۔ کیا وہ انکی ایک نہ ایک دن نہ پھیریگا۔ اے مغرور اور ظالم خدا کے عقوبت سے ڈر۔ پیارے ناظرین اس تمہید سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ ہمیں ایک متکبر و جابر حاکم کے خیالات دکھلانے مقصود ہیں گو آپکو انمیں دلچسپی نہ ہو مگر پھر بھی زندگی کا یہ پہلو بھی دیکھ لینا چاہیے۔ شاید کسیوقت نفس امارہ ورغلائے اور یہ باتیں کچھ کام آجائیں۔ اچھا تو ذرا آڑ میں کھڑے ہو کر اس فرعون بے سامان کی باتیں سن لیجئے۔ یہ وہ رخ کا کندہ ایک عالیم باعمل سے جسنے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اسے کچھ سمجھانا چاہا ہے الجھ رہا ہے مغرور رئیس مولوی صاحب اس بام کو اپنی کر بند کیجئے۔ میں نے بھی سب کچھ پڑھا ہے مگر میں نے عہد کر لیا ہے کہ اس خاندان کا نام کرکے چھوڑونگا یہ لوگ ایسے سر چڑھ گئے ہیں کہ اپنے برابر کسی کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہ لوگ اس قدر اندھے ہو گئے ہیں کہ میرے اختیارات میرے رعب اور مزاج کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ جب تک اس خاندان میں دو تین جنازے بیوہ نہ ہونگی جا داویں کم نکر نہ پھنک دی جائینگی بچے بھی بھینک مانگتے نہ پھرینگے۔ میرے دل کو صبر نہ آئیگا اس کے معنی کیا ہیں کہ میرے اشارہ پر خان صاحب نے اپنی پوتی کی شادی میرے بھتیجے سے نہ کر دی اپنے آپ کو اونچ اور ہمیں پنچ سمجھتے ہیں۔ اب ان کا منہ رکھیں گے قضا و قدر کا حکم پلٹ جائے گو

میرا ارادہ نہ چلنے گا۔ مولوی صاحب آپکو معلوم نہیں میں اور مزاج کا آدمی ہوں۔

مولوی صاحب بزدل ہو کر چلے آتے ہیں اور یہ متکبر اور جابر شخص اپنے دل میں اسطرح منصوبے باندھتا ہے "ان کے بڑے لڑکے کو ڈاکوؤں کی سراغرسانی کے لیے مامور کرتا ہوں یہ کسی کو شبہ ہوگا کہ وہیں کام تمام کردے۔ ایک اور بندوبست کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ فلاں مہاجن کو مجبور کروں کہ وہ اپنے روپیہ کی نالش فوراً کردے۔ اگر وہ نہ مانے تو قطعی اسکی ہاں چوری کرادینی چاہیے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں کس زور کا آدمی ہوں۔ اور میری نافرمانی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اگر ان تکلیفوں کے بعد انہوں نے میرا کہا مان لیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نہیں میں ہرگز راضی نہ ہونگا۔ یہ بہت شریر لوگ ہیں"

ادھر یہ شخص ان خیالات میں مصروف ہے اور ادھر کارپردازان قضا و قدر سرگرم اہتمام ہیں کہ اس سلسلہ ہی کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس کل فسانہ کی جڑ ہے۔ خدا کا حکم لگ چکا ہے کہ چوبیس گھنٹہ میں اس کے بھتیجے کا نام زندوں کی فہرست سے علیحدہ ہو جائے۔ مگر ابھی اسے خبر نہیں ہے ورنہ اس قدر غرور و تکبر کی باتیں کیوں کرتا۔ تار والا تار لایا۔ کھلوایا۔ پڑھوایا "رشید احمد کا طاعون میں انتقال ہوگیا" ہائے کہہ کر زمین پر گر پڑا۔ خود بے اولاد تھا۔ اپنے مرحوم بھائی کی نشانی کو بیٹا کرکے پالا تھا۔ کہہ بھائی مردود! اب تو تیرا دل نرم ہو جائے گا۔ دیکھ اس غشی میں خدا کا فرشتہ تجھ سے کیا کہہ رہا ہے۔ تو تو ایک جوان بے گناہ کی جان لے کر اسکی پاکدامن بیوی کو رنڈاپے کا جوڑا پہنانا چاہتا تھا۔ یہ کیا ہوا کہ تیرے ہاں کہرام مچ گیا۔ وہ دولہا ہی رہا جسکے لیے دلہن لانا چاہتا تھا۔ خدا پوچھتا ہے کہ اس موت سے بھی تیرے دل کی کرختگی کم نہ ہوئی تو کوئی اور کرشمہ دکھائیں۔ اے مغرور تو ہماری جناب میں سر نیاز جھکاتا رہتا تو آج یہ حال نہ ہوتا۔ اٹھ توبہ کر۔ کفارہ دے۔ عبادت کر +

(محمد سرفراز حسین قاسمی)

کسی سے محبت کرنا نہایت ہی شاعرانہ تخیل ہے، مگر تحریک مناکحت میں معلق شدہ نہیں ——— ممکن ہے کہ جواب اثبات میں ہو؟

(اسکر وائلڈ)

"پندارِ الفت"

"اس بے مہری کی کوئی حد ہے، اس بے مروتی کا کچھ ٹھکانہ ہے، کہ نصیب اعداء نزہت علیل ہو، تمہیں خبر ہو، مجھ سے محبت ہے اور ان سے خلوص ہے مگر تم عیادت کی بھی تکلیف گوارا نہ کرسکو۔ تمہاری بے نیازیوں کی وہ آج بھی شکایت کرتی تھی، آخر تمہارے جیسا ذوق سلیم رکھنے والا، محبت کا پتلا، خلوص کا بندہ، اور ایسی فراموش کاری پر اتر آئے، تو پھر قیامت کے قرب میں کس کافر کو شک ہوسکتا ہے"

انشا، ——— میں تو تمہیں بڑا رازشناس سمجھتا تھا، میں تو تمہیں رموز محبت کا جاننے والا جانے کیا، ——— آخر وہ کیا بات مانع آئی کہ آج تک تم نے اتنا نہ جانا کہ مجھے نزہت سے محبت ہے، میری ساری امیدیں صرف ان کے ہی دامن ناز سے وابستہ ہیں۔ لو اب تو اعتراف جرم کئے لیتا ہوں ——— اب تو اک گھڑی بھر کے لئے پھر آؤ، مجھ سے ہمدردی نہیں تو ان کے ہی لئے ان کی غم خواری کرو، حقوق محبت کی پرواہ نہیں ہے تو انسانیت کا ہی فرض ادا کردو، اور صحیح معنوں میں پرستار محبت ہونے کا دعویٰ ہے، تو اپنے افکار پرستش و اعمال بندگی سے اسکا ثبوت بھی دو ——— لمحے ان کی علالت میرے لئے سوہان روح ہے، مری بے تابیوں اور جانکاہیوں کی تمہیں کچھ خبر نہیں ———"

عقیل! ان دنوں میں تم سے یہ کہنا کہ ذرا ہوش و حواس سے باتیں کرو حقیقت میں اپنے ہی لئے جنون کا اعلان کرنا ہے، اسلئے اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم نے یہ جو کچھ کہا نہایت غلط کہا تو اسکے تو یہ معنی ہیں کہ میں خواہ مخواہ گفتگو میں سنجیدگی کے جرم کا مرتکب ہوتا ہوں، بہرحال اتنا ضرور ہے کہ تم اپنے مخاطب سے دعوائے دوستی رکھتے ہو، ضرور ہے کچھ حسیات بھی اوسکے تمہیں معلوم ہوں ———

میں تو اس ناگفتنی ساعت کو پیٹتا ہوں جبکہ تمہاری منتوں سے میں نے جلوہ گاہِ حسن

تک تمہاری زہرہ گداز سیت گوارا کی، ایک طرف تمہاری حزین رمیدگی، دوسری جانب تماشائے ہوش خطا، میں تو ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔

نزہت شائستہ ہے، حسین ہے، متین ہے، شاعرہ ہے، مگر میں پوچھتا ہوں عورت کی صنف شعری یوں ہی کیا کم حامل بلاغت ہے جو اور بھی اس طرح عنوان جاذبیت بنگئی۔

تمہیں کیا معلوم انکی دو تین ہی حسین صحبتوں نے مجھ پر کیا قیامتیں برپا کر دیں۔ میرے جذبات رقیق میں کس نوع کے تموج پیدا کر دئے، میری حیات ادبی میں کس قسم کی ہلچل ڈالدی۔ یہ ممکن ہے میں ان سے محبت کروں لیکن یہ ممکن نہیں کہ میں ان کا احترام نہ کروں، ان کی علالت میری عیادت کی محتاج کب ہے، انکی صحت تو میری غلطیوں کا خمیازہ ہے، ان کی دلنشیں شگفتگی نے جبکہ غلش سامانیوں کی نمائش کی ہو تو کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ ان کا تحسر ملیل مجھے زندہ چھوڑ دیگا۔ آپ دعوائے الفت کیساتھ تیمارداری کیا کیجئے، آپ تکلیف دوست کو دیکھئے اور دلجوئیوں کے عالم تزویر میں ضبط بے خودی کو ثابت فرمایئے۔ مجھ میں تو اتنی طاقت غیر محدود اتنی غیرت مردہ، نہیں کہ جیتا رہوں عقیل کونسا دل لاؤں جو انکی اذیت اختلاج کو دیکھوں، کونسی ہمت پیدا کروں جو ان کی بیکس بے ہوشی دیکھا کرے، مجھ سے سعی استعلاج کی توقع عبث ہے میں تو تڑپ کر جان دے سکتا ہوں، میں تیماردارانہ خوئے انتظامی کہاں سے لاؤں اونکی بیماری تو میری روح کے فشار کامل کیلئے درس اضطراب ہے، جب وہ تندرست تھیں میں بیمار تھا، اب کہ وہ بیمار ہیں تو میں جیتے رہنے کا ارمان رکھوں؟ میرے خلوص کو فراموش کاریوں کا الزام دینا، حقیقۃً میں فلسفہ ربط کی تفہیم کو علانیہ ذلیل کرنا ہے، تم کسی کو چاہتے ہو، انکی میں پرستش کرتا ہوں، تم ان سے اظہار کرتے ہو محبت کا اور میں اعلان کرتا ہوں اپنے تسلیم تعبد کا، اس لیے جذبات کی ہنگامہ بپائی ہنگامہ مقدر ہوگی، اور خاموش غمگینیاں میری تقدیر، تمہیں اپنے اقتدار سواد پر گھمنڈ ہے، لیکن مجھے دیکھئے کہ تذلیل خواہش کی تمناؤں پر بھی مٹا جا رہا ہوں۔

ہاں تم نے کہا تھا کہ میں تم کو اداشناس حسن الفت سمجھتا تھا۔ میں تمہیں رموز محبت کا ماہر
جانتا تھا، وہ کیا بات تھی جس سے کہ تم میری تربت آسودہ وابستگی کو تا جنگ نہ بجھے،،
عقیل میں اپنے اس ادعائے جائز کو تمہارے طعن سے ترک نہیں کر سکتا اور کبھی
کبھی اداشناس مدد ہوں، میری ردیف زندگی رموز عشق و حسن کی داستان کا عنوان ہے
مجھے اسکی پرواہ نہیں کہ تمہارا جگر خون ہو یا کباب مگر اب کہاتے ہو تو کہے دیتا
ہوں کہ قریب القیاس محبت میں گرفتار رہو، اور چاہتے ہو انشا ربھی تمہاری طلسم آرائی
کی تصدیق کردے۔

تم نے دن بھر کے بارہ گھنٹے موٹے موٹے آنسو بہا کے اور لمبی لمبی سانسیں بھر کے
بسر کئے مجھے تسلیم ہیں، رات کی طوالت کو تم نے نوک مژۂ خون چکیدہ سے ناپا، اور
پلک سے پلک نہ جھپکائی، یہ بھی سچ ہے،

اون کے دامن ناز کا ہر گوشہ، اور اُن کے حسین دوپٹہ کا ہر آنچل تم نے اپنے
گریہ بیکسی سے خراب نذر الفت کیا، میں نے سن لیا!

مگر کیا کروں اسکے لئے میرے پاس تحسین کا کوئی حرف، تصدیق محبت کا کوئی لفظ
نہیں ہے،

اُن کے گداز جبینی کے رقیق تاثر سے تم نے فائدہ اٹھایا اُن کو اپنی افسرگین
کے ملاحظہ پر مجبور کیا، اپنی داستان کی غم آفرینیوں سے اُن کو بیتاب الفت کرنا
چاہا۔ اپنے سیلاب چشم سے تم نے انہیں بتایا کہ تمہارے لئے سدا بہول محبت
کے اس جذبۂ اقتدار خواہی کو میں محبت کہنے کو تیار نہیں،

میں تو کبھی بھی گوارا نہ کروں کہ اونکی راحت میرے باعث مضمحل ہو، انکی رات
میری وجہ سے خواب محروم بنے، میرے آنسو اون کے اضطراب طبیعت کا عنوان
کہلائیں۔ لہذا تمہارا اعتراف جرم کئے لیتا ہوں " اچھا کیا جو یہ فقرہ تمہاری زبان سے
نکل گیا۔ ورنہ شاید مجھے تم سے کوئی حسن ظن نہ رہتا۔ محبت کرنا جرم ہے مگر اسی لئے
کہ اس سے ناکردہ خطا ایک بیگناہ معصوم متہم ہو جاتا ہے، کوئی حلیم یہ نہیں کہتا

کہ تم مجھے سرفراز رسوائی کرو، آپ کی ہی جسارت بیباک کسی کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر خود ہی آپ کی جستجوں کا کوئی ہدف ٹھہرتا ہے، فرمائیے اس سے زیادہ عالم اخلاق میں اور جرم کیا ہوسکتا ہے کہ آپ کا ایک ایسا خودسرانہ فعل کسی کی ناموس شرافت کو مجروح کرے اور اسپر بھی آپ قابل تعزیر نہ ہوں! اور یہی تو ہے وہ بات جو مجھے آجتک پھر تہمت کے حضور نہ لیجا سکی۔ اسلیئے کہ میں بھروسہ نہیں کرتا کہ دل کی فتنہ پروری مجھے ان کی تیغ نگاہوں تک ۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ سمجھ لینے پر بھی سبکت نہ ہونے دیگی! جیسا کہ آپ کو آپکا خیال ہے فریب ہے نگاہی، کیئے ہوئے ہے!! معاف کرنا تمہارے پندار الفت کی حقیقت ایک صدائے شکست ہوں، مگر پھر بھی میری آواز، نکات محبت کی ایک شرح ہے۔ دلپذیر جسکی تمہیں ہوا بھی نہیں لگی۔

تم کہتے ہو کہ تو ان سے ہمدردی نہیں کرسکتا، تو ان کی غمخواری کر،، سچ کہتا ہوں اگر تم اپنے اس فقرہ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتے تو کبھی اس طرح نہ کہتے میری زبان سے ایسی بات کیوں نکلی مگر رفع اعتراض کیلئے بیلئے کہتا ہوں مبتلائے آزار تو میں ہوں، دل پر تو میرے درد ہے، اب یہ تو ان سے خواہش نہ ہمدردی کی۔ انکو کیا غرض تھی کہ وہ کوئی ایسا درد مول لیتے، جسکے لیئے میری ہمدردی کی ضرورت ہوتی۔ یہیں سے تمہارے ہمارے عروج فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ رہا معاملہ غمخواری کا تو میری دانست میں یہ بھی ان کے قابل نہیں، اسکے بعد تم نے ایک نشتر اور بھی میرے عمیق جذبات میں اتار دیا ہے کہ "معشوق محبت کی پرواہ نہیں ہے تو انسانیت ہی کا فرض ادا کردو۔۔۔۔"،

عقیل! میری تو ساری عمر حق الفت کے احترام میں بسر ہوئی ہے مگر میں تو محبت کا بڑا حق یہ سمجھتا ہوں کہ سینہ امانت دار الفت بنا رہے اور کوئی کہ انکی پاسداری نہ گذرے، اس طرح کہ دل ذکر حبیب کرے اور حال کی پریشانی ان کی رسوائی کا سامان نہ بنے، یہاں سے بہک جانے والے تسلیم حقیقت سے بڑھ کر استحقاق کی حد میں جا پڑتے ہیں۔ یہاں سے "ایاز قدر خود بشناس" کی حد شروع ہو جاتی ہے، رہا انسانیت کا فرض ادا کرنا، تو عقیل صاحب معلوم رکھیئے کہ انسان مشتق ہے انس سے جس میں انس نہیں وہ

انسان نہیں، آدمی ہونا آسان ہے مگر انسان ہونا مشکل ہے۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ تکمیل انسانیت، اسی مکتب ادب میں ہوتی ہے، اب یہ تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہمارا عہد انسانیت کس حد پختہ و بلیغ ہے اور ہم نے کوئی سبق جو پڑھ لیا کبھی فراموش نہ کیا، مگر پرستش میری خاموش بیکسی کا عنوان ہے اور اعمال بندگی میری بیچارگیوں سے ظاہر۔

فرق یہ ہے کہ اونکی علالت تمہارے واسطے سوہان روح ہے مگر میرے واسطے موت کا پیغام، تم کو ایک تعلق روحی کے سبب خلش غم ہے اور میں اس عدم دعائے الفت کے باوصف اجل کی آمد محسوس کرتا ہوں۔

تمہیں اس بات کا شکوہ ہے، کہ تمہاری جانکاہیوں اور بے تابیوں کا مجھے کیوں علم نہیں۔ مجھے اسلئے شکر کا موقع ہے کہ خلش بے تاب کے ضبط پر اس قدر قدرت نصیب ہوئی، کہ موت کی ساعت قریب ہے ——"

آہ! نزہت تو اچھی تو ہو جا، اور اسلئے اچھی ہو جا کہ تجھ سے میرے دوست کے دعویات محبت ممنون تصدیق ہوتے ہیں، اچھا اسلئے نہیں تو اسی لئے اچھی ہو جا کہ بہت سی عشق آفرین ہستیاں تیرے دم سے مبتلائے پندار ہیں، ان کے جذبات دل کی بالیدگی، اگر تیری نوازش معمول کے تابع ہے، تو پھر کیا ہے یہ ثواب تو تعمیر کعبہ کی سنت ادبی سے کم نہیں —— اور اسلئے بھی نہیں تو صرف اسی واسطے اچھی ہو جا کہ تیری نسبت مسیحائی سے تو سارے بیمارستان غم کی غریب آرزوئیں وابستہ ہیں ——! ورنہ میری جو پوچھے تو تیری تندرستی میں پنہاں ہیں مصائب شگفتہ، اور بیماری ہے تحریک الم ناگوار، مفر نہ اس سے ہے اور نہ پناہ اوس سے، وہ مرجانا ہے جینے سے پہلے، اور یہ جینا ہے مرجانے کے بعد!!"

+ خلیقی +

اگرچہ یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے جسکا تعلق مہابھارت کی تاریخ سے ہے تاہم اسکو نہایت خوشی سے اپنے عنایت فرما مسٹر آصف علی بیرسٹر سے حاصل کرکے **تمدن** کے صفحات میں جگہ دیتے ہیں ہندوستان کے مایہ ناز فرزند مسٹر رابندرو ناتھ ٹیگور جنکی سحر طرازی کے آگے یورپ و امریکہ کے بہترین دماغ سربسجود ہوئے جسکا نوبل پرائز کی صورت میں خراج تحسین ادا کیا۔ ان کی شخصیت ہماری معرفی سے قطعی بے نیاز ہے۔ اس ادیب کے جواہر افکار کے ترجمے کیلئے یقیناً ایک خاص قابلیت کی ضرورت ہے۔ یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ مسٹر آصف علی صاحب نے جنکو ادبی دنیا سے روشناس کرانیکی ضرورت نہیں اسکام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ اور آپنے جس خوش اسلوبی سے چترا کو اردو کا لباس پہنایا۔ قابل داد ہے مگر جن حضرات کو ہندوستان کے اس بہترین شاعر ڈاکٹر رابندرو ناتھ ٹیگور کی تصنیفات دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ ان مشکلات کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ جو مترجم کو پیش آئی ہونگی۔

یہ لاجواب ڈرامہ چونکہ ذرا طویل ہے۔ اسوجہ سے ہم اسے بالاقساط شائع کریں گے۔

(ایڈیٹر)

دیباچہ

(از ملک الشعرا سر رابندرو ناتھ ٹیگور آف بنگال)

اس شعریہ نقل کو لکھے ہوئے کوئی پچیس برس ہوگئے۔ اور یہ مہابھارت کے ایک ذیلی قصہ پر مبنی ہے زمانہ کفارہ کی تکمیل میں ارجن بادیہ نوردی کرتا منی پور پہنچا۔ وہاں اسکی نگاہ راجہ چترواہن کی دختر والا صفات چترا انگدا پر پڑی۔ دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا اور راجہ سے شادی کا مستدعی ہوا۔ راجہ چتراواہن نے اس سے حسب نسب دریافت کیا۔ اور یہ سنکر کہ ارجن پنڈاروں کے خاندان سے ہے۔ اسے یہ [illegible] کہانی سنائی۔

"ہماری منی پور کی شاہی خاندان میں شیو نے ہمارے ایک مورث اعلیٰ کو ایک برت دیا کہ اولاد

محروم رہے۔ ہو سکے اولاد کی خاطر منتیں مانیں اور ریاضتیں کیں۔ اس پر شیو دیوتا نے خوش ہو کر منت قبول کی اور ریاضتوں کے صلے میں ہمارے خاندان کو اولاد بخشی۔ حسن اتفاق سے اولاد ہمیشہ نرینہ ہوتی گر پہلے پہل میرے ہاں لڑکی ہوئی کہ جس سے میرے خاندان کا نام چلیگا۔ چنانچہ میں نے اسے مثل فرزند سمجھا اور وارث تاج و تخت بنایا۔ میرے خاندان کا نام چترانگاد سے باقی رہے گا۔ چنانچہ میں اس شرط پر شادی پر رضامند ہوں کہ اس کی اولاد میرے خاندان کا نام قائم رکھے۔ اور اس شرط پر تمہیں بیوی مبارک ہو۔

ارجن نے شرط منظور کی۔ چترا سے شادی رچائی۔ اور اپنے خسر کے دارالسلطنت میں تین برس تک رنگ رلیاں منائیں۔ مگر اولاد ہوتے ہی بیوی سے گلے مل خسر سے اجازت حاصل کر پھر سیر و سیاحت کو نکل کھڑا ہوا۔

چترا
ناٹک

خدایگان

مدن - خدائے عشق

بسنت - خدائے موسم

خاکپایان -

ارجن خاندان کرو کا شہزادہ ذات کا کھتری یعنی جنگجو اور اس وقت نقل میں ایک جنگلستانی حالت میں ہے۔

چترانگاد منی پور کے راجہ چترواہن کی لڑکی۔

منی پور کے اضلاع کے چند گاؤں والے۔

ایضاً مترجم

چترا

محل اوّل

چترا۔ کیا آپ ہی ہیں پانچ تیر والے دیوتا، شاہ عشق؟

مدن۔ میں ہی ہوں کہ روز اول خالق کے دل میں پیدا ہوا۔ میں ہی ہر مرد و زن کو تکلیف و راحت کی زنجیروں میں کستا ہوں۔

چترا۔ جی ہاں اُن تکالیف و سلاسل کی خوب خبر ہے.... مگر والا درجت آپکی تعریف؟

بسنت۔ میں ان کا ہمدم سلطان موسم ہوں۔ اگر میں فضا اور فرسودگی سے دست و گریباں نہ رہوں، اور ان کے تعاقب سے باز آجاؤں۔ تو یہ دنیا کے استخوان پر پوست تک نہ چھوڑیں میں شباب لازوال ہوں۔

چترا۔ نیاز مجرا عرض ہے۔

مدن۔ مگر اے خوبرو اجنبی ترکس عہد شدید کا پابند ہے۔ جبر و ریاضت سے کیوں اپنی جوانی اور تازگی پژمردہ کئے دیتا ہے۔ یہ ایثار بندگی عشق کے لئے نازیبا ہے۔ آخر تو کون ہے اور کیا مراد رکھتا ہے۔

چترا۔ میں منی پور کے خاندان کی شاہزادی چترا ہوں عنایت معبودی سے خدائے شو نے میرے جد امجد سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کے ورثا کے ہاں مسلسل اولاد نرینہ ہوتی رہے گی۔ ہوں تو میں عورت مگر یہ زنطرت کا رو گر یہ تقاضا تھا، کہ قدرت کہ بانی بھی اس شررِ حیات کو، جو میری ماں کے شکم میں تھا تبدیل کرنے سے قاصر رہی۔

مدن۔ خوب بھی کہا۔ جب ہی تیرے باپ نے تجھے بیٹے کی طرح اٹھایا اور کمانداری کا فرائض خسروی سے بہرمند کیا۔

چترا۔ جی ہاں جب ہی تو میں نے مردانہ لباس اختیار کیا، اور پردہ کی چار دیواری ترک کی۔ دل اسیر کرنے کے طریقوں سے قطعی بے بہرہ ہوں۔ بازوؤں میں کمان زہ کرنے کی قوت موجود ہے مگر الفت کے کمان ابرو یعنی ناوک مژگاں کا استعمال نہ آیا۔

مدن۔ اے گلعذار، یہ محتاج تعلیم نہیں۔ آنکھ بے سکھائے اپنا کام کرتی ہے۔ اور تیر نظر کا بے خطا ہونا کسی زخم خوردہ دل سے پوچھیے۔

چترا۔ ایک دن۔ میں تمنائے شکار کی تلاش میں دریائے پورنا کے کنارے جنگل میں جا نکلی۔ گھوڑے کو ایک درخت کے تنے سے باندھ کر، ایک ہرن کے نشان پر ایک گنجان بن میں گھس گئی۔ ایک پتلی پگڈنڈی پیچ در پیچ نظر آئی، جو غلطاں و پیچاں شاخوں کی جھرمٹ میں سے ہو کر گذرتی تھی۔ بن کے جھینگر کی جھنکار سے پتوں میں ایک رعشہ کا سا عالم تھا۔ یکایک۔ میں ایک شخص کے قریب آ نکلی۔ وہ خشک پتوں کے ڈھیر پر راستہ کے اوپر پڑا تھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ راستہ چھوڑ دو۔ مگر اس نے کچھ التفات نہ کی۔ اسپر میں نے اسے اپنی کمان کی تیز نوک سے، بہ تحقیر ٹہوکا دیا۔ اس پر تو وہ ہاتھ پاؤں سنبھال کر یکایک اس طرح کھڑا ہوا کہ جیسے آگ میں سے شعلہ۔ ہاں۔ مگر لبوں پر ایک قسم کا انبساط آمیز تبسم۔ شاید میری مردانہ قطع پر۔ اس گھڑی عمر بھر میں پہلی مرتبہ میرے دل میں اپنے جنس کے جذبات موجزن ہوئے۔ اور سامنے کھڑے ہوئے مرد کو میں نے مرد سمجھا۔

مدن۔ اس نیک ساعت میں، ہم مرد و زن مجھ سے یہ اعلیٰ سبق سیکھتے ہیں۔ اور اپنی جنس کے خصوصیات سے واقف ہوتے ہیں۔ اچھا تو پھر کیا ہوا۔

چترا۔ میں نے ہراس اور حیرت آمیز لہجہ میں پوچھا صاحب آپ کون ہیں۔ جواب ملا۔ میرا نام ارجن ہے، اور میں کورو کے خاندان سے ہوں۔ سنتے ہی میں بت ہو گئی، اور مجرا کرنا بھی بھول گئی، تحیر میں مستغرق تھی، کہ یہی ارجن میری امیدوں، اور آرزوؤں کا مرجع ہے، برسوں ہوئے، سنا تھا کہ ارجن نے بارہ برس تک نا کتخدا رہنے کا عہد کیا ہے۔ کم سنی میں بارہا حوصلہ نے خیال کو مہمیز کیا کہ ارجن سے دو دو ہاتھ رہیں، اور بھیس بدل کر اسے دست بدست زور آزمائی پر مجبور کیا جائے۔ اور فن سپہ گری میں نیچا دکھا کے چھوڑا جائے۔ مگر اے دل ناداں وہ تعلّی کیا ہوئی؟ کاش آج میرے نوجوانی کے تمام خواب و خیال کو دیتی جو یہ حاصل ہو۔——

جوارجن کے پارس کی خاک کو نصیب ہے، تو میں نے سے ہی معراج تصور کروں جیسا اسے عقل سے محو دیدہ دل، نہ تو ارجن سے سلام و کلام ہی کیا اور نہ اوس سے عفو کا خواستگار ہوا۔ صنف میں تجھ سے بے بہرہ گم صم کھڑی رہی اور وہ حقارت آمیز نظر ڈالتا آگے بڑھا ...... دوسرے دن صبح ہوتے ہی میں نے مردانہ لباس پھینک، ہاتھوں میں چوڑیاں۔ پاؤں میں جھانجن، کمر میں زنجیر باندھ۔ ایک شفتالو ریشمی جوڑا زیب تن کیا۔ خلاف عادت لباس عرق شرم میں ڈوبے ہوئے جسم پر کسا ہوا تھا۔ مگر میں اپنی جستجو میں قدم بڑھائے رودبار ہی اور ارجن کو جنگل میں شیو کے شوالے میں جا لیا۔

مدن۔ میں اس قصہ کو اول سے آخر تک سننے کا مشتاق ہوں۔ میں خود خدائے دل آفریدہ ہوں، او انسانی جذبات کے راز سے خوب شناسا ہوں۔

چترا۔ بس صرف ایک خواب سا باقی ہے۔ کہ کیا کہا اور کیا سنا، کل کیفیت نہ پوچھئے۔ شرم برق کی مانند مجھ پر گری مگر وہ سخت جان ہوں کہ اس سے بھی کوئی آسیب نہ پہنچا۔ میری ہیأت مردانہ ہے۔ چلتے ہوئے اسکے آخری الفاظ میرے کانوں میں ہکتی ہوئی سوئیوں کی طرح چبھے۔ میں نا کتخدا رہنے کا عہد کر چکا ہوں۔ تم سے شادی کرنے سے معذور ہوں" اللہ رے مردوں کا قول! اگر اے خدائے عشق تجھ پر تو عیاں ہے کہ لاتعداد زہاد و عباد نے اپنی عمر بھر کی ریاضت آن کی آن میں عورت کے قدموں پر نثار کر دی ہے۔ میں نے کمان کے دو ٹکڑے کر، بھڑکتے ہوئے شعلے کے حوالے کئے مجھے اپنے قوی اور ورزشی قبضے دیکھ کر، جو کمان زور کر کے بنائے تھے، سخت افسوس ہوا۔ اے عشق، اے خدائے عشق، تو نے میرے مردانہ قوت کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ میری مردانہ تربیت خاک ہوئی، تیرے زیر قدم ہے۔ اب تو مجھے اپنے درس سے بہرہ ور کر۔ بس اب تو مجھے بے بل کا بل، اور غیر مسلح کا ہتیار چاہیئے۔

مدن۔ اچھا اس وقت سے میں تیرا دوست ہوں۔ اور جہانگیر ارجن کو تیرے سامنے اسیر کر کے، لا کھڑا کرونگا، تاکہ وہ اپنی سرکشی کی سزا خود تیرے ہاتھوں سے پائے۔

چترا۔ کاش مجھے کافی وقت ملے، تو میں خود ... رفتہ رفتہ اسکا دل ہاتھ میں لیلوں

اور یوں تا ازل کسی امداد کی بھی منت کش نہ ہوں۔ میں اسکی قوت بازو بنکے۔ پہلو بہ پہلو رہتے اسکے جنگی رتھ کے منھ زور گھوڑے ہانکوں۔ دلبستگی سیر و شکار میں اسکے ساتھ ہوں۔ شب کو اسکے خیمہ گاہ کے دروازہ پر پہرہ دوں، اور چھتریوں کے تمام اہم فرائض کی ادائگی میں اسکی ہمرکاب رہوں۔ بے مددگاروں کی حمایت کروں۔ اور حقداران انصاف کے ساتھ معدلت گستری سے پیش آؤں، آخر ایک نہ ایکدن تو اسکی توجہ میری طرف مبذول ہووے ہی گی۔ متحیر ہوکر پوچھے گا کہ آخر یہ کون نوجوان ہے۔ کیا میرا کسی سابقہ زندگی کے ہمدم میں سے۔ میرے نیک اعمال کی مانند، اس زندگی میں بھی میرا ازلی ہمدم ہمراہی ہے؟

میں ان میں سے نہیں ہوں کہ عزلت و خاموشی میں اپنے غم کو ہمدم بنائے بیٹھی رہتی ہیں، شب کو، غذائے اشک دیتی ہیں، اور دن کو ہمیشہ پس نقاب، زہر خندہ رکھتی ہیں یہ اُن بدنصیب عورتوں کا معمول ہے، جو روز ازل سے، بیوہ اتری ہیں۔ میری آرزوؤں کا پھول تا وقتیکہ ثمردار نہ ہو ہرگز خاک سے ہم آغوش نہ ہوگا۔ مگر اپنی اصلیت کو آشکار اور کسی کو قدر و منزلت سے آگاہ کرنے کے لئے، ایک عرصہ درکار ہے۔ اس لئے اے خدائے تیر افگن عشق، اور اے بسنت۔ نونہال خدائے بہار و خزاں، میں تمہارے در پر فریاد لائی ہوں۔ اس نا انصافی ازل، اس پھیکے پن کو میرے نوخیز تن بدن سے دور کر دو، اور جس خوبی سے میرے دل میں نوری عشق کا پھول کھلایا تھا، اسیطرح ایک دن بھر کے لئے، میرے تن بدن کو دلربا حسن سے شگفتہ کر دو، باقیماندہ ایام کی جوابدہی میں خود کر لونگی،

مدن - اے خاتون، تیری دعا قبول ہوئی۔

بسنت - اور نہ صرف دن بھر کے لئے، بلکہ پورے سال بھر، موسم بہار کے غنچوں کی دلفریبی، اور نزاکت تیرے دست و پا سے ہمکنار رہے گی

(باقی آئندہ)

بوسۂ ندامت

ایک غلطی کے بعد

اے رنگین، مہ پارہ کی صورت، نیلی آنکھیں، شام سے میرا دل بے چین کر رہی ہیں۔ آہ وہ پھول سے رخسار، مجھکو تباہ کر گئے۔ مار گئے۔ دل تجھکو ڈھونڈھتا ہے۔ آنکھیں تجھے تلاش کرتی ہیں!!!

اے حسینہ مجھ پر رحم کر۔ میرے گلے میں اپنے ہاتھ ڈالدے، آ! اے مہوش میرے قریب آ اجازت دے کہ میں اس مہ جبین صورت کو سجدہ کروں۔ منہ سے بول۔ اے مہوش میری التجا قبول کر رات آدھی سے زیادہ گذر چکی۔ حکم دے کہ رات کا بقیہ حصہ، وہ وقت جب تک بلبل خوش الحان صبح کا پیغام دے، تیری خدمت میں گذار دوں۔ جواب دے۔ اے آسمانی حور۔ مجھ پر کرم کر۔ میں مسافر ہوں، مہمان ہوں، طالب تیری عنایت کا۔ جویا تیری محبت کا، قیمت بتا۔ اے حسن فروش ان نظروں کی، ان گلاب سے ہونٹوں کا معاوضہ، ان ظالم آنکھوں کی نذر۔ دیکھنے دے جی بھر کر قبول کر۔ جلالے۔ زندہ کرلے۔

شراب کا دور شروع ہوگیا۔ حسینہ کی قاتل آنکھیں سرمگیں ہوکر اور بھی سفاک ہوگئیں۔ دو بج چکے تھے۔ چشم سرمگیں نشہ میں چور، نیند سے مجبور ہوئی۔ زلف سیاہ میرے ہاتھ پر لہرائی۔ اب حسینہ کا سر میرے زانو پر تھا۔

قدرت اس صنعت پر ناز کرسکتی ہے۔ یہ ایک پھول ہے۔ بھونرے اسکے گرد جھومتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں ان نازک لبوں پر بھنبھناتی ہیں۔ ہوا ان کالے ناگوں سے کھیلتی ہے۔

اس باغ کا ہر پھول خوش نما تھا۔ ایک ادھیڑ عورت کے شکوے شکایتوں میں بسر کرنے والا انسان، آج دنیا کی جنت میں ہوں۔ خوش ہوں۔ اب کوئی ارمان نہیں!

ہوشیار نہ ہو، اے حسن کی دیوی، آنکھ نہ کھول۔ اجازت دے کہ ان شگفتہ پھولوں کو سر پر رکھوں۔ آنکھوں سے لگاؤں۔

تیں نکل رہے تھے، حسینہ نے آنکھ کھول لی، ایک بجلی تھی چمکی، اور چمک کر گر گئی، دل اور جگر دونوں تڑپے، ایک کشش تھی، جذبۂ فطرتی، جس نے ان نیم وا آنکھوں تک پہنچا دیا، موتیوں کا آبشار پہاڑ کی چوٹیوں سے گر رہے تھے، ایک ہلکا سا رو سا اور چلا، اور چشم نرگسی مست ہو کر بند ہوئی، پھر وہی زلف سیاہ میرے ہاتھوں پر تھی،

زندگی کا انتہائی مقصود، دنیا کی بہترین کامیابی، یہ مجسم حسن، دو گھنٹہ کا اور میری آنکھوں میں مہمان ہے یہ جگنو مالا جو اس کھلے ہوئے سینہ پر لوٹ رہی ہے محافظ ہے ....

گمراہ! صبح کا پیغام لے آئی، بالیوں کے پھول باسی ہوئے، زیور ٹھنڈا پڑ گیا، کیسا اچھا وقت اور تاروں بھری رات ہے، کاش باقی عمر اس صورت کی پرستش میں بسر ہوتی،

مملکت حسن پر سکہ چلانے والی، ملکہ بیدار ہو، ایک نو وارد تیرے دربار میں حاضر ہے، تیری حکومت کا مداح تیری سلطنت کا معترف،

یہ چند لمحے کی کھلی ہوئی کلی، ایک دریائے لطافت ہے، جو لہروں سے رہا ہے، گلاب بدن کے دو پھول، دونوں آنکھیں کنار دریا پر جھوم جھوم کر اپنا منہ چوم رہی ہیں، ہوا ان کو مسرور کر رہی ہے، ایک عالم بیخودی ہے، اور اس تصویر کا ہر عضو دوسرے عضو کا دلدادہ، تحیر میں بے ہوش،

پانچ بج رہے تھے، ہاتھوں کے گجرے مرجھا چکے تھے، مگر مہک باقی تھی، اور میرے مضطر دل پہ تیر برسا رہی تھی،

حسینہ نے پھر آنکھ کھولی، ایک انگڑائی لی، اور خاموش ہو گئی، اب وہ شراب جس نے رات بھر ساتھ دیا، زہر تھی، وہ جام، تمام رات آگے بڑھنے کو جھکے، منت کر رہے تھے، سر پاؤں پر تھا، اور ایک جام کی التجا، تمام میری حالت اس پر آشکارا تھی، مگر حسینہ کا پتھر دل موم نہ ہوتا تھا،

ظالم حسینہ اتنا ظلم نہ کر، میں بے گناہ ہوں، میں نے معاوضہ دیکر بھی اپنے ہاتھ کو اس قابل نہ سمجھا کہ اسے میں تجھے ہاتھ لگاؤں، میرے ارمان، میری امنگیں، اب تک میرے دل میں ہیں، اور دل تیری نزاکت کا قتیل، حسینہ! میں نے رات بھر تیری پرستش کی ہے، کیا میں اتنی محنت کا مستحق نہیں ہوں کہ گو صبح ہو گئی مگر ایک آخری جام ....

"جو وقت تم نے مقرر کیا تھا، وہ پورا ہوا، اگر تم، اور روپیہ دے سکو تو میں حاضر ہوں ورنہ ایسے ایسے عاشق روز آتے ہیں، اور جلتے ہیں، تڑپتے ہیں، اور مر جاتے ہیں۔

وعدہ، یہ فقرے ختم ہوئے۔ اور ادھر حسینہ بجلی کی طرح سامنے سے نکل گئی۔

او بے وفا آنکھوں والی حسینہ! میرے پاس صرف یہ دو روپیہ اور ہیں، ایک دفعہ پھر ان آنکھوں کی زیارت اور کرا دے۔

ان ہی قاتل آنکھوں کا صدقہ، چند لمحہ میرے پاس بیٹھ جا، بہتر ہوگا، آپ پھر تشریف لائیں، مجھے اسوقت ایک اور صاحب سے ملنا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ سات بج رہے ہیں، صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ اس میں مجکو نہانا بھی ہے اگر آپ بھی ہو سکتے ہیں، اور ....

اچھا رخصت

اے مہ جبین ایک روپیہ اور موجود ہے، دو سے شکل دکھا دے کہ، ایک دفعہ قدرت کے اس صحیح نظارہ، تیری آنکھوں کو، اور دیکھ لوں،

مجھے حاضر ہونے میں کیا عذر ہے مگر روپیہ ....آپ کہہ رہے تھے،... تم نہایت دھوکہ باز آدمی ہو، مجھے ملا اور حیران کیا،

تو ... مجھے زیادہ بات کرنے کی فرصت نہیں، اے ظالم آنکھیں میری آنکھ سے اوجھل ہوگئیں، ایک دفعہ اور پرستش کی کوشش کی، مگر بے سود، صدائیں بے کار، گریہ و زاری فضول تھی، صحبت خواب، اور وہ باتیں خیال ہوگئیں، رات کا سماں آنکھوں میں تھا، مگر جس وہم کی رزق تھی اس کا نشان نہ ملتا تھا، دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی، وہ سیلی ستوالی آنکھیں، جو رات بھر ڈنک کرتی رہیں، نظر نہ آتی تھیں، بیہوشی، ہشیاری، منت، گریہ و زاری، بہت سی کیفیتیں گذر گئیں، لیکن بے وفا حسینہ اگر نہ پھرنا۔ اس لئے کہ جیب خالی تھی۔ اور محبوب حسن و عشق شیدائے زر تھا،

دوپہر کے قریب۔ جب حالت زیادہ خراب تھی، اور دل بے ساختہ، سجدۂ ہوش کی صدا دے رہا تھا، ایک سیہ رو، ہجڑا، سامنے آیا، اور کرخت آواز سے کہا۔

"بہتر ہوگا کہ تم فی الفور یہاں سے عارت ہو جاؤ" چلو، چلو، اٹھو، نکلو،

کیسا ظالم، ملک الموت، وحشی، بے تہذیب، سنگدل، روسیاہ تھا، ہم پھر بھٹکنے دیئے

اور یہ جسد خاکی، تڑپتا، پھڑکتا، ایک سمت روانہ ہوا۔

دل جیسے کا کلمہ پڑھ رہا تھا، اور زبان عالم خیال میں، اس حسن خداداد کی داد دے رہی تھی، نزع کی کیفیت تھی، جنگلوں کی خاک چھانی، باغوں میں ٹکریں ماریں، مگر کسی طرح تسکین نہ ہوئی، کائنات کی ہر شئے، حسینہ کی یاد تازہ کر رہی تھی، دن اسی حالت میں بسر ہوا، شام کے قریب سبب اطمینان کی کوئی صورت نظر نہ آئی، رات کا مہیب خیمہ سر پر آ پہونچا، تو اس توقع پر کہ شاید کچھ نقدی میسر ہو جائے، اور رات بھر حسینہ تک پہونچا دے گھر کا رُخ کیا،

کمرے کے نیچے آزادی کا لطف اٹھا رہے تھے، اور عصمت کی بیکس دیویاں کچھ رانڈیں، کچھ زمانہ کی ماریاں، بر قعے اوڑھے، بنیوں کی دوکانوں پر، سودا سلف خرید رہی تھیں، اب ایک دوسرا عالم تھا یہ چاند کے ٹکڑے، ظاہری آنکھوں میں بدنما، بے عزت، بے غیرت، مفلس تھے، لیکن چشم بینا ان کی رونق تماشہ دیکھ رہی تھی، گھر کے پاس، فالسہ والا جھیبے لئے بیٹھا تھا، اور بچے چاروں طرف جمع، ان میں ایک میری پانچ برس کی معصوم بچی، جو قدرت کی امانت، اور چند روز کی میری پاس مہمان تھی، اسلئے کہ اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ کھانے والے بچوں کا منہ مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی، اس نے مجکو دیکھا دیکھ کے ڈرے سہم گئی، اور لرز کر بھاگی، مگر اسکی خوف زدہ آنکھیں میرے کان میں یہ کہہ گئیں، سنگدل باپ تیری رات آنکھوں کی پرستش میں، اور ہماری رات فاقہ میں، بسر ہو گئی، گھر میں پہونچا تو پاکدامنی کی حور، جس نے صورت دیکھتے ہی دوپٹہ سنبھال کر اوڑھا، اس قیامت خیز گرمی میں چولھے کے آگے بیٹھی روٹی پکا رہی تھی، کپڑے چکٹ تھے۔ پسینہ بہہ رہا تھا، بچہ گود میں لیٹا دودھ پی رہا تھا، اور بدنصیب ماں اپنی اس لازوال دولت پر زندگی کی تمام خوشیاں قربان کر رہی تھی، یہ خاص حالت، میرے استقبال کو آگے بڑھی، اور باواز بلند کہا، بازاری آنکھوں کے بندے، غور کر، ہماری رات کس طرح صبح ہوئی ؟

اسکی صورت زہر تھی، جن آنکھوں نے قدرت کے لاجواب حسن کی بہار لوٹی، جو آنکھیں اس مجسمہ کی منتظر تھیں، اس دیوی کے درشنوں کی پیاسی، اس محبوب ... کی متلاشی، واقعات کے ان مظالم کو دیکھ کر، اور اس مکروہ صورت پر پڑ کر، نفرت سے بھاگیں، دہشت سے علیحدہ ہوئیں، لیکن

عفت کا وہ بیش بہا جوہر جو بار بار چھپانے پر بھی چمک رہا تھا، تسکین کو اٹھا، اور اس آسمانی چہرے نے دستر خوان بچھا کر کھانا چنا، سر کے وہ چند بال جو سفید ہو چکے تھے، اور ہماری ابتدائی عمر کے ہمراز تھے، کچھ کہنے لگے: ہائے! "ہم تیرے ظلم کے شکار... اور ہمارا جسم تیرے ہاتھوں برباد ہوئی، میری آنکھیں بند تھیں، اور میں کوشش کر رہا تھا کہ یہ وہ صورت نہ دیکھنے اور وقت آئے کہ پیٹ بھر کر اس حسن سے جس کی اجرت دس روپیہ سے کم تھے بدلے، میں روپیہ کا مشتاق تھا، اور یہ گھڑی ایک سال اور ہر لمحہ ایک پل تھا کہ روپوں کی جھنکار میرے کان میں آئی۔

میری نا اُمیدی امید سے بدل گئی، میری حسرتوں نے ترقی اور ارمانوں میں اضافہ ہوا۔ میں نے آنکھ کھولی، روپیہ میرے سامنے تھے، اور یہ الفاظ کان میں:-

"کیا آج بھی باہر سوؤ گے"

میں نے دل کڑا کیا۔ اور ایک پوری نظر اس صورت پر ڈالی۔

مقابلہ گھر والی، اور بازار والی عورت کا تھا، وہاں زلف سیاہ، آراستہ و پیراستہ ناگن کی طرح ڈس رہی تھی، یہاں سر کے بال وہ بھی کھچڑی۔۔۔۔ میں نے منہ پھیر لیا مگر ان باتوں نے اثر کیا۔۔ اب یہ صورت جو بگڑ چکی تھی، اپنی اصلی تصویر میں میرے سامنے آئی، اس نے عمر میرے ساتھ بسر کی تھی، اور میرے ہی گھر میں، میرے اوپر جوانی کی دولت مٹا چکی تھی، اس وقت آنکھیں اس حالت کا پتہ دے گئیں، جب سب سے پہلے سامنے ہوئی تھیں، اور گھر کے چپہ چپہ نے کہا، یہ عفت و عصمت کا وہ سدا بہار پھول ہے جو فنا ہونے کے بعد بھی اپنی مہک تمام خاندان کو معطر رکھے گی، جس نے اپنا ظاہری حسن تجھ پر فدا کیا، اب بے اعتنائی کا مستوجب بنے؟ اس وقت کج ادائی شیوۂ انسانیت نہیں، یہ گلاب مرجھا کر، اور رنگ لایا ہے، اس کی خوشبو تیز ہوئی، اور اس کا حسن دوبالا ہو گیا!

یہ سنکر آگے بڑھا۔ اور عمر بھر کا ہمراز۔ آنکھوں کو بوسہ دیا، یہ ظاہر یہ جذبہ نفرت تھا مگر درحقیقت افعال گذشتہ کی ندامت جس میں یہ عہد شامل تھا کہ اب صرف موت ہم دونوں کو جدا کر سکتی ہے" +

راشد الخیری دہلوی

ملکی آبادی

ہمارے کرمفرما جناب سید رؤف علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا ایک اقتصادی پر کمر ترتیب دے رہے ہیں جو بلحاظ اپنی اہمیت کے ایک نہایت مفید کتاب ہوگی۔ ذیل میں ہم اسی کتاب کا ایک باب جو "ملکی آبادی" کے ماتحت ہے درج کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس مضمون کو موضوع کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے گا (ایڈیٹر)

عنوان بالا پر بحث کرنے کے لیے ایک باب مخصوص کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہم کو محسوس ہوئی کہ اکثر اخباروں میں نہایت وثوق کے ساتھ لکھا دیکھا ہے کہ کسی ملک کی اقبالمندی کا پتہ اسکی آبادی کی بعد ترقی ہوئی اس سے بخوبی مل سکتا ہے نہ صرف اخباروں میں اس قسم کے سراسر بے بنیاد اور غلط خیالوں کا اظہار کیا جاتا ہے بلکہ اس وضع کے کلمات ان لوگوں کے منہ سے بھی سننے میں آتے ہیں جنکی رائے اکثر دنیوی معاملات میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے بعض آدمی تو اس طرح زور دیکر آبادی میں بڑھوتری کو ملک کی ترقی اور اقبالمندی پر محمول کرتے ہیں کہ گویا ان کے ذہن میں تمام ملک کی بہتری اور قومی ثروت کے جانچنے کا اس سے بہتر کوئی اور معیار ہونا امکان سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک میں امن و امان ہو لوگ بظاہر اپنی حالت پر قانع ہوں اور کسی خاص قسم کا شور و غل نہو بلکہ ہر شخص اپنے اپنے کام میں خاموشی کے ساتھ مصروف ہو اور اسپر آبادی میں ہر دس برس بعد اضافہ ہوا کرے تو سطحی حالات پر نظر کرنیوالے یہی نتیجہ نکالیں گے کہ ملک میں دولت ترقی پذیر ہے اور باشندے چین آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض نئے ملکوں میں جن کے بڑے بڑے وسیع رقبے غیر آباد پڑے ہیں مثلاً آسٹریلیا وغیرہ آبادی کی زیادتی قومی بہبودی اور دولتمندی کی نشانی ہے کیونکہ وہاں جتنی آبادی زیادہ ہوگی اتنے ہی زیادہ قوم میں محنت کرنے والے بڑھیں گے اور چونکہ ہزاروں لاکھوں ایکڑ زمین ابھی بے کار پڑی ہے اسپر آبادی کا یہ نیا حصہ محنت کرکے قوم کے لیے زیادہ دولت پیدا کریگا مگر ہمارے ملک ہندوستان میں حالات اس سے بالکل مختلف حالت ہے۔ پچھلی آدھی صدی میں ایک کثیر

تعداد بڑھ گئی ہو لیکن ملک کی دولت میں آبادی کی ترقی کے ساتھ نسبتاً مطلقاً اضافہ نہیں ہوا بلکہ اہل ہند کی بود و باش کا معیار گھٹ گیا۔ خدا کے لاکھوں بندے جو طاعون سے بچے ہیں فاقوں اور بھوک کے مارے مرتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ اگر ایک فصل اچھی ہو تو کم از کم دوسری فصل تک انتظار کرنے کے لئے گزران کر سکیں۔ اور ملکوں کے غربا کا یہ قاعدہ ہے کہ جب برا وقت آن کر پڑتا ہے تو عیش و عشرت کی اشیا کو جنکا پہلے استعمال کیا کرتے تھے ترک کر کے ضروریات زندگی خرید لیتے ہیں لیکن ہمارے ملک کے بدقسمت کسانوں کے پاس کبھی اچھی سے اچھی فصل میں بھی اتنا اثاثہ نہیں ہوتا کہ اوروں کی طرح عیش و عشرت کے سامان سے فائدہ اٹھانے کا خیال تک دل میں گزرے۔ جب عمدہ سے عمدہ موسم میں وہ بیچارے جوار باجرا کھا کر اپنی بسر اوقات کرتے ہیں اور دونوں وقت اس قسم کے چھوٹے موٹے اناج سے اپنا پیٹ بھرنے کو ہزار نعمت تصور کرتے ہیں تو بھلا بری گھڑی میں کونسی ایسی فضول چیز ہے جس کو چھوڑ کر پیٹ پال سکیں۔ مسٹر نوسٹ اپنی کتاب میں انکی بابت یہ الفاظ تحریر کرتی ہیں "لوگ حیات انسانی کے سب سے ادنےٰ درجہ پر رہ کر زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کے لئے اس سے ایک اور درجہ نیچے جانے کے یہ معنی ہیں کہ قحط میں مبتلا ہو کر فاقے مریں۔ اسلئے یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں آبادی کی ترقی بنفسہٖ اقبال مندی کی علامت نہیں" بلکہ ہندوستان پر آدم سمتھ کی کہاوت صادق آتی ہے کہ ایسے ملک میں جتنی زیادہ آبادی بڑھے گی اتنی ہی زیادہ عام لوگوں میں تنگدستی اور مفلسی زیادہ ہوگی۔ موجودہ حالت میں اسوقت تک ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی جبتک کہ ان کے لئے ایسے اسباب نہ مہیا کر دئے جائیں جن سے عملاً آبادی کی ترقی مسدود ہو جائے اور اسی طرح جتنی زیادہ دولت ملک میں پیدا ہو وہ لوگوں کا معیار زندگی بڑھانے میں کام آئے۔ اس مقصد کے لئے جو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں ان میں سے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ غربا میں آرام و آسائش کے ساتھ بسر اوقات کرنے کی تعلیم دیجائے یعنی ان میں یہ خیال پیدا کیا جائے کہ دنیا میں فقط زندہ رہنا کوئی بڑی نعمت نہیں ہے بلکہ آرام اور عزت کے ساتھ زندگی گزارنی اصل نعمت ہے۔ فی الحال تو اتنا ہی مقصود ہے کہ آزادی گزران کیا جھونپڑی کیا میدان ہو اور معیار زندگی بڑھ جانے سے ازدیاد آبادی کا خوف خود بخود انسداد ہو جائے گا کیونکہ تجربہ سے

اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی ملک میں لوگوں کا طریقہ رہائش اعلیٰ پیمانہ پر ہو جائے تو آبادی میں اتنی کثرت نہیں ہوتی جس سے اوروں کے لیے روٹی کے لالے پڑ جائیں اور اگر ایک دفعہ مفلوک الحال گروہ میں آرام اور عزت کی زندگی بسر کرنے کا چسکا پڑ جائے تو اغلب ہے کہ پھر وہ اسپر قائم رہنے کی کوشش کرینگے اور اپنی پہلی پستی پر دوبارہ رجوع نہ ہونگے۔ اس مضمون پر ایک مشہور تمدنی عالم مسٹی برکارڈ کہتا ہے کہ بنی نوع انسان کے سچے خیرخواہوں کا یہ فرض ہے کہ ہر ملک کی صنعتی آبادی میں طرز معاشرت کو اعلیٰ پیمانے پر پہونچائیں تاکہ انہیں زندگی کا لطف اٹھانے کی ہوس پیدا ہو اور جس طرح بھی ہو سکے اس طرح ان لوگوں کو لطافت زندگی بہم پہونچانے کی ترغیب دینی چاہیئے لیکن ان میں یہ شوق پیدا کیا جائے کہ جائز وسائل سے ضبط کے سامان مہیا کریں۔ اگر اس مقصد میں کامیابی ہو گئی تو کثرت آبادی کا کافی علاج ہو جائے گا۔ انگلستان کی کاشتکار آبادیوں میں جو آسائش سے رہتے ہیں انہیں بہار زندگی کا پورا لطف اٹھانے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور اس سے جو ملک کی مالی حالت میں ترقی ہوئی ہے وہ اظہر من الشمس ہے چنانچہ بقول مسٹر نوسیٹ انگلستان کی نئی پود اپنے باپ دادا کی طرح ایک جگہ رہ کر مصیبت کی زندگی بسر کرنا پسند نہیں کرتی یہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تلاش معاش کے لیے جاتے ہیں اور کسی اور قسم کی تجارت کو ننگ خاندان نہیں تصور کرتے۔ یہاں کے مزدوروں کا جو پچھلے پچاس برس میں معیار زندگی اعلیٰ پیمانے پر پہونچ گیا ہے اسکی کئی وجوہ ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ ۱۸۷۰ء میں لازمی تعلیم کا قانون پاس ہونا تھا۔ یہ ایک فطرتی اصول ہے کہ جب عوام تعلیم یافتہ ہونگے تو انکی ساری قوت بہترین زندگی بسر کرنے کی طرف خرچ ہوگی اور اس کوشش میں تمام ملک کا معیار معاشرت بڑھ جائے گا۔ تعلیم کے جہاں اور مفاد ہیں [illegible] جرائم کی کمی اخلاقی ترقی۔ قومی حسیت کا پیدا ہونا وغیرہ وہاں تمدنی پہلو [illegible] بڑا فائدہ یہ ہے کہ ملک کی مالی حالت میں ترقی ہوتی ہے اور کثرت آبادی کی روک تھام [illegible] جسکی وجہ سے لوگ اپنی مدت زیست آسایش کے ساتھ گزار دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ مزید برآں جیسے کہ اوپر بیان ہوا تعلیم کے اثر سے مزدوروں کی عقل و فہم بھی صیقل ہو جاتی ہے اور وہ اپنا کام زیادہ صفائی اور کمال کے ساتھ انجام دینے لگتے ہیں جسکا لازمی نتیجہ

یہ بات مشاہدہ ہوتا ہے کہ مزدوریاں بڑھ جاتی ہیں اور جتنی مزدوریاں بڑھتی ہیں اُسی نسبت سے اہل پیشہ
کو زیادہ نفع ملتا ہے۔ آبادی کے عنوان پر مالتھس نے ایک مشہور و معروف مضمون لکھ کر یہ ثابت
کر دیا ہے کہ حیوانی زندگی میں قدرتاً یہ میلان پایا جاتا ہے کہ اسکے افراد کی تعداد یہاں تک بڑھے
کہ سرمایہ قوت کفایت نہ کر سکے لہٰذا اس کا یہ خیال ہے کہ اگر آبادی کو یوں ہی بڑھنے دیا گیا اور کافی
روک تھام نہ کی گئی۔ تو ایک زمانہ ایسا آئیگا جبکہ بنی نوع انسان کے لئے سرمایہ خوراک
بالکل ناکافی ہوگا۔ بعض لوگوں نے مالتھس کے اس خیال پر اعتراض کیا ہے کیونکہ ظاہراً کسی
قسم کی کمی واقع ہونے کی کوئی علامت موجود نہیں ہے لیکن جب اس کا لحاظ رہے کہ مالتھس
کا دعوے آبادی کی لا انتہا کثرت پر مبنی ہے تو اس اعتراض کی تردید ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے
کہ اگر آبادی کا سیلاب روکنے کا انتظام نہ کیا گیا تو یہ نتیجہ ظہور میں آئیگا لیکن ہم دیکھتے ہیں
کہ آبادی کی روک تھام کئی طریقوں سے عمل میں آتی ہے۔ اور خصوصاً ہمارے ملک میں جو قدرت نے
طریقہ اختیار کیا ہے وہ تو از حد خوفناک ہے یعنی ہر سال لاکھوں بلکہ کروڑوں جانیں طاعون اور دیگر وبائی
بیماریوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ مگر اور مہذب ممالک میں جہاں تعلیم نے عوام الناس میں اپنا برا بھلا خود
سوچنے کی قابلیت پیدا کر دی ہے وہاں مصنوعی طریقوں سے آبادی کو روکا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ وہاں
حفظان صحت کے اصولوں پر عملدرآمد ہوتا ہے اسلئے انسانی تکالیف کے وہ دل ہلانے والے نظارے
جو ہندوستان میں عام ہیں وہاں بالکل دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ جس مقصد کے لئے طاعون اور قحط
ہندوستان میں یہ بے رحمانہ صورت اختیار کرتا ہے وہی مقصد فرنگی ملکوں کے باشندے علم و شی
علمی اور مصنوعی طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ مالتھس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر نباتاتی اور حیوانی
دونوں تخموں کو بے روک تھام پھیلنے دیا جائے تو چند ہزار برس کے عرصہ میں وہ اس قدر پھیل
جائیں کہ ... جیسی کروڑوں کرۂ زمین بھی ان کے سمانے کیلئے کافی نہونگی۔ وہ کہتا ہے قدرت
[illegible] کا عالمگیر اور عظیم الشان قانون ہے ان تخموں کو اعتدال کی حدود میں رکھتی ہے۔ جہاں کوئی روک
نہیں وہاں پھیلنے کی قوت کا پورا پورا استعمال کیا جاتا ہے اور اسکے بعد خوراک ہر جگہ ناکافی ہو نیکی
وجہ سے زیادہ بچے نا شروع ہوتا ہے پھر وہ ثابت کرتی ہے کہ انسانوں میں بھی اپنے سرمایہ قوت سے زیادہ
تعداد بڑھانے کا میلان ہے اور جہاں کسی قسم کی روکیں نہیں کی جاتیں وہاں آمد ورفت قحط طاعون اور

سینکڑوں طرح سے کمی واقع ہوتی ہے جو تکلیف ذلت اور خواری کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن علاوہ ان
قدرتی اور اتفاقی روکوں کے مصنوعی روک تھام بھی اپنا پورا اثر ڈالتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان
میں مصنوعی طریقے بہت کم استعمال میں آتے ہیں اور جو کام انسان خود عافیت اندیشی کی غرض سے
کر سکتا ہے وہی قدرت کو اپنے سر اور بے رحم ہاتھوں سے کرنا پڑتا ہے۔ کسی ملک کی تہذیب
اور ترقی کا اندازہ اکثر اس طرح بھی کیا جاتا ہے کہ آبادی کو اعتدال کی حدود میں رکھنے کے لیے
قدرتی روکوں کا دور اندیشانہ اور مصنوعی روکوں سے مقابلہ کریں۔ اور کسی ملک میں آبادی گھٹانے
کا کام قدرت کے ہاتھوں چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے کہ ہندوستان میں تو ظاہر ہے کہ اس کی
ترقی کا درجہ ابھی بہت ابتدائی ہے لیکن وہ ملک جو قدرت کے واسطے اس کا سرانجام سنبھال رکھا
رکھتے ہیں مگر وہ احتیاطیں کر کے انسداد کرتے ہیں ان کی تہذیب کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا
واضح ہو کہ تقسیم دولت پر بحث کرتے ہوئے اور خصوصاً ان اسباب کی تحقیق میں جن کا ذکر یہ
اور ہلکی یا بیشی مزدوری کا فیصلہ ہوتا ہے آبادی کے ابتدائی اصولوں کا جاننا ضروری ہے کہ آبادی
کی زیادہ ہوتی جبکہ اس کا پلڑا برابر رکھنے کے واسطے دیگر اسباب موجود نہ ہوں مزدور کی حالت
پر دو طرح سے اثر ڈالتی ہے۔ اول یہ کہ اشیائے خوردنی کی قیمت میں گرانی ہو جاتی ہے کیونکہ جتنا آبادی
میں اضافہ ہوا ہے اسی نسبت سے زیادہ کھانے والے پیدا ہو گئے ہیں نیز ان کے لیے خوراک بہم
پہنچانے کے واسطے بمجبوری ایسی زمینوں میں کاشت کرنی پڑتی ہے جن پر سخت محنت صرف کرکے
بھی حسب دلخواہ فصل نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ نئی پود کی بڑھ جانے سے مزدوری پانے والوں کی
تعداد بھی بڑھ جاتی ہے جس سے بازار میں مقابلہ سخت ہو جاتا ہے اور اسلئے مزدوری بھی آدھی رہ جاتی ہے مثلاً
فرض کرو کہ دس [illegible] ایک جگہ فقط دس لکڑی ڈھونے والے مزدور بہم پہنچ سکتے تھے لیکن اب
اسی جگہ بیس مل سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی مزدوری آدھی رہ جائیگی۔ اگر پہلے وہ آٹھ آنے روز
مانگتے تو ضرورت والے کو دینے پڑتے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تعداد محدود ہے لیکن اب تعداد میں
ترقی ہونے کی وجہ سے وہ چار آنے پیش کریگا اور جو مزدور نہ مانے تو وہ کہیگا تو نہیں تو تیرا اور
بھائی یہی مزدوری پر آجائیگا۔ غرض اس طرح مقابلہ میں بیچارے مزدوروں کی مزدوری ماری جاتی ہے
بعض حضرات آبادی کا دباؤ کم کرنے کا ایک یہ علاج تجویز کیا جاتا ہے کہ جتنی آبادی بڑھے اتنی ہی

حصہ لینے کے ملکوں میں چلا جائے جہاں ابھی آبادی بہت تھوڑی ہی لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت میں اس تجویز کے حسن و قبح پر بحث کرنی محض تضیع اوقات ہو گی کیونکہ ہندوستانیوں کے لیے تلاش معاش میں ترک وطن کرنا اور کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کے آجکل یہ معنی ہیں کہ وہ اپنی ساری عمر غلامی سے بدتر حالت میں رہ کر دوسروں کو فائدہ پہونچائیں اور جب انکی خدمات کی ضرورت نہ رہے تو واپس بھیج دیئے جائیں۔ دوسرے دنیا کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہی کہ جہاں اہل ہند کو گھسنے کی اجازت ملے جہاں ابتک جا چکے ہیں وہاں سے بھی ذلت و خواری کے ساتھ نکالے جا رہے ہیں۔ جو تکالیف ہمارے ہموطنوں نے جنوبی افریقہ میں سہیں اور جو ذلیل برتاؤ ان کے ساتھ ابتک کیا جا چکا ہی اور کیا جا رہا ہے اُس سے ہم کو سبق ملتا ہی کہ آئندہ کبھی وطن مالوف کو چھوڑ کر ایسے ملکوں میں نہ جائیں جہاں رہ کر ہمارے ننگ و ناموس پر حرف آتا ہی ہماری تمام کوششیں علمی و عملی طریقوں سے افزائش آبادی کو روکنے اور حد اعتدال کے اندر رکھنے کی طرف صرف ہونی چاہئیں۔ اور اگر ہم صدق دل سے اپنی نجات کے خواہاں ہیں تو منزل مقصود پر پہونچنے کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں کہ ایثار اور نفس کشی کو کام فرمائیں اور جہاں تک امکان میں ہو ایسے وسائل اختیار کریں جس سے آبادی حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ اور دیگر مہذب ممالک نے جو طریقے اختیار کئے ہیں انپر ہم کو بھی عملدرآمد لازم ہے مثلاً امریکہ کی وہ فرقے جو اجتماعی اصول پر قائم ہیں آبادی کی روک تھام کا از حد خیال رکھتے ہیں۔ اجتماعی اصول جو عام طور سے فرنگستان اور امریکہ میں سوشلزم یا کمیونزم کہلاتا ہے اور اس اصول کا پیرو وہ فرقہ ہے جو کہتا ہو کہ ہر ایک ملک کی دولت اس کے باشندوں کی بحیثیت مجموعی ملکیت ہو اور اس بنا پر کسی فرد واحد کا اپنے ہم جنسوں سے زیادہ دولت جمع کرنا ناجائز قرار دیتا ہو اس فرقے کے پیرو اس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ اگر ان کے اصول پر ملکوں کی سلطنتیں قائم کی جائیں تو فرقہ کی مفلسی اور اسکے دیگر برے نتائج فوراً رفع ہو جائینگے۔ نیز انکا ایک نہایت مشہور اور اہم اصول یہ ہو کہ ہر فرد بشر بنی نوع انسان کا ایک رکن ہو اور اس حیثیت سے کل کے فائدے کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے اسکو کوئی حق حاصل نہیں ہو کہ اپنی کمائی کو فقط اپنا سمجھ کر وہ اپنے ذاتی تصرف میں لائے بلکہ جو کچھ وہ کماتا ہو سکی برادری کا اسکے برابر حق ہی۔ اسی بنا پر یہ فرقہ اپنی برادری میں چھوٹے بڑے

کا درجہ برابر سمجھا جاتا ہو یعنی برادری کا اگر ایک رکن عالم اور دوسرا جاہل ہو تو اعزاز و احترام میں کوئی فرق نہیں کیا جائیگا۔ ان میں نہ کوئی حاکم اور نہ محکوم نہ کوئی ادنے ذات اور نہ کوئی اعلیٰ سب کا درجہ برابر ہے۔ چونکہ اس کے بال بچے درحقیقت برادری کے بال بچے سمجھے جاتے ہیں لہٰذا ان کی پرورش برادری کی مجموعی آمدنی سے کی جاتی ہے۔ اس اصول پر پابند ہونے سے آبادی میں ایسی قدر کثرت شروع ہوئی کہ ان فرقوں کے رہبروں کو تمدنی خطرات کا بیجا اندیشہ ہوا اور انہوں نے متفق ہوکر یہ فیصلہ کیا کہ امریکہ کی تمام اجماعی انجمنوں کو اس کا تدارک کرنے کے واسطے ایسے ذریعے اختیار کرنے چاہئیں جن سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو۔ چنانچہ ان انجمنوں کو شادیاں روکنے کے اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے دو فرقے جو نہایت خوشحال اور اقبالمند ہیں مطلق شادی نہیں کرتے اور ان کا ہر ایک ممبر ساری عمر ناکتخدا رہتا ہے اور فرقوں میں جو لوگ اپنی مرضی سے ناکتخدا رہنا اختیار کرتے ہیں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں امریکہ کی ان ملکوں میں جو اجماعی فریق کے بالکل برعکس ہیں یعنی انکے اصول ہندوستان کے موجودہ سوسائٹی کے اصولوں سے ملتے جلتے ہیں۔ آبادی کی تعداد کا بڑھانا گھٹانا منتظمہ کمیٹی کے اختیار کا ہی جس طرح ہندوستان میں میونسپل کمیٹیاں ہاؤس ٹیکس وغیرہ کو توقعات کے مطابق گھٹا بڑھا سکتی ہیں۔ اسی طرح ان کمیٹیوں کو یہ مجاز حاصل ہو کہ کثرت ازدواج کو روک کر آبادی کی تعداد میں معقول کمی پیدا کریں یا اگر قوم کی بہبودی اس بات کی متقاضی ہو کہ افراد قوم بڑھیں تو اسکا ویسا انتظام کریں۔ غرض وہ باحمیت لوگ جو تھوڑی تعداد میں رہکر آزادی اور عزت سے زندگی بسر کرنے کو کثیر تعدادی۔ فاقہ کشی اور ذلت و خواری پر ترجیح دیتے ہیں اپنے اہل قوم کی تعداد کو معقول حدود میں رکھنے کے لیئے وسیلے بھی اختیار کرتے جن سے حسب دلخواہ مراد بر آئے۔

لہٰذا ہندی مسلمان قوم کو چاہیئے کہ جہاں اور بہت سے ضروری مسائل پر اپنا بیش قیمت وقت صرف کرتے ہیں سیلاب آبادی کے روکنے کی طرف بھی کچھ توجہ دیں اور اگرچہ اہل ہند کے عام خیال کے مطابق اس طرف کوشش کرنی گویا خدا کی نعمت سے لڑنا کو بار رکھنے کی سعی تصور کی جائیگی اور بعض شاید یہ اعتراض کریں کہ آبادی گھٹانے سے قوم میں کمزوری پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کے ذہن میں بالخصوص کثیر تعدادی قوت اور قومی عظمت کی شان ہو لیکن یہ یاد رہے کہ ضعف کا اجتماع کبھی قوت

کا باعث نہیں ہوتا۔ جو لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ قوم میں افراد کی ترقی ترقی ہے وہ از حد غلطی پر ہیں۔ ایمرسن کا قول ہو کہ مردانگی کے خون کا ایک قطرہ بحر موج افزا کے ساری پانی سے قدر و قیمت میں زیادہ ہے۔ اس قول کی صداقت میں اگر کوئی سچی مثال دیجا سکتی ہو تو وہ ہندستان مع انگریزوں کی مثال ہو۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ آبادی کی زیادتی کس کس طرح ملک کی تمدنی حالت میں مشکلیں ڈالتی ہے، اور باشندوں کو بحیثیت مجموعی کیا کیا تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں۔ اب صرف اسکی مزید تشریح کرنی باقی رہ گئی ہو کہ کثیر آبادی بجائے قومی عظمت ہونے کے قومی ذلت اور قومی مصیبت ثابت ہوتی ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک کے مخارج دولت محدود ہیں اور دولت کی پیداوار خود ایک مقررہ حد تک عمل میں آتی ہو۔ جب آبادی بڑھی لیکن دولت کی مقدار ایک خاص حد پر قایم رہی تو اسکے یہ معنی ہیں کہ جو پہلے محنت کرکے اپنا پورا پیٹ بھر سکتے تھے اب اس سے دگنی محنت کرکے آدھا پیٹ بھی بدقت تمام بھرینگے۔ اگر پہلے دس آدمیوں میں دس روٹیاں بٹتی تو اب پندرہ آدمیوں میں دس روٹیاں تقسیم کی جائیں گی۔ غرض ایسی نسبت سے جتنی آبادی بڑھے گی اور دولت کی مقدار محدود رہے گی اسی نسبت سے لوگ فلسقمر ہونگے۔ انسان کا خاصہ ہو کہ پیٹ کے کارن سب ہی پاپڑ بیلتا ہے جب پیٹ کو لگی ہوئی ہو تو اسے پہلے تنور کی سوجھتی ہو۔ نہ اسوقت تہذیب نہ اخلاق اور نہ قوم کوئی چیز سیری نہیں کرسکتی۔ ایام قحط میں ایسے ایسے حمیت والے کہ جو کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے بھیک مانگتے دیکھے گئے ہیں اور فقط شرفا پر کیا منحصر ہے تنگی اور ناداری کے وقت ان لوگوں کو جن کے بزرگوں کے سر پر چتر شاہی سایہ کرتا تھا۔ دوسروں کے آگے یہ جان بوجھ کر کہ وہ کیا تھے ہاتھ پھیلانے پڑتی ہے۔ ایک بھوکے جم غفیر سے قومیت کی امید رکھنا عین بیوقوفی ہے بنگال کے مشہور قحط کے زمانے میں جب لاکھوں کنگلے بھوک سے ہلاک ہو رہے تھے تو انگلستان میں ایک صاحب نے ایک کتاب میں ہندستانیوں کے حال زار کا نقشہ کھینچکر وہاں کی پبلک پر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اگر قحط کی یہی حالت رہی تو یہ جو ہزاروں آدمی فاقے سے مر رہے ہیں یہ ایکدن ایکدن بھیڑیوں کی طرح انگریزی فوج پر آ پڑینگے اور آخرکار انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنا پڑیگا۔ چنانچہ اس قسم کی غلط دلائل کا جواب ایک مشہور مورخ

نے نہایت پر زور الفاظ میں دیا ہے۔ یہ مورخ کہتا ہے کہ آجتک جتنی تاریخیں مختلف قوموں
کے عروج و زوال کے متعلق میری نظر سے گذریں اُنمیں ہمیشہ ایک اصول پایا وہ یہ کہ جبکبھی
قوم نے معراج ترقی پر چڑھنا شروع کیا اسی میں ہمت جرأت کے آثار نمایاں تھے جو اسی
وقت کسی قوم میں پیدا ہو سکتے ہیں جب اسکو بھوک کی طرف سے بے فکری ہو۔ بڑی بڑی
آبادیاں صدیوں تک پستی کی گڑھے میں پڑی رہتی ہیں۔ جب زندہ رہنے کی طاقت
باقی نہیں رہتی تو فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن کبھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ ترقی کے دوڑ میں دوسروں
کی حریف ہوں اور اگر ان کو اس قدر میسر آجاتا ہو کہ جس پر بسر کرکے روح اور بدن کو
ایکجا رکھ سکیں تو اس طرح فقط زندہ رہنے کو ہی غنیمت جانتی ہیں۔ ان میں نہ تو حوصلہ
باقی رہتا ہے اور نہ حمیت یا محبت کا احساس۔ برعکس اسکے وہ قوم جسکی تعداد خواہ کتنی ہی
تھوڑی ہو مگر جسکے افراد دولتمند اور خوشحال ہوں اور زندگی کا پورا پورا لطف اٹھانا جانتے
ہوں اُس میں روز افزوں ترقی کا موجود ہونا ایک قدرتی اصول نظر آتا ہے۔ دیگر یہ کہ
اب وہ زمانہ آگیا کہ بہت سے ایسے کام جو مرضی مولا پر چھوڑے جاتے تھے اب ہم خود
اپنے ہاتھ میں لیں پہلے زمانہ میں جنگ و جدل میں ہزاروں آدمی کام آتے تھے اور اسطرح
آبادی کا پلہ برابر رہتا تھا اب چونکہ اس قسم کی لڑائیاں مفقود ہو گئی ہیں تو انکی جگہ طاعون
اور قحط وبا کام دیتے ہیں۔ ان تمام بلایات سے محفوظ رہنے کے لیے جہاں حفظان صحت
کے قوانین کی پابندی لازم ہے وہاں کثرت ازدواج اور کثرت اولاد سے ایک حد تک
احتراز بھی نہایت ضروری ہے۔ ان احتیاطوں سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ آبادی
میں کوئی معقول کمی ہوتی نظر آئے گی بلکہ ان کا صرف یہ نتیجہ نکلیگا کہ ملک کی پیداشدہ
دولت اور دولت خرچ کرنیوالوں میں ایک قسم کا تناسب پیدا ہو جائے گا۔ اور اب
جو ملک کے تین تین ہو رہے ہیں۔ یہ بات جاتی رہے گی۔ علاوہ ازیں اور بہت سے
ناگہانی وباؤں کا انسداد بھی ممکن ہوگا +

— سید رؤف علی

اجدھیا

رود سرجو کے کنارے پر جو مصر آباد تھا ۔ یوسف علم و معانی جس کا خانہ زاد تھا
جس کا ہر فرد اپنے فن میں وقت کا اُستاد تھا جس کے باشندوں کو نیکی کا صحیفہ یاد تھا

نصب تھا جس سرزمین پر راجہ جسرتھ کا علم
تھا اجدھیا نام جس خطے کا مشہور اُمم

اس کا ہر نادار علم و فن کا تھا گنجینہ دار اغنیا اس کے صداقت کیش تھے، تقوی شعار
افترا و کذب سے تھی اس کے ہر شہری کو عار غم و کم اس کے حرم میں تھی زبان ہرزہ کار

آدمی اس کے فرشتوں کی طرح طاعت گزار
عورتیں اس کی عفیفہ و متقی، پرہیزگار

وہ عظیم الشان قصر اس کے وہ ایوان بلند چوک وہ رونق فزا، وہ کوئی دبرزن دلپسند
ہر طرف پر آب وہ خندق وہ محکم شہر بند وہ علم اسپر ہو جس سے رعب شاہی چارچند

پاسبانوں کی حفاظت میں ہر اک دروازہ تھا
امن سے ہر اک کے چہرے پر خوشی کا غازہ تھا

وہ رفیع القدر مندر، وہ کلس رفعت پذیر شور دو الوں میں ہوتوں کی وہ شمیم بے نظیر
وید خوانوں کی معابد میں وہ جمعیت کثیر وید منتر کی صدائیں وہ کہ لاکھوں دل اسیر

برہمن سارے نکوکردار، طاعت کیش تھے
معرفت، حقانیت کے مرحلے در پیش تھے

تھا ہر اک کا طول قامت کے غزالے سے غنی شکل اس کی کہاں ہرگز سے ہیر کی کمی
ہر کوئی تھا وقت حرب منبع جرأت کا دھنی چھیدتی تھی سینۂ اعدا کو برچھی کی انی

جو صلے بنگام کے ٹوٹ کر دیتے تھے پست
جان دیتے تھے پر کھاتے نہ تھے ہرگز شکست

تھا سلح خانہ خدنگ و نیزہ و خنجر کا گھر | ہیبت افزائی بدو تھی کثرت تیغ و تبر
سرشکن، گردن فگن وہ گرز ہائے گاؤ سر | باقی وہ آتش فشاں جو پھونک ڈالے خشک و تر

جو نگہبانی کا ساماں چاہیئے موجود تھا
نام آلات تباہی کا مگر مفقود تھا

بزم کے بھی تھے لوازم، عود بھی تھا، چنگ بھی | تھی سہی، بربط بھی تھا، دف بھی تھی، مردنگ بھی
رقص تھا، نغمہ تھا، ساقی سا حسن خوش آہنگ بھی | عیش کی بھی انجمن تھی، راگ بھی تھا رنگ بھی

نغمہ پیرا تھا کوئی زمزمہ زن تار رباب
وجد آتا تھا کسی کو، کوئی وقف اضطراب

فیاض (ہریانوی)

ریاض خیرآبادی
مرے زخم باندھیں اگر باندھتے ہیں
مرے ہاتھ کیوں چارہ گر باندھتے ہیں

بیخود دہلوی
آئے میرے رتبہ شناسو نہیں محبت والے
لے گیا قیس کفن کے لیے دامن میرا

سائل دہلوی
مجھے دیوانہ جو کہتے ہیں وہ خود ہی ہیں دیوانے
چنا کرتا ہوں تنکے یا دل ناشاد کے ٹکڑے

صفی لکھنوی
دل ٹوٹنے میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی
لیکن تمام عمر کو آرام ہو گیا

آرزو لکھنوی
یہ سنتے ہی جھلا کر باہر تھا وہ پردے کے
کچھ ہے بھی پس پردہ یا پردہ ہی پردہ ہے

رعب شاہ آبادی
ہم سا بھی کوئی ہوگا محروم دین و دنیا
وکردہ اوام حسرت کشش نواہی

تغزل

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

کونسی آب و ہوا میں جا کے ڈھونڈیں کہ دل
یا دھواں ہو کر اڑا یا اشک بن کر رہ گیا

ہوش ہی مجھ کو نہ تھا جب بجلیاں لوٹ گئیں
مجھ کو کیا معلوم کیا جاتا رہا کیا رہ گیا

ہم مذاقِ دل اگر تھا بھی تو اک طورِ کلیم
ہو گیا سرمہ مگر بارِ تجلی سہہ گیا

زخم جو خونبار تھے وہ روتے روتے ہنس دیئے
کچھ نہ کچھ ناوک ترا قلبِ حزیں سے کہہ گیا

وادیٔ غربت میں کس سے ہمرفاقت کی امید
کون دیتا ساتھ جب نقشِ کفِ پا رہ گیا

وقت پر تھامل رہے تھے قطرہ ہائے خون آب
کیا خبر آنسو گرا یا دل پگھل کر بہہ گیا

دل پہ کیوں روئیگی تو اے آسیائے نُہ طبق
یہ مری قسمت کا دانہ تھا جو پس کر رہ گیا

وہ کبھی بھی آنچ سے ہے ان خشک تنکوں کو بہت
کیوں جلے گلچیں اگر میرا نشیمن رہ گیا

حادثوں کے زلزلوں سے جام دل چھلکا کیا
ایک چلو خون ہی کیا بہتے بہتے بہہ گیا

آبرو تھی دل کے شاید خون بھی باقی نہیں
کھینچ کر جب سانس لی دریا لہو کا بہہ گیا

زندگی ابھی سہی لیکن اسے سمجھے تو کون
دل نہیں تو عالمِ احیا میں کیا رہ گیا

ذکرِ گلشن کرنے دیتا کون وہ بھی قید میں
پہروں افسر یادیں جو کچھ تھا کہنا کہہ گیا

صبح سمجھے تھے کہ ثاقب شبِ غم ہے طویل
دل کا کوئی داغ ہوگا جو چمک کر رہ گیا

ثاقب قزلباش (لکھنوی)

گنہگار ہوں پھر بھی گناہ گار نہیں
مئے خودی کا نشہ مجھ کو زیبا نہیں

سلوک کا کوہ کا مذہب بھی ہے
خشوع نفس کا تنہا یہاں گذار نہیں

قدم ہے غیر کا جھنک کے درمیاں سالک
فنا عشق کا واللہ اعتبار نہیں

یہ [illegible] حقیقت ہو کہ ایسے مغرب — یہ دل ہو حضرت موسیٰ کوئی شرار نہیں
کہیں کا جذب محبت ہو حضرت ساری — کہ ایک ذرہ بھی عالم میں ذی قرار نہیں

قیامت آچکی تو ٹھکانا ہی میں نہیں — ہمارے دل پہ کوئی داغ انتظار نہیں

شریک ہوش بھی ہیں شغل بادہ نوشی ہیں — حرام کرکے پیوں میں وہ مے گسار نہیں

ہوں بندگی میں بھی تقلید وضع سے آزاد
غلام ہوں پہ غلامی سے شرمسار نہیں

آزاد سبحانی (کانپور)

مجھے تو تم سے محبت ہے، ہوں ادھر بیتاب — مگر نہیں یہ ہوا کیا، جو ہو ادھر بیتاب
سکون دل کے لیئے چاہتا ہوں انکا وصال — میں کیا کرونگا، یہ پھر بھی رہا اگر بیتاب

نظر ہے ان کی بہت شوخ پھر بھی سنجیدہ — ہے میرا دل متحمل بہت مگر بیتاب

یہ تیری بزم کا کیا حال ہے یہ بات ہے کیا — ہیں بے قرار ادھر، دو تو چار ادھر بیتاب

کسے خبر ہے یہ دل چاہتا ہے کیا اُن سے — ہے ہاتھ سینہ پہ ان کا، یہ ہے مگر بیتاب

شانہ ترک محبت پہ بھی یہ ذوق نگہ — حسین جو گذرا کوئی ہو گئی نظر بیتاب

میں قدر کرتا تری چارہ سازیوں کی بہت — جو ہوتا میری طرح تو بھی چارہ گر بیتاب

ادھر ہے گرنگہ بے قرار چشم شریر — ادھر بھی دل ہے مرا مضطرب جگر بیتاب

[illegible] تو کس کا دل ہوا پامال — ہے آج کیسی تری خاک رہ گذر بیتاب

مجھے سکون ہی سہی، پر یہ کیا کہا تو نے — یہ سب غلط ہے کہ ہو کوئی اس قدر بیتاب

میں اپنے دل میں دعا مانگ ہی رہا تھا کچھ — نگہ جو اُن کی اٹھی ہو گیا اثر بیتاب

[illegible] حیات، میں کاٹوں گا کیسے دل کیساتھ — دیا ہے تو نے خدا کیسا ہم سفر بیتاب

وہ انکی آنکھ میں کچھ نم لبوں پہ کچھ لرزش — انھوں نے کردیا کیسا دم سحر بیتاب

بھلا میں کیا کروں اور کوئی کیا کرے گا نیاز
جب ان کا حسن ہی کر دے یک نظر بیتاب

نیاز (فتحپوری)

تابش مشعل جاں فانوس تن کو پھونکدے
اپنی عریانی میں چھپ جا پیرہن کو پھونکدے

یہ حجاب خاک ہے تیرے لیے ننگ حیات
زندہ جاوید ہے تو اس کفن کو پھونکدے

نغمۂ باد صبا ہوکر اڑا رنگ بہار
آتش گل کا شرر بنکر چمن کو پھونکدے

گرمی ہنگامۂ پروانہ سوزی تا کجا
شعلہ افشاں شمع ہو اور انجمن کو پھونکدے

برق تاباں کو جلادے پرتو رخسار سے
طور سینا کی طرح چرخ کہن کو پھونکدے

جلوۂ جانانہ ہے ہر سو جہاں سوز دوئی
پردۂ چشم خیال ما و من کو پھونکدے

رنج غربت کچھ نہیں حسرت ہے ہمدردی ای تپش
مثل وہ آتش ہو اور بعد وطن کو پھونکدے

تپش (خورجوی)

کوئی مسجد ہی نہ تھا دل کی سرا سے پہلے
اسکی بنیاد ہے کعبہ کی بنا سے پہلے

صاف تھا چرخ ترے جور و جفا سے پہلے
یہ شفق بھی نہیں خون شہدا سے پہلے

سر تسلیم ہو خم حق کی رضا سے پہلے
زیست اسکی ہے فنا ہو جو بقا سے پہلے

اور غم ہوگا اگر بعد شفا موت آئی
تیرے بیمار تو مر جائیں شفا سے پہلے

کیوں ابھی سے ہے تمہیں فکر قیامت ای شیخ
نکلو تو دائرہ ارض و سما سے پہلے

دیکھو ہر بات پہ حجت وہ کیا کرتے ہیں
کیا مزے میں تھے ہم اس چون و چرا سے پہلے

ساتھ نالے کے ہی پاتے ہیں یہ تحفہ عشاق
دل میں کھٹکا سا جو ہوتا ہے صدا سے پہلے

مجھ سا پایا ہو کوئی اور خلش کا مشتاق
خار الجھے تو اسی آبلہ پا سے پہلے

مختصر ہے انہیں حرفوں میں یہ دنیا کا علم
جس قدر بعد الف اور ہیں یا سے پہلے

تجھ پہ سختی کے دن آئے تو نہ گھبرائے دل
کچھ مصیبت بھی ہو انعام خدا سے پہلے

کھاؤ سینوں پہ سناں تیغوں سے کٹواؤ گلے
عہد نامے ہیں یہ ارباب وفا سے پہلے

جھوٹ پر اب تو زمانے نے کمر باندھی ہے
لوگ سچے تھے بہت اس کی [illegible] سے پہلے

بزم کو پہنچے کہاں کس کی محبت لائی
بات پہنچیگی یہی جلسے کی ندا سے پہلے

بزم (اکبر آبادی)

مجھے کب تاب قدرت ہے نہیں کچھ تجھ سے احساں کی
کہ دنیا کو دکھاؤں یہ سزا تھی میرے عصیاں کی

معصیت ہی نہیں ہے دن میں اور کٹ شبہاں کی
یہ دنیا کیا ہی قسمت کھلی خواب پریشاں کی

لڑا اتنا ہوں جب توبہ کی جرأت کر کے نکلے
کہ شوقِ معصیت پر ختم ہی حد میرے امکاں کی

جہاں نقش نگارہ مہر پر پردہ سا پڑ جائے
سمجھ لینا یہی سرحد ہے یاس خانہ ویراں کی

مجھے ڈھب یاد تھا دوزخ کو جنت کر دکھانے کا
ادھر ہو بیٹھا ادھر تقدیر جاگی اہل زنداں کی

طلسم شوق و حیرت ہے طلسم ذوق و عبرت ہے
طلسم جبر و قدرت ہے عجب ہستی ہے انساں کی

میری تدبیر لیکر میری قسمت سے وہاں لائی
جہاں دریا ہے آفت کا جہاں کشتی ہے طوفاں کی

تری قدرت کو روز حشر جتنا ناز ہو کم ہے
مٹا ڈالی میرے دل سے اگر تصویر زنداں کی

غضب کی آندھیاں اٹھتی ہیں ہر فصل کی ویرانی میں
زمیں میں آملی ہے خاک یارب کس بیاباں کی

گنہ سے جب بچا ہوں آنکھیں بڑھ گئی ہیں
گریزاں سے ارے ظالم یہی فطرت ہے انساں کی

مرے دل کے لہو سے آہ میری آنکھ رنگیں ہیں
نہ رکھیں اہل محشر دیکھیاں تک اہل دلاں کی

ہے اتنی جو گھڑی بدتر ہے وقت نزع کافر سے
نہ موت اسکو سمجھ یہ زندگی ہے اہل حرماں کی

بیخود (دہلوی)

کیا کچھ کیا نہ عشق نے بے آبرو مجھے
کہنے لگے وہ آپ تم تم سے تو بے مجھے

اب لطف زندگی کی نہیں آرزو مجھے
گم کردہ کارواں کی نہیں جستجو مجھے

بولے وہ میری قبر پہ کون اس میں دفن ہے
آتی ہے اسکی خاک سے الفت کی بو مجھے

ہے بوئے زلف یار سے مہکا ہوا دماغ
کیا اپنی پہ سنگھاتی ہے اے ناز بو مجھے

ڈالا اپنے دامن سے تجھے دعا میں کیوں بھلا
بھولا نہیں ہے آیۂ لا تقنطوا مجھے

رنجور راستہ پیر کے کیونکر ہتیں دکھائیں
جو داغ ہے گلہ ہے مرا ماہ رو مجھے

رنجور (عظیم آبادی)، (دشمن العلماء)

کلامِ اکبر

پھیلے ہی دنیا میں کہتے ہیں زیادہ، کم پڑے ... سب مگر لڑتے ہیں اس پر تم بڑے یا ہم بڑے

سمجھیں نہ حضور تھرڈ والوں کو حقیر ... انجن تو وہی ہے جسکی ہم سب کو ہے آس
ایجیٹیشن گورنمنٹ ہے یہ فسٹ و سکنڈ ... بعد اسکے موافق عمل ہوگا کلاس

حاصل بکار دین ہے وہ فقط اعتقاد اک ہو ... مذاہب کو بہت جانچا ابل پڑ سنہ میاں مٹھو

لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھکو پریٹ پر ... تیار ہو رہا تھا میں جنت کے واسطے

اُس بُت کو سنا دو قل ھو اللہ ... ناخوش ہوگا تو کیا کرے گا

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے ... پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی
اس کا پسینا ہے اسلام میں بہا کے ... یورپ نے ایشیا کو انجن میں رکھ لیا ہے
اس خوان مغربی سے بچتا ہی کہاں اکبر ... حضرت نگل رہے ہیں بندہ نے چکھ لیا ہے

تمہیں تو جوش سے یہ سب انقلاب دیکھو ... جائز مگر ہے کہ قیامت کا خواب دیکھو
گر سب کو ہے تسلیم کہ معبود وہی ہے ... [illegible] سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے
[illegible] ... [illegible] کہ موجود وہی ہے
[illegible] ... [illegible] موجود وہی ہے

ہر شہر میں شور مچا ہے

کہ

شریف بیگماتوں کے بناؤ سنگھار کے لئے حکیم محمد یعقوب خان دہلوی نے زنانہ سنگھار بکس اور
تمام عورتوں اور مردوں کے لیے پریجمال صابون کیا لاجواب ایجاد کیے گورنمنٹ
عالیہ سے رجسٹرڈ کرا لیے ہیں۔ آپ نقالوں کے دھوکے سے ہوشیار رہئے گا۔

(نقلی سے بچو)

زنانہ سنگھار بکس رجسٹری شدہ

حضرات اس بکس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پریجمال صابون یک ٹکیہ (۲) بیدی
بہار تیل (۳) بال صفا صابون یک ٹکیہ (۴) پان کی بہار یک ٹکیہ (۵) خوشبو دار مسی یک
تولہ اور ۶ ماشہ سرمہ نور نظر انعام دیا جاتا ہے۔ قیمت فی بکس [illegible] بکس کلاں [illegible]
آئینہ قینچی کلاں [illegible] ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (ع۴)

حسن و خوبصورتی کا بکس

پریجمال صابون [illegible]
اور چہرے کو [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

کس کو اپنا وقت یاد رہتا ہے؟

جو اپنے شہر کی آبرو کو بڑھانا چاہتا ہے وہ وقت اور وعدہ کی پابندی ضرور کرتا ہے اور اپنے وقت کو کبھی نہیں بھولتا۔ **انڈین پریس** ایسا چھاپہ خانہ ہے جس میں وعدہ پر کام دیا جاتا ہے۔ چھپائی کی صفائی میں اعلیٰ درجہ کی کوشش ہوتی ہے۔ تمام اسٹاف تجربہ کار اور نہایت محنتی ہے۔ اجرت مناسب لیجاتی ہے۔

انڈین پریس ہندوستانیوں کا اور ہندو مسلمانوں کا کام اپنا کام سمجھ کر دلی توجہ سے چھاپتا ہے۔

کتابیں، **رسالے**، اخبارات، تجارتی اشتہارات اور خانگی رقعہ جات چھپوانے والے ایک دفعہ **انڈین پریس** کو کام دے کر اس دعوی کی تصدیق کر سکتے ہیں،

انڈین پریس چھتہ شیخ منگلو بجامع مسجد دہلی میں واقع ہے اور ہر قسم کی بہترین رنگین و سیاہ چھپائی کے لیے ممتاز ہے۔

حافظ **عزیز حسن** نقشبندی پروپرائٹر **انڈین پریس**
دہلی

انتخاب زوج دہلی کی ایک مشہور انشا پرداز خاتون کے زور قلم کا کارنامہ اسمیں قابل مصنفہ نے اپنے طبقہ کی جانب سے جنس ذکور کی خدمت میں اپیل کیا ہے کہ شادی کے معاملہ میں اس غریب کی رائے کو قابل وقعت سمجھ کر حاصل کر لیا جائے۔ قیمت ۳ ر

تاریخ جنگ طرابلس باتصویر۔ جسمیں جنگ طرابلس کے صحیح چشم دید واقعات ابتدائے جنگ ستمبر سے مارچ ۱۹۱۲ء تک مورخانہ انداز سے قلمبند کئے گئے ہیں اور جابجا تصاویر بھی شامل ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱۸)

اتوپیا۔ اس ناول میں سر ٹامس مور نے ایک خیالی ملک، قوم کے نظم و نسق کا بیان کرکے اہل انگلستان کو بیدار کرنا چاہا ہے۔ قیمت چار آنہ (۴)

برکات سلطانی۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ والی بھوپال کی روشن زندگی کے کارنامے اور انکی علمی و اسلامی خدمات کا مرقع باتصویر پڑھنے کے قابل کتاب ہے قیمت ۸ ر

خیابان عجم۔ شعرائے عجم کی سوانح عمریاں اور انکے کلام کا انتخاب مع انگریزی ترجمہ قیمت ۱۰ ر

چہلستان عرب یا تحفہ حج قرآن شریف احادیث اور تواریخ سے حج مکہ معظمہ کعبہ مقدسہ مدینہ منورہ اور عرب کے تاریخی جغرافیائی حالات اس کتاب میں نہایت تفصیل سے درج کئے گئے ہیں اور بہت سی تصاویر بھی اس کتاب میں درج ہیں قیمت ایک روپیہ (۱)

مکمل محاربات روس جاپان۔ روس و جاپان کی گذشتہ ہولناک جنگ کے حالات حصہ اول، دوئم قیمت ہر دو حصہ ۱۲ ر

حدیقۃ الاخلاق۔ اکانمی آف ہیومن لائف کا اردو ترجمہ۔ اس کتاب کی نصائح موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ تقریباً تمام مہذب زبانوں میں اسکا ترجمہ ہو چکا ہے۔ نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے یہ ایک اچھا انعام ہے قیمت عہ (۲)

ملنے کا پتہ :- تمدن بک ایجنسی ٹیا محل دہلی

علمی خزانہ

مسدس حالی مع ضمیمہ۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ صحت۔ صفائی اعلیٰ اخیر میں مولانا حالی کی مختصر لائف بھی درج ہے قیمت فی جلد ۱۲؍ +

اکسیر سخن کالیداس کی موسمی نظموں ارتو سنگھار کا اردو ترجمہ نظم۔ کتاب کے شروع میں مشہور فسانہ نگار بابو پریم چند کا ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام نامی پر کتاب معنون کی گئی ہے اور آپ کی تصویر بھی شامل ہے قیمت آٹھ آنہ ۸؍ +

فلسفہ جذبات۔ علم النفس کے مضمون پر اردو کیا فارسی میں بھی کوئی کتاب موجود نہ تھی حالانکہ معیشت کامل کے لیے جتنے عناصر و شعبہ جات ہیں سب کے لیے اس علم کی تحصیل لازمی ہے نیز رازِ ہستی کے انکشاف میں سب سے زیادہ اس علم سے مدد ملتی ہے یہ کتاب ملک کے مشہور انشا پرداز مسٹر عبد الماجد بی۔ اے کی تصنیف ہے۔ عبارت عام فہم اور سلیس ہے۔ آخر میں جس قدر اصطلاحات علمیہ بتائی گئی ہیں انکی فرہنگ ہے۔ قیمت قسم اول مجلد عہ قسم دوم ایک روپے +

مصر کی کایا پلٹ۔ سر آکلنڈ کالون کی مشہور کتاب میکنگ آف ماڈرن ایجپٹ کا اردو ترجمہ مصری معاملات کی نسبت اس سے بہتر اور جامع کتاب ملنا دشوار ہے قیمت مجلد عہ +

مشاہدات زندان۔ مولانا حسرت موہانی کے خود نوشتہ مصائب زندان قیمت ۸؍

معیشت و معاشرت جس میں انتظام خانہ داری اور روزمرہ کے وہ اصول جو عورتوں کی صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں بیان کیے گئے ہیں مصنفہ علیا حضرت سرکار عالیہ فرمانروائے بھوپال قیمت حصہ اول و دوم۔ تین روپے ؎ +

سبیل الجنان:۔ ایمان۔ اسلام اور نماز، روزہ زکوٰۃ و حج پر حضور والی بھوپال کی نہایت عالمانہ تقریریں۔ قیمت۔ ایک روپے آٹھ آنے (عہ) +

تہذیب النسواں و تربیت الانسان امراض مخصوصہ نسواں کی طبی احتیاطیں خانہ داری کی ضروری اور کارآمد باتیں و دیگر ضروری امور مولفہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ بھوپال قیمت عہ ایک روپیہ چھ آنے مجلد ایک روپیہ بارہ آنہ عہ +

تعلیم اصول خانہ داری [illegible]

مساجد اور غیر مسلم

مسجدوں کی مجالس میں مسلمانوں کی اجازت سے ہندوؤں کا شریک ہونا شرعاً جائز ہے

الحمد للہ وحدہٗ۔ بعض اخبارات نے مسلمانان دہلی وکلکتہ کے اس طرز عمل کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے کہ مسجدوں کی مجالس میں ہندوؤں کو بھی شریک کیا گیا۔ اور تقریر کرنے کی اجازت دیگئی دہلی کے مسلمان سب سے زیادہ نشانہ ملامت ہیں کہ انہوں نے سوامی شردھانند سے جامع مسجد میں تقریر کرائی۔ ان اخبارات نے اس فعل کو نہ صرف ناجائز بتلایا ہے، بلکہ ایک سخت فتنہ وبدعۃ سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مساجد کی توہین کی گئی، اور اسلامی عبادت گاہ کے احترام کا کچھ لحاظ نہیں کیا گیا۔ وغیر ذالک +

جن صاحبوں نے یہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے بڑی بڑی تمہیدیں اٹھائی ہیں اور شاندار عنوانات اختیار کئے ہیں۔ مثلاً "مسلمانوں کو ہر حال میں چاہیے کہ احکام شرعیہ کو مقدم رکھیں اور جوش اتحاد میں ایسے بیخود نہ ہو جائیں کہ احکام شرعیہ سے بے پرواہ ہو جائیں"۔ ان شاندار و اعظمانہ تمہیدوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید مسلمانان دہلی و کلکتہ نے کوئی بڑی ہی خلاف ورزی احکام شرعیۃ کی ہے، اور اب اسپر ماتم کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ اس دور فتن و بدعات میں اگر مسلمانوں کی کسی جماعت نے کوئی بہتر سے بہتر کام کیا ہے تو وہ یہی ایک کام ہے کہ مقاصد مصالحہ سے مسجدوں میں مجالس منعقد کیں، اور اپنے غیر مذہب ہمسایوں اور حلیفوں یعنی ہندوؤں کو بھی اُسی مقصد سے ان میں شریک کیا، جس مقصد سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غیر مذہب کے صلح پسندوں اور دوستوں کو مسجد میں بلاتے اور بٹھاتے تھے۔ انقلاب فکر و علم کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ جو فعل مستحسن اور سنت نبوۃ سے ماخوذ ہے، اسکو بدعۃ قرار دیا جا رہا ہے، اور طرح طرح کی بدعتیں علانیہ مسجدوں میں ہو رہی ہیں، مثلاً انعقاد مواتم و محافل بدعیۃ، و رفع الصوت و بیع و شراء فی المسجد، و ہجوم سائلین، وسائلین و حرج فی الجماعۃ، و سکونت فساق و تارکین صلوۃ، و صلوتان معاً، و غیر ذلک، ان کو نہیں روکتا، بلکہ بہت سے مدعیان علم ہیں جو ان کو عین سنت سمجھتے ہیں، احکام شرعیہ کی تقدیم و پابندی تو عین مطلوب و مقصود ہے لیکن اس کے وعظ کا استعمال صحیح موقع پر ہونا چاہئے۔ ان حضرات کو سب سے پہلے اپنی نسبت فیصلہ کر لینا چاہئے کہ کہیں وہ خود تو حدود شرع سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں؟ شریعۃ کی پابندی کے معنی صرف یہی ہیں کہ شریعۃ کی پابندی محکم بالنطق والوحی ہو اور "اعجاب کل ذی رای برایہ" کا نام شریعت نہیں ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ هٰذَا حَلَالٌ وَحَرَامٌ۔

خود اصل واقعہ بھی غلط سمجھا گیا ہے، جامع مسجد کے جلسے کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ سوامی شردھانند نے ممبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، اور ممبر کو لوگوں نے ممبر جمعہ سمجھ لیا۔ جو مسجدوں کے ہال میں ہوتا ہے۔ حالانکہ ممبر سے مقصود مکبر کا چبوترہ ہے۔ جو صحن مسجد میں ہے اور اسپر ممبر مصطلح مساجد کا اطلاق کسی طرح درست نہیں۔ یہ چبوترہ بڑی بڑی مسجدوں میں بنایا جاتا ہے

تاکہ تکبیرات انتقال کو ایک بلند مقام سے دہرایا جا سکے[۱] پھر اگر اس چبوترہ پر ایک غیر مسلم دیست نے مسلمانوں کی اجازت سے کھڑے ہو کر تقریر کی تو اسمیں شرعاً کیا قباحت لازم آئی ؟ ومن ادعی خلافہ فعلیہ البیان۔

ماحصل مسئلہ یعنی غیر مسلموں کا مسجدوں میں داخل ہونا، تو معترضین کو معلوم ہونا چاہیے کہ نہ صرف داخل ہی ہونا جایز ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اگر مصالح مقتضی ہوں تو ان کو مسجد میں عارضی طور پر بطور مہمان کے ٹھہرانا بھی جایز ہے۔ اور مسلمانوں کا جو امام یا مسلمانوں کی جو جماعت رعایت مصالح اخری کے ساتھ ایسا کرتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتی ہے، جو صاحب شریعۃ صلعم نے امت کو دکھلایا ہے. فخیر الھدی ھدی محمد و شر الامور محدثاتھا۔

(۱)

آنحضرۃ صلے اللہ علیہ وسلم کی اکثر مجالس اور صحبتیں مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، بسا اوقات غیر مسلم آتے تھے اور بلا کسی روک ٹوک کے اُن صحبتوں میں شریک ہوتے تھے. آنحضرۃ صلے اللہ علیہ وسلم کا حجرہ مبارک مسجد سے متصل تھا- جو لوگ آپکی خدمت میں حاضر ہوتے تھے انکو بعض اوقات مسجد ہی میں آپکا انتظار کرنا پڑتا تھا. اور ان لوگوں میں غیر مسلم بھی ہوتے تھے یہ امور ضمناً متعدد روایات سے مستنبط ہوتے ہیں، آپکے بعض یہودی قرضداروں نے مسجد میں آکر تقاضہ کیا ہے- اور آپنے اپنے حلم و خلق کی وجہ سے اُن کے حق طلب و تقاضا کو تسلیم فرمایا ہے- غیر مسلم اقوام سے پولٹیکل علایق، سفراء کا (ایاب و ذہاب) معاہدہ و مواثیق کی مجلس شوریٰ- عرائض و شکایات مسلمین، یہود مدینہ اور مشرکین اطراف و جوانب سے پولٹیکل تعلقات کی گفت و شنید، یہ اسی طرح کے تمام معاملات مسجد نبوی ہی میں طے پاتے تھے- خود مسلمانوں کو آپنے مسجد کے متعلق متعدد حالات میں تنبیہ فرمائی اور انہی سے احکام احترام و حقوق مسجد مستنبط ہوئے، مثلاً منع اکل البصل و ثوم، و منع انشاد ضالہ، و منع بیع، و شراء، و غیر ذلک، مگر ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں جس سے ثابت کیا جا سکے، کہ آپنے کسی غیر مسلم کو صرف اس بنا پر مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے- آپکے زمانہ میں اور آپکے بعد خلیفہ دوم

اس لیے شرک و بت پرستی کی اجازت عبادت گاہ میں نہیں دی جاسکتی، مسیحی نماز کے تین رکن ہیں تلاوۃ، سجدہ، دعا، پس انہوں نے اپنے طریق پر یہی کیا ہوگا۔

ثالثاً روایات سے ثابت ہے کہ اس وفد میں ساٹھ آدمی تھے۔ ساٹھ آدمیوں کی جماعت اچھی خاصی جماعت ہے۔ نماز پڑھی ہوگی تو بہت نمایاں حالت ہوگی، کچھ یہ بات نہ تھی کہ ایک دو آدمیوں نے کسی گوشے میں چپکے سے کوئی کام کیا اور چلدیئے، بااین ہمہ آپ نے اجازت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ اپنی نمایاں اور ممتاز شکل میں بھی احترام مسجد کے خلاف نہ تھا، ورنہ آپ ضرور روکتے، اور ظاہر ہے کہ خلاف کیوں ہوتا۔ اسلام قیام عبادت کے لیے آیا تھا نہ کہ منع عبادت کے لیے۔ یہود و نصاریٰ پر سب سے بڑا الزام تو اس نے یہی لگایا کہ یہی عبادت کرتے ہیں۔ مگر وہ شے جس کا نام "قیام عبادت" ہے مفقود ہوگئی ہے۔ حافظ ابن قیم نے اپنی عادت کے مطابق اس واقعہ کے فقہ پر بھی بحث کی ہے، "ففیہا جواز دخول اهل الکتاب مساجد المسلمین وفیها تمکین اهل الکتاب من صلاتهم بحضرة المسلمین وفی مساجدهم ایضاً اذا کان عارضاً ولا یمکنوا من اعتیاد ذلک" (جلد دوم صفحہ ۳۹ مطبوعہ مصر)

رابعاً اس واقعہ سے اُن مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو چند جزئی اختلافات کی بنا پر خود مسلمانوں کو اپنی مسجدوں میں آنے سے روکتے ہیں اسکے لیے مقدمہ بازیاں کرتے ہیں۔ اور ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ الخ کی وعید میں داخل ہوتے ہیں، اعاذاللہ تعالیٰ منہ۔

(۳)

اگر یہ کہا جائے کہ اس واقعہ سے صرف اہل کتاب کے لیے جواز ثابت ہوتا ہے نہ کہ غیر اہل کتاب غیر مسلموں کے لیے، تو یہ بھی صحیح نہیں، فتح مکہ کے بعد جب قبیلہ ثقیف کا وفد آیا تو آنحضرۃ صلعم نے ان کو نہ صرف مسجد میں آنے دیا، بلکہ بحیثیت مہمان کے مسجد میں ٹھہرایا، اور چند گھنٹوں کی شرکت مجالس اور کئی دن کے متصل قیام میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے اس وقت بھی بعض لوگوں کو اسپر وہی شبہ ہوا تھا جو آج لوگوں کو ہو رہا ہے، ہو۔ دنیا میں تجربہ کی طرح ناتجربہ کاری بھی ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ بعض مسلمانوں نے اعتراض کیا، انزلهم فی المسجد وهم

مشرکون " آپ ان کو مسجد میں ٹھہراتے ہیں، حالانکہ وہ مشرک ہیں؟ فرمایا " ان الارض لا تنجس " زمین انسانوں کے مس و قیام سے ناپاک نہیں ہو جاتی اور مسجد زمین و مکان کے ایک مخصوص ٹکڑے ہی کا نام ہے، یعنی نجاست دل کی نجاست اور گندگی، اعتقاد کی گندگی ہے۔ ابوداؤد اور امام احمد نے عثمان بن ابوالعاص سے جو خود شریک وفد تھے، روایت کیا ہے: " ان وفد ثقیف لما قدموا علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم انزلهم فی المسجد لیکون ارق لقلوبهم " اسی روایت کو بہ تغیر بعض الفاظ طبرانی نے بھی اوسط میں لیا ہے اور ابوداؤد نے بروایت حسن مرسلاً اسپر اسقدر زیادتی کی ہے " ان وفد ثقیف اتوا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فضرب قبۃ فی المسجد لینظروا الی صلوٰۃ المسلمین فقیل لہ یا رسول اللہ انزلهم فی المسجد وهم مشرکون؟ فقال ان الارض لا تنجس انما ینجس ابن آدم " چونکہ صاحب ہدایہ نے اس واقعہ سے جواز دخول پر استدلال کیا ہے اسلئے اسکی تخریج میں زیلعی نے تمام طرق حدیث جمع کر دیے، اسوقت میرے پاس نہ نصب الرایہ ہے اور نہ حافظ عسقلانی کی درایہ۔ لیکن اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو عطیہ بن سفیان کی روایت میں ہے کہ " قدم وفد ثقیف فی رمضان فضرب لهم قبۃ فی المسجد " وکما قال یعنی یہ وفد رمضان میں آیا تھا، پس ان کے قیام کیلئے آنحضرت صلعم نے ایک خیمہ مسجد نبوی میں نصب کرا دیا۔

اس واقعہ میں متعدد امور قابل غور ہیں۔

اولاً جب یہ وفد آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ مجھے انکے ٹھہرانے اور خدمت کرنے کا موقعہ دیا جائے، آپ نے فرمایا انکی خدمت و تکریم سے نہیں روکتا۔ لیکن ایسی جگہ ٹھہراؤ جہاں سے وہ قرآن سن سکیں " فقال لا امنعک ان تکرم قومک ولکن انزلهم حیث یسمعون القرآن " (زاد المعاد) اس سے معلوم ہوا کہ ان کو مسجد میں ٹھہرانا کسی مجبوری و عذر کی بنا پر نہ تھا بلکہ قصداً ٹھہرایا گیا اور اسکی ایک خاص علت تھی یعنی سماع قرآن و نظارۂ صلوٰۃ کما سیاتی بیانہ۔

ثانیاً، یہ وفد فتح مکہ کے بعد سنہ ۹ ہجری میں آیا ہے اور یہ وہ وقت ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا پورا پورا ظہور ہو چکا تھا۔ پس یہ وہ وقت غلبہ و شوکت کا تھا، اور خود وفد عاجزانہ اور مفتوحانہ آیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ عجز و درماندگی کی وجہ سے بہ نظر تالیف قلب و اعزاز و تکریم مخالفین انکو ٹھہرایا ہو۔

ثالثاً، معلوم ہے کہ اس وفد کے تمام ارکان مشرک تھے، اور مشرک بھی کیسے؟ با شدّ شدید، اور بغض اسلام و صاحب اسلام اور تصلّب فی الشرک و الجاہلیۃ میں مشہور و معروف، اس وفد کا سردار ابن عبد یالیل تھا۔ اس شخص کا یہ حال ہے کہ ابو طالب کے انتقال کے بعد جب قریش مکہ کا ظلم و جور اس حد تک پہنچ گیا کہ آنحضرت کیلئے مکہ میں رہنا بھی دشوار ہو گیا تو آپ نے طائف کا سفر کیا کہ شاید باہر کے قبائل حق کا ساتھ دیں۔ لیکن جب قبیلۂ ثقیف کی بستی میں پہنچے تو اسی عبد یالیل اور اسکے دونوں بھائیوں نے آپکے ساتھ یہ سلوک کیا کہ طائف میں دو مہینے کی مہلت نہ دی، دعوۃ حق کا یہ جواب ملا کہ "اما وجد اللہ احدًا یرسلہ غیرک" ؟ کیا خدا کو ہمارے سوا اسکو کوئی آدمی نہ ملا جسکو پیغمبر بنا کر بھیجتا؟ جب آپ واپس ہوئے تو بستی کے لڑکوں اور غلاموں کو لگا دیا کہ تضحیک و تحقیر کریں، انھوں نے آپ پر کیچڑ پھینکا، اس جسم مقدس کو جسکے بقا پر تمام کرۂ ارضی کی سعادت و ہدایت کی بقا موقوف تھی، پتھروں کی بوچھاڑ سے زخمی کر دیا۔ پیشانی مبارک کا خون پائے مبارک کو رنگین کر رہا تھا، اور یہ دعا ورد زبان تھی "اللھم الیک اشکو ضعف قوتی و قلۃ حیلتی وھو انی علی الناس یا ارحم الراحمین!" یعنی

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست   تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

اسکے بعد جنگ ہوازن و ثقیف کے جو واقعات پیش آئے، کتب سیرۃ کے مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں، جنگ ہوازن کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی مدینہ آیا، اور شرف بہ اسلام ہوا۔ مسلمان ہونے کے بعد تبلیغ حق کے عشق نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ آنحضرت روکتے رہے اور وہ اپنی قوم کی محبت کے اعتماد پر طائف واپس گیا، اور دعوۃ اسلام شروع کر دی۔ لیکن ثقیف نے اسکے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ایک دن عین حالت نماز میں شہید کر دیا۔ یہ حال تو اسلام و اہل اسلام کی عداوت کا تھا، شرک و جاہلیۃ کے جمود و تصلّب کا یہ حال تھا کہ جب فتح مکہ کے بعد یہ وفد

مدینہ آیا اور مسجد کے قیام، کلام الٰہی کی سماعت جماعت صلوٰۃ کے نظارہ، اور آنحضرتؐ کے خلق
عظیم کے اسلوب محبت سے مسخر ہو کر اسلام لانے کے لیئے آمادہ ہو گیا تو گو اسلام کی صداقت کا اعتراف
تھا لیکن پھر بھی بت پرستی اور جاہلیۃ کا کانٹا دل سے نہیں نکلتا تھا، چاہتے تھے کہ اپنی شرطیں منوا کر
مسلمان ہوں، پہلے کہا کہ نماز کی پابندی سے ہمکو مستثنےٰ کر دیجئے۔ فرمایا "لا خیر فی دین لیس
فیہ رکوع"، "وہ دین ہی کیا جس میں خدا کے سامنے جھکنے والی پیشانی نہو"! پھر کہا اچھا زنا کے
بغیر تو چارہ نہیں، ہماری قوم کے لوگ اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ فرمایا "انہ کان فاحشۃ وساء
سبیلا"، پھر کہا سود چھوڑنا مشکل ہے، شراب تو ہماری غذا ہے، فرمایا "اتقوا اللہ وذروا
ما بقی من الربوا" "رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ"۔ جب ان ساری شرطوں میں
سے کوئی نہ چلی تو آخر میں کہا اچھا ساری باتیں منظور مگر ربہ کو تو ہم اپنے ہاتھوں سے نہیں ڈھا
سکتے۔ ربہ یعنی دیبی، رب کا مؤنث۔ اس بات کو آنحضرتؐ نے منظور کر لیا۔ اور خالد بن ولیدؓ کو
چند صحابہ کے ساتھ بھیجا کہ طائف کی دیبی کو منہدم کر دیں۔ حضرت خالد نے مندر کی زمین تک کھود
ڈالی، مگر یہ لوگ یہی کہتے رہے کہ دیبی کی بے حرمتی کا وبال آئے گا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ سخت بت پرست اور اسلام کی عداوت
میں کس درجہ سنگدل تھے۔ بایں ہمہ آنحضرتؐ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ
جس قلعہ طائف کو مسلمانوں کی منجنیق چالیس دن تک سنگباری کر کے بھی فتح نہ کر سکی۔ اسکے بسنے
والوں کے دلوں کو آنحضرت صلعم کے خلق عظیم اور اسلام کی سماحت، مسجد کے قیام، اور اسلامی
عبادت کے نظارہ نے چند گھنٹوں کے اندر فتح کر لیا۔ لوہے کی تلوار کو سپر پر روکا جا سکتا ہے
لیکن محبت کی تلوار کے لیئے کوئی سپر نہیں۔

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

مسلم میں بروایت حضرت عائشہؓ ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلعم سے پوچھا "ھل اتی علیک یوم
کان اشد من یوم احد" جنگ احد والے دن سے بھی بڑھ کر کوئی مصیبت و شدت کا
دن آپ پر آیا ہے۔ فرمایا ہاں! "یوم العقبۃ اذ عرضت نفسی علی ابن عبد یالیل بن عبد
کلال فلم یجبنی الی ما اردت"، وہ دن جب میں طایف گیا اور اعانت و قبول حق کی امید سے

اپنی دعوۃ اہل عرب، یالیل کے سامنے پیش کی اور اُس نے میری کچھ پرواہ نہ کی، وہ دن اُحد
کے دن سے بھی میرے لیئے اشد تھا، تن تنہا بے یار و مددگار طائف کی گھاٹیوں میں پھر رہا تھا،
اور ایک انسان بھی نہ تھا جو مجھ پر ہمدردی اور ترس کی نظر ڈالتا، آپ کے اس ارشاد سے
اندازہ کرو کہ ثقیف نے آپکے ساتھ کیسا ظالمانہ و وحشیانہ سلوک کیا تھا، کہ اپنی ساری زندگی
کے اُن مصائب عظیمہ میں جو دعوۃ الی الحق کی راہ میں پیش آئے۔ طائف کی گھاٹیوں والی مصیبت
کو اشد فرمایا، اسی روایت میں ہے کہ باوجود ان تمام مظالم و شدائد کے آپنے فرمایا تھا۔
"ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ وحدہ لا یشرک بہ شیئاً"
اسپر بھی میں ان لوگوں کے لیئے بد دعا نہیں کرونگا۔ میں نے صدائے حق کا بیج ڈال دیا
ہے اور آج نہیں تو کل پھل لائے گا، یہ لوگ اگر بت پرستی پر تنے ہوئے ہیں تو انکی نسل سے
وہ لوگ پیدا ہونگے جو حق کو قبول کرینگے۔ اور اللہ کی پرستش کے سوا ان کی کوئی پرستش نہ ہوگی۔
غزوۂ طائف میں جب قلعہ مسخر نہ ہوا، اور مختلف مصالح مقتضی ہوئے کہ حصار اٹھا لیا جائے۔
تو لوگوں نے کہا "ادع اللہ علی ثقیف" ثقیف کے دلوں کو حق کے لیئے کھول دے،
چنانچہ وہی ہوا، جن لوگوں سے پتھر پھینکے تھے خود دوڑے ہوئے آئے کہ حق کے لیئے بے پناہ
تیروں سے اپنے دلوں کو دو نیم کر دیں، یہ تیر ان دشمنوں پر کہاں چلائے گئے تھے؟ میدان
جنگ میں؟ نہیں، خدا کی مقدس عبادتگاہ کے صحن میں "ضربوا لھم خیمۃ فی المسجد"
جن لوگوں نے منجنیق کے پتھروں سے اپنی دیواروں کو بچا لینے کا بندوبست کر لیا تھا، وہ
ان تیروں سے اپنے دلوں کو نہ بچا سکے، عثمان بن ابی العاص راتوں کو چھپ چھپ
کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آتے اور قرآن سیکھتے، یہ تھا وہ ھدی نبوی اور اسوۂ حسنہ رسالۃ
جس نے "فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ" کو بھی موم بنا کر پگھلا دیا، اس کے مقابلہ میں آج
مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کے ہمسایے اور شریک وطن عشق و محبت کے جوش سے بیخود
ہو کر ان کی مسجدوں میں خود بخود دوڑے آتے ہیں۔ کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے
ہیں، خود کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ نماز جنازہ کی صفیں کھڑی
ہوتی ہیں تو تسویۂ صفوف کی خدمت خود انجام دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے باقی دیگر نمازیوں کو

وضو کرا دیتے ہیں۔ مسجد کے چبوترہ پر کھڑے ہو کر پکارتے ہیں کہ ہم سب ایک کے بندے ہیں ایک ہی گھرانے کے بھائی ہیں، مگر مسلمان ہیں کہ اس نعمت الٰہی پر سجدہ شکر بجا لانے اور آنے والوں کو اور زیادہ اپنی طرف کھینچنے کی جگہ ناک بھوؤں چڑھا رہے ہیں، کہ ہماری مسجد غیروں کی چھوت سے بے احترام ہو گئی! غور کرو۔ پہلے کیا حالت تھی اور اب کیا حالت ہے؟ جب حالت میں انقلاب ہوا تو نتائج میں بھی انقلاب لازمی ہے۔

سارت مشرقۃ و سرت مغربا شان بین مشرق و مغرب

(۴)

حقیقت یہ ہے کہ آج اشاعت اسلام میں سب سے بڑی روک مسلمانوں کا یہی طرز عمل ہے اور یہ نتیجہ ہے قرآن و سنت کے علم و عمل حق سے بُعد اور ہدیٰ نبوۃ سے جہل و غفلت کا، یا با الفاظ مختصر علماء محقق و راسخین فی العلم کے فقدان کا، افسوس خود مسلمانوں کو اسلام کی قوت صداقت پر بھروسہ نہ رہا، نادان سمجھتے ہیں کہ دوسروں سے اگر ہم ملیں گے تو ہم ان میں جذب ہو جائیں گے ان کو اپنے میں جذب نہیں کر سکیں گے اور سچ یہ ہے کہ اس وہم فاسد سے بڑھ کر ہو کوئی خیال اسلام کے لیے مایہ عداوت و تذلیل نہیں ہو سکتا، اگر مسلمانوں کے پاس لوہا نہیں مقناطیس ہے تو مقناطیس اور لوہے کا جب آمنا سامنا ہوگا نتیجہ صرف یہی ہوگا کہ لوہا مقناطیس کی طرف کھنچے گا۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ ہر بات میں اللہ اور اس کے دین حق کی نسبت سوء ظن ظن الجاہلیۃ، اور ہر معاملے میں خود اپنے نفس پر بحکم و شھدوا علیٰ انفسھم شہادت بطلان، ضعف و ہلاکت؟ فالی اللہ المشتکی ثم الی اللہ المشتکی!

(۵)

وفد ثقیف کی روایات پر غور کرو، مسجد میں ٹھہرانے کی علت کیا بتائی گئی؟ یہ وہ تعلیل نہیں ہے جو تعلیل باطل ہے یعنی تحکم بالظن والرائے اور حصر تعلیل بالقیاس غیر مؤید بالنص، بلکہ یہ وہ تعلیل ہے جو خود شارع نے بتلادی، مغیرہ کو کہا کہ وفد کی تکریم نہیں روکتا، لیکن "انزلھم حیث یسمعون القرآن"، اور ابو داؤد و احمد و طبرانی کی روایت میں ہے، "لیکون ارق لقلوبھم"، اور ایک روایت میں ہے "لکی یسمعوا القرآن و یروا الناس اذا صلوا" (ابن ہشام)

یعنی وفد کو مسجد میں اسیلئے ٹھہرایا کہ وہ اسلام کے محاسن سے واقف ہوسکیں، قرآن کی صدائیں ان کے کانوں میں پڑیں، مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں اور خدا کی سچی اور فطری عبادت کی خوبیاں ان کے دلوں میں راہ پیدا کریں۔ اس ایک بات سے بے شمار فروعات دعوۃ تبلیغ اسلام اور جزئیات طرق اصلاح اقوام مستنبط ہوتے ہیں جنکو نہایت تفصیل سے رسالہ دعوت تبلیغ اسلام میں لکھ چکا ہوں بر مجلہ تالیفات قیام انجمن کے ہے۔ ازانجملہ یہ کہ اسلام کو اپنی صداقت وحقیقت کی طاقت پر پورا بھروسہ ہے اور قانون الہی یہ ہوکہ ہر قوی نسبت کو اپنی طرف کھینچتا اور ہر طاقت کمزور پر چھا جاتی ہے۔ قوت میں فاعلیت ہے اور کمزوری میں انفعال۔ اور قوۃ وضعف میں اعتبار کیفیت کا ہو نہ کہ مجرد کمیت کا۔ اسی قانون جذب و انجذاب وفعل وانفعال وطلب وانجلاب پر کارخانہ وجود وہستی کے تمام حوادث و اعمال کا دارومدار ہے، اور یہ قانون مادہ وجسم کی طرح تمام معقولات اور معنویات میں بھی ہو بہو ویسا ہی جاری وساری ہے۔ پس اسلام کا دعوی ہو کہ وہ قوت ہی، طاقت ہو۔ اصلح ہو امثل ہو۔ اسیلئے جب کبھی اسلام اور غیر اسلام میں قرب ہوگا، تو اسلام اپنے ماسوا کو کھینچے گا۔ اپنے میں جذب کرلے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اسلام کو غیر اسلام اپنے میں جذب کرلے۔ اگر ایسا ہو تو قانون الہی باطل ہو جائے، اور اگر یہ قانون باطل ہو تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے، یہی معنی ہیں اس آیہ کریمہ کے کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ، اور یہی معنی ہیں لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کے جسکی تفسیر میں لوگوں کو کیا کیا حیرانیاں نہیں ہوئیں، حالانکہ بات بالکل صاف اور قدرتی تھی، اس عالم میں بقا صرف اصلح کے لیئے ہے۔ اور بالآخر تمام غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا ہے، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ اور فیصلۂ حق و باطل کی یہی سب سے بڑی شہادت ہو قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ اور یہی معنی ہیں اس آیہ وانشا ہا کے کہ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؟ اور یہ کہ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ اور إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ، وامثال ھذا فی الکتاب والسنۃ، اسی اصل الاصول کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے اپنے تمام عقائد، اعمال، اماکنہ، اور مراسم و اجتماعات میں دوسرے مذہبوں کی طرح کوئی راز

اور مخفی بات نہیں رکھی ہے اسکی ساری باتیں دوپہر کے سورج کی طرح کھلی اور چمکیلی ہیں اسکی
عبادت گاہوں میں کوئی بھید نہیں جسکے کھل جانے کا اس کو ڈر ہو۔ دل اور روح کو چھوڑکر
اس نے زمین اور مٹی کی کوئی ایسی پاکی اور ستھرائی نہیں بنائی ہے۔ جو جسم وجود اور اسکے
سایہ کی چھوت سے ناپاک ہو جائے وہ ایک بے باک طاقت اور کامل حسن کی طرح سب کو
دعوت دیتا اور بلاتا ہے کہ آئیں، دیکھیں، مفتون ہوں۔ اسکی صداقت کی دعوت اسکی ہر چیز
میں ہے۔ صرف چند چنے ہوئے واعظوں کی بولیوں ہی میں نہیں ایک مسلمان کا وجود یکسر دعوت
و وعظ ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ ایک مسجد اور اسکی سادہ اور بے نقش و اشکال دیوار عمل
مجسم وعظ و حق ہیں۔ جبکہ امام قرآن پڑھ رہا ہو، اسکے نمازیوں کی صفوں کے نظارہ دلفریب
سے بڑھ کر کوئی خطبہ تبلیغ اور درس دلائل نہیں، جبکہ ایک ہی خدا کے بندے بنیان مرصوص
کی طرح کاندھے سے کاندھا جوڑے کھڑے ہوں، اور خدا کی قائم کی ہوئی انسانی اخوت
کو مکم نیشد بعضہ بعضا، کتشبیک الاصابع دکھلا رہے ہوں، پس وہ انسانوں کو
اپنی ہر بات دکھلانا، اور ہر مقام پر بلانا، اور ہر راہ میں اپنے سے جوڑنا، اور ہر شکل میں اپنے
سے قریب کرنا چاہتا ہے اور اسکا دعویٰ ہے کہ جو اُس سے قریب ہوگا بالآخر اسمیں جذب
ہو جائے گا۔ قرب و اتحاد میں اسکے لیے خوف نہیں ہے کہ وہ غیروں سے بھاگے اور الگ
رہے بلکہ غیروں کے لیے انجذاب و انفعال ہے جس کے لیے ان کو ڈرنا اور بھاگنا چاہیے، اس
کا سارا رونا تو یہی ہے کہ لوگ اسکی سنتے نہیں اسکو دیکھتے نہیں، اسمیں آتے نہیں۔ اسکی
طرف گردن موڑتے نہیں لووا رؤسهم ورأيتهم يصدون وهم مستكبرون!
پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندے اسکی طرف پیار اور اخلاص سے بڑھیں اور وہ ان پر اپنا
گھر بند کر دے کہ تمہارے اندر آنے سے میرے گھر کی تقدیس کو بٹہ لگ جائے گا؟ مسجدوں
کا اصلی احترام یہی ہے کہ اسمیں انسانوں کی بھلائی کے لیے انسانوں کا اجتماع ہو، انسانوں
کے نکال دینے میں انکی حرمت نہیں بلکہ بے حرمتی ہے۔ اسلام نوع انسانی کی عظمت و احترام
کے لیے آیا ہے، نہ کہ تذلیل و تحقیر کے لیے پس وہ کسی انسان کو بہ حیثیت ایک انسان کے
نجس نہیں قرار دیتا، جسکی چھوت سے مٹی اور اینٹ ناپاک ہو جائے۔ نجاست انسان کے

جسم میں نہیں بلکہ اُسکے اعتقاد اور عمل میں ہوتی ہے۔ کاش جسم میں ہوتی تو دریا کا پانی اسکو دھو دیتا اور انسان کا
بنا ہوا کپڑا پونچھ دیتا، مگر افسوس وہ دل اور عمل کی گندگی ہے، جسپر نہ تو پانی بہایا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ہاتھ صاف
کرسکتا ہے۔ اسکو صرف خدا کا سچا ایمان اور راستی کا کامل عشق پاک کر دیسکتا ہے۔ سو انسانوں پر اسکی راہیں بند نکرو!

(۶)

جہاں تک مکان اور عمارت کا تعلق ہے، اسلام کی دینی عمارت صرف مسجد ہی ہے اور کوئی نہیں۔ پس اگر
اسلام غیروں کو قبول کرنا چاہتا ہے تو مسجد ہی میں قبول کرنا پڑیگا، آج اگر ہمارے ہندو بھائی خود اپنی محبت
اور پیار سے ہماری مسجدوں میں آتے ہیں، تو یہ وہ چیز ہے جسکی خود ہم کو آرزو کرنی تھی، اور جسکو اول دن
ہی سے شروع ہو جانا تھا، کاش اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی نو صدیوں سے مسلسل
قیام بے اثر ثابت نہ ہوتا اور آج ملک کے سارے تفرقے مٹ گئے ہوتے، میں جب رانچی میں
نیا نیا آیا اور جامع مسجد میں جمعہ کے خطبوں کا سلسلہ شروع ہوا تو شہر کے بہت سے تعلیم یافتہ ہندو طلبا
اور وکلاء وغیرہ کو تقریر سننے کا شوق ہوا، انہوں نے کہلایا کہ کوئی صورت اختیار کیجئے کہ ہم بھی
تقریریں سنیں، میں نے جواب دیا کہ نظر بندی کی قید کی وجہ سے عام مجالس کا انعقاد آپ لوگوں
کیلئے موجب مشکلات ہوگا۔ اگر شوق ہے تو مسجد میں کیوں نہیں آتے؟ اسپر ان لوگوں کو تعجب ہوا
کہ مسجد میں جمعہ کے موقعہ پر ہم لوگ کیونکر جا سکتے ہیں؟ لیکن میں نے عین جمعہ کے دن ان کے مسجد
میں آنے اور ایک مناسب مقام سے خطبہ سننے کا انتظام کر دیا، اس کے بعد انجمن اسلامیہ قائم ہوئی
اور اسکی تمام مجالس بھی مسجد ہی میں منعقد ہوتی رہیں، ان میں بھی تمام ہندو شریک ہوتے رہے صرف اتنی
سی بات سے جو نتائج حسنہ پیدا ہوئے وہ شاید برسوں کے وعظ و تبلیغ اور آجکل کے مجادلات و
مناظرات سے بھی پیدا نہ ہوتے اور ان کا اندازہ بھی باہر کے لوگ نہیں کرسکتے۔ جبتک اسکی طولانی سرگذشت
سنائی جائے ۔

(۷)

منجملہ خصائص خمسۂ اسلام کے یہ ہے کہ "جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً" (بخاری) خدا کی
ساری زمین اسلام کے لیے مسجد ہے:- ہر جا کنیم سجدہ، بدآن آستان رسد!
جس اسلام کی اس وسیع اور غیر محدود عبادتگاہ کو ہزاروں قوموں اور مذہبوں کا رہنا اور بسنا ناپاک
نہ کرسکا اسکی چار دیواری کے اندر گھری ہوئی عبادتگاہ کو غیر مسلموں کا داخل ہونا کب بے احترام کرسکتا ہے؟

مسلمانوں کے اذن سے جائز ہے، اور علی الخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رح کا مذہب تو اس بارے میں مطلقین ہے، یہاں تک کہ معلوم ہوا ان کے نزدیک مطلقاً بلا قید و استثنا جائز ہے، اذن کی بھی شرط نہیں، اشباہ والنظائر میں ہے:

"ولا یمنع من دخول المسجد جنباً بخلاف المسلم ولا یتوقف جواز دخوله علی اذن مسلم عندنا ولو کان المسجد الحرام" (الی ان قال) "ولنا ما روی ان النبی صلعم انزل وفد ثقیف فی مسجده وهم کفار ولان الخبث فی اعتقادهم فلا یؤدی الی تلویث المسجد" (کتاب الکراهیة و مسائل متفرقه)

یعنی ہمارے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں اگر ذمی مسجد حرام میں داخل ہوں، برخلاف امام شافعی کے جو عام مساجد میں دخول کو جائز قرار دیتے ہیں، مگر مسجد حرام میں نہیں۔ اور دلیل ہماری وفد ثقیف کا مسجد میں نزول ہے، حالانکہ وہ کفار تھے اور اس لئے کہ مشرک کا خبث اس کے اعتقاد کا خبث ہے، جسم کا نہیں جس سے مسجد کے ملوث ہونے کا اندیشہ ہو۔ قاضی زادہ اسکی شرح میں لکھتے ہیں:- "قال بعض المتاخرین ظاهره ان هذا دلیل آخر ولا وجه له نحو التعبیر بحرف التعلیل بل یکون اشارة الی دفع ان یقال کیف انزلهم فی مسجده وقد وصفهم الله بکونهم انجاساً اقول لیس ذلک بشئ اذ لا شک فی صحة ان یکون هذا دلیلاً آخر عقلیاً ثانیاً فان الخبث اذا کان فی اعتقادهم لا یؤدی الی تلویث المسجد فلا یکون فی دخولهم المسجد بأس (الی ان قال) کما حکی انه علیه السلام لما انزلهم فی مسجده وضرب لهم خیمة قال الصحابة قوم انجاس فقال علیه السلام لیس علی الارض من انجاسهم وانما انجاسهم علی انفسهم" (تکملہ فتح القدیر جلد ۸ صفحہ ۱۳۴) عبارت ہدایہ کا اشکال اور شارح کا جواب ائمہ شافعیہ کی تحقیق آگے آئے گی، شارح نے نزول وفد ثقیف پر صحابہ کے اعتراض اور اسکے جواب والی روایت میں جن الفاظ کو نقل کی ہے گو وہ الفاظ نہیں، مگر معنی صحیح ہیں اصلی روایات اوپر گذر چکیں، نقل متن اور حفظ اسناد کا یہ وہ تساہل ہے جو جا بجا خود صاحب ہدایہ نے کیا ہے اور متاخرین فقہاء حنفیہ میں عینی اور ابن ہمام کے سوا سب کرتے ہیں۔

اسیطرح در مختار میں ہے "وجاز دخول الذمی مسجداً ولو جنبا" (باب الکراهیة) قاضی ابن رشد، ہدایہ میں لکھتے ہیں "وجوزوا (الحنفیة) مطلقاً" یعنی حنفیہ کے نزدیک مطلقاً ذمیوں کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے (ہدایۃ المجتہد شہر میں ہے اور میں مورآباد میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اسلئے صفحہ کا حوالہ نہیں دے سکتا۔ کتاب الکراهیة دوسری جلد میں ہوگا) + (باقی آئندہ)

ابوالکلام (معارف)

قدیم یونان کی تہذیب نے اپنا مقررشدہ کام کیا اور فنا ہوگئی - اور اسکے بعد پھر کبھی دوبارہ زندہ نہ ہوئی - یونان کی تہذیب اپنا مقصد حیات حاصل کرنے کے بعد فنا ہوگئی اور دوبارہ زندہ نہ ہوئی - علوم وفنون کے دوبارہ زندہ ہونے کے ساتھ جدید یورپ پیدا ہوا - یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پندرھویں صدی میں جبکہ ارتقا شروع ہوا اسوقت اٹلی اور اسپین علم ادب سائنس جذبات اور معاشرت کے معاملات میں یورپ کے لیڈر تھے جب ان ممالک نے اپنا کام کر لیا تو وہ بحیثیت ایک کام کرنے والے (تہذیب) پیدا کرنے والے کے نابود ہوگئے نصف صدی کے اتحاد کے باوجود آج اٹلی کیا ہے ؟ اسنے دیگر مغربی ممالک سے بہت کچھ قرض لیا ہے اور اسکے بدلے میں کوئی بھی قابل ذکر چیز دینے کے قابل نہیں ہوا اور ہسپانیہ ؟ کیا اب وہ محض لاشے نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ دور سابق کا ایک دھندلے سے خاکہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے - اور اس سے جہاں تک کہ ہم محسوس کرسکتے ہیں - اسکی بالکل امید نہیں ہوسکتی کہ وہ سابق میں کوئی کارنمایاں کرسکے گا - دیگر چھوٹے چھوٹے ممالک مثلاً پرتگال، ہالینڈ وغیرہ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے جو ایک زمانہ میں انسانی جدوجہد کے بعد شعبوں میں یورپ کے لیڈر تھے مگر آج قریب قریب ہر نقطہ نظر سے کوئی درجہ بھی نہیں رکھتے -

ان سب واقعات کی موجودگی میں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر ڈکنس یورپ کے متعلق اپنا مذکورہ خیال کیونکر قائم کرلیتے ہیں - جبسے کہ ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں عظیم الشان جنگ شروع ہوئی - اور ختم ہوگئی - اس نے ایک مدت کے لیئے یورپین اقوام کی جدوجہد کو نمایاں کردیا مگر کیا ہم کو یہ یقین نہیں رکھنا چاہیئے - کہ اس مہیب جنگ کے خاتمہ نے ایک دور جدید کا افتتاح کردیا ہے - جسمیں امریکہ رہنمائی کرے گا اور یورپ تقلید - یہ اسوقت تک بالکل نمایاں نہیں ہے آیندہ کے متعلق حالات دوسروں کی نظروں کے سامنے نہ ہوں مگر ہم جانتے ہیں کہ اب ہوا کس طرف کی ہے - امریکہ نے انگلستان اور دیگر یورپین اقوام کو روپیہ قرض دیا ہے - امریکہ دنیا میں سب سے بڑا بیڑا رکھنے کی کوشش کر رہا ہے - اور ۲۰ برس میں وہ اس میں کامیاب ہوجائے گا اسوقت بھی اس کا تجارتی بیڑا سب سے زبردست ہے - فرانس کو فاتح ہے مگر اسکی قوت اس قدر ختم ہوگئی ہے کہ وہ غالباً بڑی قوت نہیں بن سکتا - جو وہ گذشتہ صدی کے شروع میں تھا -

ہمیں روسیوں اور اطالیوں سے کوئی بڑی توقع قائم کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔ جرمن کے مستقبل کے متعلق کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ رائے زنی نہیں کر سکتا۔ امریکہ کی دنیا میں عظیم الشان ترقی سے ہمارے پاس یہ باور کرنے کے آخر کون سے وجوہ ہیں۔ کہ مغرب میں روحانیت ترقی پذیر ہوگی۔ اگر یورپ میں مادیت کے خلاف کوئی جذبہ پیدا ہوا ہے تو وہ صرف ان چند لوگوں تک محدود ہے جنکو کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

آخر یورپ کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود ہے کہ جو ملک یقینی مادیت کا بندہ ہو اس میں یکایک روحانی خیال رکھنے والے مذہبی جذبات کو تقدیم دینے والے جید عالم فلسفی مقنن شاعر پیدا ہو جائیں۔ اسکی توقع کرنا محض خیال ہے۔ اس پر یہ کہنا آسان ہے کہ رفتار زمانہ کے ساتھ ہماری تہذیب مٹ جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھیئے کہ تاگزیر یا تو ہم کسی کے سامنے آنکھیں بند کئے ہوئے [illegible] پیدا ہوا ہو۔ ہم جانتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں مغربی خیالات مشرقی ممالک پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور اگر ہم کوشش بھی کریں تو ان کے اثرات سے بالکل محفوظ نہیں رہ سکتے لیکن یہ تو ہم ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ مشرق بھی مادیات کی اس منزل پر پہنچ کر گزر سکے گا جس سے یورپ اس وقت ہو کر گذر رہا ہے۔ اسمیں کلام نہیں کہ مغربی فن تجارت۔ فن حرفت ایشیا میں جاپان میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور دیگر مشرقی ممالک چین ہندوستان وغیرہ میں بہت عجلت کے ساتھ عمل ہو رہی ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یورپ کے خلاف ہمارے بڑے آدمی ہیں جو [illegible] کے خلاف ہیں اور انہیں سے ہماری امیدیں قائم ہیں۔ مشرقی روحانیت [illegible] قوتوں کے مقابلہ کے لیئے بہت کافی اور بہت طاقتور ہے۔ ہم نے وہ خیالات حیات قائم رکھے ہیں جو بیرونی دشمنوں کے ہاتھوں پورے طور پر تاراج نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ [illegible] نقصان پہنچے ممکن ہو کہ انکی قوت میں کمی واقع ہو جائے مگر انکا مٹنا ناممکن ہو بلکہ یہ بیرونی قوتوں [illegible] بنا کر اپنے میں داخل کرلیں گے۔ یہ مشرق کے لیئے ہو کہ وہ مستقبل کے صنعت و حرفت کو شاندار بنائے [illegible] ہمارے ہاں کی آب و ہوا میں مغربی اقوام کا سا نہ بننے دیگی۔ ہم سیکھتے ہیں کہ دنیا کی مستقبل [illegible] مشرق میں ہے تاریخ نے ہمیشہ یہ دکھایا ہے کہ طاقت اور تہذیب غالباً اب یورپ سے امریکہ کی طرف منتقل ہو گئی ہے یعنی مغرب قریب اور مغرب وسطی سے مغرب بعید آگئی ہو اور اسکے بعد جلد یا بدیر اسے پہلے مشرق بعید میں جانا چاہیئے اور [illegible] مشرقی ممالک میں +

ولی بی مترا (مترجمہ انڈین ریویو)

(بسلسلۂ ماہ جون)

محل دوم

ارجن۔ اب آپ جو کچھ دیکھا، خواب تھا، یا واقعہ؟ دونوں وقت ملتے سبزہ، پر میں ایام گذشتہ کے خیال میں مستغرق بیٹھا تھا، کہ ایک پری شمائل، حلہ انسانی سے آراستہ و پیراستہ، بیتوں کی سطح بہتے نہر منٹ میں سے، خراماں خراماں نکلی، اور کنارہ آب، ایک مرمری سل پر جا کر کھڑی ہوئی۔ نظر کہتی تھی، کہ زمین کا دل اسکے پائے سیمین کے نیچے، اب متزلزل ہوا چاہتا ہے۔ خیال کہتا تھا، کہ جیسے صبح صادق کی سنہری جھلک مشرقی پہاڑیوں کی برف پوش چوٹیوں سے رفتہ رفتہ ڈھل جاتی ہے، اسی طرح اس گلبدن کے حریری پوشاک بھی، عالم محویت میں، اسکے جسم پر سے کافور ہوا چاہتی ہے۔ اتنے ہی میں اسنے جھک کر منعکس سطح آب کے آرسی میں، اپنے مصحف رخ کو دیکھا۔ پہلے تو ذرا جھجکی۔ اور عالم سکوت میں رہی، پھر تبسم کیا، اور ادائے لاپرواہی سے، دہنے ہاتھ سے گیسوئے دراز کھولے، جو پاؤں کے مقابل، زمین سے آغوش میں آ رہے۔ سینے پر سے لباس ہٹایا۔ خود اپنے دست و بازو پر ایک نگاہ کی۔ نیچے سے ٹک درست، ایڑی سے چوٹی تک سلاست کی جان۔ ذرا سر ابھار کر آئینہ آب میں شباب کے پیارے غنچوں پر نگاہ ڈالی۔ اور بلور و شہاب کی دھوپ چھاؤں دیکھی۔ حیرت آمیز مسرت کی کرنوں سے چہرہ دمک اٹھا۔ اگر کنول کی کلی۔ علی الصباح چشم نیم باز وا کرکے ذرا گردن جھکا کے سطح آب میں، خود اپنا عکس دیکھے تو تا غروب آفتاب، اپنے دلفریب حسن پر تحیر آمیز ناز کرے۔ مگر ایک لمحہ کے لمحہ میں لبہائے نازک سے تبسم مفقود، اور سرمگیں آنکھوں میں آثار تاسف موجود ہوئے۔ کھلے بالوں کو گوندھ کر، پوشاک زیب تن کی، اور ٹھنڈے سانس بھرتی آہستہ آہستہ قدم رکھتی روانہ ہوئی۔

گویا نظر فریب شام تاریکیٔ شب میں غوطہ زن ہو۔ ایک ساعت کی ساعت میں شرارۂ برق کی طرح، منزل مقصود نظر آئی، اور طعنۂ نہنگ ظلمت ہو گئی ...... یہ کس نے دروازہ کھولا؟

چترا۔ زنانہ لباس میں داخل ہوتی ہے۔

[illegible] دلِ مضطرب خاموش رہے، وہ خود موجود ہے ..... اے خاتون ہراس کا کوئی موقعہ نہیں، میں چھتری زادہ ہوں،

چترا۔ والا قدر! میری اس مندر میں نمایش ہے، اور آپ میرے مہمان ہیں حیران ہوں، کہ کس طرح مدارات بجا لاؤں۔!

ارجن۔ اے مہر منیر، تیرے دیدار سے بڑھ کر اور کیا مدارات ممکن ہے؟ اگر ناگوار خاطر نہ ہو، تو ایک سوال کروں۔

چترا۔ بشوق فرمایئے۔

ارجن۔ کس عہد شکن نے، تمہیں اس شوالہ کے حصار میں عزلت گزین بنا کے، ہم خاکیوں کو تمہارے دیدارِ دلاویز سے محروم کیا؟

چترا۔ صاحب، میرے دل میں ایک تمنا پوشیدہ ہے، جسکے بر آری کی [illegible] معبود شوا کی بندگی میں مصروف ہوں۔

ارجن۔ بھلا تو خود، کہ مطلوب عالم ہے، کس کی طالب ہو سکتی ہے؟ [illegible] سے [illegible] کی چوٹیوں پر خاور زرین بوقت طلوع اپنا شعلہ فشان قدم رکھتا ہے۔ اقصائے غرب تک میں پھرا ہوں۔ عالم کی تمام بیش بہا و خوبصورت اور عالیشان چیزیں میری نگاہ سے گذری ہیں۔ اگر تیری زبان سے حرف تمنا سن پاؤں، کہ کیا شئے مطلوب ہے، تو [illegible] معلومات کی [illegible] خدمت میں پیش کروں۔

چترا۔ میرے مطلوب سے عالم واقف ہے۔

ارجن۔ اوہو! ذرا سنیں تو وہ کون ہے۔ جس پر دیوتاؤں کی نظر عنایت ہے۔ اور جس کی شہرت نے تمہارے دل کو مسخر کر لیا ہے؟

چترا۔ شاہی گھرانوں میں افضل گھرانہ کا مایۂ ناز، وہ جوانمردوں کا سرتاج ہے۔

ارجن۔ خاتون! اپنی حسن کی بیش قرار دولت کسی کی جھوٹی شہرت پر یوں نثار نہ کرو۔ بتا، جھوٹی شہرت اس طرح زبان زد خلائق ہوتی اور پھیلتی ہے جیسے صبح کاذب کا پردہ کہر طلوع آفتاب سے قبل۔ ذرا ہم بھی تو سنیں، کہ وہ معروف خاندان شاہی میں سے کس خاندان کا نام آور جوانمرد ہے۔

چترا۔ سنیاسی، تجھے دوسروں کی شہرت پر حسد ہے! معلوم ہے کہ کورو کا شاہی خاندان تمام عالم میں معروف ترین مانا جاتا ہے؟

ارجن۔ کورو کا خاندان!

چترا۔ اور، تونے اس دور دور مشہور گھرانے کے اعلیٰ رکن کا نام سُنا ہے؟

ارجن۔ ذرا تمہارے لب شیریں سے سنیں۔

چترا۔ جہانگیر۔ ارجن! میں نے لوگوں کی زبان سے اس لازوال نام کو لوگوں کے زبان اور منہ سے اڑا کر، اپنی اچھوتے دل میں چھپا کر بہ احتیاط رکھا۔ سنیاسی! پریشان کیوں نظر آتا ہے؟ تو کیا اس نام کی چمک دمک محض جھوٹی ہے؟ اگر یہ ہے تو کہہ دے۔ میں ہرگز نہ تامل کرونگی، بلکہ اس درج دل کو چور کر کے اس مصنوعی گوہر کو خاک میں ملادونگی۔

ارجن۔ بلکہ خواہ اس کا نام و شہرت، اسکی دلاوری و جانبازی، سچی ہو یا جھوٹی، تم اسے اپنے دل سے ہرگز دور نہ کرنا۔ لو وہ خود اس دم تمہارے قدموں پر ہے۔

چترا۔ ہیں! ارجن!

ارجن۔ میں ہی ارجن ہوں، گرسنۂ الفت تمہارے در پر مہمان۔

چترا۔ تو کیا یہ نادرست ہے، کہ ارجن نے بارہ برس کے طول طویل عرصہ تک ناکتخدا رہنے کا عہد کیا ہے؟

ارجن۔ مگر تم نے میرے عہد کو اس طرح توڑ دیا۔ جیسے ماہتاب شب کے عہد ظلمت کو توڑ دے۔

چترا۔ حیف ہے! آخر مجھ میں کیا دیکھا، کہ اس بدعہدی کی ٹھانی؟ آخر ان سیاہ آنکھوں، اور بلوریں دست و شانہ میں کسکی تلاش ہے کہ جس کی خاطر

ہرد تقوں نی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ؟ یہ تو خوب جانتی ہوں کہ وہ مطلوب میری ذات ہرگز نہیں۔ بس اسی کا نام عشق ہے ؟ بس ، یہی مرد کی نگاہ میں عورت کی اعلیٰ قدر و منزلت ہے ۔ افسوس اس جسم فانی کا سراب چشم ہوش کو اس درجہ نابینا کر دیتا ہے ، کہ روح لامحدود آنکھوں سے پنہاں رہتی ہے۔ بس ہاں ، ارجن اب معلوم ہو گیا کہ تیری ملاوری اور جوانمردی کا شہرہ غلط ہے۔

ارجن ۔ ہاں مجھ پر بھی روشن ہو گیا ، کہ شہرت اور جوانمردی کا غرور کس قدر فضول ہے تمام دنیا بے وجود ، اور ادنام معلوم ہوتے ہیں۔ صرف ایک تم ہو کہ نہ صرف وجود مکمل ہو بلکہ تمام عالم کی دولت وحشمت قدرت عصمت ۔ اور تمام مقاصد کی منزل ۔ دنیا بھر میں لاثانی ، خوبصورت تو دنیا میں اور بھی ہیں جن سے بہتر ، بیچ در تعینت ہو سکتی ہے مگر تمہیں نگاہ بھر کے دیکھنا گویا عالم آدمیت کے معراج پر دیکھنا ہے۔

چترا ۔ ہائے ارجن ! یہ میں نہیں ہوں ۔ یہ ایک دیوتا کا عطا کردہ دام تزویر ہے میرے مطلوب اپنا راستہ لیجئے آگے بڑھ نظر فریب سے دل نہ لگا۔ شراب میں اپنی الفت نہ برباد کر۔

محل سوم

چترا ۔ نہیں نہیں ۔ غیر ممکن ۔ بھلا اُن پُر شوق آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں ۔ کہ جو روح کو حسرت ناک ہاتھوں کی طرح اپنے آغوش میں لے لیں ، اسکے دل کو بیقرار دیکھوں ۔ اور اسکے بڑھنے دنگھٹے کر سہ وف نالہ پاؤں ۔ اسپر بھی اسے گدا کی طرح جواب صاف دیکر ٹالوں نا ممکن : ہرگز ممکن نہیں ،

مدن اور بسنت داخل ہوتے ہیں

ہے یہ صدائے عشق یہ کیسا غضبناک شعلہ میرے تن بدن میں بھڑکا دیا ہے ! جلتی جاتی ہوں ۔ اور جس شے کو ہاتھ لگاتی ہوں ۔ وہ بھی جھلسی جاتی ہے ۔

مدن۔ میں ذرا گذشتہ شب کا حال سننا چاہتا ہوں +

چترا۔ شام ہوتے ہی گیاہ کی مخملی سیج پر، کہ بہار کے پھولوں کی پنکھڑیوں سے مرتب تھی، لیٹ گئی۔ اور ارجن کی زبان سے سنی ہوئی تعریف حسن کا خیال کرنے لگی۔ ذخیرۂ تحسین کہ دن بھر کی محنت سے جمع کیا تھا۔ کام مزا میں قطرہ بہ قطرہ ٹپکانے لگی۔ زندگی سابق مثل زندگانیہائے ماضی۔ نہم و حافظہ سے کافور ہو گئی۔ اور میری کیفیت اس پھول کی سی تھی کہ جس کے کان، چند لمحات مستعار کے لئے جنگلستان کی تملق آمیز سرگوشیوں سے آشنا ہوتے ہیں اور جو بعد ازاں رواقِ نیلی فام کے نیچے نیچی نظریں کئے، سر جھکائے، بے آہ و بکا۔ ایک آنِ واحد میں گل کے کنارہ میں آ رہتا ہے۔ اور اس لمحہ مکمل کا قصہ، جو قیدِ ماضی و استقبال سے آزاد ہے، انجام ہو جاتا ہے۔

بسنت۔ ایک لامحدود زندگی شاندار۔ عرصۂ طلوع مہر میں شگفتہ ہوتی اور صرف فنا ہو جاتی ہے +

مدن۔ جس طرح لامحدود معنی ایک تنگ عرصۂ نغمہ میں +

چترا۔ بادِ صرصر نے مجھے تھپک کے، خواب کے پہلو میں بے حس و حرکت کر دیا۔ اور چنبیلی کے پھولوں سے لدی ہوئی محراب نے، اوپر سے، میرے جسم پر بے آواز بوسے مترشح کرنے شروع کر دئے۔ کسی پھول نے بالوں کے بھنور میں جان دی۔ تو کسی نے چھاتی کی سیج پر، اور کسی نے قدموں کے آغوش میں۔ میں نیند بھر کے سوئی، مگر عالم بیہوشی میں، مجھے یکایک یہ معلوم ہوا کہ شعلہ کے شمع سان پنجے کی طرح کسی کے دل میں کھب جانے والی نظریں میرے خوابیدہ پہلو سے ہمکنار ہوئیں۔ میں چونکی تو کیا دیکھتی ہوں، کہ سنیاسی میرے سامنے کھڑا ہے۔ چاند مشرق سے غرب تک سفر کر چکا ہے۔ مگر پتوں کے جھرمٹ میں سے جھانک جھانک کر اس عجوبہ صنعت ایزدی کو دیکھ رہا تھا جو جوب آسا ابدان انسانی پر ظہور پذیر تھی۔ بادِ صبا گلزاری خوشبوئے پشت خم تھی۔ اور خاموشیٔ شب پر، دائرہ پروانہ میں مصروف ترنم۔ اشجار کا عکس سطح آب پر عالم سکوت میں میٹھی نیند سو رہا تھا، اور ارجن ہاتھ میں عصا لئے صورت الف دراز قد مثل صنوبر ہے

خاموش کھڑا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ گویا اس دنیا سے گزر کر، میں خواب کے شکم سے
جہان تصورات میں جا پیدا ہوئی - میا پیراہن دریدہ کی مانند قدموں میں آ رہی - اور ارجن کی آواز کان
میں آئی "جانم، عزیز تر از جانم! میری تمام زندگانی کے لئے صفیٰ جاگ اٹھیں، اور سب نے ہم آواز ہو کر
جواب دیا" میری جان میں حاضر ہوں۔ میرا زمان زوال پذیر ہے - یہ کہہ کے، میں نے اپنا ہاتھ
اسکی طرف بڑھایا - ماہتاب تمنات اشجار کے پیچھے روپوش ہو گیا، اور ہر شے پر ایک تاریکی کا پردہ
چھا گیا - زمین و آسمان، زمان و مکان، خطرہ، درد، حیات و ممات، سب ایک ناقابل برداشت
سرور کی موج میں غرق ہو گئے - ادھر آفتاب کی پہلی شعاع نمودار ہوئی، اور مرغان سحر نے اپنا
نغمہ شروع کیا کہ میں بیدار ہوئی - میں اٹھ بیٹھی، مگر وہ ابھی خواب ناز میں تھا - اور اس کے
لب علیین پر، ہلال صباحی کی مانند، ایک مبہم تبسم تھا - مہر عالمتاب کی زرین شعاع نے اسکی
پیشانی پر بوسہ دیا - اور میں ایک آہ سرد بھر کے کھڑی ہو گئی، اسکے رخ انور کو مہر منور کی شعاع سے
بچانے کی غرض سے، میں نے بیلوں کے پتوں کی ایک چلمن سی بنا دی - ادھر گرد نظر ڈالی - تو وہی خاکی
زمین تھی - اور وہی پرانی دنیا - اپنی گذشتہ زندگی کا خیال کر کے میں مثل آہوئے سم خوردہ کے،
کہ خود اپنی پرچھائیں سے بھاگتا ہے - بھاگ نکلی - جنگلستان کی راہ پر، جس پر سے میں افتان و خیزان
گذر رہی تھی - شبو و سوسن کے پھول بچھے ہوئے تھے - آخر، ایک سنسان کونہ دکھائی دیا - اور میں
وہاں بیٹھ کر، اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا، دل کا بخار نکالنا چاہتی تھی، مگر آنکھ میں ایک قطرہ نہ آیا -

مدن - اے دختر فانیان حیف! میں نعمت خانہ فردوسی سے معنبر شراب طہور اڑا کے
لایا - اور ایک شب دنیاوی کا جام، اور اس سے لبریز کر کے، تیرے ہاتھ میں دیا، کہ تو اس کام
آشنا ہو مگر پھر بھی تیری زبان پر فریاد و درد ہے!

چترا - بدمزگی ہے، شراب طہور اتری کس کے حلق سے - جام آرزو وصل ہاتھ میں
لینے نہ پائی تھی کہ چھن گیا - یہ حسن مستعار، یہ تصنع نظر فریب میرے جسم سے اس طرح دور
ہو جانے لگا جیسے کہ پژمردہ پھول کی پنکھڑیاں - پریشان ہو جاتی ہیں - اور اس کے ساتھ ہی
وصل کی وہ یادگار بھی جو نے مجھے باقی رہی ہے - اور میں شب و روز اپنی گم مائیگی سے مطلق نادم اور
گریہ و زاری میں مصروف رہوں گی - اے شاہ عشق - یہ میری ظاہری شمائل ہر لمحہ اور ہر جگہ ایک

ہیبتناک آسیب کیطرح میرے ہمراہ ہے۔ اور وصل کی لذات، اور بوس وکنار کی چاشنی کو اُکر جسکی میں تشنہ ہوں تلخ کئے دیتی ہے۔

مدن۔ افسوس کہ تیری شب واحد نامراد رہی۔ سفینۂ مسرت نظروں کے سامنے آیا، مگر تلاطم امواج نے اسے کنارہ نہ لگنے دیا۔

چترا۔ ایک ساعت کے لئے فردوس بریں اس قدر قریب آئی کہ فرط جوش مست کی بدحواسی میں، منزل گہ مقصود تک پہنچنے کا خیال تک نہ آیا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی معلوم ہوا کہ خود میرا جسم میرا حریف ہے۔ اب ہر روز بادل ناخواستہ میں اسے زیور و لباس سے آراستہ و پیراستہ کرتی ہوں۔ اور اپنے دلبر تک پہنچاتی ہوں تاکہ اُسکے دل بہلنے کا سامان ہو۔ اے دیوتا، یہ اسی دنیا سے باز آئی۔ تو اسے واپس لے لے +

مدن۔ بھلا اگر میں نے اسے واپس لے لیا۔ تو تو اپنے عاشق کے سامنے کس منہ سے جائے گی؟ ذرہ غور کر، کیا یہ جفاکاری نہ ہوگی، کہ ابھی اسنے کام مراد کو با وہ حفظ سے تر بھی نہیں کیا۔ اور تو اسکے ہاتھ سے جام چھینا چاہتی ہے؟ بھلا وہ تجھ سے کس قدر برافروختہ ہوگا؟

چترا۔ ہاں۔ وہ اس سے لاکھ درجہ مناسب تر ہوگا۔ میں اُسے اپنی اصلیت سے، جو اس تصنع نظر فریب سے بدرجہا شریف تر ہے۔ آگاہ کرونگی۔ اگر میں اسکے پسند خاطر نہ ہوئی، اور اس نے مجھ سے قطع الفت کی، اور میرے دل کو شیشہ کی طرح چور کیا، تو بلا کسی صدمے کے۔ میں خاموشی سے صبر کرلونگی +

بسنت۔ میری نصیحت سُن۔ جب آمد خزان ہوتی ہے اور بہار کے سینہ میں دم واپسیں ہوتا ہے تو فتح و نصرت ثمر کے نقارہ پر چوب پڑتی ہے۔ وہ دن بھی آئیگا، کہ جب اس جسم کی کلی تمازت سے کملا جائے گی۔ مگر ارجن بدل وجان تیرے ثمردار حقیقت کو قبول اور پسند کرے گا +

اے طفل دوشیزہ جا، اور دل کھو کے دن عید اور شب شب برات منا +

(باقیہ ارد)

"ٹیگور" (مترجمہ آصف علی)

آصف الدولہ

سنہ ۱۱۸۸ھ تاریخ ۲۵ ذیقعدہ کو وزیر الممالک آصف الدولہ یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ فیض آباد میں مشرف بجلوس مسند وزارت ہوئے اور مرزا حاجی مرتضیٰ خان مخاطب بہ مختار الدولہ سید مرتضیٰ خان ہیبت جنگ نائب ریاست ہوئے۔ اسوقت فیض آباد میں بہت سے انگریز صاحب اقتدار تھے ان میں دو انگریز بہت صاحب رسوخ تھے ایک کرنیل کلس صاحب دوسرے میجر پلیبر صاحب بہادر معروف بہ صاحب کلاں۔ میجر صاحب اگرچہ انگریز دبرطانوی تھے مگر پشتہا پشت سے گورنمنٹ انگریزی کی رفاقت میں رہتے تھے۔ اور بادشاہ دہلی سے امتیاز الدولہ، افتخار الملک بہادر اسلان جنگ خطاب بھی ملا تھا۔ میجر صاحب کے رفیقوں میں مارٹین صاحب بہادر بھی تھے۔ جو اسوقت کپتان تھے۔

مختار الدولہ بہادر نے صاحب کلاں سے ایک روز بسبیل تذکرہ کہا کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی ہیں۔ نواب سعادت علی خاں بہادر کو بھی طلب فرمالیجئے کہ جس طرح دوسرے بھائی نواب آصف الدولہ کے پاس ہیں اور انکی پرورش اور نگرانی میں رہتے ہیں وہ بھی رہیں۔ صاحب کلاں نے کہا کہ نواب جنت مکان شجاع الدولہ بہادر نے اپنی حیات کے زمانہ میں ان کو بریلی کا حاکم کردیا تھا۔ اب ہم کیا کرسکتے ہیں۔ مختار الدولہ نے کہا ہاں یہی ان کے ساتھ بہت زیادہ رعایت ملحوظ خاطر رکھی جائے گی لیکن مالک خانہ اور صاحب حکومت ایک ہی آدمی ہونا چاہئے اور دستور قدیم یہی ہے کہ ایک ہی بھائی صاحب حکومت ہوتا ہے۔ اس صورت میں نواب سعادت علی خاں کا برسر حکومت ہونا خلاف آئین بھی ہے۔ کیونکہ رعیت جب دو مالکوں کے درمیان میں ہوتی ہے تو ملک کا بندوبست ٹھیک نہیں ہوسکتا ہے اور بادشاہت و وزارت میں شرکت کیسی آپ یا تو سب بھائیوں کو انکی اطاعت میں کردیجئے۔ یا ان کیواسطے کوئی جاگیر غور کرکے تمام ملک تمام بھائیوں پر تقسیم کرادیجئے تاکہ دوسرے بھائیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ صاحب کلاں نے فرمایا ہم گورنر جنرل بہادر کے ماتحت میں کلکتہ میں انکو لکھ بھیجیں گے جیسا

جواب آئے گا ویسا کرینگے۔ مختارالدولہ نے کہا یہ بھی واضح رہے کہ سب سے بڑے بیٹے نواب آصف الدولہ بہادر ہیں اور سعادت میں حاکم ثانی ہیں اور ملک اودھ کبھی تقسیم نہیں کیا گیا جائداد کی تقسیم از روئے شرع تو مستحقین میں ہوتی ہے رسم قدیم اودھ یہی ہے کہ بڑا بیٹا صاحب حکومت ہوتا ہے۔ صاحب کلاں نے کہا جب یہی دستور قدیم ہے تو نواب بہادر خود اپنے بھائی کو طلب فرمالیں کون منع کرتا ہے۔ یہ سنکر نواب آصف الدولہ بہادر نے اپنا شقہ نواب شمس الدولہ بہادر کے نام لکھکر محبوب علی خان اور مرتضیٰ خان کے ہاتھ روانہ کیا۔

اور اس بات کے قبول کرنے کی خوشی میں شہر بنارس ملازمان کمپنی سرکار انگریز کو بخش دیا۔

اسی زمانے میں نواب آصف الدولہ بہادر نے اپنا قیام لکھنؤ میں مناسب سمجھا نواب شمس الدولہ وسعادت علی خان بہادر بھی بریلی سے لکھنؤ چلے آئے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے سایہ عاطفت میں رہنے لگے۔

مختارالدولہ سید عالی نسب سے دادا سید حسین طباطبائی باپ محمد باقر فرزند کو ملک مختارالدولہ تھے ملک میں انکی مزاجیوں شہرت ہو گئی۔ تمام عملہ ان سے خائف رہنے لگا۔ نواب یمین الدولہ سعادت علی خان بھی ان کے خلاف تھے۔ بہت سے امر خلاف مرضی آصف الدولہ ان سے صادر ہوئے۔ حق ولی نعمت کو فراموش کیا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ پیدل فوج کو برطرف کرکے صاحبان فرنگ سے اتفاق کرکے میں خود وزیر بن جاؤنگا اکثر پوشیدہ پوشیدہ صاحب کلاں سے ملاقات کرنے جاتے تھے اور ایک الزام میں راجہ جھاؤلال کو قید کرکے حبس دوام کر دیا۔ اور یہاں نسبت خواجہ سرا کو انکی جگہ پر مقرر کر دیا۔ میاں بسنت نے جب ان کے واقعات دیکھے تو اپنے دل میں خیال کیا۔ اگر مختارالدولہ قتل ہوجائیں اور آصف الدولہ تخت سے اتار دئے جائیں تو نواب سعادت علی خان وزیر زادہ ہوں اور میں ان کا نائب ہوں۔ علاوہ تفضل حسین خان سے اسباب میں مشورت کی انکی رائے سے بہت سے لوگ اس کام کے لئے مقرر ہوئے۔ ایک دن میاں بسنت نے مختارالدولہ کے گلے میں بانہیں ڈالکر کہا کہ بابا جان ایکدن تو غریب خانے کو اپنی تشریف آوری سے

عزت دیجئے اور کمترین کی دعوت قبول فرمایئے۔ مختار الدولہ اس فریب سے بے خبر تھے راضی
ہوگئے۔ اسی طرح نواب آصف الدولہ بہادر سے بھی عرض کی۔ نواب نے فرمایا آجکل
ہوا گرم ہے ہم اس گرد وغبار میں کہیں نہیں جا سکتے۔ مگر مختار الدولہ صاحب مدعو تشریف لے
گئے دعوت نوش فرما کر قیلولہ کرنے کے لیے نالی نالی کرتے خدمت میں حاضر ہوئے سامان
بسنت یہاں سے چلے گئے +

چند کس جرار دھوں ہوئے مختار الدولہ ان کو دیکھ کر سمجھ گئے اور خائف ہو کر بھاگنا چاہتے
تھے کہ سرفضل نے کٹار بھونکدی۔ آخر مختار الدولہ کا کام تمام ہو گیا۔ اور ان کے اعزہ لاش
اٹھا وہ میں لے گئے اور وہیں دفن کیا۔ اسکے بعد محمد ایلچ خان جو دولت خانہ قدیم اس سلطنت
کے تھے نائب ریاست ہوئے۔ یہ نمک خوار قدیم تھے اور بہت دولت رکھتے تھے کوئی
وارث نہ تھا ہمیشہ بیمار رہتے تھے اس لحاظ سے نواب یمین الدولہ خلوت میں نواب
آصف الدولہ سے کہا کہ ایلچ خان کے پاس بے شمار دولت ہے اور کوئی وارث نہیں ہے
اور وہ بیمار سخت ہے اس مرض سے جانبر ہو گا۔ اگر جناب عالی اسکی جائداد پر ابھی سے
قبضہ کرلیں تو بہتر ہے ورنہ بہت دولت تلف ہوگی۔ آصف الدولہ نے کہا میری یہ نیت
نہیں ہے کہ اپنے دست نگر کی جائداد لے لوں۔ جب ایلچ خان کا انتقال ہو گیا تو
سرفراز الدولہ مرزا حسن علی خان عرف مرزا حسنو جو اسوقت میں ایلچ خان کے پیش دست
تھے صاحب کلاں کے مشورے سے نائب رسالت ہوئے +

اسی زمانے میں مرزا جوان بخت بہادر شہزادہ دہلی لکھنؤ میں تشریف لائے اور
آصف الدولہ نے انکی بہت عزت کی ان کے استقبال کو گئے۔ ملازمان شہزادہ نے انکو
خواص میں جگہ دی اور کہا ہم تم دونوں مساوی ہیں۔ آصف الدولہ بہادر نے پہلی ملاقات
میں تین لاکھ روپیہ پیش کیا۔ اور مارٹین صاحب کی کوٹھی میں جسمیں پہلے شہزادہ مرزا
سلیمان شکوہ دہلوی ٹھہرے تھے فرودکش کیا۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر سے ایسی محبت ہوگئی
جیسے حقیقی بھائی سے ہوتی ہے۔ نواب نے ان کے مصارف کے لیئے پانچہزار روپیہ
ماہوار مقرر کیا اور سات ہزار روپیہ مصارف باورچیخانہ کا مقرر فرمایا اس قدر افزائی

اور عزت افزائی کو دیکھکر تمام شہزادگان دہلی بہت خوش ہوئے۔ شہزادے نے کچھہ دنوں کے بعد نواب جہان آبادی محل سے اپنا عقد کر لیا۔ کچھہ دنوں کے بعد کرم بخش پیش خدمت جہان آبادی محل کے عاشق اور اسے اپنا خاص محل بنایا یہ بات نواب آصف الدولہ کے خلاف ہوئی۔

نواب عدم التفات سے پیش آئے تنخواہ مقررہ میں تساہل ہونے لگی اور یہ امر اسلئے بضیحت کے پیش آیا کیونکہ اس کبیر سنی میں ایسی بیجا حرکت کر کے اپنی زوجہ مقدسہ نواب ملکہ آفاق حضرت تلون سلطان بیگم کو صدمہ دیا۔

شہزادہ بے التفاتی دیکھکر اپنے دل میں شرمندہ ہوا اور لکھنؤ سے بنارس کا قصد کیا۔ نواب آصف الدولہ بہادر اپنی سیرچشمی سے پانچہزار روپیہ ماہوار بھیجتے تھے اسمیں اوقات بسر کرتے تھے۔

اسوقت تک سرفراز الدولہ مرزا حسن علی خان نائب تھے اور مہاراجہ ٹکیت رائے قوم سکسینہ دوم کائستہ دیوان تھے۔

یہ اپنے مقابلہ میں مرزا حسن علی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے ظاہر میں تو اپنا آقا کہتے تھے مگر تمام ملکے پر اپنا حکم چلاتے تھے اس زمانہ میں آپنے ایک فرد حساب پیش کی کہ پچھتر لاکھہ روپیہ سود مہاجن کا سلطنت کے ذمہ ہے اور آیندہ سے سود در سود ہوگا۔ نواب نے دیکھتے ہی کہا ہمیں تو امیر الدولہ کے وقت میں معافی تھی کہ ساٹھ لاکھہ روپیہ اپنے مصارف کے واسطے لے لیتے تھے باقی حساب کتاب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ پھر مہاراجہ جھاؤلال سے مخاطب ہوکر کہا ٹکیت رائے نے پچھتر لاکھہ روپیہ سود کا نکالا ہے۔ جھاؤلال خاموش رہے پھر فرمایا کچھہ تم نے جواب نہ دیا۔ راجہ نے کہا بہت خوب۔ آج سے میں حساب دیکھونگا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ میری جان اس کام میں کام آئے گی۔

مگر حضور سے تصدق ہوجائے گی اصل بات یہ ہے کہ راجہ ٹکیت رائے مہاجنوں سے مل گئے ہیں اور رقم کثیر مار لیا کرتے ہیں۔ بیجناتھ داروغہ خزانہ سرکار عالی ٹکیت رائے کا عزیز اور آوردہ ہے اس قدر دولتمند ہے کہ سونے چاندی کی اینٹوں کا مکان بنوا سکتا ہے نواب نے فرمایا تم مہاجنوں سے مقابلہ حساب کتاب نہیں کر سکتے ہو۔ راجہ نے عرض

کی کہ بالکرام جو حضور کا خانہ زاد ہے سب حساب نہیں کرلے گا اور سب کی قلعی کھولدیگا۔
مہاراجہ تیجپ راج کی حویلی میں سب مہاجن جمع ہوئے بالکرام نے مہاجنوں کے تمام کھاتے غلط ٹہیرائے اور حساب کرکے پچہتر لاکھ کے صرف گیارہ لاکھ روپے باقی رہے جسمیں ایک مہاجن بھی چوں نہ کرسکا۔ اسیوقت راجہ ٹیکت رائے نظر سے گرگئے۔ مہاراجہ تیجپ رائے داروغہ خزانہ ہوئے۔ اور جہاؤلال دیوان ہوئے۔

سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خان خوشامد پسند تھے۔ ٹیکت رائے قدموں پر گر پڑے اور کہا میں حضور کا آوردہ ہوں انہیں نے اپنے مصاحبین سے صلاح کی سب نے کہا ٹیکت رائے آپکا آوردہ ہے آپکا خیرخواہ ہے آپکو چاہیے کہ اسکو اپنے ساتھ رکھیں نواب سرفراز الدولہ نے مہاراجہ سے وعدہ کرلیا کہ اگر میں نائب ہوں گا تم کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔

اور خفیہ خفیہ ریزیڈنٹ بہادر سے کہا کہ نواب آصف الدولہ متلون مزاج ہیں ابھی وہ بیٹھے ہوئے تھے ایسا ٹیکت رائے کو رکھا تھا آج اسے برطرف کردیا۔ ایسی بحالی اور معزولی سے کاروبار میں رخنہ پڑتا ہے +
یہ خبریں آصف الدولہ بہادر کو پہنچیں انہوں نے کہا ایسی رخنہ اندازیاں ہونگی تو سرفراز الدولہ بھی نہ رہیں گے۔

آخر انکو بھی برطرف کرکے علامہ تفضل حسین خان کو اپنا نائب بنایا مولوی صاحب حکیمانہ طبیعت کے آدمی تھے۔ سوائے آرام طلبی اور مطالعہ کتب کے دوسرا کام نہ تھا۔ دفعتہً نیابت کا بوجھ پڑ گیا اور ملکی کاموں میں بہت متردد تھے حکیم مہدی علی خان کو اپنا مشیر خاص بنایا۔ میر بہادر علی کوتوال کو معزول کرکے غلام محمد خان کو کوتوال شہر بنایا +

آصف الدولہ بہادر کی سخاوتیں بہت مشہور ہیں ان کی شعرا پرستی شہرہ آفاق مہربانی کہ سودا شاعر فرخ آباد میں تھے فوراً شقہ ان کی طلبی کا بھیجا سودا نے کہا میں ایک رئیس کے دامن دولت سے وابستہ ہوں۔ حیات مستعار کا اعتبار نہیں۔ کس زندگی پہ ہوس پرستی کروں مجھے یہاں بھی آرام ہے +

نواب اس جواب سے رنجیدہ ہوئے۔ میر ضاحک نے عرض کی۔ حضور تشویش نہ کریں میں ایسا خط بھیجتا ہوں کہ سودا بے بلائے دوڑا آئے۔ آپ نے دوسرے دن سودا کی ہجو میں قصیدہ لکھا۔ اور فرخ آباد بھجوا دیا۔ سودا قصیدہ سنتے ہی بہت چراغ پا ہوئے اور بیتاب ہوکر لکھنؤ دوڑے آئے ✦

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت (لکھنوی)

جذباتِ ٹیگور

اگر تم اپنی کلسی بھرنا چاہو تو میرے چشمہ پر آجاؤ!

پانی تمہارے بلوریں پاؤں سے لپٹ کر اپنا آئینۂ دل کھول دے گا، آنے والے پانی کا عکس رنگ میں پڑ رہا ہے، اور بادل درختوں کے نیلے خط پر اس طرح جھک آئے ہیں، جسطرح تمہارے سیاہ بال تمہاری نرگسی آنکھوں پر جھک آتے ہیں۔

میں تمہارے پاؤں کی جھنکار خوب جانتا ہوں، کیونکہ وہ میرے دل میں بج رہی ہیں، ہاں آجاؤ کیونکہ تم کلسی بھرنے کو آئیں! ——— اگر کلسی کو پانی کے آغوش میں چھوڑ کر خاموش بیٹھنا چاہو تو میرے چشمہ پر آجاؤ ——— زمین پر ہری گھاس بچھی ہوئی ہے اور بے شمار جنگلی پھول کھلے ہیں تمہاری سیاہ مستی بھری آنکھوں سے تمہارے تصورات اس طرح تڑپ نکلیں گے، جس طرح چڑیاں اپنے آشیانوں سے نکل آتی ہیں۔ تمہاری نقاب پاؤں پر آجائے گی!!!

اگر کام نہ ہو تو میرے چشمہ پر آجاؤ!

اگر اپنی کھیل کو چھوڑ کر موجوں سے کھیلنا چاہو تو میرے چشمہ پر آجاؤ۔ اپنے نیلے لباس کو کنارہ پر رکھ دو۔ کیونکہ پانی تمہیں اپنی نیلی چادر میں لپیٹ لیگا۔ موجیں تمہاری گردن کو چومنے کیلئے تڑپیں گی۔ اور تمہارے کانوں میں کچھ کہنے کیلئے بیقرار ہونگی۔ ہاں بقا کی ذرا میرے چشمہ پر آجاؤ!

اگر تم بے قرار ہو اور موت کے آغوش میں اچھلنا چاہتے ہو تو میرے چشمہ پر آجاؤ! یہ سرد اور گہرا ہے۔ اوس نیند کی طرح جسمیں خواب نہ ہو یہ تاریک ہے! اسکی گہرائیوں میں دن اور رات ایک ہیں۔ اور پیار کا نغمہ خاموشی ہے۔ اگر آغوش موت میں اچھلنا چاہو۔ تو میرے چشمہ پر آجاؤ!

محمد محفوظ الحق احسن

مسٹر جلاہے کی حکمرانی

وہ جلاہا جو ہندوستان میں بہت بے عقل مشہور ہے۔ احمق پن کی مثال میں سب سے پہلے
جس کا نام لیا جاتا ہے اور جسکے بھائی بند مانچسٹر میں بھی رہتے ہیں۔

وہی جلاہا یونگ گاڑھے بنتا ہے۔ جھونپڑے کے سنکانوں میں رہتا ہے۔ لنبی ڈاڑھی لٹکا کر ایک
موٹی دھوتی کمر میں باندھ کر بازاروں میں گاڑھے کے تھان بیچنے آتا ہے۔ اور جسکو احمق جلاہا کہتے ہیں
یہ وہی احمق جلاہا ہے جو پانچوں وقت محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا ہے اور بقرعید
کے ساتھ قربانی کے لیے ڈپلومیسی اور پالیسی کو بھول کر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھتا ہے۔ اسکے
سامنے بہت سی موٹریں آتی جاتی ہیں جن میں سفید لوگ سوار ہو کر کونسل میں جاتے۔ اور کہتے
ہیں کہ ہم ملک کے اور رعایا کے قائم مقام ہیں۔ مگر احمق جلاہا کہتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ سجدہ میں
تو فقط میں ہی جاتا ہوں۔ سجدہ وہاں ایک بھی نہیں آتا۔ اور جو مسجد میں نہ آئے۔ خدا کے آگے سر نہ
جھکائے۔ وہ قوم و ملک کا بڑا نہیں ہے۔ بلکہ اور سب سے ذلیل ہے۔ اور ٹھکرائے
جانے کے قابل ہے۔

احمق جلاہے نے سر نریندر ناتھ بینرجی کی بہت تعریف سنی تھی کہ وہ دیسی کپڑے کے حامی ہیں
اور مانچسٹر کے جلاہوں کا بنا ہوا کپڑا نہ خود پہنتے ہیں نہ دوسروں کو پہننے دیتے ہیں۔ آج وہ کہتا
ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ تعریف کے قابل اس دنیا میں خدا کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں۔ خدا
توفیق دے تو آدمی خود اپنی ذات سے اعمال ایسے بنائے جن کی تعریف خود اسکا دل کرے۔

اب احمق نے سنا ہے کہ یورپ میں ایک ہوا چلی ہے۔ پیشہ ور لوگ تاجداروں کی ٹوپیاں
اتار اتار کر اپنے سروں پر رکھ رہے ہیں۔ تو اس کے دل میں بھی آتا ہے کہ حکومت حاصل
کرنے کے لیے جد و جہد کرنی چاہیے۔

مگر وہ سنتا ہے کہ انگریز جن کی حکومت اس ملک میں ہے۔ یہاں کے باشندوں کو رفتہ
رفتہ آزاد و خود مختار کرنے پر آمادہ ہیں۔ مگر شیخ سید مغل پٹھان برہمن کھتری بنئے نہیں چاہتے کہ حکومت

ہیں غریب پیشہ وروں کو حصہ دیا جائے۔ بلکہ برہمن تو کمین ذاتوں کے سایہ سے بھی پرہیز کرتے ہیں
جمّن خیال کرتا ہے، مجھ میں اور برہمن دیوتا میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی آدمی ہیں میں بھی آدمی ہوں
وہ بھی عورت سے پیدا ہوئے، میں بھی عورت کا زائیدہ ہوں۔ اونچی ذات کے ماتھے پر سینگ
نہیں ہوتا۔ سب جھوٹ ہے۔ کوئی کمین اور ادنےٰ نہیں ہے۔ سب ہمارے بھائی ہیں بلکہ
جن لوگوں نے آجتک جلاہوں کو چماروں اور حلالخوروں کو نیچ ذات اور کمین سمجھا ہے وہ خود
ادنےٰ کمین اور نیچ ذات ہیں۔

مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کہتے ہیں کہ عنقریب ہندو مسلمان سکھ پارسی ایک دستر خوان پر کھانا
کھائینگے، مگر ان کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ جولاہے۔ چمار۔ حلال خور۔ حجام۔ بڑھئی۔ درزی اونچی
ذاتوں کے ہاتھ کا کھانا چھوڑ دینگے۔ اور حکومت پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ مانٹیگو بچارے کیا
جانیں ان کو تو کچھ مغل سید اور برہمن کھتری نے سمجھا دیا۔ سمجھ گئے۔ اور اندر کی چھپی ہوئی طاقت
کی طرف ان کا خیال نہ جاسکا۔

میں جمّن ابن کمّن۔ ساکن شہرانی ضلع بدھو۔ رہنے والا کمین بستی کا لکھے دیتا ہوں پکار کر۔
اور غل مچا مچا کر لارڈ چمسفورڈ اور مسٹر مانٹیگو کے کان میں کہ اگر تم دونوں کو ہندوستان میں حکومت
خود اختیاری دینی ہے تو سیدوں۔ مغلوں۔ پٹھانوں۔ شیخوں کو نہ دینا۔ برہمنوں کھتریوں۔ بنیوں
بقالوں وکیلوں کو اس کے پاس بھی نہ جانے دینا۔ کیونکہ اب حکومت مجھ غریب کا حق ہے۔ خواہ
کیسی ہی خرابی پڑے۔ خواہ کیسی ہی دشواریاں پیش آئیں، میں اپنے اس قدرتی حق سے دست بردار
نہیں ہونگا۔ آج میں نے محض ایک مضمون لکھا ہے اور کل یعنی صرف ۲۴ گھنٹہ کے بعد میں ایک
اور عملی جدوجہد شروع کرنے والا ہوں۔

مدن موہن نہیں جمّن ابن کمّن

دہلی کے اجلاس کانگریس میں مسٹر مدن موہن مالوی کو صدارت دیگئی ہے۔ یہ بھی سراسر ہٹ دہرمی
اور بے انصافی ہے۔ کیا استقبالیہ کمیٹی کے پردھان مسٹر حاذق الملک کو معلوم نہ تھا کہ دنیا بدل
گئی، خیالات بدل گئے۔ عادتوں کو بدلنے کی ضرورت آگئی۔ پھر انہوں نے ایک اونچی ذات کے آدمی
کو صدارت کیوں دی۔ اور مجھ جمّن ابن کمّن کو کس واسطے پس پشت ڈالدیا۔ بیشک میں نے موہن

کا ساچٹ پٹا ایڈیشن بیان نہ کر سکتا۔ بیشک میری باتوں میں وہ کاملیت نہ ہوگی جو مدن موہن کے کلام میں ہوگی لیکن میں اس سے زیادہ اچھی اور مفید باتیں کہتا جو مدن موہن کہیں گے۔ مدن موہن کو ملک کے اصلی باشندوں کا کچھ بھی حال معلوم نہیں ہے۔ وہ ہم غریب آدمیوں کی بہت سی ضرورتوں کو کچھ بھی نہیں جانتے۔ ان کو تو ہر ایک سرمائیکل روڈ اور پر طعن کرنا آتا ہے۔ نہ خود امیروں میں رہتے ہیں امیروں سے ملتے ہیں وہ ہم جلاہوں کے احوال سے واقف نہیں نہ ان حجاموں کی ضرورتوں کا حال معلوم ہے نہ بیماروں اور ملاح اور مزدوروں کی پریشانیوں کو وہ جان سکتے ہیں جسکے دکھ ہوتا ہے وہی اسکو خوب سمجھتا ہے۔

میں مسٹر ایڈون مانٹیگو کی جگہ لوں کا کام ہوتا تو سیدھی سادی باتیں بیان کرتا جنکو سب سمجھ لیتے اور کسی کی عقل کو غور کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مدن موہن نے جو کچھ کہا وہ کچھ اور بہی ہے۔ میں جو کچھ کہتا بالکل عملی ہوتا۔ صاف ہوتا۔ اور مجھکو معاف کیا جائے اگر یہ کہوں کہ بڑی سچا اور کھرا بھی ہوتا۔

اے اونچی ذات والو! کس نیند میں سوتے ہو۔ اٹھو۔ ہشیار ہو۔ جاگو۔ اب تمہاری ذات والوں کا زمانہ گیا۔ اب تو ہم نیچی اور کمین ذاتوں کے اقتدار کا وقت آیا ہے۔ چاہے تم بالشویک خطرہ پیش کرو۔ چاہے جرمن ملک کی خرابیاں بیان میں لاؤ ہم ایک نہیں سنیں گے۔ اور اپنی پس ماندگی اور بے چارگی کو دور کرکے دم لیں گے۔

لوگ چاہے مجھے جاہل کہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جو بحث اونچی ذات والے کرتے ہیں یہ تو ان اونچے اور بڑے آدمیوں کی وجاہت حاصل کرنے کی باتیں ہیں۔ ہم غریبوں کے واسطے ان میں خاک بھی نہیں ہے۔

ہم غیر ممالک کے اشتراکیوں سے مدد نہیں مانگیں گے۔ کیونکہ ہماری اشتراکیت تعلیم قرآن کے تحت ہوگی۔ جس کا عملی ظہور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے دکھایا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے دکھایا حضرت عثمان رضؓ نے دکھایا۔ اور حضرت علی رضؓ سے ظاہر ہوا۔

میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ ہمیں ایسا سیاسی لباس پہنانا چاہتے ہو جسکے ٹانکے ایک ہی کروٹ میں ٹوٹ جائیں۔ اور ہماری اصلیت کا بخیہ جو بہت مضبوط تھا اس نئے لباس کیخاطر ادھیڑا جاسکتا ہے۔ مگر ہم اپنے اسلام کی اشتراکیت کا ایسا لباس اختیار کریں گے جس

تائیدے کبھی خراب نہ ہونگے بشرطیکہ ہم آخر دم تک اسپر عمل کرتے رہے۔

میں ختم اس مضمون کے کہتا ہوں کہ اشتراکیت یہ نہیں ہے جو روس و جرمن میں ظاہر ہوئی ہے بلکہ اصلی اشتراکیت وہ ہے جو مدینہ میں بزمانہ خلفائے راشدین ظاہر ہوئی تھی، جبکہ ادنےٰ اعلیٰ۔ حاکم محکوم۔ مفلس امیر سب میں کچھ امتیاز نہ تھا۔ سب کو برابری کا حق مذہب میں۔ سننے لینے میں۔ اور حکومت کرنے میں حاصل تھا۔

اس اجمال کی تفصیل میں آیندہ بیان کرونگا۔ بالفعل میں بیان کو ختم کرتا ہوں بحکم مسٹر جمن جولاہے۔ کہ حسن نظامی نے لکھا)۔

حسن نظامی

اے دل اُن کو وفا کی خو ہی نہیں	ورنہ خود لطف یار کم تو ہی نہیں
عشق سے مِلکے عقل حیراں کا	اب وہ اندازِ گفتگو ہی نہیں
گل کو اس نازنیں سے کیا نسبت	وہ نزاکت وہ رنگ و بو ہی نہیں
چاک دل اب کسی سے کیا ہو درست	اِس میں گنجائش رفو ہی نہیں
حسن ہے بے نیاز عشق و ہوس	ہم بھی ناکام ہیں عدو ہی نہیں
کوئے جاناں میں کھو کے بیٹھ رہے	اب کہیں دل کی جستجو ہی نہیں
کج ادائی نہ سیکھئے اتنی	کیا کوئی اور سادہ رو ہی نہیں
ہم نہیں ہیں تو بزم ساقی میں	اب وہ رندوں کی ہاؤ ہو ہی نہیں

کثرتِ شوق سے ہمیں گویا
حسرتؔ اب کوئی آرزو ہی نہیں

(حسرت موہانی)
صبح امید۔

خدا کے واسطے کہو تو سہی کیا ہوا۔

تم نے دلہن کو کیا کیا کہا

ہائے اشفاق میاں نے خدا کی قسم اگر سوائے گوشت ترکاری کے پیسہ مانگنے اور آٹا
دال لینے کے۔ میں نے ان سے کوئی بات بھی کی ہو۔

بیوی اور اسپر سر زوری جھوٹا بھی بناتی ہے۔ لونڈی بچی تا یا اور اسپر باتیں کرتی ہو۔
فاطمہ نے میاں کے تیور دیکھے اور معلوم کر لیا کہ میری قسم تک کا انہیں اعتبار نہیں میں
جس قدر اپنی صفائی دونگی وہ اور بگڑتے ہونگے۔ بیچاری میاں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ تھر تھر کانپ
رہی تھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسپر بھی بےحس ظالم بےتقصیر کو رحم نہ آیا کمرے میں سے
بولی بھی تو یہ بولی۔ تم لونڈی بچیوں کی کیوں حمایت لیتے ہو۔ مجھے ڈولی منگوا دو میں اماں کے
ہاں چلی جاؤنگی۔ اشفاق غصہ میں لال ہوگیا۔ بید ہاتھ میں تھا۔ اسے لیے ہوئے آگے بڑھا۔
فاطمہ لرز گئی۔ اشفاق نے کہا تم اپنے بچوں کو لے کر اسی وقت اس گھر سے نکل جاؤ۔
شریف کی بچی جائے تو کہاں۔ کبھی سات پشت تک یہ بات نہ سنی تھی۔ گھر سے نکلنے کا تو
ذکر ہی کیا ہے کبھی کوٹھے پر بھی نہ چڑھی تھی۔ فاطمہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور ہونٹے کی
اشفاق اسپر اور غضبناک ہوگیا۔ فاطمہ پر بید کی مار پڑنے لگی۔ اور کون تھا جو بچاتا فاطمہ
کے منہ سے آواز ہی کب نکلتی تھی۔ منجھلا بچہ بولا۔ کیوں مارتے ہو ابا۔ اچھے ابا اماں کو نہ مارو۔
مگر موذی ابا فرعون بنا ہوا تھا۔ بچہ کے ایک لات ماری کہ اس کا سر سل سے ٹکرایا۔
اور سر سے خون کی تلیاں بہنے لگیں۔ فاطمہ اب میاں کے سامنے سے ہٹی۔ اور "ہائے
میرا بچہ" کہہ کر بچہ کو چمٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بچہ کا خون پونچھ رہی تھی میاں
بہادر کمرے میں جاتے ہوئے کہہ گئے کہ "ابھی نکل جا نہیں تو چوٹیا پکڑ کر نکال دونگا"۔ بچہ
کے اتنا خون نکلا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ بچے کے سر کو باندھ رہی تھی کہ اشفاق پھر آیا اور کہا
نکلی نہیں۔ یہ ٹھر گئی۔ اب بھی نہ نکلتی اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ قصائی بچوں کو ذبح کر ڈالیگا
ہائے شریف عورت کا قدم گھر کے دروازہ کی طرف نہیں اٹھتا۔ اشفاق پھر لپکا اسپر
فاطمہ نے بچی کو گود میں اٹھایا سر پھٹے ہوئے بچے کو ساتھ لیا جو تکلیف اور بیہوشی کے

سے گر گر پڑتا تھا۔ اور دروازہ کے باہر آئی۔ آسمان اسکی مصیبت پر ہل گیا ہوگا۔ زمین کو جنبش ہوگئی ہوگی۔ اور کونسا دل ہوگا جو خون کے آنسو نہ روتا ہوگا۔ کہ ایک وہ عورت جسکے بیاہنے کے لیے اشفاق کے ماں باپ نے لاکھوں خوشامدیں کی تھیں۔ آج اسی ٹوٹی سے اسطرح جا رہی ہے۔ مگر اشفاق کے دل پر ذرا میل نہیں تھا۔

اشفاق بلقیس تمہیں بھی ایک دن اس مالک حقیقی کے سامنے جانا ہوگا۔ اس دن تم سے سوال ہوگا۔ تو معلوم ہوگا۔ بلقیس طوفان اور اس غضب کا طوفان۔

فاطمہ کا قدم نہیں اٹھتا آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ کہتی ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں۔ باپ ماں سب مر چکے تھے ایک دور پرے کے رشتہ دار نے اس کو رکھ لیا۔ کوئی آٹھ دس دن ہی مصیبت جھیل کر زندگی کے دن گزرے ہونگے کہ شہر میں طاعون چمکا اور ایک دن رات میں یہ تینوں چٹ پٹ ہوگئے۔

فاطمہ اور باوفا فاطمہ کی وفا شعاری دیکھیے کہ مرتے وقت بھی اسکی زبان پر یہی کلمہ تھا کہ ۔

"اشفاق میرے قصور معاف کر دو!!"

(ضیا بانو)

مطلع صبح تام پہ ماہ تمام آگیا — یعنی وہ چاند حسن کا بر سر بام آگیا
شکر ہے پیر اعتکاف آگیا نام شیخ بھی — مشرب اہل جام میں منکر جام آگیا
پرسش لطف ظاہری حاصل مدعا ہوئی — دام فریب یار میں عاشق خام آگیا
لائق امتحان دینا ہیں کہ تہا ہے دل و جگر — جذبہ شوق [illegible] آگیا
موقع امتحان سے قبل دعوی امتحاں غلط — کام نہ [illegible] آگیا
نکل و سنی راہ عشق آج ہے نقد جیب دل — جان حزیں کی مانگ ہے چپٹے پیام آگیا
تکلو تھی تاب یکشی آجو دو بند میکدے — شیشۂ اتقا کرہ ماہ صیام آگیا

آزاد سبحانی (معارف)

حسنِ ادا

"کیا ہے شرم کے پردے میں بسمل
شرارت ہی یہ شرمندہ نظر کی!"

شعر گوئی کے لیے، بعض عنوان حقیقۃً اس قدر قیامت خیز ہیں کہ اگر لکھنے والا ان کو ذرا سلیقے سے لکھ لے تو پھر جذبات کے لیے پناہ نہیں، کون نہیں جانتا کہ صبحِ شبِ وصل کی رسوا ساما نیاں، تحسینِ نگارش کی آرزومند ہیں۔ مگر فرصت کس کو ہے جو ڈھلی ہوئی گردن، گری ہوئی طبیعت اور جھکی ہوئی نگاہوں سے اضمحلالِ حسین کا کوئی مطالعہ کرے۔ ہاں کون ہے وہ جو رنگِ جبیں اور گلابی ہونٹوں کی خشکی کو دیکھے اور سر دھنے کون ہے وہ جو بگڑے ہوئے خال۔ پھیلے ہوئے غازے اور کھلے ہوئے بالوں کا انداز رعنائی ملاحظہ کرے۔

شباب آسودہ انگڑائی لیتے ہوئے ابھی پورے ہاتھ بھی سر سے اونچے نہ اُٹھے تھے کہ کوئی ناجنس بے محابا سامنے آگیا، اوسکی حریص نگاہیں نظارہ کا پیام شوق لیکر آئیں سوائے اسکے کہ اُدھورے اُٹھے ہوئے ہاتھ مسکرا کے چھوڑ دیئے جائیں اور کیا ہوتا یہ فسانہ بھی مجھے تڑپا چکا ہے اور نظام کے لاجواب مطلع کا یہی موضوع شعری ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

پھر حبیب تم ہی کہو رات کو ادا نے جو کیفِ تغزل پیش کیا۔ وہ کیا قیامت کا نمونہ نہ تھا۔ اور علی الخصوص اوس کے اس شعر نے تو عالم جذبات میں اک رستخیز تلذذ بپا کر دیا

"کیا ہے شرم کے پردے میں بسمل
شرارت ہی یہ شرمندہ نظر کی!"

میں دیکھ رہا تھا کہ باوصف اس کے کہ تم اثر شعری کے معترف نہیں مگر اوس وقت بے اختیار زانو بدل رہے تھے۔ اور پھر انتہائے کیف و لذت سے وہ جو جناب گھنٹوں غرقاب استغراق رہے۔ آخر کہیے تو وہ کیا تھا۔ آہ بات تو یہ ہے کہ خوب ہی حقیقت منکشف شعر ہے

فہیم۔ ذرا ہوش میں رہ کر بات کرو۔ میں مانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہتر شعر فہم ہو مگر پھر یہ بھی کوئی بات ہے کہ تمہارے سامنے صنف نازک کی ہر بات لاجواب ہے۔ مانا کہ اواقوب گائی پھر کیا، اُستادان موسیقی کو بھاگ! رہا اب وہ غزل کا معاملہ تو کیا معلوم کس سوختہ جگر نے اون کے نام سے کہدیا ہے۔ اور صرف شرمندہ نظر والے شعر کی اس درجہ تعریف کرنی مجھے تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ میرے خیال میں تو اس شعر میں کوئی خاص حسن نہیں ہے۔

اول تو یہ کہ پورے شعر کے دونوں مصرعوں میں الا ماشاء اللہ ربط مفہوم نہیں دو مضمون ہیں اور دو مصرعے ہیں۔ اور پھر شرم کے پردے میں بسمل ہوکر شرمندہ نظر کی شرارتوں کی تعریف، عجیب مضمون ہے۔ نظر جب شرمندہ ہوئی، نگاہیں جب باحجاب ہوئیں تو پھر شرارتیں اور شوخیاں کہاں، شوخی حجاب کے منافی ہے۔ جہاں شرارت نظر ہو وہاں شرمندگی کا احساس کہاں بس بسمل نے جو شمشیر حجاب کا پردہ اپنے زخم دلگیری کے لیے پیدا کیا ہے۔ پہلے تو چاک معنی کی شوخیاں وہیں رخنہ ڈال رہی ہیں۔ اب شرمندہ نظر کی شرارتیں، مرنے والہ کا مضحکہ نہ اڑائیں تو کیا کریں۔

ہاں یہ کہو کہ ایک شعر میں چن چن کے شرم کے مترادف الفاظ جمع کردئے ہیں اسکے سوا رخاک نہیں۔ میں تو رات کو ہی اس شعر پر ساری محفل کی پھڑک اُٹھنے پر ذوق سلیم کو رو رہا تھا۔ رہا سہا حصہ آپ نے لیلہ افسوس!

حبیب ہائے تم اس شعر کو خاک نہ سمجھے ارے ظالم ایسے نشتر شاعر روز نہیں پیدا کر سکتا۔ اس قدر لطافت خیال میں ہر گھڑی پیدا نہیں ہوتی۔

آؤ میں تمہیں اس شعر کا صحیح مفہوم سمجھاؤں۔ ایک پری تمثال حسینہ کو برسوں کی منت کے بعد ایک رات کو اپنے ہاں مہمان کیا۔ رات بھر داستان شباب پڑھی جاتی رہی جوانی کی فتنہ روش حکایتیں ممنونِ سماعت ہوتی رہیں، اور وہ کچھ ہو گذرا جس کا ارمان تھا۔

صبح شب وصل جب جانے کی ٹھیری۔ تو دل گرفتہ عاشق نے دوسری عنایت کب

ضرورتِ مذہب

اگر ہم مذہب کی تاریخ کا پتہ لگانا چاہیں تو وہ اوس وقت سے ثابت ہوتا ہے جو زمانہ انسان کی پیدایش یا ظہور کا ہے۔ اگر انسان کی پیدایش اور ظہور کا زمانہ کوئی شروع نہیں رکھتا تو مذہب کا زمانہ بھی کوئی شروع نہیں رکھتا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب ظہور انسان کے بعد کی ساخت ہے تو تعجب ہوتا ہے کیونکہ مذہب تو انسان کی فطرت میں داخل ہے یا یہ کہ فطرت ہی اسکی متقاضی ہے

مذہب کیا بانی فطرت اپنے رنگ میں خدا کا نشان دیتی ہے۔ اگر یہ مانا جائے تو مذہب بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر خدا ہے (ضرور ہے) تو لازمی ہے کہ جیسے اوسکی طرف سے ایک ضابطہ جسمانی دیا گیا ہے ایسے ہی ایک ضابطہ روحانی بھی ہے گو ہمارے وجود کے بارہ میں خدا نے ہمیں براہ راست کوئی فطرتی معلومات عطا نہیں کیے گو ہمارے نفوس میں اوس نے خلقی طور پر کوئی ایسی علامتیں نقش کر دی ہیں جنہیں پڑھ کر ہمیں اوسکے وجود کا بلا کسی شک و تردد کے صحیح استدلال کا علم ہو سکے تاکہ اوس نے ہمیں اپنے وجود اور اپنی لازوال ہستی کی شہادت کے بغیر نہیں چھوڑا۔ کیونکہ اس نے ہمارے وجود میں اس استدلال کے لیے وہ قوتیں ودیعت کر دی ہیں جن کی امداد سے ہم یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ اس دنیا اور اس دنیا کے کارخانوں کو چلانے اور ترتیب دینے والا کوئی ایسا ہاتھ اور ایسی طاقت ہے جو سب دیگر طاقتوں سے بالاتر ہے۔ اگر ہم اپنی قوتوں کا احساس ادراک اور تعقل سے یہ بصیرت کام لیں تو ہمیں خدا کی ہستی کا بدیہی ثبوت ملنا مشکل نہیں کیونکہ ہماری فطرت ہی اس امر کی ضرورت کا احساس کراتی ہے کہ یہ تمام کارخانہ بغیر کسی مدبر اور مرتب کے نہیں ہے۔ جو اس کا مدبر اور مرتب ہے وہ سب سے بالاتر اور ممتاز ہے۔ اوسکی ہستی اس امتیاز کے ساتھ ایک خصوصیت بھی رکھتی ہے۔ جب ہم فطرت کے ان تمام مقتضیات پر غور کرتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ:-

خود ہی اپنی فطرت میں ذات خدا پر شہادت دیتی ہے۔

جب فطرت یہاں تک شاہد ہے تو پھر اسکے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرلینا ناواجب نہ ہوگا کہ ہماری ضرورتوں کے واسطے اوسے کوئی قانون اور ضابطہ بھی دینا چاہیئے اور اس قانون اور ضابطہ میں اپنی ان تمام ضروریات پر محیط اور حاوی بھی ہو۔ جو ہم دونوں جسمانی اور عرفانی یا روحانی رنگ میں رکھتے ہیں اگر ہم خدانخواستہ خدائی قانون یا خدائی ہستی سے انکار کردیں تو یہ ایک دوسری بات ہوگی اور اس حالت میں ہمیں کسی مذہب کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم اپنی زندگی کے ہر ایک حصہ کو خود اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے مطابق نکال دینگے۔ اوس کا نتیجہ خواہ اچھا نکلے یا برا۔

اگر ہماری فطرت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہم محض اپنی ہی خواہشات کے مطابق اس زندگی کی دوڑ میں چل سکتے ہیں تو یہ منزل اس رنگ میں بھی طے ہو سکتی ہے لیکن اگر خود ہماری فطرت ہی ہمیں اس رفتار اور اس راہ سے روکتی ہے تو سیدھی راہ اسکو سمجھنا صرف ایک شرمناک غلطی ہی نہیں بلکہ ایک سخت ٹھوکر بھی ہے۔

یہاں ہم یہ بحث نہیں کرینگے کہ کون سا مذہب سچا ہے اور کون سے جھوٹا بالفعل یہ بحث ہمارے صیغۂ استدلال سے باہر ہے ہم اس بحث میں صرف یہ دکھائینگے کہ انسان کو انسان ہوکر اس دنیا میں یا اس زندگی میں ضرورت مذہب کی ہے یا نہیں۔

سب سے اول یہ مان لیا جائے کہ انسان کو اس زندگی میں کسی نہ کسی ضابطہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ ضابطہ کبھی ہماری جسمانیات سے وابستہ ہوتا ہے اور کبھی روحانیات سے اوس ضابطہ کی جو دفعات ہماری جسمانیات سے وابستہ ہوتی ہیں اوس حصہ کو معاشرتی ضابطہ کہتے ہیں اور جو معادیات سے مربوط ہیں اونسے روحانی ضابطہ کہا جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھو کہ:۔

انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ان دونوں شقوق کے واسطے کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کی ضرورت ہے یہ مان کر اس بحث کا یہ رخ ہوگا کہ یہ دونوں قسم کے ضابطے صرف انسان ہی ترتیب دیتا ہے یا اوسکے علاوہ کوئی اور طاقت اسکی مرتب ہے ہمارا منشا ہے اور

ہمارا تجربہ شاہد ہے کہ جن حلقوں میں ہم رہتے ہیں۔
اسمیں تین قسم کے ضابطے پائے جاتے ہیں۔
(الف) وہ ضابطہ جو خود ہمارا ترتیب داد ہے۔
(ب) وہ ضابطہ جو دیگر کائنات سے وابستہ ہے۔
(ج) وہ ضابطہ جو مخفی رنگ میں کام دے رہا ہے۔

پہلی قسم کا ضابطہ ہمارا بنا یا ضابطہ کہا جاتا ہے لیکن اوسکی بہت سی دفعات بھی اس جوار سے وابستہ ہیں یا اون دفعات کا عکس ہے جو ہماری تدبیر سے بالاتر ہیں دوسری قسم کا وہ ضابطہ ہے جو دیگر کائنات سے وابستہ ہے جس سے دیگر کائنات یا دیگر کائنات کے مختلف حصے براہ راست خود تو کام نہیں لیتے بلکہ وہ ضابطہ یا اوس ضابطہ کی اسکیم ہی خود بخود کام لے اور دے رہی ہیں۔ یہ چاند سورج۔ ستارے اور سیارے وغیرہ وغیرہ جس خوبی اور جس ترتیب سے کام دے رہے ہیں وہ ایک ایسا قوی اور جامع اور بالاتر ضابطہ ہے کہ ہم ان اشیاء اور اس مادے سے کام تو لے رہے ہیں مگر ہمیں اب تک اون کی ماہیت پر عبور نہیں ہوا۔ ان دونوں ضابطوں کے علاوہ ایک تیسرا ضابطہ اور بھی ہے جسے محض ضابطہ کہنا زیادہ تر موزوں ہوگا اور جس پر ان دونوں ضابطوں کی بنیاد ہے یا یہ دونوں ضابطے جس کا عکس ہیں یہ وہ ضابطہ ہے جو انسانی طاقتوں کی دست برد اور رسائی سے بالاتر ہے اور کوئی ہستی بھی اپنے رنگ میں اس کا انکشاف نہیں کر سکتی۔

مذہب کے دو حصے ہیں :-
(الف) ظاہری۔
(ب) باطنی۔

مذہب کا ظاہر باطنی حصہ سے وابستہ ہے اور دراصل مذہب کا جزو اعظم اور نتیجہ مخفی ہے مذہب کا اصول یہ ہے کہ انسان اس زندگی کو گزار کر ایک دوسری زندگی کسی دوسرے رنگ میں پائیگا اسواسطے انسان کو اس حیات ثانوی کی خاطر اس حیات اولیہ میں یہ یہ فرائض ادا کرنے واجب اور لازم ہیں۔ حیات ثانویہ کی مذہبی رنگ میں جو تعبیر کی جاتی ہے وہ اس حیات

اولیہ میں اخیر تک پوشیدہ ہے اگر چہ بعض مذہبی کتابوں میں اس حیات ثانوی کی کچہ نہ کچہ تفصیل کردی گئی ہے۔ مگر پھر بھی وہ مخفی ہے۔ انسان جب اس دنیا سے اپنی زندگی کا سفر کرکے عالم ثانی میں چلا جاتا ہے تو وہ آخر تک کیوں خبر نہیں دے سکتا کہ اوس پر کیا کچہ گزرتی ہے اور اس عالم ثانوی کی کیا کچہ کیفیت ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ ہم اس عالم ثانوی سے انکار کریں اور یہ تعبیر کریں کہ :۔

ایسا عالم نہ تو ہے اور نہ ضرورت ہے اگر یہ قرار دیا جاوے کہ اسکی حیات ثانوی کی ضرورت نہیں ہے تو پھر یہ سوال ہوگا کہ "کیا انسان کی زندگی محض بے قیمت اور لاشے ہے کیونکہ اگر اوس کا کوئی حشر معقول نہیں تو بالفاظ دیگر یہ کہا جاوے گا کہ :۔

"انسان مرکر کچہ رہتا ہی نہیں دیگر خاک و غبار کی طرح نابود محض ہوجاتا ہے"

کیا انسان باوجود اس قدر دعوے شرف و غفلت کے اپنی حقیقت کا خاتمہ اس حد تک چاہتا ہے اور اسکی فطرت پھر قبول کرنے کو تیار ہے کہ وہ مرکر محض نابود ہوجائے گا۔

اگر انسان اس خفت کے قبول کرنے کے واسطے بلحاظ اپنی غفلت اور شرف کے تیار نہیں ہے تو پھر اسکا یہ جواب ہوگا کہ :۔

"انسان مرکر کسی دوسرے رنگ میں حیات ثانوی کا وارث ہوتا ہے۔ یا اوسے وارث ہونا چاہیئے"

جب اس حیات ثانوی کا انسان وارث قرار پا سکتا ہے اور یہ ضروری ہے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اس زندگی کے واسطے کوئی ضابطہ ہونا چاہیئے اور وہ ضابطہ کیا ہوگا۔

"ایک مذہبی ضابطہ۔ یا ایک ضابطہ حیات ثانوی کیونکہ مذہبی ضابطہ ہی ایک ایسا ضابطہ ہے جو مخفیات زندگی اور حیات ثانوی پر روشنی ڈالتا ہے اور جس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد کن مراحل سے گزرتا ہے اور اخیر پر اوسکی زندگی اولیہ کا یہ رنگ زندگی ثانی کا کیا کچہ نتیجہ اور حشر ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ فلسفہ اور حکمت دونوں نے بھی اس حیات ثانوی کے متعلق کچہ کچہ بحث کی ہے تو میں کہونگا کہ وہ حصہ فلسفہ اور حکمت کا بھی مذہب ہی کہلائے گا۔

یہ سوال کہ خدا کی طرف یا خدا کے نام سے مذہب کو کیوں نسبت دی جاتی ہے۔ اور خدا کو کیا ضرورت مذہب دینے کی ہو۔ میرے خیال میں یہ اعتراض درست نہیں خدا کے نام سے مذہب کو اسواسطے منسوب کیا جاتا ہے کہ

دراصل وہی قانون مذہبی دیتا ہے اور وہی حیات ثانوی پر روشنی ڈالتا ہو اور مذہب کے دینے کا بھی اوسی طرح ضرورت ہے جیسے عقل و فراست اور شعور کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔

اگر خدا نے ہمیں عقل و فراست دی ہو تو مذہب بھی اوسنے دیا ہو مذہب بھی دراصل حیات ثانویہ کے متعلق ایک شعور اور عقل و فراست ہی ہو جس طرح ہماری فطرت عقل و فراست کے سوائے مراحل زندگی اور نیکو بہ سہولت اور بخوبی طے نہیں کر سکتی اسی طرح مذہبی عقل کے سوائے بھی ہماری شواہد طے نہیں ہوسکتے اور اسکی ضرورت پر بھی فطرت فتوا دیتی ہے۔

مذہب نہ صرف معادیات میں ہی مؤید اور راہبر ہو بلکہ اکثر معاشریات میں بھی مذہب ایک ضابطہ اخلاق فاضلہ بھی ہو کیا انسان کو ضابطہ اخلاق کی ضرورت نہیں ہو یا اسکے بغیر تمدنی مراحل بخوش اسلوبی طے ہو سکتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے امثال میں ہو:۔

"خدا کا خوف دانشمندی کی ابتدا ہے"

مذہب نہ خدا کے خوف ہی تو ہو دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاوے گا کہ فلسفہ مذہب دانشمندی کی ابتدا ہے کیا انسان کو دانش و فراست کی ضرورت نہیں ہو اگر ضرورت ہو تو مذہب کی بھی بدرجہ اولیٰ ضرورت ہو یہ بھی کبھی کبھی کہا جاتا ہے کہ ہماری عقل و دانش ہی راہبر ہوسکتی ہو۔ پھر مذہب کی کیا ضرورت ہو میں کہتا ہوں مذہب بھی ایک ممتاز فلسفہ اور ممتاز عقل و دانش ہو اور اس عقل و دانش سے بالاتر ہے جو ہمیں دوسرے رنگ میں حاصل ہو عقل و فراست تغیر کنندہ ہے اور مذہب بجائے خود ایک تغیر ہے۔ بدین حالات مذہب مقدم ہے اور عقل و فراست اوسکی تابع ہے۔

ضابطہ الٰہی اور قانون الٰہی کے انسانی عقلیں تابع ہیں۔ کیا ضابطہ فطرت میں ہماری عقل و فراست کوئی نقص نکال سکتی ہو اگر نہیں نکال سکتی تو ضرورت مذہب صحیحہ میں بھی کوئی نقص نہیں نکل سکتا۔ مذہب یا مذہب کا فلسفہ اخلاقی اور سیاسی فلسفہ یا مطلق فلسفہ سے کہیں زیادہ صداقت کا کفیل اور ضامن ہو۔ فقد بر ۔

سلطان مرزا ۔ دگوجرانوالہ)

مسلمانانِ روس

روس کی سلطنت کے درہم برہم ہونے پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانانِ روس اب کس حال میں ہیں گو اس کا جواب دینا تو بظاہر بہت مشکل ہے مگر اس سلسلہ میں مسلمانانِ روس کی اسوقت کی حالت کا اندازہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جبکہ لڑائی شروع ہو چکی تھی بلکہ سرگرمی سے ہو رہی تھی مسلمانان روس کی حالت کے متعلق اسوقت ٹائمس کے نامہ نگار نے حسب ذیل خیالات ظاہر کئے گئے تھے +

ایڈیٹر

مملکت روس میں اسلامی آبادی کی وسعت کا بہت کم صحیح اندازہ کیا گیا ہے۔ گزشتہ چند برس کے اندر یہاں مسلمانوں نے اتنی ترقی کی کہ روسی گورنمنٹ کو انکی طرف توجہ کرنی پڑی۔ ملک کے سربرآوردہ مسلمانوں نے علو ہمتی اور استقلال سے لگاتار جدو جہد کرکے گورنمنٹ کے طرز عمل میں ایک گونہ تبدیلی پیدا کرانے میں کامیابی حاصل کی مسلمانوں کے تمام مساعی بروئے کار آئیں۔ اور ہر فرقہ و طبقہ کے لوگوں میں ایسی ہمدردی پیدا ہو گئی کہ ہز مجسٹی زار روس نے ہی تصفیہ کر لیا ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کے لیئے ایک جدا قونصل مقرر کیا جائے اور عملی کارروائی کرنے سے قبل مسلمانوں کی مردم شماری کے لیئے احکام صادر کئے۔ یہ کام وزارت داخلہ کی نگرانی میں محکمہ مذاہب کے سپرد کیا گیا۔ نتیجہ بر یودی مانڈے دی مسلمان" کی ایک تازہ اشاعت میں حسب ذیل شائع ہوا ہے۔

آبادی

۱۸۹۷ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی کل آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ بیان کی گئی تھی تازہ ترین اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی ہے۔ مملکت روس میں مسلمانوں کی آبادی ایسی منتشر ہے کہ صحیح اعداد کا معلوم کرنا دشوار ہے۔ تاہم وہ کم از کم دو کروڑ تو ضرور ہے۔ روس میں متعدد نسلوں کے مسلمان ہیں۔ ۵۰ لاکھ تاتار، ۵۰ لاکھ خرغز اور دس لاکھ لشکر ہیں۔ ملکی تقسیم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ۴۵ لاکھ مسلمان یورپین روس میں ہیں جن میں سے زیادہ دریائے روانگا کے ساحل پر آباد ہیں۔ ۳۵ لاکھ کوہ قاف میں اسی لاکھ ایشیا

رقبہ میں جسمیں روسی ترکستان بھی شامل ہے، اور بارہ تیرہ لاکھ صوبہ سائبیریا میں سکونت پذیر ہیں۔ موخرالذکر صوبہ کے علاقہ جات خاص اسطرح اس میں زیادہ کثرت ہے جہاں مسلمانوں کی ۲۴ ہزار جامعتیں، ۲۶ ہزار مسجدیں اور مقدس مقامات اور ۴۵ ہزار دینی پیشوا ہیں،

درسگاہیں اور اخبارات

مسلمانوں کے مختلف مقاصد کے انتظام و تعلیم کے لیئے ۸۰ قومی انجمنیں اور درسگاہیں ہیں مسلمانان روس میں تعلیمی ترقی نہایت سرعت سے ہو رہی ہے ان کے ۱۹۴ عظیم الشان کتبخانے ۴۲ مطابع اور ۱۰۸ اخبارات و رسائل ہیں۔ یہ اعداد بہت پرانے ہیں اسلیئے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اخبارات و رسائل کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہوگا اور اسوقت کم ازکم ۲۰۰ بااثر اخبارات موجود ہونگے۔ اخبار نویسی میں مسلمانان روس نے خاص مہارت حاصل کر لی ہے۔ تازہ ترین تفتیش سے یہ اعداد معلوم ہوئے ہیں اور گورنمنٹ روس ان کے لیئے اب خاص قوانین وضع کرنیوالی ہے۔ گورنمنٹ جو کچھ کرنا چاہتی ہے وہ صرف ان تعلیم یافتہ اور بیدار مسلمانوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو زیادہ تر یورپین روس میں آباد ہیں +

مسلم کانگریس

مسلمانان روس کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی آزادی سعی پیہم اور سرگرم تبلیغ سے حاصل ہوئی ہے۔ سب سے پہلے کانگریس ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ مسلمانوں کے تمام قوموں اور نسلوں کے نمایندے ملک کے گوشہ گوشہ سے نجنی نوگورا میں جمع ہوئے اور انہوں نے ایک جہاز کرایہ پر لیا اور مقام اوکا کو جو دریائے والگا پر واقع ہے بطور تفریح و تفنن روانہ ہوئے یہاں پہونچکر جہاز پر انہوں نے جلسہ کیا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ ترتیب جو اطمینان سے حاصل ہو سکتی ہیں کہاں نصیب تھی۔ لیکن اس کے بعد دوسرے سال ان کا حقیقی اجتماع ہوا۔ صدر جلسہ علی مردان بے توپچیباشیف باکو منتخب ہوئے۔ اسوقت جب باکو کی طرف سے پہلے روسی پارلیمینٹ ڈوما کا اجلاس شروع ہونے کے چند ہفتوں کے اندر اندر انکو ٹینے پر صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی اسپر علی مردان بے کے بھی دستخط تھے +

قومی مطالبات کے لیئے جدوجہد

پہلے ڈوما میں ۲۴ تاتاری مبعوثین شریک ہوئے تھے۔ اوران میں سے ۱۲ اپنی دوردراز کی مسافت طے کرکے آئے تھے کہ کئی ماہ آتے ہی آتے لگ گئے تھے۔ مسلمانان روس کو دوسری اقوام کے مقابلہ میں بعض حقوق حاصل نہیں ہیں اوران کو حاصل کرنے کے لیئے وہ پوری کوشش کررہے ہیں۔ کانگرس اور متفرق کانفرنسوں میں جس پالسی کو انہوں نے پیش نظر رکھا ہے اورجن بنیادوں پر قومی عمارت بنارہے ہیں ان کے سلسلہ میں۔ سب سے پہلے تو کانگرس نے یہ فیصلہ کیا کہ تاتار جو ڈوما کے اراکین مقرر ہوئے تھے اُنہیں کا پھر تقرر ہونا چاہیئے۔ اوران کے بجائے گورنمنٹ کے دوسرے نامزد ممبروں کو ہدایت کردینی چاہیئے کہ وہ ڈوما میں اپنی پارٹی الگ بنالیں اور متفقہ طور پر سلطنت کے ممبر ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لیئے مساوی حقوق کا مطالبہ کریں۔ تیسرے یہ طے کیا گیا تھا کہ ان شہروں میں جہاں تاتاریوں کی آبادی ہے۔ تاتاری زبان میں ان کے بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کا گورنمنٹ اسکولوں میں انتظام کرنا چاہیئے۔ چوتھے یہ کہ سلطنت میں جو حقوق دوسری اقوام کو حاصل ہیں مسلمانوں کو بھی ملنے چاہئیں۔ پانچویں یہ کہ گورنمنٹ سے اس امر کی اجازت حاصل کرنی چاہیئے کہ جہاں کہیں مسلمان چاہیں تاتاری سوسائٹیاں قائم کریں۔ یہ اور اس قسم کے دیگر اغراض ومقاصد کو پیش نظر رکھ کر گورنمنٹ نے کانگریس کے وجود کو تسلیم کرلیا ہے اوراس کی ترقی کا اس سے پتہ لگتا ہے کہ گزشتہ سال کانگریس دارالسلطنت (پیٹرو گراڈ) میں منعقد ہوئی تھی۔ روس کے مختلف حصوں سے یہ کثرت مبعوثین جمع ہوئے تھے جن میں تاتاریوں اور ایشیا متوسط کے ساکنوں کی تعداد غالب تھی مضامین مباحث میں یہ بھی تھا کہ عیسائی اورمسلمان دونوں کے لیئے حقوق حاصل کیئے جائیں +

تعلیمی تحریک

بعض ملکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبا کی تعداد کو محدود کردیا گیا ہے۔ پیٹروگراڈ ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ میں کل دس فی صدی مسلمان طلبا کے داخلہ کی اجازت ہے مگر مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی مساجد ومعابد اور درسگاہوں کی نگہداشت کے لیئے ایک

مرکزی کمیٹی بنائی جائے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیئے قومی مدرسوں اور کالجوں کی اجازت دی جائے
وسط ایشیا اور ترکستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کو سدھارا جائے۔ ان جلسوں
کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں مسلمان خواتین بھی شریک ہوتی ہیں اور طبقۂ نسواں کی ترقی
کے مسائل پر بحث کرتی ہیں۔ روسی خواتین کی حالت دیگر اسلامی ممالک سے بالکل مختلف
ہے۔ مسلمانوں کی لڑکیاں پٹیروگراڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اسی سال
ایک لڑکی نے یونیورسٹی کا اعلیٰ نمبروں سے امتحان پاس کرکے خاص پٹیروگراڈ میں وکالت
کرنے کے لیئے اپنے آپ کو اہل ثبت کر دیا ہے +

روس میں اسلام کی اشاعت

روس میں اسلام کی اشاعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال
میں ۵۰ ہزار عیسائی مسلمان ہوئے +

روسی مسلمانوں کی وفاداری

مسلم رعایا میں کئی اعتبار سے انقلاب کے آثار نظر آتے ہیں جنگ چھڑتے ہی قوم کے
نمایندے یکجا جمع ہوئے اور اظہار عقیدتمندی و وفاکیشی اور سلطنت کو ہر طرح کی امداد دینے
کا وعدہ کیا۔ جنوبی روس کے مسلمان یورپین لباس پہنتے ہیں۔ لیکن منگولیا اور بخارا کے
مسلمان ایشیائی لباس اور پرانے رسوم کے پابند ہیں۔ روس میں مسلمانوں کا مستقبل خوشنما
ہے۔ انہوں نے سلطنت کی اس عالمگیر جنگ میں بڑی مدد کی ہے۔ ان کی فوجیں میدان
کارزار میں غنیم سے برسر پیکار ہیں۔ ان کے مالدار لوگ سلطنت کو گرانقدر عطیہ بصورت
نقد و جنس دے رہے ہیں۔ روسی حکومت کا مسلمانوں کے متعلق عمدہ رجحان اس انقلاب
کا جزو ہے جو ہماری سلطنت کے دلوں میں ہر قوم و ملت کی رعایا کی نسبت ہو رہا ہے +

نزع میں سامنے اک صورتِ زیبا آئی | موت آنکھوں سے اٹھاتی ہوئی پردہ آئی
وہ نظر لیکے محبت کا سندیسہ آئی | تیری شامت دلِ مشتاق تمنا آئی
نازکی ہے تری طرح اجل بھی مجھسے | میں بلاتا ہوں تو کہتی نہیں اچھا آئی
کوئی انسان بھی دیکھا کوئی عاشق بھی ملا | یہ نتو آنے کو تری بزم میں دنیا آئی
میری قسمت کہ ہوئی تم سے محبت مجھکو | میری شامت کہ میرے دلمیں تمنا آئی
جان قربان ہو اس آنکھ پہ حسرت یہ ہی | دیکھ کر جو ترے جلوں کا تماشا آئی
وہ تیرا عشق تھا جسنے مجھے بیمار کیا | نہ تیری یاد تھی جو بن کے مسیحا آئی
تم اگر جاؤ گے تو مجھ کو مٹا جاؤ گے | تم جو آئے ہو تو مٹنے کو تمنا آئی
سامنے کوئی نظر آئے تو اس سے پوچھو | اسکی آواز کہاں سے دلِ شیدا آئی

بات کرنے کی قسم کس لئے کھالی بے خود
تونے کیا سمجھا ہے یہ جی میں ترے کیا آئی

بیخود دہلوی

کاٹ سر کو نہ مری تیغِ جفا سے پہلے | آن رکھنی ہے تو کر قتل ادا سے پہلے
یہی اس رنگ میں ممتاز نہیں ہو سکتی | خونِ عشاق کی سرخی تھی حنا سے پہلے
آج کس عاشقِ ناشاد نے پھبتی کہدی | جس نے گردن کو جھکایا ہے حیا سے پہلے
شامِ فرقت کی تو صورت نہ دکھائے اللہ | موت آئے شبِ اندوہ ربا سے پہلے
کیا کہا اے نظرِ یاس کہ وہ گھبرائے | جو سزا دینے کو تھے مجھکو خطا سے پہلے
کیا خبر تھی کہ لگے گی شبِ وعدہ مہندی | ہمکو واں رنگ جمانا تھا حنا سے پہلے
قتل کو میرے نزاکت سے نہ اٹھا خنجر | کام لینا تھا انہیں تیغِ ادا سے پہلے

ہم کو معشوق جو بننا تھا تو اے بندہ نواز
قاعدے سیکھتے آئینِ وفا سے پہلے

تو ظلمات نہیں زلف کا کوچہ اے خضر
منہ تو دھو آؤ ذرا آبِ بقا سے پہلے

جانیں لیتی ہیں غریبوں کی تو لیلو وہ بھی
دل تو تم لے ہی چکے اہلِ وفا سے پہلے

پہلے لیتا ہے اب اے پیرِ مغاں کیا بیعت
بک چکا اب کے ہم اس بیچ [illegible] سے پہلے

ناز کا وقت تو آئیگا ملاقات کے بعد
فکر یہ ہے کہ نبٹنا ہے ادا سے پہلے

خارِ صحرائے جنوں میرے کفِ پا سے دبے
نوک کی سیتے تھے ہر آبلہ پا سے پہلے

(بزم اکبر آبادی)

خدا عتاب ہو جا خطرِ عذاب ہو جا
جو عنایت اپنی چاہے میری جاں خراب ہو جا

یہ شکایتِ مصائب نہیں قصد خودکشی ہے
لحدِ ریگزار مدفون کہیں غرقِ آب ہو جا

وہ شرارِ طورِ ایمان تیرے دل میں ہے جو پنہاں
رگ و پے میں مشتعل کر ہمہ تن کباب ہو جا

سمجھا کہ وہ پریوش ہیں نظر براہ تیری
کوئی راہ کر کے پیدا کبھی باریاب ہو جا

ہیں عشق و عاشقی میں کوئی [illegible] روزِ محشر
ابھی شرطِ کر وفا کی ابھی کامیاب ہو جا

تیری پردہ داریوں سے ہوا بدگمان زمانہ
ہے یہ مقتضائے عفت کہ تو بے نقاب ہو جا

ہے نگاہِ مہربانی کسے اب یہاں میسر
تپش آج تو بھی نذرِ نظرِ عتاب ہو جا

تپش خورجوی

[illegible] عشق مرض ہیں تو کیا دوا کرتے
جو انتہا کو پہنچتے تو ابتدا کرتے

اگر زمانے میں اپنے کبھی وفا کرتے
دہانِ زخم تڑپنے پہ کیوں ہنسا کرتے

شکایت زیادہ ظلم ہے کہ نہیں
میں بے وفا تھا تو اچھا تمہیں وفا کرتے

مریض لذتِ فریاد کہہ نہیں سکتے
جو نالے کام نہ آتے تو چپ رہا کرتے

جو ایک حال پہ رہتا مزاج دوست تو کیا
سنبھل سنبھل کے مریضانِ غم گلا کرتے

مذاق درد سے نا واقفی نہیں اچھی
کبھی کبھی تو مری داستان سنا کرتے

شبِ فراق گوارا نہ تھی مگر دیکھی
اب اور خاطرِ مہمان زیادہ کیا کرتے

درِ قفس نہ کھلا قدرِ صبر کر صیاد
تڑپتے ہم تو بہاروں میں را شا کرتے

اسے جلا کے اُسے آگ دی برا نہ کیا
جگر جو رہ گیا رہتا تھے آخر وہ دل کو کیا کرتے

نہ پوچھ قیدئ زندانِ تنگ کی روداد
نکل گیا ہے ابھی دم ہوا ہوا کرتے

زبان والوں سے سُن سُنکے ہو یقین ثاقب
کہ بولتے تو صنم بھی خدا خدا کرتے

ثاقب قزلباش لکھنوی

مَیں شریکِ بزمِ مے ہوں مے پلانے کیلئے
سیکڑوں کے ساغر و مینا اٹھانے کیلئے

یعنی میں سامانِ بزمِ دہر کا وہ جزو ہوں
آبرو بیچی ہے جس نے آب و دانے کیلئے

داد کے قابل ہیں میری بے سر و سامانیاں
آسماں ہی آسماں ہے سر چھپانے کیلئے

بزم میں ہوں شمع اور گلشن میں شبنم سر بسر
وقف ہیں دیدے میرے آنسو بہانے کیلئے

شمع کی اور میری قسمت در حقیقت ایک ہے
لائے ہیں دونوں کو محفل میں جلانے کیلئے

فکرِ آسائش اسیری میں کچھ ایسی بڑھ گئی
مینے پر نوچے ہیں۔ اپنے آشیانے کیلئے

میری ہستی کا یہی پہلو ہے روشن ای امین
ایک عبرت ہے میری ہستی زمانے کیلئے

(امین)

بہار بے خزاں دل میں ہے وہ شاداب گلشن ہوں
گل امید سے پھولا ہوں وہ شاخِ نشیمن ہوں

مبارک ہو گل و بلبل تمہیں گلشن پہ مر مٹنا
مجھے کیا کام گلشن سے میں اپنے آپ گلشن ہوں

ہماری یاس سے کہدو نہ لیں وعدہ پھیری عبث کی
دلِ بے مدعا کہتا ہے آمیں تیرا مسکن ہوں

شکایت ہی نہ ہوگی نہ شکوہ دوست دشمن کا
میں اپنا دوست خود ہوں اور اپنا آپ دشمن ہوں

کسی کی جنبش مژگاں کی ہے مت کھولنا مجھکو
میں بالکل دیکھنے اندر کا مشتی ہوں ایک ناوک فگن ہوں

لگے ٹھوکر دل مایوس سے بولی مری تربت
معطر ہوں مزین ہوں میاں اچھی خاصی اپنی جا ہوں

جناب عشق میں بھی جستجو غارت گر دل کی
شعلۂ حسن پہ اُٹھی کہ جی میں برق خرمن ہوں

بخیر انجام ہو عزمی کا سب صاحب دعا مانگیں
وہ کہتا تھا کہ میں مومن نہیں کافر برہمن ہوں

عزمی (دہلوی)

یہی ستر تمدن ہے خیال اس کا بشر رکھے
کسی کا ہو رہے خود یا کسی کو اپنا کر رکھے

نہ تو کچھ سیم و زر رکھے نہ تو لعل و گہر رکھے
کرے دل میں ہر اک کے گھر بشر ایسا ہنر رکھے

نہ بڑھنے پائینگے عیب اور ترغیب ہنر ہوگی
بشر اپنی خطاؤں پر اگر ہر دم نظر رکھے

صفائے ظاہری پر کیا تیقن حسن باطن کا
دل اک آئینہ ہے اس میں محبت دیکھ کر رکھے

نہ دھوکا دے کسی کو کوئی عزت اپنی گر چاہے
ہو جامہ پارسائی کا تو دل بھی صاف تر رکھے

اسی کا نام طاعت ہے یہی ہے کام بندے کا
زباں پر ورد رکھے نام حق سجدے میں سر رکھے

عزیزو شر و آفت کیوں سمجھتے ہو شرافت کو
وہی اشراف کیوں ہو اشرفی جو اہل شر رکھے

طریق ایثار کا آساں نہیں مشکل یہ جادہ ہے
قدم رکھے وہی اس میں جو پتھر کا جگر رکھے

زمانہ میں سدا تیغ حوادث چلتی رہتی ہے
تعلق سے کیا خطرا سکو رضا کی جو سپر رکھے

جو کوہ حلم ہوگا کوئی اس کے منہ نہ آئیگا
وہ منہ کی کھائے گا ہر دم جو غصہ ناک پر رکھے

ذہین آتا ہے کوئی کام کب تکلیف و زحمت میں
بشر کو چاہیے خالق کی رحمت پر نظر رکھے

ذہین (حیدرآباد)

تصحیح تمدن کے جون نمبر میں جناب ثاقب کی غزل کے مطلع ثانی کے دوسرے مصرع کی جگہ رہ گیا چھپ گیا ہے اسے یوں پڑھنا چاہیے:- یاد ہوں بن کر ...

یار کا رومال

نامہ بر آج یہ کیا لایا ہے — سبز ریشم کا ایک ٹکڑا ہے
سبز رومال جس نے بھیجا ہے — اُس ستمگار کا یہ منشا ہے

عاشقی میں دکھاؤ شان اپنی
زہر کھا کر گنواؤ جان اپنی

دردِ دل کی ہے کیا دوا رومال — روح پرور ہے جانفزا رومال
ہے دل آویز و دلربا رومال — عطر فتنہ میں ہے بسا رومال

ہے یہ ایما کہ ہم نہ آئینگے!
روز فتنے نئے اُٹھائینگے!

مرہم سبز خوب لایا ہے — زخم دلِ ریش کا جو پھاہا ہے
دل کو صبر و قرار آیا ہے — میں نے آنکھوں سے جب لگایا ہے

اسکو رکھتا ہوں چشم تر پہ کبھی
دل بیتاب پر جگر پہ کبھی

اے مرے نامہ بر ترے صدقے — اتنی سی بات مجھ کو بتلادے
پوچھتا ہوں تجھے قسم دیکے — جھوٹ کہنا نہ کبریا کے لیئے

بزمِ جاناں سے اسکو لایا ہے
یا کہیں راستے میں پایا ہے

سبز رومال ہے سمن بر کا — ہے یہ تحفہ اُسی ستمگر کا
ہے جو مایل لباس اخضر کا — ہار پہنے ہے جو گل تر کا

جسکی نعدوں پہ نوجوانی ہے
آج پہنے لباس دھانی ہے

رسا ہمدانی۔ گیاوی

مضامین نسائی

ناظرین تمدن ملک کے بے مثل ادیب جناب نسائی کے جواہر ریزوں سے
واقف ہیں۔ اسمیں اب ان کے کل مضامین کا مجموعہ نہایت خوشنما
سائز پر چھاپا گیا ہے ✦

قیمت علاوہ محصولڈاک صرف ۴ر

مصورِ فطرت حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی اِس مجموعہ کی نسبت
تحریر فرماتے ہیں:۔

"بی نسائی کے مضامین میں انشاپردازی کی قیامت
بھری ہوئی ہے..... اس قسم کے مضامین اردو علم ادب کی جان
ہیں انمیں مذہبی تمدنی سیاسی اور خصوصًا ادبی اشارات خوبصورتی
سے لکھے گئے ہیں کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے"

پتہ:۔ قوم بک ایجنسی مٹیا محل

ان ادویات کو اکثر مشہور ڈاکٹروں نے سرٹیفکیٹ دیئے گورنمنٹ انڈیا سے رجسٹری کرانا پڑا ہے اگر مفید ثابت نہ ہوں تو قیمت واپس۔ اگر ولایتی دیں تو اسی اخبار میں شکایت چھپوائیں

سرمہ اکسیر چشم (رجسٹرڈ)

جسکے ۳۰ ماہ میں ۲ ہزار سارٹیفکٹ آئے ہیں

آنکھ کے تمام امراض کیلئے اکسیر ہے۔ آنکھ کی حالت کیسی ہی خراب ہو، ضعف چشم، ابتدائی موتیا بند وغیرہ امراض کیلئے مفید ہے۔ عینک تک چھڑا دیتا ہے جس کی بابت ملک کے پانچ سو نامور اخبارات نے بڑے بڑے تعریفی ریویو کیے ہیں۔

قیمت فی تولہ عہ ۳ تولہ ۱ع محصول ڈاک علاوہ

نوٹ:۔ اگر سارٹیفکٹ ملاحظہ کرنا چاہتے ہو تو فہرست مفت طلب کرو

حکمت کی روح (رجسٹرڈ)

(قیمت ۱عہ محصول ۔/)

باتصویر اعلیٰ کاغذ پر ہماری ۹۰ سالہ خاندانی خاص الخاص مجربات کا خاص ذخیرہ جس میں پوشیدہ سے پوشیدہ نسخے تمام بیان کیے گئے ہیں۔ غلط ثابت کرنے والوں کو ۵۰۰ روپیہ انعام

گلدستہ

نامی کتاب ۱۰۰ صفحہ باتصویر، اعلیٰ کاغذ، ادبی اخلاقی علمی طبی فن مجلسی وغیرہ نہایت قیمتی مضامین سے لبریز ہے

قیمت صرف ۴ آنہ اگر پسند نہ ہو قیمت واپس

حبوب مراد (رجسٹرڈ)

جسکے ۳۰ ماہ میں ایک ہزار سارٹیفکٹ آئے ہیں

دنیا میں لاثانی طاقت آپ کی جوانی اور زندگی کی جان مقوی و ممسک گولیاں استعمال فرما کر ان کا تجربہ کرو، خود دیکھو زیادہ تعریف فضول ہے۔

قیمت ۸ گولی عہ ۳۲ گولی ۱ع محصول ڈاک ۵ پائی

ایجنٹوں کی ضرورت ہے قواعد طلب کرو

سلائیاں:۔ سرمہ کیلئے خاص طور سے چاندی وغیرہ ڈلوا کر تیار کرائے گئے ہیں۔ آنکھوں کے واسطے خاص مفید ہیں قیمت خریداران سرمہ اکسیر چشم سے ۴ غیر خریداران سے ۸

ملنے کا پتہ:۔ لالہ راج نرائن حکیم نمبر ۳۲ جھنگ (پنجاب) تار کا پتہ:۔ سرمہ جھنگ

نومبر ۱۹۱۹ء نمبر ۶

تمدن دہلی

علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اخلاقی، فلسفی مضامین کا مخزن

فہرست مضامین

انجمن مانع ترقیِ تعلیم فی الہند

صدر کی افتتاحی تقریر۔

حضرات! آپ نے جو اپنی انجمن کا سب سے پہلا صدر منتخب کرکے مجھکو عزت بخشی ہے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مجھ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ اس عظیم الشان انجمن نے صدر کا انتخاب کرنے کے وقت آپکے فیصلہ پر ایک بڑی حد تک اس بات نے اثر ڈالا ہے کہ مجھ میں یونیورسٹی کے وہ اوصاف مفقود ہیں جن کا اظہار عام طور پر صاحب تعلیم کے نام کے آخر میں انگریزی کے چند بڑے حروف بڑھا دینے سے کیا جاتا ہے۔ جب میں اپنی زندگی کے ان واقعات پر غور کرتا ہوں جنہوں نے مجھ کو یونیورسٹی تعلیم کے غار تاریک میں سر کے بل گر جانے سے روکا تو مجھ کو درحقیقت لا انتہا حسرت ہوتی ہے کیونکہ مجھ کو یقین ہے کہ اگر میں ڈگری حاصل کرنے کی ذلت کا مرتکب ہوتا تو میں اس عہدہ پر مامور ہونے کے قابل ہرگز نہیں سمجھا جاتا جو آپ صاحبان میں قوت ممیزہ کے نہونے کی وجہ سے آپ نے مجھ کو سونپا ہے اگرچہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس افتتاحی جلسہ کے صدر کی حیثیت سے پبلک کے سامنے انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کا بار میرے کندھوں پر ڈالا گیا ہے وہ مجھ جیسے درجہ جہالت رکھنے والے کے لیے بہت بھاری ہے تاہم یہ یقین میری حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ آپ لوگ بحیثیت سچے حامیانِ مقاصد انجمن میری ان کمزوریوں اور نقائص کی طرف سے جو بوجہ تعلیم مجھ میں پیدا ہو گئی ہیں اپنی آنکھیں بالکل بند کر لیں گے۔ انقلاب کی ان قوتوں نے میری اس زندگی فرض کی مشکل کو اور بھی دو بالا کر دیا ہے جنہوں نے ملک کو ایک سرے سے

ملک کو سرے سے سرے تک ہیجان میں ڈال رکھا ہے اور سارے ہندوستان کو موجودہ تعلیم کا ایک سچا مرکز
نظر آتا ہے۔ لیکن بیشتر اسکے کہ میں تعلیم یافتوں کی پیدا کردہ گل جھٹی کو سلجھانا شروع کروں میرے خیال میں
یہ جتا دینا قرین مناسب ہوگا کہ اگرچہ یہ بلحاظ مقصد و سبب الوجود یہ انجمن اور "انجمن اشاعت جہالت فی الناس"
ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں لیکن درحقیقت ہماری انجمن کا وجود مذکورہ بالا انجمن سے بالکل جدا ہے کیونکہ وہ لارڈ میکالے
کے مشہور تعلیمی نوٹ سے جو سنہ ۱۸۳۵ء میں لکھا گیا تھا بہت قبل معرض وجود میں آچکی تھی، اسکو سب سے بڑا صدمہ سنہ ۱۸۵۴ء
میں سر چارلس وڈ کے مراسلت سے پہنچا اور وہ لارڈ کرزن کے زمانہ حکومت تک بحالت زوال پڑی رہی لیکن لارڈ
صاحب موصوف کے عہد میں اسنے تازہ روح کی علامات دکھانی شروع کیں اور جب سے ملک کے سب سے زیادہ طاقتور
ارکین کے زیر اثر ۔ وہ کرسر سبزی کی حالت میں چلی آتی ہے۔ ہماری انجمن اور انجمن مذکورہ میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ فرق
صرف طریقہ عمل کا ہے ہم اس مرض کی ترقی کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر طرح بالواسطہ اس نتیجہ پر پہنچتے
ہیں وہ بلاواسطہ صحیح واقعات کی توسیع سے حاصل کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیئے
کہ چونکہ "انجمن اشاعت جہالت فی الناس" ہماری انجمن سے بہت قبل وجود میں آچکی ہے اسلیئے میدان کارنمائی
میں وہ بمقابلہ ہمارے فوقیت کا درجہ رکھتی ہو صورت واقعات اسکے بالکل خلاف ہے۔ وہ تحریک جس نے
اس انجمن "بائیکاٹ تعلیم فی الہند" کی خاص شکل میں جنم لیا ہے نسل انسان میں ہمیشہ سے جنبش پیدا کرتی رہی ہے
اور زمانہ قدیم میں بھی اسکا اثر نمایاں تھا جبکہ تعلیم و تربیت کی ایک تباہ کن آتش ابھی تک ابتدائی جہالت کی بجھی
ہوئی چنگاریوں میں پنہاں تھی۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ ایسی مثالوں سے پُر ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ زمانہ
ماضی کے غیر فانی رہبران قوم نے اشاعت تعلیم کے خطرات کو بخوبی محسوس کر لیا تھا اور اس ظالم مرض کے علاج
دانستہ میں اگرچہ ناکامل لیکن بہادرانہ کوششیں کی تھیں۔ تاریخ ہند کے ہر متعلم کو معلوم ہے کہ گزشتہ زمانہ میں زبان
سنسکرت جو نسل آریہ کے علم کی محافظ تھی اور یہ زبان صرف برہمنوں کی ملکیت تھی جنہوں نے اپنے تئیں اس طرح
ذات کا ایک گروہ بنا لیا تھا جس طرح موجودہ زمانے میں علما کی ایک خاص جماعت بنی ہوئی ہے۔ شودر جو غالباً
آبادی کے سب سے زیادہ تعداد میں تھے قانوناً برہمنوں کی زبان سیکھنے سے معذور کر دیئے گئے تھے کیونکہ سیلئے
ہوا کہ ان ذات میں برہمن کے کوئی شخص سنسکرت نہ بول سکتا تھا ورنہ مرتکب جرم قرار پاتا تھا لیکن یہ لحاظ رکھا
جاتا کہ زبان مردہ چیز نہیں ہے بلکہ صرف ایک وضع کی سوداگری ہے جس میں بیٹھ کر جیسا کہ عام طبیعت با طبع سے عالم
میں آتے ہیں۔ عام تر تم کے علوم کی ترویج کے لیئے زبان ضروری ہے تو اسکی وجہ سمجھنی مشکل ہوگی

نہ عوام الناس کے لیے مقدس زبان سنسکرت کی تحصیل کیوں ممنوع کی گئی تھی۔ اس زمانہ کے قدیم ہی رہبران قوم نے اشاعت
تعلیم کے برے نتائج کو بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ گو ہم عوام الناس میں تعلیم پھیلنے سے ان کو
کس قدر تنزل کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسلیئے انہوں نے اس شجر ممنوعہ کو نیست و نابود کرنے کی خاطر اپنی پھاوڑا
اسکی جڑ پر ماری اور زبان سنسکرت ہی کی تعلیم کو ممنوع کر دیا جس میں فقط یہ قدرت تھی کہ تعلیم کو ترقی دے۔

حضرات! یہ حقیقتاً ایک ہندوستانی کے دل کی تازگی کا باعث ہوگا کہ وہ اپنی قدیم تاریخ میں پڑھے کہ اوسکے
اہل وطن اس زمانہ بعید میں بھی تعلیم کے روکنے کے مشکل اور اہم کاموں میں آگے قدم رکھنے والے تھے۔
کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ قناعت ان کی قسمت میں لکھی تھی جس زمانہ میں وہ رہتے تھے زمانہ حال سے بدرجہا بہتر تھا
اور ان کو وہ ثروت اور خوشی حاصل تھی جسکی برابری روئے زمین پر آجتک تمام انسانوں کی کسی قوم نے نہیں کی۔ اگر آپ
اون کے قابل رشک اور بے مثل عروج کی وجوہات پر غور کرنے کے لیے تامل کریں تو آپ بے اختیار اس نتیجہ پر
پہنچیں گے کہ وہ ہم سے بدرجہا بہتر تھے اس وجہ سے کہ ہم سے کم تعلیم یافتہ تھے بحیثیت انسان ہونے کے اعلیٰ تر
درجہ رکھتے تھے محض اس وجہ سے کہ ان میں بدبختی کی کمی تھی اون کا اعلیٰ اور شریفانہ چال چلن تھا صرف اس وجہ سے
کہ وہ سوالوں کے تعلیم یافتہ نہ تھے درحقیقت ہمارے ملک کا ستارہ اوسی نسبت سے زوال پذیر ہونا شروع
ہو گیا ہے کہ جس نسبت سے عوام الناس میں تعلیم عروج پکڑ گئی ہے سچ تو یہ ہے کہ اشاعت تعلیم سے بڑھ کر کوئی
بلا اس قوم پر نازل نہ ہو سکتی تھی کہ جو ایک زمانے میں اپنی اون سرشتی قوموں کی بنا پر کہ جو جہالت سے پیدا ہوتی
ہیں ایک عظیم الشان درجہ رکھتی تھی۔ میرا یہ ارادہ نہیں کہ میں تمام تاریخ آپ کے سامنے بیان کروں کہ کس طرح تعلیم کا
کانگن نے آہستہ آہستہ ہماری قومی ترقی کی پشت میں زہر پھیلانا شروع کیا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو مجھ کو
بہت سا تاریخی مصالحہ جمع کرنا پڑے گا اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو اس معاملہ کی نسبت پورا علم ہو جاوے
یہ ایک ایسا امر ہے کہ اس سے آپ کو محفوظ رکھنا میرا پہلا فرض ہے ورنہ میں اس سوسائٹی کے مقصد اصلی
کے خلاف ورزی فعل کا مرتکب ہونگا۔ ہم میں سے ہر ایک وہ شخص کہ جسکو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس جماعت کا
ممبر کہلایا جاوے بذریعہ اپنی متبرک قسم کے اس بات کا پابند ہے کہ جہالت کو ترقی دے اور ہر قسم کے علم کی بیخ کنی
کرے اسلیئے آپ مجھ سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ میں اس تحریک کے ابتدائی اصول سے سرمو بھی فرق نہ کروں گا خواہ توسیع
تعلیم کی تاریخ پر بحث کرنے کی مجھ کو کتنی ہی ترغیب کیوں نہ دی جائے لیکن میں اپنی تمام قوت سے اسکا مقابلہ کرونگا
کیونکہ حضرات ہمارا کام پاک اور متبرک ہے اور ایسے زمانہ میں جبکہ تعلیم پھیلانے والوں کے ناقابل پسند مقصد نے

کامیابی کا درجہ اولا حاصل کر لیا ہے ہم پر لازم ہے کہ اپنے برگزیدہ نصب العین کی ہمیشہ نگہداشت کریں کہیں ایسا نہو کہ یہ موجودہ زمانے کے روزمرہ مباحث میں پڑ کر ذلیل ہوجاوے اور وہ نفع جو ہندوستان کے کروڑہا گرسنگان آدمیوں کو پہنچانا مقصود ہے ہاتھ سے جاتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے بیس سال کے عرصہ میں حامی تعلیم نے چیخ چیخ کر ہمارے ملک کے بہترین دماغوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور جب سے اس کا جھنڈا اٹھا ہے اسکے پیرو کاروں کی تعداد میں مستقل طور پر ازدیاد ہوتی رہی یہی وجہ ہے کہ اس انجمن کی بنیاد ایک منٹ بھی قبل از وقت نہیں ڈالی گئی اگر ہم تھوڑے دن اور ڈھیل ڈھال کرتے رہتے تو تعلیم کے نیست و نابود کرنے کا مسئلہ تقریبًا ناقابل حل ہو جاتا مگر بحالت موجودہ بھی ہندوستان کی جمعیت کو تعلیم کے گڑھے کے کنارے سے بچانے کے لیے بہت اچھا موقع ہے اگر ایک قدم وہ اور لے لیتے تو لازمی ابتدائی تعلیم کے لیے تھا سمندر میں سر کے بل گر پڑتے جہاں سے ان کا نکالنا جدید ترین طریقہ استعمال کرکے بھی ناممکن ہوتا۔

بالمقابل موجودہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ کوششیں جو ہماری ہم مسلک انجمن اشاعت جہالت فی الناس،، نے تعلیم کے پھیلانے والوں کے حملوں کو روکنے میں کی ہیں باعتبار مختلف پہلوؤں کے قوی ہیکل نظر آتی ہے مگر ایسی کوشش میں کامیابی بھی جب ہی ممکن ہوئی جبکہ اس مادہ کے حامیان نے اس کے سر پر ہاتھ دھرا تاہم ہندوستان نے ماتم بپا دیا ہے ان قوم کی فاصحانہ اور فتنہ انگیز فضول گوئی اپنا اثر کیے بغیر نہ رہی اور انہوں نے متواتر طلبہ تعلیم کھڑک کھڑک کر طبقہ ہائے حکام میں اپنے قدردان پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی یہاں تک کہ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ چیمسفورڈ جیسے والسرائے صاحبان کو بھی ان تعلیمی منڈکوں نے ٹرا ٹرا کر اس بحث کی کیچڑ میں دہر گھسیٹا اور چار و ناچار ہو کر اس مسئلہ سے خوشروی کے ساتھ برتاؤ کرنا پڑا حالانکہ وہ جانتے تھے جیسا کہ ہر صحیح القلب آدمی جانتا ہے اور جاننا چاہیے کہ مسئلہ تعلیم نہ صرف فتنوں سے بھرا ہوا ہے بلکہ ہندوستان کے لیے اس میں بلاخیز آثار پنہاں ہیں۔

اگر سرکار ہائے صوبہ جات مردانہ وار لازمی ابتدائی تعلیم کے قانون کے اجرا کا مقابلہ نہ کرتیں تو یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سرکار ہند لارڈ ہارڈنگ کے زیر اثر رہ کر اس شور تعلیم کی شکار ہو جاتی جو مسٹر گوکھلے مرحوم نے سنہ ۱۲ء میں مجلس واضعان قوانین میں پھونکا تھا۔

حضرات! درحقیقت یہ اظہار کرتے ہوئے مجھ کو سخت رنج ہوتا ہے کہ وہ ناقابل صلح اور ان تھک

دشمن جس سے زمانہ حال میں ہماری تحریک کو دوچار ہونا پڑا ہے وہ مرحوم گوکھلے سے کم شخصیت کا آدمی نہ
تھا۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے بڑھ کر مرحوم کے صفات کا اور کوئی قدر دان نہیں ہو سکتا لیکن اگر میں مرحوم گوکھلے
کی تعلیمی حرکات کا ذکر زبان وار کرنے کی کوشش کروں تو بیشک مجھ میں حب الوطنی کے احساس کی کمی اور اس بڑی انجمن
کے مقصد سے تفاوت کے آثار پائے جائیں گے اسمیں شک نہیں کہ مسٹر گوکھلے ایک بہت بڑے آدمی تھے مگر
اس سے یہ ترشح نہیں ہوتا کہ وہ غلطی کرنے کے ناقابل تھے یا اون کا تمدنی رویہ احاطہ سہو سے باہر تھا۔ اور میں یہ
کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ہماری انجمن کے نقطہ نظر سے اون کے حرکات کے خلاف اعتراض کیا جاوے تو
یہ اعتراض اوس خالص ادب و لحاظ سے جو انکی عظمت کا ہم میں سے ہر اک کے دل میں ہے متضاد نہ ہوگا
ہماری حالت بالکل صاف اور سیدھی ہے ہم کہتے ہیں کہ ابتک کسی ایک شخص نے ہمارے استیصال تعلیم کے برگزیدہ
مقصد کو اتنا نقصان نہیں پہونچایا جتنا کہ مرحوم مسٹر گوکھلے نے پہنچایا ہے اگر وہ ہندوستان میں ناخواندگی
کے خلاف کلہاڑا لے کر نہ کھڑے ہوتے اگر وہ لازمی تعلیم کے مسئلہ کے سرغنہ نہ ہو جاتے یا کم سے کم اگر وہ اس
معاملہ میں غیر جانبدارانہ رویہ رکھتے تو یقیناً ہماری انجمن کا کام نسبتاً کہیں زیادہ آسان ہو جاتا اور وہ
خاص مشکل جو اب عوام الناس میں نام نہاد اہمیت تعلیم کے متعلق بیداری کی صورت میں ہمارا مقابلہ کر رہی ہے اسکا
وجود ہی طبعاً حقیقت میں کالعدم ہوتا۔ جب ہم کو یہ خیال گزرتا ہے کہ مسٹر گوکھلے ابتدائی تعلیم کے قانون
کو مجلس واضع قوانین میں پاس کرانے میں تقریباً بالکل کامیاب ہونے ہی کو تھے تو ہمارے سامنے کا منظر
بوجہ رنج بالکل تاریک ہو جاتا ہے۔ یہ امر کہ وہ اپنے مقصد میں ناکامیاب رہے اس مقابلہ پر مبنی ہے
جو دیوانوں کے سب سے بڑے سردار نے اونکی تحریک کا بہادرانہ طور پر کیا۔ ہماری انجمن کے مقصد کا یہ پکا
حامی ہمارے خاص شکریہ کا مستحق ہے کیونکہ مسٹر گوکھلے کے مسودہ قانون تعلیم کی مخالفت اس لیاقت
سے کی کہ گویا اس پودے کی اٹھتی کونپل کو توڑ دیا۔ بلکہ انہوں نے اپنا استحقاق قائم کر لیا ہے کہ اس
انجمن کے عہدہ داروں میں سب سے اعلیٰ عہدہ اون کے سپرد کیا جاوے لہذا میں نہایت ادب سے یہ
تجویز کرتا ہوں کہ وہ اس انجمن کے سب سے بڑے مربی منتخب کیے جاویں تاکہ اون کے متبرک سایہ [illegible]
میں یہ انجمن سرسبز ہو (اس موقعہ پر ذی عزت اور بہادر ولوالے کے انتخاب کی تجویز کرسی صدارت سے
پیش ہوئی اور بغیر مخالفت کے مربی منتخب کئے گئے جسکے بعد صدر نے اپنی تقریر اسطرح دوبارہ
شروع کر دی کہ) حضرات ایک صدی میں صرف ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے معزز مربی جیسا

طباع آدمی پیدا ہوا اور ہماری غلط رفتار اور ٹھوکریں کھائی ہوئی قوم کی قسمتوں کی رہبری کرے مجھکو امید ہے کہ آپکو یاد ہوگا کہ گوکھلے کے مسودہ قانون تعلیم کی مخالفت میں لیسی جپ کرنے والی اور قاطع دلیل ہمارے مربی نے پیش کی تھی جسکا جواب مسٹر گوکھلے جیسا ہوشیار دماغ رکھنے والا آدمی بھی قابل اطمینان نہیں دے سکا ہمارے جنگجو مربی نے اپنے ناقابل نقل طریقہ بیان میں بہت سے اور امور کو جو اس خطرناک مسودہ میں موجود تھے ادا کرنے کے بعد بیان کیا کہ اگر یہ مسودہ قانون کی حیثیت میں تبدیل ہو جائے گا تو یہ ایک بدصورت تعلیم یافتہ بن جائے گا اور پھر ہندوستان میں معمولی کاموں کے لیے قلیوں کا ملنا محال ہوجائیگا ظاہرا یہ دلیل نہایت ہی سیدھی سادی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس دلیل کی سادگی ہمارے مربی کے طباعی کی طرف اشارہ کرتی ہے غالبا میں زیادہ غلطی پر نہونگا کہ اگر میں یہ فرض کروں کہ ایسی دلیل کی قوت تھی کہ جس نے بہت سے سرکاری ارکین مجلس واضع قوانین کی کثرت کو اپنی طرف کر لیا اور آخر میں وہ بدنصیب مسودہ مسترد کر دیا گیا۔ مسٹر گوکھلے کی اس تجویز کے مسترد ہونے سے ایک دفعہ پھر صاف طور پر ظاہر ہو گیا کہ ہماری انجمن کی بنا ابدی سچائی پر ڈالی گئی ہے اور تمام دنیا نے جان لیا کہ ہندوستان ابھی تک مقصد علم کے انجام دینے میں بالکل گیا گزرا ثابت نہیں ہوا ہے بلکہ اسمیں مستقبل کی بہتری کے آثار موجود ہیں مسٹر گوکھلے جیسی عظمت رکھنے والا دشمن بھی باوجود اپنے تعلیمی جوش و خروش کے اصلیت اور حق کو نہ چھپا سکا بلکہ ایک موقعہ پر نہایت زور کے ساتھ اپنے مخاطبین کو ہدایت کی کہ "جہالت کے نقشہ کو نیست و نابود کر دو" اور مسٹر سروجنی نائیڈو نے دہلی میں مقاصد تعلیم پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر گوکھلے کا مذکورہ بالا قول بیان کیا تھا جس ہدایت سے اون کا صرف یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ جاہلوں کی افراط ہو اور درحقیقت یہ افراط ہی ہندوستان کو اشاعت تعلیم کے پنجوں سے نجات دے سکتی ہے۔

حضرات! اب تک میں نے اس مسئلہ کے جو ہمارے سامنے ہے صرف ایک پہلو پر بحث کی ہے اور اب میں اون مشکلات کا سامنا کرنا چاہتا ہوں جو ہم کو اس ملک میں خاص طور پر زوال پذیر قوم ہونے کی حیثیت سے سامنا ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کثیر التعداد لوگ اوس شے کی جو لفظ علم میں مشتمل ہے۔ تعریف کرتے ہیں اور اس چیز کو جسکی لفظ جہالت سے تعبیر ہوتی ہے برا کہتے ہیں اونکی منطق یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ علم بہ نفسہ اچھی چیز ہے اسلئے تعلیم جو علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے وہ بھی اچھی شے ہے۔ اسلیے میرے لیے یہ ضروری ہوگا کہ آپ کے فائدہ کے لیے میں علم کے سمجھنے کی موشگافی کروں تاکہ آپ کو اس مقصد کی

سچائی میں قابل اعتبار کامل بھروسہ حاصل ہوجاتے۔ اگر آپکو اطمینان کے قابل یہ ثابت کردیا جاوے کہ علم خواہ وہ کسی قسم کا ہو اس دنیا میں شرارت اور بدی کا منبع ہے اور بھلائی اور برائی کے تمام اخلاقی مفہومات کو مسترد کردیتا ہے تو آپکو اس امر کا یقین کرنے میں کوئی وقت نہ ہوگی کہ جس طریقے سے علم حاصل ہوتا ہے یعنی تعلیم وہ بھی نسل انسان کے بہترین حقوق کے لیے ایک بلا ہے اور ملک کے لیے تعلیم کی بیخکنی کرنی ایک لازمی امر ہے اس امر کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان کوئی چیز نہیں ہوسکتی کہ علم در حقیقت قابل نفرین شے ہے آپ میرے اس بیان سے متفق ہونگے کہ انگریزی کی یہ مثل کہ "علم قوت ہے" عام طور پر بالکل صحیح سمجھی جاتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قوت اور طاقت ایکہی شے ہیں اور مارٹن ٹپر کی یہ کہاوت بھی کہ "طاقت ہی حق ہے" کلی مشہور ہے لہذا وہ قوت جو علم سے پیدا ہوتی ہے حق و ناحق میں تمیز کرنے پر حاوی ہے اور اسیلیے علم اخلاق کے ان تمام اعلیٰ مفروضات کا انفساخ عمل میں آتا ہے جن کی بنیاد اس مسلمہ اصول پر قائم ہے کہ حق کو انسانی جبلت میں تمیز کرنے کا مرتبہ حاصل ہوگیا ہے نہ کہ قوت کو لہذا وہ علم جس کا نتیجہ طاقت ہوتی ہے اخلاقی نقطہ نظر سے قابل نفرین ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ علم اس عالم کے اخلاقی تناسب میں ایک ایسی تفریط پیدا کرتا ہے جو کوئی دوسری چیز نہیں کرسکتی۔ ہمارے سامنے آج اس بربادی کا منظر موجود ہے کہ جو تعلیم نے دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ بڑے پیمانے پر برپا کر رکھی ہے ہر شخص کو معلوم ہے کہ جرمنی میں تعلیم کی اشاعت دنیا کے تمام ملکوں سے کہیں زیادہ ہے علم کی اعلیٰ اشاعت نے جرمنوں میں طاقت پیدا کی اور اس طاقت کے نشہ میں انہوں نے اخلاق و انسانی تربیت کے تمام قواعد ساقط کردیے اور وہ رویہ اختیار کیا کہ جو حیوانات کے لیے بھی قابل عبرت ہے موجودہ جنگ کی تمام خونریزی صرف اشاعت تعلیم کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں جس دلیل کے مشتہر کرنے کی میں نے کوشش کی ہے غالباً وہ ان دماغوں کے لیے واضح نہ ہوگی کہ جو اس مادہ فلسفہ سے پر ہیں جسکو عام طور پر بیہودہ تعلیم کہا جاتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے حاضرین میرے پیش کردہ دلائل کے جوہر کی پوری طور پر قدر کرینگے۔

انگریزی شاعر گرے نے کیا ہی سچ کہا ہے کہ "جہاں جہالت میں مسرت ہو وہاں عقلمند ہونا عین حماقت ہے" اگر آپ اس خاکسار کی ماضی پر غور کریں (اگرچہ یہ ہرگز میری خواہش نہیں ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کی طرف حوصلہ افزائی کروں تاہم میں فرضی مثال لیتا ہوں) تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے سب سے بڑے آدمی در حقیقت جاہل تھے حضرت موسیٰ جنہوں نے اسرائیلیوں کو قانون دیا کوہ سینا کی پہاڑیوں کے ایک نابلد چرواہے تھے حضرت عیسیٰ جنہوں نے اپنے اخلاقی خیالات کا سکہ یورپ اور امریکہ پر جمادیا فلسطین کے ایک ان پڑھ یہودی تھے حضرت محمد صلعم جنہوں نے اپنی عالی شفقت نسل انسان کی خدمت قوموں پر چھوڑا ہے وہ بھی ان پڑھ تھے۔ ہم کو نہیں معلوم شیکسپیئر نے کسی مدرسہ میں پڑھا یا ملٹن نے کیمبرج ڈگری حاصل کی نہ مجھے یہ یقین ہے کہ چنگیز خان اپنا نام بھی لکھ سکتا تھا۔ لہذا حضرات آپکے لیے یہ امر باعث فخر ہونا چاہیے

کہ بحیثیت انجمن کے ممبر ہونے کے آپ دنیا کی سب سے بڑی تاریخی شخصیتوں کی صحبت رہنے کا امتیاز رکھتے ہیں لہذا لازم ہے کہ آپ اپنی طبیعتوں میں امید اور بھروسہ قائم رکھیں اگرچہ منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ مشکلات عظیم سے پر ہے تاہم میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ دلیری اور استقلال سے آپ اس اعلی مقصد پر پہنچنے کے قابل ہونگے کہ جسکو آپنے اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اگر آپ میں سے ہر ایک شخص کم از کم ایک ایک بچے کو مدرسہ جانے سے روک لیگا تو آپ اس قابل ہونگے کہ اس مہم عظیم پر حاوی ہونے کی مبارکباد اپنے تئیں دے سکیں اور آنے والی نسلیں آپکے اس سلوک کو شکریہ کے ساتھ یاد رکھیں گی۔

حضرات۔ اپنی نوع انسان میں توسیع علم کے روکنے سے آپ اس داغ کو بھی مٹا ڈالیں گے۔ جو ابدالآباد سے حضرت آدم کی نسل پر اسوجہ سے لگا گیا ہے کہ حضرت آدم نے جنت میں شجر علم یعنی گیہوں کا پھل کھا لیا اگر ہمارے جد امجد شیطان کی دلائی ہوئی ترغیب کا شکار نہ بنتے اگر ان میں اعتقادات کی جرأت ہوتی تو وہ قطعی ماما حوا کی ترغیب کو رد کر دیتے اور اس ممنوع درخت کے پاس ہی جانے کا قصد کرتے بھلا اوسکا پھل تو کھانا درکنار اور اگر وہ اُن نتائج پر ذرا بھی غور کرتے جو اون کے اس فعل سے انکی آنے والی نسلوں پر نازل ہونے والے تھے۔ تو قطعی وہ خود مع اپنی ہمجلیس ماما حوا کے جنت سے فی الفور اخراج اور اسکے نتائج قبیحہ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ حضرات اب یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں آپکے سامنے اون تمام پر فتنہ نتائج کا شمار کروں جو اس زہر آلود شجر علم سے پیدا ہوئے ہیں یہ میں آپ کے لیئے چھوڑتا ہوں کہ آپ اپنے توسن وہم کی باگیں تھوڑی دیر کیلیے ڈھیلی چھوڑ دیں اور ذرا غور کریں کہ شجر علم کا ثمر انسان کے جد امجد نے نہ کھایا ہوتا تو آج بحیثیت اون کے وارث ہونے کے ہم طبقات اس چمن کی فضا میں اجسام خاکی سے مبرا جہاں چاہتے اڑکر چلے جاتے اور انکی مسرت اور نہ اترنے والے سرور میں ہمیشہ سرشار رہتے۔ اگر کسی چیز نے ہم کو ایسی عنقا وراثت سے محروم کیا ہے تو بابا آدم کے گیہوں کھانے نے جیسے کھاتے ہی نامراد علم اون کے جسم میں حلول کر آیا اور انکو اپنی برہنگی نظر آنے لگی۔ جس کی وجہ سے اون کو مع ماما حوا کے جنت سے نکلنا پڑا۔

لہذا بنی نوع انسان میں سے ہر فرد کا یہ جدی فرض ہے کہ اس ناہنجار دشمن نسل آدم یعنی علم کی سرکوبی کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے اور تعلیم کے شجرہ کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر پھینکدے۔

(شور آفرین مرحبا) از قلم سید محمد رؤف علی

نوٹ: یہ مضمون بلا اصل انگریزی آرٹیکل کا ترجمہ ہے جو سید رؤف علی صاحب نے انڈین ریویو کے ماہ اکتوبر میں چھپوایا تھا۔ ترجمہ مصنف صاحب نے خود "تمدن" کے واسطے خاص طور پر کیا ہے۔

مساجد اور غیر مسلم

مسجدوں کی مجالس میں مسلمانوں کی اجازت سے ہندوؤں کا شریک شرعاً جائز ہے

(سلسلہ کیلئے اکتوبر نمبر ملاحظہ فرمائیے)

(۱۹)

بعض صاحبوں نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد صرف عبادة کے لیئے ہے اسلئے اس قسم کی مجلسیں وہاں منعقد کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ بات پہلے بھی بارہا لکھی گئی ہے اور ایک بار سے زیادہ مرتبہ اس بارے میں بالتفصیل لکھ چکا ہوں یہاں اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ "مسجد عبادة کے لیے ہے" اسکا مطلب کیا ہے؟ اگر یہ مطلب ہے کہ "انما بنیت المساجد لما بنیت له" (مسلم عن ابی ھریرہ) اور "وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدا" تو یہ حق ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ بجز نماز کے مسجد میں اور کچھ نہ ہونا چاہیے تو اس قول سے بڑھ کر جہل بالشریعة کا اور کوئی قول نہیں ہو سکتا۔ یہ دواوین و اسفار سنة اور تمام ذخیرہ مقصود و کتب شرعیة موجود ہیں جن سے صریح و قطعی اثبات بیشمار اعمال و اجتماعات و مجالس فی المسجد کا ہوتا ہے اور بالاتفاق تمام ائمہ اسلام نے نہ صرف انکے جواز بلکہ مستحسن و مسنون ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ پھر ان سب کا کیا جواب ہوگا؟ اور نہیں تو صرف صحیح بخاری ہی کے ابواب متعلق احکام مسجد دیکھ لیئے جائیں کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عمارت مسجد سے کیا کیا کام لیے ہیں؟ وفود کے نزول و قیام کی روایتیں ہر جگہ چمکیں۔ در اصل عہد نبوی میں مسجد نبوی ہی اور تمام عمارتوں کی طرح سرکاری مہمان خانہ کا بھی کام دیتی تھی، عمارتوں کی تعمیر و تخصیص عہد فاروقی سے شروع ہوئی ہے۔ اموال غنائم و خراج و زکوٰۃ وغیرہ بھی مسجد ہی میں لائے جاتے تھے اور یہیں لوگوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ عہد خلفائے راشدین میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا، امام بخاری نے باب باندھا ہے، "باب القسمة و تعليق القنو في المسجد" اور حضرت انس رض کی روایت درج کی ہے کہ جب بحرین سے خراج آیا تو آپ نے حکم دیا "انثروه في المسجد" ای صبوه فی المسجد، چنانچہ نماز کے بعد تقسیم کرنے بیٹھے اور مسجد ہی میں تقسیم فرمایا۔ مسجد ہی دار القضاء والافتاء بھی تھی۔ بے شمار واقعات اسکی نسبت موجود ہیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے "القضاء واللعان فی المسجد"

اور واقعۂ لعان کی مشہور روایت لائے ہیں۔ مسافر کا مسجد میں قیام باتفاق جایز ہے اور امام بخاری نے باب باندھا ہے "نوم المرأة فی المسجد"۔ اور اس میں بروایت حضرت عائشہؓ ولیدہ (ایک لڑکی) کے آنے اور مسلمان ہونے اور مسجد میں قیام کرنے کا واقعہ لائے ہیں "فکانت لها خباء فی المسجد"، خبا یعنی خیمہ۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں تو مجرد تھا اکثر مسجد میں سویا کرتا تھا۔ حضرت علی کا مسجد میں سونا اور آنحضرت کا آ کر "قم یا ابا تراب" کہنا معلوم ہے مسجد نبوی ہی فقرا و صعالیک کی دار الاقامت اور تعلیم قرآن و شریعت کے لیے درسگاہ تھی۔ اصحاب صفہ کے لقب کا سبب یہی ہے کہ مسجد میں ان کے لیے ایک صفہ (چبوترہ) تھا، جہاں شب و روز پڑے رہتے تھے، امام بخاری ابو ہریرہ کی روایت "نوم فی المسجد" میں لائے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے میں نے ستر آدمیوں کو دیکھا جنکے جسم پر پورا کپڑا بھی نہ تھا۔ مسجد نبوی میں علاوہ جماعت صلوٰۃ کے ہر طرح کی مجلسیں اور صحبتیں منعقد ہوتی تھیں۔ آنحضرت صلعم کی نشست اکثر اوقات یہیں ہوتی تھی اور تعلیم و صحبت وعظ و احکام، مشورہ و معاملات وغیرہ، جو کچھ ہوتا تھا یہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مسجد صرف نماز کے لیے ہے" اُن سے پوچھنا چاہیے کہ فوجوں کی طیاری اور تربیت، اسکے لیے مالی اعانات کی فراہمی، مفتوحہ بلاد کے ملکی انتظامات وغیرہ، انکی اصطلاح میں کس قسم کے کام ہیں؟ نماز یا غیر نماز؟ دینی یا سیاسی؟ صریح و قاطع روایتیں موجود ہیں کہ یہ تمام امور مسجد ہی میں انجام پاتے تھے، حمایت و نصرت حق میں نظم و نثر کا پڑھنا اور لوگوں کا جمع ہو کر سننا کس قسم کا عمل ہے؟ لیکن معلوم ہے کہ مسجد نبوی میں حضرت حسان بن ثابتؓ اپنے قصائد سناتے تھے اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سنتے اور خوش ہو کر دعا دیتے تھے "اَللّٰھُمَّ ایدہ بروح القدس"۔ حسانؓ نے اسپر ابو ہریرہؓ سے تصدیق چاہی اور انہوں نے کہا سچ ہے۔ امام بخاری نے اسی روایت سے جواز انشاد شعر فی المسجد کا استنباط کیا اور اس کے لیے ایک باب باندھا ہے اور ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ "کان رسول اللہ صلعم ینصب لحسان منبرًا فی المسجد فیقوم علیہ یہجو الکفار"، یعنی آنحضرت صلعم حسانؓ کے لیے مسجد میں ممبر رکھواتے اور وہ اسپر کھڑے ہو کر کفار کی ہجو میں اپنے اشعار سناتے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ غنیۃ الطالبین میں لکھتے ہیں "لا باس بانشاد شعر فی المسجد خال من سخف وہجاء المسلمین"، ثم قال "والاولیٰ صیانتہ عنہا الا ان تکون من الزہدیات فیجوز الاکثار لان المساجد وضعت لذکر اللہ"۔ علامہ سفارینی شرح منظومۃ الآداب میں لکھتے ہیں: "قلت ومثل الزہدیات بل اولیٰ ما فیہ مصلحۃ للمسلمین من ہجو اعداء اللہ و تحریض المومنین علی اتباع الحق والاجتناب عن السیئات" (جلد ۲ صفحہ ۲۵۸) اور آنحضرت کے نماز صبح کے بعد مصلی پر کچھ عرصہ تک تشریف فرما رہنے والی روایت میں بعض صحابہ نے کہا کہ ہم لوگ نماز کے بعد ٹولیاں

بنا کر بیٹھ جاتے تھے اور عہد جاہلیت کے واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم دیکھتے اور کبھی کبھی متبسم ہو جاتے
اور قرآن کی روایت متضمن منع انشاد شعر کہ "من رأیتموہ ینشد شعراً فی المسجد" الخ، تو بلا تکلف اس
سے مقصود شعار قبیحہ، معاشقہ و مطالب جاہلیہ ہیں نہ کہ نفس انشاد شعر۔ جمعاً بین الاحادیث۔ عہد نبوی میں
مسجد سے شفاخانہ کا کام دیتی تھی۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے "باب الخیمۃ فی المسجد للمرضٰی و غیرھم"
جنگ خندق میں سعدؓ زخمی ہوئے تو آنحضرت صلعم نے مسجد میں خیمہ نصب کرا دیا اور اسی میں رکھا تاکہ قریب رہیں۔ جو
لوگ کہتے ہیں کہ مسجد میں بجز نماز کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے نہیں معلوم وہ لعب حبشہ والی روایت کو سنکر کس قدر متعجب ہونگے؟
امام بخاری نے تو ایک خاص باب ہی اس واقعہ کی بنا پر باندھ دیا، "باب اصحاب الحراب فی المسجد" "الحراب
بالکسر جمع حربہ"، نیچے حضرت عائشہ کی روایت لائے ہیں "لقد رأیت رسول اللہ صلعم یوماً علی باب
حجرتی والحبشۃ یلعبون فی المسجد"، دوسری روایات میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے اور بوجہ شہرت تفصیل
ذکر نہیں۔ حافظ عسقلانی اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں "وفی بعض طرق ھذا الحدیث ان عمر انکر علیھم لعبھم
فی المسجد فقال له النبی صلعم دعھم" (فتح الباری مصری جلد ۱ صفحہ ۲۵۷) بلاشبہ ان اوقات میں بہت سے واقعات ایسے ہوں جو
آجکل عام طور پر بستیاں کا وقوع میں آئیں اور اب بحالت اعتیاد و التزام ان کو ضرور رد کیا جائیگا۔ مثلاً یہی آخری واقعہ لیکن مقصود
ان واقعات کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ مسجد صرف نماز کے لیے ہے تو اسکو سوچ سمجھ کر کہنا چاہیے۔ یہ نہیں
کہ جو منہ میں آیا کہدیا اور جو بات اپنی ہوا و خواہش کے خلاف ہوئی اسکو جھٹ ناجائز بتلا دیا۔ یہ معلوم ہے کہ مسجد اللہ کی
عبادت اور ذکر کے لیے ہے لیکن مسجد کا نماز کے لیے ہونا کب اس سے مانع ہے کہ تبعاً دیگر مقاصد صالحہ حقہ کے لیے استعمال
میں لائی جائے؟ اور ذکر کا مطلب ہی لوگوں کو معلوم نہیں۔ قرآن کی زبان میں ہر قول و فعل حق ذکر ہے، اور معاملات خدمت نوع
و ملت و ہدایت و اصلاح امم و دفع جور و اعتدار اعدائے حق تو عین ذکر کے مدلول میں داخل ہے اور دلیل اسکی خود آنحضرت صلعم
اور صحابہ و خلفائے راشدین مہدیین کا عمارت مسجد کو تمام مقاصد ملیہ و اجتماعیہ صالحہ کے لیے بالاتفاق کام میں لانا ہے
آنحضرت صلعم کے طرز عمل کے لیے گذشتہ اشارات کافی ہیں۔ صحابہ کرام کا جو حال رہا وہ اس باب میں سب سے زیادہ جامع
وقاطع اور علی الخصوص اجتماعات حاضرہ کے لیے پوری طرح اسوہ حسنہ ہے۔ اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ ہمیشہ مسجد نبوی
ہی رہی۔ یہی مشورۃ گاہ اعیان ملت و اصحاب حل و عقد و عامہ اہل اسلام تھی جس میں سارے ملکی و سیاسی و مالی معاملات
فیصل ہوتے اور انجام پاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب کبھی کوئی اہم مشورہ طلب معاملہ پیش آتا تھا تو ایک
آدمی مقرر تھا (غالباً مؤذن) جو شہر میں بایں الفاظ اعلان کرتا تھا "الصلوٰۃ جامعۃ"، یہ سنتے ہی لوگ مسجد میں جمع

ہونا شروع ہو جاتے جب تمام لوگ آ پہنچتے تو حضرت عمرؓ حاضرین کو مخاطب کر کے اور [illegible] طلب معاملہ پر تقریر [illegible]
طے پاتا (طبری صفحہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۵۰) حضرت عمرؓ نے مہاجرین کی ایک خاص مجلس بھی [illegible] قائم کی تھی جو اس عام مجلس کے علاوہ
تھی، بلاذری نے تصریح کی ہے کہ یہ مجلس ہمیشہ مسجد ہی میں منعقد ہوتی تھی۔ [illegible] مسئلہ اسی مجلس
میں طے ہوتا تھا کان للمہاجرین مجلس فی المسجد فکان عمر یجلس معہم فیہ ویحدثہم عما ینتھی الیہ
من امر الآفاق (فتوح البلدان مطبوعہ لیڈن صفحہ [illegible])

زہری حضرت ابن المسیبؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب فارس سے [illegible] پانچواں حصہ [illegible] مدینہ
پہنچا تو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ مسجد میں رکھا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا رات بھر لوگوں صحابہ نے پاسبانی کی دوسرے
دن تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوئے اور مال تقسیم کیا گیا۔ کتاب الخراج میں قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں "حدثنی علی بن
عبد اللہ عن الزہری عن سعید بن المسیب قال لما اتی [illegible] عمر [illegible] قال واللہ لا یجنہا
سقف دون السماء حتی اقسمہا بین الناس فامر بہا فوضعت بین حجرتی المسجد وامر عبد الرحمن
بن عوف وعبد اللہ بن ارقم فباتا علیہا ثم غدا عمرؓ عنہ بالناس علیہ" (صفحہ ۲۷)

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور عہد خلفاء میں مسجد نبوی ہی تمام مجالس مجامع اور معاملات
ملکی از قبیل تقسیم غنائم و تجہیز جیش و انفصال مہمات کی جگہ تھی اسلیے روایات میں گو فقط مسجد کی تصریح نہو لیکن جہاں
کہیں مجالس کے انعقاد بحث و مباحثہ، خطبات و مذاکرہ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے مقصود اس سے یہی ہے کہ مسجد ہی میں وہ
سب کچھ ہوا۔ حضرت عمرؓ کی مجالس ملکی کا جس قدر حال قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں لکھا ملتا ہے شاید اور کہیں
نہ ملے۔ کیونکہ کتاب کا موضوع خراج و عشور و جزیہ وغیرہ محاصل مالیہ ہیں اور تقریباً تمام مالی مسائل کا عملی انفصال
حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوا ہے۔ کتاب الخراج میں جا بجا موجود ہے "ان عمرؓ جمع اناسا فقال کذا وکذا" "ان عمر
شاور اصحاب النبی"۔ "ان عمر استشار الناس فقالوا کذا"۔ "جمع الناس ثم قام خطیبا فقال الخ"۔
اور اسیطرح عام کتب آثار و تاریخ میں تو گو ان روایات میں اسکی صراحت نہیں ہے کہ یہ تمام مجلسیں مسجد ہی میں ہوئی تھیں لیکن
چونکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ دار الشوریٰ اور دیوان ملکی مسجد نبوی ہی تھی، اسلیے ان تمام روایات میں سے ہر روایت
ہمارے مقصود کے لیے مستقلاً دلیل و شاہد ہے۔

اصل یہ ہے کہ ساری مصیبت قلت و فقدان علم اور ضیق نظر و فہم کی ہے، اور اسی نے ہر معاملہ علم اور ہر دعوی
عمل میں آفتیں برپا کر رکھی ہیں۔ نظریں کوتاہ ہوگئیں، معلومات درسیات و چند شروح کے اندر محدود ہے،

دیا میں خانہ باقی رہتا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی ایک بات کان میں پڑ گئی اور دنیا جہان کا فیصلہ اسی سے کر دیا ایک حالت کی نسبت کہا گیا ہے بہ حفظت شیئًا، وغابت عنک اشیاء!

لوگوں نے صرف یہ کہیں دیکھ لیا ہو کہ مسجد عبادت کے لیے ہو، لیکن نہ تو اس کا مطلب سمجھا ہو اور نہ سمجھنے کا ارادہ ہو، لعب حبشہ اصحاب الحراب والی روایت اوپر گزر چکی ہے. خلاصہ مسئلہ یہ ہو کہ مسجد نبوی کے صحن میں ایک مرتبہ حبشی ہتیاروں کے ساتھ اپنا ناچ و کرتب کھلاتے تھے جو در اصل ایک طرح کی فوجی ورزش ہو، آنحضرت صلعم نے حضرت عایشہ کو حجرہ کے دروازہ سے ان کا کھیل دکھایا. ایک روایت میں ہو کہ آپنے اپنا دست مبارک سامنے کر دیا تھا، اسپر حضرت عایشہؓ تماشا دیکھتی رہیں، دوسری روایت میں ہو کہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو روکنا چاہا تھا کہ مسجد میں کھیل کود کرو، مگر آپنے فرمایا کہ نہ روکو کھیلنے دو. کلام سابقًا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "فیہ جواز ذلک فی المسجد" یعنی اس سے ثابت ہوا کہ ایسا کرنا مسجد میں جایز ہے "قال واللعب بالحراب لیس لعبًا بل فیہ تدریب الشجعان علی مواقع الحروب والاستعداد للعدو. وقال المهلب المسجد موضوع لأمر جماعة المسلمين فما كان من الاعمال يجمع منفعة الدين واهله جاز فيه" (فتح ج ۱ ص ۴۵۴) یعنی ہتیاروں کے ساتھ کھیل محض کھیل ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی مردانہ اور جنگی ورزش ہو جس سے دشمن کے مقابلہ کی استعداد بڑہتی اور شجاعت و ہمت کو تحریک ملتی ہو اسلیئے آپنے اسکو مسجد میں جائز رکھا، اور مہلب نے کہا کہ مسجد بنائی گئی ہے جماعت اہل اسلام کے فائدے کے لیے پس تمام ایسے کام جو اسلام اور مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ہوں اسمیں جایز ہوں گے۔

اوپر گذر چکا کہ امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے "الاغتسال اذا اسلم و ربط الاسیر فی المسجد" اس ترجمہ باب کے اصل نسخہ بخاری میں ہونے نہ ہونے کی نسبت اختلافات ہیں اور بصورت اثبات ترجمہ اس ترجمہ کے ربط و مطابقت کی نسبت شارحین نے بحثیں کی ہیں - اسی سلسلہ میں حافظ موصوف لکھتے ہیں "وادعى ابن المنير ان ترجمة هذا الباب ذكر البيع والشراء فی المسجد - قال ومطابقتها لقصة ثمامة ان من تخيل منع ذلك اخذه من عموم قوله انما بنيت المساجد لذكر الله فاراد البخاری ان هذا العموم مخصوص باشياء غير ذلك - منها ربط الاسير فی المسجد. فاذا جاز ذلك للمصلحة فكذالك يجوز البيع والشراء للمصلحة فی المسجد" (صفحہ ۴۶۲) یعنی ابن منیر نے اسکی نسبت یہ کہا ہے کہ در اصل اس باب کا ترجمہ متعلق ہو ذکر بیع والشراء فی المسجد سے، اور قصہ ثمامہ سے اسکی مطابقت یوں ہو کہ جس کسی نے ذکر بیع و شرا منوع خیال کیا تو اسی بنا پر کہ "انما بنیت المساجد لذکر اللہ" کے عموم پر اسکی نظر گئی یعنی اس نے خیال کیا کہ جب

مسجدیں صرف اللہ کے ذکر کے لیے مخصوص ہیں تو پھر بیع و شراء کا ذکر اس میں کیوں جائز ہو؟ پس امام بخاری
نے اس شبہ کو دور کرنا چاہا، اور دکھلانا چاہا کہ "انما بنیت المساجد لذکر اللہ" کے حکم عام کے لیے تخصیص
بعض دوسری باتوں میں ثابت ہے۔ ازانجملہ اسمیں کہ قیدی کو مسجد میں باندھنا اور رکھنا جائز ہے، اور جب بربنار مصلحت یہ
بات جائز ہوئی تو ذکر بیع و شرار بربنار مصلحت کیوں جائز نہ ہو؟ انتہی۔ ہمیں یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس باب
کے ترجمہ و مطابقت روایت کی نسبت یہ توجیہ کہاں تک درست ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں "ولا یخفی ما فیہ
من التکلف" مقصود اس قول کے نقل کرنے سے یہ دکھلانا ہے کہ ائمہ فقہ و حدیث نے "انما بنیت المساجد لما
بنیت لہ" اور "لذکر اللہ" کا مطلب کیا سمجھا ہے؟ اور ابن منیر کے قول سے ضمناً یہ حقیقت واضح ہو گئی۔

دراصل حکم "انما بنیت المساجد لما بنیت لہ" اور "بنیت لذکر اللہ" کو اگر عام و مطلق ہی مان
لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں "لما بنیت لہ" اور "ذکر اللہ" کا صحیح مطلب سمجھ لینا چاہیے، وہ ساری باتیں
جو آنحضرت صلعم و خلفائے راشدین نے مسجد میں کیں، اور وہ اکثر امور جن سے آجکل کے درمیان علم و حفاظ شریعت
روکتے ہیں، "ذکر اللہ" اور اصل موضوع بنار مسجد میں داخل ہیں۔ خود قرآن حکیم نے خطبہ و وعظ جمعہ پر "ذکر"
کا اطلاق کیا ہے، اِذَا نُودِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ
سب نے اتفاق کیا کہ یہاں "ذکر اللہ" سے مقصود خطبہ جمعہ ہے۔ نہ کہ صلوٰۃ، اور اسی لیے "وَذَرُوا الْبَیْعَ"
کے حکم کی تعمیل بمجرد سماع ندا (اذان) واجب ہے نہ کہ ہنگام قیام صلوٰۃ، اور احادیث صحیحہ سے معلوم ہے کہ آنحضرت
صلعم کے جن خطبات جمعہ کو اللہ نے ذکر اللہ فرمایا ان میں صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ "موت کو یاد کرو اور روتے
رہو" جیسا کہ اب ہو رہا ہے بلکہ ان میں ان تمام باتوں کا ذکر کیا جاتا تھا جنکو آجکل کی جدید تقسیم اعمال انسانیہ میں "دنیوی
معاملات" قرار دیا جاتا ہے، جب کبھی اسلام اور مسلمانوں کے مصالح دینی و دنیاوی کی کوئی بات پیش آگئی ہے تو آپ نے
جمعہ کے دن خاص طور پر اسی کی نسبت خطبہ دیا ہے۔ ایسا ہی خطبات خلفاء راشدین کے ہوتے تھے، میں نے
گذشتہ سال ایک رسالہ مقاصد و احکام جمعہ پر لکھا ہے۔ اسمیں خطبہ جمعہ کی حقیقت اور اس بارے میں ہدی نبوۃ
و اسوۂ حسنہ خلفاء راشدین کو نہایت تفصیل سے واضح کیا ہے، اگر فرصت طبع و توزیع کی آگئی تو انشاء اللہ
اسی ماہ میں شائع و تقسیم ہوگا +

(باقی آیندہ)

دہلی میں ایک مسلمان خاتون کی قلم کا ایک افسانہ درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ہندوستان کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے ایک فسانہ خون حرمت سے متاثر ہو کر جو صبح امید کے ستمبر نمبر سنہ ۱۹ء میں شائع ہوا ہے تحریر کیا ہے۔ منشی پریم چند کی فسانہ نگاری میں جو شہرت ہے وہ ادن کے دلاویز فسانوں کی مقبولیت ہونے کی وجہ سے ہے۔ مگر منشی صاحب عموماً ہندو گھروں کی زندگی کے پلاٹ لے کر فسانے لکھا کرتے ہیں اور بہت خوب لکھتے ہیں مسلمانوں کے متعلق ادن کے فسانے شاید بہت کم ہیں اور انہوں نے اس طرف توجہ کی مگر اسطرح کہ لوگوں کو شکایت کا موقع ملا۔ مسٹر پریم چند ہماری نسبت شاید یہ بہتر طریقے سے جانتے ہوں گے کہ ناول اور فسانے کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ واقعہ معلوم ہو۔ مگر "خون حرمت" اس میزان پر پورا نہیں اترتا بلکہ وہ اس متعصبانہ سلسلہ کو دوبارہ بنیاد ڈالتا ہے جو ہندو مسلمانوں میں ایک دوسری قوم کے کیریکٹروں کی سو شنی میں پیش کرنے کے متعلق رائج رہی۔ اور اب کچھ عرصہ سے زمانہ کی رفتار اور ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ بہت کم ہو گئی ہے کاش کہ منشی پریم چند "خون حرمت" نہ لکھتے اور ہمیں "بالی بیوہ" جو "خون حرمت" کی نسبت زیادہ قابل قیاس فسانہ ہے شائع کرنے کا بحیثیت وہ فرض نہ ادا کرنا پڑتا۔

(ایڈیٹر)

بنارس کے امیر کبیر مہاجن کشن لال صاحب کی حسین نوجوان لڑکی شادی کے ۲ ہی سال بعد صرف ۱۶ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔ گو سسرال بھی بہت مالدار ملی تھی مگر بعد انتقال شوہر اسکو کشن لال صاحب نے اپنے پاس بلا لیا۔ کشن دیوی نے غضب کا حسن پایا تھا مرد تو الگ رہے عورتیں بھی اسے دیکھ کر محو حیرت ہوتی تھیں اور بجائے رشک کے محبت کرنے لگتیں۔ گو زمانہ حال کے موافق کشن لال نے اعلیٰ تعلیم تو نہ پائی تھی مگر محض جاہل بھی نہ تھی۔ ہندی لکھنے پڑھنے میں بہت خاصی قابلیت رکھتی تھی اور زیادہ تر قصے کہانیاں اسکو پسند تھیں ہندی کا ہر ایک تازہ ترین ناول اسکی میز پر رہتا تھا۔ شوہر کے غم میں ۳-۴ مہینے اسے بہت ہی مشکل سے گذرے پھر رفتہ رفتہ صبر آ گیا۔ [illegible] کی طرف طبیعت مائل ہوتی گئی۔ مگر رسم کے مطابق ایک سال اسکو سوگ کا گذارنا تھا اس عرصہ میں [illegible] ہر چیز سے محروم رکھی گئی۔ مگر شوہر کی برسی ہوتے ہی والدین نے اسے سوگ کی قید سے

خیال کیا کہ "ہماری لڑکی ابھی کم عمر ہے اس نے دنیا میں کچھ کھایا پیا نہیں اسوجہ سے ہم لباس و زیورات سے محروم نہ رکھیں گے" چنانچہ اب اپنی عمر کے سترہویں سال میں وہ خاص خوشی سے عمدہ اعلیٰ اعلیٰ بھڑکیلے لباسوں اور دلکش زیوروں میں نظر آنے لگی اور پہلے کی نسبت کچھ آئندہ بھی اسکے دل میں پیدا ہونے لگیں کہ زندگی خوشی سے گزرے۔ وہ شام کو سیر کے لیے باغوں میں یا پارکوں میں جایا کرتی۔ کنبے کے پرانے خیالات والے تو کہتے کہ "بیوہ کو ایسا مناسب نہیں" مگر ماں باپ اسکی بیوگی اور ہمیشہ کی پژمردہ و غمناک دنیا سے محروم زندگی کا خیال بے چین رکھتا تھا اسوجہ سے وہ یہ اعتراضات نہ کرتے تھے۔ کشن دیوی کو شام کیوقت قیمتی فٹن میں سوار دیکھ کر کبھی یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک کم علم ہندو بیوہ لڑکی ہے۔ بلکہ اسکی وضع قطع اور فیشن ایبل زندگی پر نظر کرتے ہوئے ایک آجکل کے کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی معلوم ہوتی تھی (کاش حقیقت میں ایسا ہوتا) مگر یہ سب کچھ بتقاضائے عمر ہوا اور زمانہ کے اثر سے تھا کشن دیوی ان قابل پرستش اتم دیویوں میں سے نہ تھی جو شوہر کے ساتھ ستی ہو جاتی تھیں۔ بلکہ اپنے طرز عمل سے وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ "خدا کے واسطے عقد بیوگان کا بھی رواج ہونا چاہیئے کیونکہ ہم کمسن لڑکیاں اس عمر میں گل نوشگفتہ کے ہوتی ہیں جنکے چمن دنیا میں پرشباب دن ہنسنے کھیلنے کیلیے ہوتے ہیں وہ جبراً سوگ لیکے اور قبل از وقت مرجھا کر مر جائینگے۔ گو بیوگی کے بلا ہمارے لیے خزاں ہے مگر جیسے ایک موسم خزاں کے بعد پھر فصل بہار آتی ہے سو آج چمن ہرے ہو جاتے ہیں ہم بھی دوبارہ دنیا میں ملکر اپنی زندگی کی بہار اٹھا سکتے ہیں مگر آج اس خیال کے والدین مخالف تھے کچھ تو رسمی خاندانی ملکی پابندیوں کیوجہ مانع تھی اور کچھ دل سے بھی مخالف تھے کیونکہ کشن لال کوئی تعلیم یافتہ روشن خیال تو تھے نہیں محض اپنے کاروبار اور روپیہ کی بدولت فیشن ایبل سوسائٹی میں رسوخ حاصل کر لیے تھے۔ رہنے کو نئی طرز کی بنی ہوئی کوٹھی وہ کشن لاج "۔ سیر و تفریح کے لیے گاڑی موٹر یہ سب کچھ ... کے بل پر تھا۔ ورنہ لڑکی طبعاً بلا انگریزی تعلیم حاصل کیے ہی آزادی کی دلدادہ تھی اور اسکی طبیعت کا روکنا ان کے اختیار سے باہر تھا۔

چار بجے ہونگے ٹھنڈی سڑک پر سیٹھ آدم جی .. کی عالیشان دوکان کے آگے ایک فٹن آکر ٹھیری جس میں سے ایک حسین نوعمر لڑکی کا سنجیدہ ساڑھی پہنے ہاتھ میں سیاہ قیمتی منی بیگ لیے اتر کر دوکان میں داخل ہوئی اندازہ سے یہ کمسن ہی معلوم ہوتی تھی۔ اندر جاتے ہی .. مس سیٹھ نے ہاتھ ملایا اور میزوں الماریوں کی طرف لے گئی۔ چند منٹ وہ اسکے ساتھ رہی پھر کسی کام کو دوکان کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ جونہی وہ بھی اعلیٰ درجہ کا انگریزی

سرشار ہوتے ہوئے ایک نوجوان جنٹلمین مسکراتا ہوا کشن دیوی کے قریب میز کے دوسرے جانب آکھڑا ہوا اور سلام کرکے کہا۔

جنٹلمین (انگریزی میں) اُس دن کے بعد آج پورے ۲ ہفتے ہوئے میں نے آج آپکو پھر یہاں دیکھا ہے اس پہلی ملاقات۔ آپکی مہربانی پر خیال کرتے ہوئے اسوقت میں نے بولنے کی جرأت کی۔

حسین لڑکی (شرمندگی سے) افسوس کہ میں انگریزی نہیں جانتی۔ مہربانی سے اردو میں گفتگو کیجئے۔

جنٹلمین (متعجب ہوکر) اوہو آپ انگلش نہیں سمجھ سکتی ہیں اچھا معاف کریں میں اردو بولوں گا۔ (اور پھر وہ الفاظ دہرائے)۔

حسین لڑکی۔ ہاں مجھے بھی اکثر اسدن کی آپکی ملاقات کی یاد آجاتی ہے جو اچانک ہو گئی تھی اور کچھ ایسا موثر تھی کہ میں باغ میں دوکان پر سڑک پر اکثر آپکو نظروں میں ڈھونڈا کرتی ہوں۔

جنٹلمین (خوش ہوکر) یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسی مہ حسن پر مجھ خاکسار کی ملاقات کا اثر باقی ہے عرض کرتا ہوں میں نے یہ پندرہ دن آپکی تلاش اور خاص تلاش میں بسر کئے ہیں مگر کہیں نظر نہ آئیں۔

حسین لڑکی۔ ہاں میں اندنوں عام طور پر کم نکلتی ہوں پھر بھی ۲-۳ بار باغ ضرور گئی میری والدہ علیل ہیں اسوجہ سے وقت ملا۔ اچھا اب میں جاتی ہوں کمپنی باغ میں والدصاحب منتظر ہیں صرف یہ چند ضروری چیزوں لینے کو چند منٹ کی اجازت لے کر آگئی تھی۔ پھر کسی وقت ملاقات ہوگی۔

جنٹلمین۔ تو کہاں ملیں گے؟ اور کس دن کسوقت؟ کچھ پتہ تو دیجئے۔

حسین لڑکی۔ آج تو والدصاحب ساتھ ہیں ہاں کل اسیوقت آپ کمپنی باغ میں تشریف لائیں میں وہاں ملونگی۔ یہ کہکر وہ حسن کی پتلی فٹن پر سوار ہوگئی۔ مگر وہ نوجوان پیچھے ہولیا۔

کشن لاج کے ایک دوسرے حصے میں جو ہندوستان کی طرز کا مکان کشن دیوی کی والدہ کی رہایش کیلیے ہے اسکے دالان میں پلنگ پر وہ معمر بی بی لیٹی ہوئی ہیں اور قریب ہی کرسی پر سیٹھ صاحب بیٹھے کچھ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔

بیوی۔ میں کیا جانوں اپنے کیے کو بھرو۔ جس دن وہ بیوہ ہوئی میں نے آپسے کہدیا تھا کہ خیر اسی میں عزت ہے کہ ابھی چندسال کشنو کو اسکی سسرال میں رہنے دو۔ وہاں ساس سسرے ہیں دیورانی جیٹھانی کے

۱۱ بجے رات کے موٹر پر آؤنگی۔ جب پتاجی سوتے ہونگے " "کشن دیوی"

لفافہ بھیجکر کشن دیوی کچھ ایسی رنجیدہ ہوئی کہ آج بیمار ماں کو دیکھنے بھی اسکی طرف نہ گئی رات کو جب باپ کھانا کھانے بیٹھے تو وہ وہاں بھی نہ گئی۔ اکیلی بیٹھی خیالی پلاؤ پکا رہی تھی کہ بدقسمت سیٹھ کو ملازمہ سندرا کی نے کھانا کھلا دیا۔

۱۰ بجے جب خوشحالی یہ خبر لائی کہ سیٹھ صاحب اپنی خوابگاہ میں چلے گئے تو کشن دیوی اٹھی اور ملگجا لباس تبدیل کیا اگرچہ رنجیدہ تھی مگر جانے کی خوشی میں اسوقت چہرہ دمک رہا تھا اُسنے خوشحالی کی رائے سے آتشی گلابی رنگ کی ریشمی بنارسی قیمتی ساڑھی پہنی اور سفید کا ریزی شلوکہ گلے میں بیش قیمت موتیوں کے مالا۔ بڑے آئینہ کے آگے ۱۰ منٹ تک بناؤ سنگار کی درستی کرکے پچھلے دروازے سے نکل گئی اسکی موٹر شہر سے باہر سول لائین میں مختصر سی خوشنما کوٹھی "محبوب کاٹیج" پر پہنچی پورے ۱۱ بجے تھے۔ بجلی کے برآمدے کی سیڑھیوں کے مسٹر محبوب اپنی عزیز مہمان کے لینے کو بیتاب کھڑے تھے وہاں سے برآمدہ تک موٹر کے ساتھ ساتھ آئے اور برآمدہ کے آگے موٹر ٹھہری تو محبوب نے بلا لحاظ شوفر فوراً کشن دیوی کو آغوش میں لے لیا۔ اسی آغوش پرشوق میں لیے ڈرائنگ روم میں پہنچے اسوقت ذوق وشوق وتمنا کے برآنے کی خوشی میں دونوں بیہوش ہو رہے تھے یوں تو کئی بار مل چکے تھے۔ مگر جبسے ان سے یہ دونوں واقف ہوئے آج تک ایسا بے حجاب موقع نہیں ملا تھا جسکی آرزو میں دونو محبت بھرے دل ہر وقت بے قرار رہتے تھے۔ ۲ سال ہونے آئے جب سے کشن دیوی بیوہ ہوئی تھی اسوقت سے وہ اس راحت جان بخش کے موقع کے لیے تڑپ رہی تھی کہ وہ اس طرح کسی آغوش محبت میں ہو۔ خوبصورت لبوں کو گرمجوشی سے گو عورت کو مرد کی نسبت بدرجہا صابر و پاک باطن و خرسند پیدا کیا ہے مگر فطرت انسانی سے ہر انسان مجبور ہے کسی نے دلپر جبر کیا کسی سے نہو سکا۔ پس جن سے نہو سکے وہ عورتیں اور بوالہوس مرد یکساں ہیں۔ کشن دیوی اپنی عمر کے اس عالم شباب وحسن کے نصف النہار پر پہنچے ہوئے اور زمانہ کے ہاتھوں "مجبور" بے بس ہو رہی تھی۔ وہ محبوب کو جان سے زیادہ چاہ رہی تھی اور اسکی محبت میں آنکھیں بند کرکے کنوئیں میں بھی کود پڑنے کو تیار تھی۔ مسٹر محبوب ایک نیکدل با اخلاق تعلیم یافتہ نوجوان تھا ورنہ کشن دیوی کو کسی طرح جائز ناجائز آزادی سے فائدہ اٹھانے میں عذر نہ تھا۔ آج محبوب نے اسکو اپنے گھر اس خیال سے بلایا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسکی ہو جانے کا وعدہ کرے۔ پس کمرے میں آکر ۱۵ منٹ تک خاموشی کے ساتھ یونہی یکجا بیٹھے رہے۔ پھر محبوب نے کہا۔ پیاری تم کو میرے ساتھ کھانے تو پرہیز

نہ ہوگا۔ مسلمان خانساماں کا تیار کیا ہوا ہے؟

کشن دیوی۔ پیارے اب اس کا کیا ذکر ہی تمہاری مرا دل تمہارا میری جان وایمان تمہارا ہو چکا پھر کیسا ہے؟ اتنے میں گھنٹی کی آواز آئی اور دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ خوشحالی پانی وغیرہ دینے کو کھڑی تھی آج پہلا دن تھا کہ ایک پرانے عقیدے کے بے علم رسم پرست ہندو والدین کی بیٹی یا بقول مجبور ہو کر ایک مسلمان کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

مسٹر محبوب۔ پیاری یہ تو بتاؤ اب اس حالت میں کب تک گزریگی؟ ہم سے صبر ناممکن ہے۔

کشن دیوی۔ (بچشم نم) بتاؤ میرے اختیار میں کیا ہے؟ میں نے تو سخت بے حیائی اختیار کرکے والد صاحب پر ظاہر کرایا کہ میری دوسری شادی کردیں۔ مگر وہ قتل کر دینا چاہتے ہیں اور یہ بے شرمی گوارا نہیں۔

مسٹر محبوب۔ بالفرض محال اگر وہ شادی پر آمادہ ہو بھی جائیں تب بھی اپنے ہم قوم ہم مذہب کو دینگے نہ کہ ایک ملیچھ دشمن ایمان کو۔

کشن دیوی۔ ہائے پیارے ایسا نہ کہو میرا دل دکھتا ہے۔ تم میری جان وایمان کے مالک ہو مگر تمہارا یہ خیال درست ہے وہ دوسری شادی اگر کرینگے بھی تو کسی ہندو سے۔ پھر اس سے کیا حاصل اس وجہ سے اب میں نے عہد کر لیا ہے کہ ان سے شادی کو نہ کہونگی۔

مسٹر محبوب۔ مگر تم ایک تدبیر کر سکتی ہو یہ آزادی کا زمانہ ہے کوئی کسی کا مزاحم نہیں ہو سکتا اسوقت بنگال کے خاندان اور بعض بعض تعلیم یافتہ لڑکیاں برہمو ہو گئی ہیں کیوں نہ تم بھی برہمو ہو جاؤ پھر غیر مذہب والے سے نکاح جائز ہو جائے گا۔

کشن دیوی۔ یہ درست ہے میری ایک دوست سوشیلہ نے بھی یہی رائے دی ہے مگر میرا باپ بڑا ظالم و پرانے خیالات کا انسان ہے وہ اسکی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اور مار ڈالنے پر آمادہ ہے سوا اسکے چارہ نہیں کہ جب اس قدر تشدد ہو کہ میں آپ سے ملنے بھی نہ پاؤں تو یا تو زہر کھالوں یا بے غیرت بنکر خفیہ طریق سے غائب ہو جاؤں۔ ابھی کوئی دن اور دیکھتی ہوں۔

مسٹر محبوب۔ کشن دیوی اگر ہمت کرلو تو پھر کیا چاہیئے۔ گو مجھے کس طرح گوارا نہیں کہ تم بدنام ہو کر میری بنو۔ اور تمہارے بیچارے والدین بدنام ہوں۔ رنج اٹھائیں مگر دونوں دلوں سے ہم دونوں مجبور ہیں تاہم پیار کا نفس مطمئن ہے کہ ہم دنیا کا گناہ کرینگے رسم توڑینگے مگر حقیقتاً خدا کا گناہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم

جائز طریق ایک مذہب ہو کر عقد کرینگے۔

کشن دیوی۔ آپکی محبت نے دیوانہ بنا دیا ہو جو ہو گفتگو گی مگر اپنی تو کہو یہاں تو تنہا آپ دکانوں کے
میں جیسا چاہا کر لیا بلکہ میرے والدین کے خوف سے پھر یہاں رہنا ہی مشکل ہو گا مگر آپکے والدین مجھے کیا
خوشی سے ملیں گے؟

مسٹر محبوب۔ ہاں یہاں تو نہ رہ سکیں گے۔ تبدیل مقام کرنا ہوگا۔ ترقی کا اور آزادی کا زمانہ ہے۔ والدین
اس شادی سے خوش ہونگے۔ کیونکہ وہ میری شادی اپنے کنبہ میں ٹھیرا رہے ہیں تاہم جب سنیں گے
کہ میں نے ایک حسین خاندانی لڑکی سے عقد کیا ہے جس نے میرا مذہب قبول کر لیا ہے تو مجبوراً ہو جائینگے
والدہ ذرا رنجیدہ ہونگی والد صاحب آزاد خیال ہیں۔

پیاری ہمارا مذہب بہت آزاد ہے اسی میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ کافر مشرک جبکہ ہمارے مذہب
میں داخل ہو جائے۔ ہم اسکی عزت کرتے ہیں اور نکاح جائز ہو جاتا ہے" یہی تذکرہ رہا پھر دونوں گول کمرہ
میں جا بیٹھے۔ جہاں کشن دیوی نے ۲ بجے رات تک رہ کر محبوب کو خوش کیا۔ کیونکہ اس طرح نہایت
محبت سے دونوں عاشق ومعشوق صوفے پر بیٹھے راز و نیاز کرتے رہے۔ مگر محبوب نہایت ایماندار اور خوش
اخلاق خدا سے ڈرنے والا نوجوان تھا وہ ایک حد تک آزاد رہا اور تنہائی میں بھی حد سے نہ گذرنے پایا۔

افشار

فوز صبوقت موٹر لے کر سپاڈ ڈھائی بج رہے تھے۔ سیٹھ صاحب کا جان نثار و ہمراز ملازم کرپارام
موٹر خانے کے آگے ٹہل رہا تھا۔ کیونکہ آج اسکو سرکار کا حکم تھا کہ جبوقت سے موٹر خانہ خالی دیکھو تم برابر
دیکھی رہو۔ اور ہو سکے پیچھا کر کے معلوم کرو کہ کس وقت کہاں جاتی ہے"

کشن دیوی نے ہر وقت کی غیر حاضری بیجا بناؤ سنگھار آزادی کا اظہار عقد بیوگان کی حمایت وغیرہ
وغیرہ سے سیٹھ صاحب بہت کھٹک رہے تھے اور ان کو شبہ تھا کہ وہ ضرور کسی سے محبت کر رہی ہے۔

کشن دیوی نے شوفر بڈھے کو جو کئی سال کا ملازم تھا بہانہ سے نکلوا کر ایک نوجوان نیا ڈرائیور مقرر
کرایا تھا۔ جسکو ہنڈ۵ روپیہ سیٹھ صاحب سے ملتے تھے پچاس روپے ماہوار کشن اپنے جیب خرچ سے
پوشیدہ طریق سے اسے دیتی اور اس سے یہ عہد کرایا تھا کہ جہاں جس وقت وہ کہے لیجائے اور کسی کو خبر
نہ کرے۔ آج رات جو ۱۱ بجے کرپارام نے موٹر خانہ خالی دیکھا تو اس کے ٹوہ میں لگا کہ کہاں جاتے ہیں۔

موٹر محل خانہ کے دروازہ سے نکلکر پھاٹک سے نکل چکی تھی تو وہ بھی دبے پاؤں پیچھے گیا اور "سول لائن" تک پہنچتا ہوا کیں مجیب صاحب کی کوٹھی میں اپنی موٹر کھڑی ہوئی دیکھ آیا پھر آکر وہیں ٹہلتا رہا۔ جسوقت موٹر نے کر قیام فرمایا۔ تو اس نے کرپارام کو دیکھ کر پوچھا کہ تم اسوقت یہاں کیا کر رہے ہو"

کرپارام۔ نمکحرام تم بلا اجازت اسوقت کہاں سے آرہے ہو؟ سچ کہو ورنہ جان سے مار ڈالونگا

شوفر۔ (ہاتھ جوڑ کر) للہ مجھے معاف کرو۔ میں بڑی بلا میں پھنسا تھا ۔ عنہ روپے دینے کا اقرار کیا تھا اس لالچ میں ایک گھنٹہ بھر ہوا موٹر سٹیشن پر لے گیا تھا سرکار سے نہ کہنا تو یہ صہ روپے تمہاری نذر ہیں۔

کرپارام (غضب آلود ہوکر) نمکحرام جھوٹ بکتا ہے ٹھیر جا صبح ہونے دے پتہ لگ جائیگا"

یہ کہکر کرپارام یہاں سے چلدیا اور سیدھا سرکار کے کمرے میں پہنچا اسکے ہاتھ لرزرہے تھے اور غم وغصہ وغیرت سے پسینہ پسینہ ہورہا تھا اندر آیا تو آقا کو میز پر کچھ پڑھتے پایا۔ تمام حال بیان کیا۔

سیٹھ (سر پیٹکر) کرپارام میری موت اب آن پہنچی ہائے اس لڑکی نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ تم نے پہچانا بھی کہ یہ کوٹھی کس کی تھی؟

کرپارام۔ حضور کیسے کہوں زبان بند ہوئی جاتی ہے۔ کاش وہ کوٹھی کسی معزز ہندو کی ہوتی تو کچھ نہ تھا حضور کچھ نہ۔ وسبت کر دیتے۔ وہ تو یہاں کے مشہور مسلمان وکیل محبوب صاحب کی ہے۔

سیٹھ۔ اچھا تو زندگی ختم ہے۔ کل ہی اس نامراد کا فیصلہ کرتا ہوں"

اسوقت سے صبح تک سیٹھ صاحب پریشان حال بیتاب ٹہلتے رہے اور دن نکلتے ہی بیوی کی طرف گئے وہیں کشن دیوی بھی طلب کی گئی جو مثل مجرم کے ماں کے آگے آکھڑی ہوئی۔

سیٹھ صاحب۔ او بےعزت بتا میں نے اسلیئے تجکو سسرال کی قید سے نکال کر یہاں آزادی سے رکھا تھا کہ یہ دن دکھلے۔ کہہ اب کیا چاہتی ہے؟

کشن دیوی۔ (استقلال سے) پتاجی چاہتی کیا جو آپ کا حکم ہو۔

سیٹھ صاحب۔ میرا حکم تیرے کرتوتوں کے عوض میں یہ ہے کہ تجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جاوے۔

کشن دیوی۔ بڑی خوشی سے حاضر ہوں۔

والدہ کشن دیوی۔ او نامراد لڑکی اب ہٹ سے باز آ بہت بدنام کر چکی اب کہدے جو چاہتی ہے۔

ساتھ ہی دوسری شادی۔ دوسری شادی چھپا یا کرتی ہے بتا دوسری شادی کرنی ہے یا ...

آئینہ توڑ کر چٹخنی کھولی اور اندر گیا تو دیکھ کر اسکی چیخیں نکل گئیں اسکا قدردان آقا فرش پر بیجان پڑا ہے اور پستول قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ سینہ میں کئی گولیاں لگی تھیں۔

صبح ہوتے ہی شہر بنارس میں یہ سنسنی خیز خبر مشہور ہوگئی۔ لکھ پتی مہاجن کی خودکشی۔ بیوی کی اچانک موت۔ بیٹی کی گم شدگی۔

لوگ حیران تھے۔ اور وہ لڑکی کتنی خوش ہوگی جسکو تا قیامت باحیا عصمت مآب دیویوں کیطرف سے لعنت پڑا کرے گی ✦

خاکسار نیاز بیگم عابد علی

جذبات ٹیگور

دنیا! مینے تیرا ایک پھول توڑا اور اپنے سینہ سے لگایا۔ لیکن اسکا ایک کانٹا چبھ گیا،

دن جب تمام ہوا اور تاریکی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ پھول مرجھا گیا، لیکن زخم ہرا ہے۔

دنیا تجھ میں بہت سے پھول کھلیں گے جنکی نگہت اور جنکی بو عجیب بہار لائے گی، لیکن میرے پھول چننے کے دن گزر گئے، اور اندھیری رات میں وہ گل رنگیں تو نہیں، لیکن غم کا کانٹا چبھ رہا ہے

میں اس کے ہاتھوں کو اپنے سینہ سے لپٹا لیتا ہوں۔ میں اپنے دامن کو اس کے حسن سے بھر لینا چاہتا ہوں۔ کہ بوسوں سے اسکی ملکی مسکراہٹ کو جذب کرلوں اور اسکی سیاہ آنکھوں کو اپنی نظروں میں پی جاؤں،

افسوس! لیکن وہ ہے کہاں! آسمان سے نیلی رنگت جدا ہو تو کس طرح؟ میں حسن کو جذب کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ مجھے فریب دیتا ہے اور دیکھتا ہوں تو حسن نہیں بلکہ انسانی اعضا ہیں۔

ناکام اور مایوس میں واپس آتا ہوں! بھلا یہ ہاتھ ان پھولوں کو کس طرح چھو سکتے ہیں جنکو قدرت کے ہاتھ نہ چھوتے ہوں!!

جنبش ہوئی گذرا تو اسکا دامن مجھ سے چھو گیا۔ ملکے گمنام ساحل سے بہار کا ایک تیز جھونکا آیا۔ ایک غیر محسوس لرزہ محسوس کر اسطرح غائب ہو گیا جیسے پھول کا پنکھڑی ان کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتی ہیں! یہ جھونکا ویسے ہی غیر محسوس بیقرار آنکھ پھر آیا۔

محمد محسن ظا الحق

تبادلہ کا اثر چیزوں پر

ضروریاتِ زندگی کے نرخ پر تبادلہ کا اثر کس طرح ہوتا ہے؟

تبادلہ سے کیا مراد ہے" اور اس کا چیزوں کے نرخ پر کیا اثر پڑتا ہے؟" یہ بڑے اہم سوالات ہیں۔ ان کا واسطہ اکانومکس یعنی اقتصادیات سے ہے۔ چونکہ موجودہ گرانی کا تعلق ان مسائل سے ہے۔ اسلئے ان پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ ماہروں کی زبان اور استدلال سے کام لیا جائے، جس سے عوام کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ اسواسطے ان مسائل کا عام فہم پیرایہ سے ذکر کرنے کے خواہاں ہیں۔

گرانی اشیاء کا سبب ہندوستان ہی گرانی کے ہاتھوں نالاں نہیں ہے۔ بلکہ یورپ اور امریکہ اور ساری مہذب دنیا اس آفت میں مبتلا ہے۔ گذشتہ پانچ سال میں ہندوستان کی پانچ بڑی بندرگاہوں میں ضروریات زندگی کا نرخ (۵۷) فیصدی بالاوسط بڑھا۔ اور اجناس میں چاول کا نرخ۔ آسام میں سب سے کم یعنی (۲۶) فیصدی اور ممالک متوسط میں سب سے زیادہ چڑھا یعنی (۷۳) فیصدی اور گندم کی گرانی آسام میں سب سے کم ہوئی یعنی (۳۸) فیصدی اور ممالک متوسط میں دوچند دام بڑھ گئے۔ جوار کا نرخ صوبجات متحدہ میں (۱۰۲) فیصدی اور بمبئی میں (۱۳۴) فیصدی ہو گیا۔ مکئی اور باجرہ بھی بہت گراں ہو گئے حالانکہ یہ چیزیں باہر نہیں جاتی ہیں۔ گویا کم و بیش نرخ سب صوبوں میں تیز ہو گیا۔ آسام میں سب سے کم تیزی واقع اور ممالک متوسط میں سب سے زیادہ۔ اس عرصہ میں یورپ میں ڈنمارک میں سب سے کم (۹۶) فیصدی۔ اور سویڈن میں سب سے زیادہ چیزیں گراں ہوئیں یعنی (۲۳۴) فیصدی۔ برطانیہ میں (۱۰۷) فیصدی چیزوں کے دام بڑھے۔ سب سے بڑا سبب گرانی کا جنگ یورپ ہے۔ جسکے دوران میں سب ملک جنگی سامان بناتے رہے۔ جو میدان کارزار میں خاک اور دھواں بنتا رہا۔ ایسی چیزیں تیار نہ ہوئیں جن سے قوم کے تمول اور آسائش میں اضافہ کثیر ہوتا ہے۔ ہندوستان دنیا سے الگ نہیں اسوجہ سے دنیا کی عام مالی مشکلات میں سے بھی مدبر کا حصہ دار

بھتا پڑتا ہے بلکہ وہ اوروں سے سستا چھوٹ گیا۔ غیر ممالک کی چیزوں بکثرت آنا بند ہوگئیں اور جو آتی رہیں ضرورت پورا کرنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ پچھلے سال امسال باران سے اناج اور دیگر زرعی پیداوار کم ہوئیں۔ نہری اور چاہی زمینوں میں جو غلہ پیدا ہوا وہ ضرورت کے لیے کافی نہ تھا۔ چاول اور گندم کی مقدار میں ڈیڑھ کروڑ ٹن یعنی چالیس کروڑ من کی کمی رہی۔ اسوجہ سے ضروریات مہنگی ہوگئیں۔ حکام نے یہ دوراندیشی کی کہ خشک سالی یقینی دیکھ کر غیر ممالک کو گندم۔ چاول وغیرہ کی برآمد بند کر دی۔ اور پھر ایک صوبے کو دوسرے صوبہ کو سے روک ٹوک غلہ جانا بند کر دیا۔ اناج کے تاجروں سے مطالبہ کیا کہ وہ بتائیں ان کے پاس کس قدر غلہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نرخ بڑھنے سے رک گیا۔ علاوہ ازیں آسٹریلیا سے پچاس ساٹھ لاکھ من گیہوں منگائے۔ اگر یہ پیش بندیاں نہ کی جاتیں تو نہ معلوم کیا خوفناک صورت اختیار کر لیتی۔ اسوجہ سے گورنمنٹ کی پیش بینی قابل تعریف ہے۔ مگر گرانی پر نہ کسی فرمانروا کو اختیار ہے اور نہ کسی حکومت کو۔ بلکہ صحت و تجارت کے طبعی قوانین کی رو سے واقع ہوتی ہے۔ اگر اس پر کسی کو اقتدار ہوتا تو برطانیہ فرانس اور امریکہ جیسی نہایت زبردست قوی اور جمہوری حکومتیں بھی کسی قانون کی رو سے یک قلم گرانی موقوف کر کے اپنے کو آزاد کر لیتیں علاوہ ازیں ماشل لا کے ایام میں لاہور میں حکام نے گندم اور آٹے کا نرخ مقرر کیا تھا۔ چند روز تک تو دکاندار فروخت کرتے رہے۔ لیکن بامر گیہوں اتنے مہنگے آنے لگے کہ لاہور میں پونے آٹھ سیر کے فروخت ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے گندم۔ پھر آٹا بازار سے غائب ہوگیا۔ اور عوام کو سخت دقت لاحق ہوگئی جس سے اہل لاہور خوب واقف ہیں۔ اس سے ظاہر ہو گیا۔ کہ چیزوں کی قیمت کا تعین حکام کی دسترس سے باہر ہے۔

چیزوں کی قیمت کے اسباب

چیزوں کی قیمت کا تعین حسب ذیل اسباب پر موقوف ہے:۔

(۱) مانگ یعنی حجم۔ رسائی (۲) کثرت و قلت (۳) وسائل نقل و حمل (۴) تجارت و آمد و برآمد کا توازن (۵) نرخ تبادلہ (۶) پونڈوں کا بکثرت استعمال۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں چیز ضرور پہنچ جاتی ہے۔ چاہے وہ کالے کوسوں سے کیوں نہ آئے۔ اور جب ضرورت مستقل صورت پکڑ لیتی ہے تو اس شے کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پنجاب کے لوگ گیہوں کھاتے ہیں اسواسطے بہت سا رقبہ بویا جاتا ہے۔ مدراس برہما وغیرہ میں چاول پر عوام کی بسر اوقات ہوتی ہے اسوجہ سے وہاں پر دھان بہت کثرت سے بوئے جاتے ہیں۔ پنجاب میں گیہوں ارزاں ہیں کیونکہ بہتات سے ہوتے ہیں۔ مدراس برہما میں چاول بہت سستے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پر یہ اناج بہت

پیدا ہوتا ہے۔ اسلیے مانگ و بہم رسانی سے کثرت و قلت واقع ہوتی ہے اور اسپر ارزانی اور گرانی منحصر ہے۔ چیزوں کی قیمت کا اندازہ سکے سے ہوتا ہے۔ سکہ وسیلۂ تبادلہ ہے۔ چاندی اور سونے کے سکے کا اثر چیزوں کے نرخ پر ہوتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ بازار سے آنے تنے کا سودا اس حساب سے نہیں ملتا۔ جتنا روپیہ کا۔ کیونکہ پیسوں میں چیز گراں ملتی ہو۔ یہی نسبت پونڈ اور روپیہ کے وسیلے سے مال یا چیزوں خریدنے میں واقع ہوتی ہے۔ اگر بہت سا مال اکٹھا خرید و تو سستا ملتا ہے۔ مثلاً گھی کا پیسہ لو تو روپیہ کا سستا پڑے گا۔ اسی طرح پونڈ اور روپیہ کی قیمت میں ایک اور پندرہ کا فرق ہے۔ ہمارے ہاں روپیہ کا سکہ ہے جسے لوگ اس قدر عزیز رکھتے ہیں حالانکہ پونڈ کے رواج سے اقتصادی پہلو سے بہت فائدہ رہتا ہے +

تتمہ شرح تبادلہ

ہر ایک ملک دوسرے سے کچھ مال خریدتا ہے۔ ہندوستان سے گندم۔ چمڑا روئی وغیرہ باہر جاتا ہے اور باہر سے کپڑا وغیرہ آتا ہے۔ تجارت درآمد و برآمد کی مساوات پر شرح تبادلہ قائم ہے اگر اسمیں کمی بیشی واقع ہو جائے تو شرح تبادلہ درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اب لندن میں روپیہ دو شلنگ کے برابر ہے اور پونڈ دس روپیہ کا ہے جیسا کہ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان دیکھنے میں آیا تھا حالانکہ جنگ سے پہلے کئی برس سے پونڈ پندرہ روپے کا اور روپیہ سولہ پینس کا تھا اب دنیا کی شرح تبادلہ برہم اسی وجہ سے ہے کہ درآمد و برآمد کا توازن الٹ پلٹ ہو گیا ہے سوا پونڈ کا رواج دوران جنگ میں بند ہو گیا۔ اسکی بجائے نوٹ نکلے۔ اور چاندی کی مانگ بڑھ گئی جس سے وہ اب پونے (۶۴) اونس اکتوبر ۱۹ء کی خبروں کی رو سے ہے۔ سوداگر ہمیشہ ہنڈیوں کے وسیلہ سے لین دین چکاتے ہیں۔ کیونکہ اسمیں بہت کفایت اور سہولت ہوتی ہے گزشتہ پانچ برس سے ہندوستان سے مال باہر جاتا رہا۔ ولایتی سوداگر ہندی تاجروں کو ان ہنڈیوں کے وسیلہ سے واجب الادا رقم دیتے ہیں۔ جو صاحب وزیر ہند فروخت کرتے اور کونسل بلز کے نام سے مشہور ہیں ہندوستان سے چالیس پینتالیس کروڑ روپیہ سالانہ ریلوں اور نہروں کے قرضہ کا سود افسروں کی پنشنوں اور سرکاری ضرورت کی چیزوں کی خرید کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ صاحب وزیر ہند خزانہ ہند کے نام ہنڈیاں جاری کر دیتے ہیں ہندوستان کی [illegible] چاندی کے بازاری بھاؤ کے حساب سے روپیہ کے دام لیے جاتے ہیں اور اس کا اعلان ہر ہفتہ ہفتہ پہلے ہی کر دیا جاتا ہے۔ اسلیے جب نیلام ہوتا ہے تو وہ سوداگر جنہیں ہندوستان کا روپیہ ادا کرنا ہے

روپیہ صاحب مذیر ہند کے پاس جمع کر کے ہنڈیاں خریدتے اور انہیں ہندی تاجروں کے پاس بھیجکر اپنے قرضہ سے سبکدوش ہوجاتے ہیں نہ ہندوستان سے روپیہ ولایت کو جاتا ہے اور نہ ولایتی سوداگر پونڈوں کے صندوق بھیجکر بمبئی کلکتہ میں بھیجتے ہیں۔ بلکہ یہی کھاتہ صاف رکھتے ہیں اور دونوں طرف کے قرضخواہوں کو روپیہ ملجاتا ہے۔ چاندی کے سکہ کی قیمت بمقابلہ پونڈ چاندی کے بھاؤ کے مطابق بدلتی رہتی ہے اسواسطے چیزوں کے نرخ کو متاثر کرتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ شرح تبادلہ کا اثر چیزوں کے نرخ پر کس طرح پڑتا ہے۔ اب ولایتی سوداگروں نے چیزوں کے دام دوگنے کردئے۔ کیونکہ وہ پندرہ روپے کی چیز دس روپے کو دینے کو تیار نہیں ہیں۔ ادھر کاشتکاری کو اپنی پیداوار کے پورے دام وصول نہیں ہوتے کیونکہ وہ پورے تول کا دام دیکر اصلی مول کی بجائے ⅔ پائینگے۔ ماہروں کی ایک کمیٹی غور کرنے کو مقرر ہوئی ہے لیکن اصل بات یہ ہے۔ کہ جب بین الاقوام تجارت اپنی اصل حالت پر آئے گی تو شرح تبادلہ آپ سے آپ درست ہوکر چیزوں کے دام ہلکے ہوجائینگے اور اسکے لئے بہت عرصہ درکار نہیں ہوگا+

(اے۔ جے۔ آر۔ رائے)

مرقات الاخلاق

وقت غضب کلام میں لطف بیاں نہیں | یوں چپ رہو کہ منہ میں گویا زباں نہیں
تیغ! تجھے اگر [illegible] نہیں | ہے سود کی امید کہ بیم زیاں نہیں
دیکھو جہاں عروج تو سمجھو وہیں زوال | وہ کونسی بہار ہے جسکو خزاں نہیں
نرمی اگر زباں پہ نہیں تو [illegible] | سختی اگر زباں میں نہیں تو زباں نہیں
ہے [illegible] فروتنی | جھک جائے آگے تیر کے ایسی کماں نہیں
ٹوٹے نہ [illegible] حیات | سمجھو اگر یہ جان نہیں تو جہاں نہیں
اس کی خوشی [illegible] | اس کا ہمیں ہے رنج کہ گنج گراں نہیں
دشمن ہو مہرباں بھی تو سمجھو اسکو دوست | ناخوش اگر ہو دوست تو نامہرباں نہیں
یہ جان لے کہ میان سے نکلی ہوئی ہے تیغ | قابو میں وقت غیظ جو تیری زباں نہیں
[illegible] جہاں کی انسان ہے [illegible] | کس جائے یہ زمیں نہیں تو آسماں نہیں
غصے کے وقت روک لو اپنی زباں ضرور | تیز اس سے بڑھکے خنجر و تیر و سناں نہیں

بے مہری زمانہ تو اب عام ہے ذہین
کس سے امید مہر ہو جب مہرباں نہیں

سید غلام مصطفیٰ ذہین

داغِ آرزو

دل میں ولولے سب تھے، آہ کیا زمانہ تھا
یوں خیال ہے گویا خواب تھا فسانہ تھا

ہائے وہ تمنائیں وہ ہائے دلخوشی دل کی
شوق کی وہ بیتابی اور وہ بیکلی دل کی

خوش تھا طبیعت میں ان میں اک مسرت تھی
عشق سے محبت تھی دل لگی کی چاہت تھی

کیا پسند خاطر تھی بات مہ جبینوں کی
دیتی تھی تڑپ دل کو ہر ادا حسینوں کی

ہائے اب کہاں وہ جوش ہائے اب کہاں وہ بات
ہائے اب کہاں وہ دن آہ اب کہاں وہ رات

اب گل تمنا میں رنگ ہے نہ بو باقی
رہ گیا کلیجے پر داغ آرزو باقی

ہائے چرخ پر گھر کر بدلیاں جب آتی تھیں
بوندیاں جو پڑتی تھیں دل مرا جلاتی تھیں

رعد کا گرجنا وہ برق کا چمکنا وہ
آتش تمنا کا سینے میں بھڑکنا وہ

ننھے ننھے بادلوں کا دلربا کا مڑ کر جانا
مرے آرزو دل کا شوق میں ادھر جانا

باغ میں بہار آنا اور ہنسی پھولوں کی
بلبلوں کی بیتابی دل لگی وہ پھولوں کی

ہائے ان مناظر کا دل کو اک مزا دینا
وہ میری تمنا کا دل میں چٹکیاں لینا

صبح کا سہانا وقت اور اپنی گلچینی
ہر طرف مہک پھیلی اور چمن کی رنگینی

اب مگر نہیں وہ جوش اور نہ دل لگی دل کی
کھل کے ہائے پژمردہ ہو گئی کلی دل کی

جوش کا کہاں پھر رنگ جب نہیں لہو دل میں
رہ گیا جلانے کو داغ آرزو باقی

اب کہاں گئی امید اب کہاں گیا ارمان
یاس کی حکومت ہے دل میں ہیں غم و حرماں

دل ہے اب بھی پہلو میں لیکن ہے افسردہ
دل میں آرزوئیں ہیں ہاں مگر ہیں پژمردہ

یاس نے مٹا ڈالا ولولہ جوانی کا
کھو دیا ستمگر نے لطف زندگانی کا

ہائے اب کہاں وہ دن جوش جبکہ دل میں تھا
دور تھی یہ بیہوشی ہوش جبکہ دل میں تھا

ہائے کیا ہوئے وہ دن جب مزاج البیلی
شادی و مسرت کا اک وفور تھا دل میں

ہائے کیا ہنسنے وہ دن جبکہ ہم بھی خندہ رو تھے
ورنہ خلد زینت سے خوشنما چمن میں تھے

ہر گھڑی مسرت کا اک سماں نظر میں تھا　　　لطف زیست کا ساماں کیا اپنے گھر میں تھا

بات جو میسر تھی اب نہیں رہی باقی　　　سچ یہ ہے نہیں کچھ بھی لطف زندگی باقی

اب وہ امنگیں ہیں اب وہ تمنا ہے　　　یاس آگئی دل میں رنج و غم کا پہرا ہے

پھر رہی ہے اے احسن اپنی چار سو دلمیں

رہگیا فقط باقی داغ آرزو دل میں

احسن سنبھلی (ناظم حلقہ ادبیہ کانپور)

ناول ناول ناول

نام	تفصیل	مصنف	قیمت
شاہد رعنا	دہلی کی ایک نائبہ طوائف کی خود نوشت سوانحعمری	قاری محمد سرفراز حسین	۹ر
پرتاب	بنگال کے شہرہ آفاق ناول نویس بابو بنکم چندر	بنکم چندر چیٹرجی	۸ر
مار آستین	چٹرجی کے مشہور و معروف ناول	″	عہ
مرنالنی	جن کا ترجمہ نہایت قابلیت سے جوالا پرشاد	″	۱۰ر
بنگالی دلہن	برق نے کیا	″	۱۲ر
	یہ ناول وطن پرستی اور خودداری کا بہترین سبق پڑھاتے ہیں		
معشوقہ	ایک دلکش ڈراما	برق	۸ر
بیرنگ	ایک دلچسپ ناول	″	۸ر

مصنفہ مولانا شرر	مصنفہ دینا ناتھ تشار		
بدرالنساء کی مصیبت ۳ر	گنگا جمنا ۔ بچھڑی دلہن ۸ر	پاربتی ۔ کرشنا کانت ۳ر	بنگالی جاسوس ۔ سرلا دیوی
[illegible] ۔ حسن بن صباح ۲ر	ہندوستان قیمت ۳ر	جنگ بلقان ۔ [illegible]	[illegible] قسمت ۔ [illegible] عاشق
فلورا فلورنڈا ۔ [illegible]	دیگر دلچسپ ناول [illegible]	جنگ جرمن مجموعہ قیمت ۱ر	احمق الذی ۔ اندھا ۲ر

ملنے کا پتہ

تمدن [illegible] محل دہلی

ایک نظر

اردو کانفرنس۔ آج چار سال ہوگئے ہر سال اواخر ایام میں اردو کانفرنس کا نام آتا ہے لوگ کوشش کرکے سالانہ اجلاس منعقد کرنا چاہتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے لکھنؤ میں یہ آواز اٹھی اور جلسہ منعقد کیا گیا مگر حامیان اردو پھر ایسے سوئے کہ ایک سال خبر نہ لی۔ خیر شکر ہے کہ دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں کے ساتھ اردو کانفرنس کا جلسہ ہوا اور اسکے بعد آجتک لگاتار خواب اور گہرا خواب طاری ہے کہ کوئی چونکنے کا نام نہیں لیتا۔

نہایت شرم اور ندامت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی خدمت کے اس امتحان میں پہلے لکھنؤ ناکام رہا اور اب دہلی۔ آئندہ کے لیے تو سالانہ اجلاس کا تذکرہ ہی نہیں ہے اگر حقیقی طور پر اردو کانفرنس قائم نہیں ہوتی اور عملی کام نہیں ہوسکتا تو کم از کم یہ سلسلہ ضرور جاری رہنا چاہیئے کہ ہر سال حامیان اردو ایک جگہ جمع ہوکر اس برائے نام اردو کانفرنس کا اجلاس کرلیا کریں۔ شاید اسی طرح انہیں شرم آئے اور کوئی اللہ کا بندہ اس کام کے لیے کھڑا ہوجائے۔ اور عملی کام ہونے لگے۔ اس سال کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہے گو نہایت شرمناک ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں مگر غالباً لیگ کا اجلاس بھی امرتسر ہی میں ہوگا انہیں ایام میں اردو کانفرنس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہونا چاہیئے اور پھر ایک مرتبہ اس پودے کو بارور کرنے کی کوشش کی جائے۔ بالکل ممکن ہے کہ جس امتحان میں دہلی اور لکھنؤ ناکام رہ چکے اسمیں زندہ دلان پنجاب کامیاب ہوجائیں۔ اس لیے ہم اپنے معاصرین اور حامیان اردو کی اس طرف توجہ مبذول کراتے ہیں اور خاص طور پر امرتسر کے حامیان اردو کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اردو کانفرنس کو امرتسر میں مدعو کرنے پر غور کریں۔

لکھنؤ اردو پریس کانفرنس۔ ایک رونا اردو کانفرنس کا تھا دوسرا رونا اردو پریس کانفرنس کا ہے عہدے دار پر عہدے دار بنائے جاتے ہیں مگر اردو پریس کانفرنس کی حقیقت غالب کے اس مشہور مصرع سے زیادہ نہیں ثابت ہوتی۔ ع

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

یہ کاپی چھپنے جا رہی تھی کہ ہمدرد میں اس موضوع پر نوٹ شائع ہوا +

اسکا تذکرہ نام نہاد کانفرنس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا کلکتہ میں ذکر تک نہیں آیا۔ دہلی میں پھر جلسہ ہوا۔ اس سال پھر ارکین خدا معلوم کس قسم کے خواب گراں میں گرفتار ہے اور اب تک سالانہ جلسہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیا روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات اس موضوع پر کچھ توجہ کرینگے اور برائے نام ہی سہی کیا اس سال امرتسر میں اسی کانفرنس کا اجلاس بھی ہوگا؟ +

استانی۔ اس نام کا ایک ماہوار رسالہ عورتوں اور بچوں کے لیے جنابہ محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی اور خود خواجہ صاحب کی نگرانی میں دہلی سے جاری ہوا ہے۔ استانی کا نام خود بتا رہا ہے کہ رسالہ کیا ہے اور اسکے مقاصد کیا ہیں پہلا پرچہ ہمارے روبرو ہے اور یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ جو اغراض ایسے قسم کے پرچے کے ہونے چاہئیں انہیں اس میں بہت خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ اسوقت تک ملک میں جس قدر نسوانی اور بچوں کے پرچے ہیں ان میں اس رسالہ کی ایک نہایت ممتاز جگہ ہے۔ اس پرچہ کی جامعیت کے متعلق شاید جناب ثاقب لکھنوی کا یہ مصرعہ نہایت صحیح ہے۔

کیا نہیں سب کچھ ہے اس میں نکتہ رس دل کیلئے

ہم کارکنان رسالہ استانی کو انکی اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان سے سفارش کرتے ہیں کہ اگر وہ کسی نسوانی ماہوار رسالہ کو خریدنا چاہیں تو رسالہ استانی کو خریدیں کیونکہ اس میں بہت سی باتیں ایسی ملیں گی جو اکثر دوسرے نسوانی رسائل میں نظر نہ آئینگی۔ قیمت سالانہ ۲ ضخامت ۵۰ صفحہ ششماہی ۱۲؍ دفتر رسالہ استانی دہلی +

دستور۔ آج صحافت کی دنیا جس قدر گرد آلود ہے اسکا تذکرہ اسی قدر غیر ضروری ہے جس قدر دن و رات کا کیونکہ پریس ایکٹ اور افسران حکومت کی خوشی نے گذشتہ ایام میں ہندوستان کی اخباری دنیا پر جو مصائب ڈالے وہ کسی طرح پوشیدہ نہیں۔ ایسی نازک حالت میں جو حق کی آواز بلند ہوتی ہے اور جو غدار بھی اس آواز کو بلند کرے وہ یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔ ہمارے کرم فرما مولوی منظہر الدین صاحب شیرکوٹی نے جن کے حریت نواز قلم نے مدینہ۔ جمہور۔ البلاغ کے صفحات پر موتی بکھیرے ہیں ایک ایسے وقت میں اخبار نکالنے پر آمادہ ہوئے جو وقت کسی اخبار نکالنے کے لئے کسی طرح موزوں و مناسب نہیں تھا۔ مگر ولولہ اسوقت نہیں رکا کرتا جب دل میں یاس کا ہجوم ہو۔ منزل کے خار نمایاں ہوں۔ مولانا موصوف نے اخبار جلدی کیا اور اس شان کا جاری کیا جو ان کے لیے شایان تھا۔ دستور اسوقت حق پرستی حریت نوازی میں بہت آگے ہے

نگر شاید کسی سے بھی پیچھے نہیں ہے۔ ہم مولانا کو دستور کی اشاعت اور اسکی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ ہفتہ میں دو بار شیر کوٹ سے نکلتا ہے۔ قیمت سالانہ ستے۔ پتہ:۔ دفتر اخبار دستور شیرکوٹ ضلع بجنور۔

نسائی۔ تمدن کے سابقہ نمبر میں ہم نے حامیان تعلیم نسواں کے نام ایک اپیل شائع کی تھی جس میں لکھا تھا کہ اس اخبار کے ذریعہ سے خواتین کو ان کے سلاف کے کارنامے بتائے جائینگے۔ سیاست کا سبق دیا جائیگا اور ان میں اخبار نویسی کا مذاق پیدا کیا جائیگا۔ وہ اس اخبار کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ مردوں کی روشن خیال اور بانیہ بیبیاں اور قابل فخر بیٹیاں بن سکینگی۔ گو دعوے بہت سے ہیں مگر اس اخبار کے سلسلے میں جو انتظامات ہو رہے ہیں ان کو دیکھ کر شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ یہ اخبار نسوانی دنیا میں اپنے طرز کا نرالا اور مفید ترین اخبار ہوگا۔ کارکنان نسائی کی طرف سے اطلاع دیگئی ہے کہ اخبار کی اشاعت کا مکمل انتظام ۲۰ اکتوبر کے لیے ہو چکا تھا مگر ڈکلیشن میں ناگوار اور تعلیق وہ دیر ہوگئی جسکی ذمہ داری کسی طرح بھی کارکنوں کے سر نہیں ہے اور ڈکلیشن ۱۲ اکتوبر سے پہلے نہ ہو سکا۔ اسلیئے پہلا پرچہ ۵ نومبر کو شائع ہوگا۔

ہم کو ناظرین و ناظرات تمدن کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انہوں نے نسائی کے متعلق اپیل پر توجہ کی الحمد للہ شکر ہے کہ اسوقت تک جس قدر درخواستیں وصول ہوئی ہیں وہ کافی حوصلہ افزا ہیں لیکن شاید بے قدر نہیں ہیں کہ حامیان تعلیم نسواں اور ناظرین تمدن نسائی کی توسیع اشاعت میں کوشش نہ کریں چونکہ اس پرچہ کا اجرا قدردانان تمدن کے اصرار پر کیا جا رہا ہے۔ اسلیئے شاید ہماری یہ استدعا نامناسب نہ ہوگی کہ تمدن کا ہر خریدار اپنا فرض تصور کرے کہ جلد سے جلد نسائی کا ایک خریدار مہیا کیا جائے۔ ہم ناظرین تمدن کو یقین دلاتے ہیں کہ انہیں ان توقعات میں مایوسی نہ ہوگی جو انہوں نے اس اخبار کے اجرا سے قبل نسائی کے متعلق قائم کی ہیں۔ اس رسالہ میں کسی جگہ ایک کارڈ ملے گا براہ کرم تمدن کا ہر خریدار اس کارڈ پر نسائی کے ایک خریدار کا نام لکھ کر ہمیں روانہ کردے نیز اپنا نام و پتہ بھی تحریر کرے تاکہ ان کے حوالہ سے وی۔پی روانہ کیا جاسکے۔ نسائی کے سلسلہ میں ایک بات اور بتانی ضروری ہے کہ وہ صرف خواتین کے لیے ہی مفید نہ ہوگا۔ بلکہ وہ شخص اس سے قرار واقعی فائدہ اٹھا سکتا ہے جسکی اخباری معلومات بہت زیادہ وسیع نہ ہوں +

اخبار نسائی کی توسیع اشاعت کی کوشش کیجیے

صرف کرچکی ہے اوسکا بھی مطالبہ کیا جائیگا۔ ایک مدت تک مرآندا اس میں کامیاب ہی لیکن اتفاق سے ایک ایسے امیرزادے نے سکینہ کی خواہش کی، جس کے ساتھ اُسے بھی محبت تھی۔ اور جب مرآندا نے اس معاملت کو بھی منظور نہ کیا تو سکینہ جو اپنے بہن کے مظالم سے اب بالکل بیزار تھی منحرف ہو گئی۔ اور اپنے ایک دوسرے عزیز کے پاس جو شہر کا ایک بڑا ذی اثر تاجر تھا چلی گئی۔ یہاں پہونچکر سکینہ نے اپنے عاشق کے ساتھ آزادی سے ملنا شروع کیا اور یہ عزم کر کے کہ وہ اس سے شادی ضرور کرلی۔ مرآندا سے اپنی جائداد کا مطالبہ کیا یہ وقت مرآندا کے لیے بہت سخت تھا، کیونکہ وہ اپنی بہن کی دولت کا بہت سا حصہ صرف کرچکی تھی، اور یہ اوس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اسے واپس کر سکے۔ وہ مختلف تدابیر سوچتی تھی اور کسی پر مطمئن نہ ہوتی تھی، آخر کار اوسکی ذہین طبیعت نے ایک تدبیر نکالی اور اپنے ایک خادم خصوصی کو جو علاوہ فہیم و طباع ہونے کے خوبصورت بھی تھا طلب کیا اسکی عمر سترہ سال کی تھی۔ اور جس وقت سکینہ اپنی بہن کے پاس رہتی تھی اوسوقت سے یہ اس سے محبت کرتا تھا۔ ہرچند وہ محبت حد سے آگے نہ بڑھنے دی گئی تھی۔ تاہم اوسکی گرمی برونی کے دل میں موجود تھی، اور وہ اب بھی کبھی کبھی سکینہ کے خیال سے بیقرار ہو جاتا تھا۔

مرآندا نے اس نوجوان کو اپنے خلوتکدے میں جہاں پہونچنے کے لیے ملک کے بڑے بڑے رئیس تمنائیں کرتے تھے اور نہ پہونچ سکتے تھے۔ بلایا اور اوسکے اندر آتے ہی دروازہ بند کرلیا۔ برونی کے لیے اوسکی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اوسنے اپنے تئیں مرآندا کی خلوتگاہ میں تنہا پایا ہو، وہ متحیرانہ کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ مرآندا نے پوچھا "اے برونی تجھے معلوم ہے کہ مجھ کو تیرے اوپر کس قدر اعتماد ہے؟" برونی :- "اے محترم خاتون یہ تیرا لطف و کرم ہے، اور شاید میں کبھی اس عنایت کے احترام کو فراموش نہیں کرسکتا"۔

مرآندا آگے بڑھی اور اپنے گورے گورے ہاتھ اوس کے شانے پر رکھکر نہایت محبت آمیز لہجے میں مسکراتی ہوئی بولی "میں تجھ سے ایک کام لینا چاہتی ہوں کیا تم اُسے کریگا؟" برونی نے جو مرآندا کے حسین جسم سے چھوکر جوش مجسم ہو گیا تھا، ایک شرم آلود شوق کے ساتھ جواب دیا "دنیا میں وہ کونسی بات ہے جو میں تیرے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا"۔

مرآندا یہ سنکر فدا اور آزاد ہوئی۔ اور برونی کے شانہ کے قریب جا کر کئی بار اپنے ہاتھوں سے دبایا جوش ہیجان اوسکے آنکھوں سے ٹپکنے لگا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اور بے اختیار مرآندا کے قدموں پر گر پڑا اور بولا "اے خاتون مجھے جلد کوئی حکم دے تاکہ میں اسکی تعمیل کروں اب مجھ میں یہ تاب نہیں ہے کہ تو صرف مجھے دیکھے اور رہ جائے۔ تو مجھے چھوئے اور میں یونہی کھڑا رہوں"۔ یہ سنکر مرآندا مسکرائی اور بولی "اے برونی ممکن ہے وہ کام ایسا ہو کہ بجائے اس محبت کے میری طرف سے تجھے نفرت ہو جائے"۔ برونی نے جواب دیا "دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو مجھے تجھسے، تیرے اس حسین جسم سے

منتظر رہے۔ خدا کے لیے جلد بتا کہ میری بیقراریاں اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں" مرانڈا بولی "اگر تو نے یہ خدمت انجام
دی، تو اطمینان رکھ کہ اس کے اعتراف میں میری طرف سے وہ طرز عمل دیکھیگا جس کی خواہش اس وقت تیرے دل کو مضطرب کیے ہوئے
ہے۔ اور جس کے ساتھ تیری سب سے زیادہ پر قوت آرزو وابستہ ہو سکتی ہو" یہ سنکر برونی بدحواس ہو کر پھر اس کے قدموں پر
گر پڑا لیکن مرانڈا نے فوراً اسکو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور بولی "اچھا جا اور جس طرح ممکن ہو سلیمینہ کو ہلاک کر
ڈال" برونی نے یہ سنا اور بغیر اس کے کہ وہ کچھ اظہار حیرت و استعجاب کرتا فوراً تعمیل حکم کے لیے نہایت مسرت سے آمادہ
ہو گیا۔ مرانڈا چاہتی تھی کہ اسکو کوئی تدبیر بتائے لیکن برونی نے کچھ نہیں سنا اور دیوانہ وار دروازے سے نکل باہر چلا گیا۔

(۶)

سلیمینہ شام کو اپنے مکان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ خادمہ نے اطلاع دی کہ برونی مرانڈا کا خادم پریشان و مضطرب آیا ہے اور
کچھ کہنا چاہتا ہے۔ سلیمینہ نے اندر بلا لیا۔ برونی روتا ہوا آیا۔ اور زمین پر گر کر بولا "مجھے مرانڈا نے نکال دیا ہے اور چونکہ میں نے
اسی خاندان میں پرورش پائی ہے سوا اس کے مجھے نہ سوجھا کہ کہیں اور چلا جاؤں۔ اسلیئے تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ تو مجھے اپنے
پاس رہنے کی اجازت دے" سلیمینہ چونکہ برونی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اور کبھی اس کی محبت آمیز نگاہوں کو دیکھکر خوش ہوا
کرتی تھی وہ فوراً راضی ہو گئی اور اسے اجازت دیدی کہ وہ نہایت اطمینان و مسرت سے یہاں زندگی بسر کرے۔ برونی
رہنے لگا اور شب و روز اسی فکر میں مستغرق کہ اسے کوئی موقع ملے اور وہ سلیمینہ کے جام شراب میں زہر ملا دے۔ جسے وہ ہر وقت
اسی غرض سے اپنے پاس رکھتا تھا۔

آخر کار ایک صبح سلیمینہ نے اس سے جام شراب طلب کیا۔ اور برونی نے زہر ملا کر پیش کر ہی دیا۔ جسکو سلیمینہ اٹھا کر
فوراً پی گئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد سلیمینہ کی طبیعت بگڑنے لگی جسم پر آماس آنا شروع ہوا۔ آنکھیں ابل پڑیں اور سخت کرب و اضطراب
میں مبتلا ہوئی۔ [illegible] سلیمینہ کے مسموم ہونے سب پر ظاہر ہو گیا۔ برونی گرفتار کر لیا گیا کیونکہ اسدن
صبح سوا اسکے اور کسی نے کوئی چیز سلیمینہ کو نہیں دی تھی۔ سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ برونی نے مرانڈا
کی سازش سے سلیمینہ کو زہر دیا ہے اور سلیمینہ قریب بمرگ ہے۔ اس واقعہ سے ہر طبقہ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور قریب
قریب ہر شخص اس سے دلچسپی لے رہا تھا۔ کیونکہ اب کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مرانڈا کی حالت سے واقف نہ ہو اور اس کی عادات
و اطوار سے بیزار نہ ہو گیا ہو۔

دوسرے دن حاکم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا اور برونی نے جسکو انکار کر دینے کا کوئی موقع حاصل نہ تھا اعتراف
جرم کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ "مجھے مرانڈا کے مواعید نے بالکل مست و بیخود کر دیا تھا، اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جو کچھ

گیا ہے مگر شہادت نہ دیا ہے۔ مقتول کے اس بیان پر مرانڈا بھی گرفتار کر لی گئی اور اسی محبس میں جہاں بروفی پا بند کیا گیا تھا رکھی گئی۔

دوسرے دن جب حاکم فیصلہ سنانے والا تھا، سارا شہر ارید ووڑا ہوا چلا آرہا تھا اور ہر شخص مرانڈا کے خلاف حکم سننے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا۔ شاہزادہ اُرمرانڈا کا شوہر بھی عدالت گاہ میں آیا۔ اور اپنی محبوب بیوی کو اس حال میں دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ اب شاہزادہ کو مرانڈا سے نفرت ہو جائے گی اور طلاق لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہاں اس واقعہ سے محبت بجائے گھٹنے کے اور بڑھ گئی تھی، جس کا سبب محبت کی بے اصولی دنیا میں کوئی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کار مقدمہ پیش ہوا اور مرانڈا کے سامنے بروفی نے ان تمام واقعات کو دہرایا جو خلوت گاہ مرانڈا کی یادگار رہے۔ مرانڈا نے سنا اور اقرار کیا۔ حاکم نے اس اقرار کو لکھا۔ اور فیصلہ سنایا۔

"کل صبح بروفی کو مجمع عام میں سولی دی جائے۔ اور مرانڈا دو گھنٹے سولی کے نیچے کھڑی رہے اس حال میں کہ اسکی گردن میں ایک رسی ہو۔ جس کا دوسرا کنارہ سولی سے بندھا ہو۔ اور اس کے سینہ و پشت پر اس ذلت کے اسباب نہایت روشن حروف میں لکھ کر مشتہر کئے جائیں"

بعض کا خیال تھا، کہ مرانڈا کے ساتھ رعایت کی گئی اور حاکم اس کے حسن سے مرعوب ہو گیا تاہم یہ مسرت بھی کچھ کم نہ تھی، کہ مرانڈا کی ذلت اچھی طرح ہو جائے گی اور اسکے غرورِ حسن کو جس نے اسکے دماغ کو اس درجہ خراب کر دیا تھا کافی صدمہ پہونچ رہے گا۔

دوسرے دن نفاذ حکم ہونے والا تھا۔ اور صبح سے ہی قصاص گاہ پر اس قدر لوگوں کا ہجوم تھا کہ کہیں تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی، سارا میدان میں چاروں طرف کے مکانات اور انکی چھتوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، اور اس لمحے کے لیے بیقرار، جب مرانڈا اور اسکے فریبِ عشق میں مبتلا ہونیوالا بروفی میدان میں لائے جائیں۔

کسی کسی طرح انتظار کی یہ سخت گھڑی ختم ہوئی۔ اور مرانڈا ہجوم کے اندر سے نمایاں ہوئی۔ وہ اسوقت بھی نہایت مکلف و زرکار ملبوس سے آراستہ تھی۔ سیاہ ریشمی چادر جس پر جا بجا الماس ٹکے ہوئے تھے، اس کے بدن سے لپٹی ہوئی تھی اور موتیوں کے ہار گلے میں تھے۔ بال میں سپید پھول گندھے ہوئے تھے اک نظم و ترتیب کے ساتھ شانہ و دوش پر منتشر کئے گئے تھے، آگے آگے ایک غلام مخمل سے منڈھی ہوئی چوکی لا رہا تھا، اور ساتھ ساتھ اسکے شوہر مرانڈا کو سنبھالے ہوئے تھا، [illegible] بہت سے خادموں کی قطار تھی۔ جو مرانڈا کی ضروریات کے متعلق بہت سی چیزیں اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے نہایت ادب سے آہستہ آہستہ آ رہے تھے۔ مرانڈا کا چہرہ گو اسوقت تبسم آشنا نہ تھا۔ لیکن

کوئی اثر اضمحلال وافسردگی کا بھی نظر نہ آتا تھا، وہ آہستہ آہستہ بڑھی اور مخملی چوکی پر قصاص گاہ میں کھڑی ہوگئی۔ دوکنیزوں نے اسکے دامن ملبوس کو جو زمین پر لٹک رہا تھا اٹھالیا اور تمام خدام پیچھے ادب سے کھڑے ہوگئے جس وقت ھرانڈا آدمیوں کے ہجوم سے برآمد ہوئی تھی۔ لوگوں میں ایک شور نفرت و کراہ مسرت و شادمانی کا مچ گیا تھا، لیکن جب اسے اس متانت و غرور کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو سب پر حیرت طاری ہوگئی اور ہر شخص اپنی جگہ ساکت و دم بخود رہ گیا۔

اب وہ وقت آیا کہ حکم کا نفاذ ہوتا ھرانڈا کے گلے میں ایک رسی باندھی گئی اور اسکا دوسرا کنارہ سولی سے باندھ کر سینہ و پشت پر ایک تحریر آویزاں کی گئی جس میں اس کے جرم و ذلت کا اعلان تھا، ھرانڈا کو اسی حال میں کھڑے ہوئے دس منٹ گذرے ہونگے۔ کہ بردنی لایا گیا۔ سر کا رنگ زرد تھا اور چہرہ سخت افسردہ تھا اسکا لباس سیاہ تھا۔ سر برہنہ تھا۔ اور بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے جب وہ سولی کے پاس آیا تو اسنے ھرانڈا کو دیکھا اور دیکھتے ہی قدموں پر گر پڑا اور بولا اے ھرانڈا اس وقت تو دم بھر کہ میں نے تجھے اس قدر بدنام کیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ خطا ہرگز معافی کے قابل نہیں لیکن اگر تونے اسکو بھلا دینے کا وعدہ نہ کیا تو میری جان نہایت دشواری سے نکلیگی۔ میں اپنی کمزوریوں کو محسوس کرتا تھا کہ میں نے صرف اپنی جان بچانے کے لیئے تجھے رسوا کیا جو دنیا کے محبت کا شدید ترین جرم ہے، لیکن اب جبکہ میرے سارے تعلقات دنیا و دنیا والوں سے قطع ہو رہے ہیں۔ اگر تو معاف کردیگی تو میں یقیناً کچھ آسانی سے دم دے سکونگا جس میں تیرا کوئی نقصان نہیں ہے کیا میں پھر التجا کروں اور تجھ سے طلب عفو ؟" ھرانڈا نے حد درجہ غرور و استغنا سے بردنی کی اس التجا کو سنا اور بولی "میں معاف کرتی ہوں، اگر تیرے لیے اسمیں کچھ تسلی ہے" یہ سنکر بردنی خوش خوش اٹھا اور سولی کے زینہ پر چڑھ گیا۔ ھرانڈا چاہتی تھی کہ وہ اس منظر کو نہ دیکھے بردنی کی حالت نزع کا نظارہ نہ کرے۔ لیکن حاکم نے اسے مجبور کیا کہ وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھائے اور اس شخص کو دیکھے۔ جسے اسنے اس حال میں مبتلا کیا ہے۔ ھرانڈا نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا ہی تھا کہ بردنی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اور سارے مجمع میں ایک شور بلند ہوگیا۔ بردنی تڑپ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ رہے تھے۔ اور ھرانڈا متحیرانہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔ جب دو گھنٹے کے بعد بردنی کا جسم سرد ہوا۔ تو ھرانڈا کو وہاں سے جانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن کیسا حیرتناک منظر تھا یہ سارے شہر اور دیکھنے والے کہ جب ھرانڈا قصاص گاہ سے لوٹی ہے تو اس کے غرور کا وہی عالم تھا اور اس کے عدم تاثر کی وہی کیفیت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی تفرجگاہ سے، کسی باغ سے تفریح

کے بعد طالماں خراماں چلی آرہی ہے۔ اور اسکا چہرہ فرط انبساط سے جگمگا رہا ہے +

(۷)

چند دن گزر گئے۔ اور اس عرصہ میں اگر کوئی تغیر ہمراندا کے قلب میں ہوا تھا تو وہ بالکل نا قابل بیان تھا۔ ہمراندا کی بہن اب صحتیاب ہوچکی تھی۔ سلینہ نے اپنی بادشاہ کے ستانے پر نہایت شرارت سے ترنم کیا۔ اس کے ہونے والے شوہر نے عدالت سے چارہ جوئی کی اور وہاں سے ایک شرعاً بہ وصول کرنے کے لیے ہمراندا اور اس کے شوہر کے پاس بھیجا گیا۔ چونکہ ہمراندا اپنی خیانت و تصرف ناجائز کی تلافی کسی طرح نہ کرسکتی تھی اس لیے حاکم نے دو افسر ہمراندا کے مکان پر متعین کردئے۔ تاکہ وہ ہمراندا کی عیاشی کا کوئی اسباب مکان سے باہر نہ جانے دیں ہمراندا کے لیے یہ صدمہ حقیقتاً ناقابل برداشت تھا۔ اور اسوقت وہ اپنے عزم و استقلال اپنے غرور و ستمنا کو بہت کمزور محسوس کرتی تھی۔ اسکو یقین تھا کہ اگر وہ یہ ارادہ کیا گیا تو اسکا شوہر بھی تباہ ہوجائے گا۔ اور وہ خود بالکل تباہ و برباد۔ اسے اپنے شوہر کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ وہ اپنے اوپر آنے والی مصیبت سے کانپ رہی تھی۔ اور بیقرار وہ سخت مضمحل و افسردہ ہوکر پڑ گئی۔ غذا ترک کردی اور یہ پہلا موقع تھا کہ حقیقی معنی میں اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ اس کے سینہ میں ایک آگ بغض و عناد کی اپنی بہن کی طرف سے مشتعل ہو رہی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی کسی طرح سلینہ کا وجود دنیا سے معدوم کردیا جائے۔ اسکا شوہر جسکو ہمراندا کے ساتھ عشق تھا اور ایک لمحہ کے لیے بھی اسے پریشان نہ دیکھ سکتا تھا بیتاب ہوگیا اور بولا "اے ہمراندا! اب میں کیا کروں اگر تیری سمجھ میں کوئی تدبیر اس بلا سے نجات حاصل کرنے کی آتی ہو تو بتا میں اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں" ہمراندا نے کوئی جواب نہ دیا اور شوہر کے تمام الحاح و زاری اسے کوئی تشفی نہ دے سکی۔

ایک ہفتہ اسی حال میں گزر گیا۔ یہاں تک کہ ہمراندا کا شوہر سخت بیتاب ہوگیا۔ اور پھر ایک بار اس کے پاس تشفی و تسلی کے لیے گیا۔ ہمراندا اسکو دیکھ کر اور زار زار رونے لگی اور بولی "میں کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں جبکہ سلینہ زندہ ہے" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی باہیں شوہر کے گلے میں ڈالدیں اور ہچکیاں لینے لگی، ہمراندا کی یہ حالت اس سے نہ دیکھی گئی اور بے اختیار ہوکر بول اٹھا "ہمراندا میں تیار ہوں کہ سلینہ کو ہلاک کر ڈالوں اور تیری مسرت کی راہ سے اسکو خس و خاشاک کی طرح کاٹ کر پھینکدوں۔ میں اسکے لیے ایک مردانہ عزم کرتا ہوں لیکن خدا کے لیے تو اپنی حالت سنبھال۔ ورنہ میں کچھ نہ کرسکونگا۔ اور ہلاک ہو جاؤنگا"

ہمراندا نے اس حد تک اپنے شوہر کو آمادہ کرکے کچھ مطمئن ہوئی۔ اور مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ پہلے پردنی

کے اعزا و احباب کی طرف سے گمنام خطوط سلینہ کے پاس بھیجے جائیں۔ تاکہ سلینہ کی ہلاکت اوس جانب منسوب کیجائے اور مرانڈا پر کبھی شک نہ ہو۔ چنانچہ یہ خطوط بھیجے گئے اور تمام شہر کو معلوم ہو گیا کہ بیرونی کے احباب و اعزا سلینہ کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اسکے بعد شہزادہ ارُ نے قصد کیا کہ وہ خود سلینہ کو ہلاک کرے۔ اور کسی خادم کو ذریعہ نہ بنائے وہ اپنے تئیں تلوار و خنجر سے آراستہ ہو کر اس جستجو میں نکلا کہ کسی طرح سلینہ پر ان کا استعمال کرے۔ کئی راتیں اسی فکر میں گزر گئیں، لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ پایان کار۔ ایک شب جبکہ سلینہ معبد شماش سے واپس آرہی تھی اور شاہزادہ ارُ بھی سیاہ لباس میں لپٹا ہوا موقع کا منتظر تھا، وہ وقت آہی گیا۔ جس کے انتظار میں مرانڈا بیقرار تھی۔ اس نے پشت کی طرف سے آکر سلینہ کے شانہ پر خنجر کا وار کیا۔ اور سلینہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ شہزادہ ارُ بھاگا۔ لیکن چونکہ اسی وقت معبد شماش سے بہت سے لوگ نکل رہے تھے اسلیے سب کے سب دوڑ پڑے اور اوس کا تعاقب کیا۔ مرانڈا کے شوہر کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا کیونکہ متعاقبین کی جماعت بڑھتی جاتی تھی اور راہ فرار سے کوئی نظر نہ آتی تھی وہ مجبور ہو کر ٹھیر گیا اور دونوں ہاتھوں میں تلوار لے کر اپنی جان بچانے میں مصروف لیکن جب اس کے ہاتھ شل ہو گئے۔ اور تھک کر گر پڑا تو لوگوں نے گرفتار کر لیا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ سلینہ کا قاتل مرانڈا کا شوہر ہے لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔

دوسرے دن عدالت میں شہزادہ ارُ پیش کیا گیا۔ اور اس نے نہایت جرأت و دلیری سے اعتراف جرم کیا۔ اسکا مکان اور سارا اسباب ضبط کر لیا گیا۔ اور مرانڈا بھی شام تک اس مجلس میں آگئی۔ جہاں اسکا شوہر مقید تھا۔ مرانڈا کی حالت نہایت سخت تھی۔ کبھی وہ رونے لگتی اور کبھی اپنے اوپر ملامت کرتی تھی، لیکن اوس کا شوہر صرف اس خیال سے مطمئن تھا کہ اسکی محبوبہ اسکے پاس ہے۔ چونکہ شہزادہ ارُ نہایت شریفانہ خصائل کا شخص تھا اسلیے تمام لوگوں کو اسکے ساتھ ہمدردی تھی، مگر یہ ہمدردی اوس کی قسمت کا فیصلہ نہ ٹال سکتی تھی اور جو نہایت سخت اور دلدوز تھا۔

فیصلہ کا دن آیا۔ اور عدالت نے حکم سنایا۔

"شہزادہ ارُ کا سر بازار میں قطع کیا جائے اور مرانڈا خارج البلد"

(۸)

دوسرے دن لوگوں کے ہجوم میں شہزادہ ارُ قصاص گاہ پر لایا گیا، اس حال میں کہ مرانڈا بھی اسکے ساتھ تھی مگر فرق یہ تھا کہ وہ سخت افسردہ و مضمحل تھی اور یہ نہایت مسرور و مطمئن۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی جس سے مقصود تھا کہ

پھر گویا اپنے احباب و اعزا سے رخصت ہو لینا چاہیئے۔ یوں تو شاہزادہ اُس کے ساتھ ارید و کا ہر شخص ہمدردی کرتا تھا لیکن اسکی نگاہ میں صرف ایک ہی ہستی ایسی تھی جس سے اسے رخصت ہونا تھا، وہ آگے بڑھا اور ھراندا کے قدموں پر گر پڑا۔ شاہزادہ اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور ھراندا اپنی جگہ مجسمہ کی طرح قائم تھی، تھوڑی دیر تک کوئی گفتگو نہ ہو سکی، لیکن اسکے بعد دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور ساری جماعت پر ایک نہایت گہرا تاثر طاری ہو گیا۔ جب شاہزادہ کا کچھ جوش کم ہوا اور ہچکیاں رکیں تو وہ اٹھا تاکہ ھراندا سے اپنے سر کو جلاد کے سامنے پیش کرنے کی اجازت طلب کرے۔ شہزادہ نے کہا "اے میری پیاری ھراندا افسوس ہے کہ میری زندگی تیری خدمت کے لیے بہت مختصر ثابت ہوئی۔ اور میں اپنے حوصلہ کے مطابق تیری پرستش نہ کر سکا پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ تجھے میری وجہ سے تکلیفیں ہیں، ہو سکتا ہے تو میں اپنی قطع حیات سے خوش ہونے لگتا ہوں کہ شاید یہ اسی کی سزا ہے۔ بہرحال اب میں تجھ سے جدا ہوتا ہوں۔ کیونکہ جدا ہو جانا ناگزیر ہے کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ تو اس جدائی کو آسانی سے برداشت کر لیگی، تاکہ میں اپنی اس روح و تن کی جدائی کو آسانی سے برداشت کر سکوں" یہ کہا اور پھر قدموں پر گر پڑا اٹھا اور پھر رونے لگا۔ اس کے سینہ میں اس وقت عجیب و غریب قسم کا جذبات کا ہجوم تھا، اور اُسے کسی طریق اظہار سے تسکین نہ ہوتی تھی وہ اسی حال میں مصروف تھا کہ دوسری گھنٹی بجی، جس کے سنتے ہی ھراندا بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اور شاہزادہ زبردستی وہاں سے پکڑ کر قصاص گاہ پہنچایا گیا۔ قصاص گاہ بازار کا ایک میدان تھا۔ جہاں ایک جگہ نشیب میں پتھر کی ایک بڑی سِل لگی ہوئی تھی اور اسپر لکڑی کا ایک تختہ نصب تھا، شاہزادہ خراماں خراماں آیا۔ اور تختہ کے پاس پہنچکر اپنے کرتے کی آستین الٹیں گلے سے رومال کھولکر ہاتھ میں لیا اور جلاد کو جو قریب ہی ایک برہنہ تلوار لئے ہوئے کھڑا تھا میں اشرفیاں دے کر بولا "اسے قبول کر، اور جس وقت میں رومال کو تیسری بار جنبش دوں۔ اپنی خدمت تکمیل کے ساتھ انجام دے" یہ کہا اور اپنا سر تختہ پر جھکا کر رکھدیا۔ شاہزادہ نے سر رکھتے ہی اپنے رومال کو پہلی بار جنبش دی اور جلاد مستعد کھڑا ہو گیا۔ جب شہزادے نے دوسرا اشارہ کیا تو اس نے اپنی تلوار سونت لی۔ اور اسکے بعد ہی تیسرے اشارے پر ہوا میں شہزادے کے سر پر ایک چمک سی پیدا ہوئی اور تلوار اسکے گردن میں پیوست ہو گئی، ہجوم میں ایک شور پیدا ہوا۔ دیکھنے والوں کے چہرے متغیر ہو گئے۔ اور دلوں پر حسرت و تاسف کا ایک گہرا سکوت مستولی ہو گیا۔ ھراندا ہنوز بیہوش تھی۔ اور تیاری کی جا رہی تھی کہ اسے یہاں سے اٹھا کے لیجائیں، لیکن ابھی ایک رسم اور باقی تھی۔ یہ قاعدہ تھا کہ قصاص کے بعد جب جلاد مقتول کے سر کو ایک نیزہ پر بلند کرکے سبکو

دکھاتا تھا اس غرض سے جب جلاد شہزادہ کی پھڑکتی ہوئی لاش کے پاس پہونچا، تو اسے یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی، کہ سر جسم سے علیحدہ نہیں ہوا۔ اور شہزادہ ہنوز زندہ ہے۔ یہ دیکھکر جلاد تلوار کی دوسری ضرب سے سر جدا کرنا چاہتا تھا کہ مجمع میں ایک شور بلند ہوا۔ اور اسکی سخت مخالفت کی گئی یہ بھی قانون تھا کہ اگر ایک ضرب میں مجرم ہلاک نہ ہو تو دوسری ضرب نہیں پہونچائی جاتی تھی۔ خواہ وہ جانبر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور شہزادے کے جسم کو اٹھا لے گئے، شہر کے بہترین معالجین تعینات کئے گئے۔ دو معالجوں نے بچکر جانبر ہونے کی امید دلائی کیونکہ تلوار بجائے گردن کے شانہ کی ہڈی میں تیر گئی تھی۔ اسلئے نہ گردن کو جدا کر سکی تھی اور نہ شہ رگ کو کوئی صدمہ پہنچا تھا اس واقعہ کے بعد بھی لوگوں نے اس بات پر زور دیا کہ ھراندا کی جلاوطنی شہزادہ کی صحت تک ملتوی رکھی جائے لیکن وہ عام برائی جو ھراندا کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں تھی اسکی مخالفت ہوئی اور اسی وقت ھراندا جلاوطن کر دی گئی۔ ادھر شہزادہ کا علاج جاری تھا۔ اور اسکی حالت بہتر ہوتی جاتی تھی لیکن خون کے ضائع ہو جانے سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ جلد گفتگو یا حرکت کرنے کے قابل ہوگا۔ وہ ایک عرصہ تک مسلسل بستر علالت پر پڑا رہا لیکن جب دو مہینہ کے بعد اس نے اپنی آنکھ کھولی تو سب سے پہلی جو بات اس نے کی یہ تھی کہ "ھراندا کہاں اور کیسی ہے"

(۹)

ایک سال گزر گیا، اریدو نے ھراندا کے افسانوں اور اسکے حسن کی خونی داستانوں کو بھلا دیا، لیکن شاہزادے اُرجاب شہزادہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک معمولی حیثیت کا انسان ہے، اور ھراندا جواب سفاک و بے رحم ھراندا نہیں ہے، بلکہ حقیقی معنی میں تائب و مرتاض عورت ہے اریدو کے ایک سنسان گاؤں میں اپنی فقیرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں، اب ان کی تنہا دولت و مسرت صرف ایک بچی ہے۔ جو کبھی ماں کے آغوش میں آکر باپ کو اور کبھی باپ کی آغوش میں آکر ماں کو اپنی معصوم نگاہوں سے دیکھا کرتی ہے۔

ہمارا افسانہ اس حد تک پہونچکر ختم ہو جاتا ہے، اور صرف حیرون و سلینہ کے متعلق کچھ بیان کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ سو اب سمجھ لیجئے کہ حیرون کی پاکبازی ثابت ہوئی اور وہ رہا کر دیا گیا۔ سلینہ اچھی ہوئی اور اسکی شادی ہو گئی ۔۔

نیاز۔ فتحپوری

اطلاع چونکہ اس افسانہ کا (دائمی) حق تصنیف جناب نیاز صاحب نے مجھے عنایت فرما دیا ہے۔ اسلئے کوئی صاحب اسے چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں۔ محمد عباس حسین قاسمی

قربانگاہِ حسن

حضرت نیاز فتحپوری کے
سحر نگار اور
جذبات نگار قلم کا تازہ ترین کرشمہ

جسمیں دکھایا گیا ہے کہ عورت اپنے عالم شباب میں کیا کچھ فراموشی کرجاتی ہے

۴ر

دُنیا کو جس جوہر کی تلاش تھی وہ مل گیا

سینکڑوں ہیں چند ایک ہم کے استعمال سے فائدہ نہ ہوتا ہو۔ ایک یوم کا نمونہ مفت سچائی اور ایمانداری اصل کام ہے ہمارے سچائی کا ثبوت نمونہ ہے۔ نمونہ اشتہار اور نمبر سارٹیفکٹ ہیں۔ کم از کم نمونہ منگوا کر ضرور آزمائش کیجئے۔ نمونہ جوہر طلا عجیب و غریب استعمال ۵ یوم ۴ کا ٹکٹ بذریعہ لفافہ آنے پر مع محصول پارسل آپکے مکان پر پہنچ جائیگا

جوہر طلا عجیب و غریب

یہ ایک طلسم ہے مرجھائے ہوئے دلوں کو ہرا کرنے والا بگڑی ہوئی حالت کو دور کرکے امید و امنگ پیدا کرنیوالا جن لوگوں نے بچپن کی بے اعتدالیوں سے اپنی جسمانی حالت کو بیکار کرلیا ہو اور کف افسوس مل رہے ہوں ان کے لیے یہ طلاء جادو مسیحائی کا اثر رکھتا ہے۔ رگوں میں خراب رطوبت کا بھر جانا کمزوری و نا عزی کی علامت سب شکایتیں دور ہو جائینگی۔ اور پرانی خراب جلد بلا تکلیف مثل کینچلی کے اتار دیتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ چھالہ وغیرہ کی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ترکیب نہایت آسان ہے۔ رگوں اور پٹھوں کی نقاہت کو دور کرکے مردہ رگوں میں تازہ اسپرٹ بھرتا ہے دوران خون کو تیز کرتا ہے پٹھوں کو قوی اور فربہ کرتا ہے رگوں کی خراب رطوبت نکل جانے کی وجہ سے خون کا دوران پہنچنے لگتا ہے اور کمزوری دور ہو جاتی ہے۔ رگیں کمزور اور پٹھے ناطاقت ہو جانے کے باعث عضو میں یہ شان نہیں رہتی کہ روح اور ریح کو قبول کرے یا تبدیل کرکے دیر تک محفوظ رکھے دوران خون بھی وہاں پورے طور سے نہیں پہنچتا اسلیے اصول علاج کے مطابق رگوں اور پٹھوں میں طاقت پہنچانا اور رگوں کی خراب رطوبت کو تحلیل کرنا اور دوران خون کو تیز کرنا چاہیے تاکہ عضو پوری مقدار میں ہو جائے۔ عضو اصلی حالت پر نہ آنے کی وجہ سے ہلکی سی حرارت پاکر رگیں مادہ تولید کو نکال کر پھینک دیتی ہے مفصل حال فہرست سے معلوم ہوگا +

قیمت فی شیشی کلاں ایک تولہ ۴۰ یوم عہ/ شیشی خورد چھ ماشہ ۲۰ یوم عہ/

المشتہر حکیم جوہر حیات اینڈ کو شفاخانہ دہلی

جو ہندوستانی دواخانہ دہلی نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ وہ کسی کی عیب جوئی اور بدگوئی نہیں کرتا۔ اور دوسروں کو برا کہکر خود بھلا بننے کی کوشش کو برا سمجھتا ہے، اور طب یونانی اور ویدک کی بہترین دوائیں خالص اجزار سے بناکر پبلک کے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ اگر اپنے ملک کی دوائیں پسند ہوں تو یہاں موجود ہیں، البتہ اس بات کا پورا اطمینان دلاتا ہے کہ اسکی بنائی ہوئی دوائیں مستند ہیں؛ مجرب ہیں! خالص! اور ہر ایک ضرر سے پاک!

دہلی

اور دہلی نہیں تمام ہندوستان میں اس دواخانہ کو غیر معمولی ترقی کا فخر حاصل ہے لاکھوں روپے تک اسکا کاروبار پہنچ گیا ہے، فخر ہندوستان عالیجناب حاذق الملک حکیم حافظ **محمد اجمل خان** صاحب خلف الرشید حضرت حکیم **محمود خان** صاحب غفرلہ اس کارخانہ کے مربی و سرپرست ہیں اور حاذق الملک بہادر نے طب یونانی اور ویدک کو زندہ رکھنے کیلیے **عظیم الشان طبی کالج** قایم کیا ہے اس دواخانہ کا نفع اس کالج کے اخراجات کی کفالت کرتا ہے،

ہندوستان میں ان امتیازات کیساتھ ہندوستانی دواخانہ ہی ایک تنہا کارخانہ ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ خالص اور بھروسے کے لائق دیسی دوائیں نہ ملنے کی پبلک کو جو تکلیف ہے اسکو دور کرے اور اپنا نفع کار خیر میں صرف کرے تالیفات سلف سے زیر طریقہ اور مروجہ کے لاکھوں اصحاب نے اس دواخانہ سے فایدہ اٹھایا ہے اور اسکی شہرت غیر ممالک تک پہنچ گئی ہے ۔ فہرست طلب کرنے پر مفت! تار کا پتہ "**ہیمڈی سنٹر**"

خط کا پتہ درج ذیل ٹھیک یہی الفاظ لکھنے چاہئیں۔

منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی

ان ادویات کو اپنی مشہوری و ناموری کیوجہ سے گورنمنٹ انڈیا سے رجسٹری کرانا پڑا ہے اگر یہ ثابت نہوں تو قیمت واپس [illegible]

سرمہ اکسیر چشم رجسٹرڈ

جسکے ۳۰ ماہ میں ۲ ہزار سارٹیفکٹ آئے ہیں

اسمیں ممیرہ وادر نہیں موتی مگر صحت کی حالت میں محافظ چشم و ہندعیا۔ خارش و پانی جانا رتوندہ ناخنہ ضعف چشم ابتدائی موتیابند وغیرہ امراض کیلئے لاثانی دشمن ہے اور لطف یہ کہ عینک تک چھڑا دیتا ہے جسکی بابت ملک کے پانچ درجن سے زائد اخبارات نے بڑے بڑے تعریفی ریویو کئے ہیں۔

قیمت یکتولہ عہ ۳ تولہ عہ محصولڈاک بذمہ خریدار

نوٹ:۔ اگر سارٹیفکٹ ملاحظہ کرنا چاہتے ہو تو چراغ صحت مفت طلب کرو۔

حکمت کی روح

حجم یک صد صفحہ۔ مگر قیمت مع محصول [illegible]

بالتصویر علی کاغذ پر ہماری ذاتی و خاندانی خاص الخاص مجربات کا خاص ذخیرہ جسمیں پوشیدہ سے پوشیدہ طب کے تمام نسخہ جات بے کم و کاست درج کئے گئے ہیں غلط ثابت کرنیوالے کو

۲۵ روپے انعام!

گلدستہ

نامی کتاب یکصد صفحہ سے زائد بالتصویر عمدہ کاغذ پر اوبی اخلاقی علمی جنسی فن طبی وغیرہ وغیرہ بہت بیش بہا قیمتی مضامین سے لبریز ہے۔ قیمت صرف ۲ اگر پسند نہو قیمت واپس۔

حبوب مراد رجسٹرڈ

جسکے ۱۲ ماہ میں ایکہزار سارٹیفکٹ آئے ہیں

دنیا میں لاثانی طاقت آپ کی جوانی اور زندگی کی جان معنوی مسک گولیاں استعمال فرما کر ان کا تجربہ فرمائیں بار بار [illegible] فضول ہے۔

قیمت ہر گولی عہ ۲۴ گولی عہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ [illegible]

ایجنٹوں کی ضرورت ہے قواعد طلب کرو

سلائیاں جو سرمہ کیساتھ خاص طور پر چاندی وغیرہ ڈلوا کر تیار کرائے گئے ہیں آنکھوں کے واسطے خاص مفید ہیں۔ قیمت خریداران سرمہ اکسیر چشم سے جلد آنے (۲۰) عام خریداروں سے [illegible]

ملنے کا پتہ:۔ لالہ راج نراین حکیم نمبر ۳۲ جھنگ (پنجاب) تار کا پتہ "سرمہ جھنگ"

فہرست مضامین

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المذہب

(۱) احباب کو شرمندگی ہے کہ باوجود اطلاعات سابقہ کے اس وقت تک المذہب شائع نہ ہو سکا اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسکے سرپرست خاص عالیجناب قاضی محمد سرفراز حسین صاحب مبلغ اسلام ممالک جاپان و انگلستان و ہندوستان و برہما پابند ملازمت تھے۔ الحمد للہ کا شکر ہے کہ وہ سبکدوش ہو کر دہلی تشریف لے آئے ہیں اور ہر چند علیل ہیں تاہم اس اہم اور مقدس علمی اور دینی خدمت کی طرف حتی الوسع توجہ فرما سکتے ہیں۔

(۲) رسالہ **المذہب** دفتر رسالہ ... ٹیا محل دہلی سے زیر سرپرستی جناب قاضی محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی مشنری اسلام و سیاح جاپان و انگلستان و برہما وغیرہ اور محمد عباس حسین [illegible] ایڈیٹر ... قوم کی ادارت میں ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ اور پہلا پرچہ ۱۵ دسمبر [illegible] کو نکلے گا۔

(۳) اس رسالہ میں ایسے مضامین درج ہونگے جن میں مذہب کی خوبیاں، فلسفہ، سائنس ... مروجہ کی روشنی میں بیان کی جائینگی اور تعصب، فرقہ بندی اور دل آزاری کی باتوں سے قطعاً احتراز کیا جائیگا۔ خلوص کے ساتھ کوشش کی جائے گی کہ جدید معلومات کی روشنی میں محقق لوگوں کو جمع کر کے انسانوں میں علمی روحانی و اخلاقی جذبات پیدا کئے جائیں۔ محاسن و خصوصیات اسلام ظاہر کرنا اس رسالہ کا ممتاز فرض ہوگا۔ مگر دیگر مذاہب کی خوبیوں سے ہرگز ہرگز چشم پوشی نہ کی جائے گی۔ اور جملہ ادیان و ملل کے ساتھ کما حقہ انصاف کیا جائے گا۔

مدعا یہ ہے کہ فیشن اور عام تفریحات کے مشاغل میں جو بعض نوجوان مبتلا ہو کر مذہب کی روحانی برکات سے محروم ہو جاتے ہیں اور اسکے مضر نتائج ان کے خاندان اور آل و اولاد پر مرتب ہوتے ہیں ان کے دلوں پر مذہب کی مہک لطیف طریقوں سے روحانی روشنی ڈالی جائے۔ اس رسالہ میں سیاسیات سے متعلق بحث نہ کی جائیگی۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں — آج ہم ایک ایسے رسالہ کی بنیاد ڈالتے ہیں جسکا ثانی ہندوستان میں کوئی رسالہ نہیں۔ دیگر مذہبی رسائل ہر مذہب کے پیرو نکالتے ہیں۔ مگر شاید کوئی صحیفہ بھی ایسا نہیں جو اپنے مذہب کے محاسن اور دوسرے مذہب کی خوبیاں جتا کر ... کا ہمدرد بناتا ہو۔

المذہب تو برائے وصل کردن آمدی، نے برائے فصل کردن آمدی۔ کے مطابق خدا اور اسکی مخلوق کو توحید کے علم کے نیچے لا کر ملا سکتا ہے ... ہر ایک مذہب کے بانیوں سے خدا بزرگ اور ہر مذہب کے بزرگ کے محاسن وسیع ہونگے ... ہو سکتے ہیں۔ **قیمت سالانہ** تین روپے ششماہی ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ پتہ: منیجر رسالہ ... ٹیا محل دہلی۔

علم ہیئت کی ابتدا

ماہرین علم ہیئت کے نزدیک کائنات میں زمین کا درجہ صرف اس قدر ہے جتنا کہ صحرائے اعظم افریقہ کے مقابلہ میں خاک کا ایک ذرہ۔ بمقابلہ اس نظم میں ہماری اتنی سی چھوٹی زمین کسی شمار و قطار میں نہ ہو اوس کی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جن چیزوں سے اکثر بحث ہوتی ہے۔ اون کو چھونا تو کیا معنی ہم ان کے پاس تک نہیں پھٹک سکتے۔ البتہ صبر کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم اپنی زمین سے قدم باہر نہیں نکال سکتے۔ اور وہ (اجرام فلکی) اس قدر دور ہیں کہ جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ہماری عمریں پچاس ساٹھ سال کی ہوتی ہے یا اگر بہت ہوئی تو سو سال۔ اور وہاں لاکھوں کروڑوں برس کا حساب کتاب ہے یہی وہ مشکلات ہیں جنسے تنگ آکر بعض کم حوصلہ لوگ کہنے لگتے ہیں ؎

تو کار زمین را نکو ساختی　　　　کہ با آسمان نیز پرداختی

لیکن مشکلات اب یہاں تک حل ہو گئی ہے کہ علم ہیئت ترقی میں دیگر تمام علوم سے بڑھ گیا ہے اور یہ بات صرف اسی علم کو حاصل ہے کہ اسکے تمام نظریات اور نتائج ہمیشہ صحیح اور پورے اُترتے ہیں۔ اس کی اصلی فتوحات یہ نہیں ہیں کہ انسان کی قوت مشاہدہ و تخیلہ کو تیز کر دیا۔ یا اجرام فلکی کے عجائب و غرائب اور ان کی حیران کر دینے والی جسامتیں اور فاصلے بتا دیئے۔ بلکہ بڑی بات جو اس نے پیدا کی وہ یہ ہے کہ ان مشکلات کو جو انسانی طاقت سے بعید معلوم ہوتی تھیں پانی کر کے بہا دیا۔

یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ علم ہیئت کو (قدامت کے لحاظ سے) تمام علوم میں وہی درجہ حاصل ہے۔ جو بنی نوع انسان میں حضرت آدم کو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے پردہ پر کوئی قوم ایسی نہیں پائی گئی۔ جو کم و بیش اجرام فلکی کی طرف متوجہ ہوئی ہو۔ ہر ایک قدیم قوم کے قصص و روایات کو اٹھا کر دیکھئے۔ وہ

چاند سورج کی حرکات ایک طرف ان کے گرہن ہونے تک کے اسباب بتاتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ سب غلط ہیں۔ مگر یہ ضرور ظاہر کرتے ہیں کہ اس علم کی ضرورت انسان کو اسوقت محسوس ہوئی جبکہ شاید وہ اچھی طرح انسانیت میں بھی نہیں آیا تھا۔

یونانی مورخین کے نزدیک کالدانی اور اہل مصر قدیم تہذیب کے بانی ہیں۔ اور وہ دیگر علوم کی طرح علم ہیئت کی ابتدا کا سہرا بھی انہی کے سر باندھتے ہیں۔ اہل چین کی سنیئے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا شہنشاہ فاوہی (جس کا زمانہ سلطنت اب سے ۴۷۰۵ برس پیشتر ہے) علم ہئیت کا ماہر تھا۔ اور اس نے اپنی رعایا کو بھی اس کی طرف رغبت دلائی تھی۔ اہل ہند کا دعوی ہے کہ تمام علوم و فنون کا گہوارہ ہمارا ملک ہندوستان) تھا۔ اور علم ہئیت کا بھی ہمیں حکمت اوستاد ہیں۔

اب مشکل یہ پڑی ہے کہ تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے۔ کہ آخر اس علم کی الف۔ بے۔ تے سب سے پہلے کس ملک میں ہوئی۔ ہم اپنے اس مختصر سے مضمون میں صرف وہ معلومات بیان کرنے کی کوشش کرینگے جو تاریخی زمانہ سے بہت پہلے کی ہیں اور شاید تمام قدیم قوموں کی معلوم ہونگی۔

ظاہر ہے۔ کہ انسان نے آنکھیں کھولتے ہی سورج چاند اور ستاروں کو دیکھا ہوگا جسکے ساتھ ہی اس کے دل میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہونگے۔ یعنی یہ روشنیاں کیا ہیں؟ کہاں ہیں اور کتنے فاصلہ پر ہیں؟ ان سوالات کے بہت سے جوابات دیئے گئے۔ بعض ان میں سے بالکل احمقانہ تھے۔ بعض عاقلانہ مگر غلط۔ بعض گو غلط تھے مگر کس قدر واقعیت کی طرف لیجانے والے تھے! ان میں سے بہت سے ابتک قومی اور مذہبی قصص و روایات کی صورت میں موجود ہیں۔

سورج۔ چاند۔ اور ستاروں کو دیکھا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صرف روشن ہی نہیں ہیں بلکہ آہستہ آہستہ حرکت بھی کرتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک زمانہ آیا جبکہ لوگ بیان کرنے لگے کہ ستارے رات کی طرح دن میں بھی چمکتے رہتے ہیں۔ اور یہ ترقی کا پہلا قدم تھا جو میدان علم ہیئت میں نہایت ہی قدیم زمانہ میں اٹھایا گیا۔

لوگوں نے اس واقعہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ ہر چند کہ اوس زمانہ میں دن کے وقت ستاروں کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ مگر بہت سے دلیل و استدلال کے بعد یہ طے ہوا۔ کہ ستارے ضرور دن میں

۱؎ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا۔ جلد دوم صفحہ ۵۹۹۔ ۱۲

بھی نکلے رہتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ واقعہ کس نے اور کس زمانہ میں معلوم کیا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ
اوس وقت سے لوگ قدرت کی چیزوں کو صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ عقل کی آنکھوں سے بھی دیکھنے لگے۔
اس سے نتیجہ نکالا گیا۔ کہ سورج بھی چاند کی طرح ستاروں کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ اگر کوئی
شخص کسی خاص مقام سے چند روشن ستاروں کو روزمرہ طلوع و غروب ہوتے دیکھے۔ تو اوسکو
کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ کہ ستارے ہمیشہ ایک مقررہ جگہ سے طلوع اور ایک مقررہ
جگہ پر غروب ہوتے ہیں۔ یعنی اوس مقام سے اون کے طلوع و غروب کی سمت نہیں بدلتی۔
لیکن سورج کے ساتھ یہ بات نہیں ہے۔ یوں کہنے کو تو ہم کہدیتے ہیں۔ سورج مشرق سے نکلتا
اور مغرب میں چھپتا ہے لیکن دراصل موسم سرما میں طلوع آفتاب کی سمت مشرق سے بہت کچھ جنوب
کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح موسم گرما میں یہ رخ شمال کی طرف ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ اسی کے
ساتھ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ جب آفتاب جنوب مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا ہے۔ تو اسی قدر غروب
بھی جنوب مغرب کی طرف ہوتا ہے۔ اور دوپہر کے وقت بھی وہ جنوب کی طرف جھکا ہوا رہتا ہے۔ دن
رات کی نسبت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور دھوپ میں تیزی بھی کم ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے جب آفتاب
گرشہ شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ تو معاملات بالکل برعکس ہو جاتے ہیں۔ الغرض معلوم ہو گیا
کہ آفتاب کی حرکات موسموں کے تغیر و تبدل کا باعث ہیں۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد یہ بھی معلوم ہوا
کہ موسموں سے ستاروں کا بھی تعلق ہے۔ اگر ہم تاروں بھری رات کا تماشہ دیکھنا شروع کریں۔ تو
معلوم ہو جائے گا۔ کہ موسم سرما کے ستارے اور ہیں اور موسم گرما کے اور۔
آسمان کے شمالی حصہ میں کچھ ستارے ایسے ہیں جو تمام سال نظر آتے ہیں۔ اگر ہم کسی رات
بیٹھکر ستاروں کو دیکھتے رہیں تو یہ معلوم ہوگا۔ کہ تمام آسمان آہستہ آہستہ گھوم رہا ہے اور یہ
کہ اسکا محور کہیں نہایت ہی بلندی پر شمالی آسمان میں ہے۔ اسلئے ستاروں کی دو قسمیں ہو گئیں ایک
وہ جو اس غیر مرئی محور (قطب) کے قریب ہیں۔ اور رات کو کسی وقت یا کسی موسم میں ہماری آنکھ
سے اوجھل نہیں ہونے پاتے۔ دوسرے وہ جو مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب
ہوتے ہیں لہذا کم و بیش عرصہ کیلئے ہماری نظروں سے غائب رہتے ہیں۔
چاند کی حرکات سورج کی حرکات سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اسلئے غالبًا پہلے اسکی حرکات

غور نہیں کیا گیا۔ لیکن چاند کا گھٹنا بڑھنا ایسی بات تھی کہ لوگ خواہ مخواہ اسکی طرف متوجہ ہوتے ہونگے۔ اور اپنے دلوں میں کہتے ہونگے کہ آخر یہ کیا تماشا ہے کہ ایک دن شام کو وقت ایک چھاپک سی شے آسمان میں نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ بڑھتے بڑھتے ایک گول چمکدار چیز بن جاتی ہے۔ اور بتدریج گھٹتے گھٹتے غائب ہوجاتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے۔ کہ لوگوں نے اسکی گردش کا وقت اب سے بہت پہلے معلوم کرلیا ہوگا۔ اور اپنے اوقات کا حساب قمری مہینے سے کرتے ہونگے۔

آفتاب کی حرکات اور چاند کے اس تغیر و تبدل کا مطالعہ نہایت ہی قدیم زمانہ میں کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانہ میں لوگوں کو براہ راست ان سے۔ اسقدر پڑتا تھا کہ یاں سیاسات کی دہندلی روشنی بجلی کا کام لیتے تھے۔ کاشتکار موسموں کو دیکھکر سمجھ جاتے ہیں۔ کہ اب بونے جوتنے کا وقت آگیا۔ اور جبکہ رات کے وقت روشنی کا دارومدار صرف چاند پر ہوگا۔ تو لوگ کس بے چینی سے چاندنی راتوں کا انتظار کرتے ہونگے۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا۔ وہ ایسے معمولی مشاہدات ہیں کہ غالباً تمام قومیں ان کی طرف متوجہ ہوئی ہوں گی۔ لیکن ایک جگہ ان میں بہت بڑی ترقی ہوئی۔ چاند اور سورج تو آسمان میں الگ پہچان لیئے جاتے ہیں لیکن ستاروں کی پہچان بہت مشکل ہے۔ کیونکہ بہت سے ستارے روشنی اور چمک دمک میں یکساں ہیں۔ ان کو ایک دوسرے کی جائی وقوع سے پہچانا گیا۔ اور اسلیئے ان کو بڑے بڑے اور نمایاں جھمگٹوں میں تقسیم کردیا اور ان کو برج کہنے لگے۔ ان برجوں کی مختلف اشکال کے لحاظ سے ان کے نام حمل۔ ثور۔ جوزا ۔ ۔ ۔ قلمہ رکھدیئے۔

یہ قدیمی بروج تمام آسمان پر محیط نہیں ہیں۔ بلکہ جنوب کی طرف ایک بہت بڑا رقبہ ان سے بالکل بچا ہوا ہے اور یہی وہ واقعہ ہے جس سے آجکل کے ماہرین علم ہیئت حساب لگاکر بتاتے ہیں۔ کہ یہ بروج کس زمانہ میں قائم کئے گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بچا ہوا رقبہ وہ حصہ آسمان تھا جو آج سے تقریباً ۔۔ ۲۸ برس بیشتر افق سے ۔ ۴ درجہ شمال عرض بلد پر نیچے تھا۔ اسلیئے وہ قدیم لوگ جنہوں نے اس بڑے کام (وضع بروج) کو انجام دیا۔ تقریباً ۔۔ ۲۷ برس قبل از مسیح ۳۷ یا ۳۸ درجہ شمال بلد پر رہتے تھے۔

تقسیم بروج سے ظاہر ہے۔ کہ ان لوگوں نے آفتاب کا سالانہ سفر معلوم کرلیا تھا۔ یہ تعداد

نہیں طامع نہیں خائن ہوں ستمگر بھی نہیں — اہل حق کو نہ دیا حق وہ بھی جابر ہوں نہیں

بولا منصور کہ اے شخص بھلا ہو تیرا — تو نے شکوہ جو کیا بیجا ہے شکوہ تیرا

میں کہ مالک ہوں خزانوں کا ہے مجھ کو کیا غم — کہ ہو جس کے لیے حرص اور طمع بیجا غم

میرے فرمان کے تابع ہے مری کل دنیا — پھر کمی کیا ہے کروں جس کی طمع میں بیجا

بولا داعی کہ ذرا غور سے سن اے منصور — تاکہ ہو تجھ کو ذرا اصل حقیقت پہ عبور

تو مسلمانوں کا راعی وہ رعایا ہیں تری — ان کی دولت کی حفاظت ہے یہ خدمت تیری

یہ تو ہے کار خلیفہ کہ نگراں ہے منصور — تو تو اس خدمت احسن سے ہے بالکل ہی دور

چونہ اور اینٹ کے قلعے میں ہے مسکن تیرا — اور کواڑ اوس پہ چڑھے لوہے کے سرکار من

اور دروازوں پہ دربان کھڑے ہیں تیرے — اور پہ احکام یہ تیرے ہیں یہ فرمان تیرے

کہ نہ ہرگز کوئی قلعے میں ہمارے آئے — ہاں مگر جس کو اجازت ہو وہ آئے جائے

ننگے بھوکے کی رسائی کا طریقہ مسدود — عرض مظلوم کے سننے کا ذریعہ مفقود

نہ ضعیفوں کی فقیروں کی رسائی تجھ تک — لائیں جو اپنی مصیبت کی حکایت تجھ تک

ان خزانوں کا فقط تو ہی نہیں ہے وارث — بلکہ ہر فرد رعایا کو ہے حق توارث

جبکہ حکام نے دیکھی تیری رفتار بد — بن گئے ابلیس خیانت ہوئے اشرار بد

منتشر جب ہوئیں آفاق میں خبریں تیری — کہ یہ حالت ہے تیری اور یوں ہیں درباری

ہوگئی رعب سے مرعوب رعایا تیری — آہ! یہ ظلم و تشدد کی سطوت تیری

تیرے درباری ہوا کے ہوئے گرویدہ — صفحہ ظلم کا ہر ایک ہوا دزدیدہ

عاملوں نے جو دی رشوت بنے راشی خود بھی — پھر تو ہر سو حکومت کا ہوا استرشی

یہی باعث ہے خلافت میں تیری اے منصور — ظلم و فساد و طمع کا ہوا جاری دستور

داد مظلوم نہیں ہاتھ میں تیرے منصور — کر دیا غیر کو اس کام پہ تو نے مامور

جب یہ حالت ہے تیری اور یہ اغوائے عام — آہ! پھر کیسے ہو دنیا میں بقائے اسلام

ظلم و فساد کو کر ترک خدارا منصور — کہ خلافت کو یہ شایاں نہیں ظلم و فجور

اے ذبیح جرأت حق یہ ہو صدا یہ ہے — نظم ہذا کی غرض مشک ختائی یہ ہے

یہ واقعہ تاریخ ابوالفدا، و اعلام الناس میں تفصیلاً مع شئی زائد مذکور ہے ۔ فقیر ابوالعلا محمد اسمٰعیل ذبیح گودھروی

مساجد اور غیر مسلم

مسجدوں کی مجالس میں مسلمانوں کی اجازت سے ہندوؤں کا شریک ہونا شرعاً جائز ہے

(سلسلہ کیلئے نومبر نمبر ملاحظہ فرمایئے)

(۲۰)

بعض حضرات نے اس مسئلہ میں مجتہدانہ استنباط و دقائق آفرینی کی بھی نمائش کرنی چاہی ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "جب مسجد میں پکار کر بات کرنے سے بھی روکا گیا کہ احترام مسجد کے خلاف ہے حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے دو شخصوں سے کہا کہ اگر تم شہر کے باشندے ہوتے مسافر نہ ہوتے تو میں تمکو سخت سزا دیتا۔ تم مسجد رسول اللہ میں اپنی آوازیں بلند کرتے ہو"، تو پھر اس طرح کے "مخلوط جلسے" اور تقریر و بحث کا ہنگامہ کب جائز ہو سکتا ہے"؟ حقیقت یہ ہے کہ آجکل مذہبی مسائل کی نسبت جسقدر خامہ فرسائیاں کی جا رہی ہیں ان سے اور تو کوئی نتیجہ نہیں نکلتا صرف یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے علمی تنزل کے ماتم گسار ہیں ان کے لئے درد و غم اور حسرت و اندوہ کا ایک نیا سامان بڑھ جاتا ہے۔ اول تو "مخلوط" اور "غیر مخلوط" مجالس کی جدید تقسیم سے اصول فقہ میں جو اضافہ کیا گیا ہے معلوم نہیں وہ کس نورالانوار اور تلویح سے ماخوذ ہے؟ پھر کاش "رفع الصوت فی المسجد" اور حضرت عمر والی روایت کا مطلب کسی متداول شرح کی مدد سے سمجھ لیا ہوتا۔ امام بخاری نے صحیح میں باب باندھا ہے "مسجد میں آواز بلند کرنے کا حکم" اور اس میں دو روایتیں لائے ہیں پہلی روایت یہی حضرت عمرؓ والی ہے۔ سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں کھڑا تھا (اور ایک روایت میں قائما کی جگہ نائما ہے اور حاکم کی روایت میں کنت مضطجعا ہے یعنی سو رہا تھا) کہ یکایک کسی نے مجھپر کنکری پھینکی۔ دیکھا تو عمر بن الخطاب ہیں انہوں نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا کہ میرے پاس بلا لاؤ جب وہ آئے تو ان سے پوچھا تم کون ہو یا کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا

طائف کے، حضرت عمر نے کہا "لو کنتما من اهل البلد لاوجعتکما. ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟" ترجمہ اوپر گذر چکا ہے، اسکے بعد دوسری روایت عبداللہ بن کعب کی لائے ہیں خلاصہ اسکا یہ ہے کہ کعب بن مالکؓ اور انکے ایک مقروض مسجد میں اپنے قرضہ کی نسبت بات چیت کر رہے تھے یہانتک کہ چلا چلا کر باتیں کرنے لگے اور انکی آواز آنحضرتؐ نے اپنے حجرہ میں سنلی۔ پس آپ نکلے اور کعب کو اشارہ کیا کہ اسقدر اپنے قرض میں چھوڑ دو الخ" ان دونوں روایتوں کو اس باب میں امام بخاری نے اس لئے جمع کیا کہ مسئلہ کے دونوں پہلو منع وجواز کے واضح کرنا چاہتے تھے، "وھذا من کمال فقهه ودقة استنباطه" حافظ عسقلانی لکھتے ہیں "اشار بالترجمة الی الخلاف فی ذلک فقد کرهه مالک مطلقاً سواء کان فی العلم ام فی غیره وفرق غیره بین ما یتعلق بغرض دینی او نفع دنیوی وبین ما لا فائدة فیه. وساق البخاری فی الباب حدیث عمرؓ الدال علی المنع وحدیث کعبؓ الدال علی عدمه اشارة منه الی ان المنع فی ما لا منفعة فیه. وعدمه فی ما تلجئ الضرورة الیه" ($\frac{1}{۴۶۵}$) یعنی ترجمۂ باب میں اشارہ ہے اُس اختلاف کا جو اس باب میں واقع ہوا۔ امام مالک مطلقاً رفع الصوت کو مکروہ کہتے ہیں. خواہ درس وتدریس علم ہی میں کیوں نہو، اور دیگر ائمہ نے اس بارے میں تفریق وتفصیل کی ہے۔ ان کے نزدیک اگر کسی ایسی بات کے لئے رفع صوت ہو جسمیں کوئی دینی یا دنیوی منفعت ہو تو جائز ہے والا نہیں اور امام بخاری اس باب میں حدیث عمر لائے ہیں منع کے لئے، اور حدیث کعب لائے ہیں جواز کے لئے اور اس طرح واضح کیا ہے کہ منع اُس حالت میں ہے جبکہ بیکار اور لغو باتیں پکار کر کیجائیں لیکن اگر کسی ضرورت کی بنا پر ہو تو جائز ہے

یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد سے مشورہ ومجالس مسجد میں جائز نہیں، تو قطع نظر حقیقت اطلاق الفاظ دین ودنیا وہ اس جملہ پر غور کریں "ما یتعلق بغرض دینی او نفع دنیوی"، اور حدیث کعب پر کہ دراصل رفع صوت لین دین کے معاملہ کے لئے تھا جو یقیناً صحیح معنوں میں دنیوی معاملہ ہے

باقی رہی حدیث عمر تو گو حافظ موصوف کی عبارت نے اس کا مورد واضح کر دیا لیکن

ایک نہایت اہم پہلو باقی رہ گیا ہے۔ حضرت عمر نے طائف کے آدمیوں سے فرمایا "ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ؟" یہ نہیں کہا کہ "فی المسجد" یعنی خاص طور پر مسجد رسول اللہ صلعم کا لفظ فرمایا، صرف مسجد نہیں کہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی زجر و تنبیہ اس بنا پر نہ تھی کہ مسجد میں تم نے آواز کیوں بلند کی بلکہ اس لئے تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بلند آواز سے چیختے ہوئے تمہیں شرم نہ آئی۔ بنیاد اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نہایت سختی کے ساتھ اس سے روکا تھا کہ رسول اللہ کے حضور میں بے ادبانہ آواز بلند نہ کریں "لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون"، کیونکہ قطع نظر تہذیب کلام کے یہ عادت اس ادب عظیم اور توقیر و تعزیز رسول کے خلاف تھی جس کا حکم "توقروہ وتعزروہ" کی آیت میں تمام نوع انسانی پر فرض ہے اور جس کے بغیر "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کا معاملہ محکم نہیں ہو سکتا۔ اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ آپ کے سامنے آتے تو مجسم ادب و تعظیم اور سکوت و خشوع کی تصویر ہوتے، آنکھیں زمین میں گڑی رہتیں اور جب بولتے تو آواز مشکل سے نکلتی۔ علی الخصوص حضرت عمر کا تو اس بارے میں کچھ عجیب حال تھا۔ چونکہ اس آیۂ کریمہ کا نزول جس واقعہ پر ہوا تھا اس کا تعلق خود انہی سے تھا اور خلقتاً ان کی آواز بھی بلند تھی اسلئے نزول آیت کے بعد ان کے خفض و نرمی صوت کا یہ حال ہو گیا کہ "اذا حدث النبی صلعم بحدیث حدثہ کاخی السرار لم یسمعہ حتی یستفہمہ"، کما رواہ البخاری فی کتاب التفسیر والاعتصام بالسنۃ عن ابی ملیکۃ۔ جب آپ کا وصال ہو گیا تو گو آپ کا پیکر جسمی دنیا کی آنکھوں سے چھپ گیا لیکن انبیاء کرام کی حیات معنوی موت کی دسترس سے باہر ہے "یصلون فی قبورہم" اور "صلوا علی فان صلوتکم تبلغنی حیث ما کنتم" (ابو داؤد عن ابی ہریرہ)

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

پس "ولا تجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم لبعض" کا حکم بدستور باقی رہا اور صحابۂ کرام کا آپ کی وفات کے بعد بھی یہ حال رہا کہ مسجد نبوی میں قبر مطہر کے حضور کبھی بلند آواز سے بات چیت نہ کرتے اور تمام احکام ادب و حقوق رسول کو پورا پورا ملحوظ رکھتے۔ حضرت عثمان

عبداللہ بن عمر اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہم کی نسبت منقول ہے کہ مسجد نبوی میں لوگوں کو پکار کر بات کرتے دیکھتے تو سخت خشمگیں ہوتے، اور فرماتے تمہیں شرم نہیں آتی کہ قبر مطہر کے سامنے شور و غل مچا رہے ہو حالانکہ اللہ کہتا ہے **لا ترفعوا اصواتکم** الخ یعنی اس آیہ کریمہ سے منع رفع صوت بحضور رسول پر بعد وفات رسول بھی استدلال کیا گیا۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ کا واقعہ معلوم ہے کہ ایک شخص کو پکار پکار کر بات کرتے ہوئے دیکھا تو یہی آیہ کریمہ پڑھی اور اسپر سخت غضبناک ہوئے۔ حکاہ ابن الجوزی۔ پس حضرۃ عمر کا خشمگیں ہونا اور طائف کے دو آدمیوں کو زجر فرمانا بھی اسی قبیل سے تھا اور اسی لئے آپ نے فرمایا "فی مسجد رسول اللہ؟" یعنی رسول کی طرف نسبت دیکر دکھا صرف لفظ مسجد نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں نہی عمر خاص مسجد نبوی سے تعلق رکھتی ہے علت اس کی دوسری اور غیر مشترک ہے۔ اگرچہ دیگر ادلہ سے یہ ثابت ہے کہ عام مساجد میں بھی بلا کسی ضرورت دینی و دنیوی صالح کے لغو و بیکار شور مچانا یا مسجد کو اپنی دنیاداری کی صحبتوں کی جگہ ٹھیرا لینا قطعاً ممنوع ہے، بلکہ ایسے لوگوں کا اخراج مسجد سے واجب ہے

اور تائید اس کی اس واقعے سے ہوتی ہے کہ جب حضرۃ عمرؓ نے ۱۷ھ میں مسجد نبوی کی از سر نو تعمیر و توسیع کی تو مسجد کے ایک گوشہ میں ایک چبوترہ بنا دیا اور لوگوں سے کہا جس کسی کو ٹھٹھا کر آپس کی بات چیت کرنی ہو یا شعر و اشعار وغیرہ کے لئے صحبت مقصود ہو تو اس کے لئے یہ جگہ ہے سمہودی نے خلاصۃ الوفا میں یہ واقعہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرۃ عمر مسجد میں رفع صوت اور مذاکرہ و مجالسہ کے مخالف نہ تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لئے خاص طور پر انتظام کیوں کرتے؟ بلکہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مسجد رسول میں بحضور قبر رسول چلا کر بلا ضرورت بات کیجائے اور اس طرح مقام رسالت کی تعظیم و احترام مطلوب شرعاً ہے بے پروائی و غفلت کی بنیاد پڑے اس لئے ایک گوشے میں چبوترہ بنا دیا کہ لوگوں کی نمازوں میں بھی خلل نہیں پڑیگا اور بوجہ بعد وہ صورت بھی باقی نہ رہیگی جو حضور و قرب فرمانے میں رفع صوت سے پیدا ہو جاتی ہے اور یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ حضرۃ امام مالک کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ جیسا کہ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ

مطلقاً منع حتیٰ کہ درس تدریس علم کے لئے بھی، تو دراصل یہ صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص ہے، امام مالک کا یہ مذہب نہیں ہے کہ عام طور پر تمام مساجد میں درس و تدریس علم کیلئے بھی رفع صوت نہ ہو بلاشبہ ان سے منقول ہے کہ "انا اکرہ ذلک ولا اری فیہ خیرا" یعنی میں مکروہ رکھتا ہوں کہ مسجد میں درس و تدریس علم ہو، لیکن یہ متعلق ہے صرف مسجد نبوی سے اور جس سوال کے جواب میں انہوں نے یہ کہا وہ بھی مسجد نبوی ہی کے متعلق تھا، اور اسی لئے وہ ہمیشہ اپنے مکان پر درس حدیث و فقہ دیتے ہیں۔ اور اسی بنا پر مورخین نے ان کے اس طریق کو کمال ادب و تعظیم رسول کے سلسلے میں بیان کیا ہے نہ کہ بعنوان فقہ و احکام، ورنہ ظاہر ہے کہ عام طور پر مساجد میں درس و تدریس علم و رفع الصوت انما کان "منع والتذکیر" کو وہ کیونکر مکروہ قرار دے سکتے ہیں۔ جبکہ اس کثرت سے اجماعی شواہد نصاً و عملاً اس کے خلاف موجود ہیں؟ آنحضرت اور صحابہ راشدین نے عشاء تک مسجد میں قیام کئے جو مستلزم رفع صوت و قال و قیل ہے، اور درس و تدریس علم کی تو کوئی جگہ بجز مسجد نبوی کے آنحضرت کے زمانہ میں تھی ہی نہیں، حضرت عمر نے اپنی خلافت میں حکم دیا کہ تمام بلاد مفتوحہ میں مسجدیں تعمیر کی جائیں اور ساتھ ہی ان میں تعلیم و تدریس قرآن و سنت کا بھی انتظام ہو۔ پھر ان مدارس کے لئے فقہاء قراء تنخواہ پر بھیجے گئے۔ شام کے مدارس کے لئے حضرت ابو الدرداء، ابی ابن کعب، معاذ بن جبل وغیرہم بھیجے گئے تھے، حافظ ذہبی نے ابو الدرداء کے حال میں لکھا ہے کہ جامع دمشق میں تعلیم دیتے تھے، طریقہ یہ تھا کہ مسجد میں نماز صبح کے بعد لوگ جمع ہوتے، دس دس آدمیوں کے حلقہ کی تعلیم کے لئے ایک قاری مقرر ہوتا۔ خود ٹہلتے رہتے اور ہر حلقہ کی آواز پر کان لگائے رہتے، جب ضرورت ہوتی ٹوکتے، ایک مرتبہ شمار کیا گیا تو سولہ سو طالب العلم مسجد میں حاضر تھے، ایسا ہی حافظ ذہبی حضرت معاذ بن جبل کے ترجمہ میں ابو مسلم خولانی کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حمص کی مسجد میں گیا تو دیکھا تیس صحابی جمع ہیں، اور مسائل و علوم پر مذاکرہ ہو رہا ہے، غرضیکہ مساجد کا مدارس و بیوت علم ہونا ایک ایسی تاریخی و عملی حقیقت ہے کہ محتاج دلیل و بیان نہیں۔ پھر حضرت امام مالک کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ مساجد میں رفع صوت ہر حال میں مکروہ ہے؟ علی الخصوص جبکہ انکے فقہ و ابواب کا زیادہ تر دار و مدار حضرت عمر کے فتاویٰ و فرامین خلافت اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے علوم پر ہے، اصل یہ ہے کہ بہت سی غلطیاں خاص

مقامات و حالات کے حکم و فتاویٰ کو عام سمجھ لینے سے بھی متاخرین میں پیدا ہو گئی ہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ نے خاص جامع کوفہ کی نسبت فرمایا کہ محراب والے حصے میں نماز مکروہ ہے۔ کیونکہ انکے نزدیک وہ ٹکڑہ مغصوبہ تھا لوگوں نے اس سے عام طور پر کراہیۃ صلوٰۃ فی المحراب کا مسئلہ پیدا کر لیا، قازانی[1] نے بدائع میں اس کی تصریح کی ہے اور شمال میں کہا ہے کہ اسی طرح امام مالک کی بہت سی باتیں جو خاص مدینہ کی نسبت تھیں عام سمجھ لی گئیں۔ یہاں صلوٰۃ فی المحراب کے مسئلہ سے بحث نہیں صرف غلط فہمی کی ایک نظیر دکھلانا مقصود ہے۔

البتہ اگر آجکل کے علماء واعظین کی مجالس قصص وحکایات وجدل فی المسجد و مکابرات کی نسبت سوال کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ نہ صرف رفع الصوت ممنوع میں داخل ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ زمین کے ہر حصہ اور عمارت کی ہر چھت کے نیچے ناجائز ہیں۔ صرف مسجد ہی پر موقوف نہیں عین منبر مسجد پر بیٹھکر باہدگر سب و شتم، تکفیر و تفسیق، اور تلعن و تنابز بالالقاب کیا جاتا ہے جھوٹے قصے اور حکایتیں اور مکذوب موضوع روایتیں سنائی جاتی ہیں۔ ٹھیک ٹھیک مطربوں اور گویوں کی طرح گٹکری اور لے کر گایا جاتا ہے محض مراء وجدل اور تنازع فی الدین کی نیت سے مناظروں اور مباحثوں کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں اور درندوں کی طرح امامت و منبر نشینی کا ایک مدعی دوسرے کی گردن پر خونخوارانہ ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہ ساری باتیں تو مسلمانوں کے لئے جائز ہی نہیں بلکہ عین مقاصد مسجد میں داخل، لیکن اگر مقاصد صالحہ و حسنہ کیلئے غیر اوقات صلوٰۃ میں کوئی مجمع منعقد ہو اور اس میں نفع بلاد و رفاہ ملت و جلب مصالح و دفع مفاسد کے لئے تقریریں کیجائیں تو بخاری کی روایت منع رفع الصوت والی فوراً یاد آجاتی ہے!

یکرہ ان یشرب من فضۃ — ویسرق الفضۃ ان نالہا!

تمام اہل علم و سلف نے اتفاق کیا کہ جدل و تنازع فی الدین نہ صرف ممنوع ہے بلکہ منجملہ شدید ترین

---

[1] صاحب بدائع الصنائع کے لقب کی نسبت لوگوں کو بہت تشویش ہوئی ہے۔ صاحب تراجم حنفیہ نے لکھا ہے کہ اصل میں "کاشانی" ہوگا کاشان کی طرف منسوب۔ حالانکہ بات صاف تھی صاحب بدائع نسلاً تاتاری ہیں اور قازان تاتار کے رہنے والے تھے، جو آجکل روسی ممالک میں داخل ہے اصل میں یہ کاشار تھا۔ عربی میں قازان بولنے لگے۔ منہ

وسائل ضلالۃ امت وتحریف شریعت وعقیدہ ہدیٰ کے ہے اور آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "ما ضل قوم بعد ھدی کانو علیہ الا اوتوا الجدال" کوئی قوم ہدایت کے بعد گمراہی میں نہیں پڑی مگر جدل سے۔ پھر یہ آیت پڑھی "ما ضربوہ لک الا جدلا بل ھم قوم خصمون"۔"

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ عن ابی امامہ) بدقسمتی سے جدل وتنازع و تعنت فی الدین کا دائرہ اس امت پر بھی کھلا، اور اگر آج علوم وتدوینات مقبولہ امت کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ بھی اس فتنہ سے خالی نہیں۔ لیکن ضلالۃ جدل وتنازع کا عملاً بدترین متقدم ونمونہ وہ ہے جو آجکل مناظرہ ومباحثہ مذہبی اور احقاق حق وتحقیق مسائل کے نام سے کیا جاتا ہے، اور اسکی مجلسیں عموماً مسجدہی میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔ پھر ان مجلسوں میں جو کچھ ہوا کرتا ہے معلوم ہے۔ زبان کی کوئی معصیت اور حاق وصدا سے وموع میں آنیوالا کوئی فسق ایسا نہیں ہے جو ان بھیڑوں میں بمصداق ولی نادیکم المنکر علانیہ نہوتا ہو، اور مجرد رفع صوت کا تو کیا پوچھنا؟ تو گوئی خردسان شاطر بجنگ "کے معاملے کے بغیر تو ہمارے علماء کا کوئی مناظرہ مناظرہ ہی نہیں، کوئی اسوقت جاکر اللہ کی عبادت گاہ کو دیکھے، تو بھنگڑ خانوں اور خرابات کے ہنگامے کے شور وغل کے آگے مات ہیں، پھر اس سے بھی بڑھکر یہ کہ جدل لسانی کا خاتمہ عموماً جدل بالید والحراب پر ہوتا ہے، اور لبسا اوقات نوبت مقدموں اور فوجداریوں تک پہنچی ہے، یہ ساری باتیں آجکل کے مسلمانوں کے مذہب میں جائز ہیں، بلکہ از قبیل اعمال متبرکہ وشرعیہ علماء اسلام، نہ ان کا رفع صوت ممنوع ہے، نہ گالی گلوج اور سر پھٹول لیکن مسجد میں اصلاح ملت وبلاد اور حفظ حقوق ملک وقوم کے لئے جمع ہونا جائز نہیں، کیونکہ مسجد میں پکار کر بات بھی نہ کرنی چاہئے۔ حضرۃ عمر نے اس سے روک دیا تھا! انا للہ وانا الیہ راجعون! کیا اس سے بھی بڑھکر "فیبقی ناس جھال یستفتون فیفتون برائھم فیضلون ویضلون"۔ (رواہ البخاری عن ابن عمر) کا مصداق کوئی عہد جہل اور عصر فساد ہوسکتا ہے جسکا مسلمانوں کو ابھی انتظار ہے؟ فقد جاء اشراطہا، فانی لھم اذا جاءتھم ذکراھم؟

تمدن کی توسیع اشاعت کے متعلق اپنا فرض یاد رکھئے ✤

گوشۂ تنہائی

از "پوپ"

کیا خوش نصیب ہے وہ جو ہے وطن میں اپنے   رہتا ہے پھول بنکر رنگیں چمن میں اپنے
محدود جسکی خواہش تھوڑی سی ہے زمیں پر   الفت بھری ہوئی ہے جس میں وطن کی یکسر
دیتی ہیں جسکی گائیں کیا دودھ میٹھا میٹھا   کرتی ہیں جسکی بھیڑیں پوشاک کیا مہیا
کیسی سفید روئی دیتے ہیں کھیت اُسکے   رہتے ہیں دور اس سے دنیا کے سارے جھگڑے
گرمی میں پیڑ جسکے کرتے ہیں سایہ اُسپر   جاڑے میں دے رہے ہیں آرام آگ بنکر
وہ لوگ ہیں مبارک جو یوں گذر ہیں کرتے   بیفکریوں میں اپنے دن کو بسر ہیں کرتے
آرام ہی میں جنکی حاصل ہے تندرستی   دل میں ہے جسکے پیدا امید اور تسلی
جو میٹھی نیند سو کر آرام پا رہے ہیں   جنکے مطالعہ میں ہر وقت ہیں کتابیں
تفریح کا ہے ساماں موجود پاس جنکے   دیتے نہیں ہیں دھوکا ہرگز لباس جنکے
جو اپنی بے گناہی اور اپنی عادتوں سے   رکھتے ہیں سب کو راضی اور سبکو خوش ہیں رکھتے

بس اسی طرح بسر ہو یہ زندگی بھی میری   مجھکو نہ کوئی جانے مجھکو نہ دیکھے کوئی
حالت پہ رحم میری ہرگز نہ کھائے کوئی   مر جاؤں جب، تو مجھکو رونے نہ آئے کوئی
دنیا سے جب الگ ہوں۔ دنیا سے جب ہوں رخصت   پھر کیا غرض دکھاؤں لوگوں کو اپنی حالت

پتھر نصب نہ کوئی میرے مزار پر ہو
جس سے نہ حال میرا معلوم ہو کسی کو

ابو نواس

وطن محبوب کے تین دور

ہندوستان ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے اس کا کل رقبہ برہما کو شامل کر کے پونے دو ملین مربع (۱۷۵۰۰۰۰) میل ہے یعنی براعظم یورپ سے اگر روس کی سلطنت نکال ڈالی جاوے تو باقیماندہ ممالک کے رقبے سے بارہ ہزار مربع میل اسکا رقبہ زیادہ نکلتا ہے اُس کی آبادی ازروئے مردم شماری ۱۹۱۱ء (۳۱۵۰۰۰۰۰۰) نفوس پر مشتمل تھی حالانکہ سلطنت متحدہ برطانیہ عظمی کی آبادی محض چار کروڑ سات لاکھ تھی اور جاپان کی چار کروڑ ستر لاکھ۔ اسکے فلک فرسا پہاڑ زلف یار کی طرح بل کھائے ہوئے پہاڑی دریا، وسیع میدان اور سبز پوش جنگل دلآویز سینریاں اور بیش بہا معدنی ذخائر قبل تاریخی زمانہ سے اس کو رمائش جنت آباد بنائے ہوئے ہیں دو ویجر میں اسکے آباد و موجود ہونے کا پتہ چلتا ہے اور دور آہن کے ظروف جو عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اسکے باشندوں کے متمدن ہونیکی شہادت دیرہے ہیں اس کی مقدس کتابیں وید و پران پانچہزار برس قبل کے حالات کی قصہ خوانی کرتی ہیں اور منظوم تصانیف رامائن و مہابھارت اپنے سلکی بچوں کے دلوں میں گزشتہ کارناموں کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں دیہاتی پنچائیتیں قائم ہونیکا پتہ چندر گپت کے تذکرے میں واضح طور سے چلتا ہے۔ ہمکو اس کا بھی نشان ملتا ہے کہ تین ہزار برس قبل مسیح بابل اور ہندوستان کے درمیان تجارت ہوتی تھی۔ آثار قدیمہ سے پایا جاتا ہے کہ نینوا کے بادشاہ سیمی رامس نے ۲۰۳۴ قبل مسیح ہندوستان پر حملہ کیا تھا نیز مصری ممیوں کے گرد ہندی ململ لپٹا ہوا پایا گیا ہے جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دو ہزار برس قبل مسیح ہندی ساخت کے پارچہ جات مصر اور دیگر ممالک کو برابر روانہ ہوا کرتے تھے۔ عبرانی بائبل میں تامیلی نام بھی آگئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۹۸۰ ق م میں ٹائر کے ہیرام براہ خلیج فارس ہندوستان سے تجارت کرتے تھے ۸۸۳ء میں بادشاہ انگلستان مسمی الفرڈ نے سگھل مائیں بشپ (اسقف) آف شربورن کو ہندوستانی سفارت پر مامور کر کے سوئے مشرق روانہ کیا تھا تواریخ اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ سلطنت مگدھ (بہار) اور اسکے دارالحکومت

نیپالی پتھر (ستونوں) کے حالات اس ملک کی تاریخی عظمت ثابت کرنے کو کافی ہیں۔ بادشاہ چندر گپتا
کے زمانے کا خاکہ ایک یونانی مسمی میگستھینز نے جن الفاظ میں کھینچا تھا اسکو انگریزی الفاظ کا جامہ پہنا کر
سر ولیم ہنٹر یوں رقمطراز ہیں۔ "یونانی سفیر کو سارے ہندوستان میں رسم غلامی کسی جگہ نظر نہ آئی تھی مستورات
عفیفہ تھیں اور مردوں میں شجاعت بدرجہ اتم موجود تھی۔ امن وامان اسقدر تھا کہ لوگوں کو اپنے مکانات
پر قفل لگانے کی حاجت نہ ہوتی تھی بلحاظ فراہمی سامان معشیت ہر موضع مستقل بالذات تھا اور غیر مقامات
کی امداد سے مستغنی بنا ہوا تھا گویا یہاں کا ہر گاؤں یونانی جمہوریت کی شان اپنے میں پاتا تھا گو زمانہ موجودہ
کی تہذیب سہی تاہم ایک نوع کی میونسپلٹیاں اسوقت بھی قائم تھیں جنکے زیر انتظام بازار ہاٹ منڈیاں
پینٹھ بندرگاہ اور بند وغیرہ رہتے تھے۔ اشوک کے ستون ہر حصہ ملک میں پائے جاتے ہیں جو اس
شاہنشاہ کی عظمت تدبر و نصفت پر گویا مہر صداقت لگاتے ہیں۔ فاہیان چینی سیاح راوی ہے
کہ اسوقت سڑکیں اور شاہراہیں اسقدر مامون و محفوظ تھیں کہ اسکے دوران سفر میں ایکبار بھی
کہیں چور نظر نہ آئے تھے۔ ہیون سانگ ایک اور چینی سیاح جس نے ۶۰۲ء میں ہندوستان
کا دورہ کیا تھا مہاراجہ ہرشا جس نے رسم اسپ کشی ادا کرکے اپنی شاہنشاہیت کا ڈنکا بجوا دیا تھا
کی ثنا و صفت میں رطب اللسان ہے۔ اس سیاح سے روایت ہے کہ بادشاہ ہرشا کا دستور
تھا کہ ہر پانچویں برس پریاگ (الہ آباد) میں وہ ایک جگ کیا کرتا تھا جس میں دس ہزار بدھی مہنتوں
کو فی کس ایک سو اشرفیاں روزانہ تقسیم ہوتی رہتی تھیں ایک گوہر آبدار فی کس اور پارچہ جات و
ملبوسات اسکے علاوہ تھا اس نے اس طریقہ کو کامل تیس برس تک جاری رکھا تھا ذرا قیاس تو کرو اس
بادشاہ کی دولت اور رعایا کی مرفہ الحالی کا کیونکہ اگر رعایا خوش حال نہ ہوتی تو تقسیم کرنے کو اسقدر وافر دولت
کہاں سے مل جاتی یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ بزور تشدد سے وصول ہوتی تھی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مذہبی اور
امور خیرات کے کاموں میں ہرگز نہ لائی جاتی۔

قوم آریہ پر یہ حملہ آوروں کا جب دور ختم ہوا تو گویا سب ہند کا دوسرا ورق الٹا گیا یعنی اس سرزمین
افتخار پر افق مغرب سے ہلال اسلام نمودار ہوا [illegible] تو انکی شروع کی متعصب یورپین مورخین و مصنفین حسد
جاہ ہیں اسلام اور [illegible] حکومتیں [illegible] ان کے ہاتھ میں [illegible] آفتاب حقیقت پر
[illegible] اقوام مغرب [illegible] جہالت [illegible]

حریت و مساوات کے ایوانوں میں جو عدل و انصاف سے آراستہ تھے۔ بٹھا دیا علم کی افضلیت جتا کر اونائیں جہاں بانی کی تعلیم دیکر وحشی لوگوں کو انسان بنا دیا اس اسلام سے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اپنے مفتوحہ ممالک و توابع کی سلک مروارید کے ایک نفیس گوہر کو کیچڑ میں پڑا رہنے دیتا یہاں بھی آ سنور دہ کیا جو اسپین، مراکش، مصر، شام، عراق، خراسان، خیوا و بخارا کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے لئے ہمکو آثار قدیمہ کے کھوج لگانیکی حاجت نہیں اور نہ مٹی کے ڈھیروں اور ٹیلوں کے کھودنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی کتب سیر و تواریخ شاہد عینی موجود ہیں۔ تاج محل آگرہ جس کی تعریف میں ایک یوروپین شاعر نے "خواب در حجر" جس کا مفہوم یہ ہے کہ تاج محل کو دیکھکر سیاح ایسا محو حیرت ہوجاتا ہے گویا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔ دلی کا قطب مینار شیر شاہ کی تعمیر کردہ سڑک فیروز تغلق کے ایام کی آبپاشی کی نہروں کے آثار شاہجہانی تخت طاؤس کے ہوشربا اذکار اکبر کی بے تعصبی اور رواداری کے واقعات جہانگیر کے انصاف اور شاہجہاں کے زہد و تقویٰ کے حالات کوئی داستان پارینہ نہیں بلکہ خود مغربی سیاحوں اور سفیروں کے قلمبند کئے ہوئے چشم دید واقعات سے ان باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ علاءالدین خلجی کے بیٹے اور دلی کے نقال کی لڑکی کا قصہ کسکو نہیں معلوم۔ عجائب خانوں میں جاکر فرامین شاہی کا بغور مطالعہ کرو تمکو معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ہندوؤں کے پاٹ شالوں اور درسگاہوں کو کیسی فیاضانہ امدادیں دیجاتی تھیں۔ اسلامی سلاطین کی عطا کردہ جاگیریں آجتک اکثر ہندوں کے خاندانوں میں وراثتاً چلی آرہی ہیں حقیقت یہ ہے مسلمان ہندوستان میں ایک اجنبی قوم کی مانند آئے تو لیکن آتے ہی وہ ایسا شیر و شکر ہوئے کہ پردیس وطن اور بیگانے یگانے ہوگئے اور اجنبیت حرف غلط کی طرح مٹ گئی اس وقت جسقدر رقم شاہی خزانہ میں جاتی تھی وہ صرف یہیں ہوجاتی تھی فرض کرو ایک بادشاہ عمارت بنوانیکا شوقین تھا اس کی دولت کا بیشتر حصہ یہیں کے معماروں، نجاروں، سنگ تراشوں اور مزدوروں کی جیب میں جاتا تھا۔ اگر ملبوسات کی طرف توجہ تھی تو پارچہ بافوں و دستکاروں کے بال بچوں کی روزی کا باب کھلا ہوا تھا۔ ان میں سے اگر کسی بادشاہ کو ذوق علمی نہ بھی ہوتا تھا تو بھی علمائے فن اور ارباب ہنر کی قدر افزائی سے اس کا دربار ہرگز خالی نہ رہتا تھا گویا شان ریاست کے لوازمات سے یہ بھی قرار دیا گیا تھا۔

اندنوں ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء مغربی ممالک میں نہایت قدر اور بیش قرار قیمتوں پہ فروخت ہوتی تھیں اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ اس زمانہ کے ایک یوروپین سیاح ٹیوہیر نے مفصل طور پر اس کے متعلق حالات درج کئے ہیں چنانچہ ایک جگہ رقمطراز ہے "کہ محض ایک قصبہ قاسم بازار سے ریشمی کپڑوں کی بائیس ہزار گانٹھیں جنکا وزن بائیس لاکھ پونڈ (پونڈ = نصف سیر) ہوتا تھا بیرونی ممالک کو روانہ ہوتی تھیں"۔ نیز سیاح مذکور نے یہاں کے کشیدہ کار کپڑوں طلائی و نقرئی پارچہ جات بنارسی پوت کشمیری شال، ڈھاکہ کے ململ اور ٹانڈے کی ادھی و جامدانی کا بھی تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی دکھایا ہے "کہ ممالک غیر کے تجار لاکھوں روپیہ کا چوبی سامان منقوش و سادہ اور ہاتھی دانت و آبنوس کے ظروف جن پر بیلیں کھدی ہوئی ہیں خرید کر ہر سال لیجاتے ہیں"

بلاشبہ گذشتہ صدی کے ابتدا ہی سے ہندوستان میں بدنظمی و طوائف الملوکی پھیل چلی تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دنیا ہمیشہ سے انقلاب پسند واقع ہوئی ہے ایک حالت میں اسکو قرار ایک آنکھ نہیں بھاتا ہندوستان میں بھی خانہ جنگیوں کی طرح پڑی اور بالآخر خود ہی ہندوستانیوں نے اپنے ہی لوگوں سے شکست کھا کر ایک تیسرے دور میں قدم رکھا بادشاہ جہانگیر نے ۱۶۱۳ء میں جس قوم کو اپنی سلطنت کے ساحلی مقامات پر فیکٹریاں قائم کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی اسی قوم کے سپوت بیٹوں نے اپنی فطرتی ذہانت اور فہمی سے سارے ملک پر سکہ بٹھا دیا۔

ہندوستان سے تجارت کرنے محض قوم انگلش ہی نہیں آئی بلکہ لفظ فرنگ کا اطلاق پرتگالیوں فرانسیسیوں وغیرہ سب پر یکساں طور پر ہوتا تھا۔ تاریخ رہنمائی کرتی ہے کہ سب سے قبل اہل پرتگال نے سرزمین ہند میں اپنی کوٹھیاں (فیکٹریاں) بغرض تجارت کھولی تھیں بعد ازاں اہل انگلستان وغیرالعند نے اور سب سے آخر میں اسٹریا کی آسٹنڈ کمپنی ۱۷۲۲ء اور پروشیا کی ایمڈن کمپنی ۱۷۵۳ء میں قائم ہوئی تھی اس ملک میں اپنی سلطنت قائم کرنیکا خواب سب سے قبل فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے دیکھا تھا اور گو اس کی زندگی میں اسکے اس خواب کی تعبیر نہ دیکھنے میں آئی لیکن اسکے حصول کیلئے تقریباً ایک صدی تک اس کی قوم نے جد وجہد جاری رکھی لیکن قرعہ فال ایک دوسری ہی قوم کے نام پڑ گیا جس کا مختصر حال یہ ہے کہ جب الیزبتھ ملکہ انگلستان نے ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو شہر لندن کے گورنر اور کمپنی کو مشرق سے تجارت کرنیکا چارٹر عطا کیا تو لنسس کے سوداگروں نے معہ دوسے چند تجارتی جہاز تیار کرکے ایک کو

کپتان ہاکنز کے سپرد کردیا اور کپتان مذکور اس جہاز کو لیکر ۱۶۰۷ء میں سورت کے بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا اسکے بعد کپتان سپن نے ایک اور جہاز لیکر موچلی پٹم سے اپنی تجارت جاری کی اور اس طور سے ہندوستان اور جزائر برطانیہ کے درمیان آمدورفت کا باب کھل گیا۔ برطانوی سوداگروں کے حوصلے بڑھ ہی رہے تھے ۱۶۱۳ء میں بادشاہ جہانگیر کے حضور میں عرض پرداز ہوئے کہ انکو سورت کیمبے اگوگوا اور احمدآباد میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنیکا اجازت نامہ عطا ہو۔ اجازت ملتے ہی مغربی ساحل پر انگریزوں کو قدم جمانے کا موقع ہاتھ آگیا اور بندرگاہ سورت ترقی کرکے ایک چھوٹا سا پریسیڈنسی ٹاؤن بنگیا۔ اہل برطانیہ کی خوش قسمتی سے بادشاہ چارلس دوئم کی جب شادی کیتھرائن آف برگنزا سے ہوئی تو شاہ پرتگال نے نوشاہ کو جہیز میں جزیرہ بمبئی نذر کردیا جو ترقی کرکے اب ہندوستان کا صدر دروازہ کہلاتا ہے۔ ان تاجروں نے مغرب میں پنجے ٹھیک کر شرقی ساحل پر بھی قدم جمانے کے منصوبے گانٹھنے شروع کردئے چنانچہ ۱۶۳۴ء میں سلطنت مغلیہ کے دوسرے تاجدار شاہجہاں بادشاہ سے انہوں نے ایک دوسرے مقام پر تجارتی کوٹھیاں قائم کرنیکا فرمان حاصل کرلیا جسکو پپلی کہتے تھے اور جو صوبہ بنگال میں واقع تھا کمپنی مذکور کے ہر فرد کا دل قوم پرستی کے جذبہ سے لبریز تھا ہی ایک شخص مسمی ڈے کو حصول مقصد میں سب سے بڑی کامیابی ہوئی یعنی اس نے راجہ چندرگیری سے چناپٹم میں ایک ٹکڑا زمین کا جو ۶ میل طویل تھا اور ایک میل عریض فیکٹری بنانیکو حاصل کرلیا اور چونکہ اس میں تالیف قلوب کا مادہ بخوبی موجود تھا راجہ کو شیشہ میں اتار کر اسپر بھی آمادہ کردیا کہ راجہ کی طرف سے ایک گڑھی بشکل قلعہ بھی بنادی جاوے تاکہ اس میں بدیسی تاجر بحفاظت تمام قیام پذیر رہیں اور یہ وہی قلعہ ہے جس کا نام بعد کو فورٹ سنٹ ڈیوڈ پڑا۔ اس قلعہ کی خوبی یہ تھی کہ دریائے کوم کی دونوں شاخوں کے درمیان آکر ایک جزیرہ کی شکل بنگیا تھا۔ چونکہ راجہ قابو میں تھا ہی بعد کو مسٹر ڈے نے جب قلعہ کے گرد ایک اور دیوار جو ایکسو گز چوڑی اور چارسو گز لانبی تھی تعمیر کرائی اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جدید احاطہ کے اندر بجز گورے چمڑے والوں کے کوئی کالا آدمی قدم نہ رکھنے پائے راجہ کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگی حقیقت یہ ہے کہ راجہ رتنگری کا طرز عمل ایشیائی جذبۂ مہمان نوازی پر مبنی تھا کیا علم تھا کہ حلقہ شہد کی مکھیوں کا چھتا بنجاویگا یا شیرنی کے بچوں کا بھٹ۔ احاطہ کے بیرونی حصہ میں البتہ کالے رنگ والی مخلوق قیام پذیر تھی تاہم اس وقت قلعہ کی مایۂ بساط محض ۲ مربع میل پر محدود تھی۔

قصہ مختصر اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع اول کے اندر اندر بمبئی، مدراس، کلکتہ وغیرہ میں انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر ہو گئے تھے اور اب ان کی پالیسی میں بھی تبدیلی کے آثار نمایاں ہو چلے تھے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۶۸۹ء میں سر جان چائلڈ کی زبان سے ایک موقع پر بدیں لہجہ میں یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ اب سے اگر دیسی لوگ حملہ آور ہوں گے تو وہ بھی ان کا جواب دیگا۔ عجیب لطف کی بات ہے جو تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ عین انہی ایام میں خود انگلستان کو اطمینانی حالت نصیب نہ تھی۔ نو آبادی امریکہ کے جدا ہو جانے کا اعلان ہو چکا تھا نپولین کی جنگیں لڑی گئی تھیں آزادی و مساوات، استبداد و حریت کی باہمی آویزشیں جاری تھیں، باشندوں کی غربت و خستہ حالی اور زراعت پیشہ جماعت کے آپس میں تنازعات و فسادات۔ زمینداروں و نوابوں (لارڈوں) کی سختگیریوں اور خود بادشاہ و رعایا کے درمیان حقوق ستانی اور حقوق طلبی کی جد و جہد مدبرین برطانیہ کو فکر مند بنانے کو کچھ کم نہ تھے فی الحقیقت اس کو ایک معمہ کہہ سکتے ہیں کہ اسقدر الجھنوں میں پھنسکر بھی اتنی بڑی عظیم الشان سلطنت اس قوم نے کیونکر قائم کر لی۔ بادی النظر میں اس کامیابی کا راز اس فوقیت میں پنہاں نظر آتا ہے جو انگلستان کو اپنے آئین نظام حکومت و جمہوریت نواز انسٹی ٹیوشنوں کی بدولت جملہ ممالک عالم پر حاصل تھا گو اس وقت اس نظام میں بنہایت خامیاں موجود تھیں تاہم پھر بھی دوسرے ممالک کے طرز حکومت سے بلحاظ آزادی پروری بسا غنیمت تھا

کمپنی کے ملازمین اور کارکنوں کا کیا طرز عمل رہا اور انہوں نے کن کن ترکیبوں، چالبازیوں اور حکمت عملیوں سے دیسی راجاؤں اور حکمرانوں کی کوتاہ نظریوں اور سادہ لوحیوں اور بسا اوقات اپنے اقتدار کے زعم اور طاقت کے بل پر فائدہ اٹھا کر اپنی مطلب براری کی اور محض سوداگر کی حیثیت میں رہ کر ۱۷۵۰ء میں کمپنی نے اپنا پہلا گورنر مقرر کر دیا اس دلچسپ اور عبرت زا حکایت کو بخوف طوالت ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ ایک عرصے تک دو رقیب یعنی فرانس اور انگلینڈ بغرض حصول "فوقیت" دیسی ریاستوں کی امداد کے پردے میں قسمت آزما رہے لیکن کرنیل کوٹ نے میدان واندیواش میں فرانسیسیوں کے بڑھے ہوئے حوصلوں پر ۱۷۶۰ء میں ہمیشہ کے لئے سرو پانی ڈالدیا گو مورخین ۲۳ جنوری ۱۷۵۷ء کو جبکہ کلایو نے اپنے "محب صلبی" نواب سراج الدولہ کو مقام پلاسی میں شکست دیکر کم از کم صوبہ بنگال میں اپنی قوم کی دھاک بٹھا دی تھی۔ یوم الفتح قرار دیتے ہیں۔ کلایو نے کن کن ترکیبوں اور چالوں

سے سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا اسکے انکشاف کے واسطے صفحات تاریخ مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔ باقاعدہ عہدناموں کی وقعت "ردی کاغذ" کے برابر بھی نہ سمجھی جاتی تھی آج ایک عہدنامہ لکھا گیا اور کل اسکو شکست کر ڈالنے میں باک نہ تھا۔ کلایو کے بعد وارن ہسٹینگ کی کارگزاریاں بھی نہایت "درخشاں" رہیں۔ اودہ کی بیگمات کے واقعات، بادشاہ دلی کے محاصل کا انسداد روہیلوں پر شجاع الدولہ کی یورش ایسے واقعات ہیں جن کے جوابات تاریخ کے مختلف پیرایوں میں مل سکتے ہیں انکو تفصیلی طور پر بیان کرنا ہمارے دائرۂ عمل سے باہر ہے تاہم اڈمنڈ برک کی اس تقریر کا مختصر سا اقتباس جو مسٹر موصوف نے وارن ہسٹینگ پر ملامت کا ووٹ پاس کرنیکی تجویز پیش کرتے وقت دارالعوام برطانیہ میں کی تھی۔ دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوجاوے کہ ہر قوم میں ہر وقت حق گو لوگ موجود رہے ہیں۔ وہ اقتباس یہ ہے:۔

"میں اسپر (وارن ہسٹینگ) لعنت کرتا ہوں ایوان پارلیمنٹ کے دیوان عام کے نام سے جسکا اعتماد اس نے زائل کر دیا ہے میں اسپر لعنت کرتا ہوں قوم انگلش کے نام سے جس کی دیرینہ عزت اس نے خاک میں ملادی ....
آخر میں خود فطرت انسانی کے نام سے ہر دو طبقہ ذکور و اناث کے نام سے ہر زمانہ کے نام سے میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر جو ہم سب کا دشمن اور سب پر ظلم کرنے والا ہے"

گورنر جنرل وارن ہسٹینگ کے بعد بہت سے گورنر جنرل آئے جنگیں بھی جاری رہیں مقبوضات برطانیہ میں اضافہ ہوتا رہا معاہدات تحریر ہوئے اور حسب موقع و ضرورت شکست کر دئے جاتے تھے تاآنکہ شہر میرٹھ کے افق پر بتاریخ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ایک ایسا خونی آفتاب طلوع ہوا جس نے لکھوکھا بندگان خدا اور فرزندان مادر ہند کو دن دوپہر قتل و غارت کا خون افشاں کفن پہنا دیا جہالت نہایت ہی بری شے ہے پر اسی جہالت کا کرشمہ تھا کہ میرٹھ کے ایک کنوئیں پر پانی بھرنے والے ایک سپاہی کی زبان سے دھوکے کے مبہم الفاظ نکلتے ہی دیسی فوج میں تمرد و طغیان کا آتشکدہ بھڑک اٹھا کاش کہ رعایا تعلیم یافتہ ہوتی تو یہ کلنک کا ٹیکہ فرزندان ہند کے ماتھے پر نہ لگتا یا آخیر جو شدنی تھی وہ ہو کر رہی سپاہیوں کی سرتابی ختم ہوئی دربار الہ آباد میں یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کا اعلان

شاہی پڑھا گیا جس کو ہم اپنی آزادی کا وثیقہ یا قبالہ جو کچھ کہئے سب کچھ کہہ سکتے ہیں جس کے حسب ذیل
الفاظ خاص طور سے یادگار بن گئے ہیں:-

"ہماری یہ بھی مرضی ہے کہ جہانتک ممکن ہو ہماری رعایا کے کل افراد چاہے وہ کسی نسل
یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں کو بلا رو رعایت اور بغیر جنبہ داری کے ساتھ اعلیٰ سے
اعلیٰ مناصب پر فائز کیا جاویگا جس کے فرائض وہ اپنی استعداد علمی قابلیت اور سائنتہ
ایمانداری کے ادا کرنے کے لائق ہوں گے۔ ان کی خوشحالی اور مرفہ الحالی سے ہم
قوی ہوں گے ان کی قناعت ہمارے تحفظ کا باعث ہوگی ان کی شکرگذاری
اور امتنان سے ہمکو بہترین صلہ ملیگا"

اس تاریخ سے ہندوستان کی عنان حکومت براہ راست تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آگئی۔ گورنر جنرل
کو وائسرائے یعنی نائب السلطان کی خدمت بھی تفویض ہوئی اور کمپنی کا خاتمہ بالخیر ہوا

عزیز اسیونی

المذہب

رسالہ **المذہب** دفتر رسالہ تمدن ٹیا محل دہلی سے زیر ہدایت جناب **قاری محمد سرفراز حسین صاحب**
عزمی دہلوی (مشنری اسلام) سیاح جاپان و انگلستان و برہما وغیرہ اور محمد عباس حسین قاری
اڈیٹر تمدن و قوم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں ایسے مضامین درج ہوتے ہیں جنمیں
مذہب کی خوبیاں فلسفہ۔ سائنس اور دیگر علوم مروجہ کی رو سے بیان کیجاتی ہیں۔ اور **تعصب**
فرقہ بندی اور دل آزاری کی رکیک باتوں سے قطعاً احتراز کرکے خلوص کے ساتھ کوشش کیجاتی
ہے کہ جدید معلومات کی روشنی میں عقل اور نقل کو جمع کرکے انسانوں میں اعلیٰ روحانی اور اخلاقی
جذبات پیدا کئے جائیں۔ محاسن و فضیلت اسلام کا ظاہر کرنا اس رسالہ کا ممتاز فرض ہے مگر دیگر مذاہب کی
خوبیوں سے ہرگز ہرگز چشم پوشی نہیں کیجائیگی اور جملہ ادیان و ملل کے ساتھ کامل انصاف کیا جاتا ہے مدعا
یہ ہے کہ فیشن اور عام تعلیمات کے مشاغل میں جو بعض نوجوان مبتلا ہوکر مذہب کی روحانی برکات سے
محروم ہو چلے ہیں اور اسکی مقدس تاریخ انکی خاندان اور آل اولاد پر مرتب ہوتے ہیں انکو دلنشین مذہب کی
[illegible] رسالہ کا حجم فی الحال ۴۸ صفحہ ہوگا اور قیمت سالانہ
[illegible]

ہمارے کرۂ ارض کی قدامت

روایت اور سائنس کا فیصلہ

یہ زمین جس پر ہم رہتے اور چلتے پھرتے ہیں، کیا ہے؟ یہ زمین جسے قدیم ہندوؤں نے دھرتی ماتا کا نام دیا تھا، یہ زمین جس نے حضرت انسان کی راحت اور آسائش کے لئے طرح طرح کے سامانوں کا گوناگوں فرش بچھا دیا ہے، کیا ہے؟ اس کی حقیقت اور اس کی اصل کیا ہے؟ یہ کب سے ہے؟ کیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہے جیسی ہم اسے روز دیکھتے ہیں اور کیا ہمیشہ تک یونہی برقرار چلی جائیگی؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب ایک رسالہ کے مضمون میں ہم پہونچانا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔ بحث بالتفصیل کا امکان نہیں۔ اس لئے اجمالی تذکرہ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ یہ امید لگانا لاحاصل نہ ہوگا کہ اس سے ناظرین کی دلچسپی میں کافی اضافہ ہوگا۔

زمین کی ابتدا از روئے ہیئت

ہماری کرۂ ارض کوئی ایسی ویسی شے نہ تھی جس کی صورت بنی آدم کی توجہ کو اپنی طرف مائل نہ کرتی۔ جب انسان صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا اور مظاہر قدرت اور موجودات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جن واقعات اور اشیاء کا ذہن پر گہرا اثر ہوا۔ ان کی نسبت اس کا تخیل اشتعال پذیر ہوا جس کے سبب سے کسی نہ کسی قسم کا تصور قایم ہوگیا۔ ہم اسے روایت کے نام سے پکاریں گے۔ زمین کی ابتدا کی نسبت جاہل اور اہل علم قوموں میں مختلف قسم کی روایات رائج ہوئیں اور اب تک وحشیوں میں رائج ہیں۔

عالموں نے ان جنگلی قوموں کے رسم و رواج اور خیالات معلوم کئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سی وحشی قوموں کے درمیان یہ عام روایت ہے کہ زمین پانی کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔ آفرینش عالم سے پہلے ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔ یہ خیال کئی مہذب قوموں کی مذہبی کتابوں میں بھی کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے سرخ رنگ اصلی باشندوں کی روایات اس سے کچھ مختلف ہیں۔

نیوزیلینڈ کے اصلی باشندے جو ماؤری کہلاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدا میں تاریکی ہر جگہ محیط تھی عالم
نیستی سے ثبت ہوا تھا۔ ناروے کے پرانے باشندوں میں یہ روایت مروج تھی۔ کہ ابتدائے عالم میں
ایک نہایت تاریک۔ غیر محدود بے تھاہ گڑھا تھا اور برفانی پہاڑی ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ کئی قوموں میں
بعض کی روایت ہے یعنی شروع میں عالم بیضہ کی حالت میں تھا۔ اس سے آہستہ آہستہ جاندار وجود پذیر
ہوئے۔ جیسے انڈے کے اندر سے چند ہفتے کے بعد چوزہ نکل آتا ہے۔ قدیم زمانہ کی متمدن اقوام جیسے
اہل مصر۔ اہل فنشیا۔ اہل بابل۔ اہل اسوریہ۔ چین۔ جاپان۔ یونان۔ روم۔ ہندوستان کے خیالات مختلف
ہیں مگر ان میں کسی قدر مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور مذہب سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان
قدیم اور یونان میں نوع زمین کی ابتدا کا مسئلہ مشاہدہ اور تخیل دونوں طرح سے حل کرنے کی کوشش کی گئی
تھی۔ یہاں پر ان کا ذکر نہیں ہو سکتا کیونکہ عدم گنجائش کے سبب ہم مجبور ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جن قوموں
نے تمدن میں ترقی کی تھی۔ ان کے ہاں مذہب بھی تھا۔ اور فلسفہ بھی۔ اور ان دونوں نے کرۂ ارض کی ہستی
کی نسبت خامہ فرسائی کی ہے۔ مثلاً ہم ویدوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کے اندر کئی جگہ آفرینش عالم کا ذکر ملتا ہے
پھر جب اپنشدوں کی طرف رجوع لاتے ہیں۔ تو وہاں پر حکیمانہ خیالات دکھائی دیتے ہیں۔ درشنوں میں
زیادہ منطقیانہ اور عالمانہ خیالات ملتے ہیں۔ اور جب پرانوں یا براہمنوں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں کے
بے سر و پا باتوں کا ذخیرہ ملتا ہے جو وہم و گمان کی بلند ترین اوج کی گرفت سے بھی بعید معلوم ہوتی ہیں
یہی حال قدیم یونانی لٹریچر کا ہے۔ جہاں افسانے۔ علمی مباحث۔ اور فلسفیانہ خیالات پہلو بہ پہلو پائے
جاتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کا تماشا بعض قدیم متمدن قوموں کی کتب مقدسہ میں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں پر
ایک امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یونانی مورخ حکیم ڈیوڈورس بیان کرتا ہے۔ کہ یونان کے عالموں
کا ایک گروہ دنیا کی ابتدا اور انتہا دونوں سے منکر ہے۔ مسلسل اور ہمیشہ سے آباد مانتا تھا۔ یہی خیال
ہندو فلاسفروں کا بھی ہے۔ جسے اس زمانہ میں سوامی دیانند جی نے خاص شہرت دی۔ کیونکہ
ہندو جمہور ہر قسم کے خیالات کو جو بالعموم باہمدگر نقیض اور متضاد ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ بعض یونانی
عالموں کے خیالات اس زمانہ کے سائنسی خیالات سے بہت مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً
انکساغورس کا بیان ہے "ابتدا میں ہر شے ٹھہری ہوئی تھی۔ پھر حرکت پیدا ہوئی۔ پھر تبدیلی ہو گئی۔ جوں
جوں برودت بڑھتی گئی۔ کہرہ بادل سے پانی اور پانی سے مٹی اور خشکی سے پتھر بنے" ہیراقلیطوس

نے موجودات کا اصل اصول آگ قرار دیا تھا۔ انکسیمنس نے سب کا مبدا ہوا قرار دی تھی علی ہذا۔

جدید سائنس کا حکم

وحشی قوموں کے خیالات محض بچوں کی کہانیاں ہیں۔ قدیم قوموں کے خیالات میں بہت معقولیت
ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ لیکن اسلاف نے علوم و فنون میں اس قدر ترقی نہیں کی تھی جیسی
اس زمانہ میں علوم تجربیہ کے وسیلہ سے ہوئی ہے۔ اگر کوئی نظریہ ہے۔ تو اس کی صحت کی تصدیق
کی جاتی ہے جس کے لئے ہر قسم کے سامان اور آلات موجود ہیں۔ ترکیب اور تجزیہ کا طریقہ بہت
معقول ہے جس سے سائنس کی سچائیوں کو جانچا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے تحقیقات کے نتائج قابل
اعتبار قرار پاتے ہیں۔ وہ اہل سائنس کے دعاوی بھنگڑوں، ہوشیبوں کی گپوں سے زیادہ
وقعت اور لحاظ کے مستحق قرار دئے جائیں۔ اگر قدیم زمانہ میں کوئی حکیم یا عالم ذکاوت طبعی کی اپج کے
باعث کوئی بات معلوم کر کے کسی کتاب میں لکھ دیتا۔ تو اس کی صحت کی نسبت شک ہوتا کیونکہ حق ناحق
میں امتیاز کرنے کے معیار سے متقدمین محروم تھے۔ وحشی روائتوں اور پرانے فلسفیانہ خیالوں کے
بعد زمانہ حال کے سائنس کی تحقیقات کا نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ اس نے زمین کی ابتدا۔ موجودہ حالت
دریافت۔ اور اس کی فنا کی بابت کیا حکم دیا ہے۔

مسئلہ سحاب ساکنین عالم بالا کی ابتدا کی نسبت فی زمانہ اہل سائنس اور ارباب تحقیق
مانتے ہیں۔ کہ وہ سحاب سے بنے ہیں۔ دسمبر یا اگست کی اندھیری راتوں
میں جبکہ آسمان بادلوں سے صاف ہو۔ جو بیشمار تارے جگ مگ جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ
سب کے سب عالمین افلاک ہیں۔ ہر ایک تارہ بجائے خویش ایک دنیا ہے۔ ہمارا سورج ایک ہے
مگر اس کی طرح خلا میں کروڑوں نہیں اربوں آفتاب ہیں۔ اور پھر ہر ایک سورج اپنے نظام شمسی کا
مصدر و مرجع ہے۔ خلا غیر محدود ہے۔ مگر اس کے اندر جہاں تک دوربین کی پہونچ ہے۔ ستارے
اور سیارے نظر آتے ہیں۔ بعض اتنے بڑے بڑے ہیں کہ ہمارا نظام شمسی ان کی طرف بذریعہ
چلا جا رہا ہے۔

ہلکشاں ہے جو صاف رات میں ایک سپید شرک دکھائی دیتی ہے۔ وہ کروڑ آفتاب ہیں۔ ہمارا

سورج بھی عظیم الشان مجمع سماوی میں ایسا درجہ رکھتا ہے جیسے لاٹ صاحب کے دربار میں تعلقہ دار۔
بعض عالموں کا خیال ہے کہ خلا میں ایسے ایسے ایک ارب سورج ہیں۔ اور ایک ارب سورج تاریک
یعنی مردہ سمجھے جاتے ہیں۔ جو شتر بے مہار کی طرح خلا میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی
ایک دوسرے سے ٹکرا کر نابود ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نظام شمسی کے پاس جو قریبی ستارہ
الفا سنتاوری ہے۔ وہاں سے روشنی دو لاکھ فی سکنڈ کے حساب سے چار سال میں ہمارے
ہاں پہونچتی ہے۔ یہ فاصلہ بیس ٹریلین یعنی دو کھرب میلوں سے بھی زیادہ ہے۔ کہکشاں سے بعید ترین
تاروں کی روشنی ہماری زمین پر آٹھ ہزار برسوں میں پہونچتی ہے۔ نزدیک ترین ثابت یعنی ستارہ قائم
ہمارے کرۂ ارض سے (۲۰۰۰۰۰۰۲۴۰۶۶۳۷۷۶۴) میل دور ہے۔ پھر ملکۂ بے کنارہ میں
کہکشاں محض ایک جزو ہے۔ وہ مجموعۂ ستارگان کتنی دور اور کیسا خوفناک ہوگا۔ جو سورج مع
اپنے متعلقین کے ہزاروں برسوں سے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ بعض اسے ہرقلیس اور بعض اسے
ویگا نام سے پکارتے ہیں۔ اجرام فلکی جن میں ستارے سیارے شہاب ثاقب دمدار تارے
چاند اور سورج وغیرہ وغیرہ سبھی شامل ہیں سفید سحاب سے بنے ہیں۔ جس کی وجہ سے عالموں نے
ایک نظریہ قائم کیا ہے۔ اور اس کی صحت کی تائید اسپکٹرواسکوپ کے وسیلہ سے ہو چکی ہے جو
نیبولر ہائی پاتھیسس یعنی مسئلہ سحاب کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جملہ ساکنین خلا
زندہ اور مردہ۔ تاریک اور روشن۔ نیبولر یعنی درخشاں سحاب سے بنے ہیں۔ نیبولر لاطینی لفظ
ہے جس کے معنی کہر، شب، دود۔ سمجھ لیجئے ہلکی کثافت ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا وہ دوم جو جاڑے
کے موسم میں صبح کو آپ کے منہ سے نکلتا ہے۔ یہ لطیف درخشاں مادہ ہے جو آسمان
میں جابجا موجود ہے۔ بعض حالتوں میں یہ برہنہ آنکھ سے نہیں دیکھ سکتی۔ فوٹو کے ذریعہ بھی
بمشکل اس کا پتہ لگتا ہے۔ اگر آسمان پر بادل نہ ہوں تو رات کے وقت دو بڑے سحاب نظر آتے
ہیں۔ ایک تو جو ہے وہ کنستر میں اور دوسرا اندرومیڈا میں ہے۔ یہ دونوں لاکھوں میلوں میں پھیلے
ہوئے ہیں۔ دوربینوں کے وسیلہ سے آسمانوں میں پانچ لاکھ سحاب کے ڈھیر دیکھے گئے ہیں
بعض گول چکر دار ہوتے ہیں بعض بے قاعدہ۔ بعض چھوٹے انڈے کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی
شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ اس شاندار سلسلہ کی جو تاریخ ہے وہ [illegible] ہوئے ایک عجیب

کے فلکی عالم جیمز فرگیوسن نے ایک خط میں پہلے پہل اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ بعد ازاں مشہور
جرمن فلاسفر عمانوئیل کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں یہ رائے دی تھی۔ کہ عالم ایک قسم کے منور اور درخشاں
سحاب سے رفتہ رفتہ وجود پذیر ہوئے۔ سوا سو سال کا عرصہ گذرا کہ فرانس کے ایک مشہور محقق
لاپ لاس نے نظام شمسی کے رخ گردش اور نیز اس امر سے کہ ایک ہی خط میں سب سیارے
طواف کرتے ہیں گمان کیا کہ یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔ بہت سوچنے اور مشاہدہ کرنے کے بعد اس نے
یہ قرار دیا "تمام سیارے کسی روشن دخانی مادہ سے بنے ہیں۔ جو ابتدا میں نہایت گرم تھا۔
کشش کے عمل سے اس کے اندر حرکت پیدا ہوگئی جس سے حرارت خارج ہونے لگی۔ درخشاں
سحاب کا انبار سکڑنے لگا۔ آخر کار اس نے ٹھوس صورت اختیار کر لی۔ اور وہ اصل مأخذ
سے الگ ہو گیا۔ اسی طرح کرّے بنتے چلے گئے۔ سورج بھی اسی طرح بنا تھا۔ بلکہ عمل انقباض جاری
ہے جس سے وہ ذرا ذرا سکڑتا جاتا ہے"

برطانیہ کے مشہور فلکی محقق سر جان ہرشل نے عرصہ تک بذریعہ دوربین آسمانوں کا
مشاہدہ کیا۔ اجرام فلکی کے تبدلات دیکھے۔ منور گیس (سحابیہ) کے بھی بیشمار تودے دیکھے
پھر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ستارے سفید سحاب سے بنے ہیں۔ بلکہ نئے ستارے روشن سحاب
کے انباروں کے اندر ابتدائی منزل میں دیکھے گئے۔ اس مسئلہ کی رو سے ہمارا نظام شمسی
بھی کسی عظیم الجثہ انبار سحاب سے وجود پذیر ہوا ہے جس کا مرکز سورج ہے۔ باقی سیارے
اس کے بیرونی چکر سے رفتہ رفتہ کٹ کر الگ ہو گئے۔ بڑے ٹکڑوں سے بڑے بڑے سیارے
بنے جیسے برہسپت یا مشتری ہے۔ اور چھوٹے ٹکڑوں سے چھوٹے بنے ہیں جیسے منگل (مریخ)
ہے۔ پھر ہر ایک سیارہ سے بذریعہ شمسی کشش اور ٹکڑے کٹ کر جدا ہو گئے۔ جو ان کے چاند بنے
جیسے مشتری کے آٹھ اور ہمارے کرہ ارض کا ایک منور اور ایک تاریک چاند ہے۔ علاوہ ازیں
ان کی کترن سے وہ ننھے ننھے سیارے بنے جو سیارگان خورد کے نام سے مشہور ہیں اور
کئی بہتیرے ٹکڑے ابھی آوارہ گھومتے پھرتے ہیں۔ سحاب کا یہ تودہ کتنا بڑا تھا۔ جو ہمارے
سورج اور اس کے فرمانبرداروں کا جسم داتا بنا تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ نظام
شمسی کا دربان سیارہ نیپچون سورج سے دو ارب اناسی کروڑ میلوں پر پہرہ دیتا ہے

یوں سمجھ لو کہ اس کا ایک سرا مرکز سے تین ارب میلوں پر تھا۔ آفتاب اراکین نظام شمسی سے چھ سو گنا بڑے ہے اور زمین سے ساڑھے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ ۱۸۸۹ء میں پروفیسر سر جارج ڈارون نے جو غیر فانی محقق چارلس ڈارون کے خلف رشید ہیں۔ یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ لاکھوں برس پہلے چاند اور زمین ایک ہی سحاب کے تودے کے اجزا تھے۔ اس وقت کرۂ ارض کا مخرج اپنے محور پر تین چار گھنٹے کے درمیان گردش کرتا تھا۔ زمین منور گیس کی صورت میں تھی

مسئلہ شہاب ثاقب

عالم کی ابتدا کا دوسرا مسئلہ شہاب ثاقب کا نظریہ کہلاتا ہے۔ اس کے بانی برطانیہ کے مشہور فلکی ماہر سر نارمن لاکیر ہیں۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ اجرام فلکی شہاب ثاقبوں کے ارتباط اور اجتماع سے وجود میں آئے ہیں۔ اور شہاب ثاقبوں کی بابت یہ خیال ہے کہ وہ خلا کے ہر حصہ میں بکثرت موجود ہیں عالموں کا ایک گروہ یہ مانتا ہے کہ آسمانوں پر اتنے شہاب ثاقب ہیں کہ انکا شمار وہم و گمان سے دور ہے۔ مگر اس نظریہ کو قبول عام کا فخر نصیب نہیں ہوا ہے۔ مسئلہ سحاب سب سے زیادہ مشہور اور معقول سمجھا جاتا ہے۔

سحاب کی ابتدا

شاید سوال پوچھا جائیگا کہ سحاب یا منور گیس کہاں سے آگئی اس کی نسبت دو بڑے خیال ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ کون و فساد کا سلسلہ غیر متناہی ہے۔ ایک طرف موجودات بنتی ہیں۔ اور دوسری طرف بگڑتی ہیں آسمانوں میں یہ سبیل ابتدا سے جاری ہے۔ اور آئندہ برابر چلا جائے گا۔ یہ تماشا اس وقت بھی ہو رہا ہے جو دوربینوں کے ذریعے بخوبی نظر آتا ہے۔ سحاب کے ڈھیروں سے تارے بنتے جاتے ہیں۔ ادھر کہنہ تارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر نابود ہوتے جاتے ہیں مثلاً سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک نیا تارہ یکایک دکھائی دیا۔ دوربینوں کے مشاہدہ سے اس کی سطح پر بہت تزلزل اور تہلکہ معلوم ہوا گویا کوئی عظیم انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ پھر وہ رفتہ رفتہ دھندلا ہوتا گیا۔ اور اس کی جگہ پر سحاب کا ڈھیر نظر آنے لگا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک اور نیا تارہ دکھائی دیا۔ بہت روشن تھا۔ پھر وہ جلدی جلدی بڑھنے لگا۔ بعد ازاں اس کی روشنی سحاب کی مانند معلوم ہونے لگی۔ پھر سحاب اپنے ہاتھ پیر نکالنے لگے۔ ظاہر ہوا کہ یہ کوئی مردہ تارہ تھا جس کی ٹکر جب ایک اور مردہ سے لگی۔ تو اس کی کایا پلٹ گئی۔ اسی طرح سحاب سے ہمارا نظام شمسی بنتا اور بگڑتا رہتا ہے

یہ نظریہ امریکہ کے دو عالموں مولٹن اور چیمبرلن نے پیش کیا تھا۔ دوسرا خیال شکاگو کے پروفیسر ستی نے ظاہر کیا تھا۔ اس کے رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ ستاروں سے جو منی جھڑتی ہے وہ ننھے ذروں کی صورت میں خلا میں پھیلتی رہتی ہے۔ یہ تو امر مسلمہ ہے کہ آفتاب سے اس قسم کے ذرے خارج ہو ہو کر پھیلتے رہتے ہیں۔ مداروں کی منی انہیں ذروں سے بنتی ہیں۔ درخشاں سحاب بھی انہی کا مرکب ہوتا ہے۔ اسے وہ "گرد سمادی" کے نام سے پکارتے ہیں کشش اتصال سے یہ ذرے ایک دوسرے سے ربط پکڑتے ہیں۔ ان کے تودے کے اڑتے پھرتے ہیں اور جب ایک کا دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے تو ان کے اندر عکس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے مکرر مادہ سحاب پیدا ہو جاتے ہیں۔

کرۂ ارض کی ابتدا اور اسکی سرگذشت

مسئلہ سحاب کی رو سے یہ امر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ارکان نظام شمسی ایسی عظیم درخشاں سحاب سے وجود پذیر ہوئے تھے۔ کرہ ارض بھی ارکین شمسی کا ایک ادنی رکن ہے۔ اسی وجہ سے یہ بھی منور گیس یا سحاب سے بنی۔ سحاب کے اندر اسپکٹروسکوپ سے گیس منجمد اور رقیق اجزا پائے گئے ہیں۔ گیس میں ہیڈروجن۔ ہیلیم اور ایک اور نامعلوم گیس پائی گئی ہے۔ جو نبولیئم کے نام سے مشہور ہے۔ یہی اجزا اور اجرام فلکی میں بھی پائے گئے جس سے مسئلہ سحاب قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔ زمین کا ہیولیٰ (سحاب) تیس چالیس میل فی سکنڈ کی رفتار سے گردش کیا کرتا تھا۔ کرہ ارض کئی منزلوں سے گزری تھی۔

پہلا مرحلہ

ہماری کرۂ ارض باقی سیاروں کی طرح کسی عظیم الوسعت انبار کے سحاب کا ٹکڑا ہے جس کا مرجع اور مرکز آفتاب ہے۔ کرۂ ارض کا ابتدائی مادہ ایسا تھا جیسے کھولتا ہوا سیسہ ہوتا ہے اور بڑی تیزی سے گھومتا تھا۔ اس کا ہوائی کرہ بہت عمیق تھا اس کا ایک حصہ بعد ازاں منجمد ہو کر پانی بن گیا۔ اس کی بیرونی سطح بالکل غیر معین تھی۔ اور آفتابی کشش کے سبب سے ارضی سمندروں میں سخت ہلچل پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ دھاتیں اور چٹانیں گھلے مادہ کی صورت میں ایسی تھیں جیسے کسی بڑی دیگ میں کھچڑی پکتی ہے۔ آتش فشانوں سے رات دن لاوا بہہ بہہ کر ندیاں بن گئی تھیں۔ خوفناک طوفان آیا کرتے تھے۔ جس سے سطح زمین کی کایا پلٹ

جایا کرتی تھی۔ سمندر اس طرح کھولتے تھے جیسے کڑھائی میں تیل اُبلتا ہے اور ان میں طلاطم بخش
مینہ کی بجائے شہاب ثاقبوں کی بارش ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ بجلی چمکتی تھی اور رعد آتش فشانوں
کے ہم آہنگ ہو جایا کرتی تھی۔ یہ منظر کیسا بھیانک ہوگا۔ وہاں پر کسی جاندار کی زندگی کے سہارے
کے سامان نہ تھے۔ مشتری (جوپیٹر) اور بعض دیگر سیاروں کی موجودہ حالت بہت کچھ کرہ ارض
کے ابتدائی مرحلہ کی مانند دیکھی گئی ہے۔ گاہے بگاہے کشش آفتابی کے خوفناک جھٹکوں سے سمندر کی
سے لہریں اٹھتی تھیں۔ جو خشکی کے ٹکڑوں کو جو فلزات کی بھٹی میں تیار ہو رہے تھے۔ غرق کر جاتی تھیں
کوئی اسی قسم کا ہولناک صدمہ تھا جس کے سبب سے زمین کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا جس سے
بعد ازاں چاند بنا۔ یہ واقعہ ساڑھے پانچ یا پونے چھ کروڑ سالوں کا ہے۔ چاند میں بھاپ اور گیس
تھیں جن کا دباؤ پانچ ہزار پونڈ فی مربع تھا مگر جیسے جیسے وہ زمین سے دور ہٹتا گیا ویسے ہی دباؤ بھی
کم ہوتا گیا۔ ابد ہم کی طرح بھک سے اُڑ جانے والے مصالح کا گولہ معلوم ہونے لگا۔ امریکہ کے پروفیسر
پکرنگ کا یہ خیال ہے کہ بحر الکاہل کا جو رقبہ ہے وہی جگہ ہے جہاں سے چاند کٹ کر جدا ہوا
تھا۔ اس سے دو حصے بنے جو اب نئی اور پرانی دنیا کہلاتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ

جب چاند کٹ کر الگ ہو گیا تو زمین ٹھوس ہونے لگی۔ اس وقت اس کی سطح پر
(۱۱۰۰۰) کی حرارت از روئے سنٹی گریڈ تھی۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ
سطح زمین پر جو خطے بھاری اور ہلکے دباؤ والے ہیں۔ وہ چاند کی بدولت بنے تھے۔ گڑھے اور
بلندیاں بھی اسی سے بنے ہیں۔ اس کی بابت عالموں کا خیال ہے کہ یہ چار کروڑ برس کا واقعہ ہے
کرہ ارض کی حرارت بہت خارج ہو گئی اور اس کا ٹمپریچر (۳۷۰) سنٹی گریڈ پر آ گیا۔ کرہ ہوا میں
جو بخارات تھے وہ رقیق ہونے لگے۔ اور اس سے بعد ازاں سمندر تیار ہوئے۔ گرم پانی گڑھوں
میں جمع ہونے لگا جو گردش سے بنے تھے۔ سطح پر جو سلی کیٹ تھے ان کے ساتھ مل کر پانی
کھاری ہو گیا۔ اسی طرح اور انقلابات واقع ہوئے اور طبقات ارضیہ بنتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ
زمین نے موجودہ صورت پکڑ لی۔ اس وقت اوپر کرہ ہوا اور اس کے نیچے تختۂ زمین ہے اور
اس کے اندر ایک اور حصہ ہے۔ جسے کسی خاص نام سے پکارنا دشوار ہے۔ کرہ ہوا چالیس
پچاس میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور تختۂ زمین کی موٹائی چالیس پچاس میل قرار دی جاتی ہے

شکم زمین کی نسبت محض قیاسات ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہاں پر بعید حرارت ہے اور فلزات رقیق صورت
میں پائی جاتی ہیں۔ جس کے ثبوت میں آتش فشانوں کا مادہ لاوا اور رقیق اشیاء پیش کی جاتی
ہیں۔ بعض کا کچھ اور خیال ہے۔ بعض کا یہ بھی گمان ہے کہ اس کرۂ ارض کے اندر ایک اور گولہ
ہے۔ گویا زمین کے اندر دوسری زمین ہے۔ اسی قسم کے دوسرے خیالات ہیں جن کی تشریح
بخوف طوالت آئندہ کے لئے اٹھا رکھنا پڑتی ہے۔ تختۂ زمین کی بہت چھان بین کی گئی ہے مختلف
طبقات معلوم ہوئے جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کا دل اور انکی عمر کا بھی
اندازہ کیا گیا ہے۔ طبقات ارضیہ سے نباتات اور حیوانات کے آثار بھی نکلے ہیں جن کی بنا پر
یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ کب پیدا ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اور دلچسپ باتوں کو نظر انداز
کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے مضمون کی اصل غرض ان تفصیلوں میں الجھنا نہیں ہے۔ اگرچہ
باتیں جو ان کی گئی ہیں تو اس مقصد سے کہ انکا بالواسطہ مسئلہ زیر غور سے واسطہ ہے۔

زمین کی عمر

اس کی نسبت عالموں نے طرح طرح کے اندازے لگائے ہیں۔ جو زمانہ زمین
کی عمر کا قرار دیا ہے۔ اس کی بابت ان کا باہم گر سخت تناقض ہے۔ سب
اپنی اپنی گاتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ محض گمان ہے۔ اور اس پر بھروسہ رکھنا شیوۂ
دانشمندی نہیں ہے۔ اگر کوئی گروہ سائنس دانوں کا اس گمان کو اپنے کسی عقیدہ کی تائید
میں پیش کرتا ہے تو وہ سخت مغالطہ میں ہے۔

زمین کی قدامت کی بابت جو خیالات اس وقت ہیں وہ تین قسم کے عالموں کے ہیں۔
(۱) عالمان ریاضیات (۲) عالمان ہیأتی (۳) عالمان طبعیات اور ان تینوں کے اندازے اور
استدلال استخراج جداگانہ ہیں۔ طبقہ (۱) کے عالموں نے چٹانوں کی موٹائی سے جو ایک لاکھ
فٹ سے لیکر دو لاکھ ساٹھ ہزار فٹ تک موٹی گمان کی جاتی ہے۔ یہ تخمینہ لگایا اور کرۂ ارض کی
عمر دو کروڑ ساڑھے لاکھ سال سے لیکر اڑسٹھ کروڑ سال تک قرار دی ہے۔ دوسرا طریقہ سمندری
پانی کی نمکینی پر مبنی ہے اور اس سے اور قسم کا نتیجہ پیدا ہوا۔ طبقہ (۲) کے محققوں نے انواع
کے ارتقاء سے زمین کی عمر کا تخمینہ کیا ہے [illegible] دو سو کروڑ سال قرار دیتے ہیں۔ بعض اس سے
[illegible]

اپنے خیالات کی رو سے بہت بڑی عمر قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ زمان کو غیر متناہی سمجھتے اور اس سے جتنا جی میں آئے مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر طبقہ (۲) کے عالم ان سے سخت اختلاف رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمان کو قارون کا خزانہ مت سمجھو کہ جس سے جتنا چاہا روپیہ مانگ لیا اور وہ کبھی ختم نہ ہو۔ پروفیسر ٹیٹ اور لارڈ کیلون نے کرۂ ارض اور آفتاب کی اخراج حرارت کی شرح اور بعض دیگر اسباب پر زمین کی عمر زیادہ سے زیادہ دو کروڑ برس قرار دے دئے۔ مگر بعد ازاں چار کروڑ سے لیکر دس کروڑ تک اضافہ کیا مگر جب سے ریڈیم معلوم ہوئی ہے۔ ان خیالات میں بہت بھاری تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمین کی حرارت خارج ہو کر وہ سرد نہیں ہوتی۔ بلکہ ریڈیم کے سبب سے اس کی گرمی ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ لیکن اس بحث سے یہ تو ظاہر ہے کہ زمین کی قدامت کی بابت سائنس دانوں کے خیالات چنڈو خانہ کی گپوں سے زیادہ وقعت کے قابل نہیں اور اس امر میں اہل تحقیق کی ہدایت قبول کرنا اپنی عقل سے دست بردار ہونا ہے۔

ذیل میں مشہور سائنس دانوں کی آراء درج کرکے اس اختلاف کو واضح کیا جاتا ہے۔

پروفیسر رام زے (دس ارب سال)، یوجین دبائے (ایک ارب سال کے قریب) [illegible] (ستر کروڑ سال)، سر چارلس لائل (چالیس کروڑ) چارلس ڈارون (تیس کروڑ) سر آلیور لاج (دس کروڑ سال) سر جارج ڈارون (ڈیڑھ کروڑ) پروفیسر سالس (ساڑھے پانچ کروڑ) [illegible] (دو کروڑ چالیس لاکھ سال)، ڈاکٹر کسترول (دو کروڑ برس) پروفیسر ٹیٹ (ایک کروڑ سال) [illegible] کی عمر قرار دیتے ہیں۔ امریکہ کے ایک اور عالم پروفیسر فرینک ایلین ریڈیم سے [illegible] زمین کی قدامت ڈیڑھ ارب سال قرار دیتے ہیں جرمن سائنس دان [illegible] مختلف طبقات کی عمروں کا تخمینہ کرکے دس کروڑ سات لاکھ برس اندازہ کرتا ہے۔ پروفیسر سولیس ساڑھے [illegible] کروڑ سال [illegible] ہیں۔ اور پروفیسر جالی زمین کی عمر ایک انوکھے اندازہ سے نو دس کروڑ سال کے درمیان قرار دیتے ہیں۔ اخیر میں سر آرچ بالڈ گیکی مشہور ماہر ارضیات کی رائے کا اقتباس [illegible] سائنسی معلومات کی موجودہ صورت میں یہ ہماری طاقت سے باہر ہے کہ کرۂ ارض کی عمر کا کم سے کم زمانہ مقرر کیا جائے۔ مگر ہم اسے دس کروڑ برسوں سے کم نہیں قرار دے سکتے۔ جیسے لارڈ کیلون بھی تسلیم کرنے کو تیار تھے۔" (انسائکلو پیڈیا برٹانکہ گیارہویں ایڈیشن مضمون "جیالوجی")

انسان کی قدامت

کرۂ ارض کی قدامت کے ساتھ انسان کی عمر کا سوال بھی وابستہ ہے۔ سائنسدانوں نے طبقات ارضیہ کے اندر جانداروں کی ہڈیوں سے ترتیب اندازہ کیا ہے کہ پہلے پہل جاندار ستر لاکھ برس ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ انسان کی عمر کا تخمینہ پتھر کے بھدے اوزاروں سے اور نیز پنجروں سے کیا گیا ہے۔ جو طبقات میں پھنسے رہ گئے۔ جیسے کرۂ ارض کی عمر کی بابت اختلاف ہے ویسے ہی انسان کی عمر کی نسبت بھی اختلاف ہے۔ فرانس سے جو پنجر اشیاء برآمد ہوئی تھیں۔ انکی بنا پر یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان وہاں ایک لاکھ برس پہلے رہا کرتا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں جاوا سے ایک انسانی پنجر نکالا تھا۔ جسے ڈارون کی زنجیر گمشدہ قرار دیا گیا۔ یہ پانچ لاکھ برس کا سمجھا جاتا ہے۔

ہیڈل برگ (جرمنی) سے کئی سو فٹ کی گہرائی سے جو پنجر نکلا تھا۔ وہ ڈھائی لاکھ برس کا قرار دیا گیا ہے۔ پلیٹ ڈاؤن (انگلستان) سے جو کھوپڑی نکلی تھی۔ وہ ہیڈل برگ کے پنجر سے مشابہ قرار دی گئی اور اس کا زمانہ ڈیڑھ لاکھ برس تخمینہ کیا جاتا ہے۔

نیانڈرتل (فرانس) سے کچھ انسانی ہڈیاں اور دیگر اشیاء نکلی تھیں جو بن مانس کی ہڈیوں کی سی تھیں۔ وہ آج سے پچاس ہزار برسوں کی سمجھی جاتی ہیں۔

یورپ سے ایک اور قسم کی ہڈیاں اور آثار بھی ملے ہیں۔ یہ پنجر جس نسل کے ہیں۔ وہ کرومیگنان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اوروں سے جن کی ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں۔ تمدن میں بڑھا ہوا تھا۔ اس کا زمانہ آج سے پچیس اور تیس ہزار سال اندازہ کیا جاتا ہے۔

عالموں کا انسانی عمر کی بابت یہ اندازہ ہے کہ کم سے کم بیس ہزار سال اور زیادہ سے زیادہ بیس لاکھ برس کا زمانہ گذرا جب انسان صفحۂ ہستی پر ظاہر ہوا تھا۔ اس سے یہ بھی عیاں ہے کہ سائنس صحت کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا کہ انسان کب سے ہے۔ ایک عالم

[illegible] زنی سے کام

انسان کی عمر بیس ہزار برس سے لیکر ایک لاکھ برس تک سمجھی جاتی ہے۔ بعض اس سے [illegible] آگے جاتے ہیں۔ قصہ کوتاہ کرۂ ارض اور انسان کی عمر کے [illegible] [illegible] اول الذکر کی بابت کثرت رائے اسکی عمر قرار دیتی [illegible] اسی طرح انسان کی عمر بھی

عالموں کی کثیر تعداد بیس تیس ہزار سال اندازہ کرتی ہے۔

دنیا کی بربادی

اب اخیر میں اس سوال پر بھی بحث کرنا مناسب ہے۔ کہ آیا دنیا ہمیشہ یونہی رہیگی۔ یا اس کا خاتمہ بھی ہوگا۔ سائنس کا موجودہ تحقیقات کی روشنی میں یہ فیصلہ ہے۔ کہ یہ دنیا کچھ عرصہ کے بعد برباد ہوجائے گی۔ ہکسلے دنیا کی ابتدا بھی مانتا ہے اور انتہا بھی۔ پروفیسر بالفور اسٹوارٹ لکھتے ہیں "یہ امر یقینی ہے کہ یہ عمل ہمیشہ سے نہیں۔ اور نہ آئندہ جاری رہے گا۔"

ایف ڈبلیو ہٹن کی رائے بھی یہی ہے۔ علاوہ ازیں سائنسدانوں کی کثرت رائے دنیا کی بربادی کی قائل ہے بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا۔ کہ شاید ہی کوئی نامور عالم اس کی تاگزیر بربادی کا منکر ہوگا۔ بعض عالموں کا یہ خیال ہے۔ کہ کچھ عرصہ کے بعد زمین کی کشش ثقل اتنی کمزور ہوجائے گی۔ کہ وہ سطح آفتاب پر گرکر خاک سیاہ ہوجائیگی۔ اس کی بابت یہ گمان بھی ہے کہ جب زمین سرد ہوجائیگی تو لوگوں کے رہنے کے ناقابل ہوگی اور اس کا محور سکڑکر چھوٹا ہوجائیگا۔ تو لامحالہ یہ آفت پیش آئے گی بعض عالم یہ کہتے ہیں کہ کرۂ ہوا کی اکسیجن کم اور کاربانک ایسڈ بڑھ رہی ہے۔ کوئی زمانہ آئے گا کہ جب وہ اتنی بھاری ہوجائے گی۔ کہ ہمارے اوپر گرکر ہمیں دم بخود کردے گی۔ ایک فلکی عالم کا یہ گمان ہے۔ کہ سورج مع سیارگان کے نکنستر ویگہ کی طرف جارہا ہے۔ وہ اثنائے مسافت میں بحر خلا میں کسی نچھپے ہوئے آفتاب سے ٹکر کھاکر برباد ہوجائیگا۔ اور فلکی عالم بھی اسی قسم کا احتمال ظاہر کرتے ہیں کہ خلا میں کروڑوں تاریک آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔ اگر کسی کی آفتاب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ تو پھر اراکین نظام شمسی کی خیر نہیں۔

بعض فلکیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آفتاب سکڑتا اور سرد ہوتا جاتا ہے۔ ایک مشہور جرمن عالم نے یہ رائے دی تھی۔ کہ ستر اسی لاکھ سال کے بعد آفتاب کا منبع حرارت ختم ہوجانے سے اس کے متعلقین برودت سے اینٹھ کر ہلاک ہوجائینگے۔ پروفیسر کلفرڈ نے اسی قسم کا اندیشہ اپنے ایک مضمون میں ظاہر کیا تھا۔ سورج کی حرارت کی کوتاہی سے کرۂ ارض کے جاندار یخ ہوکر مرجائینگے فرانس کے مشہور عالم موسیو فلے مریان نے بھی کچھ اسی قسم کی رائے دی ہے۔ کہ پانی اور اکسیجن

گھٹتی جاتی ہے۔ پہاڑ اور براعظم فرسودہ ہو کر سمندر میں ملتے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کسی نہ کسی زمانہ میں یہ دنیا اسی پانی میں غرق ہو گی جس سے وہ برآمد ہوئی تھی۔ بعض فلکی عالم کہتے ہیں منگل اپنے بڑھاپے کے آخری مرحلہ میں ہے۔ وہاں پر پانی بہت کم ہو گیا ہے۔ یہی حال روز و دنیا کا بھی ہو گا۔ ایک اور گروہ عالموں کا اسی خیال سے یہ کہتا ہے۔ کہ جب پانی پر جا پڑیں گے جس سے روئیدگی اور ذی جان ہستیاں ہلاک ہو جائیں گی۔

نتیجہ

چاہے دنیا قدرتی اسباب قلت آب یا کثرت کاربانک ایسڈ گیس۔ یا یخ کے سیلاب سے برباد ہو یا کسی بھولے بھٹکے مردہ سیارہ سے ٹکرا کر فنا ہو۔ یا کسی دمدار تارے کی دُم کی زہریلی گیس کی جھپٹ میں آ کر ہلاک ہو۔ یہ امر یقینی ہے۔ کہ ایسا واقعہ تھوڑے عرصہ میں واقعہ نہ ہو گا۔ بلکہ کثیر مدت اور زمانہ کے بعد ہی دنیا نابود ہو گی۔ اس وجہ سے ہمیں کسی قسم کا احتمال اور تشویش نہیں ہونا چاہیئے۔

احقر ج۔ آر۔ رائے۔ لاہور

بس میں ہی ہوں

گمان مبر کہ تو چون بگذری جہان بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است
حضرت عرفی علیہ الرحمۃ

خودداری علو نفس بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کے خیالات ایسے ہیں جن پر انسانیت کا خصوصیت سے مدار ہے جو انسانیت ان خیالات سے خالی ہے وہ مرکز انسانیت سے گری ہوئی ہی نہیں بلکہ دائرہ انسانیت سے بھی کوسوں دور ہے یہ باتیں انسانیت کا زیور اور انسانیت کا فخر ہیں مگر بعض وقت ان اوصاف اور دیگر کمینہ اوصاف نخوت رعونت اور خودستائی میں جب التباس ہو جاتا ہے تو یہی اوصاف ردی اور واجب نفرت ہو جاتے ہیں اکثر لوگ ان دونوں میں فرق اور امتیاز نہ کرنے کی وجہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں. خودداری اور خود پسندی رعونت اور علو نفس بلند ہمتی اور نصرت میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو دماغ تربیت یافتہ ہیں وہ تو ان میں ایک خوبی کے ساتھ فرق و امتیاز کر لیتے ہیں لیکن جن کے دماغ میں ایسی طاقت نہیں ہوتی اور جن کے ذہن محض عارضی نمایش پر ہی عش ہے وہ ان ہر امور میں آسانی کے ساتھ فرق اور امتیاز نہیں کر سکتے جو شعر عنوان میں درج کیا گیا ہے وہ مرحوم حضرت عرفی علیہ الرحمۃ کے اخلاقی خیالات کا نمونہ ہے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا موجودہ تمہ موجودہ پوزیشن ایک ایسا رتبہ اور ایسی پوزیشن ہے جس کی ریس کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا یا مشکل سے کر سکتا ہے۔ اون لوگوں کی نگاہوں میں تو شاید اسکی کوئی قدر و قیمت ہو مگر جو خود اس مسئلہ کے نمایشی خیالات کے گرویدہ ہیں مگر ان لوگوں کے نزدیک ان کی کوئی بھی قیمت اور قدر نہیں جو ان نمایشی امتیازات کی تہ تک مدتوں سے پہنچ چکے ہیں اور جو لوگ بمصداق

خواب پریشاں دیدہ است
چشم من لبسیار ۔ این

انکی میں نگاہ ہوا ہر قسم کے خیالات اور محض نمایشی امتیازات کیا ہے قدر و قیمت

پا سکتے ہیں ؎

بیا بہ ملک قناعت کہ در وسے رہ کشتی
ز قیمت پا کہ بہ ہمت فروش طے پر ستی

نمائشی تصرفات ہرچند بعض اتیازات پر اترانا اون دماغوں کا کام ہے جو مجنون توجہ دوسری جگہ رہتے ہیں جو لوگ ٹھوس دماغ مستقل مزاج ہوتے ہیں وہ اگر یہ انتظامی رنگ میں ایک خاص پہلو لیے ہوتے ہیں لیکن بہر حالت اونکی خودداری اور ان کا استقلال ہاتھ سے نہیں چھٹتا ایک شخص سر جھکا کے اکڑ کر بیٹھا رہتا تھا لوگوں نے اوس سے پوچھا کہ کیا ہورہا خدانخواستہ گردن میں کوئی کسر ہے یا اعصاب میں کوئی تشنج ہے یہ سوال بالکل درست تھا کیونکہ بعض لوگ اس رنگ کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اون کے امتیازات اور اون کی رعب داب اور استقلال ہمت چشم زخم سے محفوظ رہے گا اور ان کا دامن ملوث اور ذلیل سیاست بے داغ ثابت ہوگا یہ غلطی اس واسطے لگ جاتی ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں محض ایسی نمائش رنگوں سے ہی ان کا استقلال اور ان کی ہمت چشم زخم سے محفوظ رہ سکتی ہے یہ استقلال اور ہمت یا خودداری نہیں ہے بلکہ خود نمائشی اور خود ستائی کیا کیسی خودستائی کی حرکت ہوسکتی ہے اور کیا کوئی روشن دماغ ایسا وطیرہ اختیار کر سکتا ہے یہ طریق عمل اوصاف جمیلہ اور اطوار فاضلہ میں داخل ہیں یہ تو ایک محض فاحش حرکت ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں ایک با وقار با عظمت ممتاز شخص ہوکر خوش خلقی بردباری اور ہنسنا منزل ان اوصاف کی ہے بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدخلقی چہچڑا پن ہمیشہ ترش منہ بنائے بیٹھے رہنا اور روتی صورت بنائے رکھنا انسانیت کا زیور ہے کیا درحقیقت یہی باتیں انسانیت کا زیور ہیں۔ اور درحقیقت یہی باتوں انسانوں کے شرف اور فضیلت کی موجب ہیں ؎

گر این ہمیں صورت است و این شیوہ
کار انسان تمام خواہد شد

بھلا اس بھونڈی صورت اور روتی شکل پر کون ایمان لائے گا ہر وقت اپنی نمائشی

تخیلات سے کام لینا اور ہر وقت امتیازی رنگ پیش کرنا خود اپنے واسطے ایک بدرنگی اور بدمزگی خریدنا ہے ؎

کہیئے حضرت آپ کیوں مغموم ہیں
کوئی بیماری ہے یا مسموم ہیں

منہ بنائے بیٹھے کیوں ہوتے ہیں آپ
ایسے جیسے کہ کوئی مظلوم ہیں

بیٹھے رہتے ہو اکیلے سارا دن
توبہ توبہ آپ کچھ مجذوم ہیں

ہنستے گھر بستے ہیں کہتے ہیں تمام
آپ اس لذت سے کیا محروم ہیں

نمایشی۔ منہ اٹھاکر یہ میری طرف خطاب ہے۔

متحیر۔ ہاں حضور آپ ہی مخاطب ہیں۔

نمایشی۔ ہمیں ایسی چھیڑ چھاڑ پسند نہیں۔

متحیر۔ ہیں چھیڑ چھاڑ خواہ مخواہ۔

نمایشی۔ آخر کیوں؟

متحیر۔ ارے میاں ہم تو حیران ہیں کہ آپ سارا دن ایسے کیوں بیٹھے رہتے ہیں سلسلہ خیالات بند ہی نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اکیلے بیٹھے رہنا بیمار نہیں کر دیتا۔

نمایشی۔ بکواس۔ تم نے سنا نہیں۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید

متحیر۔ بے ادبی معاف۔ اسکا مطلب بھی سمجھے یہ تو ایک فلسفیانہ مقولہ ہے اس سے مراد ہے کہ حقایق اشیا میں کی تنقید کی جائے۔ تعلیمی رنگ میں نکات ماحول کی دریافت اور انکشاف ہوتا رہے نضول بک بک میں دن اور وقت نہ گنوایا جاوے نہ یہ کہ سارا دن اسی وہم اور اسی خبط میں مصروف اور مگن رہیں کہ ہم چو ما دیگرے نیست۔ تمہاری شکل وصورت سے تو

ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہو کہ میرے اس عارضی امتیاز کو مٹی نہ لگے۔

نمائشی۔ دیکھو میں ایک ذی عزت شخص ہوں میرا لوگوں کے ساتھ بولنا اور ہنسنا اپنے دفتر اور امتیاز کو کھو دینا ہے ہر کس و ناکس کے ساتھ بے تکلف ہونا متانت سے بعید ہے۔

متحیر۔ اس متانت کی دُم میں نمدا متانت ہے کہ خبط اور جنون آپ تو کسی روز پاگل ہو جاوینگے ذرا کسی سے پوچھو تو سہی آپ کی اور آپکے اس خبط کی بابت مخلوق خدا کہتی کیا ہے اگر اپنا محاسبہ کرنا مطلوب ہے تو خود کو خود اپنا دشمن بناکر صحیفہ اخلاق کا مطالعہ کرو۔ عرفی نے کیا اچھا کہا ہے۔

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشین در کمین خویش

نمائشی۔ تم نے یہ بھی سمجھا کہ میں کیا ہوں۔

متحیر۔ فرمایئے حضرت آپ کیا ہیں لڈو ہیں پیڑا ہیں جلیبی ہیں گلاب جامن ہیں

نمائشی ؎

اشرف المخلوق ہوں افضل ہوں اعلیٰ ہوں میں — کم بضاعت میں نہیں ہوں فیض کا دریا ہوں میں
مال و دولت سیم و زر ہیں ذات میری نامدار — علم و فہم و عقل و دانش میں وحید روزگار
کیا تمدن اور سیاست سب میں ہوں مشہور جہاں — ایم اے ہوں ایل ڈی ہوں اور ہوں قانوں داں
ہوں مہذب سوسائٹی لیبریشن پر فدا رہتا ہوں میں — نیو لائٹ کی شاہراہوں میں گھرا رہتا ہوں میں

متحیر۔ اوہو آپ تو چشم بد دور سب کچھ ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

نمائشی۔ یہ متضاد فقرہ کیسا ہوں بھی اور نہیں بھی۔

متحیر۔ آپ نے کبھی سنا کہ سورج اور چاند نے کبھی آواز دی ہو کہ میں سورج اور میں چاند ہوں۔ اکڑفوں اور سناول سے کیا بنتا ہے صدائے برنخاست کا معاملہ ہے ڈھول باوجود اس قدر دُھم دُھم کے بھی اندر سے خالی ہوتا ہے۔ جو گرجتے ہیں برستے نہیں چونکہ اسکی ذات ستودہ صفات میں تحمل بردباری استقلال موازنہ نہیں ہے اس واسطے یہ سب کی لات اور یہ سب ٹھوکریاں کرایہ کا گھر اور خالی ڈھول ہیں گو وہ کی خالی ڈھول کی بے ہنگام صداؤں سے خبردار تو ہو جاتے ہیں مگر کہاں ہارمونیم کی سریلی آوازیں اور سارنگی و ستار کی سر بیں۔ کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں۔

نمائیشی۔ بس بس ہمارا دماغ تھک گیا۔

متحیر۔ چشم بددور دماغ نہ ہوا بہلو ج پیتھر ہوا اس قدر نزاکت اور اسپر یہ نفاست آپ سارا دن لوگوں کا سر کھلاتے ہیں اور ادن غریبوں کا دماغ نہ پھٹے اور ہمارے دو چار بول ہی دماغ کے واسطے چھری وکٹاری ثابت ہوں۔ اللہ اکبر۔ قربان جائیں اس نزاکت اور اس نفاست کے۔ حضرت یہ خودداری نہیں یہ متانت نہیں مانا کہ آپ سب کچھ ہیں مانا کہ آپ ساری نزاکتوں اور ساری خوبیوں اور سارے امتیازات کا نچوڑ ہیں مگر کیا اوسکا یہ نتیجہ ہونا چاہیئے کہ بجائے انسانیت کے آپ صنم درندگی کی آؤبھگت میں لگ جاویں اور اپنے ہاتھوں سے ان صفات چند کا قلع قمع کردیں جو قدرت نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھی ہے کیا ساری دنیا میں آپ ہی کو یہ اعزاز اور یہ امتیاز نصیب ہوا ہے اور آپ ہی دنیا میں منتخب ہیں صدہا کیا لاکھوں لوگ اس سے بھی زیادہ احترام واکرام کے مالک ہیں انہیں بھی دیکھنے کے لیے ملنساری اور خندہ پیشانی میں باتیں ہیں کہ پھول جھڑتے ہیں کلام ہے کہ سبحان اللہ۔

نمائیشی۔ تم اس راز کو کیا سمجھو۔ یہ دور کی باتیں ہیں۔

متحیر۔ کوہ قاف کی یا کوہ ہمالیہ کی اس میں کیا راز ہے۔ گھر گھر تو آپ کی نقلیں اتاری جاتی ہیں آپ کا وجود ان دنوں حضرت من کشت زعفران بنا رہا ہے۔ لوگ نمائیشی ادب کیوجہ سے ہنستے ہیں ورنہ اونکی انتڑیاں قابو سے نکلی جاتی ہیں۔ کہ آپ کس ہیئت کذائی سے درشن دیتے ہیں ذرا آئینہ میں دیکھو تو سہی چونکہ آپ واقعی اس دنیا میں ایک ممتاز عنصر ہیں اسواسطے آپ کی ذات لوگوں اور ابنائے جنس کے واسطے کسی صورت میں بھی بے سود نہیں ہونی چاہیے اگرچہ سب کچھ خدائے کریم کے اختیار میں ہے لیکن خدائے کریم نے خود انسانوں کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ سود و نفع دے رکھا ہے۔ جب آپ اس خشک بیانی کے قائل رہے تو کسی کی کیا مجال ہے کہ آپ کے دربار دربار میں آکر مستفید ہو سکے۔ ہمیں آپکے اعزاز واحترام کا اعتراف ہے ہم آپ کی عزت کرتے ہیں لیکن بہ حالت میں آپ کا معترض ہی بنے۔ ہنسا ڈرتا ہے کہ کہیں خواہ مخواہ معمولی کتر بیونت میں نہ آجاویں۔

نمائیشی۔ منہ بنا کر کیا کہا۔ اس قدر گستاخی۔

متحیر۔ قربانت شوم اب تک نزاکت کا پارہ اُترا نہیں اور پیمانۂ نخوت چڑھا ہی جاتا ہے ذرا کہو تو سہی یہ بخار دماغ شریف میں کب سے چڑھا ہے کونسی ایسی انوکھی امتیازی ڈگری ملی ہے کہ تیور دکھتے ہی نہیں کچھ ہمیں بھی تو سمجھایا ہوتا آخر ہم بھی اس دنیا میں رہتے ہیں خدانخواستہ آپ کسی مرض میں تو مبتلا نہیں ہیں۔

نمائشی۔ خدا کی پناہ۔

متحیر۔ تو پھر یبوست کے یہ لچھن ہیں حضرت دوا کیجئے ورنہ بڑھتے بڑھتے کوئی اور بلا گلے کا ہار نہ ہو جاوے۔

نمائشی۔ ذرا ہنسکر کونین تو روز کھایا کرتا ہوں۔

متحیر۔ اگر اسوقت حلوائی کی دکان نزدیک ہوتی تو واسد ڈیڑھ پیسہ کی برفی اس جلسے یا زہر قند کی خوشی میں بانٹ ہی دیتا میں سمجھ گیا بشرہ بھی تو گواہی دے رہا ہے یہ کونین کی کمبخت خشکی رنگ لا رہی ہے معلوم ہوا کہ دودھ پینے کی عادت نہیں پیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

نمائشی۔ خاموش زیادہ بات کرنے کی میری پوزیشن اجازت نہیں دیتی۔

متحیر۔ خدا خیر کرے اب تو کونین سے خود بدولت کونین سے بھی بیزار ہیں حضرت یہ آثار تو اچھے نہیں خدا کرے فصد لینے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ یبوست کونین رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہے۔

نمائشی۔ یہ زرد یبوست نہیں بلکہ زرد لیاقت اور استعداد اور سچ پوچھو کہ میں تو اردو اور ہندی میں بات چیت کرنا ہی پسند نہیں کرتا۔ اردو ہندی بھی کوئی زبان ہے۔

متحیر۔ بہت اچھا میں انگریزی میں کہتا ہوں مگر چونکہ میں ہندی نژاد ہوں اسواسطے شاید میری زبان سے آپ انگریزی سننا بھی پسند نہ کریں اگرچہ الفاظ انگریزی ہوں گے گو منہ تو یہی ہندوستان کا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہندی نہیں ہیں۔

نمائشی۔ خاموش ادب کن **بادب باش**۔

متحیر۔ میری حیرت رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

نمائشی۔ میں آپ سے بولنا پسند ہی نہیں کرتا۔

متحیر۔ آخر میرا گناہ۔

نمایشی۔ آئی ایم جنٹلمین۔

متحیر۔ میں نے کب کہا کہ آپ اس دائرہ سے باہر ہیں سوال از آسمان جواب از ریسمان استعداد و لیاقت کا چشمہ بدور یہ موازنہ ہے (راوی)

حضور انور جنٹلمین کا سبق رٹتے کمرہ سے اُٹھ گئے اور میری آنکھ کھل گئی حیران ہوں کہ میں نے خواب میں یہ کیا دیکھا۔ غالباً رات کو اس پاس شئے کیا ہی ہوگی دماغ پیوست زدہ ہو کر اس مرحلہ پر آ گیا اور وہ خواب دیکھا جو سراسر پیوست نما ہے ابھی تک خشکی دور نہیں ہوئی خواب وحشت آثار سے خشکی کا اس قدر زور ہے کہ لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ؎

عجب خواب پریشان دیدہ ام امشب
کہ بر سیرین ہم دشوار تعبیر است

حضرت خصت اور بس میں ہی ہوں۔ باقی خیر صلاح +

(سلطان احمد)

جن حضرات کا چندہ دسمبر میں ختم ہو گیا ان کے نام آیندہ پرچہ بذریعہ دی۔پی حاضر ہوگا اگر خدانخواستہ کوئی صاحب تمدن کی سرپرستی چھوڑنا چاہیں تو وہ جلد مطلع کریں اور دفتر کو دی۔پی کے خرچ کی زحمت سے بچا کر مشکور فرمائیں +

جو حضرات تمدن کے خریدار بننا چاہتے ہیں ان کے لیئے بہتر ہے کہ وہ جنوری سے خریداری شروع کریں کیونکہ جنوری سے تمدن کی نئی جلد شروع ہو گی اور بعض مضامین مسلسل شروع ہونگے جنکا لطف بغیر سلسلہ کے نہ آسکے گا +

جو حضرات تمدن کی جلد جون لغایت دسمبر ۱۹۱۱ء خریدنا چاہیں وہ ۳ کے دی پی کی اجازت دیں۔ کل ۲۵ جلدیں ہمارے پاس ہیں +

تمدن کے جو ناظرین نسائی کے خریدار بننا چاہیں ان کے لیے اچھی موقعہ ہے کہ وہ پہلے پرچہ سے خریدار ہو سکتے ہیں اسکے بعد پہلا پرچہ نہ مل سکیگا۔ **مینجر**

تغزّل

کر دیا تھا بسکہ پختہ روز کی تعذیب نے
مرتے مرتے کی نہ توبہ کیشان پیر نے

جا رہے جو قدم سجدے کئے زنجیر نے
کر دیا رسوا میری وحشت کو اس توقیر نے

جا گزیں تھا دل میں تو اب ہی تو ہی دل نہیں
توڑ ڈالا آئینہ کو شوخئ تصویر نے

شمع اک پردہ ہے سوزان محفل حجاب نیم کان
تاب نظارہ نہ چھوڑی حسن عالمگیر نے

صیقل جاں ہے مصیبت سر فروشوں کے لیے
کر دیا روشن سراپا شمع کا گلگیر نے

چھپکے ہم پیتے تھے جو جبتک نہ تھے رسوائے خلق
جرأت رندانہ بخشی لذت تشہیر نے

پھرتے ہیں صدہا سکندر روز و شب مقتل کے گرد
کر دیا ہے آب زندان کیا تیری شمشیر نے

ہائے خون تن میں بھری ہے آتش آہن گداز
ہمسے دیوانے ہی دیکھے ہیں کسی زنجیر نے

جاذب برق بلا ہیں لوٹے دیدار کے
پھونک ڈالا دل کو ان اجزائے آتشگیر نے

میکشی زاہد پہ کی جو ہو گئی تاثیر وعظ
مشغلہ اچھا سکھایا شیخ کی تقریر نے

ناصح مشفق کو بھی سودائے جانان ہو گیا
بوالہوس سمجھا تھا مجھ کو منکر تاثیر نے

رقص بسمل ان کے کشتوں کا رہیگا حشر تک
وجد طاری کر دیا ہے نعرۂ تکبیر نے

روز و شب سرگشتہ و درماندہ ہوں تپش
عمر بھر چکر دئے مجھ کو میری تقدیر نے

تپش خورجوی

عریاں جہاں میں آئے تھے عریاں ہی جائینگے
وہ با رہم کفن کا بدن کو لگائیں گے

رونے پہ اپنے دیدۂ خونبار آئیں گے
تیغے میں آ کے ہاتھ کے مہندی لگائینگے

وہ صید ہم ہیں صید گہ روزگار میں
صیاد کو بھی دام میں اپنے پھنسائینگے

اک عمر بعد آئے گی جب نیند زیر خاک
منکر نکیر آ کے وہاں بھی جگائیں گے

عشرت لکھنوی

قرار دل کو ہوا اک گونہ بیقراری میں
مزا وصال کا آتا تھا آہ و زاری میں

ہوئیں منت ہجران تھی میری بیداری
عجیب لطف تھا انجم کی پہرہ داری میں

علی الصباح صبوحی تھی جام خون جگر
مزے میں کٹتے تھے دن رات میگساری میں

تفکرات تھے فکر بلند کا زینہ
دماغ عرش پہ رہتا تھا ذوق خواری میں

کمند ناز سے بڑھ کر تھا جذب سحر جنوں
کہ ایک سحر تھا مضمون نگاری میں

خوشا وہ دن کہ تھی خونناب بار دیدۂ تر
نہاں حیات حقیقی تھی اشکباری میں

امین وصال میں وہ لذت خلش نہ رہی
نصیب تھی جو کبھی دل کی بیقراری میں

امین سیالکوٹی

محشر میں سب سے چھپکے اندھیرا نہ کیجئے
للہ آج اپنی تمنا نہ کیجئے

کہتے ہو حشر ہے تری رسوائیوں کا نام
کس منہ سے اب کہوں مجھے رسوا نہ کیجئے

مجبور انفعال سے مجبور شوق سے
ایسا ہو دل تو کیجئے کیا کیا نہ کیجئے

تصویر اسکی آنکھ کے پردہ پہ رہ نہ جائے
سیر نگارخانہ دنیا نہ کیجئے

پھر زندہ کرکے شوق کو کہتی ہے وہ نگاہ
انکار رستخیز سے توبہ نہ کیجئے

وہ چھپ گئے ہیں جب سے کہ گئی تیری ہوئی نگاہ
مجبور شوق دید سے پروا نہ کیجئے

دل آئینہ ہے آج بھی پہلی نگاہ کا
کہتا ہے کون حشر میں پروا نہ کیجئے

میں ناز بے نیاز کو کیا منہ دکھاؤں گا
للہ دیکھئے مری پروا نہ کیجئے

دل میں نہاں پرستش اعمال رہ نہ جائے
شوق گناہ کیجئے پروا نہ کیجئے

حسرت بھری نگاہ سے بے چین کر دیا
کہتے ہیں اس طرح مجھے دیکھا نہ کیجئے

تحقیق کائنات ہے سرمایۂ حزن
ہر شے کو انقلاب کی دنیا نہ سمجھئے

بیخود موہانی

بات سننے کی تو سب خلق خدا سنتی ہے
شکوۂ جور و جفا تیری بلا سنتی ہے

کان میں کہنے کی باتیں ہیں کہوں میں کیونکر
شوخ بے چین تیری زلف رسا سنتی ہے

منہ جہاں اسکو لگایا وہی سر چڑھتی ہے
کب کسی کی یہ مئے ہوش ربا سنتی ہے

منہ سے نکلے نہ کبھی راز محبت اے دل
در جدا سنتا ہے دیوار جدا سنتی ہے

چھپ سکے بلبل و گل کے نہ کبھی راز و نیاز
ان میں سے [illegible] صبا سنتی ہے

دوستو خلقت عالم کی عجب حالت ہے
بات کہتی ہے بڑھا کر جو ذرا سنتی ہے

مست و سرشار کرتی ہے میرا دل پامال
بات کب تیری جوانی کی ادا سنتی ہے

کیا دبے پاؤں نکل جاتی ہے خلوت سے شرر
ساعت وصل کی آمد جو صبا سنتی ہے

شرر کاکوروی

بھری ہے آجکل دل میں میرے وحشت بیاباں کی
میری تصویر ہے تصویر رنج و درد و حرماں کی

مریض عشق ہوں ڈھونڈو نہ تم جا کر طبیبوں کو
ضرورت ہی نہیں مجھ کو دوا کی اور نہ درماں کی

گریباں چاک ہے اور پھر رہا ہوں دشت و صحرا میں
یہ ہے سب کار پردازی جنون فتنہ ساماں کی

کروں تعریف میں کیا اوس سراپا نور کی کہیئے
حقیقت کیا ہے اسکے سامنے مہر درخشاں کی

یہ کیا آنا ہے کیا جانا قیامت ہے قیامت ہے
ہٹی جاتی ہے یوں مٹی پلید اب میرے ایماں کی

رلاتا ہے فراق یار کیا کیا اشک خوں پیہم
نہ پوچھو کیسی حالت ہے ہماری چشم گریاں کی

نہ ہو تو مفت حیران و پریشاں بلبل ناداں
نہیں پروا ہے گل کو نالہ و آہ شبستاں کی

تو نکلا ہے گلستاں میں مگر ڈرتا ہوں میں ہمدم
نظر تجھ کو نہ لگ جائے کہیں سرو خراماں کی

گھڑی بھر کیوں نظر ناصح تیری میرے گریباں پر
اڑی جاتی ہیں یوں ہی دھجیاں میرے گریباں کی

خزاں ہے آج واں تھی جس جگہ کل نو بہار گل
مجھے ہوتی ہے عبرت دیکھ کر حالت گلستاں کی

یہ اب تک راز پنہاں ہے بشر مرتا ہے کیوں احمد
یہاں کچھ بھی نہیں چلتی کسی کی عقل و برہاں کی

احمد حیدرآبادی

[illegible] حد سے ترے جلوؤں میں کیونکر خالی　　ملکے شیشے سے تو رہتا نہیں ساغر خالی

ایک دل ہے کہ نہیں درد سے دم بھر خالی　　ورنہ کیا کیا نظر آئے نہ بھرے گھر خالی

تو نے کس کس کو اجاڑا نہیں اے باد خزاں　　گل سے خالی ہے چمن بو سے گل تر خالی

ساقی ابر نہ اک دن سر گلشن آیا　　لالہ و گل لیے بیٹھے رہے ساغر خالی

منقطع ہو نہیں سکتا کبھی کعبے کا طواف　　کوچۂ یار ہو عشاق سے کیونکر خالی

مرغ جاں آج پھڑکتا ہے بہ انداز پرے　　کوئے جاناں سے پھرا ہو نہ کبوتر خالی

دل میں اب کیا ہو جو خونناب رہیں آنکھیں پیتی　　کر چکے شیشۂ لبریز کو ساغر خالی

بے خطا جس کا نشانہ ہو یہی ناوک ہے　　کبھی جاتی نہیں آہ دل مضطر خالی

فیض پایا نہیں کس نے نگہ قاتل سے　　کوئی خنجر ہے نہ اس سے نہ کوئی نشتر خالی

مے نہ پائے تو کوئی زندہ رہے کیا ساقی　　انتہا یہ ہے کہ چلتا نہیں ساغر خالی

وہ نہیں اہل نظر میں ترے نظارے سے　　مثل تصویر نظر آتے ہیں پیکر خالی

شوق مے منت ساقی سے بچا لیتا ہے　　مست ہو جاتے ہیں ہم دیکھ کے ساغر خالی

آج تک ہو نہ سکا نالۂ دلکش کا جواب　　کتنے ترکش ہوئے تیروں سے ستمگر خالی

رنگ ہم دیکھ چکے گلشن ہستی کا جلیل
بوئے حسرت سے نہیں کوئی گل تر خالی

فصاحت جنگ (جلیل)

(مشفق)

خیالات عزیز

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز فتحپوری کے

جذبات نگار قلم کا تازہ ترین کرشمہ

جس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت اپنے عالم شباب میں کیا کچھ فراموش کر جاتی ہے

جو ہندوستانی دواخانہ دہلی نے اختیار کیا ہے کہ وہ کسی کی عیب جوئی اور بدگوئی نہیں کرتا۔ اور دوسروں کو برا کہہ کر خود بھلا بننے کی کوشش کو برا سمجھتا ہے، اور طب یونانی اور ویدک کی بہترین دوائیں خالص اجزا سے بنا کر پبلک کے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ اگر اپنے ملک کی دوائیں پسند ہوں تو یہاں موجود ہیں، البتہ اس بات کا پورا اطمینان دلاتا ہے کہ اسکی بنائی ہوئی دوائیں مستند ہیں؟ مجرب ہیں! خالص! اور ہر ایک ضرر سے پاک!

دہلی

اور دہلی نہیں تمام ہندوستان میں اس دواخانہ کو غیر معمولی ترقی کا فخر حاصل ہے لاکھوں روپے تک اس کا کاروبار پہنچ گیا ہے، فخر ہندوستان عالیجناب حاذق الملک حکیم حافظ **محمد اجمل خان صاحب** خلف الرشید حضرت حکیم **محمود خان** صاحب غفرلہ اس کارخانہ کے مربی و سرپرست ہیں اور حاذق الملک بہادر نے طب یونانی اور ویدک کو زندہ رکھنے کیلیے **عظیم الشان طبی کالج** قایم کیا ہے اس دواخانہ کا نفع اس کالج کے اخراجات کی کفالت کرتا ہے،

ہندوستان میں ان امتیازات کیساتھ ہندوستانی دواخانہ ہی ایک تنہا کارخانہ ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ خاندانی بھروسہ کے لائق دیسی دوائیں نہ ملنے کی پبلک کو جو تکلیف ہے اسکو دور کرے اور اپنا نفع کار خیر میں صرف کرے والیان ملک سے لیکر ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لاکھوں اصحاب نے اس دواخانہ سے فائدہ اٹھایا ہے اور اسکی شہرت غیر ممالک تک پہنچگئی ہے + فہرست طلب کرنے پر مفت! تار کا پتہ "**میڈیسنز**" خط کا پتہ (ٹھیک ٹھیک یہی الفاظ لکھنے گا):-

منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی

جلد ۳ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء نمبر ۱

تمدن دہلی

علمی۔ ادبی۔ سیاسی۔ معاشرتی۔ اخلاقی۔ فلسفی مضامین کا مخزن

فہرست مضامین

[5] یہ فسانہ تمدن میں مسلسل شائع ہوتا رہیگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گل و خار

خانہ در کوئے بیوفایان ساخت
این دلِ خانمان خرابم سوخت

(گل) خدا کی قدرتوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہاں گل اور کہاں خار۔ اس جوڑ بے جوڑ کا پتہ نہیں لگتا۔ کہاں میں اور کہاں خار۔ بھلا یہ بھی کوئی میل ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جس ٹہنی میں سے میں پھوٹتا ہوں اور نشو ونما پاتا ہوں اُس سے یہ خار بھی نکلتا ہے۔ اور طرفہ یہ کہ ہر پہلو بہ پہلو جگہ لیتا ہے۔

ایں چہ خار است کہ در پہلوئے خود مے بینم

(خار) اے رفیق باوقار و محترم
صحبت صالح سے مجکو مغتنم

فیض صحبت سے کسے انکار ہے
راست تیری سر بسر گفتار ہے

بے ادبی معاف آپکا فرمان بالکل بجا اور درست۔ اسمیں سرمو فرق نہیں یہ جوڑ بیشک بے جوڑ ہے۔ میری کیا حقیقت کہ میں گل سے مقابلہ کر سکوں۔ میرا تیرے پہلو میں ہونا گو ہر میرے واسطے تو ایک احترام وعزت ہے لیکن تیرے لئے بیشک یک عار ہے۔ میری کیا مجال کہ تیری ایس کروں مجھے یہ دعوے ہی نہیں سہ

میں نہیں کہتا شمیم ناز ہوں		یا تیری خوشبو کا ہمراز ہوں

(گل) دیکھو خفا ہونے کی بات نہیں۔ رنج کا موقعہ نہیں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ایک حقیقت ہے تم پر کوئی حملہ نہیں۔ قدرت کی کارسازی پر ریویو کر رہا ہوں۔ تم خود ہی کہہ سکتے ہو میرا اور تیرا جوڑ میل کیا اور کیسا ہے! اور یہ کہاں تک درست ہے؟ میری جو کچھ عزت واحترام اور مانگ ہے اور مجلس وجاہت اور خوبی کے ساتھ وہ تجھے کہاں حاصل۔ گو میرا نشوونما تیرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ مگر جو کچھ آؤ بھگت ہوتی ہے وہ تجھے کہاں نصیب۔

رنگ و بو پر میرے ہے عالم فدا | عندلیب اور بھونرے مبتلا
میں گلے کا ہار ہوتا ہوں کبھی | مہ وشوں کے ساتھ ہوتا ہوں کبھی
میں مشام جان میں عنبر بیز ہوں | روح کی راحت ہوں فرحت خیز ہوں
میں چمن کی رونق بازار ہوں | نور بخش دیدہ دیدار ہوں
نازنینوں کا سراپا ناز ہوں | نازکی کا اُن کے میں انداز ہوں
مردمک ہوں دیدۂ انداز کی | دھوم ہے میری نگاہ ناز کی

(خار) مجھے ان احترامات اور خوبیوں کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی اسکے اپنی کم مائیگی اور نحوست و ذلت کا دھشں کا بھی اقرار ہے تم ان خوبیوں کے مقابلہ میں تو کوئی خوبی ہی نہیں رکھتا۔

نیش ہوں میں در پے آزار ہوں | نوک پیکاں خنجر خونخوار ہوں
رنج ہوں تکلیف ہوں آزار ہوں | یعنی اسم بامسمیٰ خار ہوں
بدسیر ہوں زشت ہوں بدکار ہوں | نیش عقرب ہوں بشکل مار ہوں

ہاں میں نے کب کہا کہ میں گل کا ہمسایہ ہو کر اُسکی خوبیاں بھی رکھتا ہوں گو صحبت کا اثر ہوتا ہے مگر اُن ہی طبائع میں جو ایسا مادہ رکھتی ہیں اور جن کی سرشت قابل ہوتی ہے یہاں تو وہ بات ہی نہیں (گل) بیشک میری صحبت میں رکھ کر بھی تمہاری سرشت نہیں بدلی اور تم نے میری کوئی صفت بھی نہ لی سہ

کیا شرارت تیری فطرت میں بھری | کیا عداوت تیری طینت میں بھری
نوک تیری کس غضب کی تیز ہے | نیش تیرا کیا قیامت خیز ہے
ہاتھ میں بے وجہ چبھ جاتا ہے تو | بے سبب آزار بن جاتا ہے تو

ہاتھ جب مجھکو لگاتا ہے کوئی ... بن کے گل چین پاس آتا ہے کوئی
اُس کے دامن سے لپٹ جاتا ہوں تو ... نوک کی دیتا ہے ڈٹ جاتا ہوں تو
میری صحبت کا اثر مطلق نہیں ... ہمنشینی کارگر مطلق نہیں

(خار) جانِ من میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میری سرشت قوت قابلہ سے محروم ہے۔ تمہاری صحبت اور تمہاری رنگ و بو کا اگر مجھ میں کوئی اثر ہوتا تو میں بھی تمہاری طرح مرجع خلائق یا نازش جہاں کا مدعا ہوتا۔ بےشک میں

دشمن مخلوق ہوں جلاد ہوں ... بےسبب آمادہ بیداد ہوں
نشتر فصاد ہوں شمشیر ہوں ... ترکش ظلم و جفا کا تیر ہوں

لیکن حضور کو یاد ہے۔

بو صفت بدکیش بداندیش ہوں ... باوجود ان سب کے تیرا خویش ہوں

اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی خود بدولت کو مدِنظر ہے۔

میں بھی تیرے ساتھ ہی پیدا ہوا ... حقیقت خلاف پرستید ہوا
میری تیری ایک ہی شاخ ابتدا ... میری تیری ایک کونپل انتہا
ایک ہی مرکز تھا میری اصل کا ... ایک ہی رشتہ تھا تجھ سے وصل کا
ایک ہی تھی سرزمین زاد و بوم ... ایک ہی تھا تخم علت بالعموم
ایک ہی ساعت میں ہم تکوین ہوئے ... ایک ہی خامہ کی ہم مدوّن ہوئے
ایک ہی کُن سے ہے دونوں کا ظہور ... ایک ہی فرمان سے نسبت دانشور
ایک ہی خالق کے ہم مخلوق تھے ... ایک ہی منشور کے منطوف تھے
پھر نہیں معلوم کیوں ہے امتیاز ... فہم سے باہر ہے فطرت کا راز

(گل) یہ تو قدرت کا راز ہے۔ لیکن میرے دعوے کے محل ہیں۔

(خار) یہ کون کہتا ہے حضور کا دعوے بہت ٹھیک ہے۔ اس سے کسے انکار ہے۔ مگر میری سمجھ میں ہی نہیں آتا سے

کیوں نزاکت تو نے پائی اس قدر ... کیوں لطافت تجھ میں آئی اس قدر

کیوں تیری رنگت میں فرحت ہو نہاں | کیوں تیری خوشبو سے راحت ہو عیاں
تیرے آب و رنگ میں تسنیم ہے | اور رگ رگ میں بھری تاثیر ہے
جس کو دیکھو وہ تیرا دیوانہ ہے | تیری شمع حسن کا پروانہ ہے
بلبلیں ہیں کس لئے تجھ پر فدا | بھونرے اور بھنگے ہیں کیوں مبتلا

(گل) تمہیں رشک اور حسد کیوں ہے۔ یہ قدرت کی دین ہے۔ اسیں کسی کا اجارہ کیا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

(خار) یہ بالکل ٹھیک مگر میں تو یہ پوچھتا ہوں اور ادب سے پوچھتا ہوں ۔

کونسی تونے ریاضت کی بتا | ایسی تونے کیا عبادت کی بھلا
ایسی تیری کونسی خدمات ہیں | کس صلہ میں ایسے انعامات ہیں

(گل) میں کیا بتاؤں یہ تو مشیت خالق کا کھیل ہے۔

(خار) حضور پھر مجھ پر کیا اعتراض۔ خود ہی سوچو کہ تمہارے پہلو بہ پہلو میں بھی پیدا ہوتا اور نشو و نما پاتا ہوں اور شروع سے آخر تک تمہاری صحبت میں رہتا ہوں۔ میری فطرت اجازت ہی نہیں دیتی کہ تمہاری کسی ایک خوبی کا بھی اخذ کرسکوں ذرا خیال فرمائیے تو سہی۔

کیوں بنایا مجکو خار بدنما | اور تجکو خوش ادا و خوش لقا
کوئی باعث اس کا گر معلوم ہو | دفتر کن میں کہیں مرقوم ہو
تم بنا لیے اسکی لے نازک بدن | میں کسی پر پھر نہ چھوں نا مَیش لسن

(گل) یہ لم کون بتائے مجھے کیا معلوم کہ تجھے کیوں خار بنایا اور مجھے کیوں گل۔ بیشک میں گل ہوں رنگ و بو رکھتا ہوں مگر یہ راز تو مجھ پر پھر بھی نہ کھلا۔

(خار) جب یہ کیفیت ہے تو پھر نکتہ چینی کی کیا ضرورت۔

(گل) یہ نکتہ چینی نہیں یہ تو ایک اعتراف اور اظہار خوبی ہے۔ اور دوسرے الفاظ میں قدرت کا شکریہ اور صنعت کی قدر دانی۔

(خار) بہت اچھا یوں ہی سہی۔ مگر میں بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا

جانتا ہے صانع ان اسرار کو | کیا خبر اس راز کی مجھ زار کو

گل کی کیا طاقت کرے جو یہ سوال — کیوں بنایا مجکو ایسا اے کلال
جس طرح چاہا بنا کر رکھدیا — خام رکھا یا پکا کر رکھدیا
گل تجھے مجکو بنایا خار ہے — قدرت صانع کا یہ کردار ہے
خالق برحق کے یہ انداز ہیں — صانع مطلق کے یہ سب راز ہیں
راز سربستہ یہ کس سے کھل سکیں — عقل کی میزان میں کیونکر تل سکیں
حل ہو کیا یہ عقدۂ تقدیر ہے — گنداس جاناحق تدبیر ہے

اور اگر حضرت اکبر لسان الغیب محترم قبلہ کی زبان سے کچھ سننا چاہو تو ایک ہی شعر میں جواب آجاتا ہے ذرا گوش ہوش سے یہ سنو ؎

دست قدرت میں ہے یہ خاک چمن اے اکبر — اس سے کیونکر یہ کہوں پھول ہی بن جا زن بن

حضرت محترم نے دیکھو ایک ہی شعر میں اس سارے مضمون کو خلاصہ کردیا۔ اگر اسپر بھی تسلی نہ ہو تو تمہاری قسمت یہ تو ایک ناطق فیصلہ ہے۔ حضرت اکبر کی یہی جادو بیانی دلون پر حکومت کر رہی ہے۔

(گل) کیا عقل و فراست فضول دی گئی ہے اور اسکی کوئی حقیقت نہیں۔

(خار) نزاکت پناہ۔ اگر عقل کا کام حل اسرار ہے تو یہ بھی اسکا کام ہے کہ اسرار قدرت کے حل کرنے میں خود کو معذور جانے۔ دنیا کے عقلمندوں نے ہی یہ عقدہ کھولا ہے کہ انسان حد بشری سے آگے نہیں جا سکتا۔ جو باتیں انسان دریافت کرنیکی ہمت اور فراست رکھتا ہے وہی دریافت کرسکتا ہے اس سے آگے اُس کے پر جلتے ہیں۔ ذرا آپ ہی اپنی حقیقت کا راز بتائیے کہ میں کیوں خار ہوں اور آپ کیوں گل ہیں۔ ایک پانی ایک ہوا ایک ماحول ایک تخم۔ ایک موسم۔ پھر کیا میں اُسی تخم کا اثر نہیں ہوں جس کے آپ ہیں کیا میں بھی اُس سرزمین اور آب و ہوا میں پیدا ہوتا اور نشو و نما نہیں پاتا جس میں نزاکت پناہ خوشبو دستگاہ پرورش اور نشو و نما پاتے ہیں آخر یہ کیا راز ہے کہ میں خار خوار ہوں اور آپ گل نازک اندام ؎

آں چناں کرد عشق فراغ مرا — کہ نہ دل ماند نہ دماغ مرا

(گل) اگر یہی بات ہے تو کسیکو مجھ پر کیا رشک ہو سکتا ہے میں نے بھی یہ درخواست

نہیں گئی تھی کہ مجھے گل بنایا جائے -

(خار) یہ بالکل درست - قدرت نے سب کچھ اپنی مرضی ہی سے پیدا کیا ہے - اُسکی مرضی کے تحت سب کچھ ہو رہا ہے - اور وہی کارساز ہے -

پھر نزاکت پناہ - مجھ پر عتاب کیوں - میرا کیا قصور -

(گل) عتاب کیا ایک حقیقت بیان کی ہے - اور وہ بھی حیرت و تعجب

(خار) اگر تو نہ بے پسندی تغیر کن قضا را -

ہر صورت خوبصورتوں کو دیکھ کر چاہتا ہے کہ وہ بھی خوبصورت نہ ہو - مگر قلم قدرت کو کون مٹا سکتا ہے - اور مشیت ایزدی کا کون مقابلہ کر سکتا ہے - میں ہزار چاہوں کہ گل ہو جاؤں مگر ہو نہیں سکتا - ہاں نزاکت پناہ خار ہو سکتے ہیں -

(گل) ذرا تعجب و حیرت سے یہ سطرح

(خار) گل صرف اسی رنگ و بو اور نزاکت ہی کا نام نہیں بلکہ اُس خوبی اور اُس وصف کا جو قدرت نے گل میں رکھی ہے - اگر وہ وصف اور خوبی نہ ہے تو گل گل نہیں رہیگا ایک مصیبت زدہ بدقسمت کے واسطے گل نفرت سے بھی بدتر ہے - گل اس حالت میں سبب خاطر ہوتے ہیں جب کہ زندگی مطمئن ہوں جب دل و دماغ درست اور مطمئن نہ ہوں تو یہی گل باعث کلفت ہو جاتے ہیں شعر

فریاد کہ آن لب شکر ریز بر زخم نمک فشاند مارا

(گل) کیا میری قسمت صرف ہلکی ہے -

(خار) نزاکت پناہ قسمت تو آپکی بہت کچھ ہے مگر آپکی رسائی انہیں لوگوں تک ہے جو آپ تک پہنچ سکتے ہیں جن لوگوں کی ہستی انواع و اقسام کی کلفتوں میں مبتلا ہے وہاں حق بلبل کی مانند کہا ہے

عندلیبان باغ تجریدیم زیر بالیست آشیانہ ما

(گل) ہاں میرے گاہک ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں میری نزاکت میری لطافت میری خوشبو اُن ہی لوگوں کے حصہ میں آئی ہے جو خود بھی لطیف مزاج ہیں -

(خار) لطیف مزاج ہی جب زمانہ کی گرفت میں آتے ہیں تو انکی لطافت کہاں باقی رہتی اور گل و بلبل کی خواہش کیسے - نیاں اُنکے واسطے بھی زوال جان ہو جاتی ہیں -

دنیا کی رونق اسی سے ہے۔ اور اگر سب چیزیں ایک ہی قسم کی ہوتیں تو یہ رونق نہ ہوتی
اور نہ اس دنیا کا نظم ونسق درست رہتا۔ بجائے نکتہ چینی کے شکر گذار ہو۔ اور بہ نظر رعونت کسی کو
نہ دیکھو۔ میرا اور تیرا آخیر ایک ہی ہے۔ صرف چند روز بات ہو۔ اگر دنیا ہی مشیت ایزدی کے تحت
بیدرجہ بندیاں بھی ضروری ہیں ؏

ہمیں باشد دعائے ما فقیران
کہ خوبان نہ عشقند کار کس را

سلطان احمد۔ گوجرانوالہ

خواجہ حسن نظامی کا فتویٰ

نسائیت حضرت آدم کے وقت سے [illegible] حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی
آجتک [illegible] کو یاد کرتا ہے کیونکہ وہ بھی پسلیوں میں رہتا ہے۔ [illegible] لسانی کے مضامین میں انشا پردازی کی قیامت برپا
ہوئی ہے [illegible] تو یہ سمجھتے تھے کہ ابھی فتنہ [illegible] کوئی دن میں قیامت ہوگی [illegible] فتنہ جب پیچھے ہیں انہوں نے حشر برپا کردیا
اس قسم کے مضامین اردو علم وادب کی جان ہیں [illegible] پیدا ہوتی ہے اور انشا پردازی کا میدان
خاص قسم کی ترقی کرتا ہے [illegible] لسانی کے مضامین میں [illegible] ایک خاص اٹھان پیدا کرتے ہیں
جو ابھی تک اردو میں بہت [illegible] سلسلے میں خوش [illegible] مجموعہ کی اشاعت کی خوشی
ہمیں مذہبی تمدنی سیاسی اور خصوصاً ادبی اشارات اس خوبی سے لکھے گئے ہیں کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے
اور امید ہے کہ پبلک بھی انکی داد اپنی قبولیت سے دیگی ادبی لسانی کے مضامین بار بار چھپکر شائع ہونگے
مضامین لسانی میں آسمان صحافت کے ان روشن ستاروں کے مضمون ہیں جو ادبی آسمان پر چاند اور سورج بنکر چمکے
لسانی۔ یلدرم۔ رجائی کی تحریروں کو آنکھیں ترس گئیں۔ مگر نہیں ملیں۔ مگر مضامین لسانی کے ذریعہ
میں یہ جواہر ریزے مہیا ہوتے ہیں۔ پہلا ایڈیشن قریب ختم ہے۔

[illegible] دفتر [illegible] متیا محل دہلی

انگریزی میں فسانہ نگاری کی تاریخ

انسان اپنے افعال و کردار سے مورخ اور فسانہ نگار دونوں کے لئے مضامین مہیا کرتا ہے اور جس چیز سے آدمی کو سب سے زیادہ دلچسپی ہے وہ خود اُسکے ہمجنسوں کے افعال ہیں۔ اسلئے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی دلچسپی کے اسباب ابتدا آفرینش سے ملے ہونگے اسی خیال نے محققین کو فن تاریخ کی ابتدا کا پتہ لگانے پر آمادہ کر دیا اور وہ اسمیں کامیاب بھی ہوگئے لیکن فسانہ نگاری کے آغاز کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کرنا نہایت دشوار ہے۔ مغربی فسانہ نگاری کی ابتدا کے متعلق محققین کا خیال ہے کہ اسکی بنیاد انجیل مقدس کے دفتر اول سے پڑی جسمیں آفرینش عالم کے متعلق نہایت دلچسپ خیالات اور قصے درج ہیں۔

خاص زبان انگریزی میں اگرچہ اسکی ابتدا گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی لیکن چودھویں صدی تک اس نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ کیونکہ اس زمانہ میں زیادہ تر فسانے نظم میں لکھے گئے تھے جن سے ہمکو اس وقت کچھ بحث نہیں ہے (اگرچہ یہ قسم بھی فسانے کی بجائے خود نہایت اہم اور نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے) اور بعض جو نظم میں لکھے گئے ہیں انمیں کچھ جدت یا کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی یہ وہ زمانہ تھا کہ ولیم آف نارمنڈی نے انگلستان پر قبضہ کرکے ایک نئے خاندان [illegible] نئے رسم و رواج کی بنیاد ڈالی تھی۔ اہلیان نارمنڈی جو فرانس کا ایک [illegible] اور [illegible] معاشرت میں بالکل فرانسیسیوں سے مشابہ تھے [illegible] قومی تعصب [illegible] قوانین قدرت کے موافق فاتح قوم کے اثرات قبول کرنے لگے اور رفتہ رفتہ بالکل مل جل گئے جیسا کہ واقعہ ہے زبان پر بھی اس اختلاط باہمی کا پورا اثر پڑا۔ فیلو سے [illegible] فسانہ نگاری کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور خلیق [illegible] Morte D' Arthur [illegible] [illegible] کی نقل ہے

[illegible] انگلستان کی ادبی تاریخ میں ایک قابل یادگار عہد ہے [illegible]

کی طرح فسانہ نگاری نے بھی اس عہد زرین میں ایک قدم آگے بڑھایا لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ انگریزی نثر ہنوز مکمل نہیں ہوئی تھی اور تقلید کی بندشوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اور کچھ دیگر وجوہات سے یہ فن اسقدر ترقی نہیں کر سکا۔ جتنی کہ اس عہد کے ڈراما اور نظم وغیرہ کی۔ اسوقت انگریزی نثر کی قریب قریب وہی کیفیت تھی جو موجودہ زمانہ میں ہماری زبان اُردو کی ہے۔ اس لئے اس فن میں کوئی اسپنسر۔ شکسپیر یا بیکن پیدا نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اس زمانے کے فسانے کچھ وقتی کامیابی اور عارضی شہرت حاصل کرنے کے بعد بہت جلد بے قدری اور گمنامی کی خاک میں دفن ہو گئے اس زمانے کے فسانے نگاروں کو نہ تو کوئی مطمع نظر ہوتا تھا۔ نہ ادائے مطالب میں وہ توضیح اور صفائی سے کام لیتے تھے۔ خیالات کی جدت اور زبان کی ندرت اُن میں بالکل مفقود ہے اس عہد کا ایک مشہور فسانہ نگار [illegible] ہے۔ اُسکی تصنیفات مغلق الفاظ۔ پیچیدہ عبارت اور تصنع کے بوجھ سے دبی ہوئی ہیں۔ سیدھے طریقہ سے اپنا قصہ بیان کرنے کے قبل وہ اخلاقی درس کر دیتا ہے۔ اور قصہ کے ربط و سلسلہ کو توڑ کر وعظ و پند آغاز کر دیتا ہے۔ اور اپنے خیال میں وہ قصہ کے بوقلمونی اور دلچسپی کا باعث سمجھتا ہے۔ حالانکہ فسانے کے لئے بالخصوص یہ ایک مہلک غلطی ہے۔ علاوہ ازیں تواریخی فسانوں میں نہ تو واقعات کی صحت اور تقدیم و تاخیر کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ اشخاص فسانہ کی حیثیات اور اُنکے افعال و اقوال میں باہمی مناسبت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جن پر پوری توجہ کرنے سے شکسپیر بے کامیاب و بیش ڈراما نگار ہو گیا۔ ان خصوصیات کی طرف ہم اُردو مصنفین کو بھی خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ جسقدر یہ چیزیں ضروری ہیں اُسیقدر ہمارے ہاں ان سے اغماض برتا جاتا ہے

دوسرا ممتاز فسانہ نگار اس صدی کا **ٹامس ڈیلونے** ہے جو ۱۵۴۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۰۰ء میں مرا۔ اپنی عمر کے آخری چند سالوں میں اُس نے کئی نہایت عمدہ فسانے لکھے ہیں۔ جنکی ترتیب واقعات و طرز ادائے مطالب کا طریقہ زیادہ سہل اور مکمل ہے۔ اشخاص متعلقہ فسانے کو بیان کرنے میں اُس نے زیادہ موثر پیرایہ سے کام لیا ہے۔ ظرافت کی چاشنی بھی اس میں موجود ہے۔ اُسکی کامیابی کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ کو سادگی سے بیان کرنے پر قناعت کرتا ہے اپنے ذاتی تجربہ اور ہمیشہ مشاہدہ سے کام لیتا ہے۔ اور اشخاص فسانہ کی جن حیثیات اور خصوصیات کے متعلق ہمکو کافی علم ہے وہاں تک پہنچا یا ہے لیکن اسکے بعد کئی صدیوں تک اس طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ [illegible] اور [illegible] غیر معمولی قدر [illegible] عزت سے گرا دیا۔ عوام سمجھنے لگے [illegible]

قصے پڑھنے اسٹیج پر دیکھنا زیادہ پسند کرنے لگے لیکن اس فن کی قسمت میں ترقی کرنا لکھا تھا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے
وسط میں فرقۂ "پیوریٹان" کے غلبہ کی وجہ سے ڈرامہ کا زور کم ہوا۔ چارلس اول کے قتل اور انگلستان میں جمہوریت کے قیام سے
اس پرجوش مخلص مذہبی فرقہ کو ملک میں کامل سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔ کرامویل کی شمشیر، ملٹن کے دماغ و قلم نے انکی عظمت
تمام یورپ میں قایم کر دی۔ "پیوریٹان" مذہباً اور اعتقاداً تمام تفریحات اور رقص و سرود کو برا سمجھتے تھے انکو ڈرامہ اور تھیٹر سے
سخت نفرت تھی۔ چنانچہ انہوں نے تمام تھیٹر ہاؤس بند کر دیے اور ڈرامہ کی طرف کچھ التفات نہ کیا لیکن ڈرامہ کی بے قدری اور
انحطاط نے بھی اس فن کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا۔ لوگوں کو مذہبی اختلافات اور سیاسی مناقشات کا میدان
دماغی تگ و تاز کے لیے مل گیا اور دوسری جانب عنان توجہ موڑنے کا انکو موقعہ نہیں ملا۔

اٹھارھویں صدی میں البتہ ہم اسکو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں۔ گو ابتدائی صدی کے فسانے
کچھ زیادہ دلچسپ دلانیوالے نہیں ہیں۔ "سوفٹ" نے قدرتاً وہ تمام اوصاف پائے تھے جو فسانہ نگاری کے لئے
ضروری ہیں لیکن اُس نے اپنے فسانوں کو ہجو نویسی کا آلہ بنایا دوسرا اُستاد اس فن کا "ڈانفیو" ہے اُسکا
فسانہ "رابنسن کروسو" اُسکا استادی کا بین ثبوت ہے لیکن رابنسن کروسو اور اسکی دیگر تصنیفات
فسانہ کی سرحد کو عبور کر گئی ہیں اگرچہ ہم اسکو ناول بھی نہیں کہہ سکتے۔

ملک میں رسالوں اور میگزینوں کے جاری ہونے سے اس فن کو بہت ترقی ہوئی کیونکہ
"شارٹ اسٹوری" دفسانہ کو کتابی صورت میں شائع کرنیکا دستور نہیں تھا۔ ان رسالوں میں بعض بہت عمدہ
فسانے چھپے گئے۔ اور انکو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک فسانہ ہے جو محض من کی
جدت ہے۔ خیالات کی رنگینی اور واقعات کی دلچسپی کے لحاظ سے فن کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن علانیہ اخلاقی
وعظ اور ناصحانہ صلاح و مشورے کی تلخی اسمیں اسقدر موجود ہے کہ تخیل کی چاشنی اور محاکات کی شیرینی
اسکو دور نہیں کر سکی ہے۔

انیسویں صدی میں جو ترقی اس فن کو ہوئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ انگریزی نثر اس صدی
مکمل اور تمام خصوصیات انشا پردازی سے مالا مال ہو گئی تھی۔ اخبارات اور میگزینوں کی کثرت نے
اسکی ترقی میں بہت مدد دی۔ اسلئے انیسویں صدی "فسانہ کی صدی" کہلاتی ہے۔ مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر اس صدی کے فسانوں کی خصوصیات اور انکی ارتقائی حالت پر کچھ روشنی
ڈالیں۔ سب سے پہلے ہم فسانے کی اخلاقی حیثیت کو لیتے ہیں۔ اس صدی کے فسانوں میں بھی اخلاقی تعلیم

کی چاشنی موجود ہے لیکن ان میں اور ان کے پیش روؤں میں بڑا فرق ہے۔ اٹھارہویں صدی کا ایک مشہور فسانہ نویس ہاکسورتھ (Hawkesworth) ہے اُس کے فسانوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اُس کے دماغ میں اخلاقی درس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور بعد میں وہ اُسکے اظہار کا طریقہ دریافت کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ اسلئے اسکے قصّے اخلاق کے غیر ضروری بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اس کا بار پڑھنے والے کا دماغ بھی محسوس کرتا ہے۔

اُنیسویں صدی کا ایک مشہور آفاق فسانہ نگار (Hawthorn) ہے وہ قصہ اور اخلاق میں پورا توازن قایم رکھتا ہے۔ اور اگر ہم اُسکے اخلاقی درس کی نوعیت کو معلوم کرنا چاہیں تو یہ قصّہ میں اسقدر چھپا ہوا ہے کہ پہلے ہمکو قصہ کا خول جدا کرنا پڑیگا۔ ایک کی بے قدری اور ناکامی۔ اور دوسرے کی ہر دلعزیزی اور کامیابی کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔

دوسری خصوصیت اس صدی کی ماہرین فن کی یہ ہے کہ قصہ کی ترتیب اور مطلب کی وضاحت اور عبارت کی خوبی میں وہ اپنے متقدمین سے بہت آگے بڑھے ہوتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں یہ فن خارجی اسباب کے ماتحت ترقی کر رہا تھا لیکن انیسویں صدی میں لوگوں نے اسکی ارتقائی حالت کا اندازہ کرکے یہ رائے قایم کی کہ اسکی ترقی اندرونی اسباب کے زیر اثر ہونا چاہیئے۔ اور ابتدا ہی سے انہوں نے اس ترقی کا ثبوت دیا۔

سب سے زیادہ ضروری چیز فسانہ نگار کے لئے یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے ذہن میں قصہ کی غرض و مقصد معین کرے۔ اور اس بات کا پوری طرح اندازہ کرلے کہ وہ ناظرین کے دل پر قصہ کا کیا اثر کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر اُسی کے متعلق پلاٹ سین۔ کیرکٹر اور الفاظ و محاورات کا استعمال کرے قصہ کے مقصد پر اسقدر زبردست گرفت ہونی چاہیئے کہ کسیوقت ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اور غیر ضروری بے ربط چیزوں کو ہرگز قصہ میں داخل نہ کرے۔

ناول میں بیشک یہ خامیاں نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔ اور ممکن ہے کہ انکی وجہ سے اسکی خوبی میں کوئی فرق نہ آئے۔ لیکن اسٹوری کی تمام خوبیاں سے اجتناب کرنے پہنچنے [illegible] کے مشہورۂ آفاق ناول نویس تھیکرے اور ڈکنس ان باتوں کا خیال رکھتے تھے [illegible] دلچسپ اور مشہور ناول لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ تھیکرے نے [illegible] ناول کے مقصد کو [illegible]

گیا ہے۔ اور ڈکنس نے بہت سے ایسے اشخاص اپنے ناولوں میں داخل کرتے ہیں کہ جن کو اصل واقعہ سے
کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن انہی اسباب سے جو بوقلمونی اور رنگینی پیدا ہوگئی ہے وہ بے ربطی اور غیرضروری
طوالت کا کافی معاوضہ ہو جاتی ہے۔ فسانہ میں بے ربط اور غیرضروری چیزوں کا داخل کرنا ایسا
ہی ہے جیسا کہ ایک بہت چھوٹی تصویر میں بڑے برش سے بہت سا رنگ بھر دیا جائے ظاہر ہے
کہ تصویر کی خوبصورتی اس سے قائم نہیں رہ سکتی لیکن ان اصولوں کی پابندی اسوقت تک
ناممکن ہے جبتک کہ قصہ اور اسکے مفہوم و مقصود خود سہل اور آسان نہو۔ اس سے یہ مراد
نہیں ہے کہ یہ بالکل سطحی اور ادنےٰ درجہ کے ہوں۔ فسانہ نگار کی علمیت اور قابلیت کے موافق بلند
اور اعلیٰ ہونا چاہیئے "ہوتھارن" نے نہایت سادہ اور سلیس قصوں میں نہایت مشکل مسائل اور
دقیق نظریات سے بحث کی ہے۔ لیکن بلندیٔ مضامین اور علوئے مقصد میں اس نے پیچیدگی کو
دخل نہیں کیا ہے۔ اسلئے کہ مفہوم و عبارت کی پیچیدگی کو داخل نہیں کیا ہے۔ اسلئے کہ مفہوم و عبارت
کی پیچیدگی اور طوالت دونوں لازم و ملزوم ہیں اور جہاں طوالت ہوگی وہاں ضروری اور غیرضروری
میں امتیاز قائم رکھنا دشوار ہو جائیگا۔ فسانہ کا طرز تحریر ایسا ہونا چاہیئے کہ جس سے پڑھنے والے کا
دماغ ایک خاص اثر محسوس کرتا ہے۔ اور اسکا ذہن مختلف اثرات اور گوناگون کیفیات کی وجہ سے
اپنے مرکز سے جنبش نہ کرنے پائے۔ یہ بھی اسی حالت میں ممکن ہے کہ لکھنے والے کا ذہن مقصد خاص کے
سوا کسی دوسری جانب منتقل نہو۔ اور گریز و انتقال سے وہ حتی الامکان پرہیز کرے۔ ڈرامہ کے
اثرات انسان کی طبیعت پر مختلف ہوتے ہیں لیکن فسانہ کے اثر میں یگانگت ہونی چاہیئے۔ یہ تمام خصوصیات
انیسویں صدی کے فسانہ نگاروں میں بوجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ اور انہی کی وجہ سے اس فن نے
انگریزی میں ایک مکمل اور مستقل فن کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

اس صدی کے فسانے اختلاف اور موضوع کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ انسانی دلچسپی اور انسانی
جذبات کی کوئی ایسی قسم نہیں ہے جس پر وہ حاوی نہوں۔ غضب۔ خوف۔ رحم۔ محبت اور دیگر متضاد
جذبات کا جلوہ ہم ان میں دیکھ سکتے ہیں۔ بہشت و دوزخ۔ زمین و آسمان کے متعلق ان میں مباحث
موجود ہیں۔ بہائم صفت اہل اور فرشتہ صفت کردار کی مثالیں ہمارے سامنے پیش کرتے
ہیں۔ ایسی کہانیاں بھی ہیں جو بچے پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان میں ایسے مسائل سے

بھی بحث کی گئی ہے کہ جنکو سمجھنے مین عالم عاجز رہ جاتے ہین۔ فرضی قصوں کا پڑھنے والا بھی
اُن سے حظ حاصل کر سکتا ہے۔ اور نفسیات کا مطالعہ کرنیوالا بھی بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ سطور بالا جو کہ ایک انگریزی مضمون کا ملخص ہیں۔ ناظرین کو یہ اندازہ کرنیکا موقعہ ملگیا ہوگا کہ فسانہ نگاری
کیا چیز ہے۔ اور اس فن کو کن اسباب کے ماتحت اور کن خصوصیات کے ساتھ ترقی کرنا چاہیے
میرا مقصد ان سطور کے لکھنے سے یہ ہے کہ وہ حضرات جو اُردو میں اس فن کو داخل کرنا چاہتے
ہیں اور جن کی قابل قدر کوششوں سے اسکا سلسلہ ہماری زبان میں شروع بھی ہوگیا ہے
وہ معلوم کر سکین کہ انگریزی مین اس فن کی کیا کیفیت ہے اور اس حد تک پہنچنے کے لیے اُردو
فسانوں کو ابھی کسقدر اور ترقی کی ضرورت ہے۔ اُردو میں اس فن کی کامیابی اور ترقی زیادہ تر
انگریزی خوان حضرات کی توجہ پر منحصر ہے لیکن سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ریویو نگار
اور نقاد صاحبان بھی اپنے قلم کو حرکت دین اور ہر ایک فسانہ کے متعلق کافی غور و فکر کے بعد اپنی
منصفانہ اور بے لوث رائے ظاہر کرکے فسانہ نگارون کی رہنمائی کرین۔ ہماری زبان کو اور نیز
قوم کو مبصرانہ مذاق کے فقدان سے جو افسوسناک نقصان پہنچا ہے اور لٹریچر میں جسطرح
رطب و یابس کا ایک بیکار ذخیرہ جمع ہوگیا ہے وہ اسقدر ظاہر ہے کہ بیان کرنیکی ضرورت نہیں
اسلیے اگر فسانہ نگاری کی جانب ریویو نگار صاحبان نے بہت جلد توجہ نہ کی۔ تو ہمیں خوف ہے
کہ اس جدید فن کا بھی اُردو میں وہی افسوسناک حشر ہوگا جو ناول کا ہوا۔ اور جسکی وجہ سے
ادبیات کے اعلیٰ فن "تمثیل" یعنی ڈرامہ کی ابھی داغ بیل بھی نہین پڑی ہے۔

حامی الدین

خیالات پریشان

تھے کھلے ہوئے میرے بال و پر مین قفس سے اُڑ نہ سکا مگر
یہ ہے دل کے ذوق پہ منحصر نہیں بال و پر کا معاملہ

(محروم)

سودائے خام کو پختہ جنون ہوئے زمانہ ہوا تھا۔ دل کی خلش رفتہ رفتہ ٹیس سے بدل گئی تھی۔ درد دل اپنی حد سے متجاوز ہو چکا تھا لیکن یہ خیال دل مین جاگزین تھا کہ میرے شاہین تخیل کے پرواز میں قوت رسا ہے کہ آسمان حسن کے اُس چمکتے ہوئے تارے کو جو اندھیری اور سنسان راتون میں بہ نسبت اپنے دوسرے مجلسون کے زیادہ خوبصورتی اور دلفریبی کا ثبوت دیتا ہے نہ صرف سحر کر سکتا ہے بلکہ توڑ لا سکتا ہے۔ اور اپنے پر اثر حملون سے ان گندم نما جو فروش ہمنشینون کو جو جھوٹ اور ملمع سازی کے ساتھ کسیکی زنجیر اطاعت میں بندھے ہوئے نظر آتے ہین پراگندہ و منتشر کر سکتا ہے۔ گو یہ ہوائی بات تھی لیکن ایسے خیال کے استحکام کا باعث شاید گذشتہ قابل رشک راتون اور دنوں کی اُس لذت بخش خصلت کی یاد تھی جو یکجہتی اور موالست اور اُن باہمی تعلقات سے خیر یاکر انسان کے دل میں بیٹھ جاتی ہے اور پھر نکالے نہیں نکلتی جس کو لوگ عشق اور محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس عالم میں انسان زمانہ کے حوادث و انقلاب کو انقطاع محبت کا باعث قرار دیکر رنج و غم سہنے کا عادی ہو جاتا ہے اور فریب خوردہ دل باوجود بار بار فریب کھانے کے بھی اُن سے وفا کی امید رکھتا ہے جنکی سرشت بیوفائی اور جن کا شیوہ نمک پاشی ہو

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی   میں دل ہون فریب وفا خوردگان کا

عالم فراق میں ہمیشہ محبت کے طلسمی قفس کی تیلیان زیادہ مضبوط اور نہ ٹوٹنے والی نظر آتی ہین۔ امید بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ گو اس سے درگذر کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن سب [illegible] جفاکاری اور ستمگاری کے سوائے لطف و مہر کا کوئی پہلو بھی [illegible] ترقی جنون کا باعث ہوتے ہین اور سب اسی طرح جنون کی [illegible] ہو جاتی ہے تو سودائے [illegible] در و بام محبت کے سرشار کو اپنی دھن مین زمانہ بھر کی ٹھوکرین و رخاک

چھانی پڑتی ہے۔ اور اسکی قوت متخیلہ کو متحرک کرنیوالی اور اسکے دلکو بیچین و بیتاب کرنیوالی وہی مٹی کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے جس کا نقش اولین صفحۂ دل پر اُتر جانے کے بعد کسی دوسرے کا نظر ون میں سمانا غیر ممکن ہے۔

عالم شباب میں طائر محبت کی بلند پروازیاں اسقدر بڑھ جاتی ہیں کہ ناممکنات بھی اُس کے حد خیال میں ممکن نظر آتے ہین۔ خیالات کا توسن شوخ رفتار اپنی ابیلی چالون اور دل خوش کن انداز حرکات سے نچلا بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ کسی کے دل میں کیفیت وجدانی ہو تو وہ اچھی طرح اُن لذات روحانی سے مستفید ہو سکتا ہے۔ جو نفیس اور لطیف طبائع کو خالق کی طرف سے ملتی ہین۔ وہ دل جو پاک محبت سے لبریز ہوکر بادۂ عرفان کا ذوق شناس ہو۔ وہ دل کسیکی ہر ادا کو کس کس جوش اور کس کس تمنا سے دیکھتا ہو اُس سے پوچھو کہ محبت کیا شے ہے عجیب عالم وجد ہے۔ عجیب عالم رقص ہے کہ جسکی محفل میں شمع محبت ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ خیالات متشکل ہوکر تمام عالم سے بے نیاز بنا دیتے ہین۔ اور سوائے اُس وجود کے دوسری چیز مایۂ راحت و شادمانی نہین ہو سکتی جس کو اُس کے پاک اور شریف دل نے سچے طور سے چاہا ہے کسیکی گلی کے ذرّے ذرّے سے اُسکو محبت کی بو آتی ہے۔ دنیا دلکش سے دلکش مناظر پیش کرتی ہو تو پیش کرے یہان اُس صورت کے آگے سب ہیچ و ناکارہ ہے جس کی ہمیشہ پرستش کیگئی ہو اور کیسی پرستش جس مین بجز صدق و محبت کے ریاکاری کا شائبہ بھی نہو۔ آہ اگر ایسی چیز انقلابات روزگار اور فلک شعبدہ باز کی نیرنگیون کے باعث چھٹ جائے تو اُس خون شدہ دل کی حسرتون اور ارمانون کا حال اُس سے پوچھو جسپر بیتی ہو۔ مجنون کا مدعائے اصلی اگر کوئی چیز تھی تو وہ لیلیٰ ہی تھی۔ کوہکن کی زندگانی کا راز اُس تیشہ میں تھا جس سے سر پھوڑ کر مرگیا۔ پروانہ کی حیات ابدی کا راز اُس شمع جانگداز کی لو میں ہے جسپر بے تحاشا گر کر اُس نے جان دیدی مقصود دلی کا حصول مایۂ راحت و مسرت ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے پروانہ کی موت ایسی قابل رشک اور سبق آموز الفت ہے کہ جس کو اہل بصیرت ہی کیا خوب جانتے ہین ؎

پروانہ کا حال اس محفل مین ہے رشک کے قابل اہل نظر　　(اکبر الہ آبادی)
اک رات میں پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

یعنی جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ جو کچھ پانا تھا پاچکا۔ اتفاق اللذات کا انجام دلی تمنا پر ہوا۔ جہان

پہنچنا تھا پہنچ گیا ؎

رشید آغاز الفت سے کہیں انجام بہتر ہو　　کہ بحر عشق کے ڈوبے لب کوثر نکلتے ہین ٭ رشید لکھنوی

والے اس نامراد عاشق کے جو کسیکی قدمبوسی سے دور رہا۔ تنہائی کی صحبتیں کیا فائدہ بخش ہو سکتی ہیں جبکہ محبوب دلنواز سے دوری ہو۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

کسیکی یاد میرے دل میں ہے۔ کسیکا دیا ہوا درد میرا رفیق تنہائی ہے۔ آنکھیں بادۂ محبت سے سرشار ہیں۔ دماغ ابتک اُسی بوئے دلاویز سے مست ہے اگر کوئی میرے نزدیک حسن مجسم ہے اور سراپا عشق تو مجھے سخت تعجب ہے کہ (وہ مجھ سے الگ کیون ہے) کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدائے تلاش یہ اُسکی یاد میرے خون کے ہر قطرے میں بیتابی و بیقراری پیدا کر دیتی ہے۔ دل دریائے محبت کے طوفانی تھپیڑوں سے پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ جسم کی ہر ہر رگ کے ہر ہر قطرۂ خون میں ایک قوت متحرکہ پیدا ہوجاتی ہے جس سے بیکلی اور بیتابی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جس خیال میں سوتا ہون اُسی خیال میں اُٹھتا ہون۔ اگر یہ خوش قسمتی ہے تو میں خوش قسمت ہون۔ اگر اس کے برعکس ہے تو مجھکو اسی میں لذت ہے۔ خلوت میں وہ چیز میرے پاس ہر وقت موجود ہے۔ جو قسام ازل نے میری سرنوشت میں لکھدی تھی۔ وہی مونس وہی ہمدم اور وہی دمساز ہے۔ اُمید موہوم کے طلسمات میں گھرے ہوئے دل کو بعض اوقات ایسی گوناگوں روحانی مسرتیں بھی حاصل ہوجاتی ہین جن کو میں ہی خوب جانتا ہون ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

ہم انجمن سمجھتے ہین خلوت ہی کیون نہو　　(غالب)

(سید معجز حسین لکھنوی)

فردوسِ شدادابنِ عاد

بہت سی اقوام صفحۂ دنیا میں پر نمودار ہوئیں اور عروج و زوال کے نقشے دکھا کر نابود ہوگئیں۔ انکا مختصر ذکر یا تو کتب سماوی مین موجود ہے یا انکا پتہ وہ آثار قدیمہ دے سکتے ہین جو انقلاب ارضی سے سطح زمین پر ظاہر ہوئی۔ جاپان۔ سیام۔ ریاستہائے ملدیا اور اقوام مغرب کی کسی کہنہ و مستند تاریخ کا پتہ نہیں۔ اگرچہ Historian History of the world مترتب ہوچکی اور ہوتی رہیگی۔ لیکن اس کے حصۂ تواریخ سے ہرگز اتفاق رائے نہیں کیا گیا۔ جو زمانۂ قدیم سے تعلق رکھتا ہے یونان۔ ہندوستان نیز روستہ الکبریٰ کا پر عظمت تمدن اگرچہ صفحات تاریخ پر کسیقدر وضاحت سے دکھلایا گیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ بھی متناقض اجزا کا ایک شیرازۂ پریشان نظر آتا ہے۔ جملہ قدیمی سرزمینوں میں مصر کو بوجوہ خاص بعض ایسی خصوصیات حاصل ہین جو کسی دوسرے خطہ کو ہرگز نصیب نہیں۔ اسکی تاریخ کا زیادہ تر دارومدار آثار فن تعمیر ہے۔ بلکہ یہ کہنا نادرست نہوگا کہ وہ آثار بجائے خود ایک تاریخ ہین۔ جو ورق الارض پر ثبت کرتے رہے گئے۔ اور مورخین کو اسی پر تاریخ مصر لکھنے کی جرات ہوئی "تاریخ نویسی کو مستقل فن کی حیثیت صرف عہد اسلام میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کے پیرو دنیا کے جس حصہ مین پہنچے وہان کے حالات سے پوری پوری واقفیت بہم پہنچائی اور اسکے قلم بند کرنیں ساعی رہے" ہمارے زیر نظر اسوقت جو مضمون ہے۔ اسکی صداقت کا زیادہ تر دارومدار مفسرین کے بیان پر ہے۔ حقیقت پر روشنی ڈالی جاچکی ہے اور مزید واقفیت کے لئے کوئی ایسا ذریعہ نہ تو ہمارے پاس ہے اور نہ مورخین فرنگ کے پاس جو معاملہ کو روز روشن مین لانے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوسکے۔

قرآن مجید مین دو جگہ اجمالاً ارم ذات العماد کا ذکر آیا ہے۔ جسپر مفسرین نے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے بیان صرف ایک تاریخ کا اقتباس معرض تحریر میں لانا منظور ہے جسے مصنف Methousand and one nights نے تاریخ فردوس شداد "کے عنوان سے درج کتاب کیا ہے۔ اور بشرط فرصت ... ... کہ ان اقوال و آثار کو بھی مضمون ہذا میں شامل کردیا جائے۔ جو مورخین و علمائے حضرات ... ... میں ظاہر کئے ہین "

Translation
Tributiis - وان ہمبر (جرمن پروفیسر) اپنی تصنیف ٹری بیوٹیز ٹرانسلیشن
جلد ۳ صفحہ ۲۹۹ میں لکھتا ہے کہ "اس شہر کا قصہ عرب دیگر مورخین نے بجائے خود مسیحائی سے
قلمبند کیا ہے - اور ہمیں بلحاظ روایت قدیم ہونے سے اسمیں شک و شبہہ آنیکی حاجت نہین - علامہ
ابن خلدون شارحین قرآن کے تخیل بلند پرواز پر عاقلانہ نکتہ چینی کرتا ہوا ارم ذات العماد کی نسبت
یہ کہکر خاموش ہو جاتا ہے - کہ "ارم ایک نہایت پرانی قوم کا نام ہے اُس قوم کے لوگ عظیم الجثہ
اور طویل القامت تھے - عماد چوب خیمہ یا ستون کے معنون میں مستعمل ہوتا ہے لفظی مناسبت کو مدنظر
رکھتے ہوئے ہمین شہر کی اصلیت پر یقین لانے میں کسیقدر دقت ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن روایات
کے اعتبار سے ہم شک و شبہہ کے اظہار سے عاجز ہین" گو ابن خلدون کی اس اختصار نویسی کو مطمح نظر قرار
دیتے ہوئے ہم کسی مزید اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اسکی سچائی کا اعتراف مذہبی
نقطۂ خیال سے کرتا ہے - بہرکیف ہم تسلیم کرتے ہین کہ چونکہ شہر کی عمارات ستونوں پر تعمیر کی گئیں تھین
لہذا انطباق لفظی مفسرین کے قول کو تصدیق کے درجہ تک پہنچانے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے -

بیان کیا گیا ہے - کہ عبد اللہ ابن قلابہ اپنے اونٹ کی جستجو مین نکلا - جب وہ الیمن اور سبا کے
صحرا کو عبور کر رہا تہا - اتفاقاً وہ ایک ایسے شہر کے قریب جا پہنچا جو بیشمار قلعون سے گھرا ہوا تھا
اور اس حصار کے گرد سر بفلک ستون ایستادہ تھے - جن پر عظیم الشان عمارات کا سلسلہ حد نظر تک پھیلتا
ہوا چلا گیا تہا - دریائے حیرت میں غوطے کھاتا ہوا وہ آگے بڑھا - اور اس نے خیال کیا کہ ممکن ہے
اس شہر کے باشندون سے میرے کھوئے ہوئے اونٹ کا کچھ سراغ ملے لیکن وہ یہ معلوم کر کے
بحر تحیر میں غرق ہو گیا کہ شہر بالکل سنسان پڑا ہے - اور کوئی ہستی اس سکون فنا کو متحرک
کرنے کے لیے موجود نہیں -

عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں اونٹنی سے نیچے اتر پڑا - اور توکل زانوئے اشتر بند پر عمل پیرا
ہو کر شہر پناہ کے قریب پہنچا - اور ایسے عظیم الشان کوہ پیکر دروازے میرے دیکھنے مین آئے جن کی
مثال صفحۂ دنیا پر ڈھونڈھے سے نہیں ملسکتی - ان کے بیرونی جانب جواہرات اور یاقوت کا ایسا
عجیب کام ہو رہا تہا کہ مہری قوت باصرہ کام نہ کرتی تھی - وہ دروازے صناعی کا ایک بہترین نمونہ تھے
[illegible] کے عالی [illegible] ستون سے تھامے

ہوئے آگے بڑھا۔ عظمۃ للہ بڑے بڑے ستونوں پر فلک پیما گنبد دار محل ایستادہ ہیں۔ اور انکی ہر ایک دالان نہایت کشادہ اور سونے چاندی سے تعمیر کیا گیا ہے لعل و جواہرات اور آبدار سے آرایش دیا گیا ہے۔ ان محلات کے دروازے خوشبودار لکڑی سے بنے ہوئے تھے! اور ان کا فرش بڑے بڑے موتیوں کو تراشکر بنایا گیا تہا۔ فرش کی درزوں میں مشک و عنبر اور زعفران سے پر کیا گیا تہا جسکی خوشبو سے میرا دماغ طبقہ عطار بن گیا۔ اسی حالت میں شہر کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ رو سیں وہاں آدم کی نسل سے کوئی انسان موجود نہ تھا۔ در و دیوار پر حسرت انگیز خوفناک خاموشی برس رہی تھی۔ اور دھیمی دھیمی ہوا ماتمی لے میں کسی نامراد کا نوحہ پڑھ رہی تھی۔

علاوہ ان عمارات کے بڑے بڑے ستون یاقوت کے ایستادہ تھے۔ اور ان پر شامیانے نصب تھے جن پر زردوزی کا کام ہو رہا تہا۔ اور مختلف قسم طلائی پھولوں میں جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ جن کی جوت سے اطراف و اکناف کے در و دیوار جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ جب میں ایک محل کی چھت پر چڑھا تو وہ دریا اور نہریں بھی نظر پڑیں جو مختلف شاہراہوں میں بہہ رہی تھیں۔ آب رواں سے قرمزی کنارے پر اتہا۔ شروار طویل طویل ناریل کے درخت لہلہا رہے تھے۔ جن کی سیاہی مائل سبزی سے خشت ہائے سیم و طلا کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ اللہ اللہ وہ بہار کا عالم تہا جسے دیکھکر خیال آیا۔ لاریب یہ وہی فردوس ہے جس کا وعدہ ہم سے کیا گیا ہے۔

عبداللہ کہتا ہے کہ میں نے جی بھر کر جواہرات اور مشک اٹھا لیا۔ جو بطور کنکر اور ریت کے بچھا ہوا تہا۔ اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر ملک کو واپس ہوا۔ گھر پہنچکر میں نے اس حیرت انگیز واقعہ کی اطلاع لوگوں کو دی۔ رفتہ رفتہ یہ خبر معاویہ بن ابو سفیان کو پہنچی جو اسوقت حجاز میں تخت خلافت پر متمکن تھے۔ خلیفہ نے علاقہ یمین کے شہر سبا کے حکمران کی معرفت مجھے دربار میں طلب فرمایا۔ چنانچہ میں حاضر ہوا۔ اور جو کچھ آنکھوں دیکھا تھا بجنسہ حضور خلیفہ میں عرض کر دیا اور بطور سند جو کچھ اپنے ساتھ لایا تہا وہ بھی پیش کر دیا۔ محض اس خیال سے کہ شک و شبہہ کی گنجایش باقی نہ رہے۔ مشک کی خوشبو کچھ ہلکی پڑ گئی تھی۔ اور موتیوں کی آب و تاب کم ہو کر زردی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

مزید واقفیت بہم پہنچانے کی غرض سے معاویہ نے کعب الاحبار کو طلب کیا۔ اور استفسار فرمایا

"کیا آپکو کسی ایسے شہر کا علم ہے جو سیم و زر سے تیار کیا گیا ہو۔ جس کے ستون لعل و جواہر اور یاقوت سے بنائے گئے ہوں جس کے فرش پر موتی جڑے ہوں۔ جہاں بجائے مٹی کے مشک و عنبر پیس کر بچھا یا گیا ہو" عرض کیا البتہ وہ ارم ذات العماد ہے جس کی مثال تختہ زمین پر نہیں ملسکتی۔ رسول اکرم (صلعم) نے اس کے صفحہ دنیا پر قایم ہونیکو اور قیامت تک موجود رہنے کو تسلیم کیا ہے اس کا بانی شداد بن عاد اعظم ہے۔ چنانچہ حسب فرمایش خلیفہ معاویہ کعب الاحبار نے اسکی تاریخ اس طرح بیان کی۔

عاد اعظم کے دو پسر شدید اور شداد نامی تھے۔ عاد مر گیا اور سلطنت اسکے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ شدید کچھ زیادہ عرصہ شادکام نہ رہ سکا۔ بلکہ موت نے فنا کا تلخ جام پلا کر اسے ہمیشہ کے لئے آغوش قبر میں سلا دیا۔ اب شداد اس عظیم سلطنت کے تخت و تاج کا واحد مالک ہوا روئے زمین کے سب بادشاہ اس کے خراج گذار تھے۔ دولت بیشمار۔ اور دنیا زیر نگیں۔ مذہبی کتابوں کے دیکھنے اور علما فضلا کے جمع کرنیکا شوق تہا۔ کتابیں پڑھتا۔ اور ان کی صحبت سے لطف اٹھاتا جہاں یہ مشغلہ تھا وہاں عیش پرستی کا مادہ بھی اسکی طبیعت میں [illegible] دیا گیا تھا۔ وسعت حکومت کے ظاہر خیال سے دماغ کو نخوت و تکبر کا نشیمن بنا رکھا تھا۔ چنانچہ اسے مذہبی کتب کے مطالعہ سے ایک بہشت میں دنیا میں بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ دربار کے عاقل و فرزانہ امراء سے مشورہ کیا۔ اور فن تعمیر کے ماہر دنیا کے ہر گوشہ سے طلب کئے گئے۔ اور انہیں فردوس ارضی کی بنا رکھنے کے لئے بہترین موقعہ اور محل منتخب کرنے کی غرض سے روانگی کا حکم دیا گیا۔"

محمد یحییٰ اشہر

افراط و تفریط

مذہب کا مقصود عالم میں صرف اخلاق کا درست کرنا اور روحانیت کا رواج دینا ہے۔ اس کا مدعا
ہے کہ انسان باہم امن و صلح سے زندگی بسر کرے اور ان قوتوں سے جنہیں قدرت نے اس کے
اندر ودیعت کیا ہے کام لے اور دنیا میں تمام وہ ترقیاں حاصل کرے جو ذہن و فہم سے حاصل ہو سکتی ہیں۔
اسطرح وہ خلیفۃ اللہ ہونیکا پورا حق ادا کر جائے۔ رہا یہ امر کہ وہ کیا تدابیر اختیار کرے۔ کن علوم کو حاصل کرے
کس طرح اپنے قوائے ذہنیہ سے کام لے یہ خود انسان کے فہم و فراست سعی و انہماک اور اس کے قوت تمیز پر چھوڑ دیا
گیا ہے۔ اور مذہب اس سے بحث نہیں کرتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن علاوہ احکام مذہب و شریعت
کے بہت سے مسائل حکمیہ بھی بتاتا ہے جن پر ایمان لانا اس حیثیت سے کہ وہ منصوص ہیں ہمارا فرض ہے۔
ممکن ہے یہ خیال اس حد تک صحیح ہو کہ وہ مسائل حکمیہ اور تمام علوم کے حاصل کرنیکی ترغیب دیتا ہے۔ اور یہ
بھی ممکن ہے کہ کہیں کہیں اس کے اندر بہ سبیل تذکرہ کائنات کی کسی چیز یا موجودات عالم میں سے کسی شے،
یا محسوسات میں سے کسی محسوس امر کی نسبت ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو کہ وہ مفید تجربہ و یقین معلوم
ہوتا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ علوم نظری کی کتاب ہے کہ اسکے اندر مسائل فلسفہ سے بحث کی گئی
اور نہ حکمت عملی کی کوئی تصنیف کہ اس کے اندر موجودہ سائنس کے مباحث تلاش کئے جائیں۔ بلکہ وہ تو
صرف روحانیت کا درس دینے والی۔ اخلاق درست کرنیوالی کتاب ہے۔ جس کا تعلق حقایق اشیا اور
استدراک علت سے صرف اسیقدر ہے جتنا ہماری حسیات کو کہ جو ظاہر میں نظر آتا ہے وہی بیان کر دیا
جاتا ہے۔ اور بس اس لئے اگر کوئی شخص مسائل سائنس و مباحث فلسفہ کی تطبیق کلام مجید سے کرنا چاہتا
ہے تو وہ غلطی کرتا ہے کیونکہ قرآن نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ آسمان و زمین کی حقیقت یا پانی اور
ہوا کی ماہیت۔ سورج اور چاند کے حالات۔ یا دیگر محسوسات کی صحیح کیفیت میرے اندر درج ہے اور اسکے
خلاف جو کچھ کہا جائے غلط ہے۔ اگر تحقیقات جدیدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زمین گول ہے اور حرکت کرتی ہے
تو تعلیمات قرآنی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اور وہ علی حالہا اسیطرح قایم ہیں جس طرح زمین کو چپٹی اور
غیر متحرک ماننے کی صورت میں۔ اگر آسمان صرف حد نظر ہے تو قرآن کو اس سے کچھ واسطہ نہ

احکام اس صورت میں بھی وہی ہیں جو آسمان کے پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ بہ تہ ملنے کی صورت میں۔
لیکن ظلم یہ ہو رہا ہے کہ لوگوں نے اس سے بڑھ کر قرآن کو جھاڑ پھونک کی بھی کتاب سمجھ رکھا ہے، اور کوئی
وظیفہ کلام الٰہی کی توہین میں نہیں شمار کیا جاتا ہے۔ بغض و عداوت کے عمال عشق و محبت کے وظائف
مقہوری اعداء ہلاکت دشمن کی ترکیبیں۔ تالیف و تسخیر کے تعبیرات رویا کے احکام۔ بخار کا پتہ چلانے کے اعمال
دفع امراض کے طریقے۔ حالات مستقبل معلوم کرنے کے فالنامے۔ الغرض تمام علوم کا مجموعہ قرآن کو سمجھ رکھا ہے
اور اصل مقصود کی طرف بالکل اعتنا نہیں ہے۔ تاریخ سے کہیں پتہ نہیں چلتا کہ رسول اللہ کے عہد مبارک میں
آیات قرآنی سے اس قسم کا کام لیا جاتا تھا یا سکو روا رکھا جاتا تھا۔ اب اگر کسی عامل و ملا سے کہئے کہ جناب
زوجہ صفرا کے ہیجان سے جو تپ آتی ہے وہ اسیوقت جا سکتی ہے جب اُس ہیجان کو دور کیا جائے۔ تعویذ گنڈے
سے کیا ہو سکتا ہے۔ اگر بخارات محتبس ہو کر سر میں درد ہو گیا ہے تو وہ اسیوقت دور ہو سکتا ہے۔ جب کہ
بخارات کو زائل کیا جائے۔ سورۂ اخلاص اس لئے نازل ہوئی کہ اُس سے درد سر دور کیا جائے۔
تو آپ کو جواب ملیگا کہ کیا کلام مجید میں یہ نہیں لکھا کہ "فِیْہِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ" یعنی انسان کی شفا بھی اسمیں
موجود ہے۔ اب آپ لاکھ تدبیریں کریں وہ مرد مسلمان کبھی نہ سمجھ سکیگا کہ اس شفا سے شفاء روحانی مقصود ہے
نہ کہ شفاء امراض جسمانی۔ بہر حال عام طور سے قرآن کے اصل مدعا کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور اُسے زیادہ تر علم
نیرنجات کی قسم سمجھا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایسا عظیم گناہ ہے شرک کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور جیسے
مسلمانوں نے ایک سفلی و باطل بیکار و کاہل بنا رکھا ہے۔ میرے ایک دوست یہیں بھوپال میں ہیں جو ایک مدت
دراز سے معاش کی طرف سے پریشان ہیں لیکن حصول معاش کے لئے کوئی فکر نہیں کرتے۔ صرف وظیفہ
پڑھا کرتے ہیں۔ اور یقین ہے کہ جو کچھ ہوگا اسی طرح ہوگا۔ اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور
اس سے زیادہ ایک شخص اپنے تئیں بیکار کر دینے کی اور کیا تدابیر اختیار کر سکتا ہے۔ اِن کا ایک معمول
یہ بھی ہے کہ بعد نماز وہ کوئی دعا پڑھتے ہیں اور ہاتھ پھونک کر تمام جسم پر مل لیتے ہیں۔ دریافت سے
معلوم ہوا کہ حادثات ناگہانی سے بچنے کی تدبیر ہے۔ خدا کی شان ایک بار وہ سائیکل سے گر گئے اور سخت
چوٹ آئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا آج آپ نے اس دعا کا عمل اپنے جسم پر نہیں کیا تھا؟ بولے نہیں معمول میں تو
کوئی فرق نہ آیا تھا لیکن یہ بھی تقدیر تھی جو ٹل نہ سکتی تھی"۔ ایک مرد معقول جو مولوی بھی ہیں۔ اور حافظ
بھی۔ جو طب میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور فن وعظ میں بھی سالگذشتہ بھوپال تشریف لائے۔

اجمیر کے کسی یتیم خانہ یا مدرسہ عربیہ کے سفیر ہونے کی حیثیت سے دورہ کرتے پھرتے ہین۔ اور اسی سلسلہ میں یہاں بھی گذر ہوگیا۔ جس زمانہ میں وہ یہاں آئے طاعون شدت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے لوگوں کو اپنی طرف مالوف کرنے اور مدرسہ یا یتیم خانہ کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے تعویذ بھی لوگوں کو دیتے تھے یہ تعویذ چھپے ہوئے تھے۔ اور ایک تعویذ کی قیمت دو آنہ وصول کرتے تھے۔ دعوے یہ تھا کہ صرف لاگت وصول کی جاتی ہے۔ اور نفع مطلق نہیں لیا جاتا۔ ممکن ہے کہ لاگت میں سفیر صاحب کے مصارف سیر و سفارت بھی شامل کرلئے گئے ہون۔ اس لئے ہم نے تسلیم کر لیا کہ لاگت ہی وصول کی جاتی تھی لیکن جو اثرات اس کے بیان کئے گئے وہ اسقدر عجیب و غریب تھے کہ اِن میں سے ایک بھی صحیح نکل جائے تو پھر دنیا میں نہ کسی تجارت کی ضرورت رہ جاتی ہے اور نہ فن طب کی۔ اُن کا بیان تھا کہ ایک درویش پہاڑ سے اُتر کر دفعتاً اجمیر پہنچ گئے تھے اور اُنہوں نے اس تعویذ کو بتایا تھا اور ہدایت کی تھی کہ تین لاکھ تعویذ تقسیم کر دیا جائے۔ وبا کے لئے اکسیر ہے۔ چنانچہ مدرسے نے اس تعویذ کو طبع کرا کے دو آنہ میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ جسوقت سفیر صاحب بھوپال آئے تو وہ کہتے تھے کہ دو لاکھ سے زیادہ تقسیم ہو چکے ہین اور صرف چند ہزار تعویذ کی اجازت اور باقی ہے۔ اس لئے جو شخص مستفید نہوا پھر وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیگا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اُس تعویذ میں کیا تھا لیکن سفیر صاحب کے اس بیان اور انکی اس جسارت پر حیرت ہوتی ہے کہ دنیا میں ان کے نزدیک فہم و فراست بالکل مفقود ہوگئی ہے اور کیا ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کے بیان کی لغویت اور تعویذ کے مکر و فریب کو سمجھ سکیگا۔ چونکہ میں ایسے نیم ملاحضرات کا سخت دشمن ہون اس لیے میں نے کچھ اعتبار نہیں کیا اور چند اعتراضات کئے جسپر وہ برہم ہو کر بولے کہ "اگر آپکو یقین نہیں ہے تو بلائیے کسی حائضہ کو ابھی میں اس تعویذ کو گھولکر پلا دون دیکھیئے تو حیض بند ہوا جاتا ہے کہ نہیں" میں نے کہا جناب مولوی صاحب نہ بھی یہ کیا کوئی بڑی عمدہ بات ہے۔ ایسی حالت میں تو یہ تعویذ سخت خطرناک چیز ہے۔ اور قانوناً اسکی اشاعت ممنوع ہونی چاہیئے۔ یہ سنکر وہ بہت چراغ پا ہوئے منہ میں کف لے آئے اور خدا جانے کیا کیا کہا۔ بہرحال وہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب ہوئے اور کثرت سے اُن کے تعویذ فروخت ہوئے یہ نہیں معلوم کہ طاعون اس سے کچھ متاثر بھی ہوا یا نہیں اب غور فرمائیے کہ ایک سنجیدہ شخص ایسی صورت مین اسلام و مدعیان اسلام کی طرف سے کیا خیال قائم کریگا اور مذہب کی کیا وقعت اس کے دل میں باقی رہیگی۔ اس نوع کی کج اعتقادیوں سے نہ صرف یہ نقصان

ہو رہا ہے کہ اصل مذہب و حقیقی مدعائے کلام الٰہی مستور ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ مکر و فریب کے لئے ایسا وسیع
میدان ہاتھ آگیا ہے کہ حشرات الارض کی طرح فقیروں۔ درویشوں۔ ملانوں اور سیانوں کا گروہ پیدا ہوتا
جاتا ہے اور قوم کے سیدھے سادھے افرادوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں یہ سب نتیجہ ہے صرف اُس غفلت کا
جو مذہب کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس کا سبب جہل ہے تو ہم تسلیم نہیں کرینگے۔ کیونکہ
جہل قرون اولیٰ میں بھی تھا لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ مذہب کا صحیح مفہوم مفقود نہ تھا اور لوگ حقیقت سے
اسقدر بیگانہ نہ تھے یہ تصویر کا ایک رخ۔ اب دوسرا رخ ملاحظہ کیجیے۔ ایک گروہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ہے
جو اپنی تفریط کے لحاظ سے اسی طرح قابل ملامت ہیں جیسے وہ لوگ اپنے افراط کے اعتبار سے یہ چاہتے ہیں
کہ مذہب کی تمام باتوں کو اپنی عقل کے مطابق پائیں اور جس بات کو نہ سمجھ سکیں اُسے تسلیم نہ کریں جدید
علوم۔ حکمت و سائنس کے تمام نظریات تمام مسایل خواہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں ان کے نزدیک تسلیم کرنے کے
قابل ہیں۔ صرف اسلئے کہ مغرب کے حکما ایسا کہتے ہیں لیکن مذہب کی وہ کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ
علماء مغرب اُس کے قایل نہیں یہ حضرات کبھی غور نہیں کرتے کہ مذہب کا تعلق صرف روح سے ہے اور روحانیت
صرف اعتقاد سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ریاضت نفس اُس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اگر مذہب یہ بتاتا ہے
کہ نماز فواحش سے روکنے والی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ ایک شخص جو فواحش سے باز رہتا ہے نماز نہ پڑھے۔
کیونکہ وہ روحانیت جو پابندی نماز سے حاصل ہوتی ہے صرف اسیقدر نہیں ہے کہ معاصی سے انسان بچتا
ہے۔ بلکہ کچھ اور چیز ہے جس کا بیان صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ "تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر" الخ
اگر تمام شرائط کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ روحانیت کیا ہے اور وہ سکون قلب اور
طمانیت خاطر کیا ہے جو نتیجہ ہے پابندی نماز کا ہے۔ اسی طرح سے تمام مسائل و احکام مذہب ہیں جن میں
بیشمار مصالح پنہاں ہیں۔ لیکن اُنکو صرف عقل کے معیار سے نہ دیکھنا چاہیئے کہ یہاں عقل کا دخل نہیں ہے
بلکہ صرف عمل کا ہے اور عمل کرنے کے بعد ہی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے میں کہتا ہوں کہ آجکل جسقدر متین اور
کھلے ہوئے ثبوت نظریات سائنس کے لئے پیش کئے جاتے ہیں اُس سے زیادہ روشن اور واضح دلائل و براہین
شریعت اسلامی کے حق ہونے کے میسر آسکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حقیقی معنی میں اُسکا پابند ہو جائے اور
اپنی زندگی میں وہ کیفیات پیدا کرے جو صرف احکام شریعت کی پابندی سے پیدا ہو سکتے ہیں ان حضرات
میں جو دیا سے کفر پھیلی ہیں وہ سخت خطرناک ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام مذہبی وجوہات عادات کی

معلوم کرنے کے لئے جس طرح مقررہ اصول - مثال و مقیاس ہیں - اسی طرح روحانیت کو بھی ہونا چاہیئے
کہ اسکی حقیقت کو کس کی ترازو میں تولکر وزن معلوم کر سکیں انکی خواہش ہو کہ برکات مذہب کی اسی طرح تحقیق
کریں جسطرح ریاضی کے مسائل کی وہ یہ چاہتے ہیں کہ شریعت کو بھی مسلمات میں داخل کر کے اپنے حواس ظاہری سے
اسکو سمجھ لیں لیکن انکو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا کے پیمانہ و معیار، علوم ظاہری کے اصول و مسلمات، عالم حواس
کے افعال و اعمال یہاں بیکار ہیں اور مذہب کی حقیقت صرف اسی طرح معلوم ہو سکتی ہو کہ اسکو اختیار کیا جائے اور
پھر غور کیا جائے کہ ہماری زندگی، ہماری سعی نے کن اثرات کو قبول کیا - پھر جو لوگ براہین و دلایل کے طالب ہیں
ان کے لئے تاریخ موجود ہے وہ اسکو دیکھکر معلوم کر سکتے ہیں کہ مذہب اسلام نے کیا ترقی کی مسلمانوں نے اس دنیا میں
کیا کچھ نہیں کیا شائستگی و تہذیب کا کون سا شعبہ ہے جس کو انہوں نے معراج کمال تک پہنچا دیا اور ترقی و ارتقا کا
وہ کونسا درجہ ہے جو انہوں نے حاصل نہیں کیا یہ کوئی اتفاق نہ تھا یہ کوئی انقلاب ناگہانی نہ تھا بلکہ نتیجہ تھا صرف
پابندی مذہب کا اور کرشمے تھے - اسلام کی حقانیت و صداقت کے جوہر آج بھی اسیطرح عالم میں رونما ہو سکتے ہیں
اگر ہم اس جوش و خروش، اسی شوق و انہماک کے ساتھ اسکو اپنا معین و مددگار بنائیں مسٹر باسورتھ اپنی کتاب
محمڈا نیڈ محمڈنزم میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ زیتون کے نکاڑ دن کو اپنا خدا مان کر انکی پرستش کرتے تھے، علم ریاضی
و ابعد الطبیعت کی دور انکار بحثوں میں مذہب کی حقیقی سعی کو محو کر چکے تھے فلسفیہ ... [illegible] میں
پیدا ہو کر صداقت و حقانیت سے جدا ہوتے چلے جاتے تھے کہ محمد نے ... [illegible]
کی طرح دور کر کے لوگوں کو بتایا کہ صرف اللہ سب سے بڑا ہے اور کوئی نہیں ... [illegible]
کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہی - ہر شخص یہ جانتا ہے اور تمام مذاہب بھی درس ... یہ بالکل صحیح ہے ... اور محمد
نے بھی بار بار یہی کہا ہے کہ میں عربوں کے لئے کوئی نئی بات لیکر نہیں آیا ہوں لیکن ہاں اس عہد و پیمان کو
دوبارہ زندہ کرنے آیا ہوں جو ابراھیم کے سامنے کیا گیا تھا - پھر دیکھو کہ جب یہودیوں کی بدعت و
ضلالت حد سے گذر گئی تو ان میں یک دنت ایک لکھنے والا آیا ہے نہ اس لئے کہ انہیں کوئی بات سکھائے - بلکہ
اس غرض سے کہ جو کچھ وہ بھول گئے ہیں یاد دلائے - اسی طرح سرزمین عرب میں تین ہزار برس قبل ایک شخص
جو جنگل میں اپنے باپ کی بکریاں چرا رہا تھا - یہ پیغام لایا کہ میں وہ ہوں جو ہوں، اے اسرائیل سن سب کا
مالک ایک خدا ہے اپس جا، میں تیری زبان کے ساتھ ہونگا اور سکھاؤنگا جو تجھے کہنا چاہیئے، اس کو سنکر
بنی اسرائیل افریقہ سے ایشیا چلے گئے - غلام آزاد ہوگئے اور وہ ایک قوم بن گئے - بالکل اسی طرح سرزمین

عرب پر پھر وہی آواز ایک دستگر بکریاں چلانیوالے کی آئی اور ایسے قوی اثر کے ساتھ آئی کہ ایک ہی صدی کے اندر اس آواز کی گونج عدن سے انطاکیہ اور سیول سے سمرقند تک پہنچگئی اور تمام ملک نے اُس حقیقت کے سامنے اپنے سروں کو جھکا دیا۔"

اب دیکھو کہ مسٹر باسورتھ یا دیگر محققین مغرب نے جو اسلام کی حقانیت اور شریعت اسلامی کی صداقت کو تسلیم کیا ہے تو کیا پہلے اس اصول کے فلسفہ و حکمت سے منطبق کرکے دیکھ لیا ہے کہ کسیکی عقل اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک قوم جو صرف خدا کو ایک مانتی ہے اور رسول کو برحق دنیا میں ترقی کو اپنے لئے مخصوص کر سکتی ہے۔ بظاہر اسمیں کوئی وجہ ارتقا کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن اسکا حال تو اسیوقت معلوم ہو سکتا ہے جب رسول کی اس آواز پر ایمان لے آیا جائے اور اُن تمام کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر لیا جائے جو اس آواز کو صدق دل سے تسلیم کر لینے کی حالت میں طاری ہو جاتی ہیں۔ علاوہ اس کے پھر ایک واقعہ یہ ہے۔ اک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سرزمین عرب کا ذرہ ذرہ صرف اسی ایک قول کی وجہ سے رشک آفتاب بن گیا۔ اس لئے بجائے اسکے کہ ہم خواہ مخواہ عقل و مذہب کی تطبیق میں اپنا وقت ضائع کریں ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ واقعات و تجربات ماضیہ پر غور کریں اور دیکھیں کہ زمانہ گذشتہ و زمانہ حال میں کیا ایسا فرق ہوگیا ہے کہ ایک ہی بات جو پہلے اسقدر پر اثر تھی اب کیوں بیکار و بے سود ثابت ہو رہی ہے۔ وہی اسلام جو پہلے ہماری ترقیوں کا ضامن تھا اب کیوں مانع حقیقی بن رہا ہے۔ وہی اصول جو کسی وقت ہمارے لئے سرمایہ فتح و ظفر تھے اب کیوں ادبار و نکبت میں مبتلا کر رہے اور اگر غور کیا جائیگا تو نتیجہ ہمیشہ یہی نکلیگا کہ پہلے ہم میں اسلام تھا اب نہیں ہے پہلے ہم اصول مذہب کے پابند تھے اور اب نہیں۔ پہلے ہم احکام شریعت پر عمل کرتے تھے اور اب صرف ان کی تبلیغ کیا کرتے ہیں۔ پہلے ہمارے دل تک اثر اور اب صرف زبان سے ذکر ہے دل سے کوئی علاقہ نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتا کہ مذہب اسلام کے اصول عقل سے منطبق نہ ہوں۔ یقیناً شریعت اسلام عقلی شریعت ہے فطری مذہب ہے اور اسمیں کوئی بات ایسی تسلیم نہیں کرائی جاتی جس کو عقل غلط سمجھے لیکن بلاضرورت تمام اوقات اسی میں صرف کر دینا مناسب نہیں اور اسی کے ساتھ اگر کوئی بات اپنی سمجھ میں نہ آئے تو اسکو غلط کہدینا بھی ناروا ہے کیونکہ عقلیں مختلف ہیں بالکل ممکن ہے کہ ایک ہی بات جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی دوسرے کے لئے اسکا سمجھنا بہت آسان ہو اور جو بات ہمارے ذہن میں آجاتی ہے دوسرے کیلئے ناقابل تسلیم ہو۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیشہ سے معرض بحث میں رہی ہے اور دنیا کے تمام مذاہب والوں اور فلاسفروں نے اسپر غور کیا ہے بعض نے اسکو اچھا بتایا بعض نے برا بعض اس سے متاثر ہوئے بعض نہیں۔ اس لئے اگر ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اغیار ہی کے قول کو اپنے مذہب کے باب میں صحیح سمجھیں تو بھی کوئی وجہ نہیں کہ انہیں کے قول پر عمل کریں۔ جو مخالف ہیں کیوں نہ ہم اسکو صحیح سمجھیں جو مذہب کے موافق ہے۔ یہ میں نے صرف ان لوگوں کے حال کو دیکھکر کہا جو یورپ کی تحقیقات اور اس کے ہر قول پر ایمان لانے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں ورنہ میں تو اسکو خود اسلام اور مسلمانوں کی توہین سمجھتا ہوں کہ دوسروں کی زبان سے اپنے مذہب کی حقیقت معلوم کرکے کوئی رائے قایم کی جائے۔

میں نے جہانتک غور کیا ہے جدید تعلیم اور مذہب کے درمیان اختلاف کی وجہ صرف وہ مسائل سائنس و فلسفہ ہیں جن کی تعلیم عملی طریقے سے کالجوں میں دی جاتی ہے اور جن کے ذریعہ طلباء کو ان مسایل کی حقانیت کا ثبوت نہایت مکمل آلات کے ذریعہ سے مل جاتا ہے یہاں تک کہ وہ خود ان کے حسیات ان مسایل و نظریات کو محسوس کر لیتی ہیں اور شک کی کوئی گنجایش نہیں رہتی پھر جب وہی طلبہ کلام الٰہی یا احادیث نبوی میں ایسے امور کے متعلق کوئی خلاف بات پاتے ہیں تو تسلیم کرنے سے گریز کرتے اور سمجھنے لگتے ہیں کہ جب مذہب کی تعلیمات میں ایسی خلاف عقل باتیں پائی جاتی ہیں تو کیونکر ایسے مذہب کو سچا سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن غلطی یہی ہے کہ انہوں نے اسپر کبھی غور نہیں کیا۔ کہ آیا مذہب کسی امر کو ایک مسئلہ فلسفہ ہونے کی حیثیت سے بیان کرتا ہے یا محض عام بول چال کے لحاظ سے مثلاً تحقیقات جدید سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زمین گول اور متحرک ہے آفتاب کا طلوع و غروب کچھ نہیں ہے مگر خود زمین کی حرکت کہ جب حرکت کرتے کرتے وہ اپنے ایک محدب حصہ کو ہماری نگاہ اور آفتاب کے درمیان حایل کر دیتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ سورج ڈوب گیا حالانکہ وہاں صرف آڑ حایل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب حرکت کرتے کرتے وہ محدب حصہ سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو آفتاب نظر آنے لگتا ہے جسکو ہم کہتے ہیں کہ آفتاب نے طلوع کیا۔ اب اگر کلام الٰہی یا احادیث نبوی میں طلوع و غروب آفتاب کا ذکر اسطرح کیا گیا جسطرح عام لوگ سمجھتے ہیں یا بظاہر نظر آتا ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ حقیقت طلوع و غروب سے بحث کی گئی ہے اصل مقصود مسئلہ طلوع و غروب پر روشنی ڈالنا مقصود ہے مسئلہ طلوع و غروب تو صرف خدا کی عظمت شان ظاہر کرتا ہے اور وہ بہر الحال ہے خواہ آفتاب زمین کے گرد چکر لگائے یا خود زمین آفتاب کے گرد۔ پھر یوں بھی دیکھنا چاہیئے کہ گفتگو میں ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی ہو طلوع و غروب کے متعلق یہی کہتا ہے کہ سورج نکلا اور ڈوبا۔ کوئی نہیں کہتا کہ زمین کا محدب حصہ میرے اور آفتاب کے درمیان حائل ہو گیا یا دور ہو گیا۔

نیاز فتحپوری

جاپانی خواتین

جاپان میں بخلاف اسلام پردہ مطلق نہیں ہے مگر یورپ و امریکہ کی طرح عورت مرد کا اسقدر خلاملا بھی نہیں ہے۔ گھر کی کامل مالکہ اور منتظمہ عورت ہی ہے۔ خاوند کی عظمت و اطاعت بھی حد درجہ کرتی ہے حتی کہ اکثر خدمتیں نوکروں کے ہوتے ساتے خود بجالاتی ہے۔ خاوند کے دوستوں کی خاطر داضع میں معقول حصہ لیتی ہے۔ ان کے گھروں میں عورتیں خادمہ ہوتی ہیں جب کوئی شخص خاوند سے ملنے آتا ہے تو سب سے پہلے خادمہ دروازہ پر آکر دوزانو بیٹھ کر قریب قریب سجدہ کے جھکتی ہے اور پھر اندر خبر کرتی ہے یا کارڈ لیجاتی ہے اسکے بعد خاوند یا بیوی ان دونوں میں سے کوئی آتا ہے اور مہمان کو ملاقات کے کمرہ میں لیجاتا ہے اسکے بعد چاء آتی ہے۔ چاء لانا بیوی کا کام ہے یعنی تواضع اگر خادمہ کے سپرد کی جائے تو خلق کے خلاف سمجھا جاتا ہے چاء دروازہ تک لانے میں خادمہ مدد کرتی ہے۔ مگر وہاں ٹھہر کر مودبانہ جھکنا۔ پھر چاء اندر لاکر مہمان کے سامنے عجب دلکش طرز سے پیش کرنا بیوی کا حصہ ہے۔ اسکے بعد وہ تشریف لیجاتی ہیں۔ یا اگر خاص تعلقات کا مہمان ہے تو بیٹھی رہتی ہے ایک دفعہ ایک دوست سے جن سے چار پانچ ملاقاتیں ہو چکی تھیں ملنے گیا وہ دوسرے مہمان کے ساتھ مصروف تھے۔ ان کی بیوی آکر مجھے ایک اور کمرہ میں لیگئیں اور معذرت کرکے کہا کہ وہ ابھی آتے ہیں میرے پاس کئی منٹ تک بیٹھی رہی چاء پلائی اور کہا کہ ہمارا آج ایک تیوہار ہے۔ ور ہم نے ایک خاص مٹھائی دموچی۔ چاول سے بنتی ہے بنائی ہے تم مہمان ہو اجازت دو کہ لاؤں اور پھر خود جا کر لائیں۔ اور مجھے کھلائی۔ اسکے بعد صاحب خانہ تشریف لے آئے اور وہ مودبانہ سلام کرکے چلی گئیں۔ مکان اسقدر صاف ستھرا اور قرینے سے سجا ہوا رکھتی ہیں کہ دل عش عش کرتا ہے۔ گلدستہ بنانے اور پھولوں کی آرائش کا ایک خاص فن وہ سیکھتی ہیں۔ اور گھر میں پودے لگانے اور بیلیں اور پھولوں کے درخت لگانے میں نہیں خوب ملکہ ہوتا ہے۔ بچوں کو خوب صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ ان کے کپڑے ہمیشہ صاف ہوتے ہیں۔ روز کا نہانا سب پر فرض ہے ننگے پاؤں پھرنا ہر شخص پر مرد ہو یا عورت یا بچہ ہو حرام بلکہ قانوناً منع ہے۔ شام کے بعد کھانا کھا کر اکثر آدمی مع اپنی بیویوں بچوں کے بازار میں سیر اور خرید فروخت کے لئے جاتے ہیں۔ اسوقت دو تین گھنٹہ تک بازاروں میں خوب رونق رہتی ہے۔ گھروں پر تو صرف معمولی لگ

یا متوسط درجہ کے لوگ نہاتے ہیں۔ باقی آدمی مرد اور عورت بازار کے حماموں میں نہاتے ہیں جہاں مرد اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہے۔ عورتوں کا لباس ایک خاص قسم کا خوبصورت جبہ ہے اور گنی کئی جبے اوپر تلے پہنتی ہیں۔ اسکے نیچے تہمد سی ہوتی ہے۔ کمر میں پٹکہ ہوتا ہے اور پشت پر ایک گیا ہوا رومال اسی پٹکہ میں بندھا ہوتا ہے۔ سر پر دوپٹہ یا ٹوپی نہیں ہوتی۔ مگر بال اس خوبصورتی کے ساتھ بنائے جاتے ہیں کہ بمنزلہ ایک تاج کے معلوم ہوتے ہیں۔ قدرتی بالوں کے علاوہ مصنوعی بال پن اور کپڑے کے پھول استعمال کرتی ہیں۔ بال بنوانے کیلئے اکثر حجام کی دوکان پر جانا پڑتا ہے۔ یہ دوکانیں اچھی طرح عمدہ عمدہ کرسیوں اور قد آدم آئینوں صابون خوشبویات وغیرہ سے آراستہ ہوتی ہیں بعض دوکانوں میں عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کے بال بھی تراشتی ہیں۔

اکثر دوکانوں پر عورتیں سودا بیچتی ہیں۔ ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ یوں تو عورتیں غیر مردوں سے باتیں بھی کرتی ہیں ہنستی بولتی بھی ہیں مگر پھر بھی ان کے چہروں سے ایسی متانت ٹپکتی ہے کہ اسکا ایک پاکیزہ اثر دل پر پڑتا ہے۔ ہنسکر بولنا تواضع کی علامت ہے اور ہوٹلوں کی خادمہ اور دوستوں کی بیویوں کو میں نے اکثر ہنستے ہوئے اور ہنسکر بات کرتے ہوئے دیکھا۔ زیور کا رواج نہیں ہے۔ مگر کپڑا بہت نفیس اور قیمتی پہنتی ہیں جو خادمہ پانچ روپیہ ماہوار اور کھانے پر کسی کے ہاں نوکر ہے وہ جب کسی سے ملنے جائیگی تو ٹریم میں بیٹھکر یا رکھشا گاڑی پر سوار ہوکر جائیگی تو پچاس ساٹھ روپیہ سے کم کی اسکی پوشاک نہ ہوگی۔ ہمارے ہاں تو بچوں کو گود میں لیتے ہیں مگر جاپان میں پیٹھ پر لیکر پھرتے ہیں اُن کے جبہ میں پیٹھ پر بچہ آجاتے ہیں جس سے ان کے دونوں ہاتھ آزاد رہتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی کھڑانوے پہنتی ہیں جو جرابوں پر آجاتی ہیں۔ جراب میں انگوٹھا الگ ہوتا ہے اور باقی انگلیاں الگ۔

عورتیں اخباروں کی ایڈیٹر ہیں۔ ڈاکخانوں اور بعض دفتروں میں نوکر ہیں اور غریب عورتیں خدمت گاری کا کام کرتی ہیں۔ پانچ بجے صبح سے اٹھکر رات کے گیارہ بجے تک اسقدر خوشدلی سے کام کرتی رہتی ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے اپنی جان کو کھپا دیتی ہیں۔ مندروں تھیٹروں اور میلوں تماشوں میں بچوں سمیت جاتی ہیں جاپان میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ تعریف کے قابل ہے کہ ریل میں ٹریم میں بازار میں پھرنے۔ سودا خریدنے میں۔ مندر تھیٹر اور میلے تماشوں میں غرض کسی جگہ کیا مجال ہے کہ کوئی اجنبی شخص آنکھ اٹھا کر بھی کسی عورت کو دیکھ لے۔ ٹریم یا ریلوے میں میں نے اکثر دیکھا کہ جب کوئی عورت

سوار ہوئی تو اگر بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے تو کوئی مرد اپنی جگہ سے کھڑا ہو جائیگا اور عورت کو اشارہ کریگا وہ سر جھکا کر سلام سا کر کے بیٹھ جائیگی۔ ایک دفعہ دار السلطنت ٹوکیو میں میری ٹریم میں دو شریف زادیاں سوار ہوئیں۔ لباس چہرہ اور گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑے اونچے گھرانے کی ہیں۔ میں نے تو اپنی جگہ چھوڑ کر ان کو اشارہ کیا سلام کر کے بیٹھ گئیں اور میں کھڑا رہا۔ آگے چلکر مجھے بھی جگہ مل گئی۔ جب وہ اترنے لگیں تو دوبارہ میرے قریب سے گذر کر نہایت مودبانہ سلام کیا اور رخصت ہوئیں۔ تندرستی کے آثار عام طور سے ان کے چہروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جاپانی مثل ہمارے مردوں میں عورتوں کا ذکر کرنا معیوب خیال کرتے ہیں۔ برخلاف یورپین جنٹلمینوں کے جن کے ہاں ایسا کرنا مستحسن بلکہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ عورتیں ہمیشہ دوزانو بیٹھتی ہیں جیسے ہم مرد نماز کے قاعدے میں بیٹھتے ہیں۔

تعلیم میں عورتیں نہایت معقول حصہ لیتی ہیں سب پڑھی لکھی ہوتی ہیں اور بہت سے مدرسے علم موسیقی کے اور پھولوں کے سجانے کی تعلیم کے جاری ہیں۔ جہاں خاصی خاصی بڑی بڑی عمر کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ شادی ان کے ہاں چھوٹی عمر میں نہیں ہوتی۔ شادی کا طریقہ ویسا نہیں ہے جیسا یورپ و امریکہ میں ذاتی ملاقات اور میل جول سے ہوتا ہے۔ جاپان میں مثل ہمارے ہاں کے والدین بندوبست کرتے ہیں۔ مگر میلے تماشوں کے موقعہ پر دولہا دلہن ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔

سینا پرونا۔ کاڑھنا۔ اور ریشم اور کپڑا بننا زردوزی اور ہر قسم کی کاریگری میں عورتیں مردوں سے بھی زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ ہسپتالوں میں کام کرتی ہیں۔ اور لڑائیوں میں سپاہیوں کی دوا درمن اور مرہم پٹی کرتی ہیں۔ غرض جاپان کی عورتیں کسی طرح مردوں پر بار نہیں بلکہ ہر طرح ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اور انکی زیب اور سہارا ہے۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی اخبار پڑھتی ہیں اور خبر رکھتی ہیں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔

راقم خاکسار محمد سرفراز حسین قاری عزمی - دہلوی
سیاح جاپان و انگلستان و برادر تمدنی

شبِ فراق

یہ شبِ فراق اور غضب کی سردی　　کانپتا ہوں جو ہوا چلتی ہے سناٹے کی
دل پہ صدمہ کی وہ سخت بلا ٹوٹ پڑی　　کہ نہیں آتی ہے قابو میں طبیعت میری
آہ رہ رہ کے خیالِ رخِ یار آتا ہے
صبر آتا ہے نہ دل کو نہ قرار آتا ہے

رات بھر اشک فشاں دیدۂ خونبار رہا　　درد پہلو میں رہا اور دل آزار رہا
میں تنہا ہے دل تو یہ حالِ دلِ افگار رہا　　کبھی تڑپا کبھی لوٹا کبھی ناچار رہا
یا سُنتی کوئی نہ ہمدم نہ سرہانے کوئی
مر بھی جاؤں تو سوا میرے نہ جانے کوئی

یاد آتا ہے مجھے رات کا آنا اُن کا　　چودھویں رات کا چاند آکے دکھانا اُن کا
آکے پہلو میں گلے مجھکو لگانا اُن کا　　منہ اندھیرے وہ مرے پاس سے جانا اُن کا
اب تو وہ بھول گئے ہیں مرے گھر کا رستا
یاد آئے بھی تو کاٹیں وہ ادھر کا رستا

اُن کی یاد آتی ہے تو آکے ستم ڈھاتی ہے　　دور آپے سے مجھے کھینچ کے لیجاتی ہے
نیند آنکھوں کو کبھی آکے جو جھپکاتی ہے　　عالمِ خواب میں وہ شکل نظر آتی ہے
قصد کرتا ہوں ہم آغوش جو ہونے کے لئے
چونک پڑتا ہوں وہیں خواب سے رونے کے لئے

کیا یہ مشکل مری سہل اب کبھی ہوئیگی نہیں　　کیا نگاہ اُن کی ادھر اب کبھی ہوئیگی نہیں
کیا نہیں میری خبر اب کبھی ہوئیگی نہیں　　کیا شبِ غم کی سحر اب کبھی ہوئیگی نہیں
کیا تمنا مری ایسی ہے کہ پوری ہی نہ ہو +
کیا ہے ایسا مرا جینا کہ ضرر ہی نہ ہو +

میرے گھر میں نہیں آتی ہے خوشی غم کے سوا — میری دنیا میں نہیں عیدِ محرم کے سوا
کوئی ہم چشم نہیں دیدۂ پرنم کے سوا — کوئی ہمدم نہیں آتا ہے نظر دم کے سوا

کیا تمنا مری ایسی ہے کہ پوری ہی نہ ہو
کیا ہے ایسا مرا جینا کہ مری بھی نہ ہو

صورتِ زلفِ رسا وہ بھی پریشاں ہونگے — چشمِ نرگس کی طرح ہائے وہ حیراں ہونگے
کہہ دو رسوا نہ ہوں۔ اس ڈر سے لرزاں ہونگے — دل کے بنتے ہیں سب دل ہی میں پنہاں ہونگے

یاد میری انہیں بے چین جو کرتی ہوگی
دلِ مجبور پہ کیا کیا نہ گذرتی ہوگی

(رسا ہمدانی گیانی)

رازِ فراغت

تو رازِ فراغت کیا جانے محدود تری آگاہی ہے — اپنے کو پریشان حال سمجھنا عقل کی کوتاہی ہے
دولت کیا اک دلدل ہے دل کا حرص نہیں گمراہی ہے — دنیا سے بے پروا رہنا یہ سب سے بڑی شاہی ہے

اس قول کو میرے مانیگا جو صاحبِ دل ہو جاتا ہے
کہتے ہیں جسے شاہنشاہی حاجت کا روا ہو جانا ہے

پینے کو میسر پانی ہے، کھانے کے لئے خاطر خواہ غذا ہے — صحت کی محافظ صاف ہوا تفریح کو سبزہ صحرا کا
پوشش کے لئے ملبوس بھی ہے رہنے کو مکاں بھی ہے تیرا — اور اسکے سوا کیا حاجت ہے انصاف تو کر کچھ دل میں ذرا

راحت کے لئے جو ساماں ہیں قدرت نے بہم پہنچائے ہیں
اے بندۂ زر! پر تیری ہوس نے پاؤں کیوں پھیلائے ہیں

صحبت میں تری کچھ ہرج نہیں اعضا میں تیرے نقصان نہیں — پھر بھی یہ شکایت تجھکو ہے اسباب نہیں ساماں نہیں
انعامِ خدا کا منکر ہے اللہ پہ اطمینان نہیں — تو حرص و ہوا کا بندہ ہے مضبوط ترا ایمان نہیں

دنیا کی حکومت تیری ہے اپنے کو گدا کیوں کہتا ہے
سامانِ فراغت حاضر ہیں بیکار پریشاں رہتا ہے

دولت کا نتیجہ کلفت ہے ساماں امیری ذلت ہے — جس دل میں ہوس کی کثرت ہے دور اس سے حقیقی راحت ہے

ارمانوں کو غافل کم کر دے ہستی یہ نہیں اک غفلت ہے — آغاز سراپا دھوکا ہے انجام سراسر غفلت ہے

تاریخ اٹھا بتلائیگی وہ "دنیا میں خوشی کا نام نہیں"

"جس دل پہ ہوس کا سکہ ہو اس دل کے لئے آرام نہیں"

اللہ کی بخشش عام ہے سب شاہ ہوں یا بیت ہو گدا — یہ چاند یہ سورج یہ تارے یہ نور سحر یہ موج صبا

دونوں کے لئے یکساں ہیں کچھ فرق اگر ہے تو اتنا — ان جلوں سے لذت پاتا ہے آزاد کا دل منعم نہ ہوا

شاہوں کے سروں میں تاج گراں سے درد اکثر رہتا ہے

جو اہل صفا ہیں ان کے دل میں نور کا چشمہ بہتا ہے

(جوش ملیح آبادی)

المذہب

رسالہ **المذہب** بہ ہدایت جناب **قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی** مصنف اسلام، سیاحت جاپان و انگلستان، دیرہاد وغیرہ اور محمد عباس حسین تارتی ایڈیٹر تمدن و قوم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اس رسالہ میں ایسے مضامین درج ہوتے ہیں جنمیں مذہب کی خوبیاں فلسفہ سائنس اور دیگر علوم مروجہ کی رو سے بیان کی جاتی ہیں اور **تعصب** فرقہ بندی اور دل آزاری کی رکیک نوں سے قطعاً احتراز کر کے خلوص کے ساتھ کوشش کی جاتی ہے کہ جدید معلومات کی روشنی میں عقل و نقل کو جمع کر کے انسانوں میں سچے **روحانی اخلاقی** جذبات پیدا کئے جائیں گو اسوقت فضیلت اسلام کا ظاہر کرنا اس رسالہ کا ممتاز فرض ہے مگر دیگر مذاہب کی خوبیوں سے ہرگز ہرگز چشم پوشی نہیں کی جا سکیگی اور جملہ ادیان مدلل کے ساتھ تحفظ انصاف کیا جاتا ہے مذہب صاف ہے کہ مشن اور عام تفریحات کے مشاغل میں جو بعض نوجوان مبتلا ہو کر مذہب کی روحانی برکات سے محروم رہ جاتے ہیں ان کا اصلی منشا یہ ہے کہ تفسیر ان ادیان و ملل یہ مرتب ہوتے ہیں انکے دلوں پر مذہب کی بجلیاں تڑپیں اور روحانی روشنی ڈالی جاتی ہے **قیمت سالانہ** تین روپے ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ **درخواستیں۔**

دفتر المذہب مٹیا محل دہلی کے پتہ پر آنی چاہئیں

تغزّل

صورت نظر میں ہے کسی مست شباب کی — ملتی ہے بے پیے مجھے لذت شراب کی

انگڑائی لیکے مجھ سے وہ بیباک ہوگئے — ہاتھوں کے ساتھ اٹھ گئی چلمن حجاب کی

جب شوخیوں پہ آئی ہے انکی نگاہ ناز — تصویر کھینچ دی ہے مرے اضطراب کی

نخوت سے تم قدم نہیں رکھتے زمین پر — آخر کچھ انتہا بھی غرور شباب کی

چھانٹا ہے وہ حسین جو ہر اِک میں ایک ہے — کیا بات ہے مری نگہ انتخاب کی

محفل میں دیکھتے ہیں وہ غصے سے ہر طرف — بجلی چمک رہی ہے نگاہ عتاب کی

کیا بادہ کش کے غم میں ہیں یہ بیقراریاں — کیوں گردشیں بدلتی ہیں موجیں شراب کی

کیا کیا مٹا رہی ہے جوانی کو یاس وصل — برباد ہو رہی ہیں امنگیں شباب کی

اپنی نگاہ شوخ پر انکو نظر نہیں — مجھ سے شکایتیں ہیں مرے اضطراب کی

تیری شعاع حسن سے روشن ہے کائنات — پھیلی ہوئی ہے دھوپ اسی آفتاب کی

میں روسیاہ دفن کے قابل نہ تھا شفق
احباب نے زمین کی مٹی خراب کی

شفق امروہوی

دہر میں رہ کے بے وفا نہ ہوا — میں کسی سے کبھی بُرا نہ ہوا

درد فرقت کا کیا وہ جانے مزا — جو کبھی لذت آشنا نہ ہوا

سعی چارہ ساز کا حاصل — زخم لذت کش دوا نہ ہوا

فصل گل آکے ہوگئی رخصت — میں قفس سے مگر رہا نہ ہوا

کھینچ کر جذب مرکزی لایا — جس جگہ میرا آب و دانہ ہوا

کیا ملے لطف زخم دست جنوں — تو ہی جب ناخن آزما نہ ہوا

داغ دل کا چراغ کب ہیں مرگ سا لگن جادۂ فنا نہ ہوا
پردہ داری دہی ہوئے جراح زخم دل منکر حیا نہ ہوا
باعث نغمہ جنبش مضراب تار خود گرم صدا نہ ہوا
مرگیا اس طرح ترا بیمار کوئی آگاہ اک ادا نہ ہوا
اس کے زیب گلو ہو اک تعویذ میری تقدیر کا لکھا نہ ہوا
بعد میرے کہاں وہ آرائش شعلہ منت کش حنا نہ ہوا
اب کہاں ہم کہاں ہمارا گھر اسکو چھوڑے ہوئے زمانہ ہوا
باعث ہجر ہے نشاط اے وصف لب ہنسی میں بھی کب جدا نہ ہوا

وصف لکھنوی

مجھ پر ہو کیا نگاہ تمہارے خیال کی چادر اٹھاکے دیکھتے ہو میرے حال کی
دوش نظر پہ نعش ہو کیوں عرض حال کی زندہ ہیں ٹھوکریں تیرے پائے خیال کی
میں اور تاب دید تمہارے جمال کی ہاں دیکھنا نظر مرے عجز خیال کی
کہتے ہیں تم خود اپنے لئے ہو بلائے ہجر اب میں ہوں در تیغ فنا ہے خیال کی
دیکھا تو کچھ سمجھ نہ سکے فرط شوق سے روکیں ہجوم دید نے راہیں خیال کی
کی وہ نظر جو موجب پاس جواب تھی ظالم نے روح کھینچ لی شوق سوال کی
جب سے ملا صحیفہ داغ جگر ہمیں منسوخ آیتیں ہوئیں رنج ملال کی
دل کو چپکے لئے درد محبت کی کھو دیا لوٹا مجھے زکوۃ نے تیرے جمال کی
دل آگیا ہے ناز ادائے جواب پر ورنہ ہم اور اٹھائیں یہ ذلت سوال کی
یوں اس ستم شعار سے بے التجائے رحم رونق ہی کچھ سادگی حسن خیال کی
ایسا تو ہو ستم کہ رہیں محو ذوق ہم سننا پڑے نہ بند ہیں اپنے حال کی
اب اسکو فیض ساقی فیاض کیا کرے مٹی بھی تشنہ ہے مرے جام سفال کی
وہ چاہتے ہیں نام ہے اس فقیر کا بھرتے ہیں نقد شوق سے جھولی سوال کی

زاہد اسیر وہم ہے تو رند اُسکی یاد کا پابند ہی نہیں کسی فکر و خیال کی
راغب یہی ہے مومن و غالب کا اتباع
پہنچے فرازِ عرش بلندی خیال کی

راغب بدایونی

دل اٹکتا ہے کسی زلف گرہ گیر کے ساتھ خوب سودا ہے جو ہو جائے یہ تقدیر کے ساتھ
بد سلائی میری تقدیر کی دیکھے کوئی عشق ہے اُن کو میرے نالہ شبگیر کے ساتھ
جلوہ فرما میری قبر پہ ہونگے بھی تو کیا حسرتیں دفن ہوئیں سب دلِ دلگیر کے ساتھ
رہا برباد ہمیشہ ہی دل خانہ خراب تھی ازل ہی سے خرابی تیری تعمیر کے ساتھ
پیکرِ حسن حقیقت ہے ہمیشہ روشن نہیں ظلمت کا نشان مہر کی تنویر کے ساتھ
ناوک انداز زمانے میں نہ دیکھا تجھ سا دل ہزاروں کے اڑا ڈالے ہیں اک تیر کے ساتھ
چشم بد سے تجھے اللہ بچائے۔ صیاد یہ عنایت کی نظر بلبل دلگیر کے ساتھ
ضبط اظہار تمنا سے نہ گھبرا دلِ زار کیا برائی ہے جو کام اچھا ہو تاخیر کے ساتھ
اہل فرزانہ ہے مجنوں۔ وہی دیوانہ ہے قید کرتا ہے جو آزاد کو زنجیر کے ساتھ
ہوگئی فیض رسان زاریٔ ہنگام سحر دل سے نکلی جو دعا مل گئی تاثیر کے ساتھ
حسن معنی کا زمانہ میں ہے آئینہ سخن جوہر انسان کے کھل جاتے ہیں تقریر کے ساتھ
آپ بنی عشق میں تو ہو گئے بیگانے سبھی آشنا درد رہا بس دلِ دلگیر کے ساتھ
کارگر جب نہو تدبیر تو کیا چارہ ہے
زور کچھ بندے کا ارشد نہیں تقدیر کے ساتھ

آغا غلام حسین ارشد

عمر بھر۔ وہ ہمتِ ضبط فغاں دیکھا کئے مٹ نہ جائے۔ یوں کوئی یہ تو کہاں دیکھا کئے
دیکھکر۔ کیا تجھکو تیرے نیم جاں دیکھا کئے عمر بھر۔ رہ رہکے سوئے آسماں دیکھا کئے

ایک وہ - جو تیری محفل کا سماں دیکھا کیے　　ایک ہم ہیں - جو نگاہ پاسباں دیکھا کیے
تیرے وعدہ کے یقین پر اوستم پرور نہ پوچھ　　دل کی کیا کیا - رات بھر بیتابیاں دیکھا کیے
کیا بتائیں کیوں ہیں محو لذت آزار عشق　　کیا کہیں کیوں جلوہ حسن بتاں دیکھا کیے
جان دینا شدت غم سے کوئی مشکل نہ تھا　　وائے قسمت یوں بھی انکو بدگماں دیکھا کیے
اضطراب عشق میں - دل سے گئے صبر و قرار　　لٹ گیا گھر اور تیرے ناتواں دیکھا کیے
حشر میں ہر ایک اپنے اپنے غم میں مبتلا　　ہم وہاں بھی جلوۂ روئے بتاں دیکھا کیے
لذت بیتابی دل - ہائے ہمدم کیا کہوں　　جب وہ پہلو میں میرے درد نہاں دیکھا کیے
ہائے کیسی بے بسی کا وقت ہے ہنگام نزع　　میرا دم نکلا کیا بیسود جواں دیکھا کیے

دیدنی تھا وہ بھی عالم آرزو ہنگام نزع
جب وہ گھبرائے میری نبضوں میں جاں دیکھا کیے　　(آرزو بریلوی)

وفادار شمشاد

شمشاد (۱)

مجھکو اس در دولت سے، صرف نسبت نمک خواری حاصل ہے۔ مگر یہ مخصوص نسبت اپنے عمق و عرض کے لحاظ سے اسقدر کشادہ نہیں، کہ خدمت یا پرورش کے سوا کسی اور چیز کو طرفۃ العین کے لئے بھی قبول کر سکے۔

علایق دنیوی کو ٹھکراتے ہوئے مرحوم آقا نے کہا تھا ـــــ شمشاد تجھکو والد مرحوم نے اولاد کی طرح پالا ہے! اور میں بھی آجتک چھوٹا بھائی سمجھتا اور برتتا رہا ہوں۔ تو میری واگذاشتہ عزت اور ترکہ امین بن یتیم ہونیوالے محمود کو اب اپنا آقا سمجھ جا اور ضروری حالات پر نگاہ رکھ۔ میرے بعد تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوگی اسقدر چھوڑے جاتا ہوں کہ تم سب کی واجب مدارات کو کافی ہو۔ کیا میں نے اب تک اس حکم کی تعمیل کی۔ ہاں اب تک توفیق الٰہی شامل حال ہے۔ الحمد للہ شمشاد اپنے کریم النفس آقا کی رحمت پرور روح سے شرمندہ نہیں۔

قمری (۲)

نرالی راتیں چھن جاتیں۔ چھن جاتیں، روکھی سوکھی جو چنے کی بس تھی۔ پھٹا پرانا موٹا جھوٹا تن ڈھانکنے کو کافی تھا ایک وقت نہ سہی دو وقت تو مل ہی جاتی۔ خوش بام محل سرائے نہ ہوتی بلا سے نہ ہوتی خس پوش دالان یا گرمی سردی سے آدمیوں کو بچاتی ہی ہیں، ہاتھ اگر خالی ہوتا تو ضروریات بھی وسیع نہ ہوتیں۔ کیسے برداشت کروں مجبور کی گئی ہوں۔ اس چیز سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوئی ہوں اس چیز سے جس سے کوئی فطرت قناعت قبول نہیں کر سکتی۔ ہر چیز سے صبر کیا جا سکتا ہے مگر آہ ـ ! نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ یقیناً نہیں ہو سکتا۔

شمشاد (۳)

کیا میں نے انکو قصد و خیال سے جیتا کبھی دیکھنے کی ناپاک و غدارانہ جسارت کی۔ نہیں ہرگز نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے کبھی فرض خدمت میں سبقت کی اور اظہار تعمیل کی حد سے متجاوز ہوا یا کبھی

قدر دیانہ عقیدت سے آگے بڑھنے کی ہوس تلطف سے روشناس ہوئی۔

میرے کانوں نے ایک ماہ سے پیشتر کبھی وہ باتیں نہیں سنیں تھیں جو اب سن رہے ہیں۔ آنکھوں نے ایک ماہ پیشتر وہ چیزیں کبھی نہیں دیکھیں جو اب دیکھ رہی ہیں۔ جو صدائیں بلند ہو رہی ہے وہ راگ بنانے کے لئے کافی ہیں۔ مگر میرے لئے راگ سمجھنے سے بہتر تو یہ ہے کہ خاک کا رزق ہو جاؤں۔ اگر میرا خیال غلط ہے تو پھر اس کا یہ التفات رنگین یہ بے تکلفانہ تعلیم یہ ساحرانہ تحریک یہ پیام خاموش کیا جتاتا ہے۔ خیر یہ نقوش غیر منظم جو مجھے سمجھانا چاہتے ہیں یا سمجھاتے ہیں وہ میں کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک پری ہے جس کے سامنے مجھکو اپنی پرستش کا ثبوت دائمی سجدات وفاداگی سے پیش کرتے رہنا چاہیئے۔

قمری

(۴)

میرے حسیات فنا نہیں ہوئے میری حیات بالغہ کی شعریت معروف اگرچہ چھین لی گئی تھی اور میں اس روح پرور نعمت سے محروم رہنے پر مجبور کر دی گئی ہوں تو۔ خیر یہ معاملہ تو اکثروں کو پیش آتا ہے مگر اسکا اطمینان چاہتی ہوں کہ کیا وہ بھی میری طرح بے آب و دانہ قفس میں پر بستہ پڑے رہنے پر بخوشی راضی رہی ہیں اور اپنی مجبوریوں کی کڑیاں سہتے ہوئے اپنی مشکلات کی پھانسیوں کو اپنے ہاتھوں سے کھولنا نہیں۔ [illegible] متعصب ہوئیں کیا کوئی کشود کار کی صورت انہوں نے کبھی نہیں پیدا کی دنیا کہیگی کہ کوئی صورت نہیں پائی مرد بآسانی اسپر یقین کر سکتا ہے مگر مجھکو اسکی شہادت اپنی جنس سے مطلوب ہے اور اپنی جنس کی بھی اُس فرد سے مطلوب ہے جس نے عین بہار میں خزاں کو اپنے گھر مہمان دیکھا عورت کو مرد نہیں جان سکتا۔ جنس کا حال جنس کو معلوم ہوتا ہے۔ ہاتھی ہاتھی کو پہچانتا ہے اور ناگن ناگن کو۔

جو حیات بالغہ کی شعریت معروف سے محروم ہو اور یہ جانتی ہو کہ ہمیشہ اور ہر حیلہ سے محروم ہی رہیگی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ فطرتاً شعریت مجہول کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ میں گرد و پیش کے حالات سے مجبور ہوں اور جیسی آج مجبور ہوں ایسی ہی ہمیشہ مجبور و مایوس رہونگی مجھکو پاک ہوا اور میدہ پرواز نصیب نہیں ہو سکتی۔ میرا مستقبل پاک ماحول سے خالی ہے اور خالی رہیگا۔ میں ایک ایسی مچھلی ہوں جو پانی سے دور ہے جس کو چند بار تڑپ کر جان دینا باقی ہے۔ میں وہ پارہ ہوں جسکا اضطراب صرف موت کا سکون گم کر سکتا ہے۔

جب میں ہر سمت سے مایوس ہوئی تو اپنا مطمح نظر ایک معمولی ذرہ کو قرار دیا۔ اُف یہ ذرہ کس قدر سنگین ثابت ہوا۔ البرز و ہمالیہ پر اگر ایسی کاری ضربات لگائی جائیں تو پاش پاش ہو جائے مگر یہ سنگین ذرہ سرمہ نہ ہونا تھا نہ ہوا

رات کا وقت ہے کسی کی آمد و شد کا کالے کوسوں خطرہ نہیں ہے۔ دروازہ مقفل ہے۔ مسہری پر گاؤ تکیہ سے سہارا لئے ہوئی بلا لحاظ اسباب کے کہ کیا کھلا ہے کیا ڈھکا ہے بیٹھی ہوئی ہوں آواز دی۔ جواب ملا۔ حاضر ہوا۔ کہا کیا۔ گرمی معلوم ہوتی ہے ذرا پنکھا لیجئے۔ پنکھا لا کر سامنے رکھ دیا مامکوا اٹھانیکا اس لئے قصد ہے کہ وہ جھلے۔ مگر نیاتاً کہا گیا کہ غریب بڑھیا ہے اسکو سونے دو۔ تم ہی جہاں دو پنکھا جھلا رہا ہے۔ میں ضرورت سے زیادہ اور بھی بے تکلف ہو کر بیٹھ گئی ہوں۔ بہانہ سے کئی بار قمیص کو کئی بار اوپر اٹھایا۔ کئی بار اس کے دامنوں سے ہوا لی۔ مگر کیا۔ جواب میں صرف حسرت وہ ذرہ سنگین ایک آہنی پتلی تھی جسکے پہلو میں شاید قلب تھا مایوس ہو کر بس کیا۔ اور یہ پتلی ادب کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ اب کہئے میں نے کیا نہ کہا کوئی نہ سُنے اور نہ سمجھے تو پھر... ؟ میں نے بارہا ضرورت بلا ضرورت ماما کو اسلئے نکالدیا کہ اُسکی عدم موجودگی میں جب تک دوسری تلاش ہو ہر وقت کے کاموں میں اُسی کو بلانیکا موقعہ رہے۔

اکثر ارادتاً خاص طور پر کئی دفعہ اسکا اہتمام کر چکی ہوں کہ غسل کے بعد اُتھر رہوں اور اسی غسل خانہ سے تولیہ لئے ہوئے نکلی جس سے تولیہ لپیٹنے کا مقصد قطعی فوت ہو گیا۔ اور دیکھنے والی نگاہوں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو عمداً بے پرواہی کے ساتھ چھپائے ہوئے اُن کے سامنے کر دیا گیا تھا۔ مگر اس زبردست وار کو بھی سنگین حریف نے ہمیشہ منہ پھیر کر نیچی نگاہ کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ میرے اس خاموش سوال نے بھی آج تک اس پتھر سے جواب نہ پایا۔

میں نے اکثر موقعہ دیا کہ وہ میرے بال سنوارے مجھکو چھوٹے بڑے کپڑے پہننے میں مدد دے لیکن یہ سب نشتر ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئے اور رگ سنگ نے خون نہ دینا تھا نہ دیا

میں اکثر خوانخواہ اسلئے بیمار بنی کہ تیمارداری کے بہانہ سے مجھکو زیادہ مخاطبہ کا موقعہ ملیگا قصداً ساعت بہ ساعت نئے نئے پہلو سے گمنون تحریک کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ مگر نتیجہ ہیچ۔ پتھر پر جونک لگنی تھی نہ لگی۔ میں نے کئی دفعہ الفاظ بجا کر وحشت دل کی شکایت کی مقصد طلب تبسم کے ساتھ جرأت بخش

استہزا کے ساتھ قربت طلب اخلاص کے ساتھ میں نے وہ سب کچھ اس سے کہا جس کو زبان سے عورتیں کبھی خود کہنا نہیں چاہتی ہیں مگر مجھے اسکی بلا۔ جانے اسکی بیزار۔

میں اکثر اسکو مثنوی میرحسن خود سُناتی ہوں بزم اور خلوت کے اشعار کا مطلب تجاہل عارفانہ برت کر اس سے پوچھتی ہوں وہ نافہمی کا عذر کرکے خاموش ہو رہتا ہے پھر خود ہی سمجھاتی ہوں نہایت عریاں خرم کرتی ہوں مگر۔ وہاں ایک خاموشی میرے سب جواب میں۔

واقعی مرد کی ذات نہایت مغرور ہوتی ہے۔ اچھا وہ اگر نہیں سمجھا تو کیوں نہ سمجھا۔ کیا وہ فطرتاً ناسمجھ پیدا ہوا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے دلمیں کسی اور کو سمجھے ہوئے ہو، کسی اور کو لئے ہوئے ہو، کسی اور کو دیکھتا ہو۔ اچھا کیا مضائقہ ہے۔

ایک شب۔

سردار بہادر رسالدار میجر مرزا ہادی۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں۔ ذرا خلاف مزاج ہو کر شیر کی طرح بپھر پڑے۔ کرخت مزاج۔ جابر۔ آتش خو۔ فوجی زندگی بسر کرنیوالے شام کی گاڑی سے آ اُترے کہ رات کی رات قمری اور محمود کو پیار کرتے جائیں۔ ہرچند کہ رسالدار اپنے مزاج و عادت کے موافق مردانہ میں اُترنا چاہتے تھے۔ لیکن قمری کے اصرار سے اُنہیں زنانہ میں قیام کرنا پڑا۔

زنانہ گوشہ محل کے اندرونی آخری کمرہ میں اُنکو ٹھیرایا گیا۔ یہاں سے قمری کی خوابگاہ کو کئی دالانوں اور کمروں اور غلام گردش کا فصل تھا۔

مغرب کے وقت سے گیارہ کی توپ تک قمری رسالدار صاحب کی خدمت میں حاضر رہی اور محمود کو بھی دایہ وہیں کھلاتی رہی۔ توپ چلتے ہی محمود کو دایہ اُسکے خوابگاہ میں لیگئی اُسکو سلا کر خود بھی سو رہی۔ بارہ بجے کے قریب رسالدار صاحب پر خواب کا غلبہ ہوا۔ خرّانٹے لینے لگے تو قمری آہستہ آہستہ اُٹھ آئی اور گوشہ محل کے ابتدائی دروازہ کی زنجیر چڑھاتی آئی۔ شمالی جانب یہیں محمود کی خوابگاہ تھی دبے دبے پاؤں گئی دیکھا بچہ اور دایہ دونو بیخبر سو رہے ہیں۔ واپسی میں اس حصہ کے صدر دروازہ کی زنجیر چڑھادی۔

اب اپنی خوابگاہ میں پہنچی سنگار میز کی دراز سے پستول نکالا جسمیں پانچ کارتوس چڑھے ہوئے تھے مسہری کے تکیہ کے نیچے چھپا دیا۔ لباس اُتارا اور شب خوابی کا فرغل پہن لیا۔ لیمپ کو بالکل

دہیا کر دیا۔ گھنٹی بجائی ماماکو آنا چاہیئے تہا۔ لیکن وہ آج شام سے ہی اجازت لیکر اپنے سمدھیانے چلی گئی تھی۔ میدان خالی تہا۔ دوسری گھنٹی پر مجبوراً ڈیوڑھی سے بدنصیب شمشاد کو جانا پڑا اُسکو یہ خیال تہا کہ صبح رسالہ دار صاحب دارجلنگ جائیں گے اُنکی روانگی کے متعلق اسوقت کوئی ضروری کام ہوگا۔ یہ اسی فکر و خیال میں قمری کے خوابگاہ کے دروازہ پر پہنچکر ٹھٹکا اور کھنکارا جس کے معنی یہ تھے کہ خدا جانے بیگم کس حالت میں ہوں اذن ملے تو جاؤں۔

مسہری سے آواز آئی آجاؤ۔ دیکہو چھوٹے کمرہ کے فرش پر ایک بچھو پھرتا ہوا دیکھا ہے۔ تم تکئے وغیرہ اُٹھا کر اُسے تلاش کر دو اور مار دو کہ خطرہ ترہے۔

شمشاد نہایت سادہ دلی کے ساتھ تکئے و قالین وغیرہ اُٹھا کر بچھو تلاش کر رہا ہے بالکل خالی الذہن ہے۔ یکایک ایک کھٹکا ہوتا ہے پشت پھیر کر دیکھتا ہے تو دروازہ بند اور اپنے آپکو مقید پاتا ہے۔ اب سمجھا کہ بُرا پھنسا ہوں۔ ایک آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ اسی ساعت میں ایک آواز آئی۔ قیاس نے بتایا کہ دروازہ بند کرکے قفل لگا دیا گیا۔ اسکے بعد فوراً ہی چھوٹے کمرہ کا دروازہ کھلتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ باہر آئیے۔

شمشاد سراسیمہ لرزہ براندام باہر آیا۔ حلق خشک ہے۔ زبان پر کانٹے پڑے ہوئے ہیں بدن پسینہ پسینہ ہو رہا ہے قلب بے جرأت رخصت ہو چکی ہے۔ دیکھتا ہے کہ لیمپ پوری روشنی کیساتھ جل رہا ہے۔ آج قمری قمری نہیں ہے۔ شیرنی کی طرح بپھری ہوئی ہے۔ ہاتھ میں پستول ہے اور لب ای پر انگلی ہے۔ مہابن کی ناگن ہے۔ یا کچھار میں شیرنی۔ یا بجلی بن میں ہتنی۔

قمری۔ نہایت غضبناک لہجہ میں۔ شمشاد کیا حال ہے کیا اب تک تم اپنی ضد سے باز نہیں آئے۔

شمشاد۔ حیرتناک خاموشی میں غرق ہے جواب دینا چاہتا ہے لیکن زبان کام نہیں دیتی۔ خوف سے نظام نفس برہم ہے ہاتھ جوڑے ہوئے سامنے کھڑا ہے۔

قمری۔ محبت کے لہجہ میں دیکھو شمشاد میں اپنے آپکو تمہیں سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ تم کیوں مجھے ٹھکراتے ہو۔ کیا تمہارے قلب میں خون کا کوئی قطرہ باقی نہیں رہا یقین لاؤ کہ تمہارا اسنگین اغماض میرے لیئے ایک ایسا خنجر ہے جو جان کی ہر ہر رگ میں تیر رہا ہے تم اپنی نادانی سے اپنی زندگی کی بہار کو اپنی جوانی کو اپنے جوش شباب کو برباد نکرو میری مانو میری مسہری تمہیں بلا رہی ہے

جاؤ اسپر آرام کرو میں تمہاری خدمت کرونگی۔

شمشاد۔ عالیہ آپ میری مخدومہ ہیں۔ میں نے آپکے نمک سے پرورش پائی مجھے تعمیل حکم میں کوئی عذر نہ تھا لیکن قدرت نے میرے ساتھ اپنی معمولی فیاضی سے کام نہیں لیا میں قدرتاً اس صفت سے محروم ہوں جو آپکے مدنظر ہے۔

قمری۔ (رد کردینے والے تبسم کے ساتھ) نہیں نہیں یہ بالکل غلط ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے تم کریمن کے ذریعہ سے الٰہی بخش کی لڑکی کے لئے اپنا پیام بھیج رہے ہو۔ اگر تمہارا بیان سچا ہے تو پھر اُس گفت و شنید کے کیا معنی یقیناً تم حیلہ کر رہے ہو اور میں ارادہ کر چکی ہوں کہ تمہارا کوئی حیلہ کوئی عذر نہ سنونگی۔

شمشاد۔ جس کے چہرہ پر جھوٹ کی زردی پھیل چکی تھی جسکا حیلہ بے نقاب ہو چکا تھا جسکو جذبات انسانی برانگیختہ کر چکے تھے۔ جسکا شباب تبدیل رائے سے فطری ذوق و تحریک سے بلکہ خارجی دابے اثرات سے مانوس ہونے پر رضامند ہو جانے کے قریب تھا۔ جس کے پاؤں کے تلے سے وفاداری کی چٹیاں کھسکنے والی ہو رہی تھی جو ننگ آمد بسخت آمد سمجھکر صورت حاضرہ کو بادل ناخواستہ لبیک کہنے والا تھا۔ جسکا دماغ زنانہ چالوں سے اُلجھکر بے بس ہو چکا تھا۔ جس کے قلب سے شرافت کا نور رخصت ہونے کے لئے تیار رہتا جو ایک سر فلک مینار کی طرح پہلے اپنے مرکز پہ قایم تھا مگر اب اسکو حوادث کی شدت کو گرا دینے کے لئے تیار تھی۔ یکدفعہ سنبھلا اور نہایت جرارت کے ساتھ اُس نے کہدیا۔ عالیہ وہ مجھ سے نہوگا۔ میں اُدہر کبھی نہ آؤنگا جدہر آپ مجھکو بلا رہی ہیں۔

قمری۔ (صاف انکار سے خشک جواب سے مشتعل ہوکر) اچھا دیکھو یہ پستول تمہارے سینہ پر میں ابھی خالی کئے دیتی ہوں۔ افسوس تم نے میرے پیام محبت کی قدر نہ کی خبردار ہو جاؤ۔ مری الڈ تمہاری زندگی کے لمحات ختم ہوتے ہیں۔ دو نو لاشیں جسکو اسی کمرہ سے نکلینگی تم جانو دیکھنے اور سننے والے میرے اور تمہارے لئے کیا رائے قایم کرینگے۔

شمشاد۔ عالیہ مجھکو اپنی جان کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہ اسی گھر کی دی ہوئی ہے۔ اگر اس گھر کی خدمت اور حفاظت کے لئے کام آجائے تو زہے قسمت لیکن خدارا آپ اپنے خاندان اور معزز شوہر کی شہرت اور عزت کو ہمیشہ کے لئے رسوا نہ کریں اور مجھکو اپنے اوپر سے قربان کردیں میں اپنا خون حسبتہً للہ معاف کرتا ہوں۔ میری روح بہت خوشی سے اپنے آقا کی روح کے ساتھ رہیگی۔

قمری ۔ اپنی اس ترکیب کو بھی بے اثر ہوتے دیکھ کر فوراً با دیدۂ اشکبار شمشاد کے قدموں پر اپنا سر رکھدیتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ اس فتادگی کو سینہ سے لگا کر سر بلندی بخشے ۔ لیکن شمشاد عجلت کے ساتھ ہٹ کر خود قمری کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور اُسکے خیالات وسعت کے ساتھ اسطرف منتقل ہو جاتے ہیں کہ آج سلامتی مفقود ہے ۔ آج شاید وہی روز بد سا آگیا ہے جسکا کھٹکا تقریباً دو ماہ سے ہمارا شکار رہا تھا ۔

قمری کسیقدر غصہ کے ساتھ جواب طلب لہجہ میں) دیکھو شمشاد اب بھی باز آؤ ورنہ میں غل مچاتی ہوں ماموں جان قریب میں سو رہے ہیں ۔ قریب میں دایہ محمود کو لئے ہوئے سو رہی ہے زیادہ برہم ہو کر او غلام تجھکو میری خوابگاہ میں آنیکا کیونکر حوصلہ ہوا کیا تو نہیں جانتا کہ یہ میری خوابگاہ ہے تو یہاں اسوقت کس ارادہ ۔ اور کس نیت سے آیا ۔ میں مسہری پر بیخبر سو رہی تھی ۔ تو نے کس لئے کس نیت سے میرے چہرہ سے چادر کو ہٹایا تو نے کیا سمجھکر میرے جسم کی طرف ہاتھ بڑھانیکی جرأت کی ۔ میں ابھی تمہاری بدکرداری کی سزا تجھکو دلاتی ہوں ۔ قمری بڑھی اور نہایت بے تکلفی اور آزادی سے وہ دروازہ جو پیشتر مقفل تھا اُسکو کھول دیا ۔

شمشاد ۔ اب اپنی موت کو سامنے کھیلتا ہوا دیکھکر یقین رکھتا ہے کہ اس زہری ناگن کے منہ سے اگر ایک فقرہ بھی ہادی مرزا نے سُن لیا تو پہلے سکنڈ میں اُنکی تلوار میری ہستی کا خاتمہ کر دینے کے لئے کافی ہے ۔ میری موت چھپ نہیں سکتی دنیا میں ہی نمکحرام کہلاؤنگا کون جانیگا کہ میں اسوقت کس حالت میں ہوں اور یہ ناگن کتنی دفعہ مجھے ڈس چکی ہے اور کسطرح ڈس چکی ہے ۔ زندگی کے ساتھ نیکنامی بھی گئی ۔ موت کے ساتھ دائمی بدنامی بھی آئی ۔ مجھکو کسیطرح جیسے بھی ہو جھوٹ سے سچ سے جائز طریقہ یا کسی ناجائز حیلہ سے اپنی حفاظت کرنی چاہیئے کسیطرح یہ بدنصیب موت کی گھڑی ٹل جائے تو پھر بھگت لیا جائیگا ۔ سوچکر ۔ بیگم اچھا میں حاضر ہوں مجھکو اتنی مہلت دیجئے کہ میرے کھوئے ہوئے ہوش بجا ہو سکیں مجھکو دو گھونٹ پانی پینے دیجئے ۔ میرے قلب کا اضطراب رفع ہو ۔ میرا دماغ آپکے جذبات کو آپکی محبت کو وزن کر سکے میں بہر نوع آپکا غلام ہوں ابتک صرف میں خدمتگار رہا تھا اسوقت سے میں اپنی مخدومہ کو نہ صرف مخدومہ بلکہ دلنواز اور محرم راز سمجھونگا ۔ خدارا محبت کا پیام تلوار کی باڑ سے نہ دیجئے بلکہ اسکی شیریں دہنی کے ساتھ ہونا چاہیئے جو محبت کے لئے مخصوص ہے ۔ غضب خدا کا

[illegible] بھت [illegible] ہوا دقتل کی تدبیر ہے میں اپنی خاموشی پر نادم ہوں مگر پھر آپکی محبت اور آپ
بازی کی حفاظت و قدر کرونگا۔ اپنی جوانی کا صدقہ میرا قصور معاف کرو۔ میری گستاخیوں کو بھلاؤ
اپنے ہاتھ سے چند گھونٹ پانی کے دو کہ آواز تو نکلے حواس تو درست ہوں۔
قمری۔ جو ہاتوں سے اسی پذیرائی کی منتظر تھی سمجھی کہ یہ آخری تدبیر کارگر نشین ہوئی۔
یہ آخری تیر نشانہ نشین ہوا آہوئے رسیدہ رام ہوا جاتا ہے۔ پارہ کا اضطراب دور ہو گیا شام
غربت صبح راحت سے تبدیل ہوئی وہ ارمان جو عرصے سے دل کے قید خانہ میں پا بجولان تھے رہائی
پاکر بیہیا پھولیں گے۔ وہ حسرتیں جنہوں نے مایوسیوں سے مسموم ہو کر کنج قلب میں ٹھکانہ بنالیا
تھا دوبارہ زندگی پائینگی۔ سعی مشکور ہوئی۔ کلفت دور ہوئی۔ اب زیادہ اتنا نہ کھینچنا چاہیئے کہ
چلتہ لوٹ جائے۔ جھک کر آگے بڑھی اور دودھ کا وہ پیالہ جو روزانہ قمری کے سرہانے سوتے وقت
پینے کے لئے رکھا جایا کرتا تھا اُٹھا کر پہلے دو گھونٹ خود پئے اور پھر شمشاد کو پلا کر لو۔
شمشاد نے بادل ناخواستہ یہ دودھ زہر مار کیا اور اپنے ہوش حواس کو جمع کرکے فرش پر
بیٹھ گیا سوچ رہا ہے کہ اب کیا کروں۔
قمری چاہتی ہے شب اُمید کی جلد سے جلد سحر ہو مگر یہاں حواس مختل ہیں طبیعت کی شوخی شباب
کی شعریت حواس کی برجائی قلب کی توانائی سب رخصت ہیں اور موجودہ حالت صفت گریان سے
زیادہ نہیں۔ قمری ہر چند دلجوئی غمزدہ لئے حیات بخش کے ساتھ جاں پروری کرتی ہے۔ مگر یہ بھی سمجھ رہی
ہے کہ میری تخویف عاشقانہ نے شمشاد کو اسقدر مضمحل کر دیا ہے کہ ابھی ایک دو ساعت اُس میں استقبال
محبت کی۔ تقدیم شعریت کی استعداد پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن توقف تامل بھی ناگوار ہے۔ گو
اب اُسکا عجز طلب غرور کامیابی سے بدل چکا ہے تاہم وفور جذبات کا تقاضا ہے کہ تیر ترکش سے
جدا ہو خانہ کمان میں جلوہ گر ہو کر جلد سے جلد اپنا نشانہ اُڑائے مگر حالات اور وقت کی ناساعدت
سد راہ ہے۔
قمری زبان محبت پر مختلف مہریں لگا رہی ہے۔ لیکن جواب میں وہ تصدیق چاہتی ہے جسکی
جرأت ابھی شمشاد میں نہیں۔ قمری ہر چند موقعہ اور وقت کی طرف سے اطمینان دلاتی ہے مگر شمشاد کے
پہلو میں اب دل نہیں ہے گھڑی کا لیور ہے ـــ

حضرت نیاز فتحپوری کے

سحر نگار اور

جذبات نگار قلم کا تازہ ترین کرشمہ

جسمیں دکھایا گیا ہو کہ عورت اپنے عالم شباب میں کیا کچھ فراموشی کرجاتی ہو

دنیا کو جس جوہر کی تلاش تھی وہ مل گیا

خدارا ... جوہر طلا کے استعمال سے فائدہ نہ ہو تو ایک پیسہ کا نمونہ مفت سچائی اور ایمانداری کا ثبوت ہے ... نمونہ اشتہار اور مجموعہ سارٹیفکٹ ہے۔ کم از کم نمونہ منگوا کر ضرور آزمائش کیجئے۔ نمونہ جوہر طلائے عجیب و غریب استعمال ۵ یوم ہم ٹکٹ بذریعہ لفافہ آنے پر مع محصول پارسل آپکے مکان پر پہنچ جائیگا

جوہر طلائے عجیب و غریب

یہ طلسم ہو مرجھائے ہوئے دلوں کو ہرا کرنے والا بگڑی ہوئی حالت کو دور کرکے امید امنگ پیدا کرنے والا جن لوگوں نے بچپن کی بے اعتدالیوں سے اپنی جسمانی حالت کو بیکار کر لیا ہو اور کف افسوس مل رہے ہوں ان کے لیے یہ طلا اعجاز مسیحائی کا اثر رکھتا ہے۔ رگوں میں خراب رطوبت کا بھر جانا کمزوری و نا غری کی علامت سب شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔ اوپر کی خراب جلد مثل کینچلی کے اتار دیتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ چھالہ وغیرہ کی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ترکیب نہایت آسان ہے۔ رگوں اور پٹھوں کی نقاہت کو دور کرکے مردہ رگوں میں تازہ اسٹیم بھرتا ہے دوران خون کو تیز کرتا ہے پٹھوں کو قوی اور فربہ کرتا ہے رگوں کی خراب رطوبت نکل جانے کی وجہ سے خون کا دوران بڑھنے لگتا ہے اور کمزوری دور ہو جاتی ہے۔ رگیں کمزور اور پٹھے ناطاقت ہو جانے کے باعث عضو میں یہ شان نہیں رہتی کہ روح اور ریح کو قبول کرے یا قبول کرکے دیر تک محفوظ رکھے دوران خون بھی وہاں پورے طور سے نہیں ہوتا اسلیے اصول علاج کے مطابق رگوں اور پٹھوں میں طاقت پہنچانا اور رگوں کی خراب رطوبت کو تحلیل کرنا اور دوران خون کو تیز کرنا چاہیے تاکہ عضو پوری مقدار میں ہو جائے۔ عضو اصلی حالت پر نہ آنے کی وجہ سے ہلکی سی حرارت پا کر مادہ تولید کو نکال کر پھینک دیتا ہے مفصل حال فہرست سے معلوم ہو گا +

قیمت فی شیشی کلاں ایک تولہ ۔ ۴ یوم عہ شیشی خورد چھ ماشہ ۲۰ یوم عہ

المشتہر حکیم جوہر حیات اینڈ کو فراشخانہ دہلی

جلد ۲ فروری ۱۹۱۲ء نمبر ۲

تمدّن دہلی

علمی + ادبی + سیاسی + معاشرتی + اخلاقی + فلسفی +

مضامین کا مخزن

فہرست مضامین

سیاست کی چاشنی۔ حقوق نسواں کی حمایت۔ مشاہیر کے کارنامے تحریکات ہند کی تاریخیں
قعات عالم واقعات ہند یہ سب باتیں آپ کو اس اخبار میں ملیں گی۔
علیم نسواں کے حامی خواتین کو بلند مرتبہ پر دیکھنے والے اسکی سرپرستی کریں

سائی کیا ہی؟ اس کا جواب آپکو اخبارات اس طرح دیتے ہیں:-

روزانہ کانگریس دہلی۔ اس کے تین پرچے ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ جو ہر لحاظ سے
بل قدر ہیں۔ زبان اور ترتیب کے لحاظ سے نسائی ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ خواتین کو ایسے اخبار
سخت ضرورت تھی، نسائی عورتوں کی دستکے معلومات کے لئے بہترین اخبار ہے۔

حقیقت لکھنو۔ اخبار کی زبان صاف اور سلیس ہے ہر پرچہ میں اس بات کی کوشش کیگئی ہے کہ معلومات
لمی خاصکر ہندوستان کے قومی رہنماؤں کے حالات اور واقعات روزمرہ کی زبان میں عورتوں کے ذہن نشین
رئے جائیں۔ اور ان میں اخبار بینی کا مذاق پیدا کیا جائے یہ کوشش ہر طرح قابل تحسین ہے۔

البرید کانپور۔ ہمیں ایک ہی نمبر دیکھ کر یہ رائے قایم کرنی پڑتی ہے کہ اخبار اپنے مقصد و مستورات
سیاست سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہوگا۔

اسوۂ حسنہ دہلی جس مقصد کو پیش نظر رکھکر نسائی نکالا گیا ہے اسکے لحاظ سے یہ پرچہ قابلیت
سے مرتب ہوا ہے۔ دیگر اخبارات نے بھی حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں مگر طوالت کے خیال سے انہیں نظرانداز کرتے ہیں۔

قیمت سالانہ قسم اول للعہ قسم دوم عہ

پتہ:۔ دفتر نسائی مٹیا محل دہلی

دل کی سزا

بارِ حسن آپ کا لیلیٰ سے اُٹھایا نہ گیا
نہ لیا قیس نے جس کو وہ ملا دل مجکو

تازیانہ کی سزا۔ جیل کی سزا۔ ٹکٹکی کی سزا۔ ہنٹروں کی سزا۔ پھانسی کی سزا۔ جرمانہ کی سزا۔ سوٹیوں کی سزا۔ تلواروں کی سزا۔ بندوقوں کی سزا۔ گولوں اور گولیوں کی سزا۔ طعنوں کی سزا اور گالیوں کی سزا اپنی اپنی جگہ مختلف سزائیں ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ یہ سزائیں اُسے ملیں۔ جرائم کے مطابق عدالتیں اور جج ہر مجرم کو کم و بیش سزائیں دیتے ہیں۔ مجرم اپنی اپنی جگہ سزائیں بھگتتے ہیں۔ انہیں تکلیف اور رنج بھی ہوتا ہے۔ لوگ بھی ایسے لوگوں کو دیکھکر افسوس اور نفرین کرتے ہیں۔ بعض مجرم حبس دیتے ہیں اور بعض کے دل و دماغ پر صدمہ بھی گذرتا ہے

اکثر مجرموں کے نام رہ رہ کر نمبر ۱۰۹ میں بھی درج ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجرم بہ سلسلہ جرائم ہمیشہ پولیس کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ رات دن پولیس ان کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اسی طرح بیشتر بعض لوگوں کی عمریں گذر جاتی ہیں یہ تو سیاسی سزائیں ہوئیں۔ ان کے علاوہ تین اور سزائیں بھی ہیں۔

(الف) سوسائیٹی کی سزا

(ب) یوم الحشر کی سزا۔

(ج) دل کی سزا۔

سوسائیٹی کی سزا تو طعنوں و نکتہ چینیوں میں ہی مل جاتی ہے۔ یوم الحشر کی سزا ہر مذہب میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل جداگانہ ہی ہوگی یہاں ہم صرف دل کی سزا کا ذکر کرتے ہیں

ہر ایک قسم کی سزا جو اوپر بیان ہوئی ہے دل پر کچھ نہ کچھ اثر کرتی ہے اور ہر انسان سزا سے متاثر بھی ہوتا ہے جتنی ظاہری سزائیں ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو دل کو کبھی کبھی کسی حد تک تکلیف میں نہ ڈالے اور لوگ اس سے نادم نہ ہوں۔ یہاں تک تو دل کی ایسی سزاؤں سے متاثر اور نادم ہونا بعض حالات میں کبھی کبھی معمولی تکلیف ہی رکھتا ہے اور اکثر لوگ کبھی کبھی بھول بھی جاتے ہیں۔ اور ان کے دل و دماغ سے ان تکالیف کا رفتہ رفتہ ازالہ ہوتا جاتا ہے۔

مگر اپنے جرم۔ غلطی۔ ارتکاب۔ اقدام اور لغزش کا خود اپنے دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ دوسری سب سزاؤں سے زیادہ تر سخت اور تکلیف دہ ہے دل کی سزا کے ساتھ کوئی دوسری سزا نہیں لگ سکتی اور نہ کوئی سزا ایسی تکلیف دہ ہے اگر ان سزاؤں کا جائزہ لیا جائے اور اُن تکالیف کا اندازہ لگایا جائے جو گنہگاروں کے دلوں پر وارد ہوتی ہیں تو پتہ لگ جائے کہ دل کی سزا کیسی سخت ہوتی ہے اور دل کہاں تک اس سے نادم ہوتا ہے ہر دل لغزش پر سزا پاتا ہے سزا کا احساس کرتا ہے اور سخت طرح کرتا ہے۔ گر کوئی کیا جانے کہ کسی کا دل کس آفت اور کس بلا میں گرفتار ہے۔ اگر ایسے دلوں کا فوٹو لیا جائے تو ہزاروں دلوں کی کیفیت عبرت خیز کا نظارہ ہو سکتا ہے اور دیکھنے والے جان سکتے ہیں کہ لغزش کی صورت میں انسان کا دل کس طرح نادم ہوتا ہے اور اس پر کیا کچھ گذرتی ہے۔

دل کیوں سزا پاتا ہے اور کیوں اس پر اس قدر سخت صدمہ ہوتا اور آفت پڑتی ہے یہ سوال غور کے قابل ہے جب انسان کوئی لغزش کھاتا اور غلطی کرتا ہے تو اس کا دل ہی سب سے اول انسان کو تنبیہ کرتا اور روکتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ یہ تم کیا کرتے ہو اور کس آفت میں خود بخود پھنستے ہو۔

دل میں قدرت نے طبعاً ایک ایسی جدت اور بصارت رکھی ہے کہ وہ ہر بُرے اور نیک کام کرنے کے وقت تنقید کرتا ہے اور فوراً ہی ٹوکتا اور روکتا یا تعریف کرتا ہے اور فوراً ہی متاثر ہو جاتا ہے کوئی ایسا انسان ہوگا جو اپنی عمر میں لغزش اور غلطی کا شکار نہ ہوا ہو یا کبھی کوئی اچھا کام نہ کیا ہو ہر انسان بغور خیال کر سکتا ہے کہ کسی لغزش کے وقت بشرطیکہ دل پہلے ہی سے بالکل آلودگیوں کی وجہ سے بے نور نہ ہو چکا ہو فوراً بھانپ جاتا ہے اور انسان کو ٹوک دیتا ہے۔ اسی طرح اچھائی کی صورت میں بھی ہر انسان کا دل ایسے کام کی خوشی اور تعریف کرتا ہے ہر انسان یہ دونوں حالتیں اپنے ہی دل میں دیکھتا ہے شاید ہی کوئی ایسا دل ہو جو ایسی جدت اور بصارت نہ رکھتا ہو دل ایک طاقت رکھتا ہے اور اس میں ایک نور بھی ہے دل اپنے رنگ میں

صراف اور نقاد ہے ہر رنگ میں وہ موقعہ پر نقادی اور صرافی کرتا ہے اور انسان اسکی جدت اور بصیرت سے وقت پر آگاہ ہوجاتا ہے جب دل نقاد اور صراف ہے تو جب اس پر زد پڑتی ہے اور وہ لغزشوں کا شکار ہوتا ہے تو اسکی حالت ایک دغدغہ میں پڑجاتی ہے ۔

یہ حالت دل کے واسطے گویا ایک سخت سزا ہوتی ہے ایسی سزا کہ جو سب سزاؤں سے زیادہ تر سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے یہ سزا جب کبھی کبھی دماغ اور حافظہ میں منتقل اور حلول ہوتی ہے تو دل پر ایک صدمہ پڑتا ہے اور جو کچھ ندامت کسی لغزش کی یاد سے ہوتی ہے وہ سالوں کے جیل در قید فرنگ سے بھی زیادہ تر رنج دہ ہے

دل کی سزا کیا ہوتی ہے کسی گناہ اور لغزش گذشتہ کا یاد ہونا قوت حافظہ اور حافظہ بہت اچھی حافت ہے لیکن جب وہ بعض وقت رہ رہ کر لغزشوں اور اغلاط یاد دلاتا ہے تو دل ایک سخت مشکل میں پڑتا ہے اور یہی یاد دل کے واسطے ایک سخت سزا ہو جاتی ہے نہ تو ایسا انسان جیل میں چکی پیستا ہے اور نہ کوئی اور سخت محنت کرتا ہے نہ اسے تازیانے لگتے ہیں اور نہ بیت صرف تازیانہ یاد ہی اپنی سزا دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں جیل کی سزا اچھی معلوم ہوتی ہے جو ندامت اور جو خجالت اور جو مایوسی ایک گناہ کے یاد کرنے پر ہوتی ہے خدا وہ دشمن کو بھی نصیب نہ کرے جب یہ بات یاد آتی ہے کہ

"کبھی ایک غریب کے مکان کو نہ دبا کر اپنا مکان سیدھا کیا تھا"

"ایک یتیم کا مال ہضم کر لیا تھا"

"ایک کے ساتھ وعدہ کیا اور وفا نہ کیا"

"خواہ مخواہ ایک دوست کی چغلی کھائی"

"جھوٹی گواہی دی"

"رشوت لیکر ایک انسان کا خون کر دیا"

"ایک اسٹام میں فریب دہ عبارت لکھدی"

"ایک امانت ہضم کر لی"

"نجاست کا ارتکاب کیا"

ان باتوں یا اس قسم کی باتوں کی یاد سے دل پر جو صدمہ گذرتا ہے وہ سخت سے سخت سزا سے بھی

زیادہ پرسنگین ہے زیادہ تر تکلیف یہ ہے کہ انسان اس صورت میں اپنی غلطی اور لغزش کا احساس کر کے
کسی سے واویلا بھی نہیں کر سکتا نہ اپنا ماجرا جو دل پر گذرے سوگذرے نہ شکایت نہ دہائی ۔

قہر درویش بجان درویش

دل کی سزا کیا ہے اور جانی اور ضمیری سزا دل کی سزا کیا ہے وہ سزا جو ہمیشہ تا زندگی تپ دق کی طرح لگی
رہتی ہے وہ پاداش جو ظاہر نہیں ہے بلکہ باطن میں ملتی ہے یہ وہ سزا ہے جسکی تصدیق اور تائید بغیر کسی گواہی
اور شہادت کے ہو جاتی ہے اور خود اپنا دل اور ضمیر ہی بطور خود بلا کم وکاست اسکی تصدیق کرتا اور خود ہی اسپر
حکم بھی لگا دیتا ہے اور آپ ہی فرد قرار داد جرم لگ جاتا ہے اور آپ ہی فیصلہ لکھا جا کر ندامت کا وارنٹ
جاری ہو جاتا ہے نہ ضمانت کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ کفالت کی نہ پولیس کی نگرانی کی اور نہ جیلر کی خبرگیری
کی دل ہی ملزم و مجرم ہے دل ہی عدالت ۔ دل ہی جج ۔ دل ہی گواہ ۔ دل ہی وکیل ۔ دل ہی ضامن ۔ دل ہی
جیل اور دل ہی جیلر یہی سزا دائمی ہوتی ہے اس وقت تک کہ کوئی معافی نہ چاہے اور بدل نادم اور خجل نہ ہو
ہم مختصراً یہاں ایک ایسی کہانی سناتے ہیں جو دل کی سزا کا کچا چٹھا کھولتی ہے ۔ ذرا دلچسپی سے سنو بشرطیکہ
آپ کا دل اس پر تیار ہو ۔ اور دل میں بھی حس ہو :۔

(الف) آہ میں کس کے پاس اپنا دکھڑا بیان کروں میرا دل بھی میرے مخالف ہے اور میری سمجھ میں
نہیں آتا کہ دل میرا ہے یا اور کسی کا جو مجھے اسقدر تنگ کرتا ہے ۔

(د) آپ تو اپنے دل کے ہاتھوں نہایت تنگ ہیں بظاہر آپ تندرست اور صحیح سالم ہیں اور غذا بھی
کھاتے ہیں کپڑے بھی اچھے ہیں یہ آہ و زاری کیسی؟

(الف) آپ میری شکل و شباہت پر خیال نہ کریں دل سے میں سوختہ اور گداز ہوں میرے دل
میں ایک درد ہے اور سوز میں رات دن جل رہا ہوں مجھ پر ایک صدمہ ہے ۔

(د) بظاہر تو نہیں معلوم ہوتا ۔

(الف) میں آپ کو دل چیر کر تو نہیں دکھا سکتا ہوں ۔

(د) آخر بات کیا ہے؟ ۔

(الف) بات یہ ہے کہ میں اپنے دل میں ایک لغزش گذشتہ کی بابت ایک صدمہ رکھتا ہوں جو مجھے
رہ رہ کر ستا رہا ہے، دل مجھے ندامت دلاتا ہے اور یہ ندامت مجھے ایک آفت میں ڈالتی ہے اس سے بہتر تھا

کرمیں کوئی اور سنا پاؤں گا۔

(د) آخر تمہیں ہوتا کیا ہے

(الف) برادر من میں ایک سخت لغزش کھا چکا ہوں اور ایک دوسری جان میری بدولت دولت آسائش سے محروم ہو چکی ہے بات میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے وہ واقعہ جب یاد آتا ہے تو میرے دل پر ایک صدمہ گذرتا ہے۔

(د) میں تو یہ خیال نہیں کر سکتا کیونکہ تمہاری ظاہری حالت بظاہر بہت خوش حال اور خوش و خرم ہے

(الف) یہ ظاہر پرستی ہے میرا دل تو اس وقت اُس سزا یاب سے بھی زیادہ تر تکلیف میں ہے جو جیل میں ہو۔ فیصلہ میرے دل کو گھن کھا رہا ہے۔ کیا گھن کسی جان کو لانا کسی سزائے بدنی سے کم ہوتا ہے، بدنی سزا تو انسان بھگت لیتا ہے، روحانی اور دلی سزا اس سے کہیں سخت ہے جو دل لگتا ہے وہی خوب جانتا ہے، دیکھو میرے دل پر ایک کمزوری غالب آ رہی ہے اور میں اپنے دل پر ایک غش کا حملہ ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں، تم میرے بشرے پر تفکر کر کے دیکھ سکتے ہو کہ میری کیا کیفیت ہے۔

(د) ہاں ہاں میں دیکھ رہا ہوں تمہارا چہرہ تو زرد ہو گیا، مجھے خوف ہے کہ تم غش کھا کر نہ جاؤ

(الف) ہاں ہاں مجھے پکڑنا۔

یہ کہا اور غش کھا کر الف زمین پر گر گیا

(د) کو پتہ لگ گیا کہ دل کی سزا کی یہ صعوبت اور یہ تکلیف ہوتی ہے، اور انسان کو ندامت یہاں تک پہنچا دیتی ہے۔ سوچو کہ یہ دلی مرض کہاں تک صدمہ رساں ہوتا ہے کاش ہم پہلے سوچتے۔

اگر ہم جانتے ایسی سزا ہے
نہ کھاتے ایسی غلطی اور لغزش

سلطان احمد

مجمع البحرین

غالب، ذوق، مومن

مختصر تمہید سلطنت مغلیہ بھی کیا مبارک زمانہ تھا، اس عہد مسعود میں ہماری پیاری اُردو زبان نے نشو و نما پائی ہے۔ یہ طفل نوخیز فرمانروائے سلطنت مغلیہ کے سایۂ عاطفت میں جوان ہوکر پروان چڑھا اس نے چار دانگ عالم میں اپنی شیریں زبانی اور خوش بیانی کا سکہ جما دیا۔ جو آج دنیا کی زبانوں میں ممتاز زبان شمار کی جانے لگی، اس عہد ہمایوں میں میرمرزا سے صاحب کمال اور یگانۂ فن پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اس بلبل ہزار داستان اُردو زبان کو خون دل لخت جگر سے پرورش کیا، محفل مغلیہ کی جھلملاتی ہوئی شمع جہاں عرمنہ کو بہادر شاہ ظفر مرحوم نے روشن کر دیا۔ اسی بزرگ کے عہد حکومت میں گلشن شاعری کی بہار زوروں پر تھی۔ میدان شاعری کے شہسوار جولانیاں دکھلا رہے تھے۔ اللہ اللہ کیسا زمانہ تھا، جسمیں دبیرالملک غالب خاقانی ہند ذوق یگانۂ فن مومن جلوہ افروز تھے یہ وقت قابل رشک تھا، ہر اک کامل الفن اپنی اپنی جدت معانی آفرینی سے گلشن شاعری میں رنگ برنگ کے پھول نکھار رہا تھا۔ اسمیں کلام نہیں کہ اُن بزرگواروں میں سے ہر اک کامل الفن یکتائے عہد ہے مگر جو بات قسام ازل سے غالب مرحوم نے پائی تھی کسیکو بھی نصیب نہیں ہوئی، دبیرالملک نے فن شاعری میں چار چاند لگا دئے، اور اس کو انتہائے عروج تک پہنچا دیا، انکی اپنی جدت بلند پروازی اچھوتی تشبیہیں اور استعارے نے دھاک بٹھا دی، تینوں بزرگواروں کے ایک ہی ردیف قافیہ کے اشعار ملاحظہ ہوں اور سخن فہم انصاف کریں۔

اشعار

غالب

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

ذوق

صبا جو آئی خس و خار سے گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکر نہ پھڑکے دل آشیاں کے لئے

مومن

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس
ہے بیم برق بلا ہر در آشیاں کے لئے

اب سخن فہم نکتہ رس غور کریں کہ ہر ایک استاد نے بے نظیر شعر کہا ہے، ذوق مرحوم فرماتے ہیں کہ اسیر قفس اپنے آشیانے کی بربادی کی تلخی پھڑک گیا ہے کیونکہ گلستان میں صبا اس لئے آشیانے کے خس و خار لینے گئی ہے اسکا آشیانہ برباد کر دیگی اس لئے گرفتار قفس بے چین ہے۔ خوب کہا ہے۔

مومن مرحوم اپنی اسیری قفس کو آزادی پر کیسے مدلل پیرایہ میں ترجیح دیتے ہیں، چمن میں ہر روز بجلی کے گرنے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ کیونکہ برق کو میرے آشیانے سے لاگ ہے، اس لئے مجکو اطمینان قلب کی آرام میسر نہیں ہو سکتا جو مجھے اسیری میں حاصل ہے کیونکہ یہاں برق کا ہر روز خوف نہیں ہے۔

سبحان اللہ لبلبہ بھی اسی مضمون کا شعر کہا ہے **شعر**

نے تیر کمان میں ہے نے صیاد کمین میں ۔۔۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

استاد غالب کا مضمون ان دونوں حضرات سے جدا ہے، کیا بے مثل شعر کہا ہے، زبان تعریف میں قاصر ہے، کہتے ہیں کہ اسیری بیرحم صیاد کی سخت اسیری میں ہے، ہر طرح کی آزادی چھین گئی ہے، قید کی شدید مصیبتیں سہتے سہتے جان لب پر ہے، اگر اپنے آشیانے کے بنانے کے لئے خس و خار فراہم کرنیکی کوشش کرتی تو بیکار ہے، نہ سعی بلیغ سے کسی نتیجہ کی امید اس کے علاوہ پابند قفس سعی بلیغ کرنے سے مجبور بھی ہے اسیطرح اگر میں رنج و محن سے رہائی پانے کے لئے کوشش کروں تو بالکل ہیچ ہے، اے سبحان اللہ کیا یاس و ناکامی کی تصویر کھینچدی ہے، **اشعار**

مومن

ہے اعتماد میرے بخت خفتہ پر کیا کیا ۔۔۔ دگرنہ خواب کہاں چشم پاسبان کیلئے

غالب

گدا سمجھکے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے ۔۔۔ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لئے

مومن مرحوم نے اپنی محرومی قسمت کی تصویر کھینچی ہے، پاسبان کو میرے بخت خفتہ پر اعتماد ہے کہ میں شومی قسمت کی وجہ سے محبوب تک نہیں پہنچ سکتا، اس لئے اُسکو خواب آگیا دگرنہ کہاں آسکتا تھا کیونکہ ہوشیاری سے پاسبانی کرنا اسکا عین فرض ہے واہ واہ،

بلبل گلشن فصاحت طوطی چمن بلاغت دبیر الملک نے ایسا بامعنی اور بلیغ شعر کہا ہے کہ اسکا جواب اُردو زبان میں نہیں ملسکتا، معشوق کی عظمت جلالت بلند پایگی لفظ پاسبان ظاہر کرتا ہے۔

(۴) عاشق ناکام کی انتہائے محبت شوق دیدار کا ثبوت لفظ گدا دیتا ہے، میں ذوق لقائے دلدار میں محبوب ادا کار کے دولت کدہ پر گیا، پاسبان نے مجھکو گدا سمجھکر کچھہ نہ کہا لیکن جب میں شوق جلوہ یار میں بیخود ہوگیا تو وفور جوش محبت سے پاسبان کے قدموں پر گر پڑا، تب تو وہ ظالم سمجھہ گیا کہ غمزدہ ستم رسیدہ طالب دیدار یار ہے پھر اُس نے مجھ پر کوہ ستم توڑا اور نکالدیا، آخرکار ذلت اُٹھاکر بھی دید جانان سے محروم رہا، لے صلی علی سمندر کو کوزہ میں بھر دیا، جذبات نگاری کا فوٹو کھینچدیا، نیچرل شاعری اسکا نام ہے، خدا جانتا ہے دل پھڑک گیا، کیا طرز بیان ہے، اشعار

ذوق

جان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو　　زبان دل کیلئے ہے نہ دل زباں کے لئے

مومن

مزا نہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوتے ہو　　میں تلخ کام رہا لذت زبان کے لئے

دونوں اُستادوں کے شعر اپنے اپنے رنگ میں آپ اپنے جواب ہیں، ذوق مرحوم نے اپنے اظہار محبت کی مجبوری کیسے لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔ سبحان اللہ ایسی ہی نازک خیالی نے استاد شہ بنا دیا۔ مولانا صفی نے بھی ایسا کہا ہے شعر

یارب ترس رہا ہوں شرح غم نہاں کو　　یا دے زبان دلکو یا دل مری زبان کو

موجودہ زمانہ میں مولانا کا وجود ذیجود قابل ناز ہے، واہ۔ واہ اُستاد مرحوم زندہ ہوتے تو مولانا کو داد سے ہمت افزائی کرتے، زبان کے قافیہ میں مرزا کا شعر یہ تھا۔

غالب

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے　　جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ذوق

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں　　کیا جانے لکھدیا اُسے کیا اضطراب میں

مومن

ہے نالہ منھ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آہ ہے　　اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

خاقانی ہند کا شعر صاف ہے واہ کیا اضطرابی جس نے آپے سے باہر کر دیا، حال دل کی خوش اسلوبی

سے آئینہ کیا، انتہا کے اضطراب میں خدا معلوم کیا لکھ دیا جس نے عاشق کش بیوفا کی سنگدلی پر پیچ و تاب میں مر گیا۔ سبحان اللہ۔

خاں صاحب نے اپنا کمال اضطراب کو انوکھے پیرائے میں نمایاں کیا۔ بغیر نالہ و گریہ کے اجزائے دل بکھرے پڑے ہیں۔ سبحان اللہ کیا بے اختیاری اضطرابی ہے، فخر ہند ثانی حافظ مرزا صاحب نے عدیم النظیر شعر کہا ہے کشتہ ناز بسمل تغافل عاشق ناکام کو اتنے نحیف نارسا سے ایسی امید کہاں تھی کہ اسکو اپنی سرمایہ زندگی آرام جان کا خط وصل ملے، مگر فلک کجرفتار چرخ ستمگار کا دل پسیج گیا، بخت نارسا نے یاری کی۔ خط دلدار وصل کا پیغام لایا۔ اب ناشاد مراد کی مسرت تحیر کا تصور کرنا امکان سے باہر ہو گیا، ممکن تھا شادی مرگ ہو جاتا اس خط وصل کے شکریہ میں جان نذر دیتا مگر کمال اضطراب نے محروم رکھا ہے، لے صل علی کیا جذبات نگاری نا بکھالی ہے واہ واہ کیا محاورہ میں ڈوبا ہوا شعر ہے۔ الفاظ ہیں کہ موتی کی لڑیاں ہیں۔ ایسی ہی بلند پروازی جدت طرازی نے غالب کو آفتاب سخن منوا دیا، جناب ذوق و مومن کے شعر سے اسکا پایہ بلند ہے۔ اشعار

مومن

کھولا جو دفتر گلا اپنا زیاں کیا　　　گذری شب وصال ستم کے حساب میں

غالب

کتنے ہوں کیا بتاؤں جہاں خراب میں　　　شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

استاد مومن نے اپنی شب وصل ستم کے حساب میں گذار دی۔ سامان وصل رہ گیا۔ خوب کہا ہے لیکن غالب کا شعر مزید ارشگفتہ ہے، یاس و حزن ٹپک رہی ہے۔ شب ہجر کی درازی مشہور ہے۔ آتش غم فرقت سے جلتے جلتے اک زمانہ ہو گیا ماشاء اللہ کس کا دل ہے جو تڑپ نہ جائے اشعار

مومن

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

غالب

قاصد کے آتے آتے اک خط اور لکھ رکھوں　　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

ذوق

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں　　　واں اک خامشی تری سب کے جواب میں

ذوق و مومن کا مضمون ایک ہی ہے صرف طرز بیان جدا جدا ہے، دونوں شعر بے مثل ہیں، ناظرین خود انصاف کریں شہسوار سخن غالب مرحوم کا مضمون جداگانہ ہے، یہ اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں، لکھتے ہیں میں اُس پری جمال حور شمائل کی خو سے واقف ہوں، اُس بیوفا نے کبھی دلشاد کیا ہوتا تو کچھ اُمید ہوتی، لہذا قاصد کے آتے آتے ایک خط اور لکھ رکھوں یہ تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ بے مروت جواب نہ دیگا۔ واہ واہ کیا بلیغ پیرایہ فصیح شعر ہے شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اشعار

غالب

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے   میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

مومن

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو [illegible] جائے ہے   یہ ستم اے بے مروت کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

رقیب یار کی یہ نگاہ لطف دیکھی نہیں جاتی شاعر کا سچا تصویر کھینچی ہے، شعر اصلیت کے پہلو لئے ہوئے ہیں خوب کہا ہے شناور بحر فصاحت غواص دریائے لطافت غالب کے شعر کا پایہ آسمان سے بھی بلند ہے فرماتے ہیں کہ مجھکو اس سراپا ناز تصویر حسن مجسم کے دیکھنے سے آپ اپنے پر رشک آتا ہے بالکل نئی اچھوتی بات ہے۔ مجھکو اپنی قسمت پر رشک ہے۔ مجھ سے وہ پری پیکر حور شمائل دیکھی نہیں جاتی اللہ اللہ شعر کیا معجزہ ہے۔ ایسی مضمون آفرینی انشاء اللہ کا کسکو نصیب ہے رشک کے مضمون میں نہایت عمدہ شعر کہیں ہیں شعر

غالب

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے درد جگر کو دیکھتے ہیں

اسی بحر میں مومن مرحوم نے ایک شعر نہایت عمدہ بلیغ کہا ہے۔ شعر

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو   ضعف کے باعث کہاں تکیہ سے اُٹھا جائے ہے

آفریں صد آفریں کیا بامعنی بلیغ پر اثر شعر ہے سبحان اللہ پتھر کا بھی دل پگھل جائے۔ یہی شعر مومن کی استادی کے لئے کافی ہے۔

مذکرہ بالا اشعار سے حضرات ناظرین پر بخوبی ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اس میں شک نہیں ہر ایک بزرگ یکتائے عصر یگانہ زمانہ شاعر بے بدل ہے لیکن انصاف تو یہ ہے کہ مرزا غالب مغفور کا پایہ ہر دو بزرگ سے ارفع ہے

ضیا جامع العلوم خاک پاک پیدا نہیں کر سکتی۔ جناب غالب فخر ہندوستان ہیں۔ دیگر ممالک کے شعرا مقابلہ میں ہم صرف غالب میر امیر ہند۔ و میر سودا کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مہر سخن آفتاب تابان و مہر درخشان غالب ہیں تو مومن ذوق ماہتاب ہیں۔ ہر دو بزرگ مضمون آفرینی جدت طرازی میں غالب کو سعی بلیغ پر بھی نہ پا سکے سچ تو یہ ہے ؎

ایں قوت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بلند خیالی طرز مضامین تو آپکا حصہ ہی ہے۔ لیکن سادگی و شوخی و متانت عبارت میں بلا مبالغہ انکے میر شعر

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
راز معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشان ہو گئیں

غور کیجئے یہ اشعار پُر درد سادہ اور شگفتہ ہیں جو کسیطرح میر سے کم نہیں۔ شعر

تیرے تیر نیمکش کو میرے دل سے کوئی پوچھے یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

واہ واہ اس شعر کا تو جواب ممکن نہیں ہے۔

سید علی نصرت
باشندہ قصبہ بجنور لکھنؤ

ہندوستان کی موجودہ حالت

کیا اہل ہند بھوکے مر رہے ہین

نظریۂ افلاس کی تجدید مسٹر دادا بھائی نوروجی نے ۱۸۷۶ء میں اہل ہند کی مالی حالت اور آمدنی کی بابت وہ تخمینے تیار کیے تھے۔ جو کئی برس بعد ایک موٹی کتاب کی صورت میں نمایان ہوئے۔ گو اسی وقت ان کا منشا کونسل ہند کی فنانشل کمیٹی کے سامنے شہادت پیش کرنا تہا۔ مسٹر ولیم ڈگبی نے بھی یہی نظریہ فرض کیا تہا۔ جسکی بعدازان مسٹر ہائنڈمن نے اسی شدومد سے تائید اور ضمانت شروع کی تہی۔ قصہ کوتاہ چالیس پچاس سال پہلے کسی ذریعہ ہندوستان کو غریب قرار دیتے تھے۔ بعضوں نے ایک انگریز کے فرسودہ بیان کی بناء پر یہ دعویٰ بھی قایم کردیا کہ پانچ کروڑ آدمیوں کی حالت اس گیدڑ سے مشابہ رہتی ہے جو ایسے جنگل میں رہتا ہو۔ جہاں شکار مار کھانے کا بہت کم موقع ملتا ہو۔

بعدازان مسٹر دت نے اس نظریہ پر بیحد خامہ فرسائی کی اور کھلم کھلا یہ دعویٰ کیا کہ انگریزی راج سے ہندوستان تباہ ہوگیا ہے۔ قحط اور بیماری انگریزی راج کے نتایج قرار دئے گئے۔ چند برس سے اس نظریہ کو نسیان کے سپرد کردیا گیا تہا۔ مگر مسٹر سنکرن نائر کی سورمانہ دلاوری کی بدولت اسے از سر نو زندگی نصیب ہوئی ہے۔ نومبر کے دوسرے ہفتہ میں آپ نے لندن میں مشیر کمیٹی کے روبرو شہادت دیتے ہوئے ہندوستان کے روز افزون افلاس کی ترقی پر بیحد زور دیا۔ اس کی صورتیں طلباء اور ممبران کہ لاغر و نحیف جسم۔ شدت افلاس آبادی کی ناگفتہ بہ حالت۔ نرخ اشیاء مصنوعات وغیرہ قرار دیں۔ اسی پر اکتفا کرکے آپنے مسٹر بسنٹ کے نو زائیدہ اخبار "یونائیٹڈ انڈیا" میں اسی مسئلہ پر زور دیا۔ یہان تک دعویٰ کیا کہ گورنمنٹ ہند کے پاس ایسی معلومات اور روداد ہیں۔ جن کی بناء پر اہل ہند کا افلاس مسلم گمان کیا جاتا ہے۔ اور گورنمنٹ ہند سے اس بات کا مطالبہ کہ وہ عوام کی حالت کی تحقیقات کرے۔ آپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں مسٹر دادا بھائی نوروجی مسٹر ولیم ڈگبی اور دیگر چالیس پچاس آدمیون کے خیالات اقتباساً پیش کیے۔ قصہ کوتاہ آپ کی حمایت نظریۂ افلاس ہند کی قیاست ہوئی ہے۔

ہمارا دعوے مسٹر سنکرن نائر بڑے قابل لیڈر ہین۔ ان کی وطن پرستی مسلم ہے۔ اور

باتیں آپ کی دماغی اور اخلاقی خوبیاں تسلیم کرنے سے ہرگز گریز نہیں کر سکیں۔ مگر آپ کے نظریہ افلاس کی تائید جو حقدار ہو واقعات اور حالات جواب ہیں۔ ان کی روشنی میں افلاس کو ماننا گویا حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ ہمارا دعوے یہ ہے کہ چالیس سال پہلے عوام کی حالت واقعی خراب تھی افلاس بہت زیادہ تھا۔ اب حالت دگرگوں ہے۔ اب ۱۹۳۱ء میں جمہور کے درمیان افلاس عشر عشیر بھی نہیں۔ اگر کوئی گروہ مشکل میں ہے تو وہ یا تو ملازمت پیشہ لوگ ہیں۔ جن کی آمدنی میں تو ترقی نہیں ہوئی مگر ضروریات زندگی کی قیمت بے شک دوگنی ہوگئی ہے۔

افلاس اور تمول اضافی ہیں

افلاس اور خوشحالی نسبتی ہیں۔ مطلق نہیں۔ ان کا وجود ایک دوسرے کے ساتھ ہے اور مقابلہ رکھتا ہے۔ ایک کے مقابلہ میں دوسری ہے۔ کون غریب اور کنگال ہے۔ ٹوکری ڈھونے والا مزدور۔ یا کسان۔ سپاہی یا جولاہا۔ پھر امیر کون ہے۔ کہنا تو آسان ہے۔ مگر اسے واضح کرنا دشوار ہے۔ اس معاملے میں اقتصادیات سے بڑی ہدایت ملتی ہے۔ اس کے قواعد اور اصول مسلمہ ہیں۔ اور عامیانہ خیالات کی تصحیح اور خامیوں کو درست کرتے ہیں۔ اسواسطے ہم اس فن میں اسی طرح ہدایت پذیر ہوں گے۔ واقعات سب کو اتفاق ہے مگر وہ جن نتائج کی طرف ہدایت کرتے ہیں انہیں قبول نہ کرنا دیدہ و دانستہ عقل و دانست کو الوداع کہنا ہے۔ ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں آپکے غور و فکر کے لئے ذیل کے واقعات اور دلائل پیش کرتے ہیں۔ آپ ان پر ٹھنڈے دل اور حق سے غور فرمائیگا۔ آیا یہ درست ہیں یا محض طبیعت کی جولانی کی تراش ہے۔

(۱) زمینوں کی قیمتوں میں بیشی

گذشتہ دس سال سے زمینوں کی قیمتوں میں بہت بیشی ہوئی ہے دیہات اور ضلاع میں یا اوسط دو چند اور شہر میں سہ چند اور چہار چند ہوگئی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس امر کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ چیزوں کی قیمتیں مانگ اور بہم رسانی کے عالمگیر قانون کے تابع رہتی ہیں عامیانہ بولی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک چیز کی خرید بہت ہوتی ہے تو وہ مہنگی ہو جاتی ہے۔ کیا آپ نے نیلام میں نہیں دیکھا کہ جب ایک چیز کے واسطے زیادہ آدمی بولی دینے ہیں تو دام چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور جس چیز کے طلبگار ایک دو ہی ہوں تو اسکی قیمت نہیں بڑھتی اب جن اضلاع میں اہل زراعت اور شہروں میں سیٹھ ساہوکار زمین خرید رہے ہیں۔ اسوجہ سے انکی قیمت بڑھ رہی ہے۔ اس امر کو بھی خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ خرید و فروخت بغیر روپیہ کے ناممکن ہے

بغیر روپیہ کے لین دین کوئی نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ زمینوں کی خرید اور انکی
قیمتوں میں بے حد بیشی سے یہ ثابت ہے کہ لوگوں کے پاس بہت سا ہو گیا ہے۔

(۱) عالمگیر گرانی سے کاشتکاروں کو فائدہ

گرانی عالمگیر ہے۔ برسوں سے رفتہ رفتہ ضروریات زندگی مہنگی ہوتی چلی آتی ہیں
اس سے زراعت پیشہ آبادی کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے وہ بڑے آسودہ
حال ہو گئے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ اگر ایک کاشتکار کے پاس مثلاً
ایک ایکڑ اراضی ہو۔ اور دس سال پہلے اس سے دس من گندم وصول ہوتی تھی جو بحساب ڈھائی روپیہ من
ڈھائی سو کی تھی۔ اب تو اسی زمین کی اتنی ہی پیداوار بحساب چھ روپیہ من چھ سو روپیہ کی ہے۔ گویا ساڑھے
تین سو کی بیشی اس کی دس سال کی آمدنی میں ہو گئی ہے۔ جس کے لئے اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی ضرورت
نہیں ہوئی۔ کیا زراعت پیشہ آبادی کو کال ہے جن کی زمین کی قیمت اب دو چند اور جن کی آمدنی میں
دو ڈھائی گنا ترقی ہو گئی ہے۔ ہرگز نہیں یہ حساب کا سوال نہیں ہے بلکہ دیہاتوں کی طرز معاشرت بدل گئی
گاؤں کے جولاہے کے یہاں بجائے نفیس باریک کپڑا گزی گاڑھے کے پہنا جاتا ہے۔ ان کی عورتوں کے زیورات
سونے کے اور پوشاک شہری استریوں کی مانند ہے۔ چادروں میں بلجیم کے فیتے اور ریشم مزین ہیں۔ ان کے
درمیان راحت و آسایش کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ جو روپیہ کے بغیر ناممکن ہے۔

(۲) شرح مزدوری میں اضافہ

علاوہ ازیں گذشتہ دس سال کے عرصہ میں شرح مزدوری دو چند سہ چند ہو گئی
ہے۔ مگر بلا واسطہ اسی میں دو گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے اہل محنت اور مزدور
پیشہ گروہوں کے درمیان آسودگی بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کے کھانے پینے
پہننے سے ہی ظاہر ہے۔ ان معاشرت میں بہتری نظر آتی ہے۔ ان کی عورتوں کے زیورات اور کپڑے ان کی
آسودگی پر دلالت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں راج۔ معمار۔ بڑھئی وغیرہ کی روزانہ مزدوری دو ڈھائی روپیہ اور
مزدوروں کی بارہ آنہ اور ایک روپیہ کے درمیان ہے۔ یہ لاہور کی شرح ہے۔ باقی شہروں کا بھی یہی حال ہے
پنجاب کی نو آبادیوں میں فصل کے موقع پر ڈھائی تین روپیہ روزانہ کٹائی کرنے والے مزدوروں کو دئے جاتے
ہیں پٹسن کے موسم میں بنگال میں مزدوروں کو خاصی ڈبل اجرت ملتی ہے۔ اور دوسرے حصوں میں بھی
کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ اہل حرفت مزدور شرح اجرت بڑھ جانے سے بہت آسودہ
حال ہو رہے ہیں۔ ان کے کپڑے اور معاشرت سے اس کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ اور یہ لوگ آبادی میں [illegible]

فی صدی پائے جاتے ہیں۔

ریل گاڑیوں میں مسافروں کی کثرت

اگر عوام کی آسودگی کا ثبوت مزید درکار ہو تو ریل گاڑیوں کی حالت ملاحظہ فرمائیے کس قدر آدمی سوار ہوتے ہیں۔ ٹکٹ لینے اور چڑھنے میں مصیبت کا سامنا پڑتا ہے۔ لاہور اور دہلی کے درمیان پندرہ ماہ سے صرف ڈیوڑھے درجے کی گاڑیاں لگائی جاتی ہیں۔ یعنی تیسرا درجہ موقوف کر دیا گیا ہے تو بھی بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی کھچا کھچ بھری رہتی ہیں۔ گو جون سنہ ۱۹۱۹ء سے کرایہ پورا لیا جاتا ہے۔ تو بھی تیسرے۔ ڈیوڑھے اور دوسرے درجہ میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ الامان۔ اگر کوئی آدمی ہمت اور حوصلہ سے کام نہ لے۔ تو وہ روز تک اسٹیشن پر دھکے کھاتا رہے۔ مگر جگہ ہی نہ ملے۔ دیہات کے سادہ لوح اور سلیم طبع لوگ کئی دن تک اسٹیشنوں پر ہر ایک گاڑیوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ کیا سفر بغیر پیسے کے ممکن ہے؟ کیا بغیر کام یا سیاحت کے کوئی اپنا ٹھکانا چھوڑ کر مسافرت کی خاک پسند کرتا ہے۔ جو لوگ تیسرے درجہ کی بجائے اب ڈیوڑھے میں جاتے ہیں۔ ڈیوڑھے والے دوسرے میں جا بیٹھتے ہیں۔ جو ان کی خوشحالی کی زبردست دلیل ہے۔

تجارتی ترقی

تہتر اسی سال سے تجارت خارجی میں سال بسال ترقی ہوتی چلی آتی ہے۔ جس سے تجارت پیشہ آبادی کو بھی فائدہ پہنچا ہے۔ جو ان کی حالت سے بخوبی ظاہر ہے شہروں میں مکان اور دوکانیں بن رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے اینٹ بنانے اور لگانے اور فروخت کرنے والے لکڑی۔ چونہ والے۔ راج مزدور اور دیگر پیشوں کی چاندی ہے۔ سیٹھ۔ ساہوکار بہت سے متمول بن گئے ہیں ان کی معاشرت میں بھی بہت فرق آگیا ہے۔ فٹنوں والے اب موٹر گاڑیوں میں ہوا کھاتے پھرتے ہیں۔ اور تانگے والوں نے بگھیاں خرید لی ہیں۔ پیدل چلنے والے تانگوں میں اپنی شان دکھاتے ہیں۔ سفر کے وقت ڈیوڑھے کی بجائے دوسرے درجہ کا ٹکٹ لیتے ہیں۔ آسائش کے جملہ لوازمہ ان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ جنگ سے پہلے پانچ برسوں کا سالانہ اوسط خارجی تجارت کے نفع کا ساڑھے اٹھتر کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ گو اس میں سے کچھ حصہ ملک باہر چلا گیا۔ مگر تو بھی ہر سال ۳۶ کروڑ سالانہ کا سونا اور چاندی آتی رہی۔ جو زیورات اور ظروف اور دیگر مصنوعات میں غرق ہوتی رہی۔ گورنمنٹ کے کام کے لئے الگ آتی رہی۔ ساٹھ سال کے عرصہ میں نو (۹) ارب روپیہ کا سونا چاندی آکر ملک میں غرق ہو گئی۔ اور کروڑوں روپیہ غائب ہو جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عوام الناس کنگال ہیں جیسا کہ سر سنکرن نائر کا خیال ہے۔ ان واقعات کو کسی ماہر اقتصادیات کے سامنے پیش کر کے

پوچھئے۔ آیا بر تموّل کے لوازم ہیں یا نہیں۔ ہم ان واقعات کی بنا بر نظریۂ افلاس ماننے سے انکار کرتے ہیں

ضروریات کا مسئلہ

افلاس کہو یا تموّل یہ صرف ضروریات زندگی کا مسئلہ ہے۔ اگر ان کی افراط ہو تو آسودگی ظاہر ہے۔ اگر قلت ہو تو غریب اور تنگ دستی لازم ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ نقد روپیہ ہی موجود ہونے سے آدمی دولتمند ہو سکتا ہے۔ مگر دراصل یہ خیال خام ہے۔ روپیہ گو فقط ضروریات کی بہم رسانی کا بہترین وسیلہ ہے۔ آپ کی جیب میں جو پانچ سات آنہ کے پیسے پڑے ہیں نہیں چاہے کہ آپ اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اور نہ نوٹوں سے تن پوشی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف وسیلہ ہے جس سے کپڑا یا اناج یا اور ضروریات حاصل کر سکتے ہیں۔ اور پیسہ چیزوں کی قیمت کا معیار ہے۔ اور دولت کی بہترین اور سبک ترین صورت ہے۔ گاڑی گھوڑا چاہے ہزار روپیہ کا ہو آپ جیب میں ڈالکر نہیں لے جا سکتے۔ اور نہ ہی بنگلہ کندھے پر لادا جا سکتا ہے۔ چاہے پچاس ہزار کا ہو مگر نوٹوں میں یہ خوبی ہے کہ دس لاکھ روپیہ کوٹ یا واسکٹ کی جیبوں میں سما سکتا ہے آپ کو کتنی سہولت ہے۔ روپیہ ہمارے مال دمتاع کا ایک ضروری جزو ہے۔ ضروریات زندگی کا تبادلہ پیسہ سے ہوتا ہے۔ پیسے دئے اور سبزی ترکاری یا کوئی اور ضرورت کی چیز لے لی۔ دیہات کے لوگ اپنی ضروریات کا جنس یا اور چیزوں سے تبادلہ کر لیتے ہیں۔ وہ شہریوں کی طرح لمبے ٹھاٹے نہیں کرتے۔ کاشتکار کی آمدنی دس سال کی نسبت اب بوجہ گرانی ڈھائی گنا ہے۔ اور مزدور کی مزدوری دوگنی ہے۔ اہل تجارت خوب مالامال ہو رہے ہیں۔ یہ تینوں گروہ ضروریات زندگی کی طرف سے مستغنی ہیں، کھانے پینے کے سامان بکثرت حاصل ہیں۔ انہیں کنگال کون قرار دیسکتا ہے۔ زراعت پیشہ آبادی (۷۱) فی صدی۔ تجارت پیشہ (۶،۵) فی صدی اہل محنت و حرفت ہیں (۷،۱۱) فی صدی ہے۔ سرکاری ملازم جن میں چپراسی کورٹ ڈپٹی کمشنر اور سشن جج سے لیکر دربان۔ اردلی چپراسی کانسٹبل پولیس اور فوج والے ہیں ان کا شمار (۱،۶۵) فی صدی ہے۔ وکیل۔ ڈاکٹر۔ پروفیسر۔ اخبار نویس وغیرہ وغیرہ (۱،۷) فی صدی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ ضروریات کی تنگی صرف ملازمت پیشہ آدمیوں ہی کو زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

شرح اموات اور عمر

سر سنگرن نائر نے اپنا دعویٰ بڑھتی ہوئی شرح اموات میں ہی قایم کیا ہے یعنی یہ کہ لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ اسواسطے انکی جسمانی قوت زوال پذیر ہے۔ اور وہ جلد بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر آپکا یہ دعویٰ ویسا ہی

کمزور ہے جیسے اور یعنی یہ کہ بڑھی ہوئی شرح اموات کو افلاس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کیا آپ نے مُردوں کے اعداد پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ اگر نہیں ڈالی۔ تو اب ملاحظہ فرمائیے۔

مُردوں کے اعداد پر ایک نظر

ہم ۱۹۱۸ء کے سرکاری اعداد اموات و پیدائش کی بابت پیش کرکے اصلیت کو واضح کئے دیتے ہیں۔ کل ۸۰ لاکھ ۳ ہزار ۳۲۸ آدمی ہلاک ہوئے تھے انمیں ایکسال سے نیچے کے بچے ۱۹ لاکھ ۲۹ ہزار ۴۹۱ تھے اور ۵ برس کے درمیان کے ۱۳ لاکھ ۶۵ ہزار ۳۶۴ تھے اور پانچ اور دس برس کے درمیان (۵) لاکھ (۱۲) ہزار (۱۹۹) تھے۔ گویا دس سال سے نیچے کے بچے مردوں میں (۳۸) لاکھ ۷ ہزار تھے۔ یعنی نصف بچے۔ اور نصف مرد و عورت اسّی اور بہتر برس کے درمیان کے تھے۔ اور یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں بچے سب سے زیادہ مرتے ہیں۔ اگر اُس سال کی شرح اموات فی ہزار (۳۴) تھی۔ اگر بچوں کو خارج کردو تو شرح اموات (۱۶۷۵) فی ہزار رہ جاتی ہے جو برطانیہ کے برابر ہے اس سے ظاہر ہے کہ شرح اموات کیوں بڑھی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اس کا غربت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اتنے بچے کیوں مرتے ہیں اسکے اسباب حسب ذیل ہیں۔

زیادہ تر بچے کیوں مرتے ہیں؟

(۱) صغرسنی اور بڑھاپے کی شادیاں۔ جن کی اولاد اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو تو بچتی ہی نہیں۔ اور اگر بچ جائے تو عمر بھی مریل اور سدا روگی رہتی ہے۔ یہ سبب طلبار کی صحت جسمانی کے زوال کا ایک اور بھی ہے۔ سال کے اندر کے عموماً عورتوں کی بداحتیاطی سے مرتے ہیں (۲) غلیظ مکانات اور ان کے میلے کچیلے گندی گلی کوچے جہاں مضر صحت کے جراثیم پیدا ہوکر بچوں کی زندگی کا رشتہ کھا جاتے ہیں (۳) بیماری کے وقت ڈاکٹر حکیم کی بجائے گلی یا محلہ کی بڑی بوڑھیوں کی طرف رجوع لانا اور گھریلو علاج سے ننہی جانوں کو برباد ہونے دینا۔ (۴) دودھ گھی کی قلت اور مضر صحت چیزوں کی آمیزش کا مذموم اثر۔ طلبار کی صحت جسمانی دودھ گھی کی خرابی اور قلت سے بہت بگڑی جاتی ہے۔ جوان عورتیں مردوں سے اور ساری دنیا سے زیادہ مرتی ہیں۔ جس کا ایک سبب تو مذموم دستور جن کی رو سے کئی حصوں میں لڑکیوں کو عورت ذات کے طبعی آثار نمود سے پہلے بیاہ دینا۔ اس کی وجہ سے وہ کچی عمر میں مائیں بننے کو مجبور ہیں اس کا اثر ان کے جسم پر بہت خوفناک ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے برباد ہو جاتا ہے۔

دوم۔ تنگ و تاریک مکانوں میں پردہ یا بیہودہ خیالات کی وجہ سے انہیں ہر وقت بند رکھنا

جس کی وجہ سے وہ تازہ ہوا اور روشنی سے محروم رہتی ہیں۔ سل وغیرہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

سوم۔ دکھ بیماری کے وقت علاج نہ کرانا۔

چہارم۔ بچہ کی ولادت کے وقت بیوقوف دائی جنائی سے کام لینا۔ جسکی بیوقوفی سے یا تو خون بکثرت خارج ہو کر بخار۔ سرسام۔ جنون وغیرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یا تھوڑی مقدار میں خارج ہونے سے زہریلا خون بدن میں بہنے سے اور امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور زچہ مر جاتی ہیں۔ یا عمر بھر کے لئے جسم برباد ہو جاتا ہے اگر صغر سنی کی شادیاں۔ اور بڑھاپے کے بیاہ موقوف کرنے کیلئے تھا ہی عورتوں کو تازہ ہوا ہے۔ اور بیماری کے وقت بچہ یا اسکی ماں کا علاج ڈاکٹر یا حکیم سے کرایا جائے۔ اور ولادت کے وقت تربیت یافتہ دائی جنائی سے کام لیا جائے۔ اور اسی کام کیلئے بیوہ عورتوں کو سب شہروں اور قصبوں اور گاؤں میں تربیت دلاکر تیار کیا جائے تو بچوں اور عورتوں کی شرح اموات میں بڑی تخفیف ہو جائے۔ پانی اور صاف مکان۔ کھانے پینے پہننے اور رہنے کی صفائی کا تحت پر بہت نیک اثر ہوتا ہے۔ اس سے امراض کو جسم پر قابو پانیکا موقع نہیں ملسکتا۔

عیسائی اور افلاس

ہندوستان میں عیسائی سب سے زیادہ مفلس ہیں مگر انکی شرح اموات سب سے کم ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں عیسائی (۲۰/۱۵) فی ہزار ہندو (۲۵۰۵۶) مسلمان ۳۱ ہزار (۸۹) ہندو (۳۲/۴۷) فی ہزار ہلاک ہوئے تھے۔ عیسائی کیوں اتنے کم مرتے ہیں حالانکہ مسٹر کرنا ٹر کے خیال کی رو سے تو انکی شرح اموات سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ صاحب ممدوح کے خیال کی رو سے سب گروہوں میں مفلس ترین ہیں اصل یہ ہے کہ صاحب موصوف کا یہ خیال سراسر کمزور ہے۔ عیسائیوں کا دستور العمل آئی چلائی ہے زمین جایداد ان کے پاس نہیں ہے۔ مگر ان رہنے سہنے۔ کھانے پینے۔ پہننے۔ اوڑھنے میں ان کی صفائی سب قوموں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ... روپے ماہوار دیہاتی محنتا دانے تیس روپے پانیوالے ہندوستانیوں سے صفائی میں بدرجہا بڑھکر ہے۔ درصفائی ہی سے امراض دور رہتے ہیں۔ عیسائی لوگوں کی شرح اموات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ... کھانے پینے رہنے سہنے میں بڑی صفائی سے کام لینا چاہیے۔ اب یہ امر مسلم ہے کہ میلی کچیلی جگہ میں بیماری کے طرح طرح کے کیڑے پیدا ہو کر ہمارے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ جو ہماری توانائی کو کھا کھا کر بوسیدہ کر دیتے ہیں اور قبل از وقت موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں

یورپ اور امریکہ کے ملکوں کی شرح اموات

ہمارے پاس ایک اور بھی دلیل ہے۔ یورپ کے کئی ملکوں کی شرح اموات بمقابلہ برطانیہ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اور ہندوستان کے لگ بھگ ہے۔ چند برس پہلے روس کی شرح اموات ہندوستان کے برابر تھی۔ تازہ ترین اعداد معلوم نہیں۔ پھر امریکہ کے ملک چلی کی شرح اموات (۴۹) فی ہزار تھی۔ ملک ہنگری کی ۲۶ فی ہزار ہسپانیہ اور ریاستہائے بلقان کی (۲۶) فی ہزار کے لگ بھگ ہے یورپ میں ڈنمارک کی سب سے کم (۱۴) فی ہزار ہے۔ جرمنی و فرانس کی (۱۹ و ۱۹) اٹلی کی (۲۱) آسٹریا (۲۴) فی ہزار ہے۔ کیا اس سے کسی کو انکار ہے کہ اٹلی۔ آسٹریا۔ ہنگری۔ ہسپانیہ دولتمند ہیں۔ چلی جنوبی امریکہ میں مشہور ملک ہے۔ جہاں قومی جمہوری حکومت ہے۔ اور ملکوں میں بھی قومی حکومتیں ہیں۔ پھر بھی شرح اموات بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اسی بنا پر افلاس کا شرح اموات سے کوئی رشتہ ثابت نہیں ہوتا سر سنکرن نائر کا دعوی سراسر فضول ہے۔ واقعات سے اسکی ذرہ بھر تائید نہیں ہوتی۔

نتیجہ

اس مضمون سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مختلف ترقیوں کی روشنی میں ہندوستان مفلس نہیں قرار پاتا۔ واقعات جو پہلے مذکور ہوئے ہیں وہ اسکی تفیض ہیں یعنی وہ آسودگی کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ شرح اموات کی بیشی بری عادتوں اور بیہودہ دستوروں پر منحصر ہے۔ اور افلاس سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ ورنہ ہنگری۔ ہسپانیہ۔ روس۔ آسٹریا۔ پرتگال اٹلی ریاستہائے بلقان۔ اور چلی بھی کنگال ثابت ہونے چاہئیں۔ حالانکہ وہ ہندوستان سے کہیں زیادہ دولتمند مانے جاتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ سر سنکرن نائر کا دعوی سراسر بے بنیاد ہے۔ ملک آسودہ حال ہوتا جاتا ہے۔ اور آیندہ بھی ہوتا رہیگا۔

جے۔ آر۔ رائے۔ لاہور

عورت کا اثر مرد پر

سیپا ہار ماکس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ ہارماکس۔ اسقدر غیظ و غضب سے کام نہ لو۔ اور اس غرور آور لہجہ کو چھوڑ دو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہر زرہ میں ایک جوڑ ہوا کرتا ہے۔ حیف اُس شخص پر جس نے کر لے پہنا۔ اور صد حیف جب شمشیر نے اس جوڑ کو پالیا۔ روئے زمین پر عورت اپنی کمزوری میں بھی ایک نہایت زبردست قوت ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ کشتیِ انسان کا سکّان ہے۔ وہ صورتیں بدل بدلکر آتی اور بہت دروازوں پر کھٹکھٹاتی ہے۔ وہ چست اور حلیم ہے۔ اس کے جذبات مرد کی طرح اپنے قبضہ سے باہر نہیں ہوتے۔ وہ عربی النسل بادبان کی طرح دل میں آجائے تو رہبر بنتی ہے۔ ضد پر کمر باندھے تو اڑ جاتی یا گھنوٹ ہو کر ہوا پر نظر آتی ہے۔ اسکی نگاہ گویا کسی کپتان کی مقناطیسی نگاہ ہے۔ واقعی بجد مستحکم ہے۔ وہ قلعۂ قلب جس میں یہ فاتح بن کر داخل نہ ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ ایام جوانی میں مردوں کا خون بہت جوش کھاتا ہے لیکن گرمجوشی میں سچ پوچھو تو عورت مرد پر سبقت لے جاتی ہے۔ جب مرد اولوالعزمی کو مدنظر رکھتا ہے تو وہ اُس کے رموز کو تاڑ کر بتاتی ہے۔ ایسی شاہراہیں جو نکلتی ہیں شان و شکوہ کی طرف۔ جب مرد تھکا ماندہ آتا ہے تو وہ اُسے آرام دیتی ہے۔ جب مرد عوام کی نظروں سے گر جاتا ہے تو وہی اسکی دستگیری کرتی ہے۔ اور اپنے اثر سے خیال کو اسطرح پلٹ دیتی ہے کہ یہ اپنی شکست کو فتح تصور کرنا لگتا ہے۔ ہاں ہارماکس۔ یہ سب باتیں اس کے امکان میں ہیں۔ اسوجہ سے نیچر بھی ہمیشہ اسی کی حامی ہے۔ مگر عورت میں نیک خصائل کے ساتھ بدخوئیوں کا بھی ہونا کچھ قریب از قیاس نہیں۔ دل میں ٹھن جائے تو مرد کو نہ صرف دھوکا دیسکتی ہے۔ بلکہ پردۂ راز میں وہ کام کر سکتی ہے جکی مرد کو کانوں کان خبر نہو اور جس میں خود مرد کا کوئی حصہ نہو۔ بس یونہی عورت دنیا پر حکمران ہے۔ یہاں جنگ و جدال ہے تو اس کے لئے مرد نفع کے حاصل کرنے میں حیران و سرگردان ہے۔ تو اس کے لئے۔ غرض انسان عظمت و شوکت کا کوشاں رہ کر آخر ش بحر فراموشی میں غوطہ لگا کر اور ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتا ہے۔ اب بھی وہ بیٹھی ہے (عورت کی طرف تاکر) مانند اُس اسفنکس[1]

---

[1] اسفنکس۔ مصر قدیم کی وہ عمارت ہے جس کا آدھا جسم شیر اور سر اور چہرہ عورت کا سا ہوتا ہے۔

کے اور مبہم ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر کسی نے ابتک اس تبسم کی عقدہ کشائی نہ کی اور نہ اس کے دل کا راز جانا۔ نظرِ تحقیر سے نہ دیکھو۔ ہاں کسی نظرِ تحقیر سے نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص بڑا ہی خود دار اور باوقار ہے۔ جو عورت جیسی قوت سے متاثر نہو۔ مثال اس قوت کی وہ ہوا ہے جو انسان کی قوت باصرہ سے باہر ہے۔ اور جس میں یہ ہمیشہ گھرا ہوا ہے۔ وہ ہوا اکثر اسی وقت پر متاثر ہوتی ہے جس وقت کہ ہمارے حواس سے موہوم طور سے محسوس کرتے ہیں۔

(ترجمہ کلیو پاٹرا صفحہ ۲۴۲ مصنف سر رائیڈر ہاگارڈ)

مترجمہ سید احمد علی

میلاد نامہ مع رسول بیتی

اُردو زبان میں آجتک جسقدر مولود کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں یہ کتاب اُن سب سے نرالی ہے اور اسمیں تمام معتبر اور صحیح روایتوں سے جمع کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں کے حالات سے شروع کیا ہے۔ اور ولادت کا بیان نظم و نثر کی زیبایش سے قلم بند کرکے بچپن جوانی کے کل واقعات لکھے گئے ہیں پھر تتمہ الموسوم بہ رسول بیتی میں رسالت سے لیکر وفات تک کے حالات ہیں گویا آنحضرت کی مختصر اور پوری سیرت اور سوانحعمری ہے۔ آخر میں آپ کے اخلاق و عادات و لباس و طعام وغیرہ کی کیفیت ہے میلاد نامہ کی زبان ایسی آسان اور دلچسپ ہے کہ بچے اور عورتیں بلا تکان پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان بھر میں مقبول ہوئی ہے۔ شائع ہوتے ہی آٹھ دن میں ہاتھ پانسو سے زیادہ فروخت ہوگئی اب سہ بارہ چھپی ہے وہ بھی قریب ختم ہے کیونکہ لگاتار مانگ چلی آتی ہے قیمت ایک روپیہ چھ آنہ عہ علاوہ محصول۔

سی پارہ دل اس کتاب میں خواجہ صاحب کے تمام مضامین ہیں جو آجتک ہندوستان کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں چھپے بعض مضامین تو وہ ہیں جو نایاب ہوگئے تھے۔ ایک اشرفی قیمت دینے پر بھی دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اُردو زبان میں ایک نئی وضع انشا پردازی کی ایجاد کی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں تسلیم کرتے ہیں قیمت صرف عہ علاوہ محصول

ملنے کا پتہ دفتر تمدن بیٹا محل دہلی

نہ خورد شیر نیم خوردۂ سگ

یہ ایک مشہور بات ہے کہ شیر دوسرے کی شکار کی ہوئی چیز خصوصاً کتے کا پس خوردہ ہرگز نہیں کھاتا اگرچہ وہ کئی دن کا بھوکا ہو۔ واقعی اس کے ان مشہور کارناموں اور ہمت و جرأت سے بھرے ہوئے افسانوں کے مقابلہ میں جنکو ہم بچپن سے سنتے چلے آتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے باور کرنے میں کسیکو تامل ہو۔ یا ایک عجیب و غریب قصہ سمجھا جائے۔ بہرحال مصرع بالا کے لئے اس مصرع زیب عنوان کا مفہوم نہایت ہی قابل قدر اور بہت ہی حوصلہ افزا ہے۔ معلوم نہیں اس مصرعہ نے کتنے باہمتوں کو اظہار ہمت پر آمادہ کیا ہے۔ اور کتنے اولوالعزم حضرات نے اس سحر انگیز مصرعہ کو پڑھکر کیسی کیسی دولت اور کیسے کیسے جواہرات و منافع چھوڑ دیئے ہیں۔ جو لوگ شاعری کو سحر حلال ماننے میں تامل کرتے ہیں یا اسکو ایک اسم بلامسمی سمجھتے ہیں انہیں چاہیئے کہ ہمارے اس مضمون کو غور سے پڑھیں اور کم از کم اس مصرعہ ہی کو خوب یاد رکھیں کہ اپنے موقع و محل پر یہ مصرعہ اس مضمون کو ان کے ذہن نشین کرلے۔ کرمیں کہ غضب کا جلنا ہوا منتر ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ خدا غلام بنائے۔ مگر غلام کی صورت نہ بنائے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خدا بدصورت بنائے مگر بدسیرت و بے ہمت نہ بنائے۔ ہائے ہمت بھی کیا چیز ہے۔ کچھ نہ ہو مگر ایک ہمت ہو تو بس ہے۔ ہمت والے کی زندگی، زندگی!! اور اس کی موت، موت ہے!! یعنی جب تک وہ زندہ رہیگا عزت کے ساتھ زندہ رہیگا۔ اور جب مریگا عزت کی موت مریگا۔

دنیا میں جتنے نامور ہوئے ہیں وہ ہمت والے ہی ہوئے ہیں۔ اور جسقدر بانی خاندان گذرے ہیں وہ ہمت والے ہی گذرے ہیں۔ اہل ہمم جنت بھی چاہتے ہیں تو اپنے اعمال حسنہ کے معاوضہ میں چاہتے ہیں آپکی

میں تو جنت میں بھی جانے کا کبھی نام نہ لوں
جب تک آ نہ گئی نہ حوریں مرے لے جانے کو

ہمت والوں کے پاس ناممکن کوئی چیز نہیں مشکل سے مشکل کام ان کی ہمت و شجاعت کے مقابلہ میں بازیچۂ اطفال ہیں۔ کوہ۔ پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ **غالب**

ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بلند حوصلہ جو کام کرتے ہیں اپنے بل بوتے پر کرتے ہیں۔ کسی سے دیگر رہنا نہیں۔ ایک منٹ کے لئے بھی منظور نہیں۔ اِن کو باپ الو کی دولت و جاگیر پر ناز نہیں ہوتا۔ رشتہ داروں کی عزت و توقیر کے تعلق سے بیجا فخر نہیں کرتے۔ غیروں کی کمائی سے عیش منانا۔ کسی کے دست نگر رہنا اور اپنی خاندانی شرافت کا اظہار دوسروں کو ذلیل کرنے کے لئے کرنا اُنکی ہمت سے بہت بعید ہے **سیفی**

جن میں قوت ہے وہ کب چھینتے ہیں تابعِ غیر — پیٹ بھرنے میں شیر کے ہرگز بھی ہوتی نہیں

اِن کی ہمت ہر وقت یہی چاہتی ہے کہ کسی کی مدد کرے کسی کی مصیبت میں کام آئے اغیار کی چیز پر بھی نظر اور دن کا ذرہ برابر احسان انہیں ہرگز گوارا نہیں ۔ **عرفی**

افسال کرم می گزد ارباب ہمم را — ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را +

برخلاف اس کے بزدل اور پست ہمت شخص نہ خود ہی کوئی نمایاں کام کرتا ہے۔ نہ دوسروں کی محنت کو سرسبز ہونے دیتا ہے۔ ہمت سے کبھی کچھ کرتا بھی ہے تو یہی کہ زیر دستوں کی ہمت و محنت کے نتایج کو اپنی طرف اور اپنی برائیوں اور کمزوریوں کو اُنکی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور اُس کو اپنے اس طرز عمل سے شرم آتی ہے اور نہ کچھ افسوس ہوتا ہے۔ **سعدی**

حقا کہ با عقوبت در دوزخ برابر است

رفتن بہ پائے مردئ ہمسایہ در بہشت

واتنی .... نہ خورد شیر نیم خوردۂ سگ

کم حوصلہ آدمی کی نظر ہمیشہ ذلیل باتوں پر رہتی ہے۔ اور اُس کے ارادوں کو ہمت و حمیت سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اللہ جل شانہ نے ایسے لوگوں سے دور رکھے" عقلمندوں نے کیا خوب کہا ہے (مردوں کی گردمیں رہو مگر نامردوں کی سرمد میں نہ رہو) **مولانا رومی**

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالح ترا طالح کند

از سید حسین سیفی حیدرآبادی

اطلاع ۔ خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ہونا چاہیئے ۔

جوابِ لاجواب

آج چھ دن ہوئے میں صرف وہیں نہیں گیا تھا۔ بلکہ کہیں نہیں گیا تھا۔ مگر حقیقت یہی تھی۔ چونکہ وہاں نہیں گیا تھا۔ اس وجہ سے کہیں نہیں گیا تھا۔ گو کہ ایسا جبر کرنا میرے لئے محال ہوتا تھا۔ مگر دل کو صبح شام کے خیال سے بہلا کر اتنا وقت کاٹ ہی دیا۔

آج ساتویں دن ملازم ایک رقعہ لیکر آیا۔ گو کہ دراصل یہ اُن ہاتھوں کا لکھا ہوا نہ تھا جن کا خیال کرکے دل کی حرکت دوگنی ہوگئی تھی۔ مگر پھر بھی وہی تعلق تھا۔ کیونکہ یہ انہیں کی طرف سے تھا۔ اور اس میں کیا تھا؟ میری طلبی کا حکم۔

میں نے جواب میں ایک مختصر رقعہ آنے کا وعدہ کرتے ہوئے تحریر کرکے ملازم کو واپس کر دیا۔ تھوڑے سے عرصہ تک اُن لفظوں کو جو شوخیٔ مزاج کا نتیجہ تھے دوہراتا رہا۔ آخر واقعات اور نتائج صحبت پیش نظر ہوگئے۔ بہت ضبط کیا مگر آنسو نکل ہی آئے۔

سات بجے کے بعد کوئے جاناں چلا جا رہا تھا۔ گیس کی روشنی دور سے حسن زیبا کا پتہ دیکر ہجراں نصیبوں کو تڑپائے دیتی ہے آخرکار کاشانۂ یار آگیا میں ایک عجیب نیم مدہوشی کی حالت میں حریم ناز میں داخل ہوا۔ ایک تو حسن دوسرے نکھرا ہوا حسن۔ تیسرے سنوارا ہوا حسن۔ چوتھے شباب پر آیا ہوا حسن۔ آہ۔ چکور کے دل سے کوئی پوچھے۔ ایک تو چاند۔ دوسرے وہ چاند جس میں چار چاند اور لگے ہوں۔ آنکھیں چار ہوئیں نظروں نے کچھ ایسی بے صبری کے ساتھ بلائیں لیں کہ نزاکت نے اُن سے پیچھا چھڑانے کو فوراً منھ پھیر لینے پر مجبور کردیا۔

لطائف اہل محفل طبیعت کو خوش کرنیکی کوشش کرنے لگے۔ لیکن یہ بیچارے کیا جانیں کہ جس کو خود خوشی کو ملنے سے رنج ہو اُسکو خوش کرنا امر محال ہے۔

مختلف قسم کے سوالات شروع ہوئے۔ مگر وہ نیم جاں کیا جواب دیسکتا ہے۔ جو آڑے ترچھے تیروں کا نشانہ بن رہا ہو۔ خیر جو کچھ ممکن ہوا کہتا رہا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد سب لوگ دسترخوان پر پہنچ گئے مجھکو ناسازیٔ طبیعت کا عذر کرکے بڑی مشکل سے شریک ہونیکی اجازت ملی۔ مگر چند پھل کھانے پر مجبور کیا گیا۔

سیب چھیلنے کو چھری لیکر میرا تیر انداز ہی بیٹھا۔ اُن وہ دست نازک سے سیب کا کاٹنا۔ اُسکے کٹنے پہ مجھے بتا رشک ہو رہا ہے۔

"ناامیدی اور بہت بے چینی کے انتظار کی تکلیف برداشت کرنے کے بعد وہ موقع ملا جو خوش نصیبی کے لمحوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس میں دو ایک باتیں کر سکا۔

مجھ سے کہا گیا "آج تو عید کا چاند دیکھنے میں آ گیا۔

میں نے جواب دیا "ہاں۔ میں آج اپنے کو خوش نصیب سمجھتا ہوں"...... "خیر ان باتوں کے لئے تو بہت سا وقت ہو تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اسوقت ایک بات ضروری دریافت کرنا ہے۔ بتا دو۔

"پوچھو اگر جی چاہا تو بتا دینگے"

"میں دل لگی سے نہیں کہتا۔ ایسا نہو اِن ہی باتوں میں وقت ختم ہو جائے۔ آج تم یہ بتا دو کہ وہ خط واقعی تم لے آئی تھیں؟"

"اچھا تو یہ زکام کا بہانہ ہی بہانہ تہا۔ سچ یہ ہے کہ آپ اسوجہ سے اتنے عرصہ نہیں آئے۔ اُفوہ! اگر ایسا...... ...."

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ بات نہ تھی۔ میں وہ وجہ بھی بتا دوں گا۔ پہلے تم یہ بتا دو۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ خط میں نے بہت عزیز سمجھکر رکھا تھا۔"

"اچھا تو بتا ہی دوں۔ مگر زیادہ سوال اِسکے بارہ میں نہ کرنا۔ میں ملنے ضرور آئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ تم باہر گئے ہوئے تھے۔ ....میں دوپہر کو کوٹھے پر گئی۔ تمہاری کتابیں دیکھنے لگی۔ اتفاق سے وہ خط نکل آیا۔ میں سمجھی تمہارے ہاتھ کا ہے۔ اسوقت پڑھنے کا موقع نہ تھا میں نے رکھ لیا۔ پھر یاد نہیں رہا۔ دوسرے دن میں چلی آئی۔ جب یاد آیا۔ پڑھا۔ معلوم ہوا کسی اور کا ہے۔ ہاں ذرا یہ تو بتا دو۔ خوب یاد آیا۔ میرا کہنا صحیح ہے یا نہیں۔ دیکھو تمہیں تو سب ہی بیمروت کہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ جیسے آپ اپنے اوپر سے اس الزام کو دور کرنا چاہتی ہیں۔ اسی خیال کے اور لوگ بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اچھا تو اسکو واپس کر دو۔"

(مسکراہٹ جسکا نام نہ پوچھئے) زبردستی کی حد کر دی خیر...... میں نے اسوجہ سے کہا تھا کہ یہ

"زیادہ سوال نہ کرنا"..... (دیکھا نے کی آواز آئی جیسے ملنے کا ارادہ ہوا) "اصل یہ ہے کہ خط گم ہوگیا"

(ٹہلنا شروع کیا گیا)

"ارے سنو تو۔ کیا سچ مچ کھوگیا۔ آخر کہو تو کیسے کھوگیا؟"

"ٹھہر کر ایسے..... جیسے..... کیا بتاؤں"

اُف غضب کا تبسم۔ قہر کی اٹھلاتی ہوئی چال اور بس۔

اب میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ الفاظ "ایسے ..... جیسے ..... "کیا بتاؤں"
جو کہ ایک خاص انداز حسین آنکھوں کا اشارہ۔ ہاتھ کی حرکت جسم کی جنبش۔ اور وہ تبسم جس کا اثر چہرہ پر نمایاں تھا
بغیر شامل تھا، کے ساتھ ادا کئے گئے تھے۔ کیا اثر رکھتے ہوں گے۔ اور ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی ایک
دزدیدہ نگاہ ڈالتے ہوئے چل دینا کیا کسی کو کوئی زیادہ سوال کرنے کے قابل چھوڑ سکتا تھا۔

"شاہد"

حمیّت

چیست انسانی تپیدن از تب ہمسایگان وز سموم تجربہ باغ عدن پژمان شدن

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس در بیابان تنگ دل از محنت زندان شدن

اے عالیشان عمارتوں میں رہنے والو! اونچے اونچے محلوں میں سونے والو تمہیں کچھ اپنے فرض کا بھی خیال ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ تم کس لئے پیدا کئے گئے تھے۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ تمہاری آفرینش کا مقصد کیا تھا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ خلق کرنے سے اللہ جل شانہ کی اصلی منشا کیا تھی۔ نہ یہ کہ تم سجے سجائے مکانوں میں آرام سے رہو۔ موٹے موٹے لحافوں میں پیر پھیلا کر سوؤ۔ یہ خواب خرگوش تاکے اور یہ اطمینان کی نیند کب تک یہ غفلت تمہاری شایان شان نہیں۔ اور یہ لاپروا ہی تمہیں ایک دن ذلیل کرکے چھوڑیگی۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ جب خدائے عزوجل نے تمہیں نعمتیں عطا کیں تو تم اسکو مصرف میں نہ لاؤ۔ حاشا و کلا اگر تم بفرض محال ایسا کروگے تو تم سے بڑھکر کوئی بدقسمت نہیں۔ اسکی بخشش سے انکار ناشکری اور اسکی بے انتہا جود و عطا سے انحراف کفران نعمت۔

سوچو غور کرو۔ اور دیکھو کہ تم امیر بنائے گئے ہو تو بیوجہ نہیں۔ استطاعت دی گئی ہے تو بے سبب نہیں۔ تم اگر صاحب نصاب ہو تو تمہارے فرائض بھی زائد ہیں۔ تمہاری ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔ کیا اس ذمہ داری کا یہی مطلب ہے کہ تم تو آرام کرو اور تمہارے مفلس بھائی ناداری اور غربت کی تکلیف میں راتیں جاگ جاگ کر صبح کریں۔ جناب خالق نے تمہیں امیر بنایا۔ بہت ممکن تھا تمہیں مفلس قلاش بنا دیتا اس نے تمہیں اشرف المخلوقات میں پیدا کیا۔ بہت ممکن تھا کہ کتا اور بکری بنا دیتا۔ انسان بھی بنا کے اچھے برُی کی تمیز دی عقل و شعور دیا۔ نفع و نقصان کا احساس دیا۔ ادراک دیا نعم عطا کی آخر کیوں کچھ تمہارا اسپر حق تو نہ تھا۔ کچھ تمہارا فرض نہ تھا کوئی اخلاقی پابندی نہ تھی اور نہ کوئی سوسائٹی کا دباؤ تھا صرف اسلئے کہ تم اسکا شکر ادا کرو۔ اسی کی عبادت کرو۔ اسی کی پرستش کرو۔ اسی کے نام پر تمہارا خاتمہ ہو۔

یہ سب کچھ سہی لیکن یک معبود کے لئے پرستش کا ایک رخ ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو انسان کی آفرینش کا منشا یہی مقصد نہ تھا کہ وہ عبادت و طاعت میں زندگی گزارے۔ پرستش و بندگی

بس اپنی عمر کاٹ دے بس

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیان

ہمارا دوسرا سب سے بڑا فرض انسانی ہمدردی اور اخوت ہے۔ یہ وہ احساس ہے جسے کبھی سنا نہیں یہ وہ درد ہے جو کبھی سہنے والا نہیں۔ یہ وہ خیال ہے جو ابدی اور یہ وہ حمیت ہے جسے ہمیشہ بقا ہے ایک حکیم کا قول ہے کہ دنیا بدلے کا گھر ہے۔ جو تو کریگا وہ پائیگا۔ دنیا میں تو لوگوں سے بھلائی کر کیونکہ یہی وہ ایک چیز ہے جو تیرے کام آویگی۔

اس کیفیت کا احساس محسوس کرنے والے کے خیالات پر منحصر ہے۔ اگر وہ مذہبی ہے تو وہ اسکو کسی اور پیرایہ میں لیگا۔ اگر دہریہ ہے تو اُس کے لئے یہ جذبہ کامل ایمان کا جزو نہیں بلکہ عین ایمان ہوگا

(۱) وہ شخص جو خدائے واحد کو مانتا ہے۔ وہ حمیت اور اخوت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اگر خدا کی عبادت کے بعد اسے کسی چیز کا خیال ہو سکتا ہے تو وہ اسی کا۔

"جسے اپنے بھائی کا خیال نہیں اُسے اپنے خالق کا خیال نہیں اور جسے اپنے خالق کا خیال نہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کیونکر اُسے انسان کے اچھے لقب سے یاد کروں"

اور یہ سچ ہے ظالم اور بے حمیت ۲ جرموں کا مرتکب ہوتا ہے۔

(الف) غرور۔ مغرور خود کو دوسروں پر فوقیت دیتا ہے اپنے کو بالاتر سمجھتا ہے اور دوسروں کو ذلیل۔ خود کو معزز سمجھتا ہے اور دوسروں کو حقیر۔ اس غرور کی یہی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) مغرور دوسروں کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ اُنکی اخوت و ہمدردی کا دعویٰ کر سکیں۔

(۲) خود کو وہ اسقدر اعلیٰ سمجھتا ہے کہ اُنکی اعانت اور حمیت مظلوم کے درد کی دوا بننے کے قابل ہی نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری ہمدردی کا یہ بیجا مصرف ہے۔ اگر میں ذرا بھی تامل کروں تو ممکن ہے کہ [illegible] اور بالاصرار [illegible] میری اعانت کا مدعی ہو اور اسوقت میرے اس قیمتی احساس کا موزوں مصرف [illegible] مستقل [illegible] دھوکا دیتی ہے۔ معزز سے معزز انسان جب اس حالت کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ اعانت و حمیت کا مستحق قرار دیا جاسکے تو وہ اُس مغرور کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ اور وہ پھر اپنی بیش بہا ہمدردی کو کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر دیتا ہے اسی ٹال مٹول میں اُسکی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسکو اُسکا صحیح اور مناسب مصرف نہیں ملتا۔

میرے ان کانوں نے ارمان نکلتے نہ سُنا پوری ہوتے نہ ان آنکھوں نے تمنا دیکھی

گر تم نیکی کرنا چاہتے ہو تو اُس کے لئے موقع مت تلاش کرو۔ یہی وہ ایک موقع جسمیں عجلت مناسب ہے

(ب) خود غرضی۔ یہ دوسرا جرم ہے جبکہ کہ عالم اپنی کج خلقی اور بے حمیتی کے سبب مرتکب ہوتا ہے اس قماش کے لوگوں کا اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کیوں کسی سے ہمدردی کروں۔ کیوں کسیکی اعانت کروں اُن کے نزدیک بھلائی اُسی وقت کسی کے ساتھ کرنا چاہئیے جب وہ اپنے ساتھ بھلائی کرچکا ہو۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے کہ جسکو وہ خود ہی حل کرسکتا ہے۔ یہ انتظار کہ جب دوسرے میرے ساتھ نیکی کرلیں تب میں بھی اُنکی مدد کروں کس درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اگر دنیا کا ہر فرد بشر اُس رائے کا حامی ہوجائے تو میرے خیال میں انسانیت اور حمیت دنیا سے نیست و نابود ہوجائے۔

(ج) بیوقوفی۔ احمقوں کی دنیا میں کثرت ہے۔ افسوس کہ انکا پہلا خیال تو یہ ہوتا ہے کہ اجی مجھے کبھی ایسا موقع آنے ہی کیوں لگا ہے۔ خدا کے فضل سے تمام آرام و آسائش کے اسباب موجود ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ سارے مال و اسباب ہم سے چھین لے جائیں۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تمام میری دولت و حشمت خاک میں مل جائے۔ نہیں کبھی نہیں۔ یہ تمام چیزیں دائمی ہیں۔ اور میری زندگی جو اسوقت آرام سے گذری ہے یونہی گذرے گی۔

ہیہات۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہزاروں گھر روزانہ اجڑتے دیکھتے ہیں لیکن یہ بربادی انہیں سبق نہیں دیتی۔ اُنکی آنکھوں کے سامنے صدہا تغیرات واقع ہوئے ہیں لیکن اُن پر کچھ اثر نہیں خود انکی ہی زندگی میں ایسی تبدیلیاں ہوتی ہیں کہ اگر انہیں پر وہ غور کریں تو عبرت کیلئے بہت کافی ہیں لیکن یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اُنکی زندگی مثل ایک چکنے گھڑے کے ہے۔ اور وہ بیحیائی کی زندگی بسر کرتے ہیں ؂

بیحیا باش ہر چہ خواہی کن شرم بگذار بادشاہی کن

کیا ایسوں کو آپ اندھا کہینگے۔ بیشک کہونگا اور ضرور کہونگا۔ اُنکی آنکھیں اُنہیں دھوکا دیتی ہیں۔ یا وہ اپنی آنکھوں سے وہ کام نہیں لیتے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں۔ وہ کسی اچھی چیز کو دیکھتی ہیں تو مچل جاتی ہیں اور محو ہوجاتی ہیں اور تعریفوں کی جھڑی باندھ دیتی ہیں۔ لیکن اے بے عقل دنیا کی معمولی چیزیں جسمیں خالق اکبر کے جلوہ لاثانی کا ایک ادنیٰ جلوہ ظاہر ہے اتنی تعریف مگر اچھی چیز کے اچھے بنانے والے کی ثنا و حمد میں ایک کلمہ نہیں۔ ہائے ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ ہم کس لئے پیدا کئے گئے تھے اور ہم کیا کر رہے ہیں

ہم نے اپنا وعدہ خوب نبھایا۔ آپکو بتلا دیں ایک آسان لفظ معلوم ہوا تہا۔ ہم نے سمجہا تہا کہ یہ زبانی اقرار ہے اور لفظی وعدہ ہے۔ کیا خبر تھی کہ اسے ایفا بھی کرنا ہوگا۔ اور اگر یہ خیال رہا بھی ہوگا تو یہ کیسے خبر تھی کہ اسمیں اتنی دقتیں ہوں گی ؏

وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے

(۱۳) احسان فراموشی۔ یہ گو سلسلہ میں آخری جرم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اہمیت میں اسکا نمبر اول ہے۔ یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کوئی شخص ہمپر احسان کرتا ہے تو ہم اُسکا اجر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ھل جزاء الاحسان الا الاحسان

ایک کم عقل ہمیشہ یہ خیال کریگا کہ اس آیت شریفہ کے یہ معنی ہیں کہ بدلہ محسن ہی کو واپس دیا جائے۔ لیکن نہیں۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی تمہاری مصیبت میں کام آیا ہو تو اگر تم کسی کو بھی اُس تکلیف میں مبتلا دیکھو تو اس کے ساتھ سلوک کرنیکی کوشش کرو۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ناداری کی مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ خدا بچائے۔ یہ وہ مصیبت ہے کہ جس میں کوئی شریک نہیں۔ اگر دکھ ہو اور مفلسی نہو تو احباب دکھ بانٹ لینیکی حتی الامکان کوشش کرنے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں۔ لیکن اگر مفلسی کا مرض لاحق ہے تو کوئی رستہ نہیں دیتا۔ غرض ایک پردیسی نے اُنکی مدد کی بعد چندے بیچارہ پردیسی راہی ملک عدم ہوگیا۔ متعلقین تتر بتر ہوگئے۔ زمانہ کی گردش ہی تو ہے۔ آج ہم اسیر کل آپ۔ اُن بزرگ کے دن بھی پھرے۔ احسان کا وہ زبردست بوجھ اُنکے سر پر تھا کہ اسے، چین نہ تہا۔ ہر وقت یہی خواہش تھی کہ کونسا موقع ملے اور میں سبکدوش ہوں۔ اس خیال نے اُنکے اسدرجہ ترقی کرلی کہ آس پاس والے بھی اُنکی اس خواہش سے واقف ہوگئے۔ اُن بزرگ کی خوش قسمتی سے ایک ہمسایہ کو آخر وقت بد دیکھنا پڑا اور اُسے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ بزرگ کو معلوم ہوا تو وہ خود حاجتمند کے پاس گئے۔ اور حتی المقدور اُسکی مدد کی اور کہا کہ میں آج اس بار سے سبکدوش ہوا جو مدتوں سے میری گردن پر تہا۔

یہ ہے احسان کرنیوالوں کا طریقہ اور یہ ہے اونکی روش۔ اسکا نتیجہ اگر کچھ نہیں تو کم سے کم یہ ضرور نکلتا ہے کہ احسان کا بدلہ یہ ضروری نہیں کہ آپ اپنے محسن ہی کو واپس دیجئے۔ آپ کسی سے احسان کیجئے اور آپ سبکدوش ہیں۔

اب رہا یہ کہ بے حمیت احسان فراموش کیونکر ہوا خدا ئے برتر کے ہم پر ہزارہا احسان ہیں۔ ہم جب بچے تھے اُس نے ہماری پرورش کی۔ جب ہم بیکس تھے اُس نے ہماری نگہداشت کی۔ ہم جب نادار تھے اُسنے ہماری اعانت کی آخر کیوں۔ نہ اسلئے کہ ہم اُسکا عوض نعوذ باللہ اُسے دینگے۔ اُس کے احسانات کا بدلہ یہی ہے کہ ہم اُس کے لاچار بندوں کی مدد کریں۔

تمام مذکورہ بالا باتیں ایک مذہبی نکتہ خیال سے ہیں لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ شخص جو کسی خاص مذہب کا پیرو نہیں۔ یا جو خدائے واحد کی پرستش نہیں کرتا وہ ان امور کی مخالفت کریگا۔ ایک دہریہ اگر بے حمیتی کو خدا کا گناہ نہیں تو اخلاقی جرم تو ضرور سمجھتا ہے۔

میرا تو خیال یہ ہے کہ ایک دہریہ کو انسانی ہمدردی اور اخوت کا زیادہ خیال ہوگا وہ پوچھے کیوں اس لئے کہ ایک مسلمان عبادت معبود کو فرض اول قرار دیتا ہے لیکن وہ شخص جو "عبادت معبود" کا قائل نہیں۔ جس کے نزدیک اگر عبادت ہے کوئی تو حمیت اور اگر کوئی گناہ ہے تو بے حمیتی ایک مسلمان اگر کسی بیکس مجرم کو کسی ظالم کے ہاتھوں تکلیف پاتا دیکھیگا تو اُسے کچھ تامل بھی ہوگا وہ اپنی کتاب حافظہ کی ورق گردانی کریگا۔ اور دیکھیگا کہ کہیں ایسے مجرم کی امداد گناہ تو نہیں ہے۔ لیکن ایک دہریہ جسے خدا سے کچھ مطلب اور روزہ نماز سے کچھ غرض نہیں۔ وہ اپنا مذہب یہی سمجھتا ہے کہ وہ ہر مصیبت زدہ انسان کی مدد کرے وہ اپنا دین یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں کے دکھ میں کام آئے۔ ہر رنجیدہ کو تشفی دے اور ہر مغموم کو تسلی غرض وہ ہر بھلے کام کو عبادت سمجھتا ہے۔ اور بُرے کام کو گناہ سے

درد دل پاس وفا جذبہ ایمان ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انسان ہونا

سید یامین ہاشمی۔ بی اے کلاس
کرسچین کالج۔ الہ آباد

افسانہ

سودائے خام

(۱) شام کا وقت تہا۔ الہ آباد سنٹرل جیل کے سامنے چھتنار برگد کے درخت کے نیچے دو سپاہی بیٹھے
ہوئے تھے۔ سبزہ آغاز کالے سنگھ زور زور سے بھنگ پیس رہا تھا۔ اور یہ کوشش کرتا تھا کہ سل بٹے
کے ساتھ ہم اُٹھ آئے۔ اور سیہ فام رستم خاں آہستہ آہستہ افیون گھولتے تھے۔ دونوں کے چہرے
شگفتہ تھے۔ دونوں مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف تاکتے تھے۔

کالے سنگھ نے کہا "آج اچھے آدمی کا منہ دیکھا تھا"

رستم خاں نے افیون کا ایک گھونٹ پیا۔ اور منہ بناتے ہوئے بولے "معلوم ہو جائے تو میں اس
جاگوان کو ڈبے میں بند کر لوں اور روز درشن کیا کروں"

کالے سنگھ نے بھنگ کا ایک بیضاوی گولا بنایا اور اسے ہاتھوں سے تولکر پُر اطمینان لہجہ میں
بولے "ایسے دو ایک آدمی روز آتے رہیں۔ تو کیوں سودی اور گوالے اور کوٹھی والے کی تاڑ سہنا پڑے"

آج سشن جج نے ایک معرکۃ الارا مقدمہ کی تجویز سنائی تھی اور ایک متمول خاندان کی نوجوان
بیوہ ہر نام دیوی کو دو سال کی سزا دی تھی۔ معلوم نہیں مقدمے کی اصلیت کیا تھی۔ زبان خلق کچھ کہتی
تھی۔ تجویز مقدمہ کچھ۔ لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ کچھ حسن و عشق اور رشک و رقابت کا معاملہ تھا۔ داروغہ
جیل اور وارڈر اور ڈاکٹر پھولے نہ سماتے تھے آج سونے کی ایک چڑیا اُن کے ہاتھ لگی تھی۔ اُسی کے قدموں
کی برکت تھی کہ آج کہیں بھنگ کے گولے تھے۔ کہیں افیون کی چسکیاں اور کہیں مے ناب کے دور!

(۲) تین دن گذر چکے۔ دس بجے رات کا وقت تھا۔ الہ آباد جیل کے دروازہ پر برقی لالٹین روشن
تھی۔ کالے سنگھ اور رستم خاں دربان بنے سنگینیں لئے پہرہ دیتے تھے۔

رستم خاں نے بندوق ٹیک کر کہا۔ اس نوکری سے ناک میں دم آگیا۔ یہ مزے کی میٹھی نیند سونے
کا وقت ہے یا کھڑے کھڑے قواعد کرنیکا"

کالے سنگھ کا دھیان کسی دوسری طرف تھا۔ یہ بات کان میں پڑی تو دفعتاً رستم خاں کے پاس جاکر

بہت رازدارانہ لہجہ میں بولے میاں تم سے ایک بات کہوں؟ پیچھے ہلکے تو نہیں ہو جاؤ گے جو کم ہے؟
رستم خاں نے پریقین انداز سے پوچھا" کیا مجھ پر بھی اعتبار نہیں ہے۔ آزما دیکھو۔
کالے سنگھ کو یقین آگیا۔ بولے تین دن سے روز اسی وقت جیل کے اندر سے کوئی میرے پاس کاغذ کے پرزے پھینک جایا کرتا ہے۔ بس ایک ٹھیکرے میں لپٹا ہوا میرے سامنے ہی آگر رہتا ہے اور مضمون سب کا ایک۔ یہ دیکھو۔

رستم خاں نے حیرت آمیز اشتیاق کے ساتھ پرزوں کو لیا۔ اور بہت آہستہ آہستہ پڑھنے لگے "ٹھاکر کالے سنگھ کو ہرنام دیوی کا بہت بہت پیار۔ اگر ۲ ہزار نقد۔ پانچ ہزار کا زیور اور ایک محبت سے بھرا ہوا دل لینا ہو تو مجھے یہاں سے کسیطرح نکالو۔ بس زندگی کی آس تمہیں سے ہے"
رستم خاں کو رشک ہوا۔ یہ کچھ ایسا گبھرو جوان تو نہیں ہے۔ ہاں ذرا رنگ صاف اور بدن سڈول ہے بولے" یار تمہارے نصیب تو، گتے ہوئے نظر آتے ہیں"
کالے سنگھ نے گرمجوشی سے کہا۔ جاگیں گے تو ہم دونوں کے نصیب ساتھ ہی جاگیں گے۔
رستم خاں نے سچی ہمدردی اور حوصلہ افزائی کی نظر سے دیکھا۔ رشک غایب ہوگیا بولے" تمسے مجھے یہی اُمید ہے۔ میں تمہارے ساتھ سر دینے کو تیار ہوں۔
دونوں دوست باہم سرگوشیاں کرنے لگے۔ اِن پرزوں کے متعلق جو شکوک پیدا ہو سکتے تھے وہ پیدا ہوئے۔ کوئی دھوکا فریب تو نہیں۔ شاید کسی حریف کی شرارت ہو۔ کسی بدخواہ نے یہ جال بچھایا ہو۔ لیکن عورت کا کیا اعتبار! کہیں دھوکا دے۔ تو اپنا کام نکالکر دھتکار بتائے۔ اُسے ایسے سینکڑوں آدمی مل سکتے ہیں۔ پھر اُسے نام کیونکر معلوم ہوا۔ ضرور کسی دغاباز کی شرارت ہے۔ لیکن رستم خان نے اپنی زوردلیلوں سے یہ سارے شکوک رفع کردئے۔ دھوکا فریب کچھ نہیں۔ اس کا دل تم پر آگیا ہے۔ تم جیسا سجیلا جوان ساری دنیا میں نہیں ہے۔ چاہے شرط بدلو۔ کوئی بات نہیں۔ اُس کی نگاہ تم پر پڑی اور رکچھ کبھی ورنام کا کیا کسی سے پوچھ لیا ہوگا۔ حسین عورت ہے لاکھوں کا روبار ہے۔ اور بالفرض دھتکار ہی بتادے دو چار مہینے تو اس کی صحبت کا لطف اُٹھاؤ گے۔ اتنے دنوں میں تو مالا مال ہو سکتے ہو۔ چاہے سونے کی دیواریں بنوالو۔ کالے سنگھ کی نگاہوں میں رستم خاں اسوقت ایک نہایت آزمودہ کار، ذی فہم، وفاشعار دوست معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سارے شکوک مٹ گئے۔ انقطاعی انداز سے بولا

آگے آگے رستم خاں کندھے پر بندوق رکھے فاتحانہ انداز سے چلے جاتے تھے۔ گویا کوئی معرکہ جیت کر آ رہے ہیں۔ بیچ میں ہرنام دیوی تھی۔ شرمیلی اور مستی کالے سنگھ سب کے پیچھے تھے۔ خاموش متفکر اور خائف۔ قدم قدم پر کھٹکا ہوتا تھا کہ کہیں سپاہیوں کی فوج پیچھے نہ آتی ہو۔ اس طرح قریب نصف میل چلنے کے بعد پختہ سڑک ملی۔ ہرنام دیوی ایک ٹھنڈی سانس لیکر بیٹھ گئی۔ اور بولی کہ اب مجھ سے نہیں چلا جاتا میرے پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ ایک یکہ لاؤ۔ رستم خاں بہت نادم ہوئے کہ یہ تجویز ان کی جانب سے ہونی چاہیے تھی۔ اپنی غلطی پر متاسف ہوئے۔ اور تب بندوق کالے سنگھ کے سپرد کرکے یکہ کی تلاش میں چلے۔

آدھی رات تھی۔ سنہری چاندنی چھٹکی ہوئی سبزہ زار کا فرش آنکھوں کو بھا رہا تھا۔ درخت کا ٹھنڈا سایہ روپہلے پھولوں سے آراستہ۔ ساری فطرت نغمہ و نشاط کے نشہ میں متوالی ہو رہی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ کالے سنگھ کے دل میں عاشقانہ جذبات جوش پر آئیں۔ ہرنام دیوی۔ ایک دلفریب ادا کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اور بولی یہ بہت شرارت کرتے ہیں۔ میں انہیں باندھ دونگی۔

کالے سنگھ کو جیسے بھنگ کا نشہ تھا۔ دل زلفوں میں الجھ چکا تھا۔ گردن اس وفا کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ سارا اصافا ختم ہوگیا۔ ہرنام دیوی سینہ سے لگاتے لگاتے تھک گئی لیکن وہ اپنے مستانہ رنگ میں ان شیریں اداؤں کی بہار ہی لوٹتا رہا۔

تب اسکی آنکھوں کے سامنے سے طلسم کا پردہ اٹھا۔ ہرنام دیوی نے ساڑی اُتار پھینکی۔ اور اس کے بجائے ایک گٹھیلا بڑی بڑی مونچھوں والا جوان ہاتھ میں بندوق لئے کھڑا نظر آیا۔ ایک پانچ ہاتھ کی ساڑی انسان کو کتنا دھوکا دے سکتی ہے۔ کالے سنگھ نے پیر پٹک کر کہا "ارے گھاسی رام!"

اسی اثنا میں رستم خان یکہ لاتے ہوئے دکھائی دئے۔ گھاسی رام نے وہ ساڑی اٹھا کر کالے سنگھ کو اڑھا دی اور بولا یہ تمہاری ہرنام دیوی تمہارے سپرد ہے۔ اسکے بدلے میں تمہاری یہ بندوق لیے جاتا ہوں۔ میرا قصور معاف کرنا۔

کالے سنگھ! [illegible] گھاسی [illegible] ہو چکا تھا۔ رستم خاں پر اس سانحہ کا جو کچھ اثر ہوا وہ [illegible] بیان نہیں ہو سکتا [illegible] سے [illegible] جو [illegible] یہاں [illegible] ان [illegible] لوٹنے ہمدردی کا [illegible] کالے سنگھ نے سارا الزام اسی کے سر رکھا۔ اور وہ اپنی صفائی [illegible] ایک [illegible] دی کہ [illegible] لوٹ گئی

اسی رات کو [illegible] میں [illegible] ڈاکے پڑتے۔ روزانہ اخباروں نے لکھا کہ مشہور ڈاکو گھاسی رام الہ آباد جیل سے بھاگا ہے۔ اور [illegible] ڈاکہ اور لوٹ [illegible]

[illegible] جیسلمر (راجپوتانہ)

الفت شجر

از نتیجۂ فکر جناب منشی عبد الخالق صاحب خلیق دھلوی

کیا باغ کیا بہار کیا خورشید کیا قمر
ہر چیز میں رسول کی الفت کا ہے اثر

گلہائے رنگا رنگ میں رونق اسی کی ہے
ذرّے تمام نور سے اسکے ہیں جلوہ گر

توحید کا چراغ ہے بزم جہاں میں یہ
رنگ بہار گلشن عالم ہے سر بسر

اے مومنو مشہور روایت ہے آپکی
تھا اک ستون مسجد نبوی میں پیشتر

آکر رسول پاک جو خطبہ پڑھاتے تھے
ستون بے نہال تھا سوکھا ہوا شجر

لے لیتے تھے جو اسکا سہارا کبھی کبھی
اس فخر سے دماغ وہ رکھتا تھا عرش پر

جسم رسول پاک سے یہ منزلت بڑھی
طوبیٰ کو بھی خیال میں لاتا نہ تھا مگر

کچھ دن کے بعد لوگوں نے منبر بنا دیا
شاہِ امم نے خطبہ پڑھا اُس پہ بیٹھ کر

فرقت رسول کی نہ گوارا ہوئی اُسے
رونے لگا وہ خشک شجر پھوٹ پھوٹ کر

بیتاب و بیقرار تھا سیماب کی طرح
دردِ غم رسول سے شق ہو گیا جگر

جیسے جدا ہو ماں سے کوئی شیر خوار طفل
یوں بلبلا رہا تھا تپ ہجر سے شجر

حسرت برس رہی تھی زمانہ میں ہر طرف
دیوار و در کو ہو گیا سکتہ یہ دیکھ کر

رکھا جب اپنا دستِ مبارک رسول نے
اور اُس شجر پہ مہر و محبت کی نظر

دل کو قرار آ گیا ڈھارس بندھی اُسے
جلوے سے شاد کام ہوئی چشم منتظر

اُسدم کہا یہ آپ نے اُمت کے سامنے
چھاتی سے اس شجر کو لگاتا نہیں اگر

کہتا ہوں کھا کے تم سے میں اُس ذات کی قسم
قبضہ ازل سے رکھتی ہے جو میری جان پر

روتا اسی طرح سے یہ بیتاب حشر تک
تھمتی کبھی نہ گریہ و زاری سے چشم تر

پھر اُس ستون سے بولے محبت سے یوں رسول
جو تو کہے تو کر دوں تجھے سبز و بارور

اُس نے کہا کہ چاہتا ہوں دین اس لئے
منبر پہ بیٹھیں آپ اُسے نیچے گاڑ کر

رکھتا تھا آرزو و تمنا جو دل میں وہ
ویسا ہی مصطفٰے نے کیا قصہ مختصر

عبرت کا یہ مقام اُمت کے واسطے
سوکھے درخت میں ہو محبت کا یہ اثر

اور ہم رسول پاک کی الفت سے دور ہوں
دنیا میں ہیں خلیق فقط نام کے بشر

گلگشت

ایک دن وفور غم نے جو بیتاب کر دیا
سیر چمن ہوئی دل ناشاد کو پسند

پہنچا تو دیکھا نکہت گلزار جابجا
گلشن کے جادہ ہائے الم کر رہی ہے بند

بیٹھے ہیں چپے چپے پہ گلشن کے پاسبان
خاروں کی ہیں سنانیں تو سنبل کی ہے کمند

شمشیر بن گئی ہے ہر اک موج آبجو
ہے بوئے گل سوار تو باد سمند

سبزے کے لہلہانے سے شکل زمین ہے یوں
اوڑھے ہوئے ہو جیسے کوئی چادر پرند

فرحت ہوئی جو دل کو تو سمجھا کہ واقعی
نظارہ فصل گل کا ہے دارو ئے دردمند

مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو اک نازنین زار
بیٹھی ہے آہ سرد کو سینے میں کئے بند

کہنے لگی وہ یہ کہ دل داغدار کو
صدمہ خزاں سے فصل بہاری ہوئی دو چند

تو مجھ سے پوچھ دہر کے اسباب انقلاب
تو مجھ سے سن وہ بات کہ ہو تجھ کو سودمند

یاں سب ہے نعرہ مرگ و ولادت کی اک نوید
یاں پست کر کے ایک کو ہو دوسرا بلند

بلبل کی طرح شور و فغاں سے نہ کام لے
ایسا نہ ہو کہ تجھ کو بھی پہنچے کوئی گزند

عبرت سے دیکھ نرگس حیراں کو باغ میں
جو شیوۂ سکوت پہ رہتی ہے کاربند

غافل مشو ز گل کہ ز در رفتگان خاک
ایں نامہ را بخون دل انشا نمودہ اند

(محمود-اسرائیلی

وفادار شمشاد

(گذشتہ سے پیوستہ)

قمری نے ارادہ کیا کہ قریب کی الماری سے کوئی مقوی یا قوتی لا کر شمشاد کو کھلائے کہ اختلاج قلب میں کچھ تو سکون ہو وہ کچھ تو جواب پائے مگر بدقسمتی سے سنگار میز کی دراز میں الماری کی چابی تلاش کرنی پڑی مجبوراً ٹھنڈے پانی کیلئے غسل خانہ کیطرف گلاس لئے ہوئے گئی۔ شمشاد اس بات کو تاڑ گیا کہ بیگم پانی کیلئے غسلخانہ کی طرف جا رہی ہیں غسلخانہ تک جانے میں اونے ایک دو دالان ایک غلام گردش طے کرنی پڑے گی لہٰذا کم از کم دو منٹ میں پانی لیکر واپس آسکیں گی بس یہی موقعہ ہے کہ میں اپنی جان اور آبرو کو بچاؤں۔

قمری کی نظر بچتے ہی ایک اسٹول کی مدد سے سامنے والی چھوٹی دیوار پر چڑھ گیا اور یہاں سے برابر کی چھت پر بعد اس چھت سے پھر دوسری چھت پر چڑھ کر وہ اس دیوار پر چڑھ گیا جو شارع عام پر واقع تھی۔ اور فوراً اپنے آپ کو خدا کی حفاظت میں دیکر بسم اللہ کہتا ہوا نیچے کود پڑا۔

قمری کمرہ میں آئی تو شمشاد غائب۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا کہیں نہ پایا۔ اسٹول کو دیوار کے قریب کھڑا دیکھ کر سمجھی کہ یہی راستہ اوسنے اختیار کیا۔ فوراً زینہ کا قفل کھولکر بالاخانہ پر پہنچی یہاں کیا تھا جو کچھ ہاتھ آتی۔ اور تھا ہی غیظ و غضب کے خیالات کیساتھ مسہری پر لیٹ گئی نیند کا کیا موقعہ تھا صبح تک اپنے ہی پیچ و تاب کھاتی رہی۔ یہ ایک ناگن تھی جو زخم کھا کر صبح تک اپنے زہر میں گھلتی رہی۔

شمشاد

(۶)

کودنے کو کود تو بڑی ہمت کر کے کود گیا لیکن اسقدر بلندی سے کودنا اوس کے لئے سہل نہ تھا۔ بیچارے پیر میں جو برہنہ تھے سخت چوٹ آئی کمر میں ایسا جھٹکا آیا کہ اوٹھنا دشوار ہو گیا۔ ہاتھوں کی کہنیوں پر بھی صدمہ آیا لیکن جس طرح بھی ممکن ہوا کراہتا ہوا نشستگاہ کے دروازہ تک اس لئے کہ کوئی اوسکو دیکھے پہونچ گیا۔ اور چند لمحات دو تین ہونے میں باقی تھے اسی حالت کرب میں گذارے صبح کو جبکہ موذن نے بجائے

کو اور اذان نے مسجدوں کو اور الصلوٰۃ خیر من النوم کے وعظ نے رات کے سونے والوں کو زندہ کیا تو کسی آنے والے نے نشستگاہ کے دروازہ پر ایک شخص کو پڑا ہوا دیکھکر پوچھا کہ تو کون ہے۔

شمشاد بھی ... دیوار پر بیٹھا ہوا پیشاب کر رہا تھا۔ اوسکو دیکھ کر قسمت کی مار گر پڑا اب

اندر والے انہیں لوڈر۔ دروازہ کہلے اتنے بڑے محل میں آواز بہی تو نہیں جاتی۔

قمری۔ شب کا قصہ کیا کہے گی؟ آنکہ غرمائی ہوئی

سانپ کی طرح پیچ و تاب کہاتی ہوئی مسہری سے اٹہی محمود کی خوابگاہ میں پہونچکر دایہ کو بیدار
کیا۔ غسل کیا کپڑے پہنے۔ ماموں جان کو سلام کرنے کے لئے گوشہ محل میں پہونچیں۔ وہ فرشتہ
سیرت وظیفہ پڑہ رہے تہے۔ سعادتمند بہانجی کہ سلام کے جواب میں دست بوسی کی اور فرمایا کہ
میاں شمشاد کو کہلا بہیجو کہ ریل کے وقت میں صرف ڈیڑہ گہنٹہ باقی ہے۔ دایہ کو حکم دیا گیا کہ شمشاد
سے گاڑی کے لئے کہہ آؤ۔ دایہ نیچے آئیں۔ یہاں شمشاد کہاں۔ دروازہ کہلا دیکہا کہ یہاں نا
پڑے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ پوچہا ارے منشی جی تمہیں کیا ہوا۔ منشی جی نے جواب میں وہی بہانہ
جو پہلے سے تصنیف کر رکہا تہا بیان کر دیا۔ کچہ دایہ نے مدد کی کچہ شمشاد نے ہمت کی جس طرح
بنا گرتے پڑتے شمشاد اپنے بستر پر آ پڑے۔ دایہ نے کہیں جا کر کہا بیگم صاحب منشی جی تو دیوار پر سے گر پڑے
ان کے پیر دہیس اور کمر میں چوٹ آئی ہے چارپائی پر پڑے ہوئے کراہ رہے ہیں بیچاروں کے
کہنیوں اور ہاتہوں سے خون نکل رہا ہے۔

دایہ۔ بیگم منشی جی تو رات کو گر پڑے بیچاروں کے بہت چوٹ آئی ہے۔

قمری۔ (دل میں ایک حد تک خوش ہوتے ہوئے کسیقدر خندہ استہزا کے ساتہ انتقام طلب
لہجہ میں) کیا ہوا کیسے گر پڑے۔ ہاں گر پڑے ہوں گے پاگل تو ہیں ذرا ہماری طرف سے
پوچہ آؤ کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی۔ سائیس کو بلا کر کہدو کہ گاڑی تیار کرے۔ ماموں جان جانے کو
تیار ہیں گہسوا کے لوٹا ہے کہدو اسباب کے ساتہ چلا جائے تم اور نسیا آلیا احتیاط سے اوپر کا
اسباب نیچے رکہہ آؤ۔ منشی جی سے کہنا چند احجام کو بلوا لیں وہ اونکی خدمت تیل وغیرہ کی مالش
کرویگا۔ کیا نشہ کہایا تہا کیوں گر پڑے۔ (آہستہ سے) اچہا ہوا خوب ہوا۔

دایہ۔ سرکار سائیس کو تو منشی جی نے پہلے ہی سے کہہ رکہا تہا گاڑی تیار ہے۔ گہسوا کے
پیچہے کو میں کہہ آئی ہوں۔ دونوں تیار ہیں۔ اسباب پہونچے دیتی ہوں۔ رات کو نیند میں وہ
ہمارے پنجاب سیلے اوڑہے منڈیر پر بیٹہے تہے۔ جب کو اونگہ آگئی نصیب کی چوٹ تہی
پیر پہسلا نئی موڑ رہے ہیں کمر سے اوٹہا نہیں جاتا۔ بیچاروں کو سخت تکلیف ہے تیل ملا جائے

سینکا جاسکے۔ تب کہیں جا کے کچھ ہو تو ہو۔

قمری۔ ہاں ہاں ڈھونڈیں ایسی ہی اونگھ آگئی ہے۔ دن چڑھے میں بھی دیکھوں گی۔

دن چڑھے

اسی عرصہ میں رسالدار صاحب رخصت ہوئے۔ اسباب گاڑی پر رکھا گیا اور اسٹیشن پر روانہ ہوئے۔ سائیس سے کہدیا گیا کہ واپسی میں اس ڈیوڑھی کا تالا لیکر ڈاکٹر جینکو چلا آئے وہیں کو ہدایت کیگئی کہ وہ نیچے کے پھاٹک کو بند کرآئے۔ قمری نیچے اوتری دیکھا شمشاد اپنے بستر پر پڑا ہوا درد سے کراہ رہا ہے۔ دلمیں اسوقت ہمدردی اور انتقام کے جذبات باہم دست و گریباں تھے۔ آنکھ اگرچہ نہیں ہی تھی تو دل کڑھ رہا تھا جب دل خاموش ہو جاتا تھا تب آنکھ نم آلود ہو جاتی تھی۔

قمری۔ منشی جی کیا ہوا۔

شمشاد۔ سرکار اتفاق سے گر پڑا۔ کمر میں بہت سخت جھٹکا آیا نہ اوٹھا جاتا ہے نہ سیدھا لیٹا جاتا ہے۔ پیروں کے ٹخنوں پر بھی صدمہ پہونچا ہے کے گٹے بھی درد کر رہے ہیں۔

قمری۔ جی ہاں ایسی بو کھلاہٹ کا تو یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ تمنے کیسکو تکلیف پہونچائی ہوگی۔ خدانے تمہاری تنبیہ کی اب بھی نہ سمجھو تو تمہیں خدا سمجھے۔

شمشاد۔ خیر اب تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ میرا مقدر

قمری۔ اچھا اب اپنا علاج تو کرائیے ارادہ ہے میرے ساتھ آؤ انہے ڈاکٹر آئے تم نہیں مومیائی گرم دودھ میں پلا دو مومیائی میرے صندوقچہ میں ہے جلو میں دوا اور کہلانے کے لئے اوٹھو مرغ کا شوربا دیا جائے گا۔ ماما سے کہدو دیکھو انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ منشی جی گھبراؤ نہیں ایک دو دنمیں آرام ہو جائے گا۔ ڈاکٹری دوا میں رگ پٹھوں کے لئے کسیقدر زود اثر ہوتی ہیں۔

شمشاد

(۸)

رب العزت تو سراسر قادر ہے۔ تیرا فضل اگر شامل نہ ہوتا تو میں آج بیانے ہوگیا ہوتا۔ مجکو معلوم تہا کہ یہ ناگن اسقدر زہریلی ہے نسیم صبح بیکلمہ باد سموم سے بدل جاتی ہے جسمیں سیکروں میں یہی خبیث ارواح اشیاء بتا سکتی ہیں جبرئیل روحین حور کا مجسمہ بن سکتی ہیں کہا جاتا ہے

کہ جنس لطیف ہے کیا جنس لطیف کے حق میں استعمال فقیں مبارہی ہیں کہا جاتا ہے محبت کی روح کا خزانہ صنف نازک کے قلب میں ودیعت رکھا گیا ہے کیا اس صنف کو نازک اسکا لئے کہا جاتا ہے کہ اقتدار کا بار برداشت نہیں کر سکتی۔

عورت۔ خدا کی پناہ اگر حسن و شباب دونوں سے بہرہ ور ہے تو پھر یہ ایک ایسی قوت ہے جو ہمیشہ فاتح کی حیثیت قائم رکھتی ہے مغلوب ہونا اس کے لئے مقدر نہیں یہہ دشمن تقوی نہ ہو بلکہ سالہا سال کا چلکیوں میں خون کر کے رکھدے اسکی چشم مخمور دنیا کو خراب و برباد بنا دینے کو کافی۔

مگر کسی پر دے پر اپنے خاندان کی بیواؤں سے مطمئن رہتے ہیں اسلامی خانواد سے جنمیں پردہ طبیعت ثانیہ بنا ہوا ہے جنکا طریق معاشرت بہت سی پابندیاں لئے ہوئے ہے جنکے دلوں پر مذہب حکمرانی کر سکتا ہے جب ان حادثات سے مستثنے نہیں ہیں تو وہ اقوام جنکی معاشرت آزاد خیال پر دہ مفقود جہاں ضرورت سے زیادہ بے تکلفی وہاں کیا یہہ دقتیں نہ پیدا ہوتی ہونگی تقسیم جائیداد و ترکہ کی مصلحتیں اگر درمیان سے اوٹھ جائیں اور مستقبل کا حصر ترکہ شوہری سے وابستہ نہ ہو تو امید ہے کہ مرد عورتوں کے عقد ثانی پر ملامت کم ہو نیز خود عورتوں کو تکلیف باقی رہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسی تسلیخ دلی کے لئے کون تیار ہے۔ ان کو اگر او سیوقت آزاد کر دیا جاتا۔ انکا مہر انکا حصہ شوہری ترکہ سے رکھدیا جاتا کہ تم اپنے فعل اور فیصلے کی مختار ہو آئندہ زندگی جسطرح پر اور جسکے ساتھ جی چاہے گذار دو تو بلاشک آج یہہ سیلاب نجاست اور یہہ متعفن خطوط انکی زندگی کی تصویر نمودار نہ ہوتے۔ خیر یہہ تو جو کچھ بھی ہوا۔ ہوا۔ اور جو کچھ بھی ہے ہے۔ میرے امکان میں اسکی اصلاح نہیں نہ میری موجودہ حیثیت اسکی ہو رہی ہے کہ میں اصلاح کی تیاری کروں۔ اب سوال یہہ ہے کہ مرا مستقبل کیا ہو۔ بات ایسی ہے کہ زبان سے کہہ نہیں سکتا کسی سے مشورہ کا موقعہ نہیں اگر ترک خدمت کی تیاری کروں تو اس راہ میں بھی دو مصیبتیں ہیں اول یہہ ہے کہ بہر حال میرے بعد کوئی زندہ میری جگہ رکھا جائیگا کیا ضمانت ہے۔ دساتت کی کہ وہ میری ہی طرح اس گھر کی عزت کا محافظ بنا رہے آئندہ اسباب موجود ہیں تو نتیجہ معصیت میں نہ وہ رخود دست راست بنا یگا۔ گویا اسکے معنی یہہ سمجھے گئے کہ میں ایک خزانہ کا محافظ ہو کر

[illegible]

زندگی کسی صورت نصیب نہیں ہو سکتی یقیناً پریشان روزگاری کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں حیران ہوں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

اب تشریف لاتی نہیں۔ اللہ رب تو جانتا ہے یہ باتیں ہیں کیسے کروٹ کہاں چوٹ لگی سچ ہے عورت نہایت حسین بلا ہے یہ ایک ایسا شربت ہے جس میں زہر ملا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا تیر ہے جسکو کمان کی ضرورت نہیں جسکو چھوڑنا نہ لینے کیلئے اپنی جگہ سے متحرک ہوجاتا ہے۔ خدایا تو میری مدد کر اور مجھکو اس حسین عذاب کی گرفت سے محفوظ رکھ۔ مرحوم آقا تم کو کہاں پاؤں کاش تم اپنی روح کو اس ناگن کی سرکوبی کیلئے بھیجدو افسوس محمود تو آج کسی قابل نہیں۔ بیگم مجھکو موت کا فرشتہ کیوں بھولے ہوئے ہے غیرت الٰہی مجھکو خاک کا رزق کیوں نہیں کردیتی آہ غفور الرحیم تو میرے گناہوں کو معاف کر میرا اسقدر سخت امتحان نہ لے شیطان کو مجھپر قدرت نہ دے اپنی برکت مجھپر نازل فرما۔

قمری (۹)

شمشاد مسلسل دو ہفتہ صاحب فراش رہا حکیموں اور ڈاکٹروں نے خوب تختہ مشق بنایا خوف خدا کر کے ہر وقت کا دورہ موقوف ہوا تو ضعف بیحد بڑھا ہوا ہے۔ ہوئی دن سے قدم چلنے کی طاقت آئی۔ تکیہ پر سہارا کر کے دو چار گھنٹہ بیٹھ جانا ممکن ہوگیا چہرہ پر دو چار خون کی بوندیں جھلکنے لگیں اور شمشاد کو یقین ہے کہ میرا مستقبل کیا ہونا چاہئے اور قمری نے جو شطرنج بچھا رکھی ہے اوسپر جلد جلد مہرے تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ شمشاد بالکل بے پناہ ہے قمری کیطرف سے ہر چال پر ایک کشت پڑتی ہے اور مہرہ پٹ جاتا ہے شمشاد کیلئے صرف دو ہی گھر باقی ہیں یا تو وہ قطع تعلق کی چال سے موجودہ بساط اور بازی کو اپنے مقابلہ پر برہم کر دے جسکے لئے وہ تیار نہیں معلوم ہوتا۔ یا پھر دوسرا گھر یہ ہے کہ بازی کو صبح ہونے سے پہلے اور قمری اس فکر میں ہے کہ بیں مات کر جاوے۔ بلا شک شمشاد اپنے حریف مقابل کے مقابلہ میں کمزور ہے ہمدردی تیمارداری اور مخلصانہ استفادت رنگیں نے شمشاد کو اور بھی کمزور کردیا ہے

ایک شب

ماما وغیرہ کو کسی نہ کسی بہانہ سے ٹال دی گئیں جو تخلیہ مناسب تھا اوسکا انتظام حسن تدبیر کیساتھ کر لیا گیا گو اس سے شمشاد بیخبر تھا مگر باخبر خبردار رات کے سناٹے نے دونو کے خیالات میں اپنے اپنے ماحول کیلئے کچھ ایسے اضطرابات پیدا کرنے تھے کہ ہر ایک خود الجھن میں تھا یکایک پیروں کی چاپ

جتلایا کہ کوئی اوپر سے آرہا ہے۔

قمری (لالٹین ہاتھ میں، ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) کیا سو رہے ہو

شمشاد۔ (خیر مقدم کیلئے چارپائی سے اوٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) جی ہاں کچھ غنودگی پیدا ہو گئی تھی

قمری (مسرت کے لہجہ میں) اب طبیعت کیسی ہے

شمشاد (اعتراف احسان اور تشکر کے لہجہ میں) الحمدللہ کہ آپ کی پرورش نے پھر مجھکو آپکی خدمت کے لائق کر دیا۔ سرکار نے ناوقت کیسی تکلیف فرمائی۔ کوئی کام تھا تو دایہ کو کیوں نہ یاد فرمایا۔

قمری (برابر جو آرام کرسی پڑی ہوئی تھی اوس پر بیٹھکر) تمہیں دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔

شمشاد۔ شرمندگی سے خاموش ہو جاتا ہے اور اس خیال سے کہ پھر وہی بات سامنے آنیوالی ہے گھبرا جاتا ہے۔

قمری۔ دیکھو شمشاد تم خود سوچو اور سمجھو میں، سمجھتی نہیں ہوں میری فطرت اسقدر زیر پردہ ہیں بظاہر ہے میں عورت ہوں اور عورت اپنی فطرت کے لحاظ سے یکسر خاموشی ہے لیکن کیلئے ہمالیہ کا کوہ وقار سکوت سیلاب گرفتہ سے پارہ پارہ ہوتے نہیں دیکھا فی الجملہ میں بھی ایک سکوت ہوں لیکن حادثات نے جو میرے لائے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ قدرت کے ڈالے ہوئے ہیں مجھکو فی الجملہ گویا ہونے پر اسطریق سے مجبور کر دیا ہے جسطرح ہمالیہ کے سکوت کو سیلاب تند پاش پاش کر دیتی ہے۔ اچھا تم صداقت کیساتھ اپنے دل پر ہاتھ رکھکر اپنے ماحول و مستقبل سے پوچھکر مجھے اجازت دے سکتے ہو یا اسکو پسند کرتے ہو کہ میرے قضایا کا آخری فیصلہ میرے کی وہ کنجی کرے جسکو آخر الامر اسی خدمت کی انجام دہی کیلئے اپنی ایک انگشتری سے مستعار لے رکھا ہے۔ اگر تم اسے مناسب سمجھتے ہو اور میری قسمت کا آخری فیصلہ یہی منتہی تو تم بہت شوق سے رکت کیساتھ سو ورنہ مجھکو بتلا دو کہ میں اپنے فطری جذبات کو کہاں لیجاؤں کہ یہ معطل ہو کر رہ جائیں۔ کیا تم اسکا یقین رکھتے ہو کہ میری قضا جدید اسباب سے بہتر ہو سکتی ہے کیا میری دادہال اور ننھیال دونو مجھکو اجازت دے سکتے ہیں کہ میں اپنے ماحول کو ایک و معروف تاریخ ازلی سے معمور کر لوں کیا میرے گھر کے اقتصادی حالات اور منزلی مصالح اسکو مقتضی ہیں کیا محمود کا مستقبل اسکا متقاضی ہے کہ میں عقد ثانی کیطرف قدم بڑہانے کی کوشش کروں یقیناً تم ان سب باتوں کا جواب نفی میں دو گے خدا کیلئے پھر بتلاؤ کہ میں ہیچ کسی طرح اپنے جسم سے روح کو نکالکر پھینک دوں کیونکہ میں اسی ساحل کی تلاش کو ہوں جو صدف تشنہ لب ابر نیساں کی منتظر ہے یہ اور منو

قیمت قسم اول للعہ قسم دوم عاصہ سالانہ
نسائی
دہلی
سیاست کی چاشنی حقوق نسواں کی حمایت مشاہیر کے کارنامے تحریکات ہند کی
تاریخیں واقعات عالم واقعات ہند یہ سب باتیں آپ کو اس اخبار میں ملیں گی۔
تعلیم نسواں کے حامی خواتین کو بلند مرتبہ پر دیکھنے والے اسکی سرپرستی کریں
نسائی کیا ہے؟ اس کا جواب آپکو اخبارات اس طرح دیتے ہیں:۔
روزانہ کانگریس دہلی۔ اس کے تین پرچے ہماری نظر سے گذرے ہیں جو ہر لحاظ سے قابل قدر
ہیں۔ زبان اور ترتیب کے لحاظ سے نسائی ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ خواتین کو ایسے اخبار کی سخت
ضرورت تھی۔ نسائی عورتوں کی وسعت معلومات کے لئے بہترین اخبار ہے؟
حقیقت لکھنؤ۔ اخبار کی زبان صاف اور سلیس ہے ہر پرچہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ
معاملات ملکی خاصکر ہندوستان کے رہنماؤں کے حالات اور واقعات روزمرہ کی زبان میں عورتوں کے ذہن نشین
کئے جائیں اور ان میں اخبار بینی کا مذاق پیدا کیا جائے۔ کوشش ہر طرح قابل تحسین ہے۔
البرید کانپور۔ صرف ایک ہی نمبر دیکھکر یہ رائے قایم کرنی پڑتی ہے کہ اخبار اپنے مقصد مستورات کو سیاست سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہوگا
اسوۂ حسنہ بلیہ۔ جس مقصد کو پیش نظر رکھکر نسائی نکالا گیا ہے اس کے لحاظ سے پہلا پرچہ قابلیت سے
مرتب ہوا ہے دیگر اخبارات نے بھی حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں مگر طوالت کے خیال سے انہیں نظر انداز کرتے ہیں
پتہ:۔ دفتر نسائی ٹیا محل دہلی۔

جلد ۱۸ — مئی و جون ۱۹۳۲ء — نمبر ۵ و ۶

تمدن دہلی

علمی، ادبی، معاشرتی، اخلاقی، فلسفی مضامین کا [illegible]

فہرست مضامین

ضروری گذارش

ناظرین تمدن سے اسوقت یہ گذارش ضروری ہے کہ وہ تمدن کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں۔ سلسلہ طباعت کی گرانی نے ضخامت کی جو کچھ حالت کردی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے متاثر ہو کر اکثر رسالوں نے اپنی قیمت بڑھا دی ہے بہت سوں نے کاغذ فنڈ قایم کردیا ہے۔ صرف رسالوں پر ہی موقوف نہیں ہے بڑے بڑے کتب فروش کارخانوں تک نے کتابوں کی قیمتیں بڑھا دی ہیں۔ مگر میں نے اس وقت تک کسی قسم کے اضافہ کی درخواست نہیں کی ہے۔ شاید مجھے یہ استدعا کرنے کا حق حاصل ہے کہ ناظرین تمدن سے تمدن کی توسیع اشاعت کی استدعا کروں۔ کیونکہ تمدن کی ظاہری اور معنوی خوبیوں میں اضافہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تمدن کی اشاعت زیادہ ہو۔ مجھے اب بھی اس حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ تمدن کسی مالی فائدہ کی بنا پر نہیں چلایا جا رہا ہے بلکہ ادبی ذوق رکھنے والے احباب کا اصرار اسکے جاری رکھنے پر ہمیشہ مجبور کرتا رہا۔ اور خود میرا دل بھی نہیں چاہتا کہ خدانخواستہ اسے بند کرنا پڑے۔ اس لئے میں نے کافی مالی قربانی کے باوجود جاری رکھا۔ اور انشاء اللہ جاری رکھونگا۔ تمدن کی میں پوری خدمت نہیں کر سکا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ میں کسی نہ کسی اخبار سے تعلق رکھنے پر مجبور ہوں اسکا سبب تمدن کی قلت اشاعت ہی ہے جس طرح میرا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ تمدن بند ہو۔ اسی طرح ایک منٹ کے لئے بھی میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تمدن کی ظاہری اور معنوی حیثیت یہی رہے۔ جو اس وقت ہے۔ بس تمدن میری پوری توجہ اسی وقت جذب کر سکتا ہے کہ آپ مجھے اسکی خوبیوں میں اضافہ کرنیکے قابل بنا دیں میری جیب میں جو چند سکے تھے وہ تمدن کی نذر کر چکا اور اب بھی میں کچھ نہ کچھ تمدن کی نذر کرتا ہوں دل سے جاری رکھنے پر آمادہ ہوں لیکن اگر احباب کا تغافل اسی طرح جاری رہا تو شاید تمدن اس سے بہتر نہ ہو سکیگا جس وجہ سے روزنامہ فتح کی ادارت سے مجھے قطع تعلق کرنا پڑا اسوقت سے احباب کا اصرار ہے کہ تمدن کو بہتر بناؤں۔ میں خود دل سے اس کا خواہشمند ہوں لیکن یہ کام میرے اکیلے کا نہیں ہے۔ آپ میرا ہاتھ بٹانے میں حاضر ہوں اور اسکی صرف یہ صورت ہے کہ ہر خریدار تمدن توسیع اشاعت اپنے اوپر فرض سمجھے اور جلد سے جلد کم از کم ایک خریدار عنایت کرے امید ہے کہ یہ استدعا رائیگاں نہ جائیگی۔

خادم محمد عباس حسین قاری

تمدن دہلی

حصہ مضامین نثر مفید خاص و عام

خربوزہ کو خربوزہ دیکھ کر رنگ بدلتا ہے

نباتات میں بھی جان اور زندگی ہے تو لازمی ہے کہ نباتات میں ایک قسم کی
حس بھی ہو یا یوں کہیے کہ حس ہی ایک قسم کی زندگی ہی ہے۔ اگر انسان صحبت سے متاثر
ہوتا ہے تو اس کہاوت کا یہ سبب نہ ہو کہ نباتات بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوتی
ہیں۔ یا ایک دوسرے پر اثر ہوتا ہے۔ ماہرین نباتات ثابت کرتے ہیں کہ نباتات میں
بھی مذکر و مؤنث ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرابت سے پھل لاتے ہیں۔
جیسے کھجور کا درخت نر بھی ہوتا ہے اور مونث بھی۔ مونث کھجور کا درخت اس صورت میں ثمر دار ہوتا ہے کہ جب
کھجور نر کے مواد تولیدی سے متاثر ہو جب تک یہ نہ ہو تب تک پھل دے بھی نہیں سکتی۔
اسی طرح نباتات میں مذکر مادہ بھی ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ بارآور ہوتی ہے۔ اس
طرح نباتات میں ایک قسم کی حس بھی ہے کسی پھل پر دور سے کچھ دفعہ ہاتھ رکھ کر دیکھو
تو وہ رفتہ رفتہ کملاتا جائے گا۔ لاجونتی تو سایہ انسان سے ذرا ہی کملا جاتی ہے۔
اس قسم کی اور بھی نظیریں دی جا سکتی ہیں۔ جو زراعت سایہ درخت کے نیچے ہوتی

ہے وہ کچھ بہت نشو ونما نہیں پاتی اس سے ثابت ہے کہ نباتات دیگر اشیا سے متاثر ہوتی ہیں اور سیدھی بات تو یہ ہے کہ جب نباتات آب و ہوا سے متاثر ہیں اور ان ہی کی وجہ سے نشو ونما بھی پاتی ہیں تو پھر کیوں نہ یہ کہا جائے کہ انہیں بھی زندگی ہے۔ اور وہ بھی ایک قسم کی حس رکھتی ہیں۔

اگر ان باتوں پر یقین کیا جائے۔ اور کیوں نہ کیا جائے تو پھر کہاوت مندرجہ عنوان کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں یہ کہاوت محض قیاسی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں صداقت بھی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب خربوزے پکنے شروع ہوتے ہیں تو ساتھ کے ساتھ ہی ان کی رنگت بھی بدلتی جاتی ہے۔ اور ایسا بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک خربوزہ دوسرے خربوزہ کو گویا دیکھ کر رنگ بدلتا ہے۔ ہر پھل میں ایک قسم کی خوشبو ہوتی ہے۔ وہ خوشبو اس پھل میں زیادہ تر محسوس ہوتی ہے جو پہلے پکنا شروع ہوتا ہے۔ ہوا کے ذریعے اس کی خوشبو دوسرے پھلوں میں بھی رفتہ رفتہ سرایت کر جاتی ہے۔ مثلاً ایک خربوزہ جب پکتا ہے۔ تو اس کی خوشبو ہوا کے ذریعے دوسرے خربوزوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اور چونکہ ان میں بھی ایسا مواد ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ بھی ایک خارجی اثر سے متاثر ہو کر رنگت بدلتے ہیں۔ خیر اس کو تو کوئی ماہر نباتات ہی زیادہ تر وضاحت سے ثابت کر سکتا ہے جس نے یہ کہاوت کہی ہے وہ خربوزہ کی اس کیفیت سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ صحبت کہاں تک موثر ہوتی ہے۔ اور کہاں تک دوسرے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کہاوت میں یہ ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی صحبت خاموشی کے ساتھ بھی متاثر ہوتی ہے۔ لوگ جانتے بھی نہیں کہ ان کے دل و دماغ پر کوئی صحبت یا بعض افعال رفتہ رفتہ اثر ڈال رہے ہیں عموماً لوگ بری صحبتوں سے بچتے ہیں۔ میری رائے میں اس معنی خیز کہاوت کے پڑھنے یا سننے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ خاموش صحبت بعض اوقات دیگر صحبتوں سے زیادہ تر خوفناک ہوتی ہیں۔ ایک شخص جانتا ہی نہیں کہ کونسا زہر اسے پلایا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس کا پتا نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی ظاہری علامت ہوتی ہے۔ نادانستگی میں ہی ایسا شخص زہر کا شکار ہوتا ہے۔ خاموش صحبتیں کونسی ہیں۔ وہ جو ظاہر میں

کوئی خصوصیت نہ رکھتی ہوں۔ ایک طوائف یا کسی بازاری عورت کا گھروں میں آنا ایسا
مضر نہیں جتنا ان عورات کا جو دن بھر بازار میں رہتی ہیں لیکن اندر آنے میں ان کے
اخلاق اور ان کا رویہ ان سے بھی زیادہ تر خطرناک ہے۔ بازاری عورت اول تو خود ہی
مجتنب رہتی ہے کیونکہ وہ ایک قسم کی بری شہرت رکھتی ہے اور پہلے ہی سے زیر
نظر ہوتی ہے لیکن دوسری قسم کی عورتیں بظاہر کم بدنام ہوتی ہیں۔ مگر اندر آنے میں
زہر ہلاہل ہوتی ہیں۔

ایک شخص ایک مجلس میں جاتا ہے۔ وہاں بظاہر کوئی بداخلاقی نہیں سکھائی جاتی
لیکن باتوں باتوں میں عملی رنگ میں برے نمونے دکھائے جاتے ہیں کبھی کبھی ان کی
مذمت بھی کی جاتی ہے۔ مگر محض نمائشی رنگ میں۔ ایک سادہ دل آدمی چند لوگوں کو
دیکھ کر متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر پھر ایسی باتیں طبیعت میں گھر کر جاتی ہیں جس طرح
ایک خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ خربوزہ دوسرے خربوزوں کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا
صرف ہوائی تاثیرات ہی سے متاثر ہو کر رنگ بدل لیتا ہے اس طرح خاموش صحبتیں
بھی چپکے چپکے ہی موثر ہوتی ہیں۔

اس کہاوت کا محل اخلاق بھی عموماً ایسے ہی واقعات اور تاثرات کی حالت میں
ہوتا ہے جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو فلاں آدمی کیسا صاف اور سادہ مزاج تھا
اب تو ان میں رہ سہہ کر کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ لوگوں کی باتوں باتوں میں کہہ رہتا ہے
"سنا نہیں کہ خربوزہ خربوزہ کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ یا خربوزہ خربوزہ
سے رنگ پکڑتا ہے۔"

• اب پوچھو کہ اس کہاوت میں "دیکھ کر" کا فقرہ کیوں لایا گیا۔ کیا سچ مچ خربوزہ
بھی دیکھتا ہے۔ اگر یہ کہاوت فی الواقعہ یوں ہی ہے تو اس کا وہ مطلب یہ نہیں کہ خربوزہ
خربوزہ کی قربت سے متاثر ہو کر رنگ بدلتا ہے۔ یہاں دیکھنے سے مراد قربت یا الحاق
ہے نہ کہ سچ مچ دیکھنا ہی۔

بعض دفعہ آنکھ اور دیکھنے سے وہ معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ جو رتی بھر چسپاں نہیں

ہوتے بلکہ ایک حد تک مرادی ہوتے ہیں جیسے

(۱) آنکھ پھیر لینا۔ خفا ہو جانا۔

(۲) آنکھ چار کرنا۔ مقابلہ کرنا۔

(۳) آنکھ چرا جانا۔ بے مروتی کرنا۔

(۴) آنکھ سینکنا۔ دیکھنا

(۵) آنکھ کھل جانا۔ ہوش میں آجانا۔

(۶) آنکھوں سے چلنا۔ شوق سے جانا۔

(۷) دیکھنا۔ آزمانا۔ بدلہ لینا۔ غور کرنا۔ خیال کرنا۔

ان محاورات سے دیکھو دیکھنا کن کن معانی میں استعمال پاتا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ خربوزہ خربوزہ کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے تو مطلب اس کا وہی ہوگا۔ جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کہاوت میں رنگ پکڑنا کہا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ قربت کی وجہ یا ایک ہی قسم کے تاثرات سے متاثر ہو کر رنگ قبول کرتا ہے۔

بہر حالت اس لطف خیز کہاوت میں جیکی اور بظاہر بے ضرر صحبتوں کی مضرتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور نہ صرف بری صحبتوں ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ اس سلسلہ میں وہ اچھی صحبتیں بھی آجاتی ہیں۔ جو نمائشی نہ ہوں۔ کیونکہ ایسی خاموش نیک صحبتیں بڑے بڑے دعوے کرنے والی صحبتوں سے زیادہ تر مفید ہوتی ہیں۔

اونچی دکان پھیکا پکوان

جو صحبتیں نیکی خاموشی کے ساتھ عملی رنگ میں پھیلاتی ہیں۔ وہ بہ نسبت زود نمائی صحبتوں کے زیادہ تر مفید ہوتی ہیں۔ اچھی اور بری صحبتیں عملیات ہی سے موثر ہوتی ہیں۔ اور بمقابلہ نشست از بام صحبتوں کے خاموش صحبتیں اگرچہ بدیر موثر ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا اثر ان صورتوں میں پائیدار اور مضبوط ہوتا ہے۔ ایک خربوزہ دوسرے خربوزہ کو مخاطب نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی بار ڈالتا ہے۔ محض قربت اور ہمسایت ہی سے دوسرا خربوزہ رنگت تبدیل کر لیتا ہے۔

خاموشی اور متانت سے ہمیشہ کامرانی بالخصوص ہوتی ہے۔ گپ بازی اور طفلانہ شور و شر سے کچھ نہیں بنتا

خاموشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید

جو خاموشی سے کیا جاتا ہے اور جس کام میں حوصلہ اور استقامت کا جز مقدم ہوتا ہے۔ اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور وہی رفاقت بخش بھی ہے۔

شور و شر ہی سے بگڑتے کام ہیں
خاموشی کا کچھ ہی اور ہے !

دنیا کی مختلف صحبات کا نیک انجام شور و شر سے نہیں ہوتا۔ وہی طالب علم زیادہ تر کامیاب رہتا ہے۔ جو ایک خاموشی سے مطالب اسباق حل کرتا ہے جو طالب علم طوطے کی طرح رٹتا ہے۔ اس کا دماغ اخیر میں تنگ کر رہ جاتا ہے۔ دل میں وہی بات بیٹھتی ہے اور جوف دماغ میں وہی کہانی مرتسم ہوتی ہے۔ جو رسم خاموشی یا قانون خاموشی کے تحت ہوتی ہے۔

گو تا قیامت قیام کرنے سے ہزار داستان نہیں ہو سکتا لیکن ہزار داستان وقت پر بولنے سے ہزار داستان کہلاتا ہے۔ اگر خاموشی سے کام نکلتا ہے تو بڑبڑانے کی ضرورت کیا۔ خاموشی ایک زبردست طاقت ہے۔ زمانہ میں اس کی بدولت بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ معاویات اور معاشیات دونوں میں اس سے کام لیا جاتا رہا ہے۔

تلاش کر زمانہ کا بہ خاموشی
کہ خاموشی بھی رکھتی ایک طاقت ہے

سلطان احمد

تمدن کی توسیع اشاعت کی کوشش کیجئے۔

۸

صغیرہ کی عمر ابھی ۱۴ ہی برس کی ہوئی کہ اماں باوا کو شادی کی تلاش پڑ گئی۔ اسے کوئی برا نہیں کہتا۔ بہرحال باپ کو چاہیے کہ وہ بیٹی کے سیانے ہوتے ہی اس کی فکر کریں۔ مگر خدا کے واسطے لوگوں یہ تو بتاؤ کہ ایسی وہ کونسی بڑی عمر کی ہو گئی تھی کہ ایک بڑھا اس کے پلے باندھ دیا جائے۔ لاکھ مال والے ہیں۔ عزت والے ہیں۔ مگر دادا کے برابر عمر سے شادی کو کسے خدا نے بتائی۔ اگر پوچھو تو بات یہ تھی کہ ماں باپ بھی دولت مند تھے۔ دولت دولت ہی کا دن رات وظیفہ تھا۔ بیٹی پیاری تھی۔ بیٹیا۔ دولت کے گھر رہنے کا خیال پیارا تھا۔ سوچا یہ تھا کہ رشید اپنے خاندان ہی کا آدمی ہے۔ اگر صغیرہ کے جہیز میں مکان دیا جائیگا تو وہ بھی گھر کے گھر میں رہے گی۔ اور اگر یہ بڑھا لڑھک گیا تو جو کچھ اس کا مال و متاع ہے وہ بھی ہمارے ہاں کی دولت میں شامل ہو جائیگا۔

مکان میں آج دھوم مچ رہی ہے۔ شادی رچی ہوئی ہے۔ دروازے پر بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ دولہا آ گئے۔ دولہا میاں کو دیکھو تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ ۵۰۔۵۵ برس کے ایک بڑے میاں گھوڑے پر سے اتر رہے ہیں۔ دولہن ۱۴ برس کی عمر جوان جہان حسین و خوبصورت۔ دولہا کے ابا بھی زندہ ہیں۔ وہ نہال نہال ہیں۔ دولہا بھی باغ باغ ہیں۔ لیکن حیرت تو اس پر ہے کہ دولہن کے ماں باپ، دادا دادی نانا نانی سب کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ اللہ کے بندو خدا نے تمہیں عقل دی تھی۔ اگر غور کرتے اور سوچتے تو معلوم ہو جاتا کہ آج تمہاری خوشی کا دن نہیں ہے۔ آج تمہارے لئے ماتم کا دن ہے۔ آج تم اپنی بچی کی شادی کسی دولہا سے نہیں کر رہے بلکہ ملک الموت سے رشتہ قائم کر رہے ہو۔

شادی کا گھر ہے۔ کہنے کو چاروں طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی ہے۔ گر دولہن کو ٹٹولنے والے دلہن کے کمرے میں [illegible] گھڑی بھانے والوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اکیلا [illegible] صورت دیکھ رہے ہیں۔ گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں ضرور جانتی ہیں کہ صغیرہ کا یہ غم دوری کا غم نہیں ہے جس کے تیمار [illegible] اور جاؤ سب [illegible] اور دلہن اپنے ماں باپ کے گھر سے جدائی کا رونا رویا کرتی ہیں۔ بلکہ وہ جانتی ہیں کہ صغیرہ اس شادی سے خوش نہیں۔ صغیرہ کی آنکھوں سے آنسو دل کا تار بندھا ہوا ہے۔ وہ منگتی ہے کہ کیا کرے۔ ایک طرف زندگی کی مصیبتیں اور دوسری طرف بزرگوں کا پاس اور خیالات سے طوفان اور ہیجان کئے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی عورت اور مشرقی عورت ماں باپ کی ناک اور خاندان کی عزت کیلئے اپنی زندگی کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ اور اکثر اوقات وہ اس عزت پر [illegible] کو کبھی کو بالاد پاکر [illegible] ہے۔ کوئی اسے برا کہے یا بھلا کہے۔ مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ صغیرہ کا نقش قدم آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔ اور اس کے پاؤں کی خاک سر پر ملنے کے قابل کہ اس نے ہر بات کو سوچ کر اپنی جان پر عمر کی مصیبت لینی گوارا کی۔ مگر ماں باپ کی بات ان کی آن اور ان کی آبرو میں فرق نہ آنے دیا۔

سمندھنیں کون اپنی اپنی خالائیں ممانیاں آئیں۔ چڑھاوا چڑھا کر چلی گئیں کل صبح نکاح ہے۔ دلہن اپنے خیالات میں غلطاں پیچاں ہے دل دھڑک رہا ہے۔ آنکھوں سے خون کی ندیاں جاری ہیں۔ اس کی سہیلیاں خوش کرنے میں ناکام ہو کر سب کی سب سو رہی ہیں اب اپنے کو بالکل تنہا پاتی ہے۔ اور خوب روتی ہے۔ پھر سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر لیٹ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ جاتی ہے تو کیا دیکھتی ہے

ایک بھیانک صورت کا انسان سامنے آتا ہے۔ نہایت اچھے لباس میں ہے۔ اور جواہر کی تھیلیاں اس کے پاس ہیں انہیں صغیرہ کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ وہ نہایت اچھی

لباس میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ اپنے گھر کے دروازہ تک وہ نہایت آؤ بھگت کرتا ہے۔ دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہی اسے دوزخ نظر آجاتی ہے۔ جہاں سینکڑوں عورتیں تڑپ تڑپ کر زندگیاں گذار رہی ہیں۔ وہ شخص اسے ایک جلاد کے سپرد کر دیتا ہے جو صغیرہ کے چاروں ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر اسے تڑپنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اور صغیرہ مرنے کی دعا مانگتی ہے۔ مگر مرتی نہیں تڑپتی رہتی ہے۔

اس منظر کو دیکھ کر صغیرہ ڈر جاتی ہے اور اس کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ اتنے میں ایک فرشتہ آسمان سے اترتا ہے جہنم کی ساری آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے صغیرہ صغیرہ کل تو دلہن بنکر اس گھر سے رخصت ہو گی۔ دیکھ تو نے دیکھ لیا کہ تیرا حشر کیا ہونے والا ہے۔ تیرے ماں باپ تجھے اس جہنم میں جھونک رہے ہیں۔ وہ نمازی ہیں پرہیزگار ہیں۔ خدا پرست ہیں۔ مگر آج وہ دولت پرستی کے آگے قرآن کے حکم حدیث کی تلقین کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اب تیرے لئے دو راستہ ہیں۔ مردانہ وار اپنی زندگی کو بچا۔ یا رشتۂ جہنم کو قبول کر۔

صغیرہ کہتی ہے اے پیر مرد کٹ جائے یہ زبان جو میں اسے اپنے بزرگوں کے فیصلہ اور جل جائے یہ دل جو مجھے اپنے بزرگوں کے حکم کے خلاف کرنے پر آمادہ کرے۔ باپ کا قول اور دادا کا وعدہ صغیرہ پورا کر یگی۔ خواہ اسے انگاروں پر لٹایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ شادی شادی نہیں ہے۔ خانہ بربادی ہے۔ مگر باپ کے قول اور دادا کے قرار پر سے یہ جان قربان ہے۔

بڑے میاں میں صرف یہی وصف نہیں تھا کہ وہ بوڑھے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں یہ وصف بھی تھا کہ جورو سے دو بیویوں کے خاوند اور دو بیٹوں کے باپ تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ سانس کے مریض۔ اتفاق کی بات کہ شہر میں اسی سال سردی زیادہ پڑی بوڑھے آدمی سانس کا مرض۔ مرض طول پکڑ گیا۔ دولہا میاں کے رشتہ داروں کو دولت کا ہوکا ایک ایک اس فکر میں کہ کسی طرح یہ مرے تو روپیہ پیلے پڑے۔ کسی نے علاج معالجہ میں

بھی پوری توجہ نہ کی صغیرہ نے اپنا گہنا زیور سب کچھ ڈاکٹروں حکیموں کی نذر کیا۔ مگر بڑے میاں کی جان نہ بچی۔

آج چھ ہی دن بعد وہ ۱۴ برس کی صغیرہ چوڑیاں توڑ رہی ہے آج سرخ جوڑے کی جگہ اس کی قسمت میں رنڈسالہ لکھا ہوا ہے۔ آنکھوں نے دیکھا نہیں کانوں سے سنا ہے کہ آج دوست تو دوست دشمن تک کمبخت صغیرہ کی حالت کو دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں جوان جہاں ۱۴ برس کی عمر صورت شکل سگھڑ چتر مگر آج اس کی حالت وہ ہے کہ خدا دشمن کی بھی نہ کرے۔ آج سے صغیرہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ×

دولت کے عاشق دولت کی فکر میں رہے۔ صغیرہ کی ایک نہ چلنے دی اور بیچاری صغیرہ نہ صرف یہ کہ کچھ لے کر نہ آئی بلکہ جو کچھ لے گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھی اس گھر کی نظر ہو گیا۔

خدا کو جان دینی ہے ہم تو یہی کہینگے کہ ایسی نیک کوک کی بیٹی خدا سب کو دے۔ ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا تھا اور بیاہی کے دن رہی تھی۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ رانڈ ہو گئی۔ اب اس کو اس بزرگ کا بھی خیال آتا تھا جو اس شادی سے روکتے تھے۔ اور وہ بھی سوچتی تھی کہ ان بزرگوں کی بدولت آج یہ دن مجھے نصیب ہوا۔

زندگی موت خدا کے اختیار ہے پھر بھی آنکھوں دیکھتے مکھی کھانی حماقت ہے تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا ہوا نصیب میں جو کچھ لکھا ہے اسے بھی دیکھا ×

سسرال کی زندگی ختم ہو گئی۔ چھ ہی مہینے بعد میکے کا دور پھر شروع ہوا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر اس دوسری زندگی میں صغیرہ ہوشیاری سے کام نہ لیتی تو کبھی کی تباہ ہوجاتی۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس کا دوسرا نکاح کردو۔ مگر وہ بزرگ جنہوں نے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے ہوتے تیسری غرض چار چار شادیاں کیں۔ اس کا منہ نوچنے کو موجود جو

ہوئی کہ میرے بچے کو بھی یہاں کوئی رکھ سکے گا۔ مگر اب کیا امید۔ خیر بچے کو بلایا پیار کیا اور یہ کہکر کہ تجھے خدا کے سپرد کیا۔ اسے علیحدہ کر دیا۔ رونے کا دم نہیں آنکھوں میں آنسو نہیں گھر کے ایک ایک چھوٹے بڑے سے رخصت ہوئی۔ اتنے میں ایک ہچکی آئی اور ختم ہو گئی۔

آج صغرا کو مرے ہوئے بیس دن بھی نہیں ہوئے کہ اس کا بچہ لوگوں کی جوتیوں میں رہنے لگا۔ گھر کے سب بچے اس کے مارنے کو موجود اور ان کی اٹھل کرنے کا وہ ذمہ دار۔ سب بچے باہر کھیل رہے ہیں۔ صغرا کے بچے سے گیند نالی میں جا پڑی سب بچے اس پر پل پڑے ایک نے دھکا دیا کہ اس کا منہ دروازے کی چوکھٹ پر پڑا۔ خون کی للی چھوٹی۔ نوکر اندر سے نکل بچے کو اندر لے گئی۔ نانی نے منہ وغیرہ دھلایا۔ سب بچے جب کھیل کر گھر میں آئے بچے کے نانا بھی آ گئے۔ اس وقت مقدمہ پیش ہوا۔ بچوں نے کہا گیند ہماری تھی۔ ہمارے ماموں کی تھی۔ یہ کیوں کھیلا۔ اس وقت نانا نے بھی یہی کہا کہ ہاں بھئی ان کی مرضی کے بغیر کیوں کھیلا تھا بچہ ۵ برس کا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ رات کو اس نے خواب میں اماں کو دیکھا اور اس سے کہا کہ مجھے بھی وہیں بلا لو۔ اماں نے اطمینان دلایا۔ صبح دیکھیں تو بچہ مرا پڑا ہے۔ اور قریب ہی ایک سانپ کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے

آج ایک ماہ کے اندر اسی گھر سے دو معصوم جنازے نکل چکے ہیں۔ مگر گھر میں سے کوئی شخص رنجیدہ نظر نہیں آتا۔

سارا گھر بیٹھا ہوا ہے اور مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

باہر کے دروازہ کی چٹخنی اپنے آپ کھل گئی اور ایک کفن پوش شخص اندر داخل ہوا۔ سب کے سب ڈر گئے۔ اس نے صغرا کے باپ ماں دادی دادا کو مخاطب کر کے کہا۔ صغرا اور اس کے بچہ کا خون تم لوگوں کی گردن پر ہے۔ صغرا خدا سے تمہاری بخشش کیلئے گڑگڑا رہی ہے مگر خدا کا آخری فیصلہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے یہ گناہ اسقدر بڑا کیا ہے کہ انکی بخشش ناممکن معافی کے مستحق نہیں ہیں دوزخ کی بدترین سزا انہیں دیجائیگی۔ صرف یہ الفاظ کہکر کفن پوش روح رخصت ہو گئی۔

اطہر لکھنوی

او دیکھنے والے

(اک پکھباز حسین دوشیزہ کے خیالات)

دیکھ، او دیکھنے والے! تُو مجھے دیکھ، مگر صرف دیکھ۔ ہاں مجھے دیکھ لیکن چشم باطن سے دیکھ، دل کی آنکھ کھول کر دیکھ۔ مجھے دیکھ مگر اپنے دل میں کوئی حسرت، کوئی ارمان، کوئی آرزو، اور کوئی تمنا پیدا نہ کر۔

میرے لمبے اور سیاہ بالوں کو دیکھ، ان کی عنبر بیز خوشبو کو سونگھ جسے نسیم سحر نے منتشر کر رکھا ہے، سُونگھ، پھر سونگھ اور مست ہو جا، سونگھ اور بیخود ہو جا۔ مگر ان کو اپنے حسرت زدہ ہاتھوں میں لینے کی آرزو نہ کر، کیوں یہ آرزو ان کی رعنائی کو پریشان کرنے والی ہے

میری روشن اور صاف جبیں کو دیکھ، افشاں چنی ہوئی جبیں کو دیکھ، اسے کہکشاں سے، حالانکہ اس کا اور اس کا مقابلہ نہیں، نسبت دے۔ مگر اسے چومنے کی تمنا نہ رکھ، کیونکہ یہ تمنا اس کی زیبائی کی دشمن ہے۔

میری ابروئے خمدار کو دیکھ، تیز خنجر سے تشبیہ دے، ہلال عید سے نسبت دے، لیکن اپنے اوپر اس کے وار چلنے کی حسرت نہ رکھ، کیونکہ یہ حسرت ایک خیال خام ہے۔

میری سیاہ اور لمبی، مست اور سحر کرنے والی آنکھوں کو دیکھ، چشم آہو سے مثال دے، نرگس شہلا سے تشبیہ دے۔ دیکھ اور دیکھ کر مست ہو جا، مبہوت بن جا اور ہوش و حواس کھو دے۔ مگر ان بغدادی ساغروں سے شراب حاصل کرنے کا ارمان نہ کر، ان سے جرعہ نوشی کی تمنا نہ کر، کیونکہ یہ ارمان اور یہ تمنا بیکار ہے۔

میری تیز، نوکدار اور سیاہ پلکوں کو دیکھ، نوک سنان سے تشبیہ دے مگر یہ امید نہ رکھ کہ یہ تیرے دل میں گھر کر لیں، کیونکہ یہ امید فضول ہے۔

میری ترچھی اور سیدھی نظروں کو دیکھ، تیر سے مثال دے، لیکن ان سے اپنی

میں بھی تیری للچائی ہوئی نظریں سمجھتی ہوں اُن کا مطلب بھی سمجھتی ہوں مگر تیری حسرتوں کی بر آئی میرے امکان سے باہر ہے

اچھا تو مجھے دیکھ، لیکن للہ کوئی اثر اپنے دل پر نہ لے کیونکہ مجھے خوف ہے کہیں یہ اثر ایک دن اپنا رنگ نہ لائے۔ اور مجھے بھی متاثر نہ بنا دے۔

دیکھ اور دیکھنے والے! تو مجھے نہ دیکھ، میرے مست شباب کو نہ دیکھ، بلکہ اُسے دیکھ، جس نے مجھے دیکھنے کے قابل بنایا اور تجھے دیکھنے کے واسطے آنکھیں دیں۔ اُسے اور صرف اُسی کو دیکھ، اگر تو دیکھ سکے، میری ہستی میں صرف اس کی صنعت کا معائنہ کر اور اس کی کاریگری پر غور کر۔ پھر تجھے خود معلوم ہو جائے گا کہ تو نے دھوکا کھایا، تیری نگاہوں نے غلطی کی اور تو جانے گا کہ حقیقت میں کون دیکھنے کے قابل ہے۔ تو مجھے بھول کر بھی نہ دیکھے گا۔ مجھ پر غلطی سے بھی تیری نگاہ نہ پڑے گی۔ یاد رکھ مجھے اس کا کچھ بھی ملال نہ ہوگا، مجھے بالکل پروانہ ہوگی۔ بلکہ میں خوش ہونگی کہ تو نے مجھے دیکھکر اُسے دیکھ لیا جس کو دیکھنا چاہیے تھا۔

ارے تم کون؟

"دیکھنے والا"

راز صدیقی چاندپوری

خیالات اکبر

مذہب کی لپیٹ پر سے دبتی نہیں ہے عقل　　بس عشق ہی مٹاتا ہے اس کی کد کو
دین خدا کے دین کا جلوہ نصیب ہو　　دل کی نگاہ پائے جو حد کے بھید کو
ہو جاؤ کھڑے کہیں جو تو موٗا　　اور بیٹھے جو رہیں فلاں تو موٗا!

الف۔ آپ کا مذہب کیا ہے؟

ب۔ جو ساری دنیا کا مذہب ہے وہ میرا مذہب ہے۔

الف۔ ساری دنیا کا کیا مذہب ہے؟

ب۔ یہ کہ ہیچ من دیگرے نیست۔

اکبر
الہ آباد

دل بیقرار

اے دل بے قرار یہ تیری آہ وزاری اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تیرا پریشان کن زار
قطار رونا بیتاب کردیتا ہے۔ میری جان تو اگر اپنی ذلت کا خیال نہیں کرتا تو خدارا میری
بھی حالت پر رحم کھا۔

دیکھ کیا اپنی فکریں کم ہیں جو تو ان کے خیال میں مجھے تڑپاتا اور اپنے آپ بھی
پریشان ہے۔ شاید تجھے یاد ہو کہ جب تجھے ان کی بھولی بھالی صورت پسند آئی اور تو ان
کی محبت میں مبتلا ہوا۔ تو تو نے مجھے مجبور کیا کہ میں تیری حالت ان سے کہدوں اور تیرا
پیغام ان تک پہنچا دوں۔ اگر وہ نہ مانیں تو شاید میں نے ہاتھ جوڑ کر تجھے بارہا سمجھایا
تھا کہ پیارے اس خیال سے باز آ اس میں بجز ذلت وخواری کچھ نہیں۔ میں نے شاید آج
تک تیری خلاف مرضی نہیں کیا لیکن اس کے کرنے میں مجھے کچھ پس وپیش ہے۔ کیونکہ جب
میں دیکھتا ہوں کہ خداوند کریم نے ہم دونوں پر کچھ ذمہ واریاں عاید کی ہیں اور ایک سیدھا
راستہ بنادیا ہے تو تو کیوں میری سہار اس راستہ سے بھٹکتا ہے اور بیکار دوسری راہ
لیتا ہے اگر تیرا محبت کرنے کو جی چاہتا ہے تو کیا ایسی بیوی جو بفضلہ تعالے کافی سے زیادہ
خوبصورت اور ساتھ ہی وفادار ہے تیری اس محبت کی مستحق نہیں ہے۔ اگر تیری ہاتھ چومنے
اور پاؤں پڑنے کو طبیعت چاہتی ہے تو تیرے ضعیف ماں باپ زندہ ہیں یہ خدمت لینے کے
وہ حقدار ہیں۔ اگر ان کے ذراسی چوٹ لگ جاتی ہے اور وہ پریشان نظر آتے ہیں تو تو بیتاب
ہو جاتا ہے اور ہمدردی ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو میری جان اچھی طرح سے سمجھ لے
کہ وہ ہزارہا مفلس یتیم اور محتاج جو یتیم خانوں اور محتاج خانوں میں بے دست و نگر پڑے
ہیں ان سے پہلے تیری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ اگر تیری خواہش ہے کہ تو ان کی پوجا
کرے اور ہر وقت ان ہی کا نام جپا کرے تو پیارے اس معبود کی عبادت کر جو انسان اور
حیوان دونوں کا پیدا کرنے والا۔ امیر اور غریب دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھنے والا سب کا

مالک ہے۔ تاکہ نجات کی کچھ امید ہو سکے۔ انہی وجوہ کی بنا پر مجھے تیری اس خدمت کے
انجام دینے سے انکار ہے۔ اور بخدا اپنے اور تیرے دونوں کے حق میں بہتر جانکر سمجھاتا ہوں
لیکن اتنے سمجھانے کا بھی تجھکو کوئی اثر نہ ہوا اور تو اپنے خیال سے باز نہ رہا۔ بلکہ برخلاف
اس کے تو نے اپنی ضد میں مجھے اس قدر پریشان اور تباہ کر دیا کہ اگر میں کھانا کھانے کی
خواہش کرتا تھا تو تو بھوکا رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ اگر میں اپنے بیوی بچوں میں خوشی سے دن
کاٹنے کو گھر میں قدم رکھتا تھا تو تو ان کے "خیال میں مجھے ایک گوشہ میں لیجاتا اور گھنٹوں
رولاتا تھا۔ قصہ مختصر تیری ان رکیک حرکتوں کی وجہ سے جب مجھ پر دنیا اندھیر ہو گئی اور
زندگی کا ایک ایک لمحہ کاٹنا دشوار ہو گیا۔ تو میں یہ خیال کر کے کہ میری بہبودی تیری بہبودی
سے وابستہ ہے اور تیری تباہی پر میری تباہی لازمی ہے بسم اللہ کر کے تیرے اس کام کو
انجام دینے پر مستعد ہوا سب سے پہلے میری آنکھوں نے پیشقدمی کی۔ اور محبت بھری نگاہوں
سے انہیں بتا دیا کہ ایک بدنصیب دل جو پہلے اسی قالب میں آرام لیا کرتا تھا اب تڑپتا
ہے۔ [illegible] کسی دلدار پر مرتا ہے اور تمہاری محبت میں مبتلا ہے لیکن اس کے جواب میں
وہ مسکرا [illegible] کرلی جس سے معلوم نہیں تو کیا مطلب سمجھا اور کچھ خوشی منائی
اتنا ہونے پر تیری خواہش کے موافق زبان نے اپنا فرض ادا کیا یعنی تیری تڑپ و پریشانی
کا نقشہ ان کے سامنے کھینچ دکھایا اور تیرا کل دکھ درد ان سے کہدیا اور یہ بھی صاف کہدیا کہ
میرا ذاتی کوئی مطلب یا خواہش ایسا کہنے میں نہیں ہے اور نہ کوئی فاسد خیال یا خود غرضی
تا ہم اس گفتگو میں پنہاں ہے۔ صرف تیری (دل) تسلی و تشفی چاہتا ہوں لیکن اس پر
کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا بلکہ تیوری پر بل آگئے۔ اور انہوں نے منہ پھیر لیا۔ گو اتنا
زبان سے ضرور کہا کہ "کوئی میں باولا ہوں جو ایسا خیال کروں گا"۔ ہاتھ پاؤں نے بھی کام
کے انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی پاؤں ان کی چوکھٹ تک لے گئے اور میں نے ہاتھ
جوڑے۔ التجا کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب بتدریج نفرت یہاں تک بڑھ
گئی ہے کہ میں ہاتھ جوڑے ہوئے ان کے سامنے کھڑا روتا ہوں اور منت سماجت عاجزی
انکساری سے جس تسلی و تشفی کا انہوں نے خود وعدہ کیا تھا اس کا ہی مطالبہ کرتا ہوں تو وہ

اس سے بھی انکار کرتے ہیں۔ اس پر میں ٹوپی ان کے پاؤں پر رکھتا ہوں تو وہ ٹوپی پاؤں سے علیحدہ کر کے چلے جاتے ہیں اور بات تک نہیں کرتے۔ میرے پیارے اس سے زیادہ اب تو کیا میری ذلت کرانی چاہتا ہے۔ میں تیرے ہاتھوں اب تنگ آگیا ہوں۔ تیری وجہ سے زندگی وبال ہوگئی ہے۔ جب تو انہیں بارہا آزما چکا ہے تو پھر تو مجھے کیوں مجبور کرتا ہے کہ میں ان کے پاس جاؤں۔ ہاتھ جوڑوں۔ پاؤں پڑوں۔ رورو گڑگڑاؤں اور ان سے ۔ ۔ ۔ ۔ مانگوں جس کا وہ خود وعدہ کرچکے ہیں۔ میری جان کیا تجھے یاد نہیں کہ قریب قریب مجلس میں ایسی ہی خدمتیں انجام دیچکا ہوں۔ لیکن تیری بدقسمتی سے ناکام پھرا۔ اب مجھے ایسا کرنے میں انکار ہے۔ اور تجھے بھی یہی سمجھاتا ہوں۔ کہ تو اس خیال کو دور کر اور سیدھے راستے سے نہ بھٹک۔ اگر وہ وعدہ کی ہوئی چیز دینے سے انکار کرتے ہیں تو تو اس کی پرواہ نہ کر کیونکہ وہ کوئی خدا تو ہیں نہیں کہ پہلے رزق دینے کا وعدہ کیا تھا اب انکار کردیا ہے۔ اور بغیر رزق کے تیری زندگی نہیں ہوسکتی اگر تو اس پر بھی اپنے خیال سے باز نہیں رہ سکتا تو میں یہ بھی ظاہر کردینے پر مجبور ہوں کہ تجھ میں ہی کمی واقع ہوئی ہے تو بے اثر ہے۔ تیری تعلیم ناکمل ہے۔ یا ان کے پہلو میں تجھ جیسا دل نہیں بلکہ مقناطیسی پتھر ہے۔ جب ہی تو روتا ہے وہ ہنستے ہیں۔ اور پرواہ نہیں کرتے۔ تو محبت کرتا ہے۔ وہ نفرت۔ تو جس کام کو کہتا ہے وہ اس کے خلاف کرتے ہیں۔ تو جس ناکامی پر رولیتا اور جان کھوئے دیتا ہے۔ اور مجھے بھی پریشان کرتا ہے لیکن اس خیال سے باز نہیں رہتا۔ اگر تجھ جیسے ہمدم ومونس سے یہی فائدہ ہے کہ زندگی وبال ہوجائے۔ کھانا پینا حرام ہوجائے۔ تو میری جان ایسے ہمدم ومونس کو سلام ہے۔ اب بھی تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں رہ سکتا تو بسم اللہ میں تیرے ساتھ کپڑے پھاڑ گھر بار چھوڑ جنگل میں چل بیٹھتا ہوں۔ لیکن جس در پر سے جھڑکیاں کھا کر نکل چکا ہوں وہاں نہ جاؤنگا۔

دل۔ میرے آقا میں نے تمہاری تقریر بغور سنی اور خوب سمجھا۔ مجھ میں عیب ضرور ہے۔ لیکن پیارے میرا جذبہ با اثر اور تعلیم مکمل ہے۔ جب تک آپ کا قدم اس کار خیر میں نہیں آیا تھا تو ہر ایک بات درست تھی۔ آپ جاتے تھے وہ آپ کی خاطر تواضع کرتے تھے

بڑی دلچسپی کے ساتھ آپ سے گفتگو کرتے تھے۔ اگر آپ رخصت چاہتے اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ تو وہ بے حجابانہ آپ کو جانے دینے سے انکار کرتے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتے تھے۔ یہ میرا ہی اثر تھا جو جان انہوں نے پہلے - - - -

دینے کا وعدہ کیا اور خود معافی مانگی۔ لیکن پیارے کیا کروں اب میں بھی صاف کہدینے پر مجبور ہوں۔ برا نہ مانئے گا کمی مجھ میں واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ میرا مسکن اس قدر بہنا واقع ہوا ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ کام بنا بنایا آپ کی نفرت آمیز صورت ان کے سامنے جا کر بگاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ جس بات کا انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اس کا بھی آپ کے ہاتھوں مجھے انکار مل گیا خیر یہ میری قسمت۔ آپ کی ڈراؤنی صورت سے انہیں خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی تیز آواز سے وہ گھبرا جاتے ہیں۔ آپ کی نہ ہٹنے والی نگاہیں انہیں شرما دیتی ہیں اور وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ بھلا پھر بتایئے کہ ان پر کونسی ایسی مجبوری عائد ہو گئی ہے کہ جو آپ جیسی شخصیت سے گفتگو کر کے اپنا وقت ضایع کریں اور آپ سے محبت کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے لیکن یہ ذلت وخواری آپ کی ہی کا نتیجہ ہے یہ میں صاف کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ آپ کی ہی نفرت آمیز صورت ہے۔ جس کی وجہ سے اس ذلت وخواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ورنہ اگر میں ہی کسی بے عیب وخوشنما پہلو میں ہوتا تو دکھا دیتا کہ ان کا پتھر دل موم ہو جاتا اور وہ ایک لمحہ کے واسطے بھی مجھ کو اپنے سے علیحدہ اور اپنے تئیں مجھ سے علیحدہ رکھنا نہ گوارا کرتے گو آپ کی ہی پیدا کی ہوئی یہ نفرت وذلت تھی۔ لیکن آپ اتنی سی ذلت میں چیخ اٹھے۔ خیر معاف کیجے۔ اتنی سی بات پر چراغ پا نہ ہو جیے آیندہ انشاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کسی ایسے ذلت آمیز کام پر نہ مجبور کروں +

اخلاق حسین قاری

"ڈانٹی"

ڈانٹی دنیا کا ایک زبردست اہل کلام اور یورپ کا ملک الشعر اگذرا ہے۔ اس کی
شہرت کی عنبر بیزیوں سے اطراف عالم کا قریب قریب ہر گوشہ بسا ہوا ہے۔
وہ ایک بڑے عالی خاندان کا ممبر تھا۔ اس کی رگوں میں وہ سکنی خون تھا جو ایک
شجاع اور دلیر قوم کی نسلی اور یورپی امتیاز کے چشمۂ صافی سے پیدا و جاری ہوا تھا
اس کے بزرگ گو بعد میں ورطۂ غربت میں پھنس گئے تھے۔ تاہم وہ ہمیشہ تجارتی
کاروبار میں انہماک لئے رہے۔ اور ادنیٰ اور ارذل کام کرنے سے احتراز برتا۔
ڈانٹی اٹلی کے شہر فلارنس میں ۱۲۶۵ء پیدا ہوا اور روم کی خاک پاک نے ایک
دن اس کے سر پر عظمت و وقار کا تاج رکھا۔
ڈانٹی زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ مگر اطالوی زبان میں اس کو وہ قدرت و کمال حاصل تھا۔
کہ جس کی نظیر کم ملتی ہے۔ اس کا مقصد خاص یہ تھا کہ اطالوی زبان کا طوطی اونچے
میناروں پر بولتا نظر آئے۔ اور اس کو عروج پر پہنچا دے۔ وہ لاطینی و یونانی زبانوں کا
بھی شاعر تھا۔ مگر اس راہ میں اس نے ٹھوکریں کھائیں۔ اور کامیاب نہ ہو سکا۔ علاوہ
شاعری کے ڈانٹی نجوم اور موسیقی سے بھی واقفیت رکھتا تھا اور ان علوم میں اچھی
دستگاہ پیدا کر لی تھی۔
اوائل شباب میں اس کی نظر ایک گل اندام حسینہ پر پڑی۔ اور وہیں ہزار جان سے
عاشق ہو کر رہ گیا۔ اس ماہ پیکر کا نام بٹریس تھا یہ ڈانٹی کی جان تھی۔
ایک ساعت بغیر اس کے دیدار کے ڈانٹی کو چین نہ تھا۔ یہ پھول تھی وہ بلبل۔ یہ
سرو تھی وہ قمری۔
صبح و شام روز و شب ڈانٹی کے سوز و گداز اور اضطراب اور بیقراری میں گذرتے
اور ہر وقت۔ بٹریس کی محبت پریشان روا رکھتی۔ ڈانٹی کی زندگی بٹریس کا میا

تھا۔ بالحقیقت بیٹرس اٹلی کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی جس سے ڈانٹی کو عشق تھا۔ آج تک اٹلی میں ڈانٹی اور بیٹرس کے حسن و عشق کی داستان بہت مشہور ہے اور ایک گلدستہ بے نظیر نظم ڈانٹی نے اپنی پرجمال معشوقہ کی تعریف و توصیف میں لکھی ہے جو اپنی جدت طراز خوبیوں کے لحاظ سے لاجواب ہے۔

۱۲۹۰ء میں بیٹرس جیسی حور لقا معشوقہ کی قیامت خیز موت نے ڈانٹی کی مسرتیں شادیں اس کے عیش کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کو رنج و الم کے بحر ظلمات میں غوطہ زن بنا کر تمام سوانح حیات میں ایک تلاطم بپا کر دیا۔

ڈانٹی کو اس درجہ رنج ہوا اور کچھ ایسا صدمہ پڑا کہ زندگی تلخ ہو کر رہ گئی۔ دیوانگی کا سا عالم رہنے لگا۔ اور ایک برس تک شدت حزن و ملال سے کچھ نہ کیا۔ دن رات آٹھوں پہر اپنی معشوقہ کی دائمی مفارقت کے آلام سہتا اور گوناگوں صدمے اٹھاتا رہا۔ ایک سال کے بعد جا کر کچھ رنج دور ہوا۔ غم سے آنکھیں کھلیں۔ اور موت کا چڑھا ہوا نشہ زمانے کی ترشی نے کچھ کچھ اتارنا شروع کیا۔

ڈانٹی ایک جری اور بہادر سپاہی بھی تھا۔ وہ متعدد جنگوں میں شریک رہا ۱۲۸۹ء کی جنگ میں بھی وہ شامل تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقعہ پر وہ عہدہ سپہ سالاری پر فائز کر دیا گیا۔ ۱۲۹۸ء میں ڈانٹی کی شادی ایک معزز و اعلیٰ خاندان میں ہو گئی جس کی وجہ سے سوسائٹی میں یکایک اس کا مرتبہ بڑھ گیا۔ اختیارات میں بھی ترقی ہو گئی اور عزت و وقعت کی نگاہیں ہر طرف سے پڑنے لگیں۔ قومی و ملکی کاموں میں برابر حصہ لیا جانے لگا۔ وجاہت و عظمت نے آ کر قدم چوم لئے۔

ڈانٹی کی نظموں میں ایک نظم انفرنو بہت مشہور و ممتاز ہے اس میں دوزخ کا خیالی نقشہ اس درجہ پُر تاثیر الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ انسان بے انتہا متاثر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نظم کی خوبی نے ڈانٹی کی شہرت کے پر لگا دیئے اور مشہور ہے کہ یہ عالم ہوا کہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں ترجمہ ہونے لگا حتیٰ کہ اردو میں بھی اس نظم کا ترجمہ موجود ہے اور ہر شخص اس کو ڈانٹی کے ساتھ پڑھتا ہے۔

شریف احمد مراد مارہروی

عدالت خداوندی

جب حرص وہوس کی پٹی آنکھوں پر بندھ جاتی ہے تو انسان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا، اور وہ اپنی تیرہ و تار زندگی کے راستہ میں ٹٹولتا ہوا چلتا ہے۔ اس کی قدا کہ قوتیں، اور خیالات و جذبات کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ اچھی خصلتیں اور نیک عادتیں بداخلاقیوں، ذمائم اور رذائل سے بدل جاتی ہیں۔ اور ہوش وحواس لالچ کی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں۔ افعال کے ارتکاب کے وقت ضمیر حسب دستور ضرور نعنت ملامت کرتا ہے مگر اس کی بھی پروا نہیں ہوتی جس کا بیّن اور نمایاں نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان نہ صرف نیکی اور بھلائی سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ بلکہ غضب یہ ہوتا ہے کہ اس میں برائی کو برا سمجھنے کی صلاحیت اور قابلیت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ مزے سے ایسی رکیک، سُبک، مذموم، مبتذل، اور قبیح حرکتیں کرتا ہے جن کو مذہب اور سوسائٹی سخت نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور زور و شور سے ممانعت کا حکم دیتے ہیں جن کی خلاف ورزی اور نافرمانی میں جہنم کی دہکتی اور بھڑکتی ہوئی آگ سے سابقہ اور معاملہ پڑنے والا ہے۔

روزانہ اخبار "اقدام" قسطنطنیہ مورخہ ۱۵ رجب ۱۳۴۸ ہجری میں ازمیر[۱] کے روزانہ اخبار خدمت کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ درج ہوا تھا۔ جو بطور خود حسرت و عبرت اور بصیرت کا ملہ۔ اور عادل حقیقی کے انصاف بے پایاں کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ جس پر غور کرنے سے انسان کے برے ارادوں، خصلتوں اور سفر ناک حوصلوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ اور آنکھوں پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ اخبار

---

[۱] عرب شہر سمرنا کو ازمیر کہتے ہیں۔ یہ شہر دردانیال کے مدخل سے کچھ فاصلے پر ایشیائی ساحل کی جانب ساحل سمندر پر واقع ہے۔ لحاظ وضع قطع و ہیئت ترکیبی اور باعتبار خوشنمائی و خوبصورتی اور تجارتی و جنگی مصلحتوں کی بنا پر یہ شہر ملک عثمانی میں دوسرے نمبر پر شمار ہوتا ہے۔ سلطنت ٹرکی میں یہی ایک عجیب مفید کارآمد اور مضبوط و مستحکم بندرگاہ ہے۔ مترجم

مذکور اس طرح رطب اللسان ہے:-

یہ نرجانی چھانی، اور مانی ہوئی بات ہے کہ جب کبھی کسی جگہ کوئی طوفان آتا ہے یا طغیانی ہوتی ہے تو "نزلہ بر عضو ضعیف ریزد" کے مصداق سارا ادبار انہیں بیچارے غریبوں مسکینوں کی جان و مال پر ٹوٹتا ہے جو مفلس قلاش اور نان شبینہ کو محتاج ہوتے ہیں۔ اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں اپنی مصیبت ناک زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی تھوڑے دن ہوئے جو زبردست طوفان اور عظیم الشان طلاطم آیا تھا۔ اس میں بارش کی کثرت سے اکثر نشیبی مقامات میں زیادہ تر نقصان پہنچا۔ شہر ازمیر کے محلہ بالاگی میں ایک غریب کا گھر بھی منعدم اور منہدم ہونے کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ اس انتہائی پریشانی میں بیچارے نے ایک ایسے شخص سے مشورہ لیا جسے وہ دوست سمجھتا تھا۔ کہ اب کیا کیا جائے۔ کوئی تدبیر بتایئے۔ روپیہ ہے نہیں جس سے مکان کی درستی مرمت اور سال سنبھال کیجائے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ضرور ہم لوگوں پر کسی نہ کسی وقت یہ گھر گر پڑیگا اور ہم دب کر مر جائینگے پریشان ہوں کیا کروں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس شخص کو مصنوعی اور نمائشی خیرخواہی جتانے کا اس سے بڑھکر اور کونسا سنہری موقعہ مل سکتا تھا۔ اُسنے سوچ ساچ کر صلاح دی کہ تمہارا جو چھوٹا باغچہ ہے اُسے بیچ ڈالو۔ اور اس روپے سے مکان درست کرالو۔ گھر باغچہ سے ہر حال میں ضروری ہے اور اس نازک اور سخت موقعہ پر تو باغچہ سے تمہیں ذرا سی بھی منفعت اور آرام و آسائش نہیں۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں سادہ لوح مصیبت زدہ نے دوست کی اس معقول رائے کو انسانی ہمدردی پر مشتمل سمجھکر منظور کر لیا۔ اور تیس لیرا[1] میں اپنے باغچہ کو بیچدیا۔ اس نوبت پر دوست نما دشمن نے پھر یہ رائے دی کہ سونے یعنی نقد روپیہ کے دشمن بہت ہوتے ہیں۔ اس لئے حفاظت کا معقول بندوبست کیا جائے۔ میری رائے میں مناسب طریقہ یہ ہے کہ اپنے سرہانے تھوڑی کو زمین میں گاڑ دو۔ اور ہوشیار سویا کرو۔ صندوق یا کسی دوسری چیز میں رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ سیدھے سادھے راستباز شخص نے اسے بھی منظور کر لیا۔ اور اسکے کہنے کی تعمیل کی۔

---

[1] لیرا ترکی پونڈ گنی کو کہتے ہیں جو ہمارے سکہ کلدار کے برابر ہوتا ہے اور اسکو مجیدی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سلطان عبدالمجید خان مرحوم کے زمانہ میں رائج ہوا ہے۔ مترجم

اس بزدل نامرد مردود نے اپنے مصیبت زدہ دوست کے اس روپیہ پر جو کوڑیوں کے مول مجبوراً ضروری جائداد بیچکر حاصل کیا گیا تھا ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ اور تہیہ پختہ کر لیا تھا اور یہ تدبیر و ترکیب سوچی تھی کہ رات کو جب میاں بیوی بیخبر سو جائیں تو اپنی بیوی کے ذریعہ ان کے ننھے بچے کو گھر سے باہر بھیجدے اور جب دونوں اپنے نور البصر لخت جگر کے رونے چلانے سے جاگ اٹھیں، اور گھر میں نہ پاکر باہر ڈھونڈھنے کو جائیں تو اس موقعہ کو غنیمت سمجھکر فائدہ اٹھائے اور سرہانے زمین میں گڑے ہوئے روپیہ کو کھود کر نکال لے۔ اور بھاگ جائے۔ - - اور ایسا ہی کیا گیا۔ - - مگر اب عادل مطلق کی عدالت کو دیکھئے کہ وہ کیا انصاف کرتا ہے جب اس نامعقول کی بدکار بیوی بچے کو لیکر بھاگی تو بچہ اسکی گود میں چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ تو اسنے مارے دہشت کے مکان سے کچھ فاصلہ پر بچہ کو زمین پر بٹھا دیا۔ اور خود بھاگ گئی اس عرصہ میں ماں باپ بیدار ہو گئے۔ اور بچے کو بستر پر نہ پاکر مکان سے باہر تلاش و جستجو کرنے کو بے ساختہ بھپٹے جب مکان خالی ہو گیا تو اس نالائق نے پھرتی سے روپیہ نکال لیا۔ اور بھاگنے کا قصد کر ہی رہا تھا کہ اڑاڑا کر تمام مکان اس خبیث پر گر پڑا۔ اور مکان کے نابود ہونے کے ساتھ ہی اسکا وجود مٹی اینٹ کنکر پتھر کے ڈھیر میں اس طرح غائب ہو گیا جیسے دھواں ہوا میں جذب یا قطرہ دریا میں فنا ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی جب بچہ کو لیکر واپس آئے تو عجیب بھیانک اور برباد منظر نظر آیا۔ مگر مکان کی قلب نوعیت اور مٹی کے ڈھیر کی صورت میں تبدیل ہونے پر ذرا سا بھی رنج و افسوس اور استعجاب نہیں ہوا بلکہ دونوں تہہ دل سے خضوع و خشوع کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کرنے لگے۔ انہیں خیال ہوا کہ ضرور وہ کوئی فرشتۂ رحمت ہوگا جو بچہ کو لے بھاگا اور مشیت ایزدی کا منشا تھا کہ اس ترکیب سے ہم تینوں نفوس مکان سے باہر ہو جائیں اور ہلاکت و بربادی سے محفوظ رہیں صبح مزدوروں کو اینٹ مٹی کنکر پتھر الگ کرنیکے کام پر لگایا گیا تاکہ روپیہ نکالکر مکان بنوانے میں صرف کریں معماروں نے جب ملبہ الگ کر دیا تو دیکھا کہ اس چور کا ہاتھ مٹی میں سے دکھائی دیا۔ اب تو سب چکرائے کہ کیا معاملہ ہے اور جلد جلد مٹی کو اوپر سے دور کرنے لگے جب اس تباہ روزگار کے چہرہ سے خاک دور کی گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ روپیہ کے توڑہ کو مٹھی میں مضبوط پکڑے ہوئے اور اس فضاحت آمیز حال میں دم توڑ رہا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

محمد اسمعیل ہاتف بھوپال

اشکِ حسرت

دنیا میں سکوتِ نیم شبی طاری تھا۔ اور نورانی شب ماہتاب کی اس گھڑی جب روشنی کی سیماب آسا لہریں بیتابی کے ساتھ بسیط فضائے آسمانی میں چاند کی کرنوں سے کھیل رہی تھیں مجھے بھی اپنے لہو و لعب کا زمانہ مسرت و شادمانی یاد آگیا۔ لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے، زمانہ میری ہٹوں کو پورا کرتا تھا۔ میں اپنی معمولی سے معمولی چیز کے اتفاقیہ خراب ہو جانے پر آفت مچا دیتا تھا، شاہوں کا عزل و نصب میرا کھیل تھا۔ میں لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتا تھا۔ لکڑی کے گھوڑے کو سرپٹ بھگانا میرا ادنیٰ کرشمہ تھا ہاں میں مجسم شادمانی تھا۔ آہ! اب نہ وہ دن ہیں نہ وہ راتیں، نہ وہ کھیل ہیں، نہ وہ تماشے، میری شاہنشاہی ختم ہوگئی، میرے لبوں کا تبسم غائب ہوگیا۔ اب سینہ چاک ہے، غم دل کی بھر مار ہے، آہ و زاری اپنا کام ہے، کبھی کھانے کا فکر کبھی گھر آجڑنے کا ماتم۔ اب دوسروں کو مسرور و شادکام دیکھنے سے بھی رشک ہوتا ہے۔ ہائے! ع

وہ زمانہ کیا ہوا جب میرے گریہ میں اثر تھا
یہی چشم خوں فشاں تھی، یہی دل یہی جگر تھا

اے غفور الرحیم میں تیرا گنہگار بندہ، اے ارحم الراحمین میں بدکردار ہوں جانتا ہوں کہ میری یہ گت میرے ہی اعمال نے بنائی لیکن اے خدائے پاک تو بھی آمرزگار ہے۔ بے کسوں! بے پرسوں کا ماواں اے مسکین و مسافر نواز یہ بے رخی نا بجے۔ ۔ ۔ نواز اپنے مسکین و بے چارہ بندہ کو نواز۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

جذبات کا غلبہ ہوا اور آنکھوں سے چند صدف ناسفتہ میرے دامن پر گر کر غائب ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو اس جگہ لکھا تھا

"اشکِ حسرت"

شبیر مارہروی

ایک پر ارمان مگر حرماں نصیب دل کا آخری ارمان

آ۔ آ۔ اے موت آ۔ غمزدوں کی غمساز آ۔ بیمار عشق کی مسیحا آ۔ فرقت کی گھڑیاں گننے والے کے لئے آرام کا پالن آ۔ آ۔ جلد آ۔ اور ایک حرمان نصیب کو اپنے آغوش میں لے۔

اس کی امیدیں خاک ہو گئیں۔ اس کی آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ آ۔ اور اس کو تسلی دے۔

موت! موت! ہائے کیا پیارا نام ہے۔ بس ایک تو ہی ہے جو مجھ کو میری مصیبتوں سے آزاد کر سکتی ہے۔ آہ میں اب تیری آرزو میں جیتا ہوں۔

تیرے انتظار میں میری آنسو بھری آنکھیں دروازہ پر سے ہٹتی ہی نہیں۔ گو تیرے نازک پاؤں کی چاپ نہیں ہوتی۔ تاہم میرے مضمحل کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔

اے موت۔ اے میری درماں تو وہ ہے جس کے نام سے بڑے بڑے نامور شہنشاہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے جری۔ دلیر۔ سورما تیرے آگے ہتیار ڈال دیتے ہیں۔

عاشق مزاجوں کے دلوں کو نوک مژگان سے گدگدانے والے تیرے سامنے زرد پڑ جاتے ہیں

ہاں

ایک نہیں ڈرتے تو ہجراں نصیب۔ آرزوں سے پُر مگر حسرت نصیب ان کو تجھ سے

الفت ہے۔ تیرے انتظار میں گھڑیاں گننے میں اور بیقرار رہتے ہیں۔

مگر

وائے قسمت وائے نصیب۔ تو بھی ان سے موتھ چراتی ہے اور دور رہنا ہی گتی ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

موت موت اپنی ہستی کو جان۔ اپنی طاقت کو پہچان۔ موتھ مت پھیر بلکہ مدد کر تو وہ ہے جو کافر سے خدا کی وحدانیت کا اقرار کروالیتی ہے۔ تو وہ ہے جس کے خوف سے دنیا کے بڑے بڑے سرکش وجود باری کا اقبال کرتے ہیں۔

ہاں۔ ہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ بعد خدا تو ہی وہ ہے۔ جو ساری کائنات پر حکومت کرتی ہے۔

پس

آ۔ آ۔ اور جلد آ۔ میں بچشم وا تیرا منتظر ہوں۔ آ۔ اور جلد آ۔

اور

مجھ کم بخت کو دنیا کے پُرفن ہاتھوں سے چھٹکارا دلا۔ اور ایسی میٹھی نیند سلا کہ شور محشر بھی مجھ کو نہ جگا سکے۔

اختر الزمان اختر لکھنوی

تمدن کے دو نمبر۔ کچھ عرصہ سے تمدن کی اشاعت میں باقاعدگی باقی نہ رہی تھی اسے پھر دوبارہ باقاعدہ کرنے کے خیال سے یہ متحد نمبر نکل رہا ہے۔ یعنی مئی اور جون دونوں مہینوں کا پرچہ ایک ہی کر دیا ہے۔ اس پرچہ کی ضخامت بھی اسی خیال سے زیادہ کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ تمدن ہر ماہ کے ابتدائی ہفتہ میں برابر شائع ہو جایا کریگا۔ کیونکہ جو دقتیں گذشتہ ایام میں پیدا ہو گئی تھیں وہ رفع ہو گئیں۔

مینیجر

حصہ خواتین و اطفال

خاموشی اور اس کے فوائد

خاموشی اور کثرت کلام ان دونوں میں سے کون اولیٰ و افضل ہے؟
یہ ایک بہت موٹا سوال ہے۔ جس کے جواب میں ہر وہ شخص جو اپنے دماغ میں عقل کا تھوڑا سا بھی مادہ رکھتا ہے۔ فوراً یہی کہہ اُٹھے گا کہ خاموشی کثرت کلام اور بیفائدہ کلام سے بہتر ہے۔

اور فی الحقیقت بات بھی یہی ہے۔ تمام حکما و عقلا اس پر متفق ہیں۔ اگر تم کسی امر کو مخفی رکھنا چاہتے ہو۔ اور تمہاری خواہش ہے کہ کسی پر ظاہر نہ ہو تو تمہارے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ تم اپنی زبان کو بند رکھو۔ ہرگز اس امر مخفی کو کسی پر ظاہر نہ کرو۔ اگرچہ وہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ تمہارے دوست کا بھی کوئی دوست ہو اور وہ اس دوست سے اس بھید کو کہدے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ سلسلہ بسلسلہ تمہارا یہ بھید ظاہر و آشکارا ہو جائیگا۔ اور تم کو اس کی وجہ سے بعض وقت سخت خسارہ و نقصان اٹھانا پڑے گا۔ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خامشی بہ کہ ضمیر دل خویش
باکسے گفتن و گفتن کہ مگو

پس اگر تم چاہتے ہو کہ نقصان و خسارہ سے بچے رہو تو تمہارے لئے ضروری اور اشد ضروری ہے کہ اس امر کو مثل گنج پنہان کے اپنے سینے میں مخفی رکھو۔ پھر تمہارے لئے نجات کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اسی لئے آنحضرت خاتم الانبیاء سید الحکماء حضرت

احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیہ والثنا ارشاد فرماتے ہیں من صمت نجا یعنی جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔

خاموشی عین حکمت و دانائی ہے۔ بشرطیکہ کوئی اس پر عمل کرے۔ اور جب خاموشی عین حکمت ہوئی تو اس کا اختیار کرنے والا ایک حکیم اور دانا شخص ہوگا۔ خاموشی آدمی کی عزت وقار اور رعب کو قائم رکھتی ہے۔ برخلاف اس کے زیادہ بک بک کرنے۔ بیفائدہ کلام کرنے اور الٹی سیدھی باتیں بنانے سے آدمی اپنا وقار آپ کھو دیتا ہے۔ اس کا رعب لوگوں کے دلوں سے اٹھ جاتا ہے۔ بیفائدہ کلام کرنا سخت منع ہے۔ اسلام میں اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ کہ انسان جب کوئی بات بولے تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لے اور دل میں غور وفکر کرے۔ کہ میری باتیں کس قسم کی ہیں غیبت چغلی وغیرہ سے مبرا ہیں یا نہیں؟ اور میری باتوں سے کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ الغرض قبل تکلم کے اس کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ ورنہ بسا اوقات زیادہ بک بک کرنے اور بیہودہ کلام کرنے سے وہ ندامت حاصل ہوتی ہے کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جب تک کوئی بات انسان کے سینے میں محفوظ رہتی ہے اس وقت تک اس کے قابو میں رہتی ہے۔ لیکن جب اس کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے تو اس کے قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسی باتیں نہ نکالنی چاہئیں کہ جو محض بیفائدہ ہوں اور ان کا نتیجہ نہ اپنے حق میں بہتر اور نہ کسی دوسرے کے لئے مفید ہو۔ ایسی صورت میں بجز وقت ضائع کرنے کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ اور جب کوئی فائدہ نہیں تو اس کا ترک ضروری ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے فرمایا کہ اے ابوذر رضؓ کیا میں تجھے ایسا عمل بتا دوں کہ تو آسانی سے اس کو کر سکے۔ اور اس کا ثواب بہت ہو۔ حضرت ابوذر رضؓ نے عرض کیا ارشاد کیجئے۔ آپ نے فرمایا "ھو الصمت و احسن الخلق و ترک مالا یعنیک" یعنی وہ سکوت اور خوش خلقی اور غیر مفید چیز کا ترک کرنا ہے

حضرت ابن مسعود رضؓ فرماتے ہیں کہ تم کو کلام زائد سے ڈراتا ہوں۔ آدمی کو اتنی قدر

کلام کافی ہے کہ اس کا مطلب ادا ہو جائے۔

الحاصل انسان کو اسی حد تک کلام کرنا چاہیے۔ جہاں تک کہ اس کو ضرورت ہے بقدر ضرورت بول کر سکوت اختیار کرے۔ زیادہ بک بک نہ کرے۔ کیونکہ ضرورت سے زیادہ کہنا اور بیفائدہ کلام کرنا ایک فعل عبث ہے اور یہ عقلمندوں کی شان نہیں فقط

محمد عبد الغنی

(۱)

لاڈو بیگم کی تعلیم تو تعلیم تربیت بھی اچھی نہ تھی۔ گو امیر خاندان میں پیدا ہوئی تھی لیکن والدین کی بیجا ناز برداری۔ لاڈ پیار نے اول درجہ کا عیش طلب حکومت پسند، بد مزاج بنا دیا تھا۔ اپنے سامنے کسی کی ہستی نہ سمجھنا۔ چھوٹے بڑے کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ جزو عادت بن گیا تھا۔ اس کے نزدیک بزرگوں کا لحاظ یا ادب دو مہمل لفظ تھے۔ جو خواہ مخواہ بزرگانہ حقوق جتلانے کو وضع کرلئے گئے تھے جس پر نافہم و حریص سعادت نوجوان لڑکے لڑکیاں ایثار و خلق ظاہر کرنے کے لئے عمل کرتے ہیں۔

لاڈو بیگم کا ایک بھائی بھی تھا۔ جو اس سے عمر میں بڑا دولت علم سے مالامال اور تربیت یافتہ تھا۔ اگرچہ دونوں نے ایک ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے تھے۔ لیکن خصائل جدا جدا تھے۔

والدین کی آنکھیں بند ہوتے ہی لاڈو بیگم نے لڑنا جھگڑنا شروع کیا بیچارے نے میل جول قائم رکھنے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ مگر لاڈو بیگم کی ضدی طبیعت اور مغرور المزاجی نے ایک نہ چلنے دی۔ نوشیرواں مرزا (لاڈو بیگم کے بھائی) کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا سال کے اندر ہی اندر تقسیم کا مسئلہ پیش ہوگیا۔

نوشیرواں مرزا کی عاقبت اندیشی نے معاملہ کو طول نہ پکڑنے دیا۔ چند معززین کے

سامنے دیانتداری سے ترکہ تقسیم کر لیا گیا۔ ایک گھر کے دو گھر ہو کر بھائی بہن میں مغارقت کی بنیاد پڑی حالانکہ نوشیرواں مرزا کے مکان کے دروازے لاڈو بیگم کے لئے ہر وقت کھلے تھے لیکن وہ بھائی کی صورت سے بیزار تھی۔ کیوں کس لئے شاید اس کا جواب دینے سے وہ خود عاجز تھی۔

لاڈو بیگم کی شادی اُس کے قریبی رشتہ دار کیوان مرزا سے ہوئی تھی جو امیر تو نہ تھا مگر فارغ التحصیل ضرور تھا۔ اس نے کالج سے نکلکر اورسیری کا کام حاصل کیا تھا جس سے مہینہ میں ڈیڑھ دو سو کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ یہ شادی خود اس کی مرضی ہوا ایسے تو نہ ہوئی تھی مگر وہ رنجیدہ بھی نہ تھا۔

لاڈو بیگم کے والد نے کیوان مرزا کو دولتمند عزیزوں پر صرف اس لئے ترجیح دی تھی کہ وہ اپنی غربت پر نظر کر کے اپنی بی بی کو ہم لوگوں سے جدا نہ کرے گا۔ ذرا سے اشارہ میں یہاں رہنے پر بخوشی راضی ہو جائیگا۔

وہ ایک حد تک اپنے منصوبوں میں کامیاب ضرور ہوئے لیکن انہیں کیا معلوم تھا۔ ان کے بعد اُن کی دلاری بیٹی خود اس مکان کو چھوڑ دیگی جس میں پیدا ہوئی۔ پلی پرورش پائی اور کھیل کود کر اتنی بڑی ہوئی۔

—(۳)—

لاڈو بیگم کی نازک مزاجیاں تو ہرگز اس قابل نہ تھیں کہ کوئی شریف طبیعت انسان خوش رہ سکتا یا ہمیشہ نباہ دینے کی امید کر سکتا لیکن خوش قسمتی سے وہ ایسے کے پلے پڑی تھی جو نیک نفسی حلیم الطبعی میں اپنا آپ نظیر تھا۔ وہ جس قدر بدخلقیوں اور غیظ و غضب سے کام لیتی کیوان مرزا اس سے زیادہ ضبط و خوش مزاجی کا اظہار کرتا۔ لاڈو بیگم بگڑے ہوئے تیوروں سے آگ لگاتی تو وہ خوش طبعی و زندہ دلی کا پانی چھڑک کر بجھا دیتا۔

اُس نے مغلوب الغضب بی بی کی خوشی و دلدہی میں پوری سعی سے کام لیا۔ مستعدی سے نازبرداری کو موجود رہا جس طرف لاڈو بیگم کی طبیعت کا رجحان پاتا وہی بات کرتا۔ کھانے پہننے اوڑھنے۔ آرائش و زیبائش کی چیزوں سے گھر بھر دیا جس قدر بیوی کرتا اسکی خوشنودی

انسان بھلا جواب پانے کی امید پر کتنا سوال کرے۔ اور جواب نہ پاکر ہاتھوں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جواب
دینے پر مجبور کرے۔ اس بہانے [illegible] اور بھی جس قدر تالیف قلوب کے عمل یاد تھے پڑھ کر دم کئے۔ لیکن
سنگدل بی بی پر خاک بھی اثر نہ ہوا خوشامد کرتے کرتے زبان خشک ہو گئی۔ مگر [illegible] بی بی ٹس سے
مس نہ ہوئی۔ دن بھر کی سخت محنت، بی بی کی بے انتہا چاپلوسیوں نے مضمحل کر دیا تھا۔ اتفاق
سے صبح کو صرف چار بسکٹ کھا کر دفتر چلا گیا تھا تمام دن کام کی بھرمار سے کچھ کھانے کی نوبت نہ آئی شام کو
بی بی کا مزاج برہم تھا کھانے کی صلاح کرتا تو کون کرتا۔ دوسرے وہ میاں کے آنے سے قبل ہی کھانا
کھا کر فراغت کر چکی تھی۔ اور گھر کی تمام ماماؤں کو نادری حکم تھا خبردار کوئی کھانے کا ذکر نہ کرے اگر میاں کمین
خود پوچھیں تو صاف انکار کر دیا جائے۔

رات کے بارہ بجے لگے بھوک کی شدت سے بہت برا حال تھا آخر اُسنے ماما کو نام لیکر بلایا۔
حبشیہ آئی تو کھانا لانے کو کہا۔ بھلا اسکی کیا مجال تھی جو بیگم کے حکم کی خلاف ورزی کرتی اگرچہ
[illegible] اسکے نفس نے اسے ملامت بھی کی لیکن اس نے مجبوراً حیلہ کر کے ٹال دیا اب
ناچار ہو کر بستر پر دراز ہونا پڑا۔

[illegible] کا زمانہ تھا چودھویں کا چاند [illegible] کی جلالت [illegible] فلک پر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کے برابر کیوں مرا جاتا [illegible]
بلبلا رہا تھا اُسکے دل میں عجیب عجیب توہمات و خیالات ابھرتے تھے۔ کبھی اپنی حالت بے کسی پر افسوس
تھا کیونکہ قدرت کی وسیع دنیا میں ہر طرح کی ترقی کی قابلیت رکھتا تھا۔ مگر پھر اس نعمت عظمیٰ سے محروم
تھا۔ جوانی کیسی بے مزا گذر رہی تھی۔ اپنی خونخوار زوجہ کی ناز برداری سے فرصت نہ ملتی تھی۔ جو کاروبار کو
وسعت دیتا۔ کبھی آئندہ کا خیال آتا [illegible] بیتاب ہو کر جلد جلد پہلو بدلنے لگتا وہ نہیں سمجھتا تھا ایسی
کینہ پرور عورت سے کیونکر کس صورت میں گذر کی امید ہو سکتی ہے [illegible] ہر طرح کی کوششوں میں
ناکام رہتا تھا کبھی اسکی خوبصورتی کا خیال کر کے حیرت و استعجاب [illegible] دل ہی دل میں کہتا۔ ایسی حسین
ایسی دلربا، اتنی پیاری صورت اور ایسی کینہ جو، ایسی بدخصلت اسقدر سنگدل کیا دنیا میں حقیقی

برائیوں کا پردا ہے۔ جو اپنی تہہ میں بدی کو چھپائے ہوئے ہے۔ کیا واقعی حسن ایسا شربت ہے جو چکھنے میں شیریں اور اثر میں سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ الغرض ایسے ہی ایسے پریشان کن خیالات میں الجھکر آنکھ لگ گئی۔

(۴)

رات بھر خوفناک خواب دیکھتا رہا ساری رات آرام سے نیند نہ آئی سویرے نماز کے وقت آنکھ کھلی بھر تپ درد محسوس ہو رہا تھا ہاتھ پاؤں بھی ٹوٹ رہے تھے۔ اٹھکر وضو کیا نماز پڑھی طبیعت کی کسمندی نے سستی پیدا کر دی تھی کمرے میں جاکر مسہری پر لیٹ رہا صبح کی فرحت بخش ہوا نے لوری دے دے کر سلا دیا۔

اب جو آنکھ کھلی دن اچھی طرح نکل آیا تھا۔ کھڑکیوں سے آفتاب کی سنہری کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ بعجلت پلنگ سے اٹھکر حوائج ضروری سے فراغت کی۔ کھانے کا اہتمام نہ دیکھکر تعجب نہ ہوا کیونکہ غضبناک بی بی کی طبیعت سے کما حقہ واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا میرے واسطے یہی سزا تجویز کی گئی ہے۔ اس نے بغیر کچھ کہے سنے خاموشی سے دفتر کی راہ لی۔

دفتر مکان سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر بازار میں واقع تھا۔ یہاں پہنچکر ایک سلامی ہوٹل سے کچھ کھانے کی چیزیں منگا کر دو چار نوالے اگل نگل کر کھائے کیونکہ دلی صدمات، تفکرات اور کچھ غصہ کی وجہ سے حلق اسقدر خشک ہو رہا تھا کہ مشکل نوالہ تر سکتا تھا۔ دن بھر کام تو کرتا رہا لیکن حقیقتاً کسی بات میں دل نہ لگتا تھا۔ اندرونی پریشانیوں کی جہت سے گھنٹوں گھڑی ہاتھوں پر سر رکھکر کچھ سوچنے لگتا تھا۔

کل کی طرح آج بھی بہت لوگ آ گئے۔ اگرچہ اس نے بہت جلد کام ختم کر دینے کا قصد کر لیا تھا مگر اخلاق سے بعید تھا کہ ان لوگوں سے سیدھی بات نہ کرتا جو اس سے کام لینے کے متعلق تصفیہ طلب امور کی نسبت بات چیت کر رہے تھے مجبوراً خلاف توقع دیر تک دفتر میں بیٹھنا پڑا گو خاطر خواہ کام ملگیا تھا جس سے معقول نفع کی امید تھی۔ اور غالباً اس امر سے خوش بھی ہوتا۔ مگر جانتا تھا کہ یہ خوشی حقیقی مسرت نہیں بخش سکتی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی روح فرسا مصیبتوں کا سامنا ہے جس کے سامنے اس شادمانی کی کوئی حقیقت نہیں۔

(۵)

کیوان مرزا ڈرتا ڈرتا آٹھ بجے شب کو گھر پہنچا۔ صرف ایک ماما صحن میں خاموش بیٹھی تھی یہ دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی پریشانی میں کپڑے اتار کر بیٹھنے کا بھی خیال نہ آیا یونہی کھڑے کھڑے پوچھا

کیوان مرزا۔ بیگم کہاں ہیں۔

ماما۔ اپنے میکے تشریف لے گئی ہیں۔

کیوان مرزا۔ متعجب ہو کر "مجھ سے بغیر کہے ہی کیا بھائی نوشیروان مرزا آئے تھے۔

ماما۔ جی نہیں۔

اس نے لاحاصل سمجھ کر پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اسی طرح الٹے پاؤں نوشیروان مرزا کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ بھر لڑکھڑاتا ہوا خسرال پہنچا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ نوشیروان مرزا کسی ضروری رسم سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ سنکر اس نے واپسی کا قصد کیا تھا لیکن بہن کی ملازمہ نے زنانہ میں بلوا لیا۔

میاں کے غم میں اور اضافہ ہو گیا۔ لاڈو بیگم نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسے بڑی بی نے بہت سمجھایا دور سے کھڑے کھڑے دو باتیں سن جاؤ چلنے نہ چلنے کا اختیار ہے۔ خود نوشیروان مرزا کی بیوی نے بہت کچھ کہا سنا سفارش کی۔ مگر اس نے ایک نہ مانی بڑی حقارت سے شوہر کی درخواست رد کر دی اور کیوان مرزا کو بے نیل و مرام ناکام و نامراد حسرت و افسوس کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔

نوشیروان مرزا نے جب لاڈو بیگم کے ملنے سے انکار کا حال سنا تو بجائے خوشی کے چہرے پر رنج کی جھلک نمودار ہوئی۔ کاش یہ ہنسی خوشی اپنے شوہر کی اجازت سے آئی ہوتی تو وہ اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کو تیار تھا۔ موجودہ حالت میں بھی بہن سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے اخلاق نے گوارا نہ کیا کہ فوراً ہی اپنی رائے کا اظہار کر دے۔ وہ اس کے چڑچڑے مزاج سے واقف تھا۔ جانتا تھا اس وقت سمجھانا بجھانا لاڈو بیگم کی طبیعت کے خلاف ہوگا۔

لاڈو بیگم چند روز ہنسی خوشی بھائی کی مہمان رہی لیکن اسکی جنگجو طبیعت نچلی بیٹھنے کی روادار نہ تھی۔ ایک روز بھاوج سے صرف اس بات پر کہ سالن بے مزا تھا سخت لڑی جھگڑی ہزارہا باتیں سنائیں مگر وہ بھی بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ مگر نہیں وہ حیادار صلح کل اور نیک مزاج خاتون تھی۔

س نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسی نہیں نکالی جس سے لاڈو بیگم کی توہین ہوتی بلکہ ہر طرح
منصوب الغضب ہونے کا عصہ فرو کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے مرزا صاحب سوا زینہ تو جھاڑ پونچھ
کے ٹھیکلوں سے اتر جاتا۔ اس کی طبیعت قبل ہی یہاں سے اچاٹ تھی۔ اب تو اور دونے پر سہاگہ
ہوگیا۔ بھائی کے آتے ہی رو رو کر قیامت برپا کردی کہ میں ایک منٹ اس غارتی گھر میں نہیں ٹک
سکتی۔ ابھی ابھی میرے جانے کا بندوبست کردو۔ میں ماموں جان کے پاس شاہجہانپور جاؤنگی۔

نوشیرواں مرزا نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ان مرزا کو بھی بلوا بھیجا۔ مگر بے سود ہوا۔ آخر میل ٹرین
میں ایک گاڑی ریزرو کرا کے تمام اسباب رکھوا کر لوا دیا۔ خود کیوان مرزا شاہجہانپور تک ساتھ گیا۔

(۶)

لاڈو بیگم کے ماموں ایک ریاست میں تحصیلداری کے عہدہ پر ممتاز تھے اس لئے شاہجہانپور میں
بہت کم قیام کا اتفاق ہوتا تھا۔ آجکل تو معہ بال بچوں علاقہ پر تحصیل وصول کیلئے گئے ہوئے تھے گھر خالی پڑا
ہوا تھا۔ کیوان مرزا نے بعد ہزار اجازت حاصل کرکے لاڈو بیگم کے رہنے کا انتظام کردیا۔ زنانخانے میں
ماما۔ کہاریاں مردانی ڈیوڑھی پر خدمتگار سپاہی تعینات کردیئے۔ بنک کی کتاب بی بی کے حوالے
کی جب سے شادی ہوئی تھی۔ اور بی بی کی جائداد اس کے قبضے میں آئی تھی۔ اس وقت سے آج تک
اس نے لاڈو بیگم کی آمدنی کا ایک پیسہ بھی صرف نہ ہونے دیا تھا۔ برابر کل آمدنی ماہ بماہ اس کے نام سے
بنک میں جمع ہوتی رہی۔ جو اب ہزاروں کی تعداد کو پہنچ گئی تھی۔

کیوان مرزا کل بندوبست کرکے وطن واپس گیا۔ شاہجہانپور میں آئے ہوئے لاڈو بیگم کو خاصے
دن گذر گئے۔ اس درمیان میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اور ہوتی تو کیوں ہوتی ہر طرح کا آرام میسر تھا کیونکہ
پیسے کی کمی نہ تھی۔ بنک کے منافع کے علاوہ پانچسو روپیہ ماہوار ہر چاند کی پہلی کو ملتا رہتا تھا خادمیت
گذاری کو نوکر چاکر موجود رہتے تھے۔ باوجود ان باتوں کے وہ کسی قدر افسردہ ضرور تھی خود بخود دل بیٹھا جاتا
تھا۔ کیوان مرزا موجود نہ تھا جس پر نازک ہوکر اور لپک جھپک کر دل کے بخارات نکالتی رہتی۔ ماما اسلئیں
انہوں نے پہلے تو برداشت کیا مگر جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو ملازمت چھوڑ چھوڑ کر چل دیں
غضب تو یہ ہوا تین چار مرتبہ نوکروں کی تبدیلی سے شاگرد پیشہ لوگوں میں اسکی بدمزاجی کی شہرت
ہوگئی اب لوگ نوکری کرنے گھبراتے ہیں مجبوراً ان لوگوں کی جانب سے خوشامد چشم پوشی اختیار کرنی پڑی۔

بخار بالکل اتر گیا تھا۔ کمزوری کی علامتیں ظاہر تھیں۔ چاہا نیند آ جائے لیکن خیالات پریشان بنا رہے تھے۔ ادہر ادہر کروٹیں بدلیں جب کسی طرح نیند نہ آئی تو جلتے پڑی ہوئی آنکھیں کھول کر سامنے والی دیوار میں آویزاں لیمپ کی لو پر جما دیں۔

انسان چاہے کیسا ہی سفاک بدنفس ظالم ہو مگر اس کا دل منصف ہوتا ہے جب کبھی تخلیہ میں خیال کریگا تو اس کی نارا اچھائیاں برائیاں پیش نظر ہو جائینگی۔ یہی حال اس وقت لاڈو بیگم کا تھا وہ دیدۂ دل سے گذشتہ واقعات کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ اسے خوب یاد تھا ایک مرتبہ شادی کے بعد اس طرح بخار آیا تھا جب اس کا وفادار شوہر کیوان مرزا چارہ سازی کو موجود تھا وہ رات رات بھر پٹی پر ہاتھ دہرے بیٹھا رہتا تھا۔ جہاں رات کو آنکھ کھلی اس نے میٹھی میٹھی دلفریب باتوں سے بہلا لیا۔ اس کی مزہ دار کہانیاں۔ دلچسپ قصے اور ظرافت آمیز لطیفہ مرض کی تکلیف کو گھٹا دیا کرتے تھے جہاں کسی چیز کی طرف رغبت ہوئی فوراً حکیم و ڈاکٹر کی صلاح سے مہیا کر دی گئی کسی بات کی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ آج بھی اسی طرح نوکر چاکر خدمت کو موجود ہیں اسی طرح دولت کی طرف سے اطمینان ہے۔ اسی طرح حکیم ڈاکٹر آتے ہیں مگر ہائے ویسا شفیق اور مہربان تیماردار موجود نہیں۔ وہ جس قدر خیالات کو وسعت دیتی کیوان مرزا کی وفاداریاں اخلاق اور سچی محبت کا ثبوت زیادہ ہوتا جاتا۔ اس نے روزمرہ کی خانگی باتوں پر نظر ڈالی۔ بہت سی کیوان مرزا کی خوبیاں ہیرے کی طرح درخشاں نظر آئیں۔ جوں جوں غور کیا خود کو خطاوار اور اسے بے قصور پایا۔ اب اس کا نفس اس کی زیادتی اور کوتاہ اندیشی پر ملامت کر رہا تھا۔ شرمندگی نے دل کی عجیب حالت کر دی تھی۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی خیال آ گیا کہ میں اپنی بدمزاجی سے کن کن گناہوں کی مرتکب ہوئی ہوں۔ اُف بھائی بہاوج سے کیسا برا سلوک کیا۔ بڑے والدین کو اپنی بدزبانی سے ہمیشہ رنجیدہ رکھا۔ شوہر کا دل دکھایا۔ آہ ایسا فرشتہ خصلت شوہر ایسا شفیق میاں۔ اور اس کی یہ بے قدری ایسی بے وقعتی دنیا بھی خراب اور عقبیٰ بھی برباد۔

ان خیالوں نے کچھ ایسا اثر کیا کہ دیوانوں کی طرح ادہر ادہر ٹہلنے لگی۔ اب تک کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ نہ چلنے میں پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ بس سر ہے کہ سر جھکائے ہوئے ہے

خوف معاصی نے سارے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا ہے۔ خیالات کا تانتا بندھا ہے۔ اس نے جنونانہ انداز سے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ آسمان کی جانب بلند کر کے کہا۔

اے خلاق عالم اے کریم و رحیم میری غلطیوں کو معاف کر۔ میں خاطی ہوں اور اپنی خطاؤں سے شرمسار ہو کر تیری بارگاہ رحمت سے رحم کی خواستگار ہوں۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ فرقہ اناث میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں میں نے تیری عطا کی ہوئی نعمتوں کی کچھ قدر نہ کی۔ میں نے اپنے عزیز و اقارب اپنے والدین اور اپنے شوہر کی نافرمانی کر کے اُن کے دل کو دکھایا ہے۔ بار الٰہا تو عالم الغیب ہے دلوں کا حال جانتا ہے۔ میں اپنے گناہوں سے نادم ہوں۔ تو رحم کرنے والا ہے تیرا چشمۂ رحمت عام ہے۔ مجھے بھی مورد الطاف مہربانی فرما پروردگار اپنی بے پایاں رحمت کو میرا معین و مددگار بنا۔ میں آئندہ لغزشوں سے محفوظ و مامون رہوں۔

وہ رات عجیب الجھن و بے چینی میں بسر ہوئی۔ پو پھٹتے ہی اس نے دو تار دلوائے ایک کیوان مرزا دوسرا نوشیرواں مرزا کے نام تھا مضمون صرف دونوں میں اتنا تھا بہت جلد آؤ۔ دوسرے روز دونوں آدمی شاہجہانپور پہنچ گئے۔ انہیں یہ معلوم کر کے بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ لاڈو بیگم نے اپنی قدیم عادتیں یک قلم ترک کر دی ہیں۔

اس نے اپنے بھائی کو دیکھتے ہی قدموں پر گر کر عاجزی سے عفو تقصیر چاہی جس کے جواب میں انہوں نے بزرگانہ محبت و شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا سعادتمندی اور طول عمری کی دعا دے کر معافی عنایت کی۔

دن بھر خوشی اور مزے مزے کی باتوں میں گذرا شام کو کھانے سے فارغ ہو کر نوشیرواں مرزا اپنے مسکونہ کمرے میں آرام کرنے گئے۔ میاں بی بی اپنی خوابگاہ میں آئے۔ اس وقت لاڈو بیگم نے دست بستہ قدموں پر گر کر گذشتہ نافرمانیوں سے اظہار خجالت کیا۔ یہ دیکھ کر کیوان مرزا کی آنکھوں میں فرط انبساط سے آنسو ڈبڈبا آئے کیوان مرزا نے بیوی کا قصور معاف کر کے کہا۔

عزیزو! اگر کوئی بری بات ہو تو اس کی امید کو دل میں ہرگز جگہ نہ دو۔ امید و تمنا کرو نیکی کی۔ اور پھر اس کا ارادہ کر کے کوشش کرو۔ نیکی کی تمنا جلد پوری بھی ہوگی۔ اور تم کو راحت بھی ملیگی ؎

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

کیا کسی کو رُلا کر تم ہنسنے کی امید کر سکتے ہو۔ کیا کسی کو تباہ کر کے تم راحت پا سکتے ہو۔ کیا کسی پر ظلم کر کے اپنے متعلق عدل کی تم امید رکھ سکتے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کسی کو ستاؤ گے تو ستائے جاؤ گے۔ پھر ایسی باتوں کی امید کیوں کرتے ہو جن سے تم کو آرام نہ ملے۔

عزیزو! کسی کو بگاڑ کر اپنے سنوارنے کی امید رکھنی سراسر حماقت ہے۔ تم کو ایسی امید ہی فائدہ دے سکتی ہے۔ جس سے دوسرے کا کوئی نقصان نہ ہو۔ اگر تم تخم حنظل بو ؤ گے۔ تو شیرین ثمر کہاں سے توڑو گے۔ نیت پاک و صاف رکھو۔ اچھی امید و تمنا کو دل میں جگہ دو۔ اور پھر ارادہ کر کے کوشش کرو۔ تو آرام سے زندگی بسر ہوگی۔

مکند گیرجی

لالہ لاجپت رائے کا شکریہ

آج اخبار "قوم" کو موت کی نیند سوتے ہوئے ایک سال کے قریب ہوگیا لیکن اس کی یاد اس کا ذکر آج بھی زندہ ہے۔ اسی سلسلہ میں اس کا نام ہے جو بہت ہر دلعزیز ثابت ہوا چنانچہ لالہ لاجپت رائے جی نے جب اخبار کے اجرا کا خیال کیا تو اسکا نام "قوم" ہی تجویز کیا لیکن میری اس گذارش پر کہ میں "قوم" کو جس وقت بھی قوم کی زنجیریں ڈھیلی ہوجائیں۔ پھر نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انھوں نے اپنے اخبار کیلئے دوسرا نام تجویز کرلیا میں تمدن کے ذریعہ سے لالہ صاحب کا نہایت ادب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری درخواست کو قبول کرلیا۔ اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ "قوم" کی حیات کرمات سے بدلدینے والوں کو یہ توفیق دے کہ وہ اسپر سے قیود کو اٹھالیں۔ نیاز مند محمد عباس حسینی سابق ایڈیٹر "قوم"

حقیقی جوہر

سکینہ اپنی ماں کے گھر مہمان ہے لیکن اس خوشی کے وقت بھی کسی دولت کا رشک اسکو رنجیدہ بنائے ہوئے ہے۔ وہ اپنی ماں سے کہتی ہے کہ آپ نے زینب کے زیور دیکھے ہیں میں آج اسکے ہاں گئی تو اس نے اپنا سب زیور مجھے دکھایا جسکو وہ پہنتی ہوگی تو کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہوگی۔ کاش میرے پاس بھی ایسے زیور ہوتے جنکو پہنکر میں خوبصورت معلوم ہوتی سکینہ کی طرح میرے بھی کانوں میں بالیاں اور ناک میں نتھ ہوتی تو جو مجھکو دیکھتا وہ میرے اور میرے زیور کی تعریف کرتا

ماں نے کہا بیٹی تمہارے پاس بھی ایسی چیزیں ہیں جسکو لوگ دیکھکر تمہاری تعریف کریں لیکن اسکو شوق سے تم استعمال کرو تو میں بتاؤں۔ یہ بری بات ہے کہ تم دوسرے کی دولت پر رشک کرو

اس نے کہا میں نے تو مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں زیور کیلئے اپنے شوہر کو بہت دق کرونگی اور جبتک وہ مجھے سونے اور چاندی کے بہت سے زیور نہ بنوا دیگا چین نہ لینے دونگی۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت میں سب زیور پہنکر اسکے سامنے آؤنگی تو وہ خوش ہوکر مجھ سے زیادہ محبت کریگا

اے نادان بیٹی تو ایسا کرکے صرف اپنے شوہر کو پریشان کر سکیگی میں لے کبھی نہ مانونگی کہ زیور ایک صندوق ہے جسمیں روپیہ پیسہ بہت جمع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ غلط ہے کہ زیور دولت کی حفاظت کرتا ہے جہانتک میرا خیال ہے اسمیں نقصان ہے جب آدمی اپنے روپیہ کو زیوروں میں منتقل کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسکی مزدوری میں کتنا روپیہ خرچ کرتا ہے۔ پھر اسکے ٹوٹنے گم ہوجانے چوری جانے کا اندیشہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگر کبھی روپیہ کی ضرورت پڑی تو اتنا روپیہ جتنا زیور میں خرچ ہوا وصول بھی نہیں ہوتا۔ اب بتاؤ اسمیں کیا فائدہ ہے۔

ماں۔ آپ نے نہیں سمجھا کہ اسمیں کیا فائدہ ہے میرا تو مطلب صرف اتنا ہے کہ اسے پہنکر خوشی ہوتی ہے اور پہننے والی خوبصورت معلوم ہوتی ہے لوگ دیکھتے ہیں تو تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کتنی امیر ہے۔

بیٹی میرے خیال میں روپیہ کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔ لوگوں پر اپنی امارت ظاہر کرنے میں کیا فائدہ

ہے۔ اور حسد کی آگ بھڑکتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوستی کی بجائے دشمنی ہوجاتی ہے۔
میں نے سنا ہے کہ کوئی ملک ہے وہاں شوہر جتنا روپیہ جمع کرتا ہے کسی بنک میں دیدیتا ہے
اور کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے پاس کیا ہے۔

سکینہ حیران ہوکر بول اٹھی تو وہ اپنی بیوی کو کس طرح پسند کرتا ہے کیا اس سادگی سے
اس کی بیوی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اس کو دل سے چاہتا ہے۔ نہیں اس کی خواہش
ہوتی ہے کہ اس کی بیوی زیور پہنکر اس کے سامنے آئے۔

بیٹی میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض زیور سونے اور چاندی سے بھی اچھے ہوتے ہیں اور
جن کو اگر پہنا جائے تو لوگ بہت تعریف کرتے ہیں۔ اگر تم قدر کرو تو میں ایسا کچھ پتہ بتا سکتی
ہوں بتلاؤں کہ وہ کیا ہے پاس ہے اور تم ایسی ہوگی تو لوگوں کی نظروں میں بھی معلوم ہوگی
اور ہر شریف زادی کو چاہئے کہ اسے پہنا کرے۔

میری اماں مجھے جلد بتادو کہ وہ کیا ہے۔

بیٹی یہ زیور عصمت عفت شرم حیا صلح جوئی درگذر سے اخلاق سے پیش آنا ہے۔
ان کی عزت کرنا اور ادب کرنا ہے۔ جو اسے پہنتا ہے لوگ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں اور اس
سے ملنے جلنے کو بڑا فخر سمجھتے ہیں۔ یہ جملہ سے زیادہ خوبصورت بنانے والی چیزیں ہیں ایک بادشاہ
جو بہت عقلمند تھا اس نے ایک نیک عورت کے چال چلن کی بہت داد دی تھی۔ اور کہا تھا کہ
ان باتوں سے اس کے شوہر کی محبت بہت بڑھتی ہے اور اس کا اعتماد دن دونا ہوتا جاتا ہے
اور عورتوں سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ جو سونے چاندی کے زیور سے لدی رہتی ہیں
اور اپنے شوہر کا تمام روپیہ پیسہ اوپر خرچ کرتی ہیں۔ اس بادشاہ نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے
کہ ایسی نیک عورت کی قیمت جواہرات سے بھی بڑھ کر ہے۔

اے بیٹی بجائے اسکے کہ تم کسی کے زیور کو دیکھکر رشک کرو تم خود نہ ایک جوہر بنجاؤ جس سے لوگ
تمہاری قدر و عزت کریں تم مفت میں دوسرے کے زیور کو دیکھکر رنجیدہ ہوتی ہو۔ اور اسکی کوشش نہیں
کرتیں کہ جو تمہارے شوہر کو بہت خوبصورت معلوم ہو وہ تم پر فخر کرے کہ تم ایک بہترین دولت ہو۔

حکیم قمر الحسن (از بھوپال)

حصۂ مذہب
سائنس و فلسفہ

عبادت

وان من شیء الا یسبح بحمدہ

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی عبادت نہ کرتی ہو۔ کسی کے قیام کسی کے رکوع اور کسی کے سجدے کی حالت صاف صاف بتا رہی ہے کہ ساری کائنات اس خدائے یکتا کے ذکر و تسبیح میں مشغول ہے۔ جاندار ہو یا بے جان، اس جان آفرین کی تسبیح و تہلیل کو ہر مخلوق اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ خورشید خلقت کا ہر ذرہ نور طاعت سے روشن ہے۔ آسمان رکوع میں ہے۔ زمین سجدے میں۔ درندے، پرندے، چوپائے، سب اسکی بارگاہ تقدس میں سر جھکائے ہوئے ہیں نباتات میں کوئی بحالت رکوع، کوئی بحالت قیام اپنے فریضہ کو ادا کر رہا ہے۔ اور جمادات کی افتادگی اس امر کی بین دلیل ہے کہ اسکے آستان عبادت پر جبیں سائی کر رہے ہیں۔ غرض دنیا میں کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو ذکر خدا میں مصروف نہ ہو۔ گوش ہوش سے سنو کہ صبح و شام طیور تمہیں کیا سنا رہے ہیں۔ چڑیوں کی چوں چوں میں چون و چرا کی کیا گنجائش ہے کہ ذکر بے چون و چرا کرتی ہیں فاختہ کی کوکو اس بات کی شاہد ہے کہ وہ اپنے خالق کی طلب و جستجو کر رہی ہے پپیہا کا ترانہ عندلیب کا نغمہ قمری کی صدائے حق سرہٗ یہ سب خدائے یکتا و بے ہمتا کے ذکر و تسبیح پر دلالت کرتے ہیں۔

عزیزو! خدائے بے نیاز نے اپنی ہر ایک مخلوق کو کسی نہ کسی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور

ایک کو دوسرے پر مدارج کے لحاظ سے فضیلت دی ہے۔ کوئی پتھر ہے کوئی لعل۔ کوئی جھوٹا موتی ہے کوئی سچا۔ کوئی بے ثمر درخت کوئی ثمردار۔ اور جس کے قابل جو نعمت تھی وہ اُسے ملی گل کو رنگ و بو، بلبل کو نغمہ، لعل و گوہر کو آب و تاب، مگر سب سے بڑی اور سب سے اچھی نعمت حضرت انسان کو ملی یعنی خدا کی امانت۔ اور انسان کو دوسری نعمتیں بھی ہم سرفراز ہوئی وہ دوسرے حیوانات سے بدرجہا بہتر اور موزوں۔ اونٹ کی خلقت کو دیکھو اور انسان کے تناسب اعضا پر نظر کرو۔ ہاتھی اور گینڈے کے جثے اور انسان کی نازک بدنی کو میزان عقل میں تولو۔ پھر عقل بھی جیسی انسان کو ملی ہے ویسی کسی حیوان کو کب میسر ہے۔ یہ اپنی عقل سے ساری مخلوق کو مطیع کئے ہوئے ہے خدائے تعالے نے انسان کو اشرف المخلوقات بناکر دنیا میں بھیجا۔ اور ساری مخلوق کو اس کی خدمت کے لئے پیدا کیا ؎

جو کچھ کہ ہے دنیا میں سب انسان کیلئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہمان کے لئے ہے

جب اللہ تعالیٰ نے انسان پر اتنی بڑی مہربانی کی یہ عزت، یہ حرمت، یہ رفعت، یہ شرافت یہ قدرت اس کو دی ہے تو انسان کو بھی لازم ہے کہ وہ خدا کے احسانات کا شکر ادا کرے اور شرافت کا مستحق ٹھہرے جو اس کو عطا کی گئی ہے۔ انسان نہ صرف دنیا ہی کیلئے بلکہ آخرت کیلئے بھی پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو فرشتوں کی طرح دن رات تسبیح و تہلیل کی ہدایت نہیں ہوئی ہے بلکہ دینی و دنیوی دونوں کام انجام دینے کا اُسے حکم دیا گیا ہے۔ اور دنیوی کام بھی نیک تاکہ اس کی شرافت قائم رہے۔ اگر وہ کھانے پینے سونے کی زندگی ہی کو زندگی سمجھے تو یہ اس کی نکبت ہے اور اس کے لئے بڑی شرم کی بات ہے۔ گویا اس نے اپنے آپ کو نہیں سمجھا۔ اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کی۔ اگر اس نے رہبانیت کی زندگی کو پسند کیا۔ تو یہ اس کی سمجھ کا قصور ہے مخلوق تعلقات سے بری سب وہ فرشتے ہیں۔ ان کا کام عبادت ہے۔ وہ ذکر و تسبیح ہی میں مشغول ہیں۔ انسان کو تو اس سے اہم کام انجام دینا ہے۔ دنیا میں رہنا، زن و فرزند، عزیز و اقارب، دوست احباب، اور بنی آدم کے حقوق ادا کرنا، نیکی کرنا، بدی سے باز رہنا، اور پھر حق اللہ کا ادا کرنا یہ انسان کا فریضہ ہے۔ اس اہم فریضہ سے گھبرا کر وہ ترک تعلق و ترک دنیا کرے

تو کیا وہ انسان اور کیا اس کی شرافت؟ اور اگر دنیوی کاموں ہی میں منہمک رہے تو پھر اس میں اور حیوان میں کیا فرق؟ جب انسان کو عالم اخروی سے بھی بہت بڑا تعلق ہے یعنی اس نے دنیا کی چند روزہ زندگی کو ختم کر کے عالم آخرت ہی میں رہنا سہنا ہے۔ تو اس کو زاد آخرت کی فکر کرنی ضرور ہے۔ انسان عدم سے جب وجود میں آیا تو ہاتھ خالی تھے، نادانی کا زمانہ تھا۔ اس عالم اسباب میں آنے کے بعد اسے سامان دیا گیا۔ عقل دی گئی۔ اور حکم دیا گیا کہ دنیا کا کام بھی کرو اور دین کا بھی۔ اس لئے انسان پر فرض ہے کہ وہ حق اللہ و حقوق العباد کو ادا کرے اور یہیں سے اعمال صالحہ کا توشہ ساتھ لیتا جائے۔ کیونکہ دنیا دار العمل ہے۔ اور عقبے دار الجزاء ؎

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف

اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

جب کوئی شخص کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ یا کسی آفت مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔ تو خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ جب صحت ہو جاتی ہے تو پھر یاد خدا اس کے دل سے نکل جاتی ہے۔ انسان موت سے ڈرتا ہے۔ مگر خدا سے نہیں ڈرتا۔ مخلوق سے شرماتا ہے۔ مگر خدا سے نہیں شرماتا۔ مخلوق سے اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے اور ان کی نظر سے چھپ کر گناہ کرتا ہے۔ اور ڈرتا ہے کہ لوگ اسے دیکھ نہ لیں۔ کہ اس کی آبرو میں بٹا لگے۔ مگر خدا سے نہیں ڈرتا جو سمیع و بصیر ہے کہیں بھی چھپ کر گناہ کرو وہ دیکھ لیتا ہے۔ یہاں تک کہ دل کی نیت کو بھی جان لیتا ہے۔ اگر انسان خدا سے ڈرے، خدا سے شرمائے تو پھر گناہ کرنے میں اس کو تامل ہو اور رفتہ رفتہ بری عادتیں اس سے چھوٹ جائیں۔

اگر حجاب کنی از خدا فرشتہ شوی

چنانکہ می کنی از مرداں حجاب اینجا

سید غلام مصطفٰے ذہین

(رباعی)

غم جان بشر کی اک ادا ہے | نوعیت غم جدا جدا ہے

یہ ہے تو خدا بھی ہے جہاں ہے امین | غم جادۂ منزل ہدا ہے

موجودات عالم میں جس فرد کی طرف بھی نظر کرو تنازع فی البقا کو مشاہدہ کروگے۔

نباتات میں تنازع فی البقا۔ ایک پودا ایسی زمین میں جو اسکی ضروریات کو پورا کرسکے خوب بارآور ہوگا۔ ایسی مناسب و موزوں جگہ لینے کیلئے اس نوع کے افراد مختلف کی آپسمیں اور دیگر انواع جو اس سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ایک رقابت ہے۔ اگر کوئی قطعہ زمین کلبے بوئے جوتے چھوڑدیا جاوے تو اسمیں مختلف قسم کے پودے نکل آوینگے۔ جو باغ کے سابق پودوں کو فنا کردیا گے۔ رفتہ رفتہ وہ پودے جو زاید قوی ہیں کمزور پودوں پر غالب آجاوینگے اور بالکل نیست و نابود کردینگے۔ نلائی کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ دوسرے ناکارہ پودے ان پودوں کو جن کو کسان پال رہا ہے حق نہ چھین لیں۔ یا مار نہ ڈالیں۔ نباتات کو صرف دوسرے پودوں سے روشنی اور غذا کے لئے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ انکے دشمن جانور بھی ہیں۔ نوخیز پودوں کو بہت سے سبزی خوار جانور بھی کھا لیتے ہیں۔ ڈارون نے اس قانون کا نام "کشمکش حیات" رکھا ہے۔

حیوانات میں تنازع فی البقا۔ ادنیٰ درجہ کے جانوروں کے انڈے اور بچہ ہمیشہ بڑی تعداد میں تباہ ہوتے رہتے ہیں کچھ دوسرے جانوروں کی خوراک بنتے ہیں اور بچے کچھے منزل مقصود پر پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں لیکن سب سے پہلے ایسے بچے طعمہ اجل بنتے ہیں جو ماحول کے مطابق یا غذا وغیرہ تلاش کرنے کے ناقابل ہوں۔ اس کے علاوہ ایک نوع کو دوسری نوع سے بھی مقابلہ در پیش رہتا ہے وہ انواع جو ایک دوسرے سے زاید ملتے جلتے ہیں یا جن کا قریبی رشتہ ہے ان میں یہ کشمکش زاید ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے انواع کی غذا اور مناسب حالات حیات ایک سے ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے ایک اور کشمکش بھی جاری رہتی ہے۔ گوشت خوار جانوروں اور ان جانوروں میں جو ان کا شکار بنتے ہیں۔ ڈارون اس قانون تنازع فی البقاء کا بڑا پرچارک ہے اس نے قانون کے دو حصے کئے ہیں۔

ایک خانگی کشمکش جو حیوانات کو ایک دوسرے سے پیش آتی ہے۔

دوسرے معنوی ہو حیوانات کو قواعد طبیعہ سے کرنی پڑتی ہے۔

خلقت انسانی خلقت حیوانی سے خالی نہیں۔ تنازع فی البقاء اس کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے بلکہ وہ دیگر موجودات سے زاید اس کشمکش میں مبتلا ہے۔ کشاکش طبعی، کشاکش عاملی، کشاکش اخلاقی، کشاکش معاشی۔ پس انسان کی حفاظت کے لئے اور تنازع فی البقاء سے بچانے کے لئے لازم ہوا کہ کچھ اصول و ہدایات مقرر ہوں۔ جیسا کہ انسان و حیوان و نباتات کے واسطے حکما و منے وہ ضوابط و اصول مقرر کئے ہیں۔ اگر یہ عقلا ان اصول و ضوابط کے تقرر پر عقلاً مجبور تھے تو خالق کائنات کا ایسے ضروری اور اہم فریضہ سے بے اعتنائی کرنا عقلاً کیسی فروگذاشت ہے۔ لازم ہوا کہ وہ بھی کچھ اصول و قواعد مکمل قرار دے۔ جو کشائش تنازع فی البقاء میں ایک محکم قلعہ ہوں۔ ان اصول کے مجموعہ کا نام کتاب مذہب و احکام ہے اور بیان کنندہ اور انسان کو ان اصول پر چلانے والا نبی ہوتا ہے۔ اسی ضرورت کو پیدا کرنے کے لئے خدا نے اپنے ملائکہ کو خبردار کیا۔ "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" ہم زمین پر ایک خلیفہ کرنے والے ہیں جس کی وجہ سے دنیا قتل و غارت و ویرانی سے بچے اور طریق رہائش و زندگی مخلوق کو معلوم ہو۔ ملائکہ نے اسی تنازع فی البقاء کے مسئلہ کو پیش کیا۔ "اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء" خدایا کیا تو زمین کو آباد کر کے ایسی مخلوق پیدا کریگا۔ جو کہ عالم میں فساد برپا کر کے خونریزی کرے بیشک ملائکہ کا یہ شبہہ صحیح تھا۔ وہ تنازع فی البقاء کے قانون سے باخبر تھے۔ لیکن انہوں نے تنازع فی البقاء سے بچانے کے لئے اپنی ذات کو پیش کیا۔ "و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک" اس عرض و معروض کے دو مفہوم ہیں۔

ایک۔ یہ کہ زمین کی آبادی غیر ضروری ہے۔ ہماری خلقت تیرے واسطے کافی ہے۔ جو تنازع فی البقاء کے قانون سے بحیثیت خلقت بری ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ تسبیح و تحمید و تقدیس جناب باری میں بسر کرتے ہیں۔

دوسرے۔ یہ مقصود ہو سکتا ہے کہ خلافت فی الارض کے لئے ہم مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم تیری تسبیح و تحمید و تقدیس کرتے ہیں۔

خدا نے نہایت جواب دیا۔ "انی اعلم ما لا تعلمون" تم کو کیا حق ہے کہ ہماری تجویز میں

نکتہ چینی کرد۔ تم کو اتنی ہی سمجھ ہے جتنی ایک مخلوق کو ہونا چاہیئے۔ تنازع فی البقاء کا عذر تسبیح و تقدیس سے نہیں دور ہو سکتا۔ انتظام عالم کا اور امن و امان دنیا کا تسبیح و تقدیس سے نہیں ہو سکتا۔ اور نہ زمین باوجود اس وسعت و فوائد کی کثرت کے ویران رہنا عقلاً مناسب ہے لہٰذا اس کی آبادی ضروری ہے اور تنازع فی البقاء سے بچنے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ انتہا ہو گئی؟ "وعلم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملائکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین" آدم کو اسماء کی تعلیم فرما کر ملائکہ سے دریافت ہوا اس ملائکہ بتاؤ تو یہ اسماء جو آدم کو سکھائے گئے ہیں وہ کیا ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ گے۔ تنازع فی البقاء کی اصلاح کے لئے ایک حاکم اور خلیفہ کی زمین پر ضرورت ہے۔ جو دنیا کو سیدھے ڈھرے پر چلا سکے عالم ان چیزوں کا ہو جو تنازع فی البقاء کو رد کریں۔ بقاء اصلح کے اصولوں کا جاننے والا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بیشک تنازع فی البقاء انسانی خلقت کو فنا کر دیتی خلقت انسانی عبث و بے سود ہو جاتی۔ خدا نے حضرت آدم کو اس عہدہ کا اہل سمجھا اور خلیفہ فی الارض بنایا۔ اب ملائکہ کو کہنا پڑا "سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم" تیری تسبیح تو ہی ہے۔ ہم کو تو بس اتنا ہی علم ہے۔ جو تو نے بتایا ہے۔ اور تو بڑا جاننے والا حکیم ہے۔ اب تنازع فی البقاء کے لئے ضرورت خلق لازم ہو گئی۔ جو کہ بقاء اصلح کا عالم ہو۔ انسان کو خدا نے نباتات و حیوانات کی بقاء اصلح کے قواعد فطری طور پر تعلیم کر دیئے جس سے وہ حیوانات و نباتات کی حفاظت کرتا ہے۔ خود انسان بھی ایسے ہی حافظ اور مربی کا محتاج ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے ہم جنسوں کی ضرورت تھی۔ جو خدا ہی کے مقرر کردہ اصول پر انسان کی حفاظت کرے۔

اس آیہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے نبی ہوا کرتا ہے۔ انتخابی نہ ہو "انی جاعل" اس بات پر نص ہے دوسروں کا منتخب کردہ کیا اس بات پر عمل کر سکتا ہے۔ کیا انتخاب میں جاہل کی [illegible] کافی تھی۔ یہ معاملہ تنازع فی البقاء کا ہے۔ بہت اہم ہے کمال احتیاط کی ضرورت ہے پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کو خدا کی طرف سے ہو دنیا کا سکھایا پڑھا ہوا نہیں۔ دنیا کے ضرورتوں کو نہ جان سکتا ہے نہ پورا کر سکتا ہے۔ ابتدا عالم سے اس

وقت تک حکماء و عقلاء میں ایک فرد بھی نہیں جس کی نسبت یہ دعوے صحیح ہو کہ وہ عالم تھا تمام ان
اصول سے جو تنازع فی البقا کے واسطے ضروری ہیں۔ بیشک نبی کو ملائکہ سے زائد علم ہو جاتا ہے
تاکہ ملائکہ سر تسلیم خم کر سکیں۔ اور ہمیشہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کے جواب میں نہیں
کریں۔ ہر خلیفۃ اللہ کی ایسی ہی شان ہونا چاہئے۔ تاکہ خدا کا عہد ہمیشہ کے لئے بچا رہے۔
پس وحی و الہام کے ماننے پر بھی انسان عقلاً مجبور ہوا۔ اور وحی و الہام کا انحصار بھی اس میں نہ
کہ بواسطہ ملکی ہو۔ خدا کا پیغام بدون واسطہ ملکی بھی پہنچ سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت آدم کے لئے
ہوا۔ اسی معیار پر سچے اور جھوٹے نبیوں میں امتیاز ہمیشہ ہو سکتا ہے۔ اور یہی تنازع فی البقا
کی حفاظت کے لئے جب تک ضرورت ہے خلیفۃ اللہ کی بھی ضرورت رہے گی۔ ہر چند کہ
نام میں تغیر ہو۔ اور ضرورت کی کمی و زیادتی سے درجات نبوت میں بھی فرق و تفاوت ہو۔ زمین
حجۃ اللہ و خلیفۃ اللہ سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اللھم صل علیٰ محمد و آلہ و سلم۔

سید احمد ملانہ سندی

اک گنہ گار کی توبہ

اے میرے مالک۔ اے میرے خالق۔ تو رحمٰن ہے۔ تو رحیم ہے۔ تو کریم ہے۔ ستار ہے۔
مجیب الدعوات ہے۔ قاضی الحاجات ہے۔ دونوں جہان کا بادشاہ ہے اور وحدہٗ لاشریک ہے۔

اے آسمان و زمین کے بنانے والے۔ چاند سورج کے پیدا کرنے والے۔ اے میرے معبود حقیقی۔
میری سن۔ اس عاجز گنہگار روسیاہ کی فریاد کو سن۔ میری عرض سن۔ میں بیشک مجرم و
عاصی ہوں۔ عاجز ہوں۔ گنہگار ہوں مگر تیرے رحم و کرم کا طالب ہوں۔

اے میرے مولا! میرے گناہوں کو بخشدے میری خطاؤں کو معاف کر۔ میں توبہ کرتا ہوں اور صدق دل سے توبہ کرتا ہوں۔ میری توبہ کو قبول کر اور میرے دل میں گناہوں کی طرف سے نفرت پیدا کردے

اے مقلب القلوب میرے قلب کو بدل دے۔ ہاں بدل دے۔ دنیا کی محبت کو نکال کے میرے دل میں اپنی محبت بھر دے۔

اے ارحم الراحمین۔ مجھ پر رحم کر۔ مجھ گنہ گار کے حال پر رحم کر۔ مجھ سیہ کار پر رحم کر۔ ہاں رحم کر۔ میں تیرے دربار میں صرف تیری رحمت کا طلب گار آیا ہوں۔

اے ذوالجلال والاکرام۔ مجھ کو اپنے در سے نہ نکال۔ ہاں نہ نکال۔ اور اگر نکالتا ہے تو یہ بھی بتادے کہ میں جاؤں کہاں؟ تیرے سوا میرا کوئی دوسرا خدا نہیں۔ میں تو تجھی سے کہونگا رو کر کہوں گا۔ دست بستہ کہوں گا۔ رکوع میں کہوں گا۔ سجدہ میں کہونگا۔ مگر کہوں گا تجھی سے اور تو ہی میری فریاد کو سنے گا۔ کیونکہ تیرا ہی لقب سمیع بھی ہے اور بصیر بھی

اے میرے اللہ۔ اس خاتم الانبیا کا صدقہ اور اس کی آل کا صدقہ۔ جس کو تونے اپنا محبوب کیا ہے اور شافع محشر اور رحمۃ للعالمین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ میرے گناہوں سے درگذر

اے میرے رب۔ حضرت ابوبکر کی نیکیوں کا صدقہ حضرت عمر کے عدل و انصاف کا صدقہ حضرت عثمان کی حیا و ایمان کا صدقہ اور حضرت علی کے علم و شجاعت کا صدقہ۔ میرے گناہوں کو بخشدے اور میری خطاؤں کو معاف کر؎

خداوندا۔ دیکھ میں توبہ کرتا ہوں۔ اور صدق دل سے توبہ کرتا ہوں۔ میری توبہ قبول کر

استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ
(تین بار)

رسا ہمدانی گیلانی

"اختلاف مذاہب"

اس تماشاگاہِ عالم میں انسان کی نظر سے گوناگوں اشیا گزرتی ہیں۔ اور اس کے کسب تماشوں میں انسان بوقلموں واقعات کا معاینہ کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بری معلوم ہوتی ہے اور کوئی مرغوب طبع ہوتی ہے۔ کوئی صورت نفرت انگیز ہوتی ہے۔ اور کوئی دل فریب۔ کوئی شے پسندیدہ ہوتی ہے اور کوئی ناپسند

چونکہ انسانی طبایع مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ اپنے دلی جذبات کے موافق اثر قبول کرتے ہیں فرض کرو کہ ایک چیز کو ہم پسند کرتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ دوسرے اُسے ناپسند کریں۔ ہو سکتا ہے کہ جو چیز ہمارے لئے امرت ہو۔ وہی دوسروں کے لئے سم قاتل ثابت ہو جس شخص کو ہم حسین و جمیل خیال کرتے ہیں۔ دوسرے اسے بدصورت سمجھ سکتے ہیں۔

یورپ کے گورے چٹے آدمی میز کرسی پر بیٹھ کر لطیف غذا کھاتے ہیں لیکن ہندوستان کا غریب دیہاتی زمین پر بیٹھ کر سوکھی روٹی کھا لیتا ہے اور اسی میں خوش رہتا ہے۔ امریکہ میں لوگ کورٹ شپ کر کے شادی کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں عموماً شادی والدین کے فیصلہ پر منحصر ہوتی ہے روس کے باشندوں میں آج کل شورش پسندی کا زور ہے لیکن باشندگان فارس امن پسند ہیں۔

غرض مختلف ممالک اور مختلف قوموں پر نظر کرو۔ تو دیکھو گے کہ تمدن، معاشرت، سیاست مذہب یعنی کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ خواہ اُن کا تعلق حیات سے ہو خواہ ممات سے

یہ اختلاف اسی مقام تک نہیں رک جاتا ستم یہ ہے کہ ہم خود بعض اوقات اپنی رائے تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور اپنے دل میں اقرار کرتے ہیں کہ ہمارے پچھلے خیالات غلط تھے۔ دو سال پہلے ہم زید کو ایک اعلیٰ مصنف اور ایک کامیاب ادیب سمجھتے تھے لیکن آج ہم اسے معمولی آدمیوں میں شمار کرتے ہیں کل تک ہم جس شخص کو قوم کا ناخدا کہتے تھے۔ آج ہم اسے قومی بیڑے کا ڈبو دینے والا سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم کہتے تھے کہ یورپ کا تمدن ہندوستان کے لئے ابر رحمت ہوگا لیکن اب خیال کرتے ہیں کہ اس سیلاب سے ابنائے وطن بچے رہیں تو بہتر ہے۔

اس موقعہ پر ہم دو باتوں سے قطع نظر کر کے صرف مذہب کو مطمح نظر بناتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ مذاہب عالم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں۔ اُن کا عشر عشیر بھی اور چیزوں میں نہیں پایا۔ دنیا والے ان اختلافات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھٹنے کے بجائے یہ اختلافات بڑھتے جاتے ہیں۔

تاریخ عالم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مختلف مذاہب کی اشاعت مختلف مقامات پر ہوئی۔ قوموں کے ذاتی خصائل اور مقامات کے طبعی اثر بھی بعض بعض صورتوں میں اختلاف کا سبب ہوئے۔ اکثر ایسا ہوا کہ نئی شریعت نے پچھلی شریعت کی تردید کی۔ اور اپنی تعلیم کی حقانیت اور دوسرے مذہب کے بطلان کا دعویٰ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض نے نئی تعلیم قبول کی اور بعض پچھلی تعلیم کو ذریعہ نجات سمجھتے رہے

اس طرح دنیا کی قوموں میں مذہب کے لحاظ سے اختلاف کا بازار گرم ہوا۔ کوئی کسی کو کافر سمجھا کسی نے کسی کو ملیچھ بنایا کسی پر تثلیث پرستی کا اعتراض کیا گیا کسی کو مذہب کے بزور شمشیر پھیلانے کا طعنہ دیا گیا۔

غرض جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ان اختلافات میں اضافہ ہو رہا ہے کوئی صورت ایسی نہیں نظر آتی جس سے ان بیجا اختلافات کا استیصال کیا جاسکے۔ ہر مذہب والا صرف اپنے مذہب کی حقانیت کا معتقد ہے اور تمام دوسرے مذاہب کو باطل اور اُنکے ماننے والوں کو گمراہ خیال کرتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس اختلاف باہمی کو کسی طرح کم کیا جائے۔

مذہبی اختلافات کی ایک دھندلی سی تصویر اوپر کھینچی گئی۔ لیکن یہ اختلافات بجائے خود کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتے۔

دنیا کے ہر مذہب میں اصولی و فروعی دو قسم کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ اصولی مسائل وہ ہیں کہ اگر انہیں مذہب کے ماننے والے اُنکو چھوڑ دیں تو پھر ان کا شمار اس مذہب کے پیرؤں میں نہ ہوگا مثلاً اگر ایک مسلمان توحید و رسالت کا قائل نہ ہو تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا؟

دنیا کے جتنے بڑے بڑے مذاہب ہیں اُنکے اصول کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مذہب کے اصولی مسائل ایک دوسرے سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ان اصولوں میں ظاہراً کچھ تفاوت ہو لیکن حقیقت میں مذاہب کے اکثر اصول ایک ہیں۔

مثال کے طور پر مسئلہ وجود باری کو لیجئے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام مذاہب کا انحصار ہے

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کے ماننے والے وجود خدا کے قائل نہ ہوں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی سب خدا ہی کی پرستش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ملحد بھی خدا کو مانتے ہیں۔ گو وہ اس کا انکار زبان سے کرتے ہیں۔ بقول شاعر

ہندو نے صنم میں پایا جلوہ تیرا　　آتش پہ مغاں راگ گا یا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اس کے علاوہ اگر مذاہب کی روحانی تعلیم پر نظر کی جائے۔ تو یہ حقیقت آشکارا ہو گی کہ تمام مذاہب کی روحانی تعلیم تقریباً ایک ہے۔ مثال کے طور پر یوں دیکھئے کہ دنیا کے تمام مذاہب اپنے پیروؤں کو سچ کی تعلیم دیتے ہیں۔ سب بتلاتے ہیں کہ انسان کو اپنے بنائے جنس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہئے کسی مذہب کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ جھوٹ بولنا ثواب کا کام ہے۔ یا چوری کرنا مستحسن ہے۔ غرض کوئی مذہب روئے زمین پر ایسا نہیں ہے۔ جو اپنے پیروؤں کو بد اخلاقی و بدکرداری کی تعلیم دیتا ہو۔ اگر کسی مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کی آڑ میں بری باتیں کرتے ہیں۔ تو یہ مذہب کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ چند خراب رسوم کو ماننے لگے ہیں۔ جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

مذاہب کے فروعات ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں اور ان میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔ لیکن حقیقت پر غور کرنے سے ظاہر ہو گا کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ اسی وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے۔ اور تمام مذاہب اسی کی طرف سے بنانے کے لئے موجود پذیر ہوئے ہیں۔

اب چونکہ یہ ثابت ہو گیا کہ تمام مذاہب کے اصول تقریباً ایک ہیں۔ اور سب کی روحانی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس وجہ سے ہم کو یہ لازم ہے کہ آپس کے مذہبی تعصب اور جھگڑوں سے پرہیز کریں اور تمام مذاہب کے پیروؤں کو اپنے مثل سمجھ کر ان سے ویسا ہی برتاؤ کریں۔ جیسا اپنے ہم مذہب لوگوں سے کرتے ہیں۔ اور یہ خیال کریں کہ عیسیٰ بدین خود، موسیٰ بدین خود،

مطلب حسین

تمام عالم کی حالت اور عظیم الشان انقلاب

(مذہبی نقطۂ نظر سے)

زمانہ کی ہوا بدلی اور ہر رنگ چمن بدلا　　گلوں نے جیب و تن بدلی عنادل نے وطن بدلا
مقاصد مذہبیات کے بدلے دور عالم نے　　صحائف کی شرح بدلی کتابوں کا متن بدلا
نہ بدلا ہے نہ بدلے گا فقط قانون اسلامی　　قمر جب تک کہ قدرت نے نہ یہ چرخ کہن بدلا

مذہبی نقطۂ نظر سے تاریخ دو حصوں پر تقسیم کی جا سکتی ہے (۱) دور مشرکانہ (۲) دور موحدانہ اول الذکر میں شرک محیط عالم تھا موخر البیان میں توحید کا دور شروع ہو کر تمام عالم میں چار دانگ پھیل گیا دور موحدانہ کا ذکر شروع کرنے سے پہلے دور مشرکانہ کا مختصر خاکہ کھینچنا انسب معلوم ہوتا ہے تاکہ دور موحدانہ کے بانی مبانی نے جو انقلاب عظیم پیدا کیا اور تہذیب و شائستگی کا کا درس دیا اس کا تقابل معلوم ہو جائے۔

تمام دنیا میں شرک کا تسلط تھا۔ تمام روئے زمین پر حدود ربانی توڑ دیئے گئے تھے۔ اور قوانین الٰہیہ سے انحراف کیا گیا تھا۔ دنیا اشیاء پرست نیچر پرست بن گئی تھی۔ اخلاق۔ تمدن سیاست معاشرت۔ انصاف۔ تہذیب صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی تھی۔ تمام عالم پر جمود طاری تھا۔ ترقی کو سکون نے روک لیا تھا۔ ہر قبیلہ اور ہر شخص بجائے خود اس کا توہم حکمراں تھا جو محیط میں آیا اسی کو اختیار کر لیا۔ اپنے ہاتھوں ایک معبود گھڑ لیا جاتا۔ اور اسی کی پوجا پاٹ کو راہ فلاح و نجات تصور کیا جاتا تھا۔

دنیا میں تثلیث کا دور دورہ تھا۔ یورپ باپ۔ بیٹا۔ روح القدس کی تثلیث مانتا تھا۔ جرمنی فرانس۔ انگلینڈ جہالت میں مبتلا تھے۔ آپس میں کشت و خون جاری تھا۔ افریقہ نہایت درجہ وحشی اور ناشائستہ حالت میں مبتلا تھا۔

دنیا میں جس قدر بھی بنی اسرائیل آباد تھے وہ سب ۔ ۔ ۔ ۔ سانپ اور بچھو کا لقب حاصل کر چکے تھے ....ماسوائے شکل انسانی کے اُن سے انسانیت اور تہذیب معدوم ہو چکی تھی۔ ہندوستان پر جہالت کی تاریکی محیط تھی۔ روحانیت پر ظلمت کا پردہ پڑا ہوا تھا غفلت کی نیند نے معبود حقیقی سے سب کو بیہوش کر دیا تھا۔ برہما، وشنو، شیو کی تثلیث کا دلدادہ تھا بجائے ایک معبود الحق کے ۳۳ کروڑ بتوں کی خدائی کا ڈنکہ بجایا تھا

چندر بنسی اور سورج بنسی کو سورج اور چاند کی اولاد سمجھا جاتا تھا بت پرستی کی طرف بندگان خدا کی رہبری کی جاتی تھی۔ مندروں اور معبد خانوں میں مرد وعورت کی قابل اعتراض تصویریں کھینچی جاتی تھیں۔ دیواروں پر نہایت نامناسب اور فواحش تصویریں کندہ کی جاتی تھیں۔

ایران میں نور وحدانیت کو آتشکدوں نے ماند کر دیا تھا۔ زر و زن کا اوقاف عمومیہ میں منسر تھا۔ خواتین کی عصمت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا بیکس اور مظلوموں کی دستگیری کیلئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا۔ اور نہ ہی کوئی قابل فریاد اور امداد ہوتا تھا۔

مصر وغیرہ بسیس، ایسیس ہورس کی تثلیث کے قائل تھے۔ انسانیت وآدمیت کے مسند پر وحشت وحیوانیت جلوہ گر تھی۔

یونان۔ پیٹر، سر وا بکش کی تثلیث کا دلدادہ تھا معلمان ربانی کی پاک تعلیم کو یورپ کے پادری مسخ کر چکے تھے۔ اور اخلاقی پستی کے ادنی سے ادنی نقطہ پر پہنچ گئے تھے۔

اب رہا وہ ملک جہاں مذہب اسلام کے بانی روحی فداہ محمد صلعم پیدا ہوئے۔ وہ تمام دنیا کی برائیوں کا مجموعہ تھا۔ جو اقالیم عالم میں جائز قرار دی جاتی تھیں۔

آل عرب جن بھوت سحر وغیرہ کے دلدادہ تھے۔ اگر کوئی مر جاتا تو ایک ناقہ اس کی قبر پر باندھ دیتے تھے۔ کہ قیامت کو اس پر سوار ہو کر اٹھیگا۔ اور وہ ناقہ بباعث بھوک کے ہلاک ہو جاتا تو خوش ہوتے۔ اس کو باعث نجات تصور کیا جاتا تھا۔ اور ان کے ایمانی سندات میں یہ بھی تھا کہ جب تک مقتول کا عوض نہ لیا جاسے تو ایک جانور (ہامہ نامی) اس کے سر سے پیدا ہوتا ہے اور چنگھاڑتا رہتا ہے اور آئندہ کی خبریں بھی وہی (ہامہ) دیتا ہے۔ اور ایک (صفر نامی) سانپ ہے۔ جو کہ پیٹ میں رہتا ہے۔ کما قبل ۵

ھامی دتجرنی نبا تستعمرھا فجنوا الشعراء والمکرھا

جہالت اور درندگی کی یہ حالت تھی کہ اپ فوت ہوجاتا تو بیٹا ماں کے ساتھ نکاح کرنے کو تیار ہوجاتا۔ ایک عورت کے کئی کئی مرد ہوتے تھے۔ مجوسیوں کی طرح اپنی لڑکیوں سے نکاح کرلینا کوئی بات نہ تھا۔

باوجودیکہ یہ لوگ ان ممالک سے جو اپنے آپ کو ایک متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کہاتے تھے میل جول رکھتے تھے۔ ایرانیوں اور رومیوں سے ان کے تجارتی تعلقات پیوستہ تھے مگر طرہ یہ کہ ان میں یہ امور نہ وہ قبیح رسومات ترقی پاتے جاتے تھے۔

انتخاب فواحش و قتال و جدال ایک کھیل تھا۔ اور عزت کی بات تھی۔ آل عرب شجاع تھے لڑتے مرتے تھے۔ عزت آبرو پر جان دیتے تھے۔ ~

اذا المرء لم یدنس من اللوم عرضہ فکل ردا یرتدیہ جمیل

پر سار دارومدار تھا۔ ایک فخریہ کہتا ہے ~

حولی من بنی قحطان شیب وشبان الی الہیجا سراع

اذا فزعوا فامرھم جمیع وان لاقوا فایدیھم شجاع

گو یہ سب کشت و خون بیہودہ تھا اور بیکار وہ کسی کے مطیع اور فرمانبردار ہوکر رہنا اور زندگی بسر کرنا اپنی ذلت اور حقارت سمجھتے تھے۔ معمولی سے معمولی باتوں کے باعث سالہا سال تک جنگ و جدال جاری رکھا جاتا تھا۔ اگر غور سے دیکھا جاتا تو نتیجہ کچھ برآمد نہ ہوتا تھا۔

تمام عرب بتوں کے تسلط میں تھا۔ وہ کعبہ جو بزرگ ترین پیشوا کی مسجد توحید تھی ... بتوں سے معمور تھا۔ پیشواؤں کی پاک تعلیم ان کے دلوں سے مسخ ہوچکی تھی۔

باشندگان عرب زندہ لڑکیوں کو پیوند خاک کردینا عزت و شرافت سمجھتے تھے۔

میں عرض کرچکا کہ کل دنیا میں منکرات و فواحش و فخر و مباہات کا دور تھا۔ تمام روئے زمین پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور خدا کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ ایسے زمانہ میں ظہر الفساد فی البر والبحر کا سماں تھا۔ یہ دو شعر کا مختصر حال ہے اب آئندہ صحبت میں ہم موصوف کی نسبت جو فضیلت اسلام اور صلاح پیشوا پر جو کرم نبی اسلام نے کی روشنی ڈالی جائیگی۔ انشاء اللہ حبیب ... مہیب

مذہبی تعلیم

بس ہے ذات واحد عبادت کے لایق زبان اور دل کی شہادت کے لایق
اوسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لایق اسی کی ہے سرکار خدمت کے لایق

اس عالم وجود میں جو صاحب جس مذہب جس روش کو مختار و محبوب متصور کرتے ہوں ان کو لازم ہے کہ اپنے اپنے مذہب میں تصدیق قلبی و تعمیل مذہبی کے ساتھ پابند مذہب رہیں تاکہ اپنے اپنے خیالات و اوعار کے بموجب مستحق جنت و دیگر فلاح اخروی ہوں۔

ہم دنیا میں کوئی مذہب ایسی جہلک نہیں دیکھا کہ انسان کو صداقت و تصدیق قلبی و تعمیل ارکان کے خلاف حکم کر کے فلاح آخرت و بہبود کا امیدوار بنائے مجھکو دنیا میں ایسے شخص بہت کم نظر آتے ہیں۔ جو اپنے مذہب کے اوامر و نواہی کے کاربند ہو کر جادۂ اعتدال پر قدم رنجہ فرمائیں۔ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ کو ایک مذہبی حکم خیال کر کے طالب صراط مستقیم ہوں۔ خداوند شانہ و عم نوالہ نے اپنے جود و کرم سے ہم ناچیز و ناشکر بندوں کے واسطے دنیا ایک مزرعہ بنایا ہے یعنی دنیا ہمارے واسطے کھیتی ہے جس قسم و نوع کی تخم افشانی کرینگے۔ اسی سے بارور ہو کر تمتع یا مکلف ہونگے۔ شعر

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

خصوصاً میں اپنے پیارے احباب مسلمین سے دست بستہ عاجزانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اوامر و نواہی شرعیہ سے حتی الامکان ایک انچ قدم بیرون تعلیم اسلامی نہ رکھیں لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کو اپنے قلب میں اطمینان بخش و راسخ متصور کریں۔ تو ضرور بالضرور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ لھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون اولئک علی ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون۔

لیکن فی زمانہ اسلام کے اوامر و نواہی کا سامنا ورطہ مہلک ہے باوجودیکہ اپنے شاہرات

سے بیان پر صفحہ کاغذ کو سیاہ کردوں تو امید ہے کہ خالی از عبرت نہ ہوگا کشتی اسلام بحر ضلالت
عالم میں لرزاں ہے۔

ایک روز میں اپنے ایک دوست کے مکان کو تعزیت کے واسطے گیا مستورات کو سر
ارض پر سر پٹکتے اور آہ و فغاں کرتے دیکھا وہ امور ظہور پذیر نظیر میں آئے۔ جو پردۂ ظلمت سے
شارع علیہ السلام نے فضائے عالم میں نکالکر کھلم کھلا ممنوع فرمایا ہے۔ زبان قلم اس کے بیان
سے لال ہے۔ مردہ کے پہلو کے متصل عورات متعدد بجائے دعا و استغفار اپنی رانیں پیٹ
پیٹ کر اوصاف حمیدہ بیان کرکے رگیروں کی سناتی تھیں۔

میں نے تلقین انا للہ وانا الیہ راجعون کی کی۔ امور شرعیہ کے مخالف جو امور ان مستورات
سے سرزد ہو کر عالم وجود میں دیگر کائنات کے واسطے نظیر بن رہے تھے سخت ممانعت کی جواب ملا
کہ کیوں تم ہمارے قلب سوختہ میں چنگاریاں لگا کر پھر روشن کرتے ہو۔ ہمارے زخم قلب
پر نمک افشانی کرتے ہو۔ اس وقت خدا تعالی کی جانب سے ہمارے قلب پر ایک بجلی گری ہے
ہمارے قلب مسرت آمیز کو پژمردہ و سوختہ کردیا ہے۔ ہماری گلبن نوجوانی کو ہمارے لاڈلے کو
آغوش مہد دنیا سے لیکر خاک قبر میں سلا رہا ہے۔ پھر ہم کو اس مصیبت کی تبیین سے منع
کرتے ہو۔ ہم نے تو اپنی والدہ کو اسی صورت سے روتے پیٹتے دیکھا تھا۔

واقعی ایسے لوگ انا وجدنا علیہ آبائنا کے عامل ہیں۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ
ربک ذوالجلال والاکرام کو منسوخ کرکے مطلقاً عاقبت اندیشی کے پابند نہیں۔ ونبلوکم
بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص
من الاموال والانفس والثمرات کو ایک ردی کے ٹکڑے کی مانند بیکار سمجھکر زمین میں
ڈال دیے بلکہ آتشکدہ نار میں سوختہ کرنے کے متلاشی ہیں۔ اندھا پر سیاہ پردۂ ظلمت اپنی آنکھوں
پر ڈھانک لیا ہے۔

مومنین اسلام رکن پنج وقتیہ کے ادا کرنے کے نام نہیں۔ اور وہ بھی اس صورت سے

شب چو عقد نماز می بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

بلکہ اسلام تم کو سچ سچ کرم رحم و کرم خصائل پسندیدہ و عادات حمیدہ وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دے رہا ہے۔ تم کو عالم جہالت سے نکال کر روز افزوں نعمت عطا کر رہا ہے ؎

خوش خلق جگ میں رہنا تسخیر ہے تو یہ ہے
خاک اپنے کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

ارکان اسلام سے اولاً توحید ہے۔ عوام میں بجائے وحدت پرستی، باطل پرستی و قبر پرستی وغیرہ وغیرہ اپنا اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔ افسوس صد افسوس

سید عبد القائم رامپوری

تمدن کے قلمی معاونین سے درخواست

تمدن کو اعلیٰ پیمانہ پر لانے کیلئے اسکی ضرورت ہے کہ اسکی مستقل اہل قلم مدد کریں جو ابواب تمدن میں اسوقت قائم کئے گئے ہیں جن میں سے بعض کی ایک معتبر نے مخالفت بھی کی ہے حسب ذیل ہیں:۔

حصہ اول میں نثر علمی، ادبی، تاریخی، معاشرتی، تمدنی، اخلاقی۔ حصہ دوم مضامین نثر مفید خواتین و اطفال۔ حصہ سوم مضامین متعلق مذہب سائنس و فلسفہ۔ حصہ چہارم نظم

تمدن کے صفحات ناظرین تمدن کی ملکیت ہیں۔ اسلئے اسپر اصرار کرنے کا حق حاصل نہیں کہ تمدن میں مضامین کی ترتیب یہی رہے گی۔ اگر تمدن کے ناظرین نے پسند نہ کیا اور سابقہ حالت زیادہ مناسب سمجھی گئی تو پھر اسکے مضامین کی ترتیب اسی قسم کی کردی جائیگی۔ فی الحال میں اپنے احباب سے خصوصاً اور دیگر حضرات سے عموماً استدعا کرتا ہوں کہ وہ تمدن کی علمی معاونت کی طرف پھر پورے طور پر توجہ کریں۔ تمدن کی معنوی خوبیوں میں اضافہ کرنا ان کا کام ہے اور ظاہری خوبیوں میں اضافہ کرنے کا فرض زیادہ تر ناظرین تمدن پر عاید ہوتا ہے۔ اگر دونوں طبقہ تمدن کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوجائیں تو میں تو ہمیشہ تمدن کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ ہمعصر گلستاں نے تمدن پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ قاری عباس حسین صاحب اپنی روز افزوں قومی مصروفیتوں کی وجہ سے تمدن کی ترتیب و تہذیب میں زیادہ سرگرم نہیں رہ سکتے۔" جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے وہ صحیح ہے اور میں اسکے لئے خجل ہوں۔ شاید قومی مصروفیتوں کے تقاضا دہ پڑھنے کا ناساز رہا ہے۔ تاہم میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تمدن کے علمی معاونین اور ناظرین مدد کریں تو بہتر بنانا چاہتا ہوں میں تمدن کی طرف پوری توجہ کرکے انشاء اللہ بہت جلد اس الزام سے بری ہوسکونگا جو ہمعصر نے لگایا ہے۔

خادم محمد عباس حسین قاری

گوشۂ تنہائی

اے شرقِ رعنائی، اے گوشۂ تنہائی — تو باعثِ یکسوئی، تو وجہِ شکیبائی
خلوت میں بھی جلوت کی اک بزم نظر آئی — جلووں کی ترے کیا کیا آنکھیں ہیں تماشائی
تصویر بُتِ کافر دل میں ہے اُتر آئی

ملجا ہے تو حسرت کا، حسرت کا تو ہے ماویٰ — ہاں ہجر کے ماروں کا غمخوار نہیں تجھ سا
دنیا سے الگ ہو کر دل تجھ کو دیا اپنا — کیا صدمۂ تاریکی، کیا صدمۂ تنہائی
ہم جلسۂ خلوت ہے ظالم تری رعنائی

ارماں کو، حسرت کو، امید کو بھی چھوڑا — سب چھوٹ گئے، اب رشتہ تجھ سے ہے فقط جوڑا
بیٹھا ہوں الگ سب سے دنیا سے ہے منہ موڑا — بس میں ہوں یہاں اور اب تو ہے مرے مونسِ تنہائی!
گھر کر ہی گئی میرے دل میں تری زیبائی

سننے میں نہیں آتے اغیار کے اب طعنے — بیکار ہیں غیروں کے وہ رشک فزا جلے
چھایا سا ہے تجھ میں تو ہوں عالمِ ظلمت سے — جھگڑوں سے زمانے کے فرصت ہے یہاں پائی
کیونکر نہ کروں در پر میں تیرے جبیں سائی

روتا ہوں تو رونے پر اب کوئی نہیں ہنستا — ہنستا ہوں تو ہنسنے پر اب حرف نہیں آتا
جلتا ہوں تو جلنے پر اُف کوئی نہیں کرتا — مرتا ہوں تو مرنے پہ حسرت ہے اک چھائی
یہ فیض ہے سب تیرا! اے گوشۂ تنہائی!

بیٹھا ہوں لیے دل میں تصویر کسی بت کی — اور ہے مری گردن میں زنجیر کسی بت کی

مشکل رہی بالکل تسخیر کسی بت کی — وہ شوخ نظر آب ہو جس کا ہوں میں شیدائی
خلوت یہ مقدر سے ہے ہاتھ مرے آئی

آنکھوں میں بٹھاتا ہوں، سینہ سے لگاتا ہوں — فرقت کی گھٹا اپنی میں اُسکو سناتا ہوں
اُلفت کا ترانہ اب بس شوق سے گاتا ہوں — اندیشہ بدنامی نے خطرہ رسوائی
ایسی کبھی آزادی میں نے تھی کہاں پائی

اندر پرستش کا یہ تو نے بتایا ہے — تصویر تصور کو سینے سے لگایا ہے
سب فیض تصور نے ہستی کو مٹایا ہے — مشکل ہوا یہ کہنا ہے کون تمنائی؟
وہ ہے مرا شیدائی میں جس کا ہوں سودائی

دنیا مجھے کہتی ہے "ویراں ہے اکیلا ہے" — میں کہتا ہوں دنیا سے "جا تجھکو خبر کیا ہے"
اس گوشہ خلوت میں اس ذات کا جلوہ ہے — "بے مثل صفت جسکی بے مثل ہے یکتائی"
بے مثل ہے تو بھی تو اے گوشہ تنہائی!

خلوت گزین

کرشن کی بنسی — راز صدیقی حامد پوری

"بنسی کی صدا"

سکھی میں ہوں مست بنسی کی دھن سے — کہو گی جو مجھے کہنا ہے اُن سے
تجھے میں کیا بتاؤں پی کہاں ہے — بنسی مجھ کو بتا دے پی کہاں ہے
برہ کی آگ سے میں جل رہی ہوں — تڑپتی ہوں کلیجہ مل رہی ہوں
نگاہ ناز سے بسمل ہوئی ہوں — فقط بسمل نہیں بیدل ہوئی ہوں
مرے چت چور کو کوئی بلا دے — سنا دے پھر مجھے بنسی سنا دے
مری آنکھوں میں وہ رنگیں ادا ہے — مرے کانوں میں بنسی کی صدا ہے
کسی کا دم بھری بوری میں دم ہے — مرا اس بانس کی پوری میں دم ہے

اسی غمّاز نے مارا ہے مجھ کو
اسی آواز نے مارا ہے مجھکو

مروں گی جان دوں گی سر دُھنوں گی
سُنوں گی پھر وہی بنسی سُنوں گی

وہی بنسی رسیلی ہے سُریلی
وہی بنسی، رنگیلی ہے چھبیلی

وہی بنسی، بھرا ہے سوز جس میں
نئی آواز ہے ہر روز جس میں

وہی بنسی، جو بجباں بولتی ہے
مگر راز حقیقت کھولتی ہے

وہی بنسی، بڑی تقدیر جس کی
مری نظروں میں ہے تصویر جس کی

وہی بنسی، مجھے دکھ دے رہی ہے
لب جاناں کے بوسے لے رہی ہے

وہی بنسی، گئی جو بانس ہو کر
کھٹکتی ہے جگر میں پھانس ہو کر

وہی بنسی، خیالوں میں بسی ہے
وہی عاشق کے نالوں میں بسی ہے

اسی بنسی میں جادو بھر رہا ہے
اسی بنسی نے میرا من ہرا ہے

مروں گی جان دوں گی سر دُھنوں گی
سُنوں گی پھر وہی بنسی سُنوں گی

اسی دن سے نشیلے غضب ہیں
ترانے زینت بزم طرب ہیں

ترے سُر سے دریا تھم گیا ہے
سری جمنا کا پانی جم گیا ہے

درختوں کو ہوئے سُن سُن کے سکتے
پرندے رہ گئے تکتے کے تکتے

ہرن بھی چوکڑی بھولے ہوئے ہیں
تری آواز سے پھولے ہوئے ہیں

لساؤں کو کیا بے خود چمن میں
ہوئیں مدہوشیاں شیر دکن میں

مدہوش ہے بانسری کے راگ سُنکر
پھنوں کو پیٹتے ہیں ناگ سُنکر

خلیق زار دیوانہ ہوا ہے۔
جگر افگار پروانہ ہوا ہے

سکھی سدھ بدھ گری جاتی رہی ہے؟
کسی کی بانسری جب سے سُنی ہے

مروں گی جان دوں گی سر دُھنوں گی
سُنوں گی پھر وہی بنسی سُنوں گی

خلیق دہلوی

شکستہ مزاروں کو ہموار کر دو — قیامت وہاں ٹھوکریں کھا رہی ہے
شبِ غم کی ہو گی سحر تیرے ہوتے — ابھی تیرگی ہر طرف چھا رہی ہے
اثر یہ تبدل کا ہے دنیا پہ طاری — طبیعت زمانہ کی گھبرا رہی ہے
کہو خضر سے جا کے کشتی ہماری — سمندر کی موجوں سے ٹکرا رہی ہے
خبر بھی ہے کچھ تجھ کو اے بندۂ اپنی — بلا سر پہ مدت سے منڈلا رہی ہے
ہمارے جنوں کی ہمت گھروں میں — دلہن بن کے گھونگٹ میں شرما رہی ہے
نہ شیخ و برہمن نہ دیر و حرم ہیں — سماں دہریت اپنا دکھلا رہی ہے

خبر لے تپش اپنے سوزِ دروں کی
ترے دل کے جلنے کی بو آ رہی ہے

تپش خورجوی

سنا یا گردش قسمت نے اس بت کی خطا کیا ہے — ہم اس پر مفت کیوں الزام رکھیں ہم کو مرنا ہے
اسے کہتے ہیں الفت عشق صادق ایسا ہوتا ہے — کہ مجنوں خاک ہو کر بھی غبارِ راہِ لیلیٰ ہے
ترا حسن شرابی ہوش اڑاتا ہے زمانے کا — پھر اس پر چشم خواب آلود سونے پر سہاگا ہے
وہ جاں درد آشنا میں درد کی لذت پہ مرتا ہوں — مجھے تو نیشتر بھی مرہم زخم تمنا ہے
ہوا ہے دلنشیں ایسا نکلتا ہی نہیں دل سے — ترا تیرِ نظر ہے دل میں یا دل کی تمنا ہے
ہوئی فرصت دوا سے شاد باش اے الفت جاناں — قضا ہی اب ترے بیمار کے حق میں مسیحا ہے
میں ان سے کہہ چکا سو بار میری آرزو تم ہو — وہ جب کہتے ہیں یہ کہتے ہیں تیری آرزو کیا ہے
نقاب لن ترانی ہے رخ انور کی تابانی — تمہاری بے حجابی خود حجاب روئے زیبا ہے
ہماری سادہ لوحی دیکھئے دی جس نے بیتابی — اسی بیدرد سے اب دل کی بیتابی کا شکوا ہے
مجھے بہکا لیا اس فتنۂ محشر نے محشر میں — یہ ہنس ہنس کر کہہ رہا ہے کیئے دل کا مدعا کیا ہے

حقارت سے نہ دیکھ اے تاجور تو اشک حسرت کو
یہی قطرہ اگر طوفاں پر آئے تو دریا ہے

تاجور نجیب آبادی

درحیا پردہ یہ شرمیلی دلہن چلمن میں ہے
یا نگاہ ناز تیرے دیدۂ پرفن میں ہے

اتحاد عاشق و معشوق اس کا نام ہے
چاک بلبل کے جگر کا پھول کے دامن میں ہے

تم کو اک دل دیکے گویا سو بلائیں مول لیں
دل مصیبت میں جگر آفت میں جان الجھن میں ہے

اے زلیخا دامن یوسف سے گستاخی نہ کر
یہ سمجھ لے تیری عصمت بھی اسی دامن میں ہے

نور چھن چھن کر نکلتا ہے دل صد چاک سے
یا الٰہی کیا یہ ماہ پارہ اسی چلمن میں ہے

اور پھولوں سے مجھے مطلب نہیں اے گلعذار
جس میں تیری بو ہو ایسا پھول کس گلشن میں ہے

جگمگے ہے سر فروشان محبت کا لہو
کچھ ترے دامن میں ہے کچھ تیغ کے دامن میں ہے

سچ ہے ظالم تجھکو میرا درد کیوں ہونے لگا
تیری جان الجھن میں ہے یا مری جاں الجھن میں ہے

پاؤں رکھنا دیکھ کر اے شاہد باد بہار
آتش گل ہر طرف بھڑکی ہوئی گلشن میں ہے

اس طرف روتے ہیں بالیں پر ہم بیٹھے ہوئے
اس طرف بیمار ہجراں نزع کی الجھن میں ہے

ہائے وہ گور غریباں پر کسی کا پوچھنا
یا خدا میرا شہید ناز کس مدفن میں ہے

کسکی آنکھوں میں لگاوٹ ہے تری آنکھوں میں ہے
کس کی عنواں میں شرارت ہے تری چتون میں ہے

ترک الفت پر بھی دل میں ولولہ حسرت ہے شفق
آگ ٹھنڈی ہو چکی لیکن دھواں گلخن میں ہے

شفق امروہی

نکل رہے ہیں جو صدمے وصال کے کر کے
یہ اہل درد نہیں جیتے ہیں منگ مر مر کے

مجال اف نہیں وابستگان دامن ہیں
غضب کے رعب ہیں انداز حسن دلبر کے

عدو کسے کوئی محرم وصل پوچھی سے
کہ آپ کس لئے در پے ہیں جان مضطر کے؟

چمن میں حال زبوں میرا مشتہر نہ ہوا
قلم بنائے تھے صیاد نے میرے پر کے

خدا کے واسطے سوچو تو اے مسلمانو
تمہارا پاؤں نہ کیوں راہ راست سے سرکے؟

ق

طواف کعبۂ تہذیب نو کے نشے میں
مٹائے جاتے ہو نقش قدم پیمبر کے

مثل یہ دھوبی کے کتے کی صادق آئی ہے
نہ گھاٹ کے ہو سکے نہ رہے امین نہ ہم گھر کے

امین سیالکوٹی

ان کو دل دے کے ہوئی حاصل پشیمانی مجھے
ہاں مگر مرنے نہیں دیتی گراں جانی مجھے

اس کی زلفوں کا تصور ہے نہ وحشت کا خیال
اک نہ اک ہر وقت رہتی ہے پریشانی مجھے

میں نہ کہتا تھا نہ دیجے میرے دل کو پائمال
اب ندامت آپ کو ہے یا پشیمانی مجھے

پاسباں روکیں گے تا کب کون تھا میرے سوا
جلوہ گاہ ناز کی تھی نگہبانی مجھے

سہل ہونا تھا انداز پہ صراحۂ عشق سے
کیا خبر تھی دل کی کرنی ہوگی قربانی مجھے

خوگر رنج و الم ہونا کوئی آسان ہے
مدتوں کرنی پڑی ہے غم کی مہمانی مجھے

اس سے بڑھ جانے سے ہو حاصل حیات جاوداں
اب بتائے گا بھلا کیا عالم فانی مجھے

میری قسمت پہ ملنے کو نہ آئے رشک کیوں
مل گیا تقدیر سے اک یوسف ثانی مجھے

معشوق یوسف یہ کہتے تھے زبان حال سے
سوئے زنداں لے چلی ہے پاک دامانی مجھے

وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اسے دیکھا کروں
کاش آئینہ بنا دے میری حیرانی مجھے

اس کا جلوہ بھی نظر آ جائے گا اک دن مگر
ہوش میں آنے تو دے اخلاق حیرانی مجھے

اخلاق دہلوی

عشق کیا چیز ہے پابند مقدر ہونا
اتنا مٹنا کہ فقط اپنی خبر ہو جانا

ہیں محبت میں تصور کے یہ سچے معنی
دل میں گھل مل کے خیالوں کا نظر ہو جانا

ابتدا ہوتی ہے جب یاد تو سر دھنتا ہوا
صرف باتوں ہی میں مشغول سحر ہو جانا

حشر کے دن بھی تری جلوہ گاہی کا مجھے
حکم یہ تھا کہ خبردار ادھر ہو جانا

معنی وصل ہوس کا ہی دل سے ہے تو یہ
مٹتے مٹتے بھی محبت کی خبر ہو جانا

خون تو آنکھ میں [illegible] ہے لیکن
اتنا تھمنا کہ خبردار گہر ہو جانا

محترم اس لئے کعبہ و [illegible] سمجھے تھے
تھا حقیقت میں تو اللہ کا گھر ہو جانا

دیکھ سکتی نہیں آنکھیں مرے اکثر [illegible]
وہ جدھر ہوں مرے اللہ ادھر ہو جانا

ننگ چاہت ہے یہ بہتر ہے کہ ٹھہر [illegible]
[illegible] مرحوم کا کچھ دل میں گذر ہو جانا

[illegible] نام ہے اسکا نہ کہنے میں [illegible]
آنکھ کے ملتے ہی پابند نظر ہو جانا

یہ کہہ کے سرہانے سے وہ رنجور کے اٹھے
یہ حالت نزع اس کی - تو دیکھی نہیں جاتی

رنجور عظیم آبادی

...جو گذری جب ہوئے اوجھل نظر سے آپ	خود پوچھ لیجئے گا دل لوحِ گر سے آپ
...ل وہ چھپ گیا دامان ابر میں	دو چار ہو گئے جو کسی شب قمر سے آپ
...ٹ جل تو لیجئے اے خفتگان خاک!	منزل کڑی تھی تھک گئے شاید سفر سے آپ
...دن سے آنسوؤں نے کیا فاش راز عشق	اس دن سے گر گئے ہیں ہم اپنی نظر سے آپ
...ے رہروان دہر! ہے پُرخار راہ عشق	بچ بچ کے چلنا - دیکھنا - اس رہگزر سے آپ
...ے جو جل بجھے ہیں یہاں پھر جلینگے خاک	ہاں تھکے ہوئے تھے ڈر گئے نار سقر سے آپ

تھی گر خطا تو چشم نظارہ نگر کی تھی
ناحق خفا ہیں عاشقِ خستہ جگر سے آپ

عاشق لدھیانہ